مجالس مسیح الامت

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب

پیش لفظ

مولانا عبدالقیوم حقانی

بہ تعاون و نگرانی

الحاج ابراہیم تسبیح والا

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ پاکستان

مجالسِ مسیح الامت

حضرت مولانا مسیح اللہ خانؒ

پیش لفظ : مولانا عبدالقیوم حقانی

بہ تعاون ونگرانی : الحاج ابراہیم تسبیح والا

مقامِ علم، تفصیلِ ذکر، تقویٰ، اصلاح میں تاخیر کی وجہ، نورِ نبوت، نورِ علم، ترتیب سلوک، تبدیلی حالات میں تصحیح نیت، حصولِ مطلوب کے لئے طریقِ صحیح، اتباعِ اکابر اور زیادۃ فی العلم، حفظِ ماتقدم، مجاہدہ وشانِ فناء، واقعاتِ مسیح الامت، اخلاص وصدق، اسلامی تہذیب وصفائی، عقلیہ، غضبیہ، شہویہ کا اعتدال، مردِ کامل کی تشکیل، تصدیق و عمل، صراطِ مستقیم وغیرہ وغیرہ اس طرح کے دلچسپ، اثر انگیز اور دل موہ لینے والے مجالس کا حسین مرقع۔

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ سرحد پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

❀ ❀ ❀

کتنے نغمے ہیں جو پردوں میں چھپا رکھے ہیں
آپ چھیڑیں تو یہ سازِ دلِ ناساز کبھی
کیفی

❀ ❀ ❀

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

کے چند اجل خلفاء

از : حضرت مولانا وکیل احمد شیروانی مدظلہم

☆ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ

☆ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ

☆ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ

☆ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

☆ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ

☆ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحبؒ

☆ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

☆ حضرت مولانا عبدالباری صاحبؒ

☆ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحبؒ

☆ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری صاحبؒ

☆ حضرت مولانا جلیل احمد احمد شیروانی

فہرستِ عناوین

دسویں مجلس ...... حفظِ ما تقدّم ۲۵۱

پندرہویں مجلس

☆☆☆

فہرست عناوین

اُنیسویں مجلس ...... جوہر تصوف ۸۰

تیئیسویں مجلس ...... امیر اور شوریٰ ۱۴۷

اٹھائیسویں مجلس

اکتیسویں مجلس ...... مجلسِ شیخ سے تعجیل استفادہ کا طریقہ ۲۷۴

چونتیسویں مجلس

پینتیسویں مجلس

دینِ اسلام مکمل نظام وانتظام ہے

چھتیسویں مجلس

اڑتیسویں مجلس

مؤمن کا اوّلین فرض اجرائے احکام ہے

اکتالیسویں مجلس ۴۵۸

وساوسِ غیرِ اختیاریہ ورؤیا کی تفصیل

تینتالیسویں مجلس......احکامِ شریعت نہایت عظیم امانت ہیں ۴۹۷

چوالیسویں مجلس

پینتالیسویں مجلس

☆

عرضِ ناشر

مسیح الامت حضرت مولانا **مسیح اللہ خانؒ** کے خلیفۂ اجل، ان کے علوم و معارف کے امین و شارح، ان کے مسلکِ اعتدال کے ترجمان **حضرت الحاج ابراہیم تسبیح والے** کی دلی تمنا تھی کہ حضرت **مسیح الامتؒ** کے مجالس، جدید ترتیب، عمدہ کتابت اور خوبصورت طباعت کے ساتھ منظر عام پر آئیں۔

القاسم اکیڈمی پر اعتماد فرمایا۔ان کی سرپرستی اور بھرپور مخلصانہ تعاون سے اکیڈمی حضرتؒ کے اوّلین سولہ (۱۶) مجالس کو جلد اوّل کی صورت میں اُمت کے حضور پیش کررہی ہے، مزید کام جاری ہے۔قارئین سے اشاعت و تکمیل کیلئے دُعا کی درخواست ہے۔

عبدالقیوم حقانی

پیش لفظ

از : حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی مدظلہٗ

الحمد لحضرة الجلالة والصلوٰة والسلام علی خاتم الرسالة.

شیخ جامیؒ فرماتے ہیں ....

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

حقیقت بھی یہی ہے کہ انسانی سیرت و کردار پر چہرہ اور لہجہ دونوں اثر انداز ہوتے ہیں، وہ بات تیر بن کر دل میں کھب جاتی ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلی ہو، گفتگو کو اگر حکمت آمیز، معانی سے لبریز، مٹھاس سے معمور، دلِ دردمند کی ترجمان اور حسنِ بیان سے بھرپور ہو تو ایک ایک حرف اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ کی سیرت سازی میں جہاں آنحضرت ﷺ کے جمالِ جہاں افروز کا اثر تھا، وہاں آپ کے بیان فیض ترجمان کی تاثیر کا بھی اتنا ہی حصہ تھا، چھوٹی چھوٹی مگر حکمت و عظمت سے لبریز باتیں' تاثیر' کشش اور کیف میں رچے جملے اور معارف و حقائق کے خزانے اپنے دامن میں لئے ہوئے مختصر اقوال' بلاشبہ صحابۂ کرامؓ کی سیرتوں پر بے پناہ اثرات چھوڑتے تھے، ان سے جہاں ایمان تازہ ہوتا، وہاں عرفان کو بھی غذا ملتی ایک طرف اگر عقل کی گتھیاں سلجھ رہی ہوتیں تو دوسری جانب ذوق و وجدان کی پرورش بھی ہو رہی تھی، گفتار کی شرینی اور بیان کی حلاوت کانوں میں جب اُترتی محسوس ہوتی' یہی رنگ ہمیں صوفیاءِ کرام کی محفلوں پر بھی غالب دکھائی دیتا

ہے، جب ہم ان کی مجالس ومحافل کا احوال اوران کے ملفوظات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی محفل ومجلس ایسا چمنستان نظر آتی ہے جس میں ہر گل اپنا رنگ اوراپنی مہک رکھتا ہے، رنگ آنکھوں کوسرور بخشتا اورمہک مشام جان کو معطر کرتی ہے، جب بزرگانِ دین کی محافل عروج پر پہنچیں تو دلکش جملوں، عزت آموز مثالوں اور دلچسپ حکایتوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے عمیق ترین حقائق چٹکیوں میں حل ہوتے چلے جاتے، محفل پر کبھی جذب وکیف طاری ہوتا اور کبھی عقل وخرد کا رنگ، کبھی ایمان وعرفان کی کیفیت غالب ہوتی اور کبھی ذوق ووجدان کی، کبھی جنت کی شادابیوں کا ذکراور کبھی جہنم کی وادیوں کا تذکرہ، محفل میں رحمتِ حق کا ذکر آتا تو چہرے کھل اُٹھتے، عذابِ الٰہی کی بات چل نکلتی تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی، احترامِ انسانیت کا موضوع چھڑتا تو موتی لٹتے، تعلیمِ آدمیت کا مسئلہ آتا تو دریا بہتے، خدا کے عدل پر لب کشائی ہوتی تو چیخیں اُبھرتیں، اس کے فضل پر زبان کھلتی تو باچھیں کھل جاتیں، غیرت فقر کا موضوعِ نوکِ زبان ہوتا تو بوریا نشینوں اور خرقہ پوشوں کے سر میں سکندر کا دماغ آجاتا، خدمتِ خلق کی بحث نطق آشنا ہوتی تو پندار وناموس کے آبگینے چھنا کے سے ٹوٹ جاتے۔

الغرض صوفیاءِ کرام کی باتیں ایجاز واختصار کا بہترین مرقع ہوتیں، قطرے میں دریا اور ذرے میں صحرا کو انہوں نے سمو کر دکھایا، صوفیا کی مجالس ومحافل میں اپنی اور غیروں، امیروں اور غریبوں، شہریوں اور دیہاتیوں، عالموں اور جاہلوں، گوروں اور کالوں، نیکو کاروں اور گناہ گاروں کی یکجائی کا عجب سماں ہوتا، نہ تنقید نہ تعریض، نہ طنز نہ استہزاء نہ مناظرانہ پن اور نہ دلآزاری۔ بات وہی کہی جو ہر دل کی تھی، نصیحت سے معمور اور عبرت سے بھرپور، صوفیاءِ کرام کی مجالس گویا صحرا کے پاپیادہ مسافروں کے لئے گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں ہوتی، اور عمر بھر کی تھکاوٹ دور ہوجاتی، ان کا اندازِ تربیت اور طریقۂ اصلاح کیا تھا؟ اس کا اندازہ ان کے ملفوظات سے ہوتا ہے اور ان کے موضوعات علمی وفنی نہیں،

تبلیغی و اصلاحی ہوتے تھے۔احترامِ انسانیت،توکل،توبہ،خوفِ خدا،اخلاص،ایثار،تقویٰ، محبت،خدمتِ خلق اور عجز و نیاز ان کے دل پسند اور مرغوب موضوعات تھے، چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں، دہلی میں خانوادہ چشت کے عظیم صوفی بزرگ حضرت نظام الدین دہلویؒ کی محفل آراستہ ہے، اللہ والوں کے مزاج کی بات چھڑی تو آپ نے فرمایا :

''ایک شخص بڑی محبت کے ساتھ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی خدمت میں تحفے کے طور پر چھری لے کر آیا آپ نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا تمہاری اس محبت پر شکرگزار ہوں' مگر مجھے چھری نہ دو، پھر کبھی آنا تو چھوٹی سی سوئی لیتے آنا کہ اللہ والے کاٹنے کا کام نہیں کرتے جوڑنے کا کام کرتے ہیں''۔

ایک بار شیخ بہاؤالدین نقشبندؒ کی مجلس سجی تھی' علم و عمل کی یکجائی اور اس کا لازم وملزوم ہونا زیربحث آیا، آپ نے فرمایا :

''تو شمع کی طرح بن اور شمع کی طرح نہ بن' لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی اور انہوں نے وضاحت چاہی۔آپ نے فرمایا ''شمع کی طرح بن'' کا مطلب ہے کہ دوسروں کو روشنی پہنچاؤ اور شمع کی طرح نہ بننے کا معنی ہے کہ اس کی طرح خود روشنی سے محروم نہ رہو''۔

توکل کیا ہے؟ اور توکل کی روح کیا ہے؟ حضرت ابوبکر شبلیؒ نے ایک بار ارشاد فرمایا :

''ایک بار ایک شخص میرے پاس آیا اور مجھ سے اپنے کثیرالعیال ہونے کی شکایت کی۔میں نے اس سے کہا ان افراد کو گھر سے نکال دو جن کا رزق اللہ کے ذمہ نہیں' تم صرف انہی کی کفالت کرو جن کی رزق رسانی تمہارے ذمے ہے، یہ سن کر اسے ساری بات سمجھ میں آ گئی اور چل دیا''۔

خرقِ عادت واقعات کے ظہور اور کرامات کے صدور کا خوش عقیدہ حلقوں میں بڑا چرچا رہتا ہے اور اسے معیارِ تقویٰ اور بزرگی سمجھا جاتا ہے، مگر اس خیال کی بڑی یقین افروز

وضاحت حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبند نے بہت ہی معنی خیز اور حسن کارانہ انداز میں فرمائی ہے۔ بعض لوگوں نے آپ سے کرامت کے ظہور کی بات کی، آپ نے فرمایا :

"میری یہی کیا کم کرامت ہے کہ اتنے گناہوں کے باوجود میں زمین پر چل پھر رہا ہوں"۔

صوفیاء کے ہاں "خود بینی" کے بجائے "خود شکنی" رویہ زیادہ نظر آتا ہے اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کی جگہ "ہیچ میرزی" کا چلن عام ہے، خوانہ نظام الدین دہلویؒ کی ایک ایسی مجلس کا ایک گوشہ ملاحظہ ہو' آپ نے فرمایا "جسے دیکھو اور جس سے ملو اسے اپنے سے بہتر سمجھو' اگرچہ تم اطاعت گزار ہو اور وہ گناہگار ہو، ہوسکتا ہے یہ تمہاری آخری اطاعت ہو اور وہ اس کا آخری گناہ، تم اس کے بعد گناہگار بن جاؤ اور وہ اطاعت شعار"۔

شعلہ و شبنم کی یکجائی اور آتشِ شوق اور بارانِ اشک کی ہم آغوشی جیسی مجازی کیفیت کو شیخ ابوبکر شبلیؒ نے حقیقت کے انداز میں کیسے بیان فرمایا، ایک جملہ دیکھئے، آپ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، قریب ہی گیلی لکڑیاں جل رہی تھیں ایک طرف آگ تھی اور دوسرے سرے سے پانی رس رہا تھا، آپ کا ذہن فوراً اس طرف متوجہ ہوا اور فرمانے لگے :

"اگر یہ بات سچ ہے کہ تمہارے دل آتشِ عشق الٰہی میں جل رہے ہیں تو تمہاری آنکھوں میں آنسو رواں کیوں نہیں ہوتے؟"

لوگ نہ جانے عقل و دولت کسے کہتے ہیں؟ اس کی کیا علامات ہیں؟ اور اس کا مدار و معیار کیا ہے؟ اس باب میں شیخ ابوعلی محمد بن عبدالوہابؒ کا نقطۂ نظر بصیرت افروز بھی ہے اور نصیحت آموز بھی۔

اُف ہے دنیا کے کاموں پر جب وہ اُمڈ کر آجائیں اور اُف ہے دنیا کی حسرتوں پر جب وہ جاتی رہیں، عقل مند ایسی چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، کہ آئیں تو مشغولیت کا سبب بنیں اور جائیں تو حسرت دے کر جائیں"۔

"اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرو"۔ یہ حکمِ الٰہی ہے، کتنا خرچ کرو؟ اس کی وضاحت متعدد احادیثِ رسول ﷺ سے ملتی ہے اور احکامِ الٰہی تفصیل کے ساتھ درج ہیں، صوفیا کس نظر سے دیکھتے ہیں، جس نے پوری دنیا کا سکون چاٹ رکھا ہے اور دماغ اُڑا رکھا ہے، حضرت ابوبکر شبلیؒ کا انداز لائقِ توجہ ہے، آپ سے کسی نے پوچھا زکوٰۃ کب اور کتنی واجب ہے؟ آپ نے فرمایا مذہب فقہاء کی رو سے پوچھ رہے ہو یا مذہب فقراء کے حوالے سے؟ سائل نے کہا دونوں طرح سے ارشاد فرمائیے۔ جواب دیا، فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ سال گزرنے پر ۱۰۰ (سو) درہم میں سے ڈھائی درہم نکال دو، اور فقراء کا مشرب یہ ہے کہ جو کچھ مال و دولت ہو سال بھر کا انتظار کیے بغیر خدا کی راہ میں اور اس مخلوقِ خدا پر خرچ کر دو۔

انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے، مل جل کر رہتا، معاملات کرتا، اور کچھ لو اور کچھ دو کے انداز میں زندگی گزارتا ہے، اس کے کچھ فرائض ہیں اور کچھ حقوق۔ فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی برت جاتا ہے مگر حقوق طلب کرنے میں بہت مستعد ہوشیار ہے، انسانوں کی بستی میں مفادات ٹکراتے بھی ہیں اور تحفظات آڑے بھی آتے ہیں، جھگڑے بھی اُٹھتے ہیں اور فتنے بھی پیدا ہوتے ہیں، یہ ایک عمومی صورتحال ہے مگر صوفیا کرام اس بارے میں جداگانہ رویہ رکھتے اور انداز اپناتے ہیں، وہ زندگی کو تجارتی بنیادوں پر استوار نہیں کرتے اور نہ لو اور دو کے اُصول اختیار کرتے ہیں بلکہ ان کے ہاں ایثار، مروّت، اخوت، احسان، اور ترک و توکل کا چلن زیادہ ہوتا ہے، وہ "بھلا کر بھلا ہوگا" کو فقیرانہ صدا قرار دیتے ہیں جبکہ مومنانہ انداز ان کے ہاں "سب کا بھلا" خواہ کوئی بھلا کرے یا برا یہ بھلائی کا دامن کسی صورت نہیں چھوڑتے، دوستوں پر گلہ اور زمانے پر شکوہ ان کے نصابِ زندگی میں شامل ہی نہیں، اسی نظریے کو حضرت جنید بغدادیؒ اس طرح الفاظ کا قالب عطا کرتے ہیں، فرمایا:

''کوئی شخص اس وقت تک عارف وکامل نہیں بن اور کہلا سکتا جب تک کہ وہ زمین کی طرح نہ ہو جائے کہ نیک و بد اس پر چلتے اور وہ ہر ایک کے سامنے بچھتی ہے، اور بادل کی طرح نہ بن جائے جو ہر جگہ سایہ کرتا ہے خواہ گلستان ہو یا صحرا اور بیابان، اور سورج کی طرح نہ بن جائے جو ہر ذرے کو روشن کرتا ہے اور شہر و دیہات میں امتیاز نہیں برتتا، اور بارش کی طرح نہ بن جائے جو ہر چیز پر برستی ہے، پھولوں پر بھی اور کانٹوں پر بھی''۔

''مجالسِ مسیح الامت'' اسی متن کی شرح' اسی اجمال کی تفصیل' اسی نقطہ کی توضیح اور انہی اہداف کی پیش رفت ہے۔ مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان ؒ کے ارشادات' مواعظ' فرمودات' مجالس اور تمثیلات' تصوف و طریقت کی روح اور باطنی علوم و معارف کا خلاصہ اور مکھن ہیں۔

مجالس مسیح الامت ایک خاص اسلوبِ حیات اور اندازِ فکر کو واضح کرتی ہیں، اور یہ اسلوب بہت حیات بخش اور یہ انداز بہت مثبت ہے، بشرطیکہ لوگ اسے محض ''ملفوظات'' نہ سمجھ لیں بلکہ زندگی کے ''معمولات'' بنالیں' اگر ایسا ہو جائے تو انسان کے ہاتھ وہ فردوس گم گشتہ آ سکتی ہے، جس کی تلاش میں صدیوں سے محوِ سفر اور بھٹک رہا ہے، ان باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیا و اولیاء صرف محیر العقول واقعات رونما نہیں کرتے اور نہ یہ ان کا بنیادی منصب ہے بلکہ وہ ایسا اندازِ حیات اپناتے ہیں جو ان کے لئے موجب عافیت اور دوسروں کے لئے ذریعۂ منفعت ہے اور یہی اللہ والوں کا بہتر تعارف اور نمایاں تشخص ہے۔

عبدالقیوم حقانی

صدر القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ

۱۷رصفر المظفر ۱۴۲۹ھ/ ۲۵رفروری ۲۰۰۸ء

پیش لفظ

الحمد لحضرة الجلالة والصلوٰة والسلام علی خاتم الرسالة اما بعد !

دینِ اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی کامیابی کے لئے ایک ضابطۂ حیات ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن یکساں ہو، ظاہر کے درست کرنے والے کا نام علمِ فقہ ہے اور باطن کے درست کرنے والے کو علمِ تصوف کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں ایک شریعت ہے تو دوسرا طریقت' ایک ظاہر ہے تو دوسرا باطن' ایک صورت ہے تو دوسرا معنیٰ' ایک چھلکا ہے تو دوسرا مغز' ایک علم ہے تو دوسرا حال' ایک ہوشیاری ہے تو دوسرا مستی' ایک مذہب ہے تو دوسرا مشرب' ایک عقل ہے تو دوسرا عشق' دونوں ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے کتاب لکھی ہے "شریعت و طریقت کا تلازم" اگر اس کو سیدھا راستہ اور راہ استوار کا نام دیا جائے تو جائز ہوگا۔ نیز دینِ خالص اور سلامتی کے راستے سے ملقب کیا جائے تو روا ہوگا اور اگر دعوتِ حق اور راہِ نجات کہیں تو بھی درست' اور میزانِ اعتدال اور دستور العمل گردانیں تو بھی صحیح ہے۔

مشائخ و صوفیاء ہر دور میں اپنے مریدین کی تربیت کرتے رہتے ہیں اور ان کے اصلاحِ حال کے لئے مختلف نسخے اور طریقے اختیار فرماتے ہیں۔ اکثر مشائخ عظام کے ہاں مجلس منعقد ہوا کرتی ہے اور اس مجلس میں اپنے مریدین' متعلقین

اور عامۃ المسلمین کو قیمتی مواعظ و نصائح سے نوازتے رہتے ہیں۔ پھر یہی مواعظ و نصائح کتابوں کی شکل میں مرتب کئے جاتے ہیں۔ اس طرح اس کا نفع اور بھی عام ہوتا ہے۔
''مجالس مسیح الامت جلد دوم'' بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک زرّین کڑی ہے۔ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان رحمہ اللہ' حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اجل خلفاء میں سے ہیں۔ آپ کے مجالس و مواعظ دنیا بھر میں مشہور ہیں اور سینکڑوں لوگ استفادہ کر کے اپنے باطن کی اصلاح کر چکے ہیں۔

''مجالس مسیح الامت'' کو نئے انداز میں مرتب کرنے اور شائع کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے القاسم اکیڈمی کو دی ہے۔ اس کے محرک حضرت مسیح الامتؒ کے خلیفۂ اجل' ہمارے بزرگ الحاج محمد ابراہیم تسبیح والا ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے کہ انہوں نے اس عظیم کام کے تمام مصارف اپنے ذمے لیئے اور اشاعت وتقسیم کے لئے ہم فقیر طالب علموں کو اہل سمجھا۔ واجرھم علی اللّٰہ۔

قارئین نے بھی ''مجالس مسیح الامت'' جلد اوّل پڑھ کر ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ دوسری جلد اسی سلسلۂ تشجیع کی پیش رفت ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ دوسری جلد سے بھی بھرپور استفادہ کر کے اپنے باطن کو سنواریں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ واجمعین۔

عبدالقیوم حقانی

۲۴ رجمادی الاوّل ۱۴۳۱ھ/ ۸ رمئی ۲۰۱۰ء

پہلی مجلس

مقامِ علم

علماء کو خطاب ہوا تھا کہ عوام کا مدارِ اخلاق، عوام کی درستگی کا موقوف علیہ علماءِ کرام ہیں۔

صحابۂ کرامؓ حضور ﷺ سے تعلیم حاصل کرتے تھے :

ارشاد فرمایا : کل بیان میں عرض کیا تھا کہ کتابیں سامنے رکھ کر تعلیم لے اور استاد کتابیں سامنے رکھ کر تعلیم دے، تعلیم کا یہی مروّجہ طریقہ ہے۔ صحابۂ کرامؓ کے سامنے کونسی کتابیں تھیں، بغیر کتابوں کے رسالت مآب ﷺ کے درس میں حاضر ہوتے تھے او رعلم حاصل کرتے تھے۔

تحصیلِ علم کتابوں کے ساتھ مخصوص نہیں :

اس سے معلوم ہوا کہ مقصود و مطلوب علم کا حاصل کرنا ہے، تحصیلِ علم مقید اور کتابوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ حدیث میں طلبِ علم کا لفظ آیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْن۔ (کنز العمال ص ۱۳۸)
علم طلب کرو اگر چہ چین جیسے دور دراز ملک میں ہو۔

دوسری حدیث میں ہے:
طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِم۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۳۴)
علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد پر فرض ہے۔

ایک روایت میں وَ مُسْلِمَةٌ بھی آیا ہے یعنی عورت پر بھی فرض ہے۔

علم سے مراد علمِ دین ہے:

اور مراد علم سے علمِ دین ہے جو وحی جلی اور وحی خفی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ وحی جلی سے مراد قرآنِ پاک ہے اور وحی خفی سے مراد حدیث شریف ہے اور فقہ، مسائل اور احکام جو قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں وہ بھی وحی ہی کی تعلیم ہے۔

قرآن کی آیت سے بھی علم کی واقعی حقیقت اور حصولِ علم کی اہمیت عجیب وغریب انداز کے ساتھ ثابت فرمائی ہے۔

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: جب جہاد کا حکم ہو سب کے سب جہاد میں نہ چلے جاویں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً ۚ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۔ (پ ۱۱ ع ۴)

اور مسلمانوں کو یہ (بھی) نہ چاہئے کہ (جہاد کے واسطے) سب کے سب (ہی) نکل کھڑے ہوں سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے (اور بقیہ اپنے وطن میں رہ جایا کریں) تا کہ (یہ)

باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تا کہ یہ لوگ اپنی (اس) قوم کو (جو جہاد میں گئے ہیں) جبکہ وہ ان کے پاس واپس آویں ڈراویں تا کہ وہ احتیاط رکھیں۔

دیکھئے ! اس آیت میں علم کی اہمیت جہاد کے مقابل میں بیان کی گئی کہ ایک جماعت کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں محبوس رہنا ضروری ہے۔

جہاد کے ذریعہ اسلام کی نشر واشاعت :

جہادِ علمی بمقابلہ کفار زبردستی ایمان لانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اشاعت ونشرِ اسلام کے لئے اور دین کی طرف آنے والوں کے لئے رُکاوٹوں کو دفع کرنا، ان کا انسداد کرنا، جہاد کا مقصود ہے، جہاد سے مراد مؤمنوں کی جان، مال، عزت اور آبرو کا خیال رکھنا ہے جو ایمان کی طرف آنا چاہتے ہیں ان کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔

خود جان کر اپنے کو تکلیف میں ڈالنا یہ اسلام میں منع ہے، مقصود حاصل ہووے نا ور خود کو تکلیف میں ڈال دینا یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسی لئے تیرہ سالہ حیات مبارکہ (مکی زندگی) نہایت ہی مجاہدوں اور ریاضتوں کے ساتھ گزاری گئی تا کہ نفسانیت باقی نہ رہے، اور ہر کام رضاءِ الٰہی کے لئے ہو، تو مکی زندگی کا دارومدار اخلاقیات اور جہاد بالنفس پر تھا، تا کہ تمام اُمور یعنی تعلیم وتعلّم، ظاہر وباطن، انفرادیت واجتماعیت، معاشرت و معاشیات ہر کام من حیث العادات والاخلاق صرف رضائے الٰہی کے لئے رہ جاے۔ دوسری کوئی اور چیز بیچ میں نہ رہے، اور ہر کام شریعت کے مطابق ہو۔ اسی لئے مکی زندگی میں خاموشی کے ساتھ تیرہ سال تک اخلاقِ جامعہ کے ساتھ تعلیمِ دین ہوتی رہی، اس کے سوا کوئی عبادت نہ تھی۔ نماز ہجرت سے ایک سال قبل فرض ہوئی ہے اور روزوں کی فرضیت بعدِ ہجرت ہوئی ہے۔

اب بعد الہجرت بحصولِ مرکزیت جب تعلیم میں غیروں کی طرف سے رُکاوٹیں

آنے لگیں اور مومنوں کو ستایا جانے لگا، ان کو روکا جانے لگا، تب جہادِ عملی مشروع ہوا کہ اب جو بھی عمل ہو گا وہ بحدودِ شرع رضاءِ الٰہی کے لئے ہو گا اپنے لئے نہ ہو گا۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں : اب میری پوری تائید ان کے ساتھ ہو گی سکون یعنی غیروں سے بے التفاتی یہ ان کے قلب میں دوسری جانب سے آگیا سکینہ میری جانب سے نازل ہونے کا گویا قلب محل ہو گیا۔

تو یہ جہاد زبردستی ایمان لانے کے لئے نہیں بلکہ تبلیغ میں رُکاوٹ کو ختم کرنے کے لئے فرض ہوا ہے۔ پیش قدمی کو روکنے کے لئے جہاد فرضِ کفایہ ہے اور ہجومِ دشمن کے وقت فرضِ عین ہے۔

جہاد کے لئے مرکزِ علّت اور تقویٰ شرط ہے :

جہاد کے لئے تقویٰ شرط ہے اور مرکزیت ہونا علت ہے۔ محض شرط کے پائے جانے پر جہاد فرض نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ کا ارشاد :

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ۔(پ۵ع۱۲)

بلاشبہ نماز مسلمانوں پر ایک مقررہ وقت میں فرض کی گئی ہے۔

یہ ارشاد علت ہے اگر یہ ارشاد نہ ہوتا تو نہ نماز ہوتی نہ وضو ہوتا۔ اسی طرح مرکزیت کا ہونا جہاد کے لئے علت ہے اگر یہ نہیں تو جہاد فرض ہی نہیں اور تقویٰ شرط ہے تقویٰ سے سکون آتا ہے اور مرکزیت کے حاصل ہونے پر ایک قوتِ خاص منجانب اللہ مع سکینہ آتی ہے، خواہ الہامی طور پر قلب میں سکینہ پیدا فرمادیں یا ظاہری طور پر فرشتوں کے نزول کے ذریعہ۔

تائیدِ ظاہری بھی باعثِ تقویت ہے :

تائیدِ ظاہری سے بھی شرع میں تقویت ملتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو

جب حق تعالیٰ نے فرعون کی طرف بھیجنے کے لئے فرمایا :

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔(طٰہٰ:۲۴)(اب تم فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ بڑا سرکش ہوگیا ہے) فرعون کے پاس (تبلیغ کے لئے) جاؤ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا مجھے ڈر لگتا ہے، فرعون بڑا سخت ظالم ہے، مجھ سے ایک اس کی قوم کا آدمی بھی مارا گیا ہے، کیا اچھا ہو کہ میرے گھر کا آدمی جس پر مجھے اعتمادِ کامل ہے جو کہ میرا بھائی ہارون ہے اسے میری قوتِ بازو کے لئے ساتھ بھیج دیجئے۔ ارشاد ہوا، بہت اچھا ہم نے ان کو نبوت دے کر تمہارے ساتھ کردیا۔

الغرض ظاہری تائید سے بھی سکینہ پیدا فرماتے ہیں خواہ کسی انسان سے ملائکہ سے یا بلا واسطہ باری تعالیٰ ایسا الہام وارد فرما دیتے ہیں کہ قوتِ قلبی حاصل ہوجاتی ہے۔ کبھی ظاہری سکون کے ساتھ سکینہ نازل فرماتے ہیں جیسا کہ غزوۂ احد میں نیند غالب کردی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا ۔ کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین (بشکل) اونگھ بھیج دی جس سے سکون ہوگیا، ساری تھکان دور ہوئی اور اونگھ سے طبیعت ہلکی پھلکی ہوگئی۔

حصولِ علم کی اہمیت جہاد پر :

جہاد نشرِ اسلام میں رُکاوٹ کو دور کرنے کے لئے مشروع ہوا ہے' لیکن اس کے باوجود "علم دین" کی اس درجہ اہمیت ہے کہ سب کو جہاد میں نکل جانے سے منع فرمادیا بلکہ حکم ہوا کہ حصولِ علم کے لئے بھی ایک جماعت نبی ﷺ کے پاس رہنی چاہئے۔

علمِ طریقت کی اس درجہ اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اگر علم صحیح طور سے بحدودِ شرع نہیں ہے تو جہاد مرضیٔ مولیٰ کے موافق نہیں ہوسکتا۔

یہ بات ضمناً اس لئے آئی تھی کہ ایسا مت کرنا کہ جب نفیرِ عام جہاد کے لئے نہ ہو تو سب کے سب نکل جائیں بلکہ ایک جماعت تم میں سے علمِ دین حاصل کرنے کے لئے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے اور ایک جماعت جہاد کے لئے جائے، جب تم تحصیلِ علم میں ہو تو علم کا حاصل کرنا بھی نفس پر بار ہوتا ہے تو تحصیلِ علم بھی جہاد ہے کیونکہ تحصیلِ علم میں رُکے ہوئے ہیں، پابند ہیں، آزادی سلب ہوتی ہے تو اس جہادِ نفسانی کے لئے جہادِ علمی میں رُکے رہو، سب کے سب مت نکل جاؤ۔ معلوم ہوا کہ علم کا حاصل کرنا بہت ہی غایت درجہ کی اہمیت رکھتا ہے اور آگے کیا فرمایا اس کو بھی دیکھو کہ جو جہاد کرنے والے چلے گئے تھے، جب لوٹ کر آویں تو موجودین نے آپ ﷺ کے دربار میں رہ کر جو علم حاصل کیا ہے وہ اس جہادِ جسمانی سے واپس آنے والوں کو انذار کریں یعنی دینی فہمائش، صحیح افہام و تفہیم کے ساتھ ان کے شاگرد ہو گئے۔ واسطہ در واسطہ اس طرح کہ یہ تو شاگرد بنے۔ رسول اللہ ﷺ کے اور وہ شاگردان کے بنے۔ آیت میں لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ جمع کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدمتِ نبوی میں رہنے والے فقہ (دین کی سمجھ) حاصل کریں۔

فقہ دین کی فہم کو کہتے ہیں:

فقہ کہتے ہیں دین کی باریکیوں کو سمجھنا جس میں استنباطی طاقت اور موقع محل کا پہچاننا بھی ہو۔ اگر تمہارے مقابلہ میں کوئی علمی گفتگو کے لئے آجائے تو ابلاغِ حق میں دباؤ نہ پاؤ، نہایت ہی آزادئ طبع کے ساتھ بحسنِ اخلاق ان کو جواب دو۔

سرسری علم کافی نہیں:

سرسری علم کافی نہیں بلکہ گہرائی اور عمق کے ساتھ تحصیلِ علم ہونا چاہیے۔ صرف وسعتِ نظری پر اکتفاء نہیں بلکہ وسعتِ نظری کے ساتھ عمقِ نظری اور گہراؤ بھی ضروری ہے۔

حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

فَقِيْهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۳۴)

ایک ہزار عابدوں کو بہکانا تو آسان ہے، ایک فقیہ کو بہکانا مشکل ہے۔ شیطان کے پاس علم تو تھا مگر فقیہ نہ تھا اس لئے بہکاوے میں آ گیا۔ نیز شیطان کا استاد نفس تھا، اس میں حب جاہ تھا، اخلاق کی تصحیح نہیں ہوئی تھی، صرف حصول علم تھا اس لئے بھی بہکاوے میں آ گیا۔

اہلِ علم کیلئے اخلاقیات کی اہمیت :

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ طالب علم کے لئے حُسنِ اخلاق کی کتنی اہمیت ہے۔ اخلاقِ حمیدہ محمودہ جتنا بلند ہوگا اس کے بالمقابل اخلاقِ ذمیمہ کا ازالہ ہوگا، غفلت ختم ہو کر ملکۂ یادداشت میں تیزی آئے گی اور اتنا ہی نفس کے بہکاوے سے محفوظ رہے گا۔ شیطان کو علم تھا، اس کو تفقہ نہیں تھا بس نفس کے بہکاوے میں آ گیا تو طالب علم کو علم کا حصول اس درجہ کے گہراؤ کے ساتھ ضروری ہے کہ ابلاغِ حق میں آزادی حاصل ہو، دباؤ محسوس نہ کرے۔

تحقیقی، تعمیقی علم ضروری ہے اور اس زمانہ میں تو اور بھی تحقیق و تدقیق سے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دشمنانِ اسلام واعداءِ دین میں علمِ سائنس کا بہت چرچا ہے۔ ان کے دماغ سائنسی اور مزاج فلسفی ہو گئے ہیں، اعداءِ دین سائنسی دلائل کے ساتھ بالمقابل آنے لگے ہیں۔ لہٰذا طلبہ کو علم کی تحصیل خاص کر اس زمانہ میں گہراؤ کے ساتھ کرنا چاہئے۔

منطق وفلسفہ کی ضرورت :

علمِ منطق اور فلسفہ اور ہیئت کا حصول اشد ضروری ہے۔ اساتذہ کو فلسفہ اور عقائد

کے مسائل فلسفی اور منقولی انداز میں سہل طریقہ سے سمجھانا بہت ضروری ہیں ورنہ اغیار کا بہکانا بہت آسان ہو جائے گا اور عالم اسلام ان کے بہکاوے میں آ کر شبہ میں پڑ جائے گا۔

اور یہ بہکانے کا طریقہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ صحابۂ کرامؓ کو کفار بہکایا کرتے تھے، مثلاً یہ کہ بھلا یہ کونسی بات ہے؟ کہ خدا کا مارا ہوا حرام اور اپنا مارا ہوا حلال یعنی طبعی طور پر جانور مر جاوے تو خدا کا مارا ہوا ہے وہ تو حرام اور اپنا مارا ہوا (ذبح کیا ہوا) حلال۔

(تفسیر کبیر ج ۱۱ ص ۱۳۲)

کہتے تھے ارے تمہارے رسول تمہیں استنجا کرنا، پیشاب، پاخانہ کرنا بھی سکھاتے ہیں یہ کتنی ہلکی بات ہے لیکن صحابۂ کرامؓ جو پختہ ہو چکے تھے جواب دیتے تھے کہ ہاں ہمیں پہلے ہگنا موتنا بھی نہ آتا تھا کہ کس طرح ہگنا موتنا چاہئے۔ (مشکوٰۃ باب آداب الخلاء ص ۴۲)

شریعت کے حکم کے مطابق استنجا بھی عبادت ہے:

بحق شرع علم صحیح کے ساتھ استنجا کرنا عبادت میں داخل ہے اور بحد شرع استنجا کرنے میں جو قرب حاصل ہے اس کے مقابلہ میں ہزاروں کشف، ہزاروں کرامتیں کچھ نہیں۔

تو صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں بیچارے نئے مسلمانوں کو اس طرح بہکایا جاتا تھا اور آج تو یہ بہکاوے کی چیز بہت دور کر رہی ہے اس لئے ہمیں علم میں مضبوطی کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ تعجب ہے کہ ادھر (غیر مسلموں) میں تو علم کی اشاعت اور پھیلاؤ بہت ہو رہا ہے اور ہم اس میں اختصار کرتے جاتے ہیں یہ بڑی کمی کی بات ہے۔

اصحابِ صفہ:

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک چبوترا تھا، جس کو عربی میں صفہ کہا جاتا ہے۔ اسی صفہ میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں طلبہ کا قیام رہتا تھا، اور حصولِ علم میں مشغول

رہتے تھے ان کو اصحابِ صفہ کہا جاتا ہے۔

طلبہ کا دارالاقامہ میں قیام :

اسی لئے رہائشی دارالاقامہ (بورڈنگ) مدرسہ میں ہونا چاہئے اور کھانے کا انتظام بھی منجانب مدرسہ ہونا چاہئے۔ اگر ہو سکے تو نظامِ مدرسہ کے تحت بستی کے طلبہ کا بھی دارالاقامہ میں ہی قیام رہنا چاہئے کیونکہ وہاں رہ کر جو وقت کی پابندی ہوگی گھر جا کر نہیں ہوسکتی، پھر پڑھے ہوئے سبق کا تکرار جس پابندی کے ساتھ وہاں رہ کر ہوگا گھروں سے آ کر نہیں ہوسکتا کیونکہ مدرسہ میں تعلیمی نگرانی آسانی سے ہوتی ہے۔

بھوک کا برداشت کرنا :

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اصحابِ صفہ میں سے تھے۔ فرماتے ہیں کہ طلبِ علم میں بعض وقت کھانا بھی نہیں ملتا تھا، شدتِ بھوک سے چکر آتے تھے اور بے ہوش ہو کر گر پڑتا تھا، لوگ سمجھتے تھے کہ جن آ گیا ہے اس لئے زمانۂ جاہلیت کے عقیدے کے موافق لوگ میرا کان مروڑتے تھے حالانکہ وہ صرف بھوک ہوتی تھی۔

تو دیکھو ! اصحابِ صفہ طالب علم تھے، ان کو پورا کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ آج پورا ملنے پر بھی شکایت ہوتی ہے جو طلبہ کی شان سے ازبس بعید ہے۔

علم کا تقاضا حلم ہے :

تو علم کے کچھ تقاضے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا، انہی تقاضوں میں سے ایک تقاضا حلم بھی ہے۔ علم کا تقاضا حلم ہے نہ کہ آپس میں جھگڑنا باہمی تنازع کرنا۔

اختلاف کے حدود :

اختلاف بدلائل، درجہ علم میں ہوتا ہے۔ استاد و شاگرد کے درمیان بھی ہوتا ہے،

دیکھئے امام صاحبؒ کچھ فرما رہے ہیں اور امام ابو یوسفؒ کچھ اور فرما رہے ہیں، اُس زمانہ میں اجتہادی مسائل میں اختلاف ہوتا تھا۔ آج کل اجتہادی مسائل کا دروازہ تو بند ہو گیا مگر انتظامی اُمور میں تو اجتہاد باقی ہے، اختلاف بھی اور خلاف بھی لیکن تنازع کچھ نہیں۔

اور سنئے اختلاف کہاں نہیں ہوتا، اطباء (ڈاکٹروں) میں ہے، وکلاء میں ہے حکام میں ہے۔

حضرت علیؓ اور قاضی شریحؒ کا اختلاف مشہور ہے کہ زرہ کے چوری ہونے پر حضرت علیؓ نے باوجود خلیفہ ہونے کے قاضی شریحؒ کے یہاں دعویٰ دائر کیا تھا اور گواہی میں اپنے آزاد کردہ غلام قنبر اور اپنے بیٹے کو شہادت میں پیش کیا تھا۔ قاضی شریحؒ نے فرمایا غلام تو آزاد شدہ ہے، اس کی شہادت تو قبول ہے لیکن بیٹے کی شہادت قبول نہیں۔ لہٰذا مقدمہ خارج۔ حضرت علیؓ یہ سن کر ہنسی خوشی واپس ہو گئے۔ یہودی نے یہ حال دیکھ کر کلمہ شہادت پڑھ لیا: **اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدًا عبدهٗ و رسوله** اور اسلام لے آیا۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۲۹)

دیکھا آپ نے ‘اللہ اکبر! حضرت علیؓ بڑے ذہین‘ بڑے حاضر جواب‘ شیخین ابوبکرؓ و عمرؓ کو جب کوئی مشکل پیش آتی تھی تو فرماتے تھے حضرت علیؓ کو بلاؤ، پھر عشرہ مبشرہ میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت دنیا میں ہی دیدی گئی تھی۔ تو کیا حضرت علیؓ میں جھوٹ کا احتمال ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں‘ اگر قاضی شریح سے قسم دے کر تنہائی میں پوچھا جاتا کہ حضرت علیؓ سچے ہیں یا جھوٹے؟ تو وہ قسم کھا کر یہ کہتے کہ علیؓ سچے ہیں لیکن میں کیا کروں؟ معاملہ اور حقوق کی بات ہے اور شرعی شہادت ضروری ہے، وہ میرے نزدیک نہیں اس لئے میں مجبور ہوں۔ بیٹے کی شہادت میرے نزدیک معتبر نہیں۔

ادھر حضرت علیؓ کو دیکھئے کوئی جرح، قدح نہیں کی کہ میرے نزدیک تو بیٹے کی

گواہی معتبر ہے، آپ کو ماننا پڑے گی، آپ میرے ماتحت ہیں، میں خلیفہ ہوں آپ میرے ہی مقرر کردہ قاضی ہیں وغیرہ ایسی کوئی گفتگو نہیں کی بلکہ یہ سوچ کر کہ اجتہادی مسئلہ ہے، قاضی کی رائے کو ترجیح ہوتی ہے، ہنسی خوشی واپس چلے آئے۔ کیا اچھا واقعہ ہے۔ علماء کو ایسا حق پرست ہونا چاہئے نہ ردّ و قدح اور تنازع کا عامیانہ طریق اپنانا چاہیے۔

پھر حضرت علیؓ کا حوصلہ تو دیکھئے کہ یہ منظر حق پرستی دیکھ کر یہودی کہہ رہا ہے کہ زرہ آپ ہی کی ہے، آپ لے لیجئے لیکن حضرت علیؓ لیتے نہیں، فرماتے ہیں کہ اب تمہاری ہوگئی تم ہی رکھو۔ معلوم ہوا کہ جس طرح اہلِ علم کو باحلم ہونا چاہئے اسی طرح علم کی شان بیان ہورہی تھی کہ حق تعالیٰ نے صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ایسا نہ کرو کہ جہاد کے لئے سب کے سب نکل جاؤ بلکہ ایک جماعت کو نبی ﷺ کی خدمت میں علم حاصل کرنے کے لئے رہنا چاہئے اور جب جہاد والی جماعت آئے تو جو کچھ سیکھا ہے آنے والوں کو سکھانا چاہئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ○

مدارسِ دینیہ کی بقا ضروری ہے کہ ان مدارس میں تفصیلی درس کی ضرورت ہے جو جڑ اور اصل ہے، اسی لئے بعض تقریروں میں مدارسِ دینیہ کو اسلام کے قلعے کہا جاتا ہے۔ یہ مدارس اسلام کی اشاعت کے قلعے ہیں۔

تدریس بالکتاب کی ضرورت ؟

چونکہ انحطاط کا زمانہ ہے، حافظے کمزور ہوتے چلے جارہے ہیں، ورنہ تو پہلے حافظے ایسے تھے کہ کسی نے سو، سو شعر کا قصیدہ پڑھا، دوسرے نے سُن کر فوراً سنا دیا، اب حافظوں اور ذہنوں کا ایسا حال نہیں رہا۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اصل طریق زبانی تعلیم تھی، اب چونکہ یہ طریق

قائم نہیں ہوسکتا، اس لئے علم کی تحصل کے لئے کتب کا ہونا ضروری ہوگیا اور مدارسِ عربیہ دینیہ میں کتابوں کے ذریعہ تعلیم دینے کا سلسلہ جاری ہے۔

خانقاہوں کی ضرورت :

مدارس بنیادی طور پر تعلیم میں مشغول ہوتے ہیں۔ لہٰذا تربیت کے لئے خانقاہ سے استفادہ حاصل کریں تو خانقاہ میں اہتمامِ تربیت ہے، تعلیم کا حصول مدارس میں ہو اور تربیت کا خانقاہ میں۔ چنانچہ بڑے بڑے علماء تعلیم درسی مدارس میں پاکر باہتمام شان تربیت کے لئے خانقاہ میں مقیم ہوئے اور مدتوں رہے۔

ایک اعتراض کا ازالہ :

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اُس وقت مربی تھے ہی ایسے کہ اصحابِ علوم وہاں مقیم ہوتے۔ اب ایسے مربی کہاں ہیں کہ وہاں تربیت کے لئے جائیں، اور مدارس کے اندر درس دینے والے بھی ویسے کہاں ہیں؟ کہاں ہیں مولانا گنگوہیؒ، مولانا یعقوبؒ، مولانا تھانویؒ جیسے۔ اگر خانقاہ میں خانقاہی تربیت دینے والے ویسے نہیں جیسے متقدمین تھے تو درسگاہوں کے اندر بھی اس اعتبار سے مدرسین نہیں ہیں، اگر خانقاہ کے اندر اقامت اختیار کرنا چھوڑتے ہو؟ تو درسگاہوں کا درس دینا بھی چھوڑ دو، جب اس کو نہیں چھوڑتے تو اس کو کیوں چھڑاتے ہو اور کیوں خانقاہ میں نہ جانے کی ترغیب دیتے ہو اور کیوں اس طرح کہتے ہو کہ خانقاہ میں جا کر وقت برباد کرنا ہے؟ اس انحطاط کے زمانہ میں جیسے مدارس والے ہمارے علم کے لئے کافی ہیں ایسے ہی اس انحطاط کے زمانہ میں تربیت دینے والے مشائخ خانقاہ کے اندر موجود ہیں، اگر اس کو ترک کرتے ہو، اس کو بھی ترک کردو، اس کو ترک نہیں کرتے تو اس کو ترک کرنا کیسا؟ زمانہ خالی نہیں ہے مگر یہ سب یہ خداع ہے۔

تربیتِ اخلاق مقدم ہے :

مدارس میں تعلیم کا التزام ہے، اور خانقاہ میں تربیت کا اہتمام ہے۔ تیرہ سالہ مکی زندگی میں تصحیح اخلاق کرائی گئی تھی اور وہ مشائخ کے یہاں خانقاہوں میں آئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

مجالسِ شیخ :

اور اس تربیتِ اخلاق کے ساتھ مشائخ کے یہاں تعلیم بھی ہوتی رہتی ہے، بشرطیکہ وہ شیخ صاحبِ فن ہو، فنِ تصوف باقاعدہ سیکھا ہو، ایسے شیخ کو حکم ہے کہ طالبوں کے پاس جم کر بیٹھے اور ان کو تعلیم دے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ. (پ ۱۵، ع ۱۶)

آپ ان کے ساتھ جم کر بیٹھئے جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں درانحالیکہ اپنے رب کو ہی چاہتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ شیخ کا ایک وقت ایسا ہونا چاہئے کہ جس میں باہر آ کر بیٹھے اور طالبینِ تزکیۂ نفس اس کے پاس آ کر جمع ہو جائیں جیسا کہ صحابۂ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر بیٹھتے تھے۔

مجلسِ شیخ میں جو طالبین تربیت کے لئے جمع ہوتے ہیں، امراضِ نفسانی دور کرنے کے لئے آتے ہیں اور مرضِ نفسانی ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ تو ہر ایک کا نسخہ بھی الگ الگ ہوتا ہے، پرہیز بھی الگ الگ ہوتا ہے، جیسا کہ درسگاہ میں استاد کتاب شرح وقایہ، ہدایہ کا درس دیتا ہے اس میں ایک عنوان کتاب الطہارت ہوتا ہے۔ اس میں صرف

استنجے کا ہی بیان نہیں ہوتا، استنجے کے لئے پانی کا بھی بیان ہے، پھر پانی کا بیان بھی مختلف طریقہ سے ہوتا ہے کونسا پانی پاک ہے، کونسا ناپاک، ناپاک کے پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ پاک پانی کی کیا پہچان ہے، اگر رنگ، بو، مزہ بدل گیا تو کیا حکم ہے؟ باب تو ہے طہارت کا لیکن اس کے ضمن میں بیانات مختلف ہوتے ہیں ایسے ہی طالبِ طہارتِ باطنی میں سے کسی کو کوئی بات پیش آرہی ہے، کسی کے اندر کوئی کمزوری ہورہی ہے، لہٰذا شیخ جب مجلس میں آکر بیٹھتا ہے تو مختلف امراضِ باطنہ پر اس کا کلام ہوتا ہے اور مختلف موضوعات پر کلام کرتا ہے، کبھی کسی واقعہ اور حکایت کے تحت بیان کررہا ہے، واقعات کے بیان میں ترغیب خاص ہوتی ہے اور قرآن و حدیث کا بھی یہی طرز ہے کہ واقعات و حکایات بھی آتے رہتے ہیں کیونکہ حکایت و واقعہ سے ترغیب و ترہیب ہوتی ہے۔ اسی لئے شیخ کی مجلس میں کبھی ترغیب کا مضمون بیان ہوتا ہے کبھی توہیب کا، کبھی تحضیض کا مضمون ہوتا ہے کہ مخاطب کو اُبھارو (تحضیض میں دونوں جگہ ضاد ہے جس کے معنی اُبھارنے کے ہیں، کبھی کبر کا بیان آجاتا ہے تو کبھی حسد کا ذکر آجاتا ہے کبھی قناعت کا آجاتا ہے تو کبھی اخلاص کا ذکر آجاتا ہے) یہ بیانات علمی نہیں تو اور کیا ہیں؟ تو بلا درسِ کتاب شیخ کی مجلس میں درسِ علمی بھی ہوتا رہتا ہے، تعلیم بھی چل رہی ہوتی ہے اور تربیت بھی ہورہی ہوتی ہے۔

تربیت وتزکیۂ نفس کی تعلیم :

مگر مفصل مسائل کی تعلیم نہیں کیونکہ یہاں تعلیم و تعلم متعلق بالتربیت ہے اور یہ تمام تعلیم و تربیت وہی ہے جو قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے :

لاتحاسدوا۔ (آپس میں حسد مت کرو)

لاتباغضوا۔ (آپس میں بغض مت رکھو)

اور قرآن میں ہے :

لَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا ۔(ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۔(بلاشبہ اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے۔

ان احادیث و آیات میں طہارتِ باطنی کا ذکر ہے تو تفصیلی ترجمہ اور معانی ظاہریہ مدرسہ میں ہوں گے اور انطباقی طریق کے ساتھ تعلیم بانطباقِ تربیت خانقاہ میں ہے، تعلیم وہاں ہوگی اور انطباق یہاں ہوگا، جانچ پڑتال یہاں۔ نگرانی محافظت اور احتساب کے لئے مقام خانقاہ ہے۔

حاسبوا قبل ان تحاسبوا۔ حدیث پاک ہے یعنی قیامت میں حساب لئے جانے سے پہلے تم اپنا جائزہ لیتے رہو، اپنے اعمال کا حساب کرتے رہو، نگرانی کرتے رہو، آخرت کا معاملہ اس علیم وخبیر کے ساتھ ہے، اس کو ہمارے حالات سب معلوم ہیں، لہٰذا اپنے اعمال کا احتساب کرتے رہو۔

اب سمجھو کہ شیخ بھی محتسب ہے وہ طالب کا جائزہ لیتا رہتا ہے اور احتساب کا طریق بھی بتلاتا رہتا ہے کہ نفس کا احتساب کن کن طریقوں سے کرنا چاہئے، اس کے لئے کونسا وقت موزوں ہے کیونکہ کسی کے لئے کوئی وقت موزوں ہے کسی کے لئے کوئی وقت موزوں ہے۔ تو شیخ محاسبہ کی تعلیم کرتا ہے اور ذکر کی بھی تعلیم بہیئت کذائیہ خاص ہیئت کے ساتھ کرتا ہے، جس سے قلب میں ایک خاص ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے۔

صحبت شیخ کامل کی ضرورت :

یوں تو قرآنِ پاک میں ہر وقت ذکر کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِکُمْ۔

اللہ کا ذکر کھڑے، بیٹھے، لیٹے کرتے رہو۔

لیکن شیخ ذکر کی ایک خاص ہیئت کذائیہ کے ساتھ تعلیم دیتا ہے، ایک خاص مقدار سے تعلیم دیتا ہے۔ فرصت، طاقت اور ہمت دیکھ کر شیخ ذکر کی تعلیم کرتا ہے، اور وقت کی بھی تعیین کرتا ہے۔ یہ خانقاہ کی تعلیم وتربیت ہے اور سب حدود کی باتیں ہیں، یہ اشغال، اذکار، مراقبات دین سے الگ نہیں ہیں، کسی کو آہستہ خفی ذکر کی تلقین کرتا ہے، کسی کو جہری اور کسی کو درمیانی آواز سے۔ کسی کو دل ہی دل میں یعنی ذکرِ قلبی، اللہ کا ارشاد ہے :

وَاذْکُرْ رَبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ۔ اللہ کو دل ہی دل میں یاد کرو۔

تو درسگاہ میں جو تعلیم ہوتی ہے خانقاہ میں اسی تعلیم کی انطباقیت ہے۔ وہ شریعت سے باہر نہیں ہے عنوان کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

مراقبہ قرآن وحدیث کی روشنی میں :

مؤمن کی زندگی کسی وقت بھی عبادت سے خالی نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔ (پ۲۷ع۲)

میں نے جن اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اس آیت میں حصر کے ساتھ فرمایا جارہا ہے کہ انسانوں کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ ''یہ مقدمہ تسلیم'' اور عبادت کا حکم بمراقبہ دیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے :

ان تعبد اللہ کانک تراہ فالم تکن تراہُ فانہٗ یراک۔

(مشکوٰۃ شریف ج۱ص۱۱)

تو اللہ کی اس طرح عبادت کر گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے، سو اگر تو اس کو نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

اس حدیث میں مراقبہ کا بیان ہے کیونکہ یہ دھیان قائم کرنا کہ میں اللہ کو دیکھ رہا

ہوں یا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اسی کو مراقبہ کہتے ہیں۔ الغرض یہ دوسرا مقدمہ بھی ثابت ہو گیا کہ عبادت کا حکم بمراقبہ دیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مؤمن کی زندگی کسی وقت بمراقبہ عبادت سے خالی نہیں۔ حدیث جبرئیل میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے صحابہ کو احکام سکھلانے کے لئے جہاں ما الایمان کہہ کر ایمان سے سوال کیا اور ما الاسلام کہہ کر اسلام سے سوال کیا پھر رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کا جواب دیا ہے: ما الاحسان کا سوال کیا کہ احسان کسے کہتے ہیں؟ تو حضور ﷺ نے جواب دیا: ان تعبدالله کانک تراہٗ اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو) یا ان تصلی (نماز پڑھو) یا ان تصوم فرمایا (روزہ رکھو)

ایک ضروری انتباہ :

حدیث میں دو جملے ارشاد فرمائے، پہلا ان تعبد الله کانک تراہٗ یعنی اس طرح عبادت کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر یہ مشکل ہو تو اے مؤمن! تیرا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہے، لہٰذا تیری عبادت اس طرح ہو کہ فانهٗ یراک کہ تجھے دیکھ رہا ہے، یہ تو آسان ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے اس تصوّر کو جماؤ۔

ذکرِ الٰہی قرآن وحدیث کی روشنی میں :

اب رہا ذکر تو ہر وقت ذکر کرنے کا حکم ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاذْكُرُو اللّٰهَ قِيَامًا وَ قُعُوْدًا وَ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ۔

کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اللہ کا ذکر کرو۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مطالبہ کیا ہے ہر وقت ذکر کا۔ نیز حصن حصین کی حدیث ہے :

کل مطیع الله فهو ذاکر۔ اللہ تعالیٰ کا ہر مطیع سو وہ ذاکر ہے۔

ذکر سے مراد صرف زبان پر کلمۂ شریف اور درود شریف اور تسبیحات پڑھنا نہیں بلکہ جو شخص جس وقت حکمِ الٰہی کے تحت مطیع بن کر کام کر رہا ہو تو وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہے، اگر چہ زبان پر ذکر نہیں ہے اگر چہ اس وقت دل میں اللہ کی یاد بھی نہیں ہے لیکن جو کام کر رہا ہے، اللہ کے حکم کے تحت کر رہا ہے تو ذاکر ہے بیوی کے پاس بحکم الٰہی جا رہا ہے، وہ بھی ذاکر ہے، گو اس وقت زبان پر ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر اطاعتِ کاملہ کرنے والا ذاکر ہے۔ اصل چیز اطاعت ہے۔

سو مراقبہ حدیث ان تعبد اللہ الخ سے ثابت ہوا اور ذکرِ دائمی قرآنِ پاک کی آیت اُذکروا اللہ الخ سے ثابت ہوا۔ اور کل مطیع اللہ سے معلوم ہوا کہ صرف ذکرِ لسانی کافی نہیں ہے جب تک اطاعتِ کاملہ نہ ہو۔

شغل کا مفہوم :

اب رہ گیا شغل تین چیزیں صوفیہ کی تعلیم میں ہوتی ہیں۔ اذکار، اشغال، مراقبات۔ دو کا بیان ہو گیا۔ شغل اسے کہتے ہیں کہ کسی چیز پر کوئی نفع خاص حاصل کرنے کے لئے آنکھ جما کر دیکھنا، پلک تک نہیں جھپکنا۔ بس اس طرح ٹکٹکی باندھ کر، آنکھ جما کر دیکھتے رہنا اس کو شغل کہتے ہین۔

شغل کے منافع :

اور دل میں دھیان اور خیالِ اللہ تعالیٰ جما کر ٹکٹکی باندھ کر خیال کرتے رہنا یہ نماز کے اندر بھی ہے کہ جب قیام ہو تو نگاہ سجدہ کی جگہ ہونی چاہئے جو کہ جمعیتِ خاطر اور دفع خطرات و خیالات کا ذریعہ ہے۔ جب ایک جگہ نظر جما کر دیکھے گا تو ادھر، اُدھر کے خیالات غائب ہو جائیں گے۔

چنانچہ یہ مسئلہ ہے کہ میدان میں نماز پڑھ رہا ہو اور لوگ سامنے سے گزر رہے ہوں تو سترہ کھڑا کرلے تاکہ یہ سترہ نمازی اور گزرنے والے کے سامنے آڑ ہوجائے اور اگر سترہ کے لئے کوئی چیز نہ ہو تو مصلّی اپنے سامنے خط کھینچ لے۔ تاکہ نگاہ محفوظ ہو، انتشار نہ ہو، وہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہو۔ اگر (گزرنے والے) کے لئے فائدہ نہیں ہے تو مصلّی (نماز پڑھنے والے) کے لئے فائدہ جو مقصود تھا ''جمعیتِ خاطر اور انتشارِ ذہنی سے حفاظت'' وہ حاصل ہوگیا۔

نماز، ذکر و مراقبہ اور شغل تینوں کی حاصل ہے :

نماز کے اندر اللہ اکبر سے لے کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک ذکر ہے اور اللہ دیکھ رہا ہے اس کا دھیان یعنی مراقبہ ہے اور نظر کو ہر رکن میں ایک خاص جگہ پر جمانا یہ شغل ہے تو نماز میں ذکر کی بھی تعلیم ہے، شغل کی بھی تعلیم ہے، وہی تعلیم جامعیت کے ساتھ اکمالاً اور اتماماً خانقاہ میں شیخ کی طرف سے ہے، یہ ہے وہ خانقاہ جس میں تعلیم بھی ہوتی ہے اور تربیت بھی ہوتی ہے، بدرجۂ اکمال، بدرجۂ اتمام۔

خانقاہوں پر ایک شبہ کا ازالہ :

اور کس کی تربیت ہوتی ہے؟ سچے، مخلص طالب کی کہ وہاں خانقاہ میں بھی ہر قسم کے لوگ آتے ہیں کہ حضور ﷺ کی خدمت میں بھی مختلف قسم کے لوگ تھے۔ کیا وہاں منافق نہیں تھے؟ کیا حضور کی خدمت میں حضور کے دربار میں منافق نہیں تھے؟ چھوٹے بڑے، ضرور تھے۔ اسی طرح خانقاہ میں بھی ایسے ہوتے ہیں پھر کیا تعجب کی بات ہے، ان ہی میں مخلص، سچے بھی ہوتے ہیں، وہی طالب کہلاتے ہیں، اگر اس کے برخلاف کوئی دوسری قسم کا نکل آوے تو خانقاہ پر کیا زد پڑی، حضور ﷺ کے دربار میں بھی، صفہ میں بھی وحی کے لکھنے والے بھی اور نفاق والے بھی تھے، گو اقل قلیل ہی سہی مگر تھے ضرور۔ احادیث

سے ثابت ہے، حالانکہ وہ زمانہ خیر کا زمانہ تھا۔ ارشادِ نبوی ہے :

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم یفشو الکذب۔ (مشکوۃ شریف ج ۲ ص ۵۵۴)

بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر ان کا جوان سے ملے ہوئے ہیں، پھر ان کا جو اُن سے ملے ہوئے ہیں، پھر جھوٹ پھیل جائے گا۔

تو زمانہ خیر میں جب ایسے لوگ موجود تھے تو اب کیا اعتراض ہے؟ یہ تو بہت ہی انحطاط کا زمانہ ہے، اب اس خانقاہ میں رہنے والے اگر کچھ ایسے ویسے لوگ ہوں تو اس کا اثر طالبین پر کیا خانقاہ پر کیا؟ اور اگر خانقاہ پر اس وجہ سے کچھ اعتراض ہے تو پھر مدرسہ اور درسگاہوں کے اندر تو بہت ہیں، درس صحیح لینے والے، کتاب کو صحیح افہام وتفہیم، اکمال واتمام کے ساتھ حل کرنے والے، سمجھنے والے، پابندی رکھنے والے ہمارے اس زمانہ میں بہت کم نکلیں گے۔ طالبِ صادق بہت کم ہیں، لہٰذا مدرسہ بند کر دو، جس درس کے اندر بیس ہیں تو شمار کرلو کہ طالبِ صادق، وقت کی پابندی کے ساتھ، استاد کی طرف نگاہ جما کر، حل کتاب کے ساتھ، تکرار کرانے کے ساتھ، تقریر سننے کے ساتھ کتنے ہیں، اگر خانقاہوں میں دو چار ایسے ہیں تو مدرسوں میں، درسگاہوں میں کتنے ہیں؟ خود دیکھ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ذہن میں ڈالا ہے، کہلوایا ہے اس لئے کہا جا رہا ہے۔ حالات کا جائزہ لیا جا رہا ہے، اگر بعض کی خانقاہوں میں خانقاہوں جیسی زندگی نہیں ہے تو مدرسوں میں بھی مدرسوں جیسی زندگی نہیں ہے تو کیا مدارس بند کر دیئے جائیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو دہریت پھیل جائے گی، پس اگر مدرسوں کی ضرورت ہے اور بالیقین ضرورت ہے اور بہت ہی زیادہ ضرورت ہے تو خانقاہ کی بھی ضرورت ہے اور اب تو بہت ہی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں پڑھانے والے شیخ یا کالشیخ ہوتے تھے اور پڑھنے والے بھی طالبِ صادق اور تقویٰ اور طہارت رکھنے والے ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود بھی خانقاہ میں پہنچتے تھے۔

پہلے طالب علم کیسے ہوتے تھے ؟

یہ مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلہ کے رہنے والے شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے یہاں پڑھنے گئے، فارسی وغیرہ پڑھ چکے تھے، مالا بدمنہ وغیرہ کتابیں اُن سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان کو پڑھ کر مسائل سے واقف تھے، شاہ صاحبؒ کی خدمت میں دہلی پہنچ گئے، اندر سے کھانا آیا، روٹی تو کھالی دال نہیں کھائی۔ جب دال کا برتن اندر پہنچا تو بیوی صاحبہ نے کہا افوہ یہ کون لڑکا آ گیا کہ روکھی روٹی کھانا تو منظور مگر دال کھانا منظور نہیں، روزانہ ان کے لئے گوشت ہونا چاہئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا میں تحقیق کرتا ہوں، بلا تحقیق کسی پر کوئی الزام لگانا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ چنانچہ باہر تشریف لا کر پوچھا، لڑکے! کیا کوئی پرہیز ہے؟ تم نے روٹی کھالی، دال نہیں کھائی، عرض کیا! نہیں حضرت! بس جی نہیں چاہا۔ فرمایا نہیں نہیں بتاؤ کیا بات ہے؟ عرض کیا حضرت! بات یہ ہے کہ دال میں کھٹائی پڑی تھی آم کی اور اس زمانہ میں بھی یہی طریقہ چلا آ رہا تھا کہ اکثر و بیشتر آموں کے باغات بلا پھل آئے ہوئے فروخت کر دیئے جاتے تھے اور اس کی بیع باطل ہے۔

عرض کیا کہ اس دال میں آم کی کھٹائی پڑی ہوئی تھی، اس لئے میں نے دال نہیں کھائی۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا، ہمارا کبھی ادھر خیال ہی نہیں گیا، اندر جا کر کہا اللہ میاں نے فرشتہ بھیج دیا ہماری اصلاح کے لئے۔ ہمارا کبھی اس طرف ذہن ہی نہیں گیا۔ بعض دفعہ جزئی ایسی ہوتی ہے کہ اچھے اچھے کی نظر اُدھر نہیں پہنچتی، چھوٹے کی نگاہ پہنچ جاتی ہے اور جب چھوٹا حق اور ٹھیک کہہ رہا ہے تو بڑے کو قبول کرنا چاہئے۔ یہی اکابر کا طریقہ چلا آ رہا ہے، اسی لئے شاہ صاحبؒ نے بھی اس چھوٹے کی بات قبول کر لی اور فرمایا کہ آئندہ سے بازاری آموں کا آنا منع ہے، جب تک تحقیق نہ ہو جاوے کہ پھل بکے ہوئے باغ کے ہیں یا بلا پھل کے بکے ہوئے کے ہیں۔

غور طلب بات ہے وہ طالب علمی کا زمانہ ایسا تھا اور اب ایسا زمانہ ہے کہ تاویلوں کے ساتھ جائز کرلیں گے۔ علم پورے اعمال کے لئے ایک بنیادی چیز ہے کہ علم بلا عمل کے ہو نہیں سکتا اور اگر ہوا تو قبول نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے علم کی اس درجہ اہمیت ہے کہ جب تم کو جہاد کا حکم ہو تو سب کے سب جہاد میں مت چلے جاؤ بلکہ تحصیلِ علم کے لئے آپ ﷺ کی خدمت میں بھی حاضر رہو اور جب وہ جہاد سے واپس آئیں تو ان کو تم تعلیم دو، جو تم نے سیکھا ہے ان کو سکھاؤ، جو تم کو علم آیا ہے وہ ان کو پہنچاؤ۔ جیسا کہ آیت: فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ ۔ (الآیۃ) کے تحت بیان کیا گیا، اور اسی اہمیت کو مزید در مزید ظاہر کرنے اور بتلانے کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا ہے :

من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع (مشکوٰۃ ج۱ ص۳۴)

جو طلبِ علم میں نکلا وہ جہاد میں ہے۔

فی سبیل اللہ کہتے ہیں جہاد کو، یہ محاورہ اور اصطلاح ہے، چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۔ (التوبۃ: ۳۸)

اے ایمان والو ! تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو۔

تو فی سبیل اللہ کہتے ہیں جہاد کے لئے نکل جانے کو، اور اس کو رسول اللہ ﷺ نے طالب علم کے لئے استعمال کیا ہے اور اس کو استعمال کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے طالبِ علم کے لئے ارشاد ہے :

من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع. (مشکوٰۃ ج۱ ص۳۴)

جو شخص علم کے حاصل کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلا وہ جہاد کے اندر ہے۔ وہ اللہ کے راستہ میں ہے۔

معلوم ہوا کہ طالب علم جہاد کرنے والوں میں سے ہے، مجاہدین میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ طالب علم جہاد کس سے کر رہا ہے؟ نفس سے کر رہا ہے اور جہاد میں کیا بات پیش آتی ہے اس کو یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

طالب علم مجاہد کیوں ہے ؟

شراح حدیث نے لکھا ہے کہ پہلی چیز جو جہاد میں پیش آتی ہے وہ اعلاءِ دین ہے جس کو اعلاءِ کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے کہ جہاد دین کی برتری کے لئے ہونا چاہئے تاکہ ملک و ریاست میں سو فیصد شرعی قانون ہو اور شریعت کے مطابق معاملات نمٹائے جاسکیں۔ نہ کہ ملک گیری اور ملک داری کے لئے دوسری چیز اذلال شیاطین ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ شیطان شام کو سمندر پر تخت بچھا کر بیٹھتا ہے۔ یہ استدراج ہے، کرامت نہیں۔

کرامت اور استدراج میں فرق :

معلوم ہوا کہ کسی سے کوئی نئی سی، جدید سی بات خلاف عادت ظاہر ہو جاوے اور وہ خلافِ شرع ہو' کرامت نہیں بلکہ استدراج دُھوکہ ہے۔ شیطان تمام کافروں میں اکفر اور دریا پر تخت بچھا رہا ہے اور تمام چھوٹے شیاطین جمع ہیں، تخت ڈوبتا نہیں حالانکہ شیاطین، جنات میں سے ہیں جو انسان کی طرح بوجھل ہیں یہ استدراج ہے جو اللہ تعالیٰ نے امتحان کے لئے دیدیا ہے۔

معلوم ہوا کہ غیر مطیع سے کوئی ایسی بات خلاف عادت صادر ہو جائے تو وہ کرامت نہیں۔ الغرض شیطان اس تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ اب ذرّیت (کارندے) جو صبح سے لوگوں کو بہکانے کے لئے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے آتے ہیں، کارگزاری سناتے

ہیں، سب کی سنتا ہے اور کہتا ہے ماصنعت شیئا کوئی خاص کارگزاری نہیں، ہاں کر دیتا ہے ایک شیطان کھڑا ہوتا ہے کہتا میری بھی سُن لیجئے! آج میں نے میاں بیوی کے درمیان تیزی پیدا کر دی، غصہ بھڑکا دیا، یہاں تک کہ میاں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔ شیطان یہ کارگزاری سن کر خوش ہو جاتا ہے اور جوشِ مسرت میں کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے شاباش، شاباش یہ کام کیا ہے تو نے شاباش شاباش!

آخر میں ایک شیطان اور کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کچھ میری بھی سُن لیجئے! ایک طالب علم علمِ دین پڑھنے جا رہا تھا، میں نے اس کا بہکانا اور پھسلانا شروع کر دیا، کبھی کچھ کہا، کبھی کچھ، یہاں تک کہ میں نے اس کو پڑھنے نہیں جانے دیا، بستہ ایک طرف رکھ دیا اور کھیل میں لگ گیا، میں نے اس کو علمِ دین کے حاصل کرنے سے روک دیا۔ یہ سن کر شیطان اُچھل پڑتا ہے اور کہتا ہے شاباش، شاباش اور سینہ سے لگا لیتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ علمِ دین کا حاصل کرنے والا شیطان کو بہت بُرا معلوم ہو رہا ہے۔ یہ چاہ رہا ہے کہ طالبِ علم تحصیلِ علم میں مشغول نہ ہو، اس میں میری بڑی ذلت ہے۔ یہ بچہ بڑا ہو کر عالمِ دین بنے گا، فقیہ ہوگا، نہ معلوم کتنے گنہگاروں کو راہِ راست پر لائے گا، اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے:

فقيهٌ واحد اشد على الشيطان من الف عابد۔ (مشکوٰۃ شریف ج ۱ ص ۳۴)

ایک فقیہ (دین کی صحیح سمجھ رکھنے والا) شیطان پر ہزار عابد سے بھاری ہے۔

تطبیق ہوگئی، یہ وجہ ہے کہ شیطان طالب علم کے بہکانے سے بہت خوش ہوتا ہے مبادا یہ بچہ بڑا ہو کر فقیہ بن جائے، میرے لئے پہاڑ جیسا بوجھ بن جائے اور میرے مکر و استدراج کے راستہ میں سنگِ راہ ہو جائے۔

جہاد میں دوسری چیز اذلالِ شیاطین تھی، طلبِ علم میں اذلالِ شیاطین بھی بدرجۂ اتم موجود ہے جیسا کہ معلوم ہوا۔

ارتعابِ نفس :

تیسری چیز جہاد میں ارتعابِ نفس یعنی نفس کو مشکل میں ڈالنا۔تعب مشقت کو کہتے ہیں۔ جہاد کرنے والا مشقت میں ہے، کفار کے مقابلہ میں جارہا ہے۔تو طلبِ علم کے اندر بھی اتعابِ نفس ہے، گھر سے نکلا ہے وہ گھر جیسا کھانا کہاں؟ وہ پینا کہاں؟ وہ آرام کہاں؟ وہ راحت کہاں؟ ساری چیزیں گھر کی راحتوں کی' آرام کی' کھانے پینے کی چھوڑ کر علم حاصل کرنے آیا ہے۔ یہ ہے اتعابِ نفس اور یہ ہے وہ طالبِ علم جو اتعابِ نفس کی وجہ سے جہاد کے اندر ہے، یہ تین باتیں ہوگئیں۔اعلاءِ کلمۃ اللہ، اذلالِ شیاطین، اتعابِ نفس۔

کسرِ ہویٰ :

چوتھی بات کسرِ ہویٰ ہے یعنی نفسانی خواہشات کو توڑ دینا۔آنکھ کیا کہہ رہی ہے؟ کس کو دیکھو؟ زبان کیا کہہ رہی ہے؟ کس طرح بولو؟ کان کیا کہہ رہا ہے؟ کدھر لگاؤ؟ ان سب چیزوں سے طبیعت کو روکنا یہ کسرِ ہویٰ ہے۔ کسر کے معنی توڑنا، ہویٰ خواہش نفس کو کہتے ہیں، اس سے پہلے اتعابِ نفس ہے۔اتعابِ نفس مجاہدہ ہے اور کسر نفس ریاضت ہے کہ طبیعات سے رُک گیا، سونا چاہتا ہے مگر کہاں ہے سونا؟ طالب علم حقیقی کا سونا چار گھنٹہ، تین گھنٹہ سے زیادہ مشکل سے ہوتا ہے۔ جہاد کے اندر کسر ہویٰ ہوتا ہے یا نہیں؟ تاریخ میں ہے کہ نصاریٰ عورتوں کو بناؤ سنگھار کرا کے صحابہؓ کے سامنے بھیجتے تھے، مال و دولت راستوں میں پھیلا دیتے تھے کہ لالچ میں آجائیں مگر وہاں تو تیرہ سال تک اخلاق مہذب کئے گئے تھے وہاں زر و زن و جواہر کیا چیز ہیں؟ وہاں حسین و خوبصورت دوشیزہ لڑکیوں کا سامنے آنا کیا چیز ہے؟ جہاد کے اندر یہ چیزیں ہوتی ہیں اور طالب علم میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔

ایک طالب علم کا دلچسپ واقعہ :

ایک کتاب میں واقعہ دیکھا ہے کہ ایک جنگل کی مسجد میں ایک طالب علم رہتا تھا،

اتفاق سے ایک رئیس زادی، شکار کی شوقین اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئی اور بھٹکتی ہوئی اس مسجد میں پہنچ گئی۔ طالب علم سے ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لڑکی مردانہ لباس میں تھی، نسوانی آواز سے طالب علم نے پہچان لیا کہ یہ لڑکی ہے۔ دونوں سو گئے، رات میں نفس نے بہکایا کہ تنہائی ہے یہ لڑکی ہے کمزور ہے، اس سے خواہش پوری کی جائے، وہ طالب علم اُٹھا اور چراغ جل رہا تھا اس کے پاس پہنچا اور اپنی اُنگلی چراغ کے لَو کے سامنے کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد آ کر لیٹ گیا، کچھ دیر گزرنے پر پھر ایسا ہی ہوا اور لَو کے سامنے اُنگلی کر دی، کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ لڑکی جس کو نیند نہیں آ رہی تھی یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی۔ جب صبح ہوئی تو اس نے پوچھا کہ آپ رات اپنی اُنگلی کیوں جلا رہے تھے، طالب علم نے ٹال دیا، کچھ جواب نہ دیا۔ اس رئیس زادی نے اصرار کیا تو بتلایا کہ میں بھی انسان ہوں، نفسانی خواہشات رکھتا ہوں، میں آواز سے پہچان گیا تھا کہ آپ لڑکی ہیں۔ مجھے نفس نے بہکایا، تو میں نے نفس سے کہا کہ اس کی سزا جہنم کی آگ ہے جو دُنیا کی آگ سے ستر (۷۰) گنا زیادہ ہے، پہلے تو اس آگ کی جلن برداشت کر لے تو میں تیری خواہش پوری کروں گا۔ اس طرح اُنگلی جلا جلا کر میں نے اُس کی خواہش کو توڑا ہے۔

ارشادِ نبوی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا :

من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللّٰہ حتی یرجع (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۴)

جو طلبِ علم میں نکلا وہ اللہ کے راستہ میں ہے (جہاد میں ہے) یہاں تک کہ لوٹ کر آئے۔

حدیث میں طلب کا لفظ آیا ہے یعنی علم کا تقاضا پیدا ہو جائے، مطلب یہ کہ جب تک اس چیز کو حاصل نہ کرے چین نہیں پڑتا، اسے کہتے ہیں تقاضا، اسی تقاضا کو صوفیہ کی اصطلاح میں حال کہتے ہیں۔ علم کی طلب کے اندر، علم کے حاصل کرنے کے اندر حال پیدا ہو گیا۔

حالِ صوفیہ کا مفہوم :

کسی چیز کا طبیعت پر اس طرح سوار ہو جانا کہ جب تک پورا نہیں ہوتا چین نہیں آتا۔ جس طرح بھوک، جب تک کھانا کھا نہ لے چین نہیں آتا، یہ بھوک کا حال ہے۔

یہ چار چیزیں اعلاءِ دین، اذلالِ شیاطین، اتعابِ نفس، کسرِ ہویٰ ہوگئیں، مجاہد کو جہاد میں یہی چار چیزیں پیش آتی ہیں، طالبِ علم میں بھی یہ چار چیزیں ضرور موجود ہونی چاہئیں۔

حصولِ علم کی طلب میں انہماک :

ایھا الطلاب ! طالب علم تو طلبِ علم میں نکلا ہے، علم کا ایسا تقاضا لے کر گھر سے چلا ہے کہ جب تک اس کو حاصل نہ کر لے چین نہیں پڑتا، تمام دنیاوی اُمور، سب کچھ چھوڑ، چھاڑ کر علم کی طلب کرتا ہے کہ جب تک مطالعہ نہ کر لے، وقت پر پابندی کے ساتھ درسگاہ نہ چلا جائے، استاد کی تقریر غور سے نہ سُن لے، سننے کے بعد اس کو پھر دہرا نہ لے اسے چین ہی نہیں آتا۔

طلبِ علم کا مفہوم :

کسب اور چیز ہے اور طلب اور چیز ہے، یہاں کسب کا لفظ نہیں ہے، یہاں طلب کا لفظ ہے جس کی حقیقت ہے برابر تحصیلِ مطلوب میں لگا رہنا، اسی کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں...... ؎

طلبگار باید صبور و حمول　　　　که نشنیده ام کیمیا گر ملول

ترجمہ : طالب کو انتہائی صابر اور برداشت کرنے والا ہونا چاہئے، میں نے نہیں

سنا کہ کیمیا بنانے والا ہار کر تھک کر بیٹھا ہو دنیا کے طالب کو ہم نے نہیں سنا کہ ملول ہو کر اور تھک کر بیٹھ گیا ہو۔

اے دین کے طالبو ! کہ وہ دنیا کا طالب تھک کر نہیں بیٹھتا، اُسے حاصل نہیں کر لیتا چین نہیں لیتا۔ کھیتی کرنے والے کو دیکھ لو وہ بھی تھک کر نہیں بیٹھ جاتا!!

مولانا رومیؒ کیا فرما رہے ہیں ...... ع طلبگار باید صبور وحمول

طالب علم کے اوصاف :

طلبگار کو صبور ہونا چاہئے اور حمول صبور یعنی بہت ہی طبیعت کے خلاف کسی کی طرف سے کوئی بات پیش آ گئی تو بڑا بردبار ہے۔ صبور وحمول مبالغہ کا صیغہ ہے۔ صابر وحامل نہیں کہا۔ بہت ہی طبیعت کو روکنے والا، کسی نے کچھ گالی بھی دیدی، یا کوئی طبیعت کے خلاف بات پیش آ رہی ہے، بس آ گئی آ گئی اس کی طرف کچھ توجہ نہیں۔ یہ ہے حمول، کسی نے طالبِ علم کے خلاف کوئی بات کہہ دی، کہہ دی لیکن بھڑک نہیں۔ یہاں تو صرف علم کی طلب ہے اس کے سامنے بھڑک کیسی؟

تو حدیث میں طلب کا لفظ آیا ہے: مَنْ خرج فی طلب العلم یعنی علم کا چاہنے والا، کہ جب تک اس کو حاصل نہ کر لے اس وقت تک چین نہیں پڑتا۔ الغرض صحیح معنیٰ میں طالبِ علم کے لئے مجاہدین کا ثواب ہے۔ جہاد کرنے والوں کے لئے جو ثواب و فضائل ہیں وہ تمام فضائل طالبِ علم کے لئے ہوں گے تو صحیح معنیٰ میں جہاد کے فضائل کا مصداق طالب علم ہیں۔

علم کا مقام بہت اونچا ہے۔ فرض وواجب، سنن مؤکدہ ادا کرنے والا اور تقویٰ کا اہتمام رکھنے والا، اگر چہ نوافل کی کثرت نہیں، اگر چہ تسبیحات کی کثرت نہیں، اس طالب علم کو جو مقام ہے وہ صرف کثرتِ تسبیح والے کا، کثرتِ نوافل والے کا نہیں ہے، مگر ہو اس

طرح جس طرح بیان کیا گیا نہ کہ نماز قضاء ہو رہی ہو تو ایسا طالب علم تو ہر وقت ذاکر ہے، نفلیں نہیں پڑھتا مگر ذاکر ہے، تسبیح نہیں پڑھتا مگر ذاکر ہے، یہ کل مطیع اللّٰہ فھو ذاکر کا مصداق ہے۔

الحاصل ! مندرجہ بالا بیان سے علم کی اہمیت معلوم ہو گئی کہ کتنی اونچی ہے، کتنا اونچا مقام ہے علم کے حاصل کرنے والے کا اور اس کی طلب کا۔

خانقاہ اکمالیت اور اتمامیت کے لئے ہے :

رہا انطباقِ علم کا احوالِ زندگی پر منطبق ہونا تو وہ خانقاہ کے اندر ہے جو کچھ کسر رہ گئی یعنی اتمامیت اور اکمالیت کی تو وہ خانقاہ میں ہے کیونکہ اعمالِ ظاہرہ کی تکمیل بلا اخلاقِ باطنہ کے نہیں آئے گی۔ مثلاً نماز اعمالِ ظاہر میں سے ہے، اس میں کمال بغیر احسان کے نہیں آئے گا، جس کو ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ میں بیان کیا گیا ہے اور احسان اخلاقِ باطنہ میں سے ہے، جس کی تحصیل خانقاہ میں ہے تو مدرسہ میں جو کچھ تعلیم حاصل کی ہے، اس کی تکمیل اور انطباق یہ خانقاہ میں ہے تو دونوں کی ضرورت معلوم کی گئی۔ علم کا مقام آپ کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کے انطباق کے لئے اتمامیت اور اکمالیت کے لئے خانقاہ کی ضرورت اصحابِ صفہ کے واقعات کے تحت سامنے آ گئی۔ آیت بھی پیش کی گئی :

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنفِرُوْا كَافَّةً ط فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ○ (پ۱۱ ع۴)

یعنی مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ سب کے سب جہاد میں نکل جایا کریں ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جہاد میں جایا کرے تاکہ جو باقی رہ گئے ہیں، وہ علمِ دین میں سمجھ حاصل کریں اور جب مجاہدین واپس آئیں تو ان کو ڈرائیں تاکہ وہ بھی احتیاط رکھیں۔

اور حدیث شریف میں بھی وارد ہوا ہے۔

من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع.

جو علم کی طلب میں نکلا تو وہ اللہ کے راستہ جہاد میں ہے یہاں تک کہ واپس آئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ محنت اور یکسوئی کے ساتھ طلبِ علم کی بھی ہمیں ضرورت ہے جس کے لئے ہم مدرسوں کے محتاج ہیں اور انطباقِ علم کے لئے خانقاہوں کے بھی محتاج ہیں۔ تو دونوں کی اہم ترین ضرورت ضروری تفصیل کے ساتھ بفضلہٖ تعالیٰ بیان کی گئی۔

..................☆☆☆..................

دوسری مجلس

تفصیل ذکر

جب آمر کو پہچان لیا :

اگر دیکھا جائے کہ آمر (حکم دینے والا) کون ہے؟ تو جس چیز کے لئے امر فرما رہا ہے اس میں عملی حیثیت سے تفصیل کی ضرورت نہیں، کیونکہ آمر کو پہچان لیا جو کہ حق تعالیٰ ہیں۔ اس پہچان ہی کا نام عارف ہونا ہے۔ جب اس ذاتِ باری تعالیٰ کا عارف ہو گیا، اب اس تفصیل کی ضرورت نہیں کہ یہ امر کس درجہ میں ہے اور جب آمر کو پہچان لیا، قطعی طور' اور واقعی طور پر کہ وہ خود ہی مصلحت کا خیال فرماتے ہوئے امر فرماتے ہیں، تو پھر نہ مصلحت پر نظر ڈالنے کی ضرورت رہی اور نہ مصلحت پر نظر جانے کی ضرورت رہی، بس اب تو آنکھ بند کر کے ساکت وصامت ہو کر بجمعیتِ خاطر عمل کرنے کی ضرورت رہ گئی۔

اس لئے بفرزانگی، بجرأت، بہمت، دلیرانہ، طوعاً اس مامور بہ کو بجالانا چاہئے اس پر نظر نہیں کہ کیا اجر ملے گا، کیا انعام و بخشش ہوگی، اس سے بھی قطع نظر بس عمل کرنے کی ضرورت ہے، نہ عمل کرنے کے لئے دم مارنے (سستی کرنے کی) اجازت نہ انعام پانے

کے لئے دم مارنے (قصد کرنے کی) ضرورت۔ ان تمام سوچوں سے، ان تمام لایعنی فکروں سے بےفکر اور نظر انداز ہو کر اس امر کو (جس کا حکم کیا گیا ہے) عمل میں لے آنا چاہئے تو بس سیدھی سادھی زندگی حاصل ہوگئی کہ جب خاطرطبع (موافق طبع) اُصول مان لئے گئے تو تمام پریشانیوں سے نجات پا گیا اور اُس کی رضاء پر اپنی رضا حاصل ہوگئی۔

پریشانیوں کا سبب اور اِس کا سدباب :

پریشانیوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان دماغ کے سوچنے پر چلنے لگتا ہے۔ اس نے اپنے کو کسی ذات کے حوالہ نہیں کیا ہوتا، پراگندہ دل، پراگندہ حال ہو جاتا ہے کیونکہ دماغ اپنی تجویزات کی طرف سوچنے میں لگ جاتا ہے، تجویز پر سوچتا ہے' اگر تفویض سے کام لیا ہوتا، پریشانیاں دفع ہوگئی ہوتیں اور سکون آجاتا، پریشانیوں سے حفاظت کے علاج کے لئے اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہوسکتی، یہ مؤمن پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کی رضا پر جسماً وقلباً مطیع ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر تو اس پر بھی نہیں رہتی کہ کیا ملے گا، جب اس درجہ کی قطع نظری، فنائیت بفناء تام ہو جاتی ہے، اپنے سے نظر ہٹتے ہوئے، سعی پر نظر کرتے ہوئے اس طرح فانی بفناء تام ہو جاتا ہے تو وہ جو بعض حضرات نے فرمایا ہے، یہ بتوفیقہ تعالیٰ اس کا جامع ہو جاتا ہے یعنی ...... ع ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک

ترکِ مولیٰ ترکِ ترک کا مطلب :

مندرجہ بالا یہ مصرع جب سنا جاتا ہے، اس میں بڑا اشکال پیدا ہو جاتا ہے کہ ترکِ دنیا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ترکِ عقبیٰ اور ترکِ مولیٰ یہ کس طرح صحیح ہوسکتے ہیں اور پھر ترکِ ترک کے کیا ل معنی ہیں؟ تو ترکِ ترک فناء تام کا نام ہے کہ جب ترک سے بھی نظر ہٹ گئی تو فناءِ تام حاصل ہوگئی اور ترکِ مولیٰ کا مطلب یہ ہے کہ اس جستجو میں بھی نہ پڑے کہ اللہ

تعالیٰ ملے یا نہیں بس کام میں لگا رہے، اسی کو فارسی کے اس شعر میں ذکر کیا گیا ہے ......

یا بم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنم

اسی کا کسی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے ....

ملنے یا نہ ملنے کا وہ مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دَو لگی رہے

مطلب یہ ہے کہ کام میں لگے رہو، اس فکر کو چھوڑ و کہ کیا ملے گا؟ کون ملے گا؟ کب ملے گا؟ کس طرح ملے گا؟ اس سے قطع نظر ہو جاؤ۔

اس میں تمام وہ چیزیں جو غیر اختیاری ہیں سب سے نظر اندازی ہو گئی، جیسا کہ سلوک میں سالک جب تربیت کے ساتھ بتقویٰ ذکر و اذکار و مراقبات میں مشغول ہوتا ہوا چلتا ہے تو کیفیات طرح طرح کے اور وارداتِ قلب طرح طرح کے آتے ہیں تو ان کی طرف خیال کیسا؟ ان کی طرف سے قلب خالی ہے تو ان کی طرف رجوع کیسا؟ اچھا معلوم ہو گیا کہ ابھی مخلوق ہے دل میں، کیفیات سے دلدادگی ہی، نہ ہونے پر رنجیدگی ہے، ہونے پر اترانا پن ہو گیا، ان کے ساتھ مشغول ہو گیا، اور آ کر چلی گئیں تو رنجیدگی ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ ابھی شغل بخلق ہے، ابھی شغل بحق نہیں۔ تو یہ شخص کیسا پُر سکوں بفضلہٖ تعالیٰ ہے، اب یہ سالک جس کا بیان ہو رہا ہے، جن کی نظر بس اللہ تعالیٰ پر ہے، ہر وقت ذاکر ہے، اگرچہ خود اس کو اپنا ذاکر ہونا محسوس نہیں ہے لیکن عند اللہ ذاکر ہے۔

دفعِ وساوسِ شیطانی :

اگر شیطان آئے اور بہکائے تو اس طرح بہکنا نہ چاہئے، جس طرح مولانا محمد یعقوب صاحب نے نماز کی نیت باندھی، شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ تو نے مسح تو کیا ہی نہیں

نیت توڑ دی جا کر مسح کر لیا۔ یہ ضروری نہیں کہ مسح کرنے کے لئے پھر وضو کرو، مسح رہ گیا بس مسح کر لیا، اب جب نماز کا وقت آوے اور نیت باندھیں تو شیطان سوار کہ مسح تو کیا ہی نہیں، ہاتھ پیروں کو کیسے کہے کہ نہیں دھوئے وہ تو تر ہو گئے ہیں۔ دیکھا شیطان کتنا ہوشیار ہے......

الغرض دوسری مرتبہ بھی نماز توڑ دی اور مسح کر لیا، کئی مرتبہ ایسا ہوتا رہا، جب یہ دیکھا کہ یہ تو ہاتھ دھو کر جان کے پیچھے پڑ گیا تو اب کی مرتبہ جب شیطان نے کہا کہ مسح تو کیا ہی نہیں، مولانا نے جواب دیا، ہاں نہیں کیا، شیطان نے کہا جب مسح نہیں کیا تو وضو نہیں ہوا، مسح فرض ہے۔ مولانا نے جواب دیا ہاں نہیں ہوا۔ شیطان نے کہا جب وضو نہیں ہوا تو پھر نماز بھی نہیں ہوگی، جواب دیا ہاں نہیں ہوگی، اور اسی طرح نماز پوری کر لی۔ اب جب دوسرا وقت آیا اور نیت باندھی تو شیطان نہیں آیا۔ دیکھئے شیطان نے نماز میں آ کر وسوسہ ڈالا کہ مسح تو کیا ہی نہیں، ایسی غفلت، حالانکہ وہ غفلت نہیں تھی، اسی طرح ایسے ذاکر کو شیطان بہکاتا ہے کہ ذکر تو ہے ہی نہیں ایسی غفلت؟ بس جواب دیدو کہ تیرے نزدیک غفلت ہے، عنداللہ غفلت نہیں کیونکہ ایسا سالک تو ہمہ وقت ذاکر ہے، اس کا رُواں رُواں ذاکر ہے، اگرچہ ذاکر کو اپنا ذاکر ہونا معلوم نہ ہو کہ شیطان غفلت کا تخیل پیدا کرتا ہے مگر یہ غافل نہیں، ذاکر ہے، یہ سالک مراد ہے جس کا ذکر ہو رہا ہے کہ اس کی نظر سب سے ہٹ کر صرف ایک ذات کی اطاعت و رضا پر جمی ہوئی ہے۔ ایسے سالک کے لئے، یہ شیطانی خیال ہے کہ غفلت سے سانس نکل رہے ہیں، غفلت سے سانس چل رہے ہیں، ادھر التفات، توجہ، خیال نہیں کرنا چاہئے اگر کیا تو پھر چھٹکارا نہیں، بے غم نہیں، بے فکر نہیں اور یہ سلوک کے خلاف ہے کہ فکر مند بنا، یا غم ہوا کیونکہ اس سے نشاط گیا، بشاشت گئی، حق تعالیٰ کے ساتھ جو بشاشتِ ایمانی ہونا چاہئے۔ طبیعت رجوع الی اللہ رہے، کھلی اور کھلی رہے، اس خیال سے یہ تمام باتیں ختم ہو جائیں گی۔

...... الغرض یہ سالک ہمہ دم ذاکر ہے، غافل نہیں۔ اسی کو فرمایا ہے :

کل مطیع للہ فھو ذاکر ۔ جو اللہ کا مطیع ہے وہ ذاکر ہے۔

یعنی خالص ذاتِ باری تعالیٰ کی رضا کے لئے اطاعت کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور دوسری نیت خیال بالکل نہیں ۔ تو جب یہ سالکِ مطیع خالصاً اللہ کی رضاءِ الٰہی میں لگا ہوا ہے ذاکر ہے، اگرچہ بظاہر ذاکر نہیں معلوم ہوتا ہے کیونکہ نفس کا غیر اللہ کی طرف میلان ہوا، فوراً رُکا، اغواءِ شیطان ہوا، فوراً رُکا، کیوں رُکا؟ اللہ کے تصور و دھیان سے کہ انہوں نے منع کیا ہے تو یہ سالک پورا مطیع ہے اور ہر مطیع ذاکر ہے جیسا اوپر بیان ہوا۔ تو بقاعدۂ منطقی یوں کہو کہ نفس کا میلان ہوا رُکا، اغواء شیطان ہوا رُکا، یہ ایک مقدمہ ہوا، اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جو ایسے میلانات اور اغوآت سے رُکے وہ مطیع ہے۔ نتیجہ یہ مطیع ہے، اور تیسرا مقدمہ اور ملالو کہ ہر اللہ کا مطیع ذاکر ہے تو یہ سالک، بالیقین ذاکر ہے۔ گھر میں ہو تو باہر ہو تو، گھر میں بھی غلط میلان ہوسکتا ہے، جس طرح باہر غلط میلان ہوسکتا ہے، اسی طرح اغواء شیطان گھر میں بھی ہوسکتا ہے، باہر بھی ہوسکتا ہے تو گھر کی زندگی میں بھی اور باہر کی زندگی میں بھی ان میلانات اور اغوآت سے رُکا رہا تو مطیع ہے اور ہر مطیع ذاکر ہے، مثلاً آنکھ اُٹھی دیکھنے کے لئے تو یہ تو دیکھنے کے لئے ہے ہی لیکن اجنبیہ پر پڑکر رُکی، میلان ہونے لگا، جب میلان ہوا فوراً رُکی اور نظر نیچی جھکالی، اگرچہ اس وقت اس کی زبان پر کوئی تسبیح نہیں ہے کوئی ذکر نہیں ہے، نہ نفی و اثبات نہ ذکر اسمِ ذات نہ درود شریف، نہ استغفار نہ سبحان ربی العظیم کسی قسم کی کوئی تسبیح یا ذکر نہیں ہے، لیکن وہ ذاکر ہے بفضلہٖ تعالیٰ۔

سالک کو فرشتہ پر فوقیت ہے :

اب یہ ذاکر فرشتہ سے بڑھ گیا کیونکہ وہاں تو میلان نہیں اور یہاں میلان ہے لیکن اس کے باوجود باطناً ایسا ذاکر ہے کہ میلان کی طرف، فرط اغواء کی طرف اقدام نہیں یہ کمال ہے، اندھا اگر یوں کہے کہ میں نے کبھی کسی کو بدنگاہ سے نہیں دیکھا تو اس کا کوئی کمال

نہیں، تو دیکھتا کیسے؟ نابینا ہے، بینا ہوتا دونوں آنکھیں کھلی ہوتیں اور نہ دیکھتا جب کمال تھا کہ نفس ہوتے ہوئے پھر بے نفس توفیق الٰہی سے ہو گیا۔ یہ عادت اللہ ہے کہ بے نفس بنا دیا۔ جب کوئی بے نفس بننا چاہتا ہے اللہ اس کو بے نفس بنا دیتے ہیں۔ تو یہ سالک فرشتہ سے بڑھ گیا کیونکہ اس کو اس عالم میں کیسی کیسی جاہی اور باہی اور حرصی باتیں اغواءِ شیطانی اور میلانِ نفسانی کی پیش آئیں لیکن اس کے باوجود بفضلہٖ تعالیٰ محفوظ رہا نہ کہ معصوم۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا جب کہ پیدائش آدم پر انہوں نے شبہ پیش کیا تھا کہ ''میں جو جانتا ہوں تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون کیا ہوگا؟ ایسا سالک جو کامل مطیع ہو حق تعالیٰ کی امان میں آ گیا۔

انبیاء معصوم، اولیاء محفوظ :

اسی لئے کہا گیا ہے :

الانبیاء معصوم والاولیاء محفوظ۔ انبیاء معصوم ہیں اور اولیاء محفوظ ہیں۔

اور کبھی اتفاقاً خطاءً غلطی ہو جانا (یعنی ایسی غلطی سے قابلیتِ ولایت ختم نہیں ہوتی اور اگر ولایت حاصل ہونے کے بعد ایسی غلطی ہو جائے تو ولایت چھین نہیں لی جاتی۔ از محشی) وہ نہ استعدادِ ولایت کے خلاف ہے اور نہ فعلیتِ ولایت کے خلاف ہے، جیسے کبھی خطاء لغزش یہ نبوت کے بھی خلاف نہیں کیونکہ اس غلطی میں قصد و ارادہ کو دخل نہیں ہوتا جیسے جب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو اس نے جہاں یہ کہا کہ میں نے آپ کی پرورش کی تھی، میرے گھر کے اندر آپ رہے تو وہیں یہ بھی کہا کہ آپ کے ہاتھ سے ہمارا ایک آدمی بھی تو مارا گیا ہے۔ آپ نے کتنی بھاری بات کی تھی کچھ تو خیال کیجئے کہ میرا ہی کھایا، میرا ہی آدمی قتل کیا اور پھر مجھ کو اپنا تابع بنانے آئے ہو، موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ وہ غلطی تھی تو خطاءً غلطی کا صدور استعدادِ نبوت کے خلاف نہیں، اس لئے اس سے

میری نبوت پر کوئی شبہ نہیں ہوسکتا، اس مقام کی تفسیر دیکھ لینا۔ خلاصۂ جواب یہ کہ میں پیغمبری کی حیثیت سے آیا ہوں جس میں دبنے کی کوئی وجہ نہیں اور وہ پیغمبری اس واقعۂ قتل کے منافی نہیں کیونکہ وہ خطاء تھی جو قادحِ استعدادِ نبوت نہیں اور استعداد کے بعد فعلیت مستبعد نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ خطاءً کوئی غلطی ہوجائے تو یہ عصمتِ انبیاء کے خلاف نہیں ہے۔

سالک ہر وقت ذاکر ہے:

حق تعالیٰ کی طلب میں سب کچھ بھلا دیتا ہے، یہ سالک ہر وقت ذاکر ہے، ذکر کے ساتھ مشغول ہے اور ذکر کے ساتھ شغل بحق فی القلب راسخ ہے اور جب ایسا ذکر راسخ اس کے قلب میں ہے تو عام معنیٰ ذکر کے اعتبار سے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (یعنی یہ ذکر (قرآنِ پاک) ہم نے اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) تو اس آیت ذکر کے معنی عمومی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوا کہ ایسے ذکر کی ہم حفاظت کرتے ہیں۔ جب ذاکر ایسے ذکر کے ساتھ ہوجاتا ہے جو شغل بحق کا ذریعہ ہو تو حق تعالیٰ ایسے ذاکر کی حفاظت فرماتے ہیں اور جب حق تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں، تو ذاکر محفوظ ہوجاتا ہے اور والاولیاء محفوظٌ کا مصداق بن جاتا ہے۔ یہ تفسیر (صوفیہ کی اصطلاح میں ایسی تفاسیر کو علم اعتبار کہتے ہیں۔ اس میں مفسرین کی تفسیر سے انکار نہیں ہوتا بلکہ عموم لفظ سے کوئی مفید علم نکال لیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خلافِ شریعت نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے لکل آیۃ ظھر وبطن۔ صوفیہ کی یہ تفاسیر بطن آیت کا مظہر ہوتی ہیں) عموم معنیٰ ذکر کے اعتبار سے کی گئی ہے، لہٰذا مفتی صاحب کے فتویٰ لگانے کی بات نہیں ہے، پھر ذکر عام ہے، ذکر لسانی، زبان کی حرکت کے ساتھ ہو تب یا دل کے اندر صرف دھیان کی بات تب بہر صورت ذاکر ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ۔ اپنے رب کو دل میں یاد کر۔

اس میں لفظ فی کی وجہ سے نفس ظرف ہوگیا اور وہ دل ہے تو آیت کا مطلب یہ ہوگیا کہ اپنے ربّ کا دل ہی دل میں ذکر کر اب یہ ایسا ذاکر ہوگیا کہ ذکر روئیں روئیں، بال بال میں جاری وساری ہوگیا، ایسا ذاکر بذکرِ نفس۔ یہ ہمہ وقت ذاکر ہوگیا، کوئی وقت اس کا ذکر سے خالی نہیں۔ آخر میلانِ طبع سے رُکنا کیوں ہوا؟ اغواءِ شیطان سے رُکنا کیوں ہوا؟ وہ کونسا مانع ہے وہ کونسا دافع ہے کہ میلان کو اندر آنے نہ دیا، اندر عکس کے طور پر کچھ تھوڑا سا ہی میلان آیا تھا کہ فوراً اس کو دفع کر دیا، اندر سے نکال دیا، یہ تمام افعال ذکر کر رہا ہے، سو یہ شخص اس اغواءِ شیطانی اور میلانِ نفسانی سے رُکنے کے وقت ذاکر ہے۔ وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ۔ میں نفس سے مراد ذات ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی ذات کو بھی نفس سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہے: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ تمہارے رب نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔ ہاں تم خود اس رحمت کو زحمت بناؤ تم زحمت بلاؤ (کہ معاصی کرنے لگو) تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں، خالقِ اشیاء تو میں ہی ہوں زحمت بھیج دوں گا، مگر میں تو رحمت ہی اپنی طرف سے بھیجنا چاہتا ہوں اور اگر غیر اختیاری زحمت آ بھی گئی تو وہ بھی مؤمن کے لئے رحمت ہے حاصلِ کلام یہ ہے کہ اپنے رب کا ذکر کر اپنی ذات میں کہ ذکر تیرے اندر سرایت کئے ہوئے اس طرح ہو کہ ذکر دل میں ساری، زبان پر جاری ہو تو پورا جسم جس میں زبان و دل بھی داخل ہیں ذاکر ہوگیا۔

تو معلوم ہوا کہ صرف زبان کے ہی چلتے رہنے کو ذکر نہیں کہتے۔ دل میں اس کی یاد، اس کا خیال، اس کا دھیان، بلا کسی تفصیل کے یہ بھی ذکر ہے۔

بن دیکھے خدا تعالیٰ کا تصور:

بعض دفعہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا تصور کیسے آجائے جبکہ اس کو دیکھا نہیں؟ تو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہاں مجلس خانہ میں بیٹھے ہیں اور اپنے نوزائیدہ بچہ کا خیال

آجاتا ہے، یا حجرے میں بیٹھے ہیں اور بچہ کا خیال آگیا بلا کسی تفصیل کے کہ ناک کیسی ہے، آنکھ کیسی ہے، دانت کیسا ہے، ہونٹ کیسے ہیں، بلا کسی تفصیل کے خیال آگیا کیونکہ ابھی تک بچہ کو دیکھا نہیں، نوزائیدہ ہے اور دل بچہ کی طرف کھنچنے لگا۔ ایسے ہی بلا کسی تفصیل کے ذاتِ حق کا خیال آجاتا ہے، کبھی جلالاً (تصور جلال کے ساتھ) آجاتا ہے، کبھی جمالاً (تصورِ جمال کے ساتھ) آجاتا ہے، کبھی محسناً اور معطیاً (احسان کے تصور سے) آجاتا ہے، اسی طرح کبھی مربیاً آجاتا ہے، کبھی مالکاً آجاتا ہے۔

حضوریٔ حق کا طریق :

اسی طرح تقویٰ کا اہتمام برابر کرتے رہنے اور ذکر کی تکثیر کے اندر لگے رہنے سے ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور اور دھیان بالکل آسان ہوجاتا ہے، عادت اللہ یہی ہے کہ جب سالک کی نظر سب سے ہٹ کر اس ذات کی طرف لگ جاتی ہے تو تصور و حضور کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ سب طرف سے نظر کس طرح ہٹے تو اس کا طریق حق تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے :

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ۔ تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔

حدیث شریف میں اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر بندہ مجھے تنہائی میں یاد کرے گا تو میں بھی تنہائی میں یاد کروں گا اور اگر بندہ مجھے مجمع میں یاد کرے گا تو میں اس سے بہتر مجمع میں یاد کروں گا یعنی فرشتوں کے مجمع میں۔ تو سالک کی اس فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ نے تحضیض کردی، بھڑکا دیا، تحضیض میں تا، حا، ضاد یا اور ضاد یہ حروف ہیں، جس کے معنیٰ بھڑکانا، رغبت دلانا ہیں، تو سالک کو بھڑکا دیا، وہ سوچتا ہے کہ میں ذکر کس طرح چھوڑوں، یہ تو بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے یاد کرتے ہیں، وہ ذات تو بڑی مستغنی اور غیر محتاج ہے، بھلا اس مستغنی ذات کو کیا ضرورت پڑی کہ وہ مجھے یاد کرے۔ یہ

اس کی انتہائی مہربانی ہے کہ وہ مجھے یاد کرتا ہے۔اس تصور سے سالک ذکر پر کمر بستہ ہوجاتا ہےاور دھیرے دھیرے اللہ تعالیٰ کا تصور وخیال جم جاتا ہےاور ذکر اس سالک کے روئیں روئیں میں جم جاتا ہےاور اس کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ ....

ملنے نہ ملنے کا وہ مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دو لگی رہے

جب اس کا یہ حال ہےتو غفلت کہاں ہے؟ پس اغواء شیطانی سے اپنے کو غافل سمجھنا کیسا؟ اس لئے ایسے تخیلات سے اپنے کو پاک رکھنا ضروری ہے تاکہ دل جمارہے، تازگی باقی رہے، بشاشت باقی رہے، اسی بشاشت کو بخاری شریف میں حدیث ہرقل کے اندر سوال وجواب کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ۶ ھ میں صلح حدیبیہ مکمل ہوگئی تو اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نصرانی اور مجوسی بادشاہوں کے پاس تبلیغِ اسلام کے لئے دعوت نامے بھیجے ہیں، انہی دعوت ناموں میں ایک والا نامہ ہرقل کے پاس بھی بھیجا تھا۔ جب ہرقل کے پاس یہ والا نامہ پہنچا تو اس نے تحقیق کے لئے عرب کی کسی جماعت کو جو اس کے ملک میں آئی تھی تلاش کرایا۔ابوسفیان جو اس وقت اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ تجارت کی غرض سے روم گئے تھےاور مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان کو بلایا گیا۔ ہرقل نے ان سے چند سوالات کئے جن کو تفصیل سے بخاری شریف باب الوحی میں بیان کیا گیا ہے، انہی سوالات میں ایک سوال یہ تھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ اسلام لانے کے بعد کوئی اسلام سے ناراض ہوکر لوٹتا بھی ہے یا نہیں؟ ابوسفیان فرماتے ہیں میں نے جواب دیا کہ ایمان لانے کے بعد کوئی نہیں پھرتا۔اس پر ہرقل نے کہا :

وکذالک الایمان حین تخالط بشاشتہُ القلوب۔ (بخاری شریف ج ۱ ص ۴)

یعنی ایمان کی یہی کیفیت ہے (کہ اس سے پھرا نہیں جاتا) جبکہ اس کی بشاشت

دلوں میں گھل مل جاتی ہے۔

یہ ہے وہ بشاشت جس کو نصرانی بادشاہ ہرقل بیان کر رہا ہے کیونکہ وہ اپنی کتاب انجیل کا عالم ہے۔ جب بشاشت ایمان کے اندر آجاتی ہے تو بڑھتا چلا جاتا ہے، یہی بشاشت اور حلاوت ہے جس کو الایمان یزید و ینقص (ایمان بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے) میں بیان کیا جاتا ہے یہ کمی اور زیادتی اسی کیفیتِ ایمان میں ہوتی ہے، ورنہ نفسِ ایمان وہ کمی و زیادتی کو قبول نہیں کرتا۔ الحاصل سالک کو ضروری ہے کہ بشاشت اور انشراح کو قائم رکھے۔

حق تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں مطالبہ فرمایا ہے :

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُو اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ۔ (پ۵ع۱۲)

جب تم نماز پڑھ چکو تو اللہ کا کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ذکر کرو۔

آیتِ مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو مت سمجھو کہ ذکر سے فراغت ہوگئی، نماز ہیئت کذائیہ کے ساتھ، ایک وقتی چیز ہے، اس کے بعد فراغت کیسی؟ ایک جگہ ارشاد ہے :

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا۔ (پ۲۹ سورۂ دھر)

اپنے رب کا نام صبح اور شام لیتے رہو۔

بکرہ صبح سے لے کر دوپہر تک اور اصیل زوال سے لے کر رات تک، دونوں طرفوں کو گھیر لیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت اللہ کا نام لیتے رہو، الغرض ذاتِ باری تعالیٰ کا مطالبہ ہر وقت ذکر کا ہے، قلباً بھی، لساناً بھی، جسماً بھی، قلباً یہ کہ دل میں یاد ہو اور لساناً یہ کہ زبان ذکر سے تر رہے اور جسماً یہ طاعتِ کاملہ میں لگا ہوا ہو، نیز کان، آنکھ وغیرہ یہ جسم کے اعضاء ہیں، جب پورا جسم ذکر میں سرشار ہوگا تو آنکھ بھی ذکر و طاعت میں ہوگی، کان بھی ذکر طاعت میں ہوگا۔ الغرض اس کا ہر عضو ذکر میں لگا ہوا ہوگا، کوئی آن اس کی ذکر سے خالی

نہ ہوگی، ہاں جب قصداً و بالارادہ بیداری میں عقل و بلوغ کے ساتھ خلاف حکم چلے گا تو ذکر سے خالی ہوگا اور غافل سمجھا جائے گا۔

ایک حدیث اور لے لیجئے : **لایزال لسانک رطبًا من ذکر اللّٰہ.** تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تروتازہ رہے، ہر وقت، چلتے پھرتے، لیٹے، بیٹھے، باوضو، بے وضو، خلوت میں، جلوت میں، سفر میں، حضر میں، سواری میں، پیدل ہر وقت زبان اللہ کی یاد سے تازہ رہے۔

ذکرِ قلبی کے ساتھ ساتھ ذکرِ لسانی کی اولویّت :

دل کے ذاکر ہونے کے ساتھ زبان کو بھی شامل ذکر ہونا چاہئے کیونکہ ذکرِ لسانی میں زبان کو حرکت ہے اور حرکت محسوس چیز ہے، اِدھر زبان میں حرکت نہ ہوگی فوراً محسوس ہوجائے گا کہ حرکت نہیں ہے، تو فوراً متنبہ ہوجائے گا، اور ذکر لسانی شروع کردے گا، کیونکہ محسوس چیز پر جلد تنبہ ہوجاتا ہے۔ افضل یہ ہے کہ دونوں کو جمع کیا جائے۔

باقی باللہؒ کی حکایت :

اگر ذکر جامع افضل نہ ہوتا تو باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ ذکرِ لسانی کا اہتمام نہ فرماتے، اس کا قصہ یہ ہے کہ آپ بیٹھے ہوئے ذکرِ لسانی میں مشغول تھے کہ حجام خط بنانے آگیا۔ جب ہونٹ کے بال تراشنے چاہے تو حجام نے کہا کہ حضرت تھوڑی دیر کو ذکر قطع فرما دیجئے ورنہ لب قطع ہوجائے گا۔ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لب کا قطع ہونا منظور ہے لیکن ذکر کا قطع کرنا منظور نہیں۔ تو کیا اس وقت ان کا قلب ذاکر نہ تھا، ضرور تھا مگر دونوں ذکروں کا جمع کرنا یہ جامعیت ہے۔

الغرض دل کے ساتھ زبان کو ذاکر رکھنا یہ بہتر اور افضل ہے۔ جب کسی سے ابتداءً

کلام شروع کیا جائے یا کسی کلام کا جواب دیا جائے تو ذکرِ لسانی منقطع ہو جائے گا، جب اس سے فراغت ہوگئی تو پھر ذکر میں مشغول ہو جانا چاہئے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ کسی سے کلام کے وقت چونکہ ذکر منقطع ہو گیا، اس لئے یہ اب ذاکر نہیں رہا۔ جواب یہ ہے کہ ضروری کلام یا ضروری جواب میں بھی ذکر ہے، کیونکہ یہ کلام برائے ادائے حق خلق ہے تو یہ زبان اب بھی ذاکر ہے، اُس وقت ذکر بلا واسطہ تھا اور اب حقِ خلق کی ادائیگی کے واسطہ سے ذاکر ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے کوئی مدرس درس دے رہا ہے، زبان تدریس میں تقریر پر چل رہی ہے، تو یہ مدرس اس وقت بھی بواسطہ تدریس ذاکر ہے، غافل نہیں ہے۔ البتہ تقریر اور حل کتاب کی طرف غایت توجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل میں دھیان کی طرف سے تغافل، تساہل اور ذہول ہے حالانکہ یہ غفلت اور ترکِ ذکر نہیں بلکہ ضعفِ ذکر ہو گیا ہے۔ اس لئے جوں ہی تقریر سے فارغ ہوا، دل بھی بلا واسطہ ذاکر اور زبان بھی بلا واسطہ ذاکر ہو جاتی ہے۔ تو وہاں نسیان نہیں تھا، غفلت نہیں تھی بلکہ دوسری طرف توجہ کی وجہ سے صرف ضعفِ ذکر تھا، سالک ضعف کو غفلت سمجھ جاتا ہے۔

مستحب اہل اللہ کے نزدیک عملاً واجب ہے:

مستحبات پر اعتقاد و نیت تو استحباب کا ہی ہو مگر اس پر دوام فرائض کی طرح کرنا چاہئے۔ اسی لئے اہل اللہ جانتے ہیں کہ تہجد فرض نہیں ہے لیکن اس پر دوام فرض کی طرح کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں اس کا ترک نہیں ہے، ہاں اگر خاص عذر ہی پیش آ گیا، تو یہ معذوری ہے۔ تو معذوری کے وقت کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس لئے کچھ رنجیدگی کی بات نہیں ہے۔

احتیاطاً تہجد بعد نمازِ عشاء پڑھی جائے:

متاخرین نے ہمارے ضعف کو مدنظر رکھتے ہوئے فرما دیا ہے کہ احتیاطاً تہجد بعد از

نمازِ عشاء پڑھ لو کہ شاید آنکھ نہ کھلے اور ترک ہو جائے اور طبیعت تشویش میں ہو جائے، اس لئے تشویش سے بچنے کے لئے عشاء کے بعد ہی پڑھ لو، احتیاطاً ادا کر لو، اسے حفظ ماتقدم کہتے ہیں اور آج کل آخر رات میں جاگنے کا کیا اعتبار ہے، غیر اختیاری نیند ہوتی ہے، گھڑی بجتی ہے سننے میں نہیں آتی، اس لئے حفظ ماتقدم کے طور پر نمازِ عشاء کے بعد پڑھ لینی چاہئے، آنکھ کھلے تو اُٹھ کر آخر رات میں دوبارہ ادا کر دینی چاہئے۔

تو اہل اللہ تہجد کو غیر واجب سمجھتے ہیں، مگر اس کے ساتھ معاملہ واجب جیسا کرتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ آمر حق تعالیٰ ہیں، ارشاد ہے :

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ۔ اور رات کے کسی قدر حصہ میں آپ نمازِ تہجد کیجئے جو آپ کے لئے فرضوں سے زائد چیز ہے۔ (بیان القرآن)

توفیقِ الٰہی سے آج ذکر کی تفصیل، لساناً، قلباً، جسماً ذکر کے اقسام بیان کر کے رسول اللہ ﷺ نے ذکر قلبی مع لسانی کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ :

''جس کو چار چیزیں دی گئیں اس کو دنیا اور آخرت کی بھلائی دیدی گئی، قلبِ شاکر، زبانِ ذاکر، جسم صابر، اور بیوی ناظر ہو، اپنی بھی حفاظت کرتی ہے اور شوہر کے مال کی بھی نگرانی رکھتی ہے''۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۸۳)

جسم صابر یہ کمالِ طاعت کا عنوان ہے کیونکہ جسم حریت چاہتا ہے اور طاعت و تعمیلِ حکم میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ طاعات کو پورا سہارے ہوئے ہے، یہاں تک کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا حکم جس کو شریعت کہتے ہیں، اس کی طبیعت بن گئی، اسی کو کمالِ طاعت کہتے ہیں۔ اس کی نظر صرف حکم پر رہ جاتی ہے، عارف باللہ اگر بیمار ہوتا ہے اور بیماری کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھتا ہے، مسجد میں نہیں جا سکتا تو اس کو اس کا قلق نہیں ہوتا کہ مسجد میں جماعت سے نماز نہیں پڑھی جا رہی کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرے لئے اس وقت میں اسی کا حکم

ہے کہ گھر میں نماز پڑھوں، میرے لئے یہی مصلحت ہے، اسی میں حکمت ہے۔

حرم شریف کی نماز ہی مطلوب نہیں، رضا مطلوب ہے :

ایک بزرگ مکہ معظمہ میں بیمار ہوگئے۔ ایک ماہ تک حرم شریف میں حاضر نہ ہوسکے کہ دل میں یہ خیال تھا ایک مہینہ بیمار رہا، حرم شریف کی نماز کی حاضری سے محروم رہا، اظہارِ افسوس فرمارہے ہیں۔ تو حرم شریف کی حضوری ہی مطلوب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی یہی رضا تھی کہ حرم میں حاضری نہ ہو، مطلوب حاصل ہے، عارف باللہ اس کو نہیں دیکھتا کہ حرم میں حاضری ہوئی یا نہیں ہوئی، اس کی نظر رضا پر رہتی ہے چاہے حرم میں نماز پڑھوالیں چاہے گھر پر۔ ایک عابد ہوتا ہے اور ایک عارف، عابد شوقِ عبادت میں ہوتا ہے، اس کو عبادت کا چسکہ ہوتا ہے، اس کی عادت کے خلاف جب ہوتا ہے افسوس کرتا ہے اور عارف اللہ کی مرضی پر نظر رکھتا ہے، وہ رجوع الی اللہ کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ رجوع الی اللہ کا مطلب یہی ہے کہ ہر وقت ہر آن یہ دیکھے کہ آقا کی مرضی کیا ہے۔

خلاصۂ مجلس :

بہر حال خلاصہ یہ ہے کہ جب معلوم ہوگیا کہ آمر (حکم دینے والے) اللہ تعالیٰ ہیں اور وہ ہماری مصلحتوں اور حکمتوں کے موافق ہی حکم دیتے ہیں تو پھر احکام میں عمل کرنے کے لئے مصلحتوں اور حکمتوں کا تلاش کرنا مخلص مؤمن جس کو سالک کہا جاتا ہے اس کے مقصد سے بہت بعید بات ہے، اس کی نظر مصالح وحکم پر تو کیا ہوتی اس کی نظر تو اللہ کے ملنے اور نہ ملنے پر بھی نہیں ہوتی، اس کی نظر تو بس اطاعت وفرمانبرداری اور مرضی مولیٰ کی تلاش میں رہتی ہے، اس کو شعر مذکور میں ترکِ مولیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے اور پھر سالک اس تصور سے

بھی خالی ہو جاتا ہے کہ میری نظر مولیٰ پر بھی نہیں ہے اس کو ترکِ ترک سے تعبیر کیا ہے، جس کو اصطلاحِ تصوف میں فناء الفناء کہتے ہیں۔

دوسری بات اہم یہ بیان کی گئی کہ ذکر، زبانی اور قلبی یاد ہی کو صرف نہیں کہتے گو یہ بھی مامور بہ ہے بلکہ اصل ذکر یہ ہے کہ خود کو اطاعت و فرمانبرداری میں کھپا دے۔ درحقیقت ذکر و یاد یہی ہے اور کلّ مطیع للّٰہ فھو ذاکرٌ کا یہی مطلب ہے، لیکن یہ مطلب بھی نہیں کہ ذکر لسانی اور ذکرِ قلبی مطلوب نہیں وہ بھی مطلوب ہیں۔ جیسا کہ آیت وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ اور حدیث لایزال لسانک رطبًا من ذکر اللّٰہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ ذکر لسانی اور قلبی دونوں کو جمع کرنا افضل ہے۔

غرض آپ حضرات کے طفیل سے حق تعالیٰ ذہن میں ڈالتے رہے، زبان چلتی رہی، یہ حقیقت ہے سلوک کیا چاہتا ہے جو کہ شریعت کا جزو اہم باطنی ہے۔ یہ ہے وہ سلوک، یہ ہے وہ سالک جس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور لفظ یہ (یہ کا مشارٌ الیہ وہ سالک ہے جس میں ذکرِ لسانی اور قلبی کا اہتمام اور تقویٰ کا التزام ہو، اسی کو مطیع کامل کہا جاتا ہے۔ از محشی) سے بار بار اشارہ کیا گیا۔

☆☆☆

تیسری مجلس

تقویٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ (کامیاب ہوا جس نے نفس کا تزکیہ کیا)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰیO وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی۔

(کامیاب ہوا وہ جس کا تزکیہ ہو گیا اور اپنے ربّ کے نام کا ذکر کیا پھر نماز پڑھی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ ذکر و نماز سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے دونوں کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے اور دونوں کو تَـزَكّٰی کے بعد ذکر کیا ہے، ذکر اسم بھی ہے اور ذکر صلوٰۃ بھی ہے۔ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰیO اور اگر ایسا نہیں ہے کہ نماز بھی پڑھ رہا ہے، ذکر بھی کر رہا ہے اور تزکیہ نہیں ہوتا تو اس کا ایثار دنیا کی محبت ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ (بلکہ تم دنیا کی محبت کو ترجیح دیتے ہو)

اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور اس نیت پر منجانب اللہ ثمرات مرتب ہوتے ہیں،

ورنہ وہیں کا وہیں رہے گا، ممکن ہے اور بگڑ جائے کہ پہلے اخلاص تھا، اب نفاق آ گیا، پہلے خوش عقیدہ تھا، اب بدعقیدہ ہو گیا۔

خودساختہ سی آئی ڈی :

ایسے سی، آئی، ڈی والے بھی ہوتے ہیں جنہیں حکومت نے مقرر بھی نہیں کیا از خود سی، آئی ڈی والا بنا ہوا ہے۔ جو منافقین حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو کیا ان کو حکومت نے مقرر کیا تھا؟ نہیں تو، خود ہی سی، آئی، ڈی والے بنا کرتے تھے اور دوسروں سے جا کر کہہ دیتے تھے، اپنے نزدیک کسی میں جو کمی معلوم ہوئی اس کی تشہیر کر رہے ہیں، تطہیر کر رہے ہیں، یہ سی آئی ڈی دوسروں سے جا کر جو کمی بیان کر رہے ہیں، وہ درحقیقت کمی کی چیز ہوتی نہیں لیکن اس کی نظر میں چونکہ یہ منافق ہے کمی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے سطحی طور پر جو ایسی بات ہو گئی تھی جو بظاہر خلافِ انصاف معلوم ہوتی تھی (حالانکہ تعمق نظر کے بعد اس میں بڑی مصلحت اور حکمت ہوتی تھی) اس کو اُچھالتے تھے ایسے متعدد واقعات ہیں۔

منافقین کا حال :

ایک واقعہ عرض کیا جاتا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی مجلس ہو رہی تھی، جگہ پُر تھی، مجلس بھری ہوئی تھی کہ اتنے میں اصحابِ بدریینؓ تشریف لے آئے، آپ ﷺ نے اصحابِ بدریینؓ کی رعایت سے بعض صحابہؓ سے فرما دیا مل کر بیٹھ جاؤ، بعض سے فرما دیا کہ تم نے تو بہت باتیں سن لیں اب ان اہلِ بدر کو موقع دیدو، جاں نثار صحابہؓ نے فوراً تعمیل کی اور اُٹھ کر چلے گئے۔ منافقین کو موقع مل گیا، لگے اعتراض کرنے، کہ یہ کونسا انصاف ہے کہ جو پہلے سے بیٹھے ہیں ان کو تو اُٹھا دیا اور نئے آنے والوں کو ان کی جگہ دیدی، اس پر آیت نازل ہوئی :

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (پ۲۸، ع۲)

اے مسلمانو ! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو تم جگہ کھول دیا کرو، اللہ تعالیٰ تم کو (جنت میں) کھلی جگہ دے گا اور جب یہ کہا جاوے کہ اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہوا کرو، اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) ان لوگوں کے (اور زیادہ) جن کو علم دین عطاء ہوا ہے اُخروی درجے بلند کرے گا۔

اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے انتہائی حکمت اور مصلحت سے کام لیا کیونکہ عقلی قاعدہ ہے کہ مجلس میں بیک وقت جگہ نہ ہونے کی صورت میں تناوب فی الاستفاضہ سے کام لیا جاتا ہے کہ پہلی مجلس کو رخصت کردیا جائے تاکہ دوسری مجلس کو استفادہ کا موقع مل جائے تو درحقیقت یہ کمی کی بات نہ تھی لیکن ان میں چونکہ نفاق تھا، اس لئے اس پُرحکمت بات میں بھی ان کو کمی نظر آئی اور دوسروں سے بیان کرنا شروع کردیا۔

معلوم ہوا کہ مجلس میں کوئی سی آئی ڈی والا بھی ہوتا ہے جو دوسروں سے کہتا ہے کہ آج کی مجلس میں یہ بات کمی کی تھی حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ کمی کی بات ہو مگر لوگ سطحی چیزوں کو جلد قبول کرلیتے ہیں کیونکہ حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک واقعہ دو طرح سے منقول ہے۔ شیخ ایک طرح سے بیان کرتا ہے، کسی شخص کو دوسری طرح سے معلوم ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ شیخ سے بیان میں غلطی ہوئی ہے، تو اب یہ شخص کہتا پھرتا ہے کہ یہ واقعہ اس طرح نہیں ہے جیسا کہ بیان کیا گیا بلکہ دوسری طرح ہے اور کتاب بھی دکھلا دیتا ہے، مگر اس سے شیخ کی تکذیب لازم نہیں آتی کیونکہ وہ واقعہ متعدد طریقوں سے روایت کیا ہوا ہوتا ہے۔

طالبِ علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ :

جب میں دارالعلوم میں پڑھتا تھا تو کتاب کا تکرار اس طرح کرتا تھا کہ آنکھ بند کر لیا کرتا تھا اور نگاہ دوڑاتا تھا کہ فلاں صفحہ تک یہ مضمون ہے اور فلاں صفحہ تک یہ مضمون ہے، فلاں یوں کہہ رہا ہے، اور فلاں یوں کہہ رہا ہے، فلاں کا مذہب یہ ہے، فلاں کا مذہب یہ ہے، اب حافظہ کمزور ہوگیا ہے، اس لئے رُکا رُکا جھجکا بولتا ہوں۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خواب میں دیکھا پوچھا آپ کے زمانہ میں طریقِ سلوک وتزکیہ کس طرح تھا؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: ہمارے زمانہ میں سلوک اور تزکیہ تین چیزوں کے ذریعہ تھا، تلاوت، ذکر، صلوٰۃ، اب صرف ذکر رہ گیا ہے، ذکر کی زیادہ کثرت ہے۔ چنانچہ اس آیت میں تینوں چیزوں کا یکجا ذکر ہے۔

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ ۔(پ۲۱ع۱)

آپ اس کتاب کی تلاوت کیجئے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اور نماز کو قائم کیجئے، بلاشبہ نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔

تو تزکیہ کے لئے تینوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اب ذکر کی تو کثرت ہے لیکن تلاوت اور اقامتِ صلوٰۃ اس میں کوتاہی ہے۔

طاعت میں دوام ہے ذکر میں کثرت ہے :

خلاصہ یہ کہ سلوک کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، دوامِ طاعت اور کثرتِ ذکر۔ طاعت میں دوام ہے اور ذکر میں کثرت تو ہے مگر دوام نہیں ہے کیونکہ طاعت سے تو کبھی اور کسی وقت، کسی صورت میں بھی خالی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کلام کے موقع

بھی طاعت ہے، کسی کی طرف دیکھو تو وہاں بھی طاعت ہے، چپ رہنا طاعت ہے تو ضرورت کے وقت بولنا بھی طاعت ہے۔ حرکت میں طاعت ہے تو سکون میں بھی طاعت، ں سے خالی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر ذکر میں دوام یہ عادۃً محال ہے جب کسی طاعت میں انہماک کے ساتھ لگ گیا تو ذکر عادۃً چھوٹ گیا، لیکن دل میں ذکر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دوامِ اطاعت اسی ذکرِ قلبی کا اثر ہے، جو دل میں بیٹھی ہوئی ہے وہی ذکرِ اصلی ہے یمان تو اصلی تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اقرار باللسان اسی کی ترجمانی ہے۔ اس تصدیقِ قلبی اقرار ہر وقت کہاں ہوتا ہے؟ جب کوئی پوچھے گا کہہ دے گا لا الہ الا اللّٰہ محمد رّسول ، مگر ایمان ہر وقت دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ احقر کو ایک آیت یاد آ گئی، وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ، اللہ نے ان کے دل میں کلمۂ تقویٰ چپکا دیا ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ کلمۂ تقویٰ دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ اَلْزَمَ فعل متعدی بدو مفعول ہے، هُمْ مفعول اوّل ہے، اور كَلِمَةَ التقوىٰ مفعول ثانی ہے اور اَلْزَمَ کا فاعل باری تعالیٰ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ پہلے کیسے تھے، اب کیسے ہو گئے، پہلے ایسے تھے کہ خلافِ طبیعت پیش آنے پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے اور اب ایسے ہو گئے کہ کفار سخت، سخت شرطیں لگا رہے ہیں' مگر اللہ کے رسول کے سامنے اپنے کو پامال کئے ہوئے ہیں۔ (یہ آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا تھا کہ میں مکہ میں امن و امان کے ساتھ داخل ہوا ہوں اور حلق و قصر بھی کرایا ہے، یہ خواب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بیان کیا تو صحابہؓ کا اشتیاق زیارت بیت اللہ شریف کا بڑھ گیا اور اسی سال عمرہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب حدیبیہ مقام پر پہنچے تو کفارِ مکہ نے آپ کو عمرہ سے روک دیا اور بہت حیل و حجت کے بعد صلح نامہ مرتب ہونا شروع ہوا، سب سے پہلے کفار مکہ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پر جھگڑا کیا اور کہا کہ پرانا کلمہ باسمک اللّٰهم لکھئے، پھر محمد رسول اللّٰہ لکھنے پر جھگڑا کیا، کہا محمد بن عبداللہ لکھئے۔ ایک شرط یہ تھی کہ اگر ہمارا آدمی مدینہ

آئے تو آپ کو واپس کرنا پڑے گا اور تمہارا آدمی مکہ آئے گا تو ہم واپس نہ کریں گے۔ اس پر صحابہ کچھ جزبز ہوئے مگر رسول اللہ ﷺ کے سمجھانے پر سب مان گئے، اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے) کیونکہ ہم نے ان کے دل میں کلمۂ تقویٰ جما دیا ہے، کلمہ کی اضافت تقویٰ کی طرف ہے۔ دونوں مضاف، مضاف الیہ ہیں۔ ترجمہ ہے تقویٰ کے کلمہ کو، جب کلمہ بولتے ہیں تو ذہن کہاں جاتا ہے، چوتھے کلمہ کی طرف؟ جب کسی سے کہا جاوے کہ بھائی کلمہ سنانا تو وہ چوتھا کلمہ سنائے گا، نہیں نہیں بلکہ کلمۂ طیبہ کی طرف جاتا ہے (فی تفسیر الکبیر (والزمهم کلمة التقویٰ) فیه وجوه. اظهرها انه لااله الا اللّٰه ج ۲۸ ص ۱۰۳) سنائے گا۔ کلمۂ طیب کی حقیقت' ذاتِ باری تعالیٰ کا موصوف بکمالات ہونا اور نقائص و عیوب سے منزّہ (پاک صاف) ہونا اور رسول اللہ ﷺ کا موصوف برسالت ہونا ہے، اس کلمۂ طیبہ کا تقاضا ہے تقویٰ اس لئے کلمہ کی اضافت تقویٰ کی طرف کی گئی ہے اور تقویٰ کی حقیقت دوامِ اطاعت ہے تو کلمہ کا تقاضا ہے دوامِ طاعت۔

الزمهم کلمة التقویٰ میں لفظ کلمہ سے ذکر کی طرف اشارہ ہے اور لفظ تقویٰ سے دوامِ طاعت ثابت ہوتا ہے کیونکہ کلمہ کی اضافت تقویٰ کی طرف ہو رہی ہے تو معلوم ہوا کہ کلمہ کا اثر تقویٰ یعنی دوامِ طاعت ہے۔

الغرض حق تعالیٰ کے فضل اور حضرت والا کی برکت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ دوامِ طاعت اور کثرتِ ذکر یہ مطلوب ہے۔ دوامِ طاعت سے مراد اعمالِ ظاہرہ اور اعمالِ باطنہ کی پابندی ہے اور کثرتِ ذکر سے مراد کثرت سے زبان پر ذکر جاری رہنا ہے۔ جب فرصت ملے فوراً ذکر شروع کر دیا جائے اور اعمالِ باطنہ سے مراد اخلاقِ رذیلہ کا ازالہ اور اخلاقِ حمیدہ کا رسوخ و ملکہ ہے۔ اخلاقِ رذیلہ کا اصل میں تو امالہ ہے مگر وہ امالہ ازالہ ہی کے درجہ میں ہے، جیسے قرأت میں جب امالہ کیا جاتا ہے تو اصل حرکت ختم سی ہو جاتی ہے جیسے مجریها کو مجرے ها پڑھتے ہیں تو زیر جو اصل حرکت ہے امالہ میں ختم سی ہو جاتی ہے۔

کوزیری کی کچھ بو باقی رہتی ہے اور اخلاقِ حمیدہ کا رسوخ بملکہ حاصل ہونا یہ مقصود ہے۔

ذکر میں تلاوت بھی آ گئی اور تلاوت کے علاوہ جو اور اذکار ہیں وہ بھی داخل ہو گئے پھر یہ ذکر کبھی بلا واسطہ ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ اور جب بواسطۂ طاعت ذکر بھی ذکر میں داخل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کل مطیع للّٰہ فھو ذاکرٌ تو ذکر کے اس عام معنٰی کے اعتبار سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دوامِ ذکر بھی مطلوب ہے کیونکہ جب ذکر کو بلا واسطہ اور بواسطہ دونوں کو عام کر دیا اور ذکر بالواسطہ یہی ہے کہ اللہ نے جس وقت جس عمل کے کرنے کو فرمایا ہے اس میں بحدود و قیود باخلاص لگا رہے اور اس طرح لگا رہنا مطلوب ہے۔ تو معلوم ہوا کہ دوامِ ذکر بھی مطلوب ہے اور دوامِ طاعت بھی مطلوب ہے۔ دونوں مطلوب ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ دوامِ طاعت بلا واسطہ مطلوب ہے اور دوامِ ذکر بالعموم مطلوب ہے۔ چاہے بلا واسطہ ہو یا بواسطہ ہو، تو جب کسی طاعت میں لگا ہوا ہے، تو اس حالت میں ذکر قلبی میں بھی کچھ قلتِ توجہ آ گئی ایسے وقت میں توجہ الی الطاعت کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب دو عبادتیں بیک وقت جمع ہو جائیں اور تقدم تأخر نہ ہو سکے تو اہم کو مقدم کیا جائے گا۔ دلیل حضرت عمرؓ کا ارشاد :

اجھز جیشی و انا فی الصلٰوۃ ہے اپنے لشکر کی ترتیب دیتا ہوں اور نماز میں ہوتا ہوں۔

عمر فاروقؓ کے سامنے دو عبادتیں ہیں، ایک نماز میں کمال توجہ جس کے عبادت ہونے میں کوئی شبہ نہیں، دوسرے تجہیز جیش (ترتیب لشکر) یہ بھی عبادت ہے کیونکہ اعلاء کلمۃ اللہ کفار کے مقابلہ میں فتح پر موقوف ہے اور فتح عادۃً اس پر موقوف ہے کہ لشکر کو طریق جنگ پر ترتیب دیا جائے تو تجہیزِ جیش بھی عبادت ہے اور چونکہ لشکر مقابلہ میں گیا ہوا ہے اس لئے نماز میں اس کی ترتیب کی طرف ذہن منتقل ہو گیا تو اب دو عبادتیں جمع ہو گئیں، ایک نماز میں کمالِ توجہ دوسری تجہیزِ جیش اور دوسری اوّل سے اہم ہے کیونکہ عمر فاروقؓ کو اُمورِ سلطنت

میں مشغولی کی وجہ سے تجہیزِ جیش کا یکسوئی سے وقت نہیں ملتا تھا اور نماز میں یکسوئی کی وجہ سے یہ مقصود حاصل ہو گیا اور یہ اہم وضروری، اس لئے اس کو مقدم فرمایا۔ اسی طرح ذکرِ قلبی اور توجہ الی الطاعت دونوں عبادت ہیں لیکن عین اطاعت کے وقت ذکرِ قلبی کی طرف توجہ ضعیف ہو جائے تو یہ مرجوح اور توجہ الی الطاعت راجح ہو گی۔ اسی طرح عمر فاروقؓ کبھی خطبہ پڑھ رہے ہیں اور خطبہ پڑھتے پڑھتے کچھ اور زبان سے نکال رہے ہیں۔ سامعین حیران ہیں کہ یہ کیا ہوا خطبہ پڑھتے پڑھتے فرما رہے ہیں :

یا ساریَ الجبل، یا ساریَ الجبل ۔ (مشکوٰۃ شریف ج۲ص۵۴۶)

اے ساریہ! پہاڑ کی پناہ لو۔ اے ساریہ! پہاڑ کی پناہ لو۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضرت ساریہؓ کو جہاد کے واسطہ بھیجا تھا، عین جہاد کے وقت آپ کو منکشف ہوا کہ دشمن کا غلبہ ہوا چاہتا ہے، آپ نے فرمایا ساریہ پہاڑ کو اپنے پیچھے کر لو یہ آواز کرامت کے طور پر اہلِ لشکر کے کان میں پہنچ گئی۔ فوراً اس پر عمل فرمایا اور دشمن پسپا ہو گیا۔ (ھکذافی المشکوۃ ج۲ص۵۴۶)

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کی جانب سے گھوم کر دشمن کے آنے کا احتمال ہوگا)

تو دیکھئے خطبہ طاعت تھا، ایسی طاعت کہ خطبہ نہ ہو تو جمعہ ہی نہیں ہوتا تو عمر فاروقؓ نے ایک طاعت میں دوسری طاعتِ اہم کو داخل فرمایا اور اختتامِ نماز تک اس کو مؤخر نہیں فرمایا کیونکہ اہم تھی۔

الغرض ذکر عرفاً وعموماً زبان سے متعلق ہوتا ہے جیسے کلمہ بولیں تو عرفاً کلمہ طیبہ کی طرف ذہن جاتا ہے اسی طرح جب ذکر بولتے ہیں تو عرفاً مراد ذکرِ لسانی ہوتا ہے اور ذکرِ قلبی وہ دل میں جما ہوا ہوتا ہے۔ وہی ذکرِ قلبی ہے لیکن طاعت کے وقت یہ ذکر قلبی بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔ تو اس کی فکر نہیں کرنی چاہئے اور طاعت کی طرف ہی متوجہ رہنا چاہئے

جیسا کہ ابھی ارشاد گزرا کلّ مطیع لِلّٰہ فھو ذاکر۔

بعض حضرات مشاغلِ دینیہ اور مشاغلِ ضروریہ انسانیہ میں مشغول ہوتے ہیں۔ ذکرِلسانی کی کثرت سے معذور ہوتے ہیں، ان کو حسرت ہوتی ہے کہ یہ وقت کثرتِ ذکر کا ہے یہ اقل قلیل ذکر والا بھی جو مشاغلِ دینیہ اور مشاغلِ ضروریہ انسانیہ میں لگا ہوا ہے۔ دوامِ ذکر میں ہے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ اقل قلیل کثیر کس طرح ہے؟ جواب یہ ہے کہ تھوڑا، تھوڑا روز کیا جائے تو بہت ہو جاتا ہے۔ تو جب قلیل یا اقل قلیل پر دوام ہے تو کثیر ہوگا۔ بعض صاحبان یہ خیال کرتے ہوں گے کہ اس قلیل ذکر سے تو یہ اچھا ہے دو چار دن کہیں بیٹھ کر اچھی طرح ذکر کرلیں اور بالکل خاموش رہیں لیکن یہ کہاں کثرت ہے؟ یہ تو ایسا ہے کہ دو چار دن بیٹھ کر خوب اچھی طرح کھالیا اور پھر تین چار دن کھانا چھوڑ دیا تو وہ کیا کثرتِ طعام ہوگا؟ کچھ نہ ہوگا، اور ایک شخص قلیل، قلیل کھانا روز کھا رہا ہے تو اس سے وہ کثیر ہو رہا ہے یا قلیل؟ ظاہر ہے کہ کثیر ہو رہا ہے۔ اس سے صحت قائم رہے گی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مالدار صحابی تھے۔ کسی نے پوچھا آپ اتنے بڑے مالدار کس طرح ہوگئے؟ فرمایا میں تجارت میں اس کا خیال رکھتا ہوں کہ قرض نہ دیا جائے نقد دیتا ہوں اور نفع کم سے کم لیتا ہوں، وہ تجات ہی کیا ہوئی جس میں نفع نہ ہو مگر بنسبت دوسرے تاجروں کے نفع کم لیتا ہوں تو میری بکری زیادہ ہوتی ہے تو یہ نفع قلیل، زیادہ بکری پر نفع کثیر ہوگیا۔ یوں ہوئی ہے یہ کثرتِ دولت، تو دیکھئے قلیل، کثیر ہوگیا، یا ابھی نہیں ہوا۔ اور دوسروں کا کثیر نفع، قلیل ہوگیا، اس طرح کہ ایک صاحب نفع زیادہ لیتے تھے، گاہکوں کو معلوم ہوا وہ کھٹک گئے اور کہنے لگے کہ جہاں نفع کم لیا جاتا ہے وہاں سے کیوں نہ لیں، جہاں ہمیں چار پیسے میں چیز ملتی ہے وہاں سے کیوں نہ لیں چھ والی کیوں لیں؟ چیز وہی ہے۔ یہ نظیر سمجھ لی گئی۔ اسی طرح طالبِ تزکیہ مشغول کا اقل قلیل ذکر، کثرتِ ذکر کرنے والے سے

ثواب وقرب میں کم نہیں۔

خلفاء کے لئے باہم مشورہ کی افادیت :

اسی لئے یہ طریقت کا مسئلہ ہے کہ اپنے شیخ کا انتقال ہو گیا اور خود خلیفہ شیخ ہے، ش مرحوم کی طرف سے بیعت لینے کی اجازت ہے۔ اس خلیفہ کو کوئی بات اُلجھن کی پیش آ گئی اپنے شیخ کا کلام سامنے ہو تو اس سے حل کرے لیکن اس کے باوجود حل نہ ہو مزید طمانیت کے لئے کسی سے مشورہ کی ضرورت ہو رہی ہے تو اپنے خلفاء میں سے کسی خلیفہ سے جس سے طبیعت مل گئی ہے، بے تکلفی ہے یا پیر بھائیوں میں سے کسی پیر بھائی سے اس کو حل کرے اور اگر ان میں سے کوئی نہیں ہے تو کسی منتہی صاحبِ ذوق سے اس اُلجھن میں مشورہ کر لے، یہ مسئلہ ہے اور اسے مشورہ لینے میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہو سکتی کیونکہ رُکاوٹ جاہ سے ہوتی ہے اور یہ خلیفہ جاہ کو پھونک چکا ہے، فنا کر چکا ہے۔ اور جہاں علمِ باطن میں ایسی رُکاوٹ کی بات پیش آ جاتی ہے، علومِ ظاہر میں بھی ایسی بات پیش آ جاتی ہے۔

مولانا محمد یعقوبؒ کی حکایت فناءِ نفس :

جیسے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ بخاری شریف کا درس دے رہے ہیں، بیان کرتے ہوئے ایک جگہ پر رُکاوٹ ہو گئی۔ مولانا صدر مدرس تھے، کتاب لے کر اُٹھے اور اپنے ماتحت استاذ کے پاس پہنچ گئے کہ مولانا ذرا دیکھنا یہ مقام کچھ اٹکا سا ہوا ہے، اس کی تقریر فرما دیجئے، ان استاذ صاحب نے دیکھا اور تقریر کر دی، مولانا اپنی درسگاہ میں تشریف لے آئے اور درسگاہ میں آ کر طلبہ سے کہا کہ فلاں مدرس صاحب کے پاس اس مقام کو ان سے حل کرنے کے لئے گیا تھا، انہوں نے یوں تقریر فرمائی ہے اور اس مقام کا خوب حق ادا کر دیا اور اس بات کو کئی دفعہ ذکر کرتے تھے یہ اس لئے تھا کہ تزکیہ کامل ہو چکا تھا اور یہاں آج کل کوئی تزکیہ نہیں۔

تزکیۂ نفس :

حب الدنیا جو اصل اصول اور جڑ ہے۔ حب الدنیا رأس کل خطیئۃ (دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے) یہ جڑ جا چکی ہے اور جب یہ جڑ جا چکی ہے تو تنا کہاں رہا؟ اس تنا میں جو شاخ میں سے شاخ نکلتی ہے وہ کہاں رہی؟ دنیا کی محبت جڑ ہے اور وہ چلی گئی اور ایسی چلی گئی کہ اب وہ جڑ جمتی ہی نہیں، اسی کو زوالِ اخلاق رذیلہ بملکۂ تامہ کہتے ہیں۔ (یادِ باری تعالیٰ) ذاتِ باقی دل میں ایسی بیٹھی کہ ذواتِ فناء کو دل میں رہنے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ باقی اور فانی دونوں ضد ہیں اور ضدین ایک جگہ جمع نہیں ہوتی۔

بیوی سے عشق ولایت کا درجہ ہے :

جس کو اپنی بیوی کے ساتھ عشق ہے، اس کے ولی ہونے میں کیا شبہ ہے؟ کیونکہ ولایت کا دامن عجیب وغریب عفت کو چاہتا ہے اور بیوی کے ساتھ عشق ہونے پر غیر کی طرف نظرِ شہوت نہ ہوگی تو یہ شخص انتہائی درجہ کا عفیف ہوگا تو اس کے ولی ہونے اور اس صفت کے ولایت کا درجہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ حضرت والا کا جملہ تو صرف اتنا تھا کہ جس کو اپنی بیوی سے عشق ہو جس کو عشق کہتے ہیں اس کے ولی ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اس کی شرح کی گئی جو اوپر مذکور ہوئی۔

اور بیوی کے ساتھ عشق، عشقِ غیر اللہ نہیں ہے، وہ اللہ ہی کے لئے ہے۔ حضور ﷺ کی دعاء ہے :اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَ حُبَّ مَنْ یَّنْفَعُنِیْ حُبُّہٗ عِنْدَکَ. (مناجاتِ مقبول، م۲ص ۱۷)

یعنی اے اللہ! میں آپ کی محبت کا رزق مانگتا ہوں اور اس کی محبت کا جس کی محبت آپ کی محبت میں معین ہو۔

تو بیوی کے ساتھ ایسی محبت باری تعالیٰ کے ساتھ محبت میں معین ہوگی تو پھر یہ عشقِ

غیر اللہ نہ ہوگا؟ ایسا شخص عفت مآب ہوگا جس کی دلیل یہ ہے کہ رسولِ پاک ﷺ ذاتِ باری تعالیٰ کا سب سے بلند درجہ عشق تھا لیکن اس کے باوجود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی عشق تھا، باوجود اس عشق کے حقوقِ عدلیہ (برابری) سب کے ساتھ تھے۔ حالتِ مرضِ وفات میں بھی باریک باریک باتیں (حقوق سے متعلق) پوری فرمائی جارہی ہیں لیکن آپ عائشہؓ کی باری کا انتظار فرماتے ہیں۔ جب بقیہ بیویوں کو اس کا علم ہوا کہ آپ عائشہؓ کی باری کا انتظار فرماتے ہیں، ہر ایک باری میں تشریف لانے میں آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو سب نے اتفاق کر کے کہہ دیا کہ بس اب آپ عائشہؓ کے یہاں ہی رہا کیجئے۔ تو حضورِ اکرم ﷺ کو عائشہؓ کے ساتھ محبت تھی، تو بیوی کے ساتھ عشق دوام طاعت کے خلاف کیا ہوتا بلکہ دوامِ طاعت میں داخل ہے یہ بات اس پر چلی تھی کہ ذکر کی دو قسم ہیں۔ ذکر بلاواسطہ یا ذکر بواسطہ اور اس معنیٰ پر دوام ذکر بھی ہے پھر ذکر کی قلت اور کثرت کی بحث آ گئی تھی، اسی ضمن میں تداخلِ عبادتین کا ذکر آ گیا تھا۔

کہ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى میں کلمہ کی اضافت تقویٰ کی طرف ہے اور کلمہ سے مراد کلمۂ طیبہ ہوا کرتا ہے جو کہ ذکر ہے اور پھر اس کا تقاضا تقویٰ ہے جو کہ وجوبِ طاعت بدوام کا نام ہے اور کلمہ کا تقاضا کثرتِ ذکر ہے۔ یہ کلمہ جو ایمان کا اصل اُصول ہے اس ایمان کے ساتھ جب کلمہ کا تقاضا تقویٰ آتا ہے تو حق تعالیٰ ایمان میں زیادتی فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْنَ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ (سورۂ فتح)

وہ خدا ایسا ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل پیدا کیا تا کہ ان کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو۔ (بیان القرآن)

ایمان میں تحمل پیدا کرنے سے زیادتِ ایمان مقصود ہے کیونکہ لیزدادوا جمع کا

صیغہ ہے اور ایمانًا تمیز ہے جو ابہام نسبت کو رفع کرتی ہے کہ ان کی زیادتی من حیث الایمان ہے، مع ایمانھم ان کے ایمان کے ساتھ، مطلب یہ ہوا کہ پہلے سے جو ایمان ہے اس ایمان میں تحمل عطاء ہونے سے اور زیادتی ہوگئی تو معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی ہوتی رہتی ہے اور وہ زیادتی ایمان میں ایمان کے ساتھ تقویٰ کے ذریعہ سے ہے۔

ایمان کی زیادتی مطلوب ہے :

اور اچھی چیز میں کون زیادتی نہیں چاہتا، کاشتکار کاشت میں زیادتی چاہتا ہے، زمیندار زمین میں زیادتی چاہتا ہے، تاجر تجارت میں زیادتی چاہتا ہے تو اچھی چیز میں تو ہر ایک زیادتی چاہتا ہے۔ ایمان سے زیادہ اچھی چیز اور کونسی ہوگی، پھر اس میں زیادتی کی طلب کیوں نہیں؟

زیادتی کے اسباب :

اور اگر ہے تو ہر چیز کی زیادتی کے اسباب و ذرائع ہوا کرتے ہیں، کاشتکار کاشتکاری میں زیادتی چاہتا ہے تو زمین اچھی طرح جوتے گا، اچھا بیج وقت پر ڈالے گا، پانی وقت پر دے گا، آندھی اولے سے حتی الامکان حفاظت رکھے گا، اسی طرح زمیندار روپیہ پیسہ سے زمین خریدے گا، جب اس میں زیادتی ہوگی، اسی طرح سے تاجر اچھا مال وقت پر سستا خریدے اور وقت پر اچھے داموں میں بیچے، تب زیادتی ہوگی اسی طرح ایمان میں زیادتی کے لئے تم چاہتے ہو تو اس کی یہ شکل ہے، اس طاعت اور ذکر میں لگ جانا ہے، ذکر کی اصل یہ ہے کہ دل میں کسی ذات کا بٹھا لینا اور اس کا زبان پر ذکر آتا رہنا کہ دل میں بیٹھی ہوئی چیز کا تو بہانہ، بہانہ سے ذکر آتا رہتا ہے اور دل میں بیٹھی ہوئی چیز وہ ہوتی ہے جس سے غایت درجہ محبت ہوتی ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ کے علاوہ غایت محبت کا کوئی محل نہیں ہے، لہٰذا پھر زبان پر اس کے نام نہ آتے رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کے اندر ایسا عموم فرما دیا ہے کہ طہارت کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم دوامِ ذکر چاہتے ہیں تو طاعتِ دائمی میں ذکر ہے جیسا کہ اوپر بیان کی گئی کل مطیع للّٰہ فھو ذاکر (ہر اللہ کا مطیع ذاکر ہے) کہیں بلاواسطہ کہیں بواسطہ تو اخلاص کے ساتھ، قناعت کے ساتھ، بلاحرص وطمع ولالچِ مالیہ جو مدرس دین کی تعلیم دیتا ہے اگر چہ میزان الصرف ہی کی سہی جو کہ بنیادِ ہے بخاری شریف کے لئے وہ مدرس اس میزان کے درس و تدریس کے وقت طاعت اور توجہ الی اللہ میں ہی ہے، اگر چہ فَعَلَ فَعَلَ کی گردان کر رہا ہے، یا گردان سن رہا ہے اور توجہ سے سن رہا ہے کیونکہ اگر توجہ نہیں کرے گا تو کوئی طالب علم گردان غلط کر سکتا ہے، جو منصبِ تدریس کے خلاف ہے۔ تو لامحالہ اسے سننے کی طرف توجہ کرنا ہوگی تو توجہ الی اللہ میں ضعف آوے گا کہ نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف توجہ نہیں کر سکتا، لیکن یہ ضعف، ضعف میں داخل نہیں ہے، جیسے کسی کو اتفاق سے چھینک زور سے آ گئی یا اتفاق سے کھانسی آ گئی تو اس کو تھوڑی سی دیر کے لئے ضعف کا احساس ہو گیا، اس کو ضعف نہیں کہتے۔ ضعف تو اسے کہتے ہیں کہ ہر موقع پر کمزوری کا اظہار ہو رہا ہے، جو دوسری طاعت میں مشغول ہوتے ہوئے ذکر میں یا توجہ الی اللہ میں کچھ ضعف ہو گیا، اس کو ضعف نہیں کہتے، ضعف تو اسے کہتے ہیں کہ اکثر و بیشتر دل میں اللہ کا خیال ہی نہیں، دھیان ہی نہیں، اکثر و بیشتر زبان پر اللہ کا نام ہے ہی نہیں۔

سالک کو مسائلِ سلوک کی ضرورت:

سالک کو مسائلِ سلوک جاننے کی اشد ضرورت ہے، جیسے فقہ کے مسائل ہوتے ہیں اسی طرح سلوک کے بھی مسائل ہیں، نماز پڑھنے والوں کو نماز کے مسئلوں کے جاننے کی نہایت ضرورت ہوتی ہے۔ تو ایسے ہی باطنی تزکیہ کی عبادت و طاعت میں لگنے والے کو بھی ان مسائلِ تزکیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت ہے۔ مولانا گنگوہیؒ آخر عمر میں فرماتے تھے کہ اب جا کر اتنا ہوا ہے کہ نماز کے مسئلہ کے لئے کسی کتاب کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس سے اندازہ لگائیں کہ اتنی مدت میں نماز کے مسئلوں میں کتاب دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس میں بتلایا کہ دوسری عبادتی چیزوں میں چاہے وہ من حیث العبادات ہوں یا من حیث المعاملات ہوں، ان میں کتاب دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

جب عباداتِ ظاہرہ نماز وغیرہ کے مسائل میں اتنی کاوش کی ضرورت ہے تو اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ عباداتِ باطنہ میں مسائل جاننے کی ضرورت ہے۔

ایک عورت نے مسئلہ معلوم کرایا کہ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ بعض غیر محرم مرد بغیر اجازت اندر چلے آئے ہیں، معتدہ کی ان پر نظر پڑ گئی تو مسئلہ معلوم کرایا ہے کہ ان پر نظر پڑنے سے میری عدت تو نہیں ٹوٹ گئی۔ اس عورت کو ضرورت پڑی تو اس نے مسئلہ معلوم کرایا۔ جواب یہ ہے کہ گھر کا جو آخری دروازہ باہر نکلنے کا ہے اس سے باہر نہ جاوے اور گھر میں چاہے کوئی نظر آ جاوے تو اس سے عدت نہیں ٹوٹتی۔ رہا پردہ تو جس سے پردہ ہے ہر وقت پردہ ہے، چاہے عدت میں ہو یا نہ ہو۔

اسی طرح ایک صاحب نے مسئلہ پوچھا تھا کہ میرے پاس غیر ملک کا آیا ہوا کالا کپڑا رکھا تھا، میں نے اس کے پہننے کے لئے کپڑے سلوا لئے تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ کالے کپڑے پہننا تو حرام ہے، جواب دیا گیا کہ آپ ان سے پوچھیں کہ حرام ہونے کی کیا وجہ ہے؟ دلیل بیان کیجئے! اس میں سوال کا جواب بھی ہو گیا کہ جب ناجائز ہونے کی کوئی شرعی وجہ نہیں ہے تو جائز ہے۔ بعض دفعہ شریعت کا علم نہ ہونے سے ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ تو دیکھئے نہ اس عورت کی عدت ٹوٹی اور نہ کالا کپڑا پہننا حرام ہے لیکن علم نہ ہونے سے پریشان ہو گئے اور مسئلہ معلوم کرایا۔ ایسے ہی سلوک طے کرتے ہوئے کوئی بات پیش آ گئی اب اس کو خبر نہیں تو پریشان ہو گیا، حالانکہ واقع میں وہ بات ٹھیک تھی مگر اپنے نظریئے میں

اس کو ٹھیک نہیں سمجھا، اس لئے سالک کو مسائلِ سلوک جاننے کی ضرورت ہے۔

مجلس شیخ مجلس علمیہ سلوکیہ ہوتی ہے :

اسی لئے مجلسِ شیخ سالکوں کے لئے مجلس علمیہ سلوکیہ ہوتی ہے، مجلس علم تزکیہ ہوتی ہے اس میں صرف ذکر کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ علم ذکری کے لئے ہوتی ہے یعنی آثار ذکر کے ظہور پر جن علموں کی ضرورت ہوتی ہے، ان علموں کے بیان کے لئے مجلس ہوتی ہے، اسی طرح دوامِ طاعت مع الذکر پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں ان کے علم کے لئے مجلس ہوتی ہے۔

مجلس کا نفع کس کو ہوتا ہے ؟

تو جس طرح نماز پڑھنے والے کو نماز کے مسائل کا تذکرہ نفع دے گا اور وہ اس تذکرہ سے خوش ہوگا، ایسے ہی جو سلوک کو طے کررہے ہیں، تزکیہ میں لگے ہوئے ہیں ان کو جو باتیں پیش آتی رہتی ہیں ان کے آثار ظاہر ہوتے رہتے ہیں، ان کو یہ باتیں مفید ہوں گی ان کا جی خوش ہوگا، ان کے جی کو یہ باتیں لگیں گی اور بعض جملۂ علمیہ پر ان کو حال بھی آجاوے گا، جیسے ابھی عرض کیا گیا کہ اقل قلیل ذکر مشغولی من حیث الدین یا من حیث الدنیا جائزہ کے وقت تکثیرِ ذکر سے من حیث الثواب والقرب کم نہیں ہے، یہ مسئلہ سلوک سن کر سالک کا جی کیسا خوش ہوگا، وہ سوچے گا کہ آج میرے سوال کا جواب مل گیا کہ جس کو میں کوتاہی خیال کر کے غمگین ہوتا تھا، آج مجھے اس کا تسکینی جواب مل گیا، اس کا جی خوش ہوگا، کام میں لگا رہے گا۔

شاہ فضل الرحمٰن صاحب کا واقعہ :

حضرت والاؒ نے حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کا واقعہ سنایا، اس واقعہ سے پہلے ایک دوسرا واقعہ یاد آگیا جس میں اتباعِ شیخ کا سبق ہے۔ پہلے وہ سناتا ہوں یہ بھی

حضرت والاؒ نے سنایا تھا کہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں یہ بہت رہتا تھا کہ جو آیا کہا جا رہا ہے اس کو نکالو، ارے نکالو، ارے نکالو، ایک مرتبہ شاہجہان بیگم والیہ بھوپال کے وزیر پہنچ گئے، رات کا وقت تھا، حسبِ عادت فرمایا، جاؤ جاؤ، نکالنے کا حکم فرمادیا، صاحبزادہ جن کا نام محمد میاں تھا (ان محمد میاں صاحب کے دو صاحبزادے تھے، نعمت اللہ میاں، فرحت اللہ میاں، میں نے ان دونوں پوتوں کو دیکھا ہے) تو صاحبزادہ نے کہا کہ یہ نواب بیگم بھوپال کے وزیر ہیں، فرمایا میں کیا کروں؟ وزیر ہیں تو اپنے گھر کے ہیں، نکالو اور زور سے کہا، مولانا پر ہر وقت جذب رہتا تھا، صاحبزادہ نے پھر عرض کیا فرمایا اچھا بلالاؤ، بلایا گیا، پوچھا کیوں آئے ہو؟ عرض کیا بیگم صاحبہ نے دُعا کے لئے بھیجا ہے، فرمایا بہت اچھا دعا کرتا ہوں، دعا ہوگئی، ٹھہرنے کی اجازت بھی مل گئی، مگر یہ شرط لگادی کہ آدھی رات تک مثلاً بارہ بجے یا ایک بجے تک ٹھہرنے کی خانقاہ میں اجازت ہے، اس کے بعد خانقاہ سے چلے جانا۔ عرض کیا بہت اُچھا۔ جب وہ وقت آیا (ذرا خیال فرمایئے گا کہ پہلے لوگ کیسے ہوتے تھے اور بعض معتقدین کیسے ہوتے تھے؟ اور اب تو کچھ پوچھو مت کیسے ہیں؟) حضرت والا سنا رہے ہیں کہ جب وہ وقت آیا تو وزیر صاحب اپنا سامان لے کر چلنے لگے، بعض مقیمینِ خانقاہ کی آنکھ کھل گئی، دیکھا کہ اس وقت جا رہے ہیں تو ان معتقدین، مقیمینِ خانقاہ نے کہا اس وقت آپ کہاں جائیں گے؟ کہاں رہیں گے؟ رات کا وقت ہے پریشانی ہوگی، یہیں رہئے صبح کو چلے جایئے۔ وزیر صاحب نے کہا جو خاندانی آدمی تھے، خاندان کا ایک اثر ہوا کرتا ہے، انہوں نے کہا کہ شیخ کا حکم ہے، اسی وقت تک ٹھہرنے کی اجازت تھی، اگر اس وقت کے بعد ٹھہرتا ہوں تو یہ خیانت ہے اور حکم کی مخالفت ہے، میں نہیں ٹھہر سکتا، خانقاہ سے باہر جا کر کسی مسجد میں ٹھہر جاؤں گا، چنانچہ نہیں ٹھہرے، اسی وقت چلے گئے۔

آپ اس سے اندازہ کیجئے کہ معتقد کیا کہہ رہے ہیں؟ اور وہ وزیر صاحب کس درجہ عمل کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ مفید ہونے کے سبب ضمناً سُنا دیا، مجھے سنانا دوسرا واقعہ ہے کہ

اسی طرح مولانا کے یہاں ایک شخص آیا، سلام ومصافحہ وغیرہ اچھی طرح ہوا۔تھوڑی دیر کے بعد فرمایا، اچھا جاؤ، اُٹھو، اب وہ اُٹھتا نہیں۔ مولانا خود اُٹھے اور اس شخص کا بستر اُٹھا کر دروازہ پر رکھ دیا، وہ شخص اُٹھ کر چلا گیا اور بسترہ دروازہ سے لاکر اندر رکھ دیا۔ مولانا نے فرمایا پھر آ گیا، اُٹھو، جاؤ، جب نہیں اُٹھا تو مولانا نے پھر بستر اُٹھا کر دروازہ کے باہر رکھ دیا، اس نے اُٹھا کر پھر اندر رکھ لیا، اسی طرح تین چار چکر ہوئے، پھر فرمایا کھانا کھالو، کھانے کا وقت ہے یہ فرما کر اندر تشریف لے گئے، گھر جا کر کھانا بھیجا، اس مسافر نے کہا کہ ساری فضیحت تو کھانے کی تھی، میں کھانا نہیں کھاتا، کھانا واپس کر دیا۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی خود کھانا لے کر آئے اور کہا بھائی لڑائی تمہاری میری ہے، کھانے سے تو نہیں، کھانا کھالو، مسافر نے کہا میں نہیں کھاتا، فرمایا کھانے سے کیا لڑائی ہے کھانا کھالو۔ خیر کھانا کھالیا، پھر پوچھا کہ کیوں آئے ہو۔ عرض کیا کہ باطنی حالت میں کچھ رُکاوٹ ہوگئی ہے، اس کو حل کرنے آیا ہوں۔ فرمایا او ہو پہلے کیوں نہیں کہا تھا، میں تو سمجھا تھا کہ جس طرح یہ سارے دنیادار دنیا کے لئے دعا کرانے آتے ہیں، اسی طرح تم آئے ہوگے، یہ لوگ اتنا ہمارا وقت خرچ کرتے ہیں۔

دیکھئے حضرت کو کشف ہوا؟ نہیں ہوا حالانکہ مولانا کو کشف بہت ہوتا تھا لیکن اس وقت نہیں ہوا۔ کشف لازمِ بزرگی نہیں ہے، ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا۔ پھر فرمایا اچھا بیٹھو، بیٹھ گئے اور وہ حال جس میں رُکاوٹ ہوگئی تھی حل فرمایا، وہ شخص سلام ومصافحہ کر کے چلا گیا۔

تو دیکھئے سلوک وتصوف جس کو تزکیۂ باطن کہتے ہیں، اس میں اعمال کے ساتھ کچھ چیزیں نئی قسم کی سامنے آجاتی ہیں، ان میں پریشانی ہوجاتی ہے، ان کے حل کرنے کے لئے کچھ اُمور کی ضرورت ہوتی ہے، انہی کو مسائلِ تصوف کہتے ہیں، یہ مجالس انہی مسائلِ تصوف کے بیان کے لئے ہوتی ہیں، مسائلِ فقہ کے لئے نہیں ہوتی۔ یہ مجالس ان کے لئے مفید ہوتی ہے جو تزکیۂ باطن میں لگے ہوئے ہیں اور جو ایسے نہیں ہیں، ان کو چاہئے کہ چپ

چاپ آ کر بیٹھ جائیں، ان کی سمجھ میں آئے گا نہیں، کسی بھوکے سے پوچھو کہ دو اور دو کیا ہوتے ہیں تو وہ کہے گا چار روٹی، کیونکہ وہ روٹی کا طالب ہے۔ چار روپیہ نہیں کہے گا کیونکہ اس وقت وہ پیسہ کا طالب نہیں ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب کلمہ کا تقاضا تقویٰ آ جاتا ہے تو حق تعالیٰ مؤمن متقی کے دل میں سکینہ، تحمل پیدا فرما دیتے ہیں تا کہ اس ایمان میں جو اس وقت موجود ہے زیادتی ہو جاوے۔ معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے، اس کا طریقہ اس کے اسباب، وسائل و ذرائع کیا وہ دوامِ طاعت اور کثرتِ ذکر ہے۔

عوام کے کام کی بات :

یہاں ایک بات عوام کے سمجھنے کی ہے کہ حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کے دل میں سکینہ پیدا فرما دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مؤمن کے دل میں تحمل کا ہونا ضروری ہے جس کا دوسرا نام وقار بھی ہے یعنی دوسروں کی طرف سے خلافِ طبیعت پیش آنے پر یا پیش آتے رہنے پر سکینہ ہونا چاہئے، تحمل ہونا چاہئے، وقار سے باہر نہ نکل جائیں، تیزی آواز کے اندر، تیزی کلام کے اندر، تیزی الفاظ کے اندر نہ آنے پاوے۔ اس کڑوی چیز کو میٹھا گھونٹ سمجھ کر پی لیوے اور میٹھا گھونٹ بنا کر کب پئے گا، جبکہ سلوک کی چیز اندر دبی ہوئی ہے۔ اس کا خیال آ گیا، اس جمی ہوئی چیز کا تصور آ گیا، وہ جمی ہوئی چیز یاد آ گئی، اس اندر کی چیز نے کڑوی چیز کو میٹھا کر کے پلا دیا۔ وہ چیز کیا ہے؟ جو اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ ہے رضا اس رضا نے تمام تلخیوں کو میٹھا بنا دیا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو موسمی بخار آتا تھا جس کو ملیریا کہتے ہیں، تو صدر مدرس (ہیڈ ماسٹر صاحب) دوپہر کو کونین کی گولی اپنے سامنے کھلاتے تھے، کسی بالٹی میں پانی رکھ دیا کونین کھلائی اور پانی پلا دیا ایسے کیوں کرتے تھے؟ کہ کونین کڑوی ہوتی ہے، تو اپنے سامنے کھلاتے تھے، لیکن اب ترقی کا زمانہ ہے کونین پر شکر چڑھا دی جاتی ہے تو کونین بلا پانی کے ہی نگل لی۔

تو دیکھو! کڑوی چیز میٹھی ہو کر آسانی سے حلق سے اُتر گئی۔ ایسے ہی وہ کڑوی بات جو کسی کی طرف سے پیش آئی، رضائے الٰہی کی شیرینی جو اندر رکھی ہوئی ہے، اس کے ساتھ مل کر آسانی سے پی گیا، جس طرح صحتِ جسمانی کیلئے کڑوی کونین مٹھائی چڑھا کر پی جاتا ہے، اسی طرح صحتِ روحانی کے لئے کڑوا کلام پینا ضروری ہے اور اسی تلخی کو دور کرنے کے لئے کیا چیز ضروری ہے۔ رضا۔ یہ رضائے الٰہی قرب کے لئے مطلوب ہے، اس لئے اس کڑوی چیز کو میٹھی کر کے پی گیا۔ اس سلوک کے حاصل کرنے کا یہ اثر ہوتا ہے، اگر ایک ساتھ نہیں ہو تو تدریجاً (آہستہ آہستہ) چونکہ فکر میں لگا ہوا ہے، اثر آتا چلا گیا، تدریجاً یہ حال ہو گیا کہ اگر کسی نے گالی دیدی، تأسف نہیں ہوتا، اگر ہوا تو آن، فان، اِدھر آیا اُدھر گیا، اس تأثر (افسوس) کو لے کر نہیں بیٹھ گیا، اگر کسی نے مُکا مار دیا تو پیچھے گھوم کر بھی نہیں دیکھا کہ کس نے مارا، وہ تو تزکیہ میں لگا ہوا ہے، اس درجہ پر کہ کڑوی چیز کو' کڑوے کلام کو میٹھا کلام کر کے پی لیا۔

الغرض یہ مسائلِ سلوک، تزکیۂ نفس، وجوبِ طاعت جو الزمهم كلمة التقوىٰ سے احقر نے ثابت کیا۔ جب كلمة التقوىٰ پر التزام ہوتا ہے، تو اس پر زیادتِ ایمان مرتب ہوتا ہے، جیسا کہ تفصیل سے اوپر بیان کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں طلبِ صادق بذوق و شوق عطا فرمائیں اور ایمان کی زیادتی کے طرق و ذرائع جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے، ان کو اختیار کرنے کی توفیق ارزانی عطا فرمائیں۔ (آمین)

..................☆☆☆..................

چوتھی مجلس

اصلاح میں تاخیر کی وجہ

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔

اپنی من مانی بات ہوگئی تو اعتقاد بھی ہے، اعتماد بھی ہے اور من مانی نہ ہوئی تو کچھ بھی نہیں یہ تو اچھا پیر بنایا۔

اب دو پیر ہوگئے ایک وہ جس کو پیر بنایا ہے، دوسرے خود اپنے لئے پیر یہ تو اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ جیسا معاملہ ہوگیا کہ پیر کی بعض بات کو چھوڑ دیا، ان بعض بات میں خود اپنے لئے پیر بن گیا اور بات یہ ہونی چاہئے تھی کہ اپنی سمجھ میں نہیں آرہی، پھر بھی مان لی بات ماننا یہ ہے۔ہاں اگر صریح نص کے خلاف ہے تو ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اہلِ حق پر اعتراض کرنا باعثِ عتاب ہے :

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے زمانہ میں کسی نے سوال کیا تھا کہ فلاں پرندہ حلال ہے

یا نہیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ حلال ہے نہ کھانا الگ بات ہے، اس وقت ایک اچھے خاصے بزرگ تھے، ان کو جب یہ بات پہنچی تو فرمایا کہ اچھا کل کو چیل کو بھی کہہ دینا کہ حلال ہے، اس کہنے پر اس بزرگ کی نسبت میں فرق آ گیا، ان کے اندر وہ ذوق وشوق، ذائقہ، وہ حلاوت قلب کے اندر نہیں رہی، انہوں نے کسی اور بزرگ سے اپنی یہ حالت ذکر کی کہ میری ایسی حالت ہوگئی۔ ان بزرگ نے فرمایا کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے کسی کے ساتھ بے ادبی کی بات کی ہو، پہلے بزرگ نے فرمایا کہ مجھے تو یاد نہیں، دوسرے بزرگ نے فرمایا اچھا تو سوچ لینا، سوچنے پر مذکورہ واقعہ یاد آ گیا، اور عرض کیا کہ سوچنے پر مجھے حضرت والا گنگوہیؒ کا یہ واقعہ یاد آیا، ایسا ہوا تھا۔ دوسرے بزرگ نے فرمایا، معافی مانگ لو تو چونکہ وہ بے چارے خود بھی نیک آدمی تھے، سچے تھے، طالب تھے معافی مانگی۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا یہ کوئی بات نہیں معاف ہے' معاف فرماتے ہی نسبت کا اثر لوٹ آیا' باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔

تو جب ایک مخلوق غیر صحابی کے ساتھ خلاف ادب بات ہو تو ایسی بات ہو جاتی ہے تو صحابہؓ کے ساتھ بے ادبی کی باتیں کہاں پہنچیں گی اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کہاں پہنچیں گی اور اللہ کے ساتھ کہاں پہنچیں گی، سلسلہ بسلسلہ قیاس کر لیا جائے تو ادب کتنی لازمی چیز ہے۔

اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ پیر صاحب کو کیا خبر ہے؟ لیکن اللہ کو تو خبر ہے کہ پیر نے کیا تعلیم دی تھی اور کیا کر رہا ہے تو پھر بیعت ہی کیوں ہوئے تھے جو چھپا رہا ہے، کسی بات کے ٹوکنے پر بھی اس بات کے چھوڑنے پر تیار نہیں ہو رہا ہے کیوں؟ تو یہ فی الجملہ شرک نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ امام بخاریؒ۔ **باب کفران العشیر وکفر دون کفر.** (بخاری شریف ج۱ ص۹) کے تحت ایک حدیث لائے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفرانِ عشیر (شوہر کی ناشکری) بھی کفر ہے، گو کفر باللہ نہیں ہے، اسی طرح **شرک دون شرک** کے تحت یہ بھی شرک ہے کہ جس کو پیر بنایا وہ تو ہے ہی خود بھی پیر بن گیا۔ اپنی عقل آ گئی، اپنا

تجربہ آ گیا، اپنا علم آ گیا، اپنی رائے آ گئی تو اس کی رائے کے ساتھ اپنی رائے، اس کے علم کے ساتھ اپنا علم اس کی عقل کے ساتھ اپنی عقل اس کے تجربہ کے ساتھ اپنا تجربہ، اب یہ شرک نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ (صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو شرک فی الطریقت کہتے ہیں جیسے شرک فی العقائد اسلام سے مانع ہے، ایسے ہی شرک فی الطریقت اصلاح سے مانع ہے۔ از: مجشی)

اس زمانہ میں اصلاح میں دیر پر دیر کیوں ہوتی چلی جا رہی ہے، پہلے تو مرید یہ کہا کرتے تھے کہ بیعت کے وقت کی تعلیم ہماری آخری عمر تک نہیں چھوٹ سکتی اور اب آگے کیا تعلیم لیں گے، اس تعلیم پر ہی عمل نہیں جو بیعت کے وقت کی تھی۔

مولویوں کو دیر میں بیعت کرنے کی وجہ :

حضرت والاؒ نے تجربہ کی بنا پر ہی فرمایا ہوگا کہ مولویوں کو ذرا دیر میں بیعت کرنا۔ ہیر پھیر کی باتیں کرتے ہیں کہ مجھے خلافت مل جائے حالانکہ ابھی خلافت کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے؟ ابھی تو وہ احکام جو صحیح احکام ہیں انہی کی عظمت قلب میں نہیں ہے۔ انہی کو ترک کر رہا ہے اور لوگوں کو اپنی حرکات اور افعالِ ظاہرہ سے مشتبہ بنا رہا ہے۔ اسی لئے حضرت نے فرمایا تھا کہ مولویوں کو دیر میں بیعت کرنا، یہ اپنا علم اپنی رائے بہت چلاتے ہیں۔ جب اپنی رائے اپنا علم چلایا تو شرک ہوا۔ اور مرید ہو کر یہ خیال کہ پیر کو کیا خبر؟ تو بڑا بھاری شرک ہے۔ علم غیب تو اللہ تعالیٰ کو ہے، پیر کو تیرے خبر دینے سے خبر ہوگی، تو طالب ہے اصلاح کا، پھر یہ چھپانا کیسا؟ جزئی، جزئی کی اطلاع ضروری ہے، غلطی انسان سے ہوتی ہے، بشر ہے غلطی ہو ہی جاتی ہے، مگر اصلاح کا طالب اور اصلاح کی طرف اقدام تو اسی لئے تھا کہ اخلاص کے ساتھ، صدق کے ساتھ، فکر کے ساتھ، آخرت کے عقیدہ کے استحضار کے ساتھ، آہستہ آہستہ میں بشر ہو کر بے شر ہو جاؤں، معاصی اور کبیرہ گناہ تو اسی وقت چھوٹ گئے تھے، جب بیعت کے وقت یہ کہلوایا تھا کہ میں توبہ کرتا ہوں گناہوں سے، رہے صغیرہ چلو۔

وہ تدریجاً سہی کہ آہستہ آہستہ چھوٹ جائیں گے۔ کبیرہ تو اسی وقت چھوٹ گئے اور اگر اتفاقاً گناہ ہوگیا تو رو پڑا کہ ہائے گناہ کیوں ہوا، پھر کبیرہ کے ارتکاب کا اصرار کیسا ہے؟ اس لئے کہ طالبِ صادق ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

اور جن لوگوں نے ہمارے بارے میں مجاہدہ کیا ہم ان کو ضرور بالضرور اپنے راستوں کی ہدایت دیتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہیں۔

محسنین یعنی مخلصین کے ساتھ اللہ کی مدد و توفیق ہوتی ہے تو گناہ کبیرہ تو بتوفیق الٰہی بیعت کے وقت چھوٹ جاتے ہیں۔

اپنی سعی پر نظر بھی شرک ہے :

لیکن اپنی سعی پر نظر نہ ہو کہ یہ بھی شرک ہوگیا، غور فرماتے رہئے کیونکہ پانچوں وقت فرضوں میں اور سنتوں اور نفلوں میں کیا کہہ رہا تھا :

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۔

ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

تو یہ عبادت بھی انہی کی مدد سے ہے، پھر اپنی سعی پر نظر کیسی؟ اپنی سعی پر نظر تو نبی کو بھی نہیں ہوتی۔ بس سعی حکم کی تعمیل میں ہے لیکن اس سعی پر نظر نہیں۔ حدیث شریف میں ہے

هذا الجهد منی و علیک التکلان ۔ (مناجات مقبول منزل رابع ص ۴۱)

یہ میری جانب سے کوشش ہے، بھروسہ آپ پر ہی ہے۔ یہ حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ حکم کی تعمیل کوشش کے ساتھ میں نے کردی۔ باقی بھروسہ آپ پر ہی ہے، اس سے پہلے ارشاد ہے :

اللّٰهم هذا الدعاء و علیک الاجابة ۔ اے اللہ! یہ میری دعا ہے۔

الف لام عوض میں مضاف الیہ کے ہے۔ قبول کرنا آپ کا کام ہے تو دیکھئے سعی پر نظر تو نبی کو بھی نہیں، تو سعی پر نظر شرک ہے، روٹی پکانے کے لئے لکڑی کا اکٹھا کرنا چولہے میں لگا کر آگ لگانا آٹا لانا، آٹے کو گوندھنا، پانی ڈال کر پیڑا بنانا، اس کی روٹی کی شکل بنا کر توے پر ڈال کر پھر گھی میں رکھ کر سینکنا یہ تم [illegible] ب ہیں لیکن ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ ساری روٹیاں پورے طریقہ سے سینک کر، تیار ہو کر چنگیری میں آ بھی جائیں، بعض جل جاتی ہیں مثلاً تندور میں نان لگاتے ہیں کوئی نان نیچے گر گیا جل گیا، ہانڈی جل گئی، دودھ میں اپھان آ گیا، کٹورہ ہاتھ میں لیا اور گھڑے میں سے پانی لے کر اُٹھایا وہ منہ تک نہ پہنچا ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پانی گر گیا۔ تو اپنی سعی پر نظر خلافِ توحید ہے۔

مولویوں کی تاویلات :

مولویوں کے یہاں تاویل کا پھاٹک بہت لمبا ہے، اتنا بڑا ہے کہ اس میں سے کئی ہاتھی نکل جاویں۔ سادہ ایمان گاؤں والے کا سا ہونا چاہئے۔ وجود واجب باری تعالیٰ بوحدانیت کے لئے دلائل کی ضرورت نہیں کیونکہ وجودِ باری تعالیٰ وحدانیت، توحید یہ تمام چیزیں تو ایک نوع سے بدیہی ہیں، یہ نظری نہیں ہوتیں تو پھر اس میں استدلال کی دلائل و براہین کے تلاش کی کیا ضرورت ہے۔

علمِ کلام کے تدوین کی وجہ :

معتزلہ اور فلاسفہ نے توحید اور وجودِ باری تعالیٰ پر عقلی بحثیں شروع کر دیں تو متکلمین کو علمِ کلام کی تدوین کرنے کی اس فتنہ کو دور کرنے کے لئے ضرورت پڑی ورنہ توحیدِ باری تعالیٰ اور ایمان سادہ ہونا چاہئے، جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دلائل کی ضرورت نہ تھی ہمیں بھی دلائل کی ضرورت نہیں ہے اور جن اصل اُصول کو مان لیا اس کی ہر چیز کو مانتا چلا گیا اور سادہ طریقہ سے مانتا ہوا کہتا چلا جا رہا ہے کہ دلیل کی ضرورت نہیں ......

ع سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

اگر محبوب رات کے دو بجے آنے کا حکم کرے تو عاشق فوراً تیار ہوگا یہ نہیں پوچھے گا کہ آپ مجھے دو بجے آنے کا کیوں حکم دے رہے ہیں؟ دوپہر ہی کو بلالیا ہوتا، عاشق ہرگز نہیں کہے گا اگر کہے تو بڑے افسوس کی بات ہے ارے تو تو مجنوں سے بھی گیا گزرا ہوا۔

مجنوں کی حکایت :

کہ ایک مرتبہ بہت سے لوگ مجنوں بن کر لیلیٰ کے دروازے پر آ کر بیٹھ گئے۔ باندی نے کہا کہ آج بہت سے مجنوں آ کر بیٹھ گئے۔ کیسے پہچان ہو کہ حقیقی مجنوں کون ہے؟ لیلیٰ نے کہا کہ جاؤ اور یوں کہنا کہ لیلیٰ کو تھوڑے سے گوشت کے لوتھڑے کی ضرورت ہے، اس کو اپنے جسم میں استعمال کرے گی، اب باندی جس کے پاس جاتی ہے کوئی کہتا ہے یہ قصاب خانہ ہے؟ یہ کوئی مذبح خانہ ہے؟ گوشت تو قصائی کے یہاں ملے گا، مصنوعی مجنوں تو یہ کہہ کر چلے گئے، جو واقعی مجنوں تھا وہ بھی بیٹھا تھا، اس نے باندی سے کہا یہ پوچھ کر آ کہ کونسی جگہ کا چاہئے، باندی نے لیلیٰ سے جا کر کہا، لیلیٰ نے جواب دیا، اوہو ابھی خامی ہے۔ باندی نے پھر وہی سوال کیا کہ لیلیٰ نے گوشت کی بوٹی مانگی ہے، یہ سن کر تمام مصنوعی مجنوں چلے گئے، حقیقی مجنوں نے کہا تو میرے جسم کی ہر ہر جگہ سے بوٹی لے لے، جس جگہ کی استعمال کرنا ہوگی، استعمال کر لے گی اور باقی پھینک دی گی۔ لیلیٰ نے یہ سن کر کہا کہ واقعی مجنوں یہ ہے۔ عاشق ایسے ہوتے ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہماری تاویلوں کا کوٹہ ہی ختم نہیں ہوتا، خدا تعالیٰ کے حاضر ناظر ہونے کا بھی عقیدہ، قیامت کا بھی عقیدہ اور پھر سوال پر سوال عقائد کے بارے میں ہو رہے ہیں۔

جب اصل اُصول کو مان لیا تو فروع میں سوال نہیں ہوتا :

ارے جب اصل اُصول کو واقع، قطعی، یقینی طور پر مان لیا تو فروع کے اندر سوال

کرنے کا کیا مطلب؟ فروع تو تعمیل کے لئے ہیں، عمل تو بلادلیل یوں ہی کیا جاتا ہے۔ جب قطعی طور پر پانچ وقت کی نماز فرض ہونا جس طرح سے بھی پہنچا مان لیا، مان لینے کے معنیٰ ہیں عمل میں لانا، تسلیم کرنا، اسلام کے معنیٰ ہیں فرمانبرداری کے لئے گردن رکھ دینا، جب اس درجہ کا اعتقاد وعقیدہ ہوجائے تو پھر اصلاح میں دیر کیوں ہورہی ہے؟ اخلاق میں کمزوری سے کمزوری کیوں چلی جارہی ہے؟ پختگی سے پختگی کیوں نہیں آتی' اب تک حسد کا مرض ہی نہیں نکلا۔ یہ بھی پڑھ لیا:

وَ لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا۔

ہرایک کواس کے اعمال کے موافق درجات ملیں گے۔

پھر مشکوٰۃ شریف بھی پڑھ لی، اس کے بعد دس کتابیں دورۂ حدیث شریف کی بھی پڑھ لیں، اب تک پنج وقتہ نماز کا باہتمام تکبیر اولیٰ پابند نہیں ہوا۔ سردیوں میں سردی لگنے کا ہیر پھیر ہے، اس لئے تاویلیں کرتا ہے۔

علمِ یقینی سے عمل متخلف نہیں ہوتا:

دھاردار آلہ کے اُنگلی پر چلانے سے یقین کٹنے کا ہے حالانکہ یہ احتمال بھی ہے کہ نہ کٹے لیکن کٹنے کا ایسا یقین ہے کہ نہ کٹنے کا احتمال ذہن میں نہیں آتا۔ اسی طرح جس قدر مناہی شریعت میں ممنوع چیزیں ہیں چاہے بڑے ہوں یا چھوٹے وہ مضرتی (نقصان دہ) ہیں خواہ زیادہ مضرت ہو یا کم، سب سے بچنا ضروری ہے کیونکہ چھوٹی مضرت ہو ہو کر پھر بڑی مضرت بن جاتی ہے، پھران مناہی کے پاس قصداً بار بار جانے کا کیا سوال ہے؟

نفع وضرر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے:

کوئی شخص جب بار بار قلب میں باختیار ضرر ارادہ لاتا ہے تو خود مضرت چاہتا ہے،

اس لئے حق تعالیٰ ضرر پیدا فرما دیتا ہے، گویا کہ تو نے خود بزبانِ حال یوں کہا کہ میں ضر
چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے ضرر پیدا فرما دیا اور مامور بہا اپنے اپنے درجہ پر سب کے سب
نافع بلامضرت ہیں، پھر ان کا ترک کیسا؟ پنجگانہ نماز اپنے اپنے وقت پر نہایت اہمیت کے
ساتھ مامور بہا ہے، ان کی ادا کا کس قدر اہتمام ہونا چاہئے۔

عشق کا تقاضا نوافل ادا کرنا ہے :

عاشقوں کو تو کہ عشق مؤمن کی فطرت ہے زیادتی کا طالب ہونا چاہئے، اسی لئے
فرائض کے ساتھ نوافل رکھ دیئے کہ طلوع و غروب و زوال کے علاوہ نوافل کی بھی اجازت
ہے کہ اے عاشق جب تیرا جی چاہے جب تیرا ذوق چاہے تو اپنا ذوقِ طلب زیادتِ نوافل
سے پورا کر لے، یہ عاشقوں کی پرواز ہے تو جو مؤمن بھی اپنے اپنے اوقات میں پنجگانہ نماز
پر ماشاء اللہ پابندی کے ساتھ چل رہے ہیں، وہ سارے کے سارے سلوک طے کر رہے
ہیں اور سالک ہیں اور جو اس کے ساتھ نوافل کے درپے ہو رہے ہیں تو وہ سلوک کے ساتھ
جذب میں ہیں۔ سالک کے ساتھ مجذوب بھی ہیں یعنی سالک عاشق ہیں وہ درجۂ عشق میں
ہیں، درجۂ تعشق میں ہیں کہ پنجگانہ ہی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ آگے اور خدمت کو جی چاہ رہا
ہے۔ عاشق یہی تو کہے گا اے محبوب ہاتھ دبوالے، کمر دبوالے، تیل ہی لگوالے، پانی ہی
بھروالے نہ معلوم کون کون سی خدمات کو اندر سے جی چاہے گا۔ محبوب اشارہ کر رہا ہے کسی اور
کی طرف، مگر عاشق جلدی سے آگے بڑھ کر لوٹا ہاتھ میں لے رہا ہے اور پانی بھر کر دے رہا
ہے۔ دیکھا عاشق کی پرواز۔ ایسا سالک، سالک مجذوب کہلاتا ہے۔

طالب کی اقسام :

طالب کی چار قسمیں ہیں، سالک محض، مجذوبِ محض، سالک مجذوب، مجذوب
سالک۔ درجۂ سلوک تک ہوتے ہوئے اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ کہیں جلدی سے رجعتِ

قہقری (اُلٹا لوٹنا) نہ ہوجائے اور سلوک جب جسم کے اندر آ گیا کہ عشق پیدا ہوگیا تو سالک مجذوب ہوگیا، تو اب ان شاء اللہ تعالیٰ خرابی کا اندیشہ اُٹھ گیا۔ یہ مسائلِ شرع بدرجۂ سلوک ہیں۔ بات مجنونِ حقیقی کی ہو رہی تھی۔ مجنونِ حقیقی نے کہا کہ میرے بدن کی ہر جگہ کی بوٹی لے جاؤ، جہاں کی کام آئے گی رکھ لی جائے گی۔ یہ سوال کیسا کہ جس جگہ کی بوٹی چاہئے اسی اصول کے تحت جب اس نے (اللہ و رسول نے) جس چیز کا حکم دیا ہے، وہاں عمل کرنے کے لئے سوال کیسا؟ رہے اعذار تو اس نے اعذار پر پہلے ہی مطلع کر دیا ہے کہ اگر کوئی عذر ہو تو خیر ہے کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر پڑھ لینا، بیٹھ کر نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر پڑھ لینا، پانی نقصان دیتا ہوں تو تیمّم کر کے پڑھ لینا، تو ہر موقع پر اس نے خود ہی رخصت فرمائی ہے، تو اصل عزیمت ہی ہے، باقی بضرورت رخصت بھی ہے۔

بوقتِ ضرورت رخصت پر بھی عمل کرنا چاہئے :

ضرورت کے وقت رخصت پر عمل کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ رخصت ایک نعمت ہے اور شریف الطبع کی طبیعت میں ذاتِ باری تعالیٰ کی اشد محبت ہوتی ہے، تو رخصت کی نعمت استعمال کرنے پر محبت اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ سوچے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مصالح و اعذار کی کیسی رعایت فرمائی ہے لیکن اگر رخصت کے اندر کاہلی اور سستی ہے تو طالب صادق نہیں جھوٹا ہے۔ ہاں واقعی علالت اور ضعف ہو تو انہوں نے خود ہی رعایت فرما دی بلکہ ایسے ضعف و علالت کی صورت میں رخصت پر عمل نہ کرے تو اظہارِ ناراضگی ہے ارشادِ نبوی ہے : من شاق شاق اللّٰہ علیه ۔

جس نے اپنے کو جان بوجھ کر مشقت میں ڈالا اللہ تعالیٰ اس پر اور مشقت ڈال دیں گے۔

اپنے اوپر جان کر شدت مت کرو، ایسا کرو گے تو تم تھک کر بیٹھ جاؤ گے۔ (اللہ

تعالیٰ) تو خود ہی عاشق کے عشق کو دیکھ کر رحم و کرم فرماتے ہیں۔ رعایت فرماتے ہیں، ہاں عشق کا ظہور اخلاص و صدق کے ساتھ ہو جاوے۔

عشقِ حقیقی کے آثار:

عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص کو ایک عورت سے عشق ہو گیا، اس زمانہ کے عشق عفت مآب ہوتے تھے۔ اُس وقت عشق پاکدامنی کے ساتھ ہوتے تھے، معشوقہ کو معلوم ہو گیا کہ اس کو عشق ہو گیا ہے، اس نے ملاقات کا موقع دیدیا۔ عاشق وقت پر آ گیا۔

اصل واقعہ عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ فرماتے ہیں کہ معشوقہ نے عاشق کو ملاقات کا موقع دیدیا، وہ آ گیا، بیٹھ گیا، بہت خوش ہو رہا ہے، معشوقہ نے جذبۂ عشق میں اس عاشق کو اپنی ران پر سر رکھ کر لٹا لیا، عاشق آنکھیں کھول کر، ٹکٹکی باندھ کر کہ پلک بھی نہ جھپکنے پائے اپنی معشوقہ کو دیکھ رہا ہے، اور یہ اس کو دیکھ رہی ہے۔ ایسی حالت میں بھی سالک کے اندر جامعیت آ جاتی ہے، تو مجھے اور میں تجھے دیکھا کروں' توفیقِ الٰہی سے اس وقت کَاَنَّکَ تَرَاہُ بھی ہے اور فانہ یراک بھی ہے۔ دونوں بتوفیقہ تعالیٰ جمع ہیں۔

ایسے ہی جب سالک نماز میں قیام کے اندر ہے تو سجدہ کی ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے، اس طرح پلک بھی نہیں جھپکتا اور جب ذرا جھک گیا (رکوع میں چلا گیا) تو قدموں پر ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے، ذرا پلک نہیں جھپکتا اور جب بالکل قدموں پر سر رکھ دیا (سجدہ میں چلا گیا) تو بھی پرۂ بینی (ناک کی پھننگل) کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے، پلک نہیں جھپکتا۔ جب سلام کی پیشی ہو رہی ہے تو داہنے اور بائیں مونڈھے پر ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے، پلک نہیں جھپکتا، حکم تعلیم نماز میں اس طرح ہو رہا ہے، یہ مطلوب کی طرف اشارہ تمثیل سے کیا گیا، آگے قصہ کی تکمیل ہے، معشوقہ نے دیکھا کہ عاشق کے رُخسار پر ایک مسّہ ہے، ایک

ہوتا ہے تِل، ایک ہوتا ہے مسہ، مسّہ اُبھرا ہوا ہوتا ہے، وہ اچھا نہیں لگتا، اور تِل تو جمال پیدا کرتا ہے۔ تو وہ مسّہ معشوقہ کو کچھ اچھا سا نہیں لگا، اس نے اپنی ران پر سے عاشق کا سر اُٹھا کر تکیہ پر رکھ دیا اور خود اُٹھ کر اندر گئی، وہاں سے ایک دھاردار آلہ لائی تا کہ مسہ کو چھیل دے۔ اتفاق سے وہ آلہ زہر میں بجھا ہوا تھا، معشوقہ کو اس کا علم نہ تھا، اس نے آہستہ آہستہ اس مسّہ کو چھیلا، چونکہ وہ آلہ زہر آلود تھا، اس کا اثر جسم کے اندر پہنچ گیا۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، ٹکٹکی باندھ کر معشوقہ کو دیکھ رہا ہے، اور روح پرواز کر رہی ہے، یہاں تک کہ روح پرواز کر گئی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ میرا سر کہاں رکھا تھا، پھر کہاں رکھ دیا گیا اور کہاں چھیلا جا رہا ہے اور کیسے روح پرواز کر رہی ہے۔ عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ نے مریدین سے فرمایا، دیکھا ایک مخلوق کا مخلوق کے ساتھ عشق کا حال تو اللہ کے عاشقوں کا ذاتِ حق کے ساتھ عشق کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ جب ہوتا ہوگا (یہ جملہ اس لئے ارشاد فرمایا کہ احوال میں انقلاب ہوتا رہتا ہے، کبھی یہ حال ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا بالخصوص تمکین کے بعد ایسے احوال کم پیش آتے ہیں، البتہ اتباع بعشق راسخ ہوتا جاتا ہے)۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ ۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے اشد محبت ہے۔ اور اشد محبت کا نام عشق ہے۔ تو مؤمن کو ذاتِ باری تعالیٰ عاشق ہونے کی سند دے کر مسندِ عشق پر بٹھا رہے ہیں، اب مسند کی لاج رکھنا موت کے وقت تک یہ بہت مشکل ہے، تسبیح پڑھنا بہت آسان ہے، اشراق پڑھنا آسان ہے، تہجد پڑھنا آسان ہے، حالانکہ اصل یہ ہے کہ اے مؤمن ! اپنے عاشق ہونے کا ثبوت دے۔ جس کو دیکھو معمولی وظیفہ کو لکھ رہا ہے اور حق تعالیٰ مربی حقیقی فرما رہے ہیں کہ تو اپنے عاشق ہونے کا ثبوت دے۔ عشق اختیار کر۔

اس آیت میں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ ۔

ایک قسم کا اخبار ہے، یعنی خبر دی کہ مؤمن ایسے ہوتے ہیں اور اخبار کا منشا انشاء

ہے جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ کہہ دیجئے اے محمد ﷺ کہ وہ اللہ ایک ہے۔

یہ صرف خبر دینا ہے یا اس خبر دینے میں اپنے وجوب وجودی توحید کو منوانا ہے، اسی طرح ربِّ حقیقی کا اس آیت میں مؤمن بندہ سے یہ مطالبہ ہے کہ عشق کے ساتھ رہو، یہ نئی بات سُنی ہوگی کہ حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ میرے عاشق بن کر رہو، پھر کسی حکم کی تعمیل میں حکمت وغیرہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح منھی عنھا سے پرہیز میں بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ غذا کھائیں اور ساتھ ہی کوئی ایسی چیز کھالیں جو غذا کو نقصان دے، کیا یہ ٹھیک ہے؟ دوا کھائیں اور دوا کے ساتھ کوئی ایسی چیز کھالیں جو دوا کی خاصیت اور اثر کو کمزور کردے یا زائل کردے تو کیا یہ ٹھیک ہے؟ کوئی بھی عقلمند اسے ٹھیک نہیں کہے گا۔

گناہ طاعت کے اثر کو کمزور کردیتے ہیں :

اسی طرح مامور بھا (مامور بھا وہ احکام شرع ہیں جن کے کرنے کا حکم دیا ہے اور منھی عنھا وہ چیزیں ہیں جن سے منع کیا گیا ہے) بجالاتے ہوئے منہیات سے اجتناب ضروری ہے تاکہ مامور بہا کا اثر زائل یا کمزور نہ ہو جیسے قوۃ جسم کے لئے غذاءِ جسمانی کا کھانا اور مضر چیزوں سے پرہیز رکھنا ضروری ہے ظاہراً و باطناً۔ مامور بھا نماز کو بھی ادا کیا اور منھی عنھا حسد کو بھی کیا۔ اب حسد، مامور بہا نماز کا جو اثر ہے، اس کو اندر ہی اندر کمزور کررہا ہے، اندر ہی اندر جھلسا رہا ہے۔ اسی طرح رکوع، سجدہ، جھک کر قدموں پر سر رکھ کر اظہارِ محبت سے روح میں جو اثر ہوا تھا، دربار سے باہر نکل کر کسی رنگین (خوبصورت) شکل پر نظر پڑی، اس کو دیکھ کر لطف لے رہا ہے تو اس طرح دیکھنے نے، اس بد پرہیزی نے قلب کے اندر کسرِ نفس کے ساتھ جو انکسار و محبت کی شدت کا اثر ہوا تھا، اس کو مضمحل کردیا، وہ اثر کمزور ہو جاتا ہے۔

نیز اس کا بھی استحضار کرلیا جائے کہ حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں غیور

ہوں، غیرتمند ہوں اور اللہ تعالیٰ تو انتہائی غیور ہیں، لامتناہی غیور ہیں، تو یہ منھی عنھا جن سے بچنے کا حکم دیا ہے یہ کہ جب منھی عنھا کا بندہ سے ارتکاب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو غیرت آتی ہے اور جب ذاتِ حق کو غیرت آتی ہے تو اے سالک! تجھے کتنی غیرت آنی چاہئے کہ یہ منھی عنھا تو غیر ہے ، بھلا اس غیر کا صدور کیوں ہوگیا؟ غیرت آنا چاہئے، اور اگر بتقاضاءِ بشریت کبھی شر ہوگیا لیکن بار بار شر کے اندر اصرار کرنا کیسا؟ کیونکہ انسان کا اقدام تو قلب میں ذاتِ حق کے ساتھ انابت اور رجوع قائم کرنے کا تھا، پھر بار بار اس کے خلاف کرنا جائے تعجب ہے۔

پہلے زمانہ میں اصلاح پر اتنی دیر نہیں ہوتی تھی، اب تو موٹی موٹی باتیں بھی نہیں چھوڑتا، اگر داڑھی منڈاتا ہے تو منڈاتا ہی چلا جارہا ہے۔ خشخشی رکھتا تھا تو ایسی ہی رکھے جا رہا ہے۔ پائجامہ، لنگی ٹخنے سے نیچی پہنتا تھا، تو اب بھی وہی حال ہے، کرتہ اونچا پہنتا ہے تو اب بھی ویسا ہی ہے وغیرہ ذالک۔ کھانا بھی طریقِ سنت سے نہیں کھاتا بلکہ ممنوع طریقہ سے کھانا کھاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر کوئی رُکاوٹ ہی نہیں ہے کہ ترکِ سنت پر روک ٹوک کرے، ابھی تو بحکمِ شرع کھانا بھی ٹھیک نہیں کھاتا۔ ابھی مسجد کے اندر بھی بحکمِ شرع ادب کے ساتھ داخل نہیں ہوتا اور نہ اس طرح باہر آتا ہے۔ ابھی تو کلام کی زیادتی بھی نہیں چھوٹی، ایسے بھی خط آتے ہیں کہ زائد کلام کی عادت تھی، ابھی وہ زیادہ چلی جارہی ہے۔ زبان کے اندر ساکت وصامت ہونا ہی نہیں ہوتا۔ لایعنی کلام کا ترک ہی نہیں ہوتا، بلکہ اور غیبتوں کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ تو ظاہری اور باطنی اعمال میں موٹی موٹی باتیں ہیں، باریک باتوں کا تو ابھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ابھی تو وضو ہی سنت اور استحباب واستحسان کے درجہ کے ساتھ نہیں ہوتا، نماز ہی جس سکون کے ساتھ اور سکوت کے ساتھ، خشوع کے

ساتھ، خضوع کے ساتھ ہونا چاہئے وہ بھی نہیں ہوتی۔ اسی کے درپے نہیں اس کے قصد کے ساتھ نہیں اسی کے اہتمام کے ساتھ نہیں اسی لئے آگے پوچھنے کا سوال نہیں ہوتا کہ قلب کام نہیں کر رہا ہے اگر کام کرتا پوچھتا حالات کی اطلاع کرتا اگر کسی کو منزل پر پہنچنا ہے اور راستہ معلوم نہیں تو جگہ جگہ پوچھتا چلا جاتا ہے تاکہ منزل تک پہنچ جائے۔ اسی طرح طالبِ حق کو منزل پر پہنچنے کی طلب ہوتی تو پوچھتا، بندوں کے حقوق کا کچھ خیال نہیں کسی کا قرضہ ہے نہ ادا کرتا ہے نہ معافی مانگتا ہے، کسی کے ساتھ کچھ کلام کرنے میں غلطی ہوئی معافی نہیں مانگتا، حالانکہ جانتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، میں نے اس طرح کلام کیا کہ دوسرے کا دل دکھ گیا لیکن معافی نہیں مانگتا، تو نہ آنکھ قابو میں آرہی ہے، نہ زبان، نہ کان قابو میں آرہے ہیں، نہ دل، اور نہ پیر قابو میں آرہے ہیں کہ جہاں چاہا اُٹھ کر چل دیا نہ ہاتھ قابو میں آرہے ہیں۔ اگر نیت واقعی خالص فکرِ آخرت اور بصدق اصلاح کی تھی تو اصلاحِ حال میں دیر لگنے کی کوئی بات نہیں اگر دیر لگتی جارہی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے، اخلاص وصدق کے اندر کچھ فرق ہے۔

بیعت میں اغراضِ فاسد :

کوئی اس لئے بیعت ہوگیا کہ تندرستی اچھی ہوجائے، کوئی اس لئے بیعت ہوگیا کہ گھر میں کچھ برکت ہوجائے، کوئی اس لئے ہوگیا کہ آمدنی اچھی ہوجائے، قرضہ ادا ہوجائے، کوئی اس لئے ہوگیا کہ شیخ سے نسبت ہوجائے گی تو لوگوں کو ہمارے اوپر اعتماد ہو جائے گا، کوئی اس لئے ہوگیا کہ لوگوں کے رجوعات ہوجائیں گی، لوگ ہم پر اعتماد کرکے اچھا اعتقاد قائم کرلیں گے کہ فلاں کی طرف منسوب ہے۔ یہ سب دنیاداری کی کاوشیں ہیں اب اصلاح ہو تو کس طرح ہو، قلب کے اندر تزکیہ آئے تو کس طرح آئے اور خلوت میں اور جلوت میں پابندی پوری استقامت کے ساتھ کس طرح ہو کہ خلوت اور جلوت یکساں

ہو جائے لیکن دونوں یکساں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر مآل (انجام) پر نہیں ہے، اس لئے اعمال میں کوتاہی ہے، اگر اس کی نظر مآل پر ذرہ برابر بھی ہوتی تو اس کے دل میں تکبر ہونے کی ذرہ برابر گنجائش نہ تھی اور جن کی مآل پر نظر تھی، انہوں نے بقسم کہہ دیا کہ ہم کتے اور خنزیر سے بھی بدتر ہیں' تو مآل پر نظر ہونے کی وجہ سے عمل چلا گیا یعنی اس پر نظر نہیں رہی، البتہ امل (اُمید) رہ گئی کہ اپنے اعمال پر تو نظر نہیں لیکن اللہ کی عطا کردہ اُمید ہے، اسی کو یہاں لفظ اَمَل عَمل کے قافیہ کی لطافت سے ذکر کر دیا گیا ہے، ورنہ اصطلاح میں طولِ اَمَل لمبی لمبی تمناؤں کو کہتے ہیں۔ یہ طولِ امل حرام ہے، یہ باطنی مرض ہے، اب یہ ہو جائے، اب وہ ہو جائے، اب یہ کروں اب وہ کروں، بیٹے کی تمنا ہے وہ ہو گیا تو اس کے نکاح کی تمنا ہے نکاح ہو گیا تو پوتے کی تمنا ہے پوتا ہو گیا تو اس کے نکاح کی تمنا ہے وہ بھی دیکھ لوں۔ جب یہ طولِ امل آ جائے تو عمل چلا جاتا ہے، جب لمبی لمبی تمنائیں' آرزوئیں آتی ہیں تو بھلا اعمال وتزکیہ کہاں آوے گا، اگر آ بھی گیا تو تمنائیں آنے سے چلا جاتا ہے۔

الغرض پہلے اکابر کی نظر اعمال پر تھی، اس لئے سفر وحضر یکساں تھا، گھر اور باہر یکساں تھا، معمولات' گھر پر اور مہمان بننے پر یکساں تھے، البتہ عذر کی حالت میں احکام جدا ہیں تو ان حضرات کے اعمال حالتِ عذر کو چھوڑ کر سفر وحضر میں یکساں تھے نہ کہ طلب ظاہر کرتے ہوئے خانقاہ کے اندر بھی معمولات کی پابندی نہیں' تہجد گزاری نہیں، اشراق و چاشت گزاری' اوابین گزاری نہیں' نمازوں کی باقاعدہ پابندی' تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ نہیں' بھلا گھر جا کر تو کیا ہوگا، حق تعالیٰ کی توفیق نیتوں کے ساتھ ہوتی ہے اور نیت صحیح نہیں کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتے ہیں) نیت کا حال اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ اس لئے توفیقات نہیں' جب توفیقات نیتِ صحیح نہ ہونے کی وجہ سے نہیں تو استقامت کس طرح ہو؟ استقامت نہیں ہوتی، ڈٹا ہوا رہنا، جما ہوا رہنا، ترک کی صورت پر

نظر نہ ہونا، پھر دیکھئے :

تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ کا ظہور ہوگا پوری آیت اس طرح ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ' جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پرورش کرنے والا اللہ ہے، اس میں اشارہ فرمایا کہ جب وہی ہماری ہر طرح سے، ہر قسم سے، ہر اعتبار سے، ہر نوعیت سے پرورش کرنے والا ہے تو وہی مستحقِ عبادت ہوگا، اسی مستحقِ عبادت کا نام اللہ ہے تو لفظ رب میں اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ آگے فرماتے ہیں کہ رَبُّنَا اللّٰهُ صرف زبان سے نہیں کہا، دل میں ٹھان کر کہا، بصیرت کے ساتھ کہا ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کا یہی مطلب ہے کہ پھر اس پر جمے رہے، ڈٹے رہے، موت تک چھوڑنے کا نام نہیں آیا۔ اب حق تعالیٰ اس پر وعدہ مرتب کر کے فرماتے ہیں :

تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا. ان کے آگے فرشتے ہوتے ہیں، ان کو تسلی دیتے ہیں، ان کو تھپتھپاتے ہیں کہ تمہارے حزن کی کیا بات ہے؟ تمہارے غم کی کیا بات ہے؟ اُداسی کی کیا بات ہے؟ دیکھا! یہ ہے استقامت، مضبوطی، جماؤ کا اثر کہ فرشتوں کے ذریعہ سے رنج و غم دور کیا جاتا ہے۔ جب یہ استقامت حاصل ہو جاتی ہے تو حضر میں بھی، سفر میں بھی، گھر میں بھی، مہمان داری میں بھی، خوشنودی میں بھی، رنجیدگی میں بھی، فراخدستی میں بھی، تنگدستی میں بھی، صحت میں بھی، علالت میں بھی معمولات پر جما رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے ہر ایک حالت کا حکم علیحدہ ہے جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا گیا کہ پہلے بیٹھ کر وظیفہ پورا کرتا تھا، اب مرض ہے لیٹ کر پورا کرے۔ الغرض معمولات پر جمے رہنا یہ ہے استقامت۔ اللہ تمام مسلمانوں کو استقامت کی توفیق عطاء فرمائے۔

..................☆☆☆..................

پانچویں مجلس

نورِ نبوت، نورِ علم

روزِ روشن میں دن کی روشنی اور ہماری آنکھ کی روشنی یہ دونوں روشنیاں مل کر کام دیتی ہیں، اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے میں آسانیاں حاصل ہوتی ہیں، یہ دونوں روشنیاں ہر چیز کو روشن کیے ہوئے ہیں لیکن جب لیل (رات) کا وقت ظلمت کدہ بن کر آ جاتا ہے تو آنکھ کی روشنی بھی ختم ہو جاتی ہے اور اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آتا حالانکہ چشمِ رو (آنکھ) تو موجود ہے اسی طرح کمرہ میں بجلی جلتی ہے سب کچھ نظر آتا ہے بجلی بند ہو جاتی ہے اندھیرا ہو جاتا ہے چارپائی ذرا فاصلہ سے پڑی ہوتی ہے ٹٹولتا ہوا جاتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ دیوار سے لگ جائے۔

بصارت کے لئے نورِ آفتاب کی ضرورت :

روشنی آنکھ میں موجود ہوتی ہے، لیکن اس نور کو نورِ آفتابی (سورج کی روشنی) کی مدد نہیں ملتی، تو اپنا نور اپنے پاس ہوتے ہوئے بھی بلا دوسرے نورِ آفتابی کی مدد کے کام نہیں دیتا۔ بینا ہو کر نابینا جیسا چلتا ہے، آہستہ آہستہ ٹٹولتا ہوا چلتا ہے، یہ حسّی اور بصارتی مثال

ہے کہ بصارت کام نہیں دے رہی ہے حالانکہ اس کے اندر بصارت و بینائی (خزانہ نور) موجود ہے مگر کیا کیا جائے باہر کی استمداد و اعانت نہیں ہو رہی ہے، اس لئے اپنی بینائی کی طاقت کا حصول بھی بیکار ہے، بینا ہو کر بھی نابینا ہے۔

بصیرت کے لئے نورِ نبوت کی ضرورت :

ٹھیک اسی طرح اور کہیں اس سے زیادہ کہ اپنے اندر عقلِ انسانی بھی ہے، اپنے اندر قوتِ ادراک یعنی بصیرتِ قلبی بھی ہے اور اپنے اندر بالقوہ قوتِ علمی بھی ہے، بالقوہ قوتِ بصیرت بھی ہے، قوتِ عقلی بھی ہے، لیکن محض اپنی قوتِ عقلیہ' قوتِ ادراکیہ' قوتِ علمیہ جب تک کہ نورِ نبوت کی شعائیں اُس نورِ عقل پر نہیں پڑیں گی، اس وقت تک یہ نورانیت کارفرما نہیں ہوسکتی، اس لئے اس کے سوا اور کوئی صورت ہی نہیں کہ نورِ آفتاب (نبوت) کو ساتھ لے کر چلو۔ اور اگر نورِ آفتاب نہیں ہے تو نورِ قمر کو ساتھ لے کر چلو، اگر نورِ قمر نہیں ہے تو نورِ نجم کو لے چلو، اگر کسی وقت نہ نورِ آفتاب رہا، نہ نورِ قمر، نہ نورِ نجم رہا تو چلنا محال ہو جائے گا۔

ایک حِسّی مثال :

کئی دفعہ ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ ظہر اور عصر کے درمیانی وقت میں گھٹا شروع ہوتی ہے اور اتنی زور کی آندھی اور گھٹا آتی ہے اور اتنا اندھیرا ہو جاتا ہے کہ اپنا جسم بھی نظر نہیں آتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشاء کا وقت ہو گیا۔ کبھی عصر اور مغرب کے درمیان ایسا لگتا ہے کہ مغرب کا وقت ہو گیا تو بینائی آنکھوں کی موجود ہوتی ہے اور دن بھی موجود ہوتا ہے۔ آفتاب کہیں چلا نہیں گیا مگر آفتاب اور اس شخص کے درمیان کوئی دوسری چیز ایسی حائل ہو گئی کہ نہ نورِ آفتاب رہا اور نہ نورِ قمر رہا نہ نورِ ستارہ رہا نہ خود اپنا نورِ نظر رہا کہ اس نور کو دوسرے کی طرف جو اعانت پہنچ رہی تھی وہ سب نور ایسے مستور ہوئے جیسے کہ معدوم ہوں' تو

یہ نور بھی بیکار ہو گیا۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کو اپنی ضروریات میں باوجود قویٰ صحیح ہونے کے جب تک بیرونی امداد نہیں ملتی تو وہ قویٰ بھی صحیح کام نہیں دیتے، تو پھر بھلا بلا نورِ نبوت کے منزلِ مقصود (آخرت) تک پہنچنے کا صحیح صحیح راستہ اور صحیح صحیح نعمتوں کی بوچھاڑ ہوتے رہنے کا مورد کیسے ہوسکتا ہے؟ حالانکہ جب تک روشنی نہ ہو تو ہم اندھیرے میں اپنی چارپائی کی مختصر منزل تک کو طے نہیں کر سکتے، دیا سلائی اُٹھا کر لالٹین جلانا چاہتے ہیں بلکہ بعض اوقات دیا سلائی اور موم بتی کے پاس پہنچنا بھی مشکل ہوتا ہے، تو بھلا منزلِ اصلی (آخرت) تک پہنچنا بلا نورِ نبوت کے کیسے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ منزلِ مقصود (آخرت) تک پہنچنے کے لئے نورِ نبوت کی بھی اشد ضرورت ہے۔

نورِ صحابہؓ کی ضرورت :

نورِ نبوت کے ساتھ ساتھ نورِ نجم (صحابہؓ) کی بھی اشد ضرورت ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے :

اصحابی کالنجوم فبایّهم اقتدیتُم اهتدَیتُم۔

نورِ صحابہؓ تاروں کی طرح ہے اور ان تاروں میں سب تارے برابر نہیں۔ قمر تو ایک ہے، شمس بھی ایک ہے مگر تارے بہت ہیں اور سب کی روشنی برابر نہیں۔ اس عالمِ مخلوق میں نورِ آفتاب جو اصل تھا، قمر نے اس نورِ آفتاب سے استفادہ کیا، علم ہیئت میں لکھا ہے کہ نورِ قمر مستفاد ہے نورِ آفتاب سے اور نورِ نجم مستفاد ہے نورِ قمر سے اور تارا ایک نہیں کثرت سے ہیں۔

آفتاب چلتے چلتے قمر سے کہہ کر گیا تو میری جگہ کام کرنا، اگرچہ ہم اس کی بولی کو سنتے، سمجھتے نہیں ہیں، جتنی اشیاء زمین و آسمان میں ہیں، سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں:

قال اللّٰہ تعالیٰ : وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔ (بنی اسرائیل : ۴۴)

ترجمہ : اور نہیں کوئی چیز مگر تسبیح کرتی ہے اس کی تعریف کے ساتھ۔

اور قمر بھی چلتے چلتے تاروں سے کہہ گیا کہ اب تو میں جا رہا ہوں تم میری قائم مقامی کرنا اور قائم مقامی وہی نائب کرتا ہے جو متصف بصفاتِ اصل ہو۔ یہ سلسلہ اس عالم (خلق) میں درجہ بدرجہ، نیابت در نیابت قیامت تک کے لئے قائم ہے۔ ایسے ہی عالمِ امر میں درجہ بدرجہ نورِ نبوت کا جو قائم مقام ہے وہ بھی نیابت در نیابت قیامت تک کے لئے قائم ہے اور وہ نورِ نبوت سے مستفاد اور مُستفیض بنورِ الٰہی ہے۔

نورِ نبوت حادث ہے :

البتہ نورِ الٰہی قدیم اور نورِ نبوت حادث ہے، اس لئے کہ نورِ نبوت متصل ذاتِ نبی حادث کے ساتھ ہے۔ جب ذاتِ نبی حادث ہے تو نورِ نبوت بھی حادث ہوگا، کیونکہ نورِ نبوت شرعی صفت ہے جو ذاتِ نبیؐ سے متعلق ہے، لیکن اس نورِ نبوت کا سلسلہ نورِ الٰہی قدیم ذاتِ واجب الوجود کے ساتھ ہے، اس لئے یہ سلسلہ نورِ نبوت بھی بلا وجوب (یعنی ازلی ہونے کے) قدیم یعنی ابدی ہے۔

اور قیامت تک اس کا سلسلہ باقی رہے گا بلکہ بعد از قیامت بھی رہے گا، کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ نفخِ صور کے وقت فنائے عالم ہوجائے گا لیکن بعض وہ موجودات بھی ہیں جن پر فنائیتِ تامہ نہیں ہوگی گو صورۃً فنائیت ہوگی جیسے نوم کی کیفیت ہے کہ اس میں روح بالکل نہیں چلی جاتی، فنائیت طاری نہیں ہوتی، بلکہ مرجھائیت طاری ہوجاتی ہے۔ اسی طرح نورِ نبوت قیامت تک قائم ہے تو نورِ نبوت ذاتِ نبی کے ساتھ قائم ہے جو حادث ہے، تو حادث کی صفت بھی حادث بمعنی غیر ازلی ہوگی۔ البتہ نورِ الٰہی ازلی بھی ہے اور ابدی بھی ہے یعنی وہاں نہ ابتدا کا سوال ہے نہ انتہاء کا سوال ہے۔ العیاذ باللہ۔

وہ ذات کمیت یعنی ابتداء اور انتہا اور کیفیت دونوں سے پاک ہے، کیونکہ اگر کمیت کو مانا جائے تو اوّل عدمیت کو ماننا پڑے گا اور وہ ذاتِ واجب عدمیت سے پاک ہے اور

کیفیت کو مانا تو تأثر کو ماننا پڑے گا اور وہ ذات تأثر سے بھی پاک ہے۔ اس لئے وہ ذات نہ کمیات میں سے ہے نہ کیفیات میں سے، نہ اس کی ابتداء ہے نہ انتہاء ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ازلی ہونے کی ایک تمثیل :

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی شخص نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ سے پہلے کون تھا؟ امام صاحبؒ نے سائل کو کہا کہ تم کچھ پڑھے لکھے ہو۔ سائل نے عرض کیا کیوں نہیں، پڑھا لکھا ہوا ہوں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا اچھا گنتی سُناؤ۔ سائل نے سنانا شروع کیا۔ ایک' دوٗ تین۔ امام صاحبؒ نے کہا نہیں نہیں' اس طرح نہ سناؤ' بلکہ سو سے اُلٹی سناؤ۔ ننانوے، اٹھانوے، ستانوے، چھیانوے، پچانوے، چورانوے، تیرانوے، بانوے، اکیانوے، سائل نے سنانا شروع کردیا، سناتے سناتے ایک پر آ کر رُک گیا۔ امام صاحبؒ نے کہا کہ آگے سناؤ۔ سائل نے کہا ایک سے پہلے تو کوئی نہیں، اس پر امام صاحبؒ نے فرمایا جب یہاں گنتی میں ایک سے پہلے کوئی نہیں' تو اس ایک ذاتِ پاک سے پہلے بھی کوئی نہیں۔

علاوہ اس ذاتِ پاک کے' دوسری اشیاء سب ممکنات میں ہیں اور حدوثِ تام اس ممکن کو لاحق ہوتا ہے کہ جو پہلے بھی عدمی ہے اور آئندہ جا کر بھی عدمی ہے، مگر نورِ نبوت کی ابتداء تو عدمی ہے لیکن انتہاء عدمی نہیں اسی طرح ملائکہ بھی اس میں شامل ہیں کہ ان پر اضمحلال وجود کی کیفیتِ نوم (نیند) کیسے طاری ہوگی۔ تو جب نوم جیسی کیفیت کا نام معدوم ہونا نہیں رکھا جاتا تو نورِ نبویت کے لئے معدوم ہونا کہاں ثابت ہوا؟ بلک اس نورِ نبوتِ محمدی ﷺ میں قیامت تک کے لئے قائم ہے بلکہ آپ تو جامع الانوار ہیں، جس طرح آپ نے فرمایا: انّما انا اوتیت علم الاوّلین و الآخرین۔ مجھے اوّلین وآخرین سب کا علم دیا گیا ہے۔

نورِ نبوت جامع الانوار ہے :

ایسے ہی جمیع انبیاء علیہم السلام اور جمیع ملائکہ کے تمام انوار رسول اللہ ﷺ کے

اندر موجود ہیں کیونکہ تمام عالَم کا وجود آپ ﷺ کے نورِ نبوت سے وجود میں آیا ہے، یہی وہ نورِ نبوت تھا جو آدم علیہ السلام کے اندر موجود تھا، پھر انبیاء علیہم السلام میں منتقل ہوتا ہوا نبی آخرالزماں ﷺ میں اس کا ظہور ہوا۔ جب آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد مکمل ہوگیا تو آپ کے جسمِ نورانی کو تو اُٹھالیا گیا مگر نورِ نبوت کو باقی رکھا گیا اور یہ قیامت تک کے لئے ہے۔ تو آپ کا نورِ نبوت مثلِ نورِ آفتاب وقمر کے ہے۔

انوارِ صحابہؓ استفادہ میں مثل نور ستاروں کے ہیں :

اور نورِ صحابہؓ مثلِ نورِ ستاروں کے ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے صحابہؓ مثل ستاروں کے مختلف قسم کے ہیں، کوئی چھوٹا ستارہ، کوئی بڑا ستارہ، میرے جانے کے بعد ان سے استفادہ حاصل کرتے رہنا۔ آنکھیں بند نہ کرنا، ذرا شعور سے کام لینا اور صحابۂ کرامؓ کے بعد تابعینؒ، تبع تابعینؒ، علماءِ حقانی، صوفیائے ربانی ان کے قائم مقام ہیں کیونکہ وہ صفات جو نبی کریم ﷺ کے اندر تھے، وہی صفات (نورِ نبوت) من حیث الاستفادہ نقلاً بعد نقلٍ ان میں چلے آرہے ہیں، تو جن حضرات میں صفات (نورِ نبوت) ہیں، وہی حضرات اس قابل ہیں کہ ان سے استفادہ واستفاضہ کیا جاوے۔

بُری گھڑی کے سبب بُرے اعمال ہیں :

اسی نورِ نبوت کا نام علم ہے۔

اللّٰھم انی اعوذبک من ساعۃ السوء۔ (حصن حصین ص:۳۱۴)

یعنی اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں بُری گھڑی سے۔

بُری گھڑی سے پناہ غیر اختیاری ہے، مگر اس بُری گھڑی کا موجب بُرے اعمال ہیں اور ان سے بچنا اختیاری ہے۔ مثلاً آپ کو نظر آتا ہے مگر آپ جب گھر سے نکلے تو آپ

نے آنکھیں بند کرلیں یا آنکھ بند تو نہیں کی مگر بجائے نیچی نظر رکھنے کے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے منہ اُٹھا کر چل رہے ہیں۔ اینٹ سے ٹھوکر لگ گئی اور گر گئے تو یہ گرنا جو کہ بُری گھڑی ہے، یہ اس لئے آئی کہ بُرے افعال اختیار کئے۔

طلبائے کرام کے لئے خصوصی خطاب :

اسی طرح امتحان کا وقت آ گیا۔ طالب علم امتحان دینے بیٹھا، عبارت ہی نہیں پڑھی جا رہی ہے تو ترجمہ ٹھیک کیا کرے گا۔ مطلب حل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بُری گھڑی اس لئے آئی کیونکہ مطالعہ نہیں کرتا تھا، اسباق کا ناغہ کرتا رہتا تھا، کبھی تکرار میں جا کر بیٹھ گیا تو وہ بھی لاپرواہی سے، یہی وہ برے افعال ہیں جو طالب علم کے اندر تھے، ان کی وجہ سے امتحان کے وقت بُری گھڑی آ گئی، تو اسی لئے حضورِ اکرم ﷺ نے بُری گھڑی سے پناہ مانگی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ سَاعَةِ السُّوْءِ۔

لیکن اس ساعتِ سوء کی یہ شرح ہے جو بیان کی گئی ہے۔ حدیث شریف میں پڑھا ہوگا کہ بے نمازی کا حشر قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ (مشکوٰۃ شریف ج ۱ ص ۵۹)

ایک نکتہ کی وضاحت :

اس حدیث میں قارون، فرعون، ہامان تینوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح ایک آیت میں بھی ان تینوں کا ذکر ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ○ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ ھَامَانَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ○ (پ ۲۴، ع ۸)

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات اور واضح حجت دے کر فرعون اور ہامان

اور قارون کے پاس بھیجا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو جھوٹے جادوگر ہیں۔

اسبابِ غفلت :

ان تین ناموں میں اس طرف اشارہ ہے کہ دین سے غفلت کی چیزیں دولت و تجارت، سلطنت وحکومت اور وجاہت بنتی ہیں کیونکہ ان تینوں میں یہی چیزیں موجود تھیں، باوجود ایمان ساتھ لے جانے کے بے نمازی کا حشر فرعون، ہامان وغیرہ کے ساتھ ہوگا۔ اگرچہ مؤمن کے لئے بخشش اور جنت میں دخول تو ہے لیکن اوّلِ وہلہ میں، انتقال ہوتے ہی جنت میں دخول ہو جائے، اس کا وعدہ نہیں ہے۔ تو دیکھئے یہ بُری ساعت جہنم میں جانے کی اس لئے آئی کہ بُرا عمل، یعنی نمازوں کو چھوڑتے چلا جانا عمل میں آیا جو کہ عملِ سوء ہے۔ اس لئے بُری گھڑی آئی تو اس بُری گھڑی کا مرجع غیر اختیاری ہوا۔

اگر قلبی توجہ نہ ہو تو یہ بیٹھنا بھی بُری ساعت ہی ہے، اگرچہ بیٹھنا اچھی جگہ ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ ایک شخص بے چارہ طواف سے فارغ ہوا تو کسی کی جیب کاٹ لی اور روپے نکال لئے تو ایک شخص بیت اللہ شریف کا طواف بھی کر رہا ہے اور وہیں جیب بھی کاٹ رہا ہے تو وہ اچھی جگہ پر تھا لیکن اس کے باوجود یہ حرکت کی اور اس کے لئے بُری گھڑی آ گئی۔

دینی مجلس میں فکر و توجہ لازم ہے :

اسی طرح ایسی جگہ بیٹھا ہوا ہے کہ دین کی باتیں ہو رہی ہیں، لیکن دل سے اثر لینے، غور و فکر، اخلاص و صدق کے ساتھ عامل بننے کے لئے، اصلاحی حالت درست کرنے کے لئے نہیں سن رہا ہے تو مقامِ حسن میں بھی ساعتِ سوء ہے۔

نوجوانوں کے لئے فہمِ سلیم کی ضرورت :

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے :

الشبابُ شعبَةٌ مِن الجُنون۔ جوانی' جنوں کا ایک شعبہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ جوانی ساعتِ حسن بھی ہے اور ساعت سوء بھی۔ اس لئے کہ اگر کسی کو فہمِ سلیم، عقلِ مستقیم حاصل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے عشق ومحبت ومعرفت میں دیوانہ پن اختیار کرلیا تو یہ جوانی ساعتِ حسن ہے، ورنہ اگر محض جنون ہے کہ خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑا ہوا ہے تو یہ جوانی بھی ساعتِ سوء ہے۔

بُرے ساتھی کی صحبت بدترین گھڑی ہے:

وہ بڑی ساعتِ سوء (بُری گھڑی) ہے کہ جس گھڑی میں بُرے ساتھی کے ساتھ اُٹھنا، بیٹھنا، کھڑا ہونا، چلنا پھرنا ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ یہ صاحبِ سوء، ساعتِ سوء کی جڑ ہے، بُری گھڑی اس لئے آتی ہے کہ بُرا ساتھی مل گیا، وہاں نشست وبرخاست' اُٹھنا' بیٹھنا' دوستی' یاری ہوگئی تو ساعتِ خیر بھی اس اُٹھنے بیٹھنے سے ساعتِ سوء بن جاتی ہے۔

بُری صحت کے اثرات:

بہت لوگ یہ شکوہ کرتے ہیں کہ میرا بیٹا بڑا اچھا چل رہا تھا، نماز وغیرہ کی پابندی کرتا، کہنا مانتا اور کام میں لگا رہتا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے اتنا بگڑ گیا ہے کہ ہر بات سے جواب دیتا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ بُرے لڑکوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا ہو، بیچارے کہتے ہیں کہ جی ہاں ایسا ہی ہوگیا ہے۔ تو اس بھلے لڑکے کے لئے ساعتِ سوء آگئی، اس کی جڑ وہی صاحبِ سوء (بُرا ساتھی) بنی۔ تو اس بُرے ساتھی سے خوبصورتی کے ساتھ پرہیز کرنا چاہئے، کسی سے لڑنا جھگڑنا اور کسی کو دشمن ہرگز نہیں بنانا چاہئے۔

بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کا کلام بھرپور بلاغت کو لئے ہوئے ہے۔ تو حاصلِ کلام یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ میں صاحبِ سوء (بُرے ساتھی) کے بُرے اثر کا احتمال تک نہیں ہے پھر بھی بُرے ساتھی سے پناہ چاہتے ہیں۔ تو اے اُمتِ مسلمہ! تم کو

بُرے ساتھی سے کتنا پرہیز کرنا چاہئے کہ یہ صاحبِ سوء بُرا ساتھی ساعتِ سوء کی جڑ ہے۔اس لئے صاحبِ سوء سے خوبصورتی سے بچ کر رہنا چاہئے۔

علوم دینیہ کا حصول نورِ نبوت کا حصول ہے :

اسی نورِ نبوت کا نام علم ہے۔ارشاد ہے :

اللّٰھم اِنّی اعوذبک مِن ساعۃ السوء۔ (حصن حصین ص:۳۱۴)

یعنی اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں بُری گھڑی سے۔

نور کے متعلق عرض کیا گیا تھا کہ وہ علم ہے اس پر امام شافعیؒ کا واقعہ شروع کیا تھا کہ انہوں نے اپنے استاذ امام وکیعؒ سے اپنے سوءِ حفظ کی شکایت کی،لفظِ سوء کی مناسبت سے ساعتِ سوء اور صاحبِ سوء کی طرف ذہن منتقل ہو گیا کہ آج کل اس میں ابتلاء زیادہ ہے، اس لئے اس کو قدرے تفصیل سے عرض کر دیا گیا،تو امام شافعیؒ نے اپنے استاذ سے اپنے سوءِ حفظ کی شکایت کی اور فرمایا :

شکوتُ الی وکیعؒ سُوء حِفظی

میں نے اپنے استاذ وکیعؒ سے اپنے خرابیِ حافظہ کی شکایت کی

فَاوصَانی الیٰ ترکِ المعَاصِی

سو انہوں نے مجھ کو گناہ چھوڑنے کی وصیت کی

میں نے بزبانِ حال عرض کیا کہ کیوں؟ گناہ کو سوء حفظ میں کیا دخل ہے۔امام وکیعؒ نے فرمایا ....

فَان العلمَ نورٌ مِن اللہ

و نور اللہ لا یعطی لعَاصِ

کہ علم اللہ تعالیٰ کا نور ہے اور اللہ کا نور گنہگار کو نہیں ملتا۔

گویا کہ امام وکیعؒ یوں فرما رہے ہیں، ارے بچے ! تو نے اپنے نورِ علم کے بارے میں سوال کیا ہے' اس لئے میں جواب میں کہہ رہا ہوں کہ علمِ حقیقی نورِ الٰہی کا نام ہے، یہ جو علمِ حقیقی ہے، اس نورِ الٰہی کی تعبیر ہے، اور نورِ الٰہی' الٰہِ حقیقی کی مخالفت کر کے کیسے آئے گا؟

نورِ الٰہی معصیت کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتا :

لٰہذا بطورِ نتیجہ یہ ظاہر ہے کہ علم جو کہ نورِ الٰہی ہے معصیت کر کے حاصل نہیں ہوسکتا، اسی کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب علم، نورِ الٰہی ہے تو علم (حقیقی) دن ہوا' اور معصیت جو مثل (ظلمت) ہے رات ہوئی۔ تو تم رات میں دن کو تلاش کر رہے ہو' تو بھلا رات میں دن اور ظلمت میں نور کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

معصیت کے ظلمت ہونے کی دلیل :

چنانچہ امام وکیعؒ کا استدلال حدیث شریف سے ہے کہ جب کوئی معصیت کرتا ہے تو دل پر ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے، اگر توبہ کر لے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور اگر گناہ کرتا چلا جائے تو وہ نقطۂ سیاہ بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ دل پر چھا جاتا ہے۔
(مشکوٰۃ شریف ص ۲۰۴ ج ۱)

حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ معصیت ظلمت ہے کیونکہ یہ سیاہ نقطہ اندھیرا ہے؟ تو یہ معصیت ظلمت ہے۔

ظاہر کا اثر باطن پر ہوتا ہے :

ظاہر کا اثر باطن میں پہنچتا ہے اور باطن کا اثر ظاہر پر پہنچتا ہے۔ مثلاً کسی نے کسی کو بُرے بُرے الفاظ کہے تو چہرہ پر زردی آئی، اسی لئے کہ ان بُرے الفاظ کا اثر جو ظاہر ہے نکل رہے تھے، دل پر باطنا پڑا، پھر دل کا اثر چہرہ پر زردی کی شکل میں نمودار ہوا، اس لئے چہرہ پر

زردی آگئی۔ اسی طرح کسی نے کسی کے منہ پر طمانچہ مارا، تو طمانچہ تو جسم پر لگا مگر یہ آنکھوں میں آنسو کہاں سے آئے، اس طمانچہ ہی کا اثر دل نے لیا، اور دل کے اثر کا اثر جسم پر پڑا، اس لئے آنکھوں میں آنسو آگئے، تو ظاہر باطن کا شاہد ہے اور باطن ظاہر کا گواہ۔ اسی طرح نورِ علم نورِ نبوت سے مستفاد ہے اور نورِ نبوت نورِ الٰہی سے مستفاد ہے۔

نورِ نبوت کی مثال :

جیسے پاور ہاؤس جہاں بجلی بنتی ہے، تمام روشنیوں کا تعلق اسی پاور ہاؤس سے ہے، اگر کسی بلب کا تعلق پاور ہاؤس سے کٹ جائے تو پھر بھی بجلی ہرگز نہیں مل سکتی۔ اسی طرح جس علم کا تعلق نبوت کے پاور ہاؤس سے نہیں ہے، اس کو ہدایت کی روشنی ہرگز نہیں مل سکتی اور جس کا تعلق نورِ نبوت سے ہے ایسا شخص جہاں چاہے قدم بردارشتہ چلتا رہے، اس کو کوئی نقصان نہیں، کیونکہ اس کے ساتھ ہدایتِ نوری ہے اور نور کو شر قبول نہیں کرتا، تو اس شخص پر دشمن اثر نہیں کرسکتا، خواہ وہ دشمن نفس ہو یا شیطان ہو یا صاحبِ سوء ہو، کیونکہ نورِ علم کی وجہ سے اس کو خیر و شر میں امتیاز ہو گیا لیکن یہ حکم اس عالم کے لئے ہے جس میں نورِ علم رچ بس گیا ہو۔ اس کے لئے نہیں جو صرف کتابیں ختم کر کے، امتحان میں پاس ہو کر عالم کہلانے لگا ہے۔ علم اتنی اونچی چیز ہے کہ اس سے اونچی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ اس علم کی جو علمِ نبوت سے مستفاد ہے، جتنی بھی مدح ہو، جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہی کم ہے، اسی لئے مشکوٰۃ شریف میں علم کے فضائل پر صفحے کے صفحے بھرے پڑے ہیں جہاں وضو کا بیان آیا ہے وہاں وضو کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اور جہاں علم کا بیان آیا ہے وہاں علم کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

عمل کے لئے بنیادی چیز علم ہے :

علم ہر عمل کا مرجع اور بنیاد ہے، بنیاد جتنی مضبوط ہوگی، اتنی ہی بلند اس پر عمارت

قائم کی جاسکتی ہے۔ چاہے دس منزلہ عمارت بنی ہو، چاہے بیس منزلہ تک پہنچ جاؤ۔ بنیاد مضبوط ہے تو سب برداشت کرلے گی، اسی طرح علم عمل کی تعمیر کے لئے بنیاد ہے، مگر علم سے مراد صرف معلومات حاصل کرنا نہیں بلکہ نورِ علم ہے۔

علمِ نافع کا سوال :

اسی نورِ علم کی درخواست کرتے وقت رسول اللہ ﷺ نے علمِ نافع کی دُعا فرمائی اشاد فرمایا ہے: **اللّٰھم انی اسئلک علمًا نافعًا**۔(اے اللہ! میں تجھ سے علمِ نافع مانگتا ہوں) اور علم غیر نافع سے پناہ مانگی ہے، ارشاد ہے: **اللّٰھُمَّ اِنی اعوذُبکَ مِن علم لاینفع**۔(اے اللہ میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو نفع نہ دے) ایسا علم جو نفع نہ دے سوء ہے اور علمِ سوء والا شخص صاحبِ سوء ہے۔ لہٰذا قابلِ مدح وتوصیف وہی علم حقیقی ہے جسے نورِ علم کہتے ہیں۔

مدارسِ دینیہ ستاروں کی مانند ہیں :

جب علمِ حقیقی ہی قابلِ مدح ٹھہرا تو ایسے علم کا متعلم بھی قابلِ مدح ہوگا اور جو مقام اس علم کے حصول کا ہے وہ بھی قابلِ مدح ہوگا اور ان مقامات ہی کا نام مدرسہ ہے۔ جب مدرسہ کا قابلِ مدح ہونا معلوم ہوگیا تو اگرچہ مدرسہ مثل آفتاب اور مثلِ قمر نہیں لیکن مثلِ نجم ضرور ہے اور نجم چھوٹے، بڑے ہر طرح کے ہوتے ہیں، ہر ایک اپنی جگہ پُرنور ہے، ایسے ہی مدارسِ دینیہ کو بھی سمجھ لیا جائے۔

بغیر نورِ نبوت کے اندھیرا ہے :

اسی طرح نورِ نبوت، نورِ صحابہؓ نہ رہا تو ان نجومِ ہدایت (مدارسِ دینیہ) سے ہی نفع اُٹھالینا چاہئے، یہ بھی اللہ کا احسان ہے کہ انہوں نے ان تاروں کو پیدا فرمادیا اور ہمارے

لئے ہدایت کا سامان مہیا کر دیا اور ہم اس کے طفیل راستہ سہولت سے طے کر لیتے ہیں۔

بنیادی چیز حصولِ علم ہے :

ذاتِ باری تعالیٰ نے ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمانے کے بعد نورِ علم عطا فرما کر سرفراز فرمایا تھا۔ وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے اسماء و آثار و خواص سکھا دیئے) تو وجود کے بعد صفتِ علم سے سرفراز فرمانا علم کی مدح کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم اور اہل جہل کی عجیب طور پر مدح و قدح فرمائی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں :

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (پ ۲۳ ج ۱۵)

قل امر کا صیغہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ فرما رہے ہیں رسولِ پاک ﷺ کو کہ اے آفتابِ نورِ نبوت ! آپ کہہ دیجئے عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہو سکتے۔ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُو الْاَلْبَابِ. انّما حصر کے لئے ہے کہ اس کو بڑی فہم والے جو لبّ لباب عقل کا رکھتے ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں، اس میں خطاب آپ ﷺ کو ہے مگر سنانا آپ ﷺ کی امّت کو ہے۔

زیادتی علم کا سوال :

ایک اور آیت یاد آئی قُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا . حق تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہیں کہ اگرچہ آپ ﷺ کے باطن میں میرے دیئے ہوئے علوم بہت کچھ ہیں لیکن مجھ سے دعا کرتے رہا کرو، درخواست کرتے رہا کرو کہ اے ربّ مجھ کو علم میں زیادتی عطا فرماتے رہیئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں نفسِ علم مطلوب ہے وہیں اس نورِ علم میں زیادتی بھی مطلوب ہے۔

☆☆☆

چھٹی مجلس

ترتیبِ سلوک

شرعاً ہر کام کا طریق وضابطہ متعین ہے۔ اس لئے ہر کام درحقیقت وہ کہلایا جاتا ہے جو شریعت کے مطابق ہو۔ اگر شریعت سے ہٹ کر کرلیا جائے تو گویا کام صورۃً ہوتا نظر تو آتا ہے مگر حقیقتاً نہیں ہوتا۔

حقوقِ واجبہ مستحبات پر مقدم ہیں :

کسی پر قرض ہو اور خیرات کرتا رہے، قرض کی پرواہ نہ کرے یا کسی پر زکوٰۃ واجب ہو اور بجائے زکوٰۃ ادا کرنے کے خیرات کرتا رہے یا کسی پر قرض بھی ہو اور قرض ادا کئے بغیر حج کرنے چلا جاوے یا بیوی بچوں یعنی نابالغ اولاد کا نان ونفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، اس کی ادائیگی کا تو اہتمام نہیں اور حج کرنے جارہا ہے یا ایسے ہی ورثہ جو ترکہ سے استحقاقِ وراثت رکھتے ہیں، ان میں سے کسی وارث کے لئے وصیت بھی کررہا ہے حالانکہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں تو یہ جتنے بھی کام ہیں ٹھیک نہیں ہیں۔ اس لئے کہ فقہ ظاہری کے

احکام شرعیہ کے مطابق نہیں، حکم حاکم کے خلاف کر رہا ہے۔

سلوک میں داخلہ کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیاں :

تصوف و سلوک میں داخل ہونے کے بعد، اس کے کچھ معمولات و تسبیحات بھی ہیں کہ ان کو پڑھتا ہے، ذکر و تلاوت بھی ہے کہ ان کو بجالاتا ہے، کوئی شغل بھی ہے اور مراقبات و تصورات بھی ہیں اور نہ معلوم کیا کیا اوراد و وظائف ہیں، یہ سب کچھ کر رہا ہے لیکن پندرہ سولہ سال کی عمر جب سے وہ بالغ ہوا، اس زمانہ سے لے کر زمانہ اصلاح کی طرف متوجہ ہونے تک کے درمیانی زمانہ کی نماز ہی نہیں پڑھی، اور اگر کبھی پڑھ لی، تو کسی وقت کی نہیں بھی پڑھی، رمضان شریف کے روزے آئے کبھی پورے رکھ لئے، کبھی نہیں رکھے یا کبھی دس دن کے رکھ لئے، کبھی پانچ دن کے رکھ لئے، زکوٰۃ کی ادائیگی کی طرف کبھی خیال بھی نہیں گیا، ہاں کوئی آتا جاتا سائل پہنچ گیا، اس کو کچھ پیسے دئیے دو ہزار بھی دیدیئے، پانچ ہزار بھی دیدیئے، مگر نیتِ زکوٰۃ نہیں کی، اور حسابِ زکوٰۃ رکھنے کی تو بات ہی نہیں، لوگ عمرہ کے لئے جارہے تھے، اس کو بھی خیال آیا تو عمرے کے لئے چلا گیا مگر حج کی طرف التفات ہی نہیں اب جب سلوک و تصوف میں قدم رکھا، اصلاح کی طرف متوجہ ہوا تو اشراق بھی ہے، چاشت بھی، اوابین بھی، تہجد بھی، وظیفوں و نفلوں میں لگ گیا، تلاوت کی طرف بھی لگ گیا۔

پہلی چیز قضا نمازوں کی ادا ہے :

لیکن یہ کبھی نہ سوچا کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں بالغ ہوا تھا اور اب میری اتنی عمر آ گئی، ان دونوں عمروں کے درمیان کا زمانہ کتنا ہے؟ مثلاً پندرہ برس کی عمر میں بالغ ہوا تھا، اب پینتالیس برس کی عمر ہے تو پینتالیس میں سے پندرہ برس کا زمانہ بلوغ سے پہلے کا نکال دیجئے تو تیس رہ گئے، اب تیس برس کی عمر کے زمانہ میں میری کتنی نمازیں چھوٹیں، کتنے

روزے چھوٹے، ان قضا نمازوں اور روزں کا تو اہتمام ہی نہیں اور نفلوں میں لگا ہوا ہوں' یہ میری عقل کو کیا خبط ہو گیا۔ کیا تیس برس میں کبھی سوچا، غور وفکر کیا، کبھی تحری کی، اسی سوچ اور غور وفکر کو تحری کہتے ہیں، اس تحری کا یہ نتیجہ ہوگا کہ اپنی حالت پر افسوس صد افسوس کرے گا کہ اتنے عرصہ کی نمازیں میرے ذمہ ہیں۔ میں نفلوں کا تو اہتمام کر رہا ہوں اور فرائض قضا کر رکھے ہیں، جن کا بھاری بوجھ میری چھاتی پر ہے، اس کا مجھے خیال بھی نہیں اور مجھے کسی نے اب تک ادھر توجہ بھی نہیں دلائی، یہ میری بڑی بھاری غلطی ہے، اس افسوس کا یہ اثر ہوگا کہ اب عہد کرے گا کہ نفلوں کو تو چھوڑوں گا اور جو فرائض کا قرضہ ہے اس کو ادا کروں گا۔

قضا نمازوں کی ادائیگی کا آسان طریقہ :

قضا نمازوں کی ادائیگی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جس وقت کی نماز پڑھی جائے، اس کے ساتھ جماعت سے قبل یا جماعت کے بعد اسی وقت کی قضا کے صرف فرض پڑھ لیا کرو اور عشاء میں وتر بھی۔ اور فرصت و ہمت کے وقت ایک وقت یا ایک دن میں کئی کئی وقت یا کئی کئی دن کی پڑھ لی جائے۔

اگر کوئی درمیان میں انتقال کر گیا کہ قضا نمازیں بھی اور قضا روزے بھی باقی رہ گئے اور نیت پورے طریقہ سے عزمِ مصمّم (پختہ ارادہ) کے ساتھ ادا کرنے کی تھی، تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے، کیونکہ وہ ذات عالم الغیب والشہادۃ ہے، وہ ذات جانتی ہے کہ فلاں سال سے تجھے پشیمانی آ گئی تھی کہ پورے ادا کروں گا لیکن موت تو تیرے قبضہ میں نہیں تھی، وہ تجھ کو آ گئی، اسی لئے حق تعالیٰ سے قوی اُمید ہے کہ ایسے عذر کی حالت میں قصور معاف فرما دیں گے، یہ نیت کا ثمرہ ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ :

اکثر یہ شبہ ہوتا ہے کہ فجر و عصر کے بعد تو نماز پڑھنا جائز نہیں، جواب یہ ہے کہ وہ

عدم جواز نفلوں کے لئے ہے، قضا کے لئے نہیں، قضا پڑھ سکتے ہیں۔ یہ قضا نماز پڑھنے کا آسان طریقہ ہے، بس کمر بستہ ہو کر ادا کرنا شروع کر دینا چاہئے۔

قضا کی نیت کا طریقہ:

اب سوال ہوا کہ قضا کی نیت کس طرح کریں؟ تو یوں نیت کر لو کہ میرے ذمہ پہلے سال کی جو صبح کی نماز ہے اس کی نیت کرتا ہوں اور اگر پڑھے لکھے ہو تو کاغذ میں لکھ لیا کرو تا کہ حساب میں آسانی ہو۔

مسلمان بیک وقت دو (۲) دوکانوں کا دوکاندار ہے:

مسلمان دوکاندار بیک وقت دو (۲) دوکانوں کا دوکاندار ہو گیا ہے کیونکہ آخرت کا بھی اعتقاد متحضر ہو گیا ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی گذرے ہیں کہ دنیا کی دوکانداری بھی کر لیتے تھے جو کہ وہ بنیت دین، دین ہی کی دوکانداری تھی۔ وہ لوگ اس طرح پر دوکانداری کرتے تھے کہ گاہک آ گیا تو سودا دیدیا، گاہک چلا گیا تو نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے، پھر گاہک آ گیا تو سلام پھیر کر سامان کے لینے دینے کی بات چیت کر لی، سامان دیدیا، پیسے لے لئے وہ چلا گیا، پھر نماز کی نیت باندھ لی۔

متقی مسلمان دو قسم کی رقمیں لے کر گھر جاتا ہے:

جب دوکان بند کر کے گھر جانے لگے تو وہ لوگ دونوں قسم کی تجارت کی رقم (اجر و ثواب) آخرت کا ذخیرہ اور (روپیہ پیسہ) دنیا کا مال گھر لے کر جا رہے ہیں، یہ لوگ دنیوی پیسے بھی لے کر جا رہے ہیں اور جو نماز پڑھ رہے تھے آخرت کا ذخیرہ وہ بھی لے کر جا رہے ہیں، کسی دن سو (۱۰۰) رکعت پڑھ لی، کسی دن پچاس (۵۰) پڑھ لی، کسی دن چالیس پڑھ لی، یہ تو گاہک کے اوپر ہے، گاہک زیادہ آتے رہے تو دس پڑھ لے گا ہک کم آئے تو مسلسل

و، سو بھی پڑھ لیتے تھے، اس قسم کے متعدد واقعات ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ سری سقطیؒ جو اُن کے ماموں تھے وہ بھی دوکان میں ایسا ہی کرتے تھے۔ وہ دونوں دوکانوں کو چلاتے ہوئے بیک وقت دونوں خیرے لے کر گھر جاتے تھے کیونکہ دونوں جہاں کے حقوق ادا کرنے ہیں' مسلمان اور مومن ہوکر ایک ہی حق ادا کرنا یہ کب زیب دیتا ہے، ہاں جب تک شادی نہیں کی تھی اکیلا تھا، ایک ہی حق اپنی ذات کا ادا کرتا تھا مگر جب شادی کر لی بیوی ہوگئی تو اس کا بھی حق ادا کرتا ہے۔

اسی طرح جب ایمان لے آیا، آخرت و قیامت کو مانتا ہے اور ربّ ذوالجلال کے سامنے کھڑے ہوکر سوال کا جواب دینے کا یقین ہے تو یہاں بھی کام کر رہا ہے اور وہاں جواب دینے کا بھی سامان تیار کر رہا ہے۔

مسلمان کا دنیا کا کام بھی آخرت کے لئے ہے :

اور یہاں کا نباہنا درحقیقت وہاں کا ہی نباہنا ہے، نپٹانا ہے وہ بھی آخرت کا ہی کام ہے، اگر بیوی کو کھانا، پینا، نان ونفقہ نہ دیا تو اللہ میاں کے یہاں پوچھ ہوگی، بیوی بچوں کی پرورش اوران کی نگرانی جواس کے ذمہ تھی کیوں نہ کی کہ بچے کسی ایسی ویسی جگہ تو نہیں بیٹھتے، کہیں کوئی بگڑ تو نہیں گیا کیونکہ یہ سب اسی کی ذمہ داری ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اپنے بھائی سے کہہ کر آیا تھا کہ میرے بچوں کی نگرانی رکھنا، ارے وہ اپنے گھر کی اور بچوں کی خبر لے گا یا تمہارے بچوں کی۔

بچے کی پرورش والدین کی ذمہ داری ہے :

جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اللہ میاں انتظام کرتے ہیں، جب ماں کے

پیٹ سے باہر آ گیا تو بھی اللہ میاں نے پہلے سے اس کے لئے دودھ کا انتظام کر دیا کہ ماں کی چھاتی میں دودھ پیدا کر دیا۔

لیکن جب بچہ کھانے پینے کے لائق ہو جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری ماں' باپ پر ڈال دی جاتی ہے' اب اس کا کھانا پینا ماں باپ کے ذمہ ہے، اسی لئے جب بچہ کھانے پینے کے لائق ہو جاتا ہے تو اللہ میاں کی طرف سے ماں کی چھاتی میں دودھ نہیں رہتا۔ وہ تو بچہ کی ضرورت کی وجہ سے غیر اختیاری طور پر اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیا تھا، جب ضرورت ختم ہو گئی، دودھ بھی ختم ہو گیا۔

ایسے ہی بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری میاں کے ذمہ ہے، اگر چہ بیوی صاحبہ کو باپ کے گھر سے بطورِ جہیز کتنا ہی ذخیرہ مل گیا ہو یا میراث میں کتنی ہی نقد و جائداد حاصل ہو گئی ہو پھر بھی بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری میاں پر لازم ہے، جس خاندان اور حیثیت کی بیوی ہے، اسی حیثیت کے اعتبار سے میاں کی ذمہ داری ہے، ادنیٰ درجہ والی ہے تو اسی اعتبار سے نفقہ واجب ہوگا، اگر اوسط خاندان و مرتبہ والی ہے تو اوسط درجہ کا واجب ہوگا اور اگر دنیوی اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہے کوئی رئیس زادی یا شہزادی ہے تو اسی کے اعتبار سے نان ونفقہ واجب ہوگا، اس لئے پہلے ہی سوچ لینا چاہئے کہ کیسے گھرانے میں شادی کر رہا ہوں، اگر تو چٹنی روٹی کھاتا ہے تو وہ بھی کھا لے گی یا نہیں؟

ایک شبہ کا ازالہ :

اور اگر کسی عورت کو دودھ نہیں اُترتا یا کم اُترتا ہے تو یہ اتفاقی بات ہے اس میں بھی بعض وقت اپنی کوتاہی ہوتی ہے کہ ایسی غذائیں نہیں کھلائی جاتیں جس سے دودھ خوب اُترے، بعض طبّی اور ڈاکٹری تدابیر ایسی ہیں جن سے دودھ اُترنے لگتا ہے، ان کو کیوں نہیں اختیار کیا؟ الغرض یہ نادر ہے اور نادر پر حکم نہیں لگایا جاتا۔ النادر کالمعدوم۔

آج کل عقل کم، ذہن زیادہ ہے:

آج کل عقل کی بہت کمی ہے، ذہن کی بہت افراط (زیادتی) ہے، اہلِ سائنس ...ند پر جار ہے ہیں لوگ سمجھ رہے ہیں بڑے عقلمند ہیں عقل کے ذریعہ چاند پر جار ہے ہیں یہی ...ا بھاری مغالطہ ہے، اگر یہ عقلمند ہوتا تو پہلے اللہ تعالیٰ کو مانتا جو خالق و مالک ہے۔ جب اسی کو ...یں مانا تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ عقلمند نہیں ہے، سو عقل سے نہیں ذہن سے جار ہے ...ں، ترکیب و تحلیل جس سے نئی نئی چیزیں ایجاد میں آتی ہیں، یہ ذہن کی جدت ہے۔

...گھر کا سامان لکڑی وغیرہ لانا مرد کے ذمہ ہے:

اگر دنیاوی اُمور چھوڑ کر مرد حضرات نفلوں میں لگ جائیں تو گھر کے لئے لکڑی، ...ا، دال، مصالحہ وغیرہ کون لاوے گا۔ غلہ کا مہینہ، دو مہینہ، چار مہینہ کا انتظام کر بھی دیا تو جو ...زانہ باہر سے لانے کی چیزیں ہیں مثلاً گوشت، ترکاری، سبزی، دودھ وغیرہ وہ کون لائے ...۔ اسی طرح بعض مدرسین سے ان کی بیوی صاحبہ کہتی ہیں کہ پڑھانے تو جار ہے ہو لکڑیاں ...م ہوگئی ہیں، دوپہر کو کھانا کس طرح پکے گا، تو مدرس صاحب کہتے ہیں کہ لڑکوں کو بھیج دوں ...وہ لے آئیں گے۔ بیوی کچھ باصلاحیت ہے تو کہتی ہے کہ طلبہ پڑھنے کے لئے آئے ...یا گھر کا کام کرنے کے لئے، لڑکوں کو بھیجنا جائز بھی ہے، یہ تو راحت حاصل کرنا ہوا، یہ تو ...غرض کے لئے کام لینا ہوا، یہ تو جائز نہیں ہے۔

...ں سے کام لینے کی شرط:

ہاں اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کرنا بھی والدین کی طرف سے تمہارے ...رد ہے تاکہ ان کو بھی کام کرنے کا صحیح ڈھنگ معلوم ہو جائے یا اس کی طبیعت میں کام ...نے سے جو رُکاوٹ ہے وہ دور ہو جائے تو خیر، لیکن آج کل ایسے استاذ کتنے ہیں؟ پھر

اگر استاد ان باتوں کا خیال رکھ کر کام لیتا بھی ہے۔تو تمام بیبیوں میں یہ صلاحیت کہاں
آپ نے تو صرف لکڑی لینے بھیجا تھا، وہاں بیوی صاحبہ بچہ کھلوانا، پانی بھروانا، غلہ منگوانا،
منگوانا سب کام لے رہی ہے، یہ کس طرح جائز ہے؟ بالخصوص جب کہ بیعت ہو کر
بلا بیعت اصلاح میں داخل ہو گیا ہے تو ہر کام کی اصلاح کرنی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل اور فتویٰ عقل :

اللہ میاں کا فضل ہے کہ قضا میں سنتِ مؤکدہ اور غیر مؤکدہ سب کو ہی معاف
کر دیا؛ مگر ہماری عقل کہتی ہے کہ بلوغ کے بعد سے یہ فریضۂ الٰہی کیوں چھوڑا، جب تو ا
تعالیٰ اور قیامت پر ایمان لایا ہے، تو فریضۂ الٰہی کا تجھے پتہ کیوں نہ چلا، تو دنیا میں ایسا مشغو
ہو گیا کہ مدہوش ہو گیا، اب تمہاری سزا یہ ہے کہ ادا بھی پڑھو قضا بھی مع سنتوں کے پڑھو
نفل بھی پڑھو۔ ہماری عقل کا تو یہ فتویٰ ہے کیونکہ سزا جرم کے موافق ہونا چاہئے، لیکن وہ ذا
ارحم الراحمین، اکرم الاکرمین کیا فرما رہی ہے؛ نہیں نہیں ایسا نہیں، انسان ہے، اور قاعدہ ہے :

الانسانُ مرکبٌ مِن الخطاء والنسیان ۔

انسان غلطی اور بھول سے مرکب ہے۔

غلطی ہوگئی لہٰذا قضا میں صرف فرض ہی پڑھ لیا کرے۔ ہمیں یہ تمہاری تو
شرمندگی پسند ہے۔ قربان جایئے باری تعالیٰ کی اس سزا پر جو جزاء سے بھی بڑھ کر ہے۔

فکر و سوچ کی ضرورت :

اس ذات سے ہمیں کتنی محبت ہونی چاہئے، ہم نے سوچنا چھوڑ دیا، اس لئے
مخلوق کی محبت ہمارے جگر و دل میں بیٹھ گئی ہے اور خالق کی محبت جو اصل فطرت
ہمارے اندر رکھی ہوئی تھی وہ مغلوب ہوگئی۔ یہ سوچ اس محبوبِ حقیقی کا یہ کتنا بڑا اکرم ہے

قضا نمازوں میں صرف فرض پڑھنے کا حکم فرمایا، سنتیں اور نوافل سب معاف فرمادیئے، اب یہ حال ہے کہ قضا نمازیں پڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس سوچ کے اندر اس خالق کی محبت بڑھتی چلی جارہی ہے یہ ہے سلوک۔

سلوک وتصوف بھی جامۂ شریعت ہے :

یہ سلوک وتصوف بھی جامۂ شریعت ہے، یہ جامۂ سلوک' شریعت نے ہی پہنایا ہے کیونکہ شریعت کے دو لباس ہیں، ایک ظاہری اس کو فقہ کہتے ہیں، دوسرا باطنی' اس کو تصوف کہتے ہیں، شریعت ان دونوں لباسوں کی جامع ہے۔

تصوف میں شریعت کی حقیقت بیان کی جاتی ہے، یہاں ایسے طریق سے جو تکبّر کی دعوت دینے والا ہے، جس سے تکبر پیدا ہوتا ہو، اس سے روکا جاتا ہے۔ بعض دفعہ سالک سے کہا جاتا ہے تم ننگے پیر کیوں پھرتے ہو، جوتی پہن کر کیوں نہیں چلتے ہو، اچھا اپنا تصوف ظاہر کرتا پھرتا ہے، تواضع آنے سے پہلے ہی تصوف ظاہر کرتا ہے تاکہ لوگوں کی نظروں میں تیری تشہیر ہو جائے کہ بڑے بزرگ آدمی ہیں، ابھی سے بشر حافی بن گیا، بشر حافی جیسا بن تو جا، پھر جوتی اُتار دینا، ابھی تو اس کو جوتی اُتار دینے سے روکا جائے گا، اس کو شیخ ہی جانتا ہے وہ شیخی خور کی شیخی کو مٹاتا ہے، جس چیز سے لوگوں کی نظروں میں تشہیر ہو، اس سے اس کو منع کیا جاویگا۔

ایماندار تاجر لاپرواعابد سے بہتر ہے :

جب بچوں کا نان ونفقہ واجب ہو گیا، تو اب جو شخص بیوی بچوں کا نفقہ ادا کرنے کے لئے حلال وطیب کا لحاظ کرتا ہوا ضرورتِ شرعیہ کا خیال کرتا ہوا کمانے میں لگا ہوا ہے، وہ سالہا سال تک راتوں کو عبادت کرنے والے ان عابدین کی ہزاروں' ہزاروں' ہزاروں

رکعات سے بہتر ہے جو بیوی بچوں کے نان ونفقہ کی پروانہیں کرتے۔

حقوق العباد کو چھوڑنے سے عبادت بھی داغدار ہو جاتی ہے :

یہ ہے اصل شریعت اس کے چھوڑ دینے سے گنہگار ہوگا چاہے صورتِ عبادت کا کیسا ہی کام کر رہا ہو، اس کو بجائے ثواب ملنے کے گناہ کی لپیٹ میں ظلمت ملتی رہے گی اور سینکڑوں قسم کی عبادتوں کے ثواب کا وزن مضمحل وکمزور ہوتا چلا جاوے گا، اس میں جو نور آیا تھا، گناہ کی ظلمت سے داغ، دھبہ پڑتا رہے گا جیسے سیاہی کا دھبہ سفید کپڑے پر۔

بھائیو ! یہ تسبیحات پڑھنے کی مخالفت نہیں ہو رہی بلکہ تسبیح ہاتھ میں رکھو، کون منع کرتا ہے، البتہ توفیقِ الٰہی سے اس کا ڈھنگ سکھایا جا رہا ہے کہ پہلے دل کی جانچ کرو، نفس کا جائزہ لو کہ شریعت پر چل رہا ہے یا نہیں؟ پھر تسبیح ہاتھ میں رکھو، کون منع کرتا ہے۔ خالی الذہن ہو کر نہیں بلکہ نفس کی نگرانی کرتے ہوئے ورنہ کام بگڑ جائے گا۔

قرآنِ پاک میں ارشاد ہے :

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ط (پ۲۹، ع۱۴)۔ (اللہ کو قرض حسنہ دو)

تو اس سے حقیقتاً قرض دینا مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم جو کسی غریب محتاج کو دے رہے ہو، تو یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ پر قرض ہے، یہ بیچارہ غریب کہاں سے ادا کرے گا اور اس کے عوض میں نہ معلوم اللہ تعالیٰ تمہیں کیا کیا دے گا۔

قرآنِ پاک کو سمجھنے کے لئے محاوراتِ عرب کی ضرورت ہے :

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "علیکم بدواوین العرب" (تم عرب کے دوانین کو لازم پکڑلو) کیونکہ جو شخص دواوین جاہلیت کے ذریعہ سے محاوراتِ عرب کو سمجھے گا، وہ قرآن مجید کو بھی خوب سمجھے گا تو جیسے اللہ تعالیٰ کو قرض دینا ایک محاورہ ہے،

ظاہری معنیٰ مرادنہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہونے سے ظاہری معنیٰ مرادنہیں بلکہ انہوں نے اپنے کرم سے روزی کا وعدہ فرمالیا ہے، اس کی ذمہ ہونے سے تعبیر کی گئی ہے۔ جیسے اہل اللہ نفلوں کو خصوصاً تہجد کو عقیدہ میں سمجھتے تو ہیں نفل' فرض وواجب نہیں سمجھتے، لیکن اس طرح پابندی سے ادا کرتے ہیں جس طرح فرض ادا کیا جاتا ہے، اس لئے بھی کہ ابتداء اسلام میں یہ (تہجد) فرض تھی، ان کا کرم ہے کہ فرضیت کو مٹا کر سنت قرار دیدی۔

عشاء کے وقت قبل وتر بھی تہجد ادا ہو جاتی ہے :

بعض علماءِ محققین نے لکھا ہے کہ چونکہ تہجد کی نماز سنتِ مؤکدہ ہے، اس لئے اگر آخری شب میں اُٹھ کر نہ پڑھ سکو تو عشاء کے وقت ہی وتر سے پہلے چار رکعت تہجد کی نیت سے پڑھ لیا کرو، ورنہ تہجد تو وہی ہے جو آخر شب میں اُٹھ کر پڑھی جاوے، لیکن اگر سالک اس سہولت کے باوجود نہیں پڑھتا، آخری شب میں تہجد کے لئے اُٹھتا نہیں اور شروع شب میں یوں سمجھ کر کہ یہ بھی کوئی تہجد ہے پڑھتا نہیں تو اس پر شیطان غالب آ گیا لیکن مشائخ محققین شریعت کو سمجھنے والے شیطان کی نہیں چلنے دیتے۔

حقوق العباد کی اہمیت :

اور ہوسکتا ہے کہ خالق اپنا حق معاف کردے لیکن مخلوق کا جو حق واجب تھا، وہ ادا نہیں کیا تو اس حق کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے بلکہ بدلہ دلوائیں گے، اگر کسی کے تین پیسے کسی کے ذمہ تھے اور ادا کرسکتا تھا مگر ادا نہیں کئے تو سات سو نمازیں جو قبول ہو چکی ہیں، اس سے لے کر صاحب حق کو دیدی جائیں گی۔ حق مار لینا کوئی کھیل نہیں، اس کے باوجود اب تو یہ حال ہے کہ زمینوں کی زمینیں ہضم کر جاتے ہیں، مگر کوئی پرواہی نہیں ہے۔ دیکھو آج کل چکبندی چل رہی ہے، جو روپے پیسے والے ہیں، رشوت دے دے کر بیچارے غریبوں

کی اچھی اچھی زمین خود حاصل کر لیتے ہیں اور خراب و بیکار ان غریبوں کو دیدیتے ہیں۔ ظاہر میں تو یہ غریب مارا جارہا ہے مگر عند اللہ حقیقت میں وہ دونوں (مالدار اور حاکم) مارے جارہے ہیں اور وہ حاکم خوش ہے کہ میرے پاس روپیہ آ گیا اور مالدار خوش ہے کہ اس کے پاس عمدہ زمین آ گئی، دونوں ہنس رہے ہیں لیکن یہ کھسیانی ہنسی ہے۔

ہنسی کے آنسو:

اس ہنسی کے آنسو جب نکلیں گے جب حقیقی عدالت قائم ہوگی، اور حقیقی عدالت مرنے کے بعد قائم ہوگی، وہاں صحیح تحقیق ہو کر صحیح فیصلہ ہوگا اور حقیقی جزا اور سزا دی جائے گی، یہاں دنیا میں تو کچھ موٹی موٹی باتیں آرام و تکلیف کی پہنچتی رہتی ہیں، حقیقی آرام و تکلیف تو آخرت کے ہیں، کسی کی زمین قبضہ میں کر کے تُو تو مر جاوے گا، کب تک زندہ رہے گا، بیٹے پوتے مزے کریں گے تو ان کے لئے ظلم کو کے حاصل کر رہا ہے۔

حضرت شبلیؒ کی حکایت:

حضرت شبلیؒ حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے آئے، یہ متقدمین حضرات بڑی دیر میں بیعت کیا کرتے تھے، کبھی کہہ رہے ہیں یہ کرو، کبھی کہہ رہے ہیں وہ کرو، امتحان لے رہے ہیں کہ سلوک میں داخل ہو رہا ہے کتنا مضبوط ہے، کتنا پختہ معتقد ہو کر آیا ہے۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ نے بھی حضرت شبلیؒ سے فرمایا ارے شبلیؒ! تم تو گھر کے امیر بھی ہو اور شہر رَے کے حاکم بھی رہ چکے ہو، تم نے لوگوں پر ظلم و زیادتیاں کی ہوں گی، جاؤ پہلے معافی مانگ کر آؤ۔ چنانچہ گئے اور ایک سال تک گشت کیا اور سب لوگوں سے معافیاں مانگی، دیکھا کیسے درجہ کے بڑے شخص تھے، امیر ہونے کے ساتھ حاکم بھی تھے، تب بھی سب سے معافیاں مانگی، اب تو غریب بھی معافی نہیں مانگتا، تکبر غریب کے اندر ایسا

گھسا ہوا ہے کہ جانتا ہے میں غریب ہوں، مگر معافی مانگنے کو تیار نہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے ان سے فرمایا کہ اب ایک سال تک بھیک مانگو، غرضیکہ حضرت شبلیؒ نے ایک سال تک بھیک مانگی، مگر کسی نے کچھ بھیک نہ دی۔ حاضر ہو کر کہا کہ بھیک مانگو اب کے بھیک ملے گی اور جو کچھ ملے وہ غریبوں کو تقسیم کرتے رہنا اور ہمارے لنگر خانہ سے کھانا کھاتے رہو۔

پہلے خلفاء و سلاطین کے زمانہ بادشاہت میں خزانہ شاہی سے مدارس و خانقاہوں کا خرچ مقرر ہوتا تھا، ایسے لنگر خانے ہوتے تھے کہ جو غریب و مسکین وغیرہ آویں تو اسے کھانا کھلا دیا جاوے۔ اب تو ایسا نہیں ہے۔

پھر گئے، ایک سال اور بھیک مانگی اور جو ملتا غریبوں کو تقسیم کرتے رہے اور لنگر سے کھاتے رہے۔ اب تین سال کے بعد خانقاہ میں رہنے کی اجازت ہو رہی ہے اور فرمایا کہ مجلس میں جہاں جگہ ملے بیٹھ جایا کرو۔

اس تین سال کے عرصہ میں ان کی اصلاح تو ہوگئی، خیر جب اصلاح ہوگئی تو اب ذکر و تسبیح بتانا شروع کر دی۔ تب ہی تو آج ہماری زبانوں پر اُن کا نامِ نامی اس طرح آ رہا ہے سیدنا حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہ العزیز۔ یہ عظمت و احترام اسی اصلاح میں مجاہدہ کرنے کی وجہ سے ہے اور اسی مجاہدہ پر وعدۂ حق ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ٥

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہمارے دین (کے کام) میں کوششیں کیں، ہم (بھی) اُن کو ضرور اپنے رستے دکھائیں گے اور کچھ شک نہیں کہ اللہ اُن (لوگوں کا) ساتھی ہے جو (خلوصِ دل سے) نیک عمل کرتے ہیں۔ (عنکبوت:۶۹)

حدیث شریف (مشکوٰۃ شریف: ج۲ص۴۳۳) میں آیا ہے رسول اللہ ﷺ کا

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو غریب متکبر پر بہت غصہ آتا ہے حتیٰ کہ قیامت میں اس کی طرف نظر رحمت بھی نہیں فرمائیں گے کیونکہ اس امیر کے پاس تو تکبر کا سامان بھی ہے، اے غریب تیرے پاس تو کچھ بھی نہیں، پھر تجھ کو تکبر کس بات پر ہے؟ اب تو بڑے سے بڑے غریب بھی متکبر بنے ہوئے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

امیر کی انوکھی تعریف :

امیر عام طور پر تو اسی کو کہتے ہیں جس کے پاس روپیہ، نقد، جائیداد زیادہ ہو لیکن حقیقتِ حال یہ نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس کی وجہ سے لوگوں کے رجوعات، رُجحانات ہوتے ہیں، اس کو بڑا تصور کرتے ہیں، اس کی وجہ سے اعزاز لوگوں کے خیال میں آتا ہے، ہر ایسی چیز امارت ہے اور جس میں ایسی چیز پائی جاتی ہے وہ امیر ہے، یہ امیر کی عمومی تعریف ہے۔ لہٰذا کوئی زمین و جائیداد کے اعتبار سے امیر ہے اور کوئی منصب و عہدہ کے اعتبار سے امیر ہے، کوئی تجارت و سوداگری کے اعتبار سے امیر ہے، کوئی عبادت کی کثرت کے اعتبار سے امیر ہے، کوئی علوم کے خزانہ کی کثرت میں امیر ہے، کوئی بہترین قرأت سے امیر ہے، کوئی بہترین حفظ سے امیر ہے، کوئی بہترین آواز سے امیر ہے۔

تکلم کے آداب :

ایسے ہی کوئی نیا آدمی خانقاہ میں آکر رہتا ہے، اس کو آدابِ خانقاہ کا علم نہیں، اس نے منتظم سے کچھ کہہ دیا، ٹھیک ہے گوارا کر لیا جائے گا، ابھی آیا ہے، اس کو نہ شرعی حکم کا پوری طرح علم ہے، نہ عملی زندگی بنی ہے، اس کے برخلاف دوسرا شخص ہے، عرصہ سے خانقاہ میں رہتا ہے اور کہتا ہے کہ اصلاح کی نیت سے آیا ہوں، وہ بھی بھاری بھر کم دل دکھانے والے الفاظ زبان سے نکالے اور تیزی کے ساتھ اس منتظم سے پیش آوے، یہ کیسے گوارا ہوگا، اس

کو تیزی سے جواب دینے کا کیا حق ہے؟ تم تو پرانے ہو چکے ہو، اچھا تم اس منتظم کی اصلاح کرنا چاہتے ہو تو پہلے اپنی اصلاح کی فکر کرو، کہیں تمہارے اندر تکبر نہ آ جاوے کہ تم سے وہ بیچارہ نرمی سے کہہ رہا ہے اور تم تیز ہو رہے ہو۔

رہا نئے شخص کے متعلق! تو اگر اس کی طرف سے کوئی ناگوار بات پیش آوے تو کہہ تو دینا چاہئے لیکن وہ اصلاح میں مشغول ہے، آہستہ آہستہ اصلاح ہو جائے گی۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا واقعہ :

اس طرح حضرت ابراہیم بن ادہمؒ جو سلسلۂ چشتیہ کے شیخ المشائخ ہیں، سلطنت چھوڑ کر سلوک و تصوف کی طرف آئے تھے۔ وہ تو بادشاہت کے ذائقہ، راحت و آرام، دولت وصولت، عزت و حشمت، حشم و خدم کا فائدہ اور مزہ اُٹھائے ہوئے تھے، اس طرح کے مورچھل جھلا جا رہا ہے کہ مکھی نہ آنے پاوے اور کیسے عمدہ عمدہ کھانے دسترخوان پر ہوتے تھے، سب چھوڑ چھاڑ کر تصوف کی طرف آئے تھے۔ زمانۂ بادشاہت میں تو یہ حال تھا کہ ہر کام کے لئے خادم موجود، لیکن جب اِدھر آئے تو غریبی اس درجہ کی کہ کپڑا پھٹ گیا، سوئی، دھاگہ اپنے پاس ہی موجود ہے اپنے ہاتھ سے بیٹھے سی رہے ہیں تا کہ سنت پر عمل ہو جائے کیونکہ حضورِ اکرم ﷺ بھی اپنا پیراہن مبارک اپنے دست مبارک سے ہی سی لیتے تھے اس لئے حضرت ابراہیم بن ادہم بزبانِ حال فرما رہے ہیں کہ میں بھی خود کیوں نہ سی لوں۔

ادھر ہم اپنا جائزہ لیں کہ سب کا سب کام والدہ محترمہ یا بیوی صاحبہ پر ڈال دیتے ہیں۔ وہاں بادشاہت چھوڑ کر غریبی میں اپنا کپڑا خود سی رہے ہیں کہ اتباعِ سنت نصیب ہو، بھائیو! سمجھے؟ یہ ہے اصلاح۔

اب کوئی ان سے پوچھے کہ حضور والا آپ تو بادشاہت کر رہے تھے، ایسی راحت و لذت، عیش و عشرت اور خوشی و انبساط میں زندگی بسر کر رہے تھے، یہاں کیوں آ پھنسے، سب

مزے کیوں بدل دیئے؟ ابراہیم بن ادہمؒ فرمادیتے کہ میں نے جو سکون واطمینان اور راحتِ قلب یہاں (سلوک وتصوف کی زندگی میں) پایا وہاں (بادشاہت میں) کہاں تھا۔ وہاں تو ہر وقت بے چینی، بے سکونی، دل کے اندر ہر وقت ہائے، ہوئے، کہیں یہ خطرہ کہ فوج نہ بگڑ جائے، کہیں یہ اندیشہ کہ رعایا خلاف نہ ہو جائے، یہ تمام تفکرات یک لخت ختم ہو گئے، اور ذہن نے تصوف وسلوک کے دھیان کے ساتھ شروع ہو گئی۔

اتباعِ شریعت کا مزہ :

واقعہ یہ ہے کہ دہلی میں دو کسبی (رنڈی) بڑی حسین وجمیل رہتی تھیں، ان کے یہاں بڑے بڑے نواب زادے اور رئیس زادے آتے تھے، وہاں کسی غریب، غرباء کی پہنچ نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اتفاق سے ایک پر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ (نگاہِ پُر تاثیر) پڑ گئی اور دوسری حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے وعظ سے متاثر ہو گئی، وہ دونوں اس فعلِ شنیع سے تائب ہو گئیں اور دونوں نے شادی کر لی۔ دونوں شاہ صاحبؒ کے ساتھ سفرِ جہاد میں روانہ ہو گئیں اور لشکر کا کھانا پکانا اور گھوڑے خچروں کا دانہ دلنے کا کام ان کے سپرد ہوا۔ کسی نے ان دونوں سے پوچھا کہ تم نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے کہ بڑے بڑے شہزادے، نواب زادے تمہارے یہاں آتے تھے اور تم شاندار مکانوں، کوٹھی، بنگلوں اور معطر کمروں میں عیش وعشرت اور اسبابِ راحت کے ساتھ رہتی تھیں، اور اب یہ مشقت کا زمانہ گزر رہا ہے۔ بتاؤ کونسا زمانہ تمہاری نظر میں بہتر ہے؟

دونوں نے بے ساختہ بیک زبان فوراً کہا ہمارا وہ زمانہ افسردگی، رنج وغم کا زمانہ تھا، کسی وقت دل کو سکون وچین نہیں تھا اور اس حال میں ہم جو سکون وچین، اطمینانِ قلب پا رہے ہیں، ہم اُسے بتا نہیں سکتے۔

یہ ہے راستہ راحت وسکون کا جو ان دونوں نے تجربہ کے بعد حاصل کیا ہے،

اسبابِ راحت کا نام راحت نہیں ہے، سامانِ راحت جمع ہونا راحت نہیں ہے، جب تک سکونِ قلب حاصل نہ ہو، کروڑ پتی بھی ہے، سرمایہ دار بھی ہے، بڑے بڑے کارخانوں اور ملوں کا مالک بھی ہے، دوچار بڑی بڑی کوٹھی اور بنگلے بھی ہیں، دوچار دوکانیں بھی خوب اچھی چل رہی ہیں، حشم وخدم، نوکر چاکر بھی ہیں سارے اسباب راحت کے میسر ہیں لیکن اگر قلب کا اطمینان وسکون حاصل نہ ہوتو سب لاحاصل اور بے سود ہے۔

اطمینان وسکونِ قلب کا ذریعہ :

وہ تعلیمات جن سے اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے، اسی کو ذاتِ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے :

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۔(پ۱۳،ع۹)

جولوگ ایمان لائے اوران کے قلوب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ مؤمنین کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ان کے قلوب اطمینان پاتے ہیں، لہٰذا حق تعالیٰ آگے فرماتے ہیں :

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○ کان کھول کر سن لو، غور سے سنو، اللہ کے ذکر سے، اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ذکر اللہ کو چھوڑ کر اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا، چاہے ہفت اقلیم (ساری دنیا) کی بادشاہی کیوں نہ بن جائے کیونکہ سکون واطمینانِ قلب ذکر اللہ کا تقاضا اوراثر ہے، خواہ کسی نوع کا ذکر ہو، ذکر لسانی ہو، ذکر قلبی ہو، ذکر جسمی ہو، ذکر مالی ہو، ذکر حقوقی ہو، یہ سارے کے سارے ذکر میں داخل ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ :

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ حضرت سری سقطیؒ کے واقعہ میں بیان فرمایا کہ وہ سوسو

نفلیں پڑھ لیتے تھے اور ہم سے فرما رہے ہیں کہ نفلیں پھر دیکھنا پہلے قضا نماز ادا کرو تو کیا سری سقطیؒ بلا قضا پڑھے ہی شیخ بن گئے کہ جنید بغدادیؒ کے وہ شیخ تھے تو کیا قضا نمازیں سر پر رکھے ہوئے ہی پیر بن گئے، واہ، واہ یہ خوب پیر بنے۔

غیر محقق پیر کی حکایت :

بعض ایسے پیر بھی آئے ہیں کہ جن کے ایک ہزار مرید تھے اور نمازیں ان کی ذمہ قضا تھیں۔

ایک صاحب پٹیالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے، ان کے ایک ہزار مرید تھے، کچھ ٹھیک سے سلوک وتصوف کی حقیقت کے واقف کار نہیں تھے، گردن جھکا کر بیٹھ گئے، ذکر نفی واثبات کر لیا، تہجد پڑھ لی بس پیر بن گئے۔ سوال کیا کہ ذرا کچھ سلوک کی ترتیب بتلایئے تو سلوک کے متعلق کچھ بیان کرنا شروع کیا، سنتے رہے، جب مقامِ توبہ کا ذکر آیا اور یہ سنا کہ مقامِ توبہ سلوک وتصوف میں پہلا قدم ہے اور اس مقامِ توبہ کی جو تفصیل اس احقر نے شروع کی تو ان کی جُھرجھری آ گئی حالانکہ سردی کا موسم تھا، مگر میاں صاحب کو پسینہ آ گیا اور کہا بس، بس اب مجھ میں سننے کی تاب نہیں، مجھ میں ہمت نہیں کہ آپ کی بات سنوں۔ یہ میری پیری کیسی؟ میری تو آنکھیں کھل گئیں، میرے امراض میرے سامنے کھل کر آ گئے۔

یہ صاحب پیر تھے اور سلوک کا اوّل قدم توبہ بھی درست نہ کیا تھا، بعض پیر ہو جاتے ہیں اور جو نمازیں قضا ہو گئیں ہیں، ان کے ادا کرنے کی پرواہ نہیں کرتے، کیونکہ سلوک کی تربیت کا ان کو علم نہیں۔ ترتیب سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ظاہر شریعت کو درست کرے۔ بلا ظاہر کے درست کیے باطن شریعت درست نہیں ہو سکتا۔

ادائیگی زکوٰۃ :

اب آگے زکوٰۃ کو لیجئے، کیونکہ سلوک کے طے کرنے کی ترتیب چل رہی ہے کہ

پہلے ظاہر شریعت کا حق ادا کرو، اعمالِ ظاہرہ کو فقہی احکام و مسائل کے مطابق ادا کرو، تو زکوٰۃ بھی حقِ شریعت میں سے ایک حق ہے، اس کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔

اگر کوئی سوچ کہ پہلے تو میرے ذمہ زکوٰۃ واجب تھی، مگر اب تو میں خود بھیک منگا، کنگال ہو گیا ہوں، اب میں کیا کروں؟

توبہ کرتے رہو اور گڑگڑا کر توبہ کرو اور یہ نیت پختگی کے ساتھ کرلو کہ اے اللہ جب بھی میرے پاس روپیہ پیسہ آ گیا، میں ضرور بالضرور زکوٰۃ ادا کروں گا، اور یہ دعا کرتا رہے کہ اے اللہ جو جائز طریقے روپیہ حاصل ہونے کے ہوتے ہیں، میں نے اختیار کر لئے ہیں، اے اللہ جس دن بھی میرے پاس مال آ گیا، تو ایک ایک پیسہ زکوٰۃ کا ادا کروں گا۔ اے اللہ تیرا خوف میرے دل پر چھا گیا ہے، لہٰذا اس کوتاہی میں مجھے معاف فرمانا۔ فضلِ الٰہی سے اُمید قوی ہے کہ انشاء اللہ سب زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اگر ادا نہ ہوئی تو معاف فرمادیں گے، جبکہ نفاق سے نہیں اخلاصِ نیت کے ساتھ کھڑا ہوا اور لگا ہوا ہے اور اخلاصِ نیت پوشیدہ چیز ہے، مگر اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، جسم کو کسبِ مال اور نماز روزہ کی ادائیگی میں لگانا یہ اختیاری امر ہے، بندہ اس کا مکلف ہے، اور پیسے آویں، روپیہ مل جاوے یہ غیر اختیاری ہے۔ اس کا مکلف نہیں ہے، اسی لئے نماز روزہ چونکہ جسم سے ادا کی جاسکتی ہے، اس لئے صرف توبہ کرنے سے معاف نہ ہوں گے، ادا کرتے رہنا ضروری ہے۔ البتہ زکوٰۃ جبکہ مال اس کے پاس نہیں ہے اور حاصل بھی نہ کر سکا تو باری تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔ یہ تمام تفصیل اس وقت ہے جبکہ زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد یہ کنگال ہو گیا۔

ادائیگی زکوٰۃ کا آسان وسہل طریقہ :

آ دائیگی زکوٰۃ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کا پیسہ اموالِ موجودہ سے نکال کر الگ تھیلی میں نیت زکوٰۃ کر کے رکھ دو، اوپر احتیاطاً زکوٰۃ بھی لکھ دو، تاکہ تھیلی کہیں دوسری

تھیلیوں میں نہ مل جاوے اور جو غریب محتاج آوے اُٹھا کر اس میں سے دیدیا۔ اس وقت زکوٰۃ کی نیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ تو زکوٰۃ کی نیت ہی سے علیحدہ رکھا ہے۔

صارفینِ زکوٰۃ :

نیز خرچ کرنے میں بھی اختیار ہے چاہے غریب بھائی بہن کو (جو کہ ایک ساتھ شریک نہ رہتے ہوں) دو یا جو ایسے رشتہ دار ہیں جیسے ماموں، خالو، پھوپھا، تایا، چچا، یا منہ بولا بیٹا وغیرہ ان سب کو دے سکتے ہو، لیکن اپنے حقیقی بیٹے، پوتے، پڑپوتے، نواسے، نواسی وغیرہ، اسی طرح باپ، دادا، پردادا ان کو زکوٰۃ کو دینا جائز نہیں۔ حقیقی بہن، بھائی اور خالو، ماموں، پھوپھا وغیرہ کو دے سکتے ہیں، لیکن دیتے وقت ان سے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ یہ زکوٰۃ ہے، بھائی شرمندہ ہوگا کہ اوہو مجھ کو زکوٰۃ کھلاتا ہے، اس لئے اس کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

فضائل بلا مسائل کافی نہیں :

صرف فضائل کا سننا کافی نہیں ہے، ورنہ فضائل کے سُننے سے واقعی عبادات کا شوق پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر قاعدہ قانون عبادات کے کرنے کا معلوم نہیں ہے تو کیا صحیح طریقہ سے کام کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں اور جب صحیح نہیں کر سکتا تو کس طرح قبول ہوگا؟ اسی لئے قدوری سے لے کر ہدایہ آخرین تک پہلے پانچ سال فقہ کو پڑھایا جاتا ہے۔ خوب مسائل سے واقف کرایا جاتا ہے، پھر حدیث شریف پڑھائی جاتی ہے، جس میں فضائل بھی ہیں اور مسائل کا بھی بیان ہے۔ مسائل کو پختہ اور خوب مضبوط کر دیا کہ ہر موقع کے متعلق مسائل و قانون اور آدابِ زندگی بتلا دیئے، پھر حدیث شریف میں مسائل اور فضائل دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں، کیونکہ فضائل سے شوق آوے گا اور شوق آ کر پھر عمل آوے گا اور عمل کا قانون پہلے ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ عمل قانون کے مطابق صحیح بھی ہوگا اور قبول بھی ہوگا۔

حج بیت اللہ شریف ایک اہم فریضہ ہے :

اب رہ گیا حج تو حج کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا :

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ ۔ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے لوگوں کے ذمہ بیت اللہ کا حج ہے، ان پر ۔ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط ۔ (پ۴) جو کہ اس تک سبیل (زادِ راہ) یعنی جانے اور واپس آنے کی طاقت رکھیں ۔

حج کرنا چاہئے تھا لیکن نہیں کیا تو اس پر افسوس کرے کہ ہائے افسوس پہلے میرے پاس مال موجود تھا، میرے ذمہ حج فرض ہو گیا تھا، مگر آج میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اے اللہ، اب میں کیا کروں؟ میری زندگی کچھ ایسی لااُبالی پن سے گزر رہی تھی کہ آپ کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ مجھ پر حج فرض ہے، لیکن میں نے آپ کی عطا کردہ نعمتِ عقل سے کام نہیں لیا اور نعمتِ عقل کی ناشکری کا ثبوت پیش کیا کہ دنیا میں ایسا منہمک ہو کر مشغول ہوا کہ مجھے روپیہ پیسہ کا لالچ آ گیا، میں حج کرنے کے لئے نہ گیا، آج میرے پاس روپیہ نہیں ہے، میں کیا کروں؟ ہاں میں کوشش و فکر میں ہوں، جس دن میرے پاس حج کے لائق پیسہ ہوگا، حج بیت اللہ شریف کو ضرور جاؤں گا، میرا پہلا کام یہی ہوگا کہ حج کروں گا۔ اے مستجاب الدعوات میری دعا قبول فرما لیجئے اور آئندہ کے لئے حج کرنے کا راستہ کھول دیجئے، کیونکہ استطاعتِ مالی بڑھانا اور پیسہ حاصل کرنا یہ غیر اختیاری ہے، البتہ سبب اور طریقہ روپیہ حاصل کرنے کا وہ اختیاری ہے، وہ میں نے اختیار کر لیا ہے۔

اپنی گزشتہ کوتاہی پر افسوس بھی کرے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا رہے، اس طرح اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ فریضۂ حج سے سبکدوش ہو جائے گا لیکن یہ ضرور ہے کہ جب مال مل جائے فوراً حج کرے اور درخواست وغیرہ جو ضروری کام ہیں، ان کو کرنا شروع کر دے، اور ایک بات اور یاد رکھئے کہ جو روپیہ کما رہا ہے، سال

گزرنے پر اس میں سے زکوٰۃ بھی ادا کرتا رہے، یہ نہیں کہ حج کے لئے جو روپیہ جمع کر رہا ہے اس میں زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی، نہیں نہیں، اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

الغرض ----- اسی طرح ہمت اور کوشش میں لگا رہے، ان شاء اللہ حج ادا ہو جائے گا، اور اگر حج ادا نہ کر پایا اور بیچ میں ہی انتقال ہو گیا تو کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا نام حاجیوں کی فہرست میں لکھ دیں اور یہ تو بعید ہی نہیں کہ مواخذہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے ارادہ کر رکھا تھا کہ میں حج ضرور ادا کروں گا، مگر روپیہ نہیں پا سکا۔ اس لئے معذور رہا۔

ارشادِ نبوی ہے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔

اللہ تعالیٰ اخلاص اور سچی نیت کو دیکھتے ہیں، تو ایسے شخص کے حج نہ کرنے کو معاف فرما دیں گے، جس نے ایسی مجبوری کی حالت پیش آنے پر حج نہیں کیا تو ہا، اور اگر ایسا اہتمام اور مجبوری نہیں ہے، تو اس کی غلطی کو معاف نہیں کریں گے بلکہ وہ اور گرفتارِ عذاب ہو جائیگا۔

یہ ہے ترتیب سلوک، یہ ہے ترتیبِ توبہ، اب چاہے بیعت ہو، چاہے بیعت نہ ہو، ہر صورت میں بندۂ مومن کے لئے ضروری ہے کہ اس طرح زندگی گزارے اور بیعت ہو تو اور بھی زیادہ باترتیب سلوک طے کرنے کی ضرورت ہے، جب نماز کی، روزہ کی، زکوٰۃ کی، حج کی ادائیگی ہو چکی تو یہ عبادات سے متعلق حقوق ادا ہو گئے۔

اسلام کے بنیادی عقائد:

اسلام کے بنیادی عقائد یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ذات و صفات میں قدیم ماننا، وہ ایک ہے، یکتا ہے، کوئی کسی اعتبار سے اس کا شریک نہیں، اللہ تعالیٰ کے نبیوں و رسولوں کو ماننا، ملائکہ کو ماننا، جو کتابیں نازل ہوئی ہیں، ان کو ماننا، مرنے کے بعد زندہ ہونے کو ماننا، مرنے کے بعد سوال و جواب اور حساب و کتاب اور قیامت کو ماننا، پل صراط پر چلنے کو ماننا، کچھ عارضی سزا ہے، جو گنہگار مسلمان کے لئے ہے، کچھ ہمیشہ کے لئے ہے جو کفر و شرک والی

سزا ہے، دوزخ کا یقین ہونا کہ پیدا ہوچکی ہے، یہ سب چیزیں ایمان و عقائد کے اندر داخل ہیں، ان کو یقین کے ساتھ ماننا رہے، تمام انبیاء کو برحق جاننا یہ بھی عقیدہ میں داخل ہے مگر عمل کرنے کے لئے صرف نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی ماننا ضروری ہے، عمل کسی اور نبی کی شریعت پر نہیں ہوگا، عمل کے لئے صرف آپ ﷺ کی ذاتِ والاصفات ہی کو ماننا ضروری ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بحیثیت اُمتی رسولؐ :

حضرت عیسیٰ علیہ السلام باوجود رسول و نبی صاحب کتاب (انجیل) ہونے کے قربِ قیامت میں تشریف لاویں گے، جیسا کہ ہمارا، ہم سب اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے، تو وہ اپنا مذہب نہیں چلائیں گے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحکم اُمتی ہمارے رسولِ اعظم ﷺ کے مذہب و قانون پر چلیں گے۔

یہ قانون جو حق تعالیٰ نے نبی آخر الزمان حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمایا ہے، اسی قانون اور انہی احکام کا نبی بھی مکلف ہو رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ نہیں فرمائیں گے کہ میری انجیل کے اندر تو شراب حلال تھی، لہٰذا حرام نہیں ہوسکتی، بلکہ حضور ﷺ کے احکام کے سامنے سر جھکا دیں گے۔

الغرض ...... ایمان لانا تو سب نبیوں اور سب کتابوں پر ضروری ہے لیکن عمل کرنے کے لئے آخری نبی اور آخری کتاب (قرآن مجید) جو آخری نبی ﷺ پر نازل ہوئی ہے، وہی لازم ہے۔

حقوق العباد اور معاملات ادا کرنے کا طریقہ :

اب معاملات کو لیجیے مثلاً کسی سے قرضہ لیا تھا یا اور کوئی کسی کا مالی حق اپنے ذمہ

ہے تو پہلے اس کو ادا کرو، کیونکہ حقوق العباد میں سے ہے اور یہ معلوم ہی ہے کہ تین پیسے کی جگہ سات سو مقبول نمازیں صاحب حق کو دلا دی جائیں گی، پھر کل قیامت میں کھڑا سوچے گا کہ یہ کیا ہوا، اتنے سے پیسوں کے بدلہ میں اس قدر مقبول نمازیں چلی گئیں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے قرضہ ادا کرنے کی نیت کر لی۔ پیسہ اپنے پاس موجود ہے، ادا کرنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ الحمد للہ تعالیٰ سب ادا ہوگیا اور اگر پیسہ موجود نہیں ہے تو اب کس طرح ادا کرے۔ یہاں توبہ سے کام نہیں چلے گا، تو اس کا طریقہ یہ ہے، اس سے جا کر معافی مانگو اور اگر کھل کر معافی نہ مانگ سکو کہ اس کے مکان یا دوکان سے چوری کی تھی یا راستہ میں جیب کاٹی تھی، تو اس طرح معافی مانگو کہ بھائی صاحب آپ کا میرے ذمہ کچھ حق ہے، ادائیگی کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں، لہٰذا میں معافی چاہتا ہوں ہاتھ جوڑ کر، پیروں میں پڑ کر، ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر معافی مانگو آخر کہاں تک معاف نہیں کرے گا، جب اخلاص صدق سے، سچے اقرار کے ساتھ بار بار روؤ گے، تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں رحم ڈال دے گا اور وہ کہہ دے گا کہ میری طرف سے معاف ہے، اللہ تعالیٰ بھی معاف فرمائے۔ اور اگر صاف طریقہ سے ہمت کر کے کہہ دو۔

حضرتِ والا نور اللہ مرقدہٗ کا بیویوں کے ساتھ عدل :

حضرت والا قدس سرہٗ العزیز کے حقوق العباد کی ادائیگی کے بارے میں بکثرت واقعات ہیں، جیسا کہ بعضوں کو دوسری شادی کا بڑا شوق ہوتا ہے، اس لئے تکوینا بڑا اچھا ہوا کہ حضرت والاؒ کی دوسری شادی ہوئی تکمیلاً للاصلاح بڑا اچھا ہوا کہ ہمارے لئے سبق بن گیا۔

ایک دن بڑی پیرانی صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ نے ناز میں کہا کہ آپ نے دوسری شادی کر کے اپنے مریدوں کے لئے دوسری شادی کا راستہ کھول دیا، حضرت والاؒ نے فرمایا کہ راستہ کھول دیا بند کردیا۔ پیرانی صاحبہؒ نے عرض کیا بند کیسے کردیا۔ فرمایا میرا معاملہ جو تم دونوں

کے ساتھ ہوتا رہتا ہے، ان کے سامنے موجود ہے اور چونکہ آپ جانتی ہیں کہ مرید پیر کے ہر عمل کو دیکھتا، جانتا اور گرویدہ ہوتا ہے، پیر کے طریق کو عمل میں لاتا ہے (یہ اس لئے فرمایا کہ پیرانی صاحبہؒ فقیہ، عالمہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز سے بیعت تھیں اور مثنوی شریف حاجی صاحبؒ سے پڑھی ہوئی تھیں) پیرانی صاحبہؒ نے عرض کیا کہ جی ہاں جانتی ہوں۔ فرمایا بس تو پھر میں نے راستہ بند کر دیا کہ وہ میرے اعتدالی برتاؤ سے سمجھیں گے کہ ہم سے اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں ہو سکتا، جو میں عمل کر کے دکھا رہا ہوں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی عملی زندگی میں اپنا اسوۂ حسنہ عمل کر کے دکھلایا تھا جس کے ہم مکلف کئے گئے ہیں یا حضور ﷺ کی عملی زندگی صرف پڑھنے پڑھانے ہی کے لئے ہے۔

مدرسین کو عملی نمونہ بننا چاہئے:

مدرسین و معلمین کو چاہئے کہ اپنی عملی زندگی کو بھی عملاً نمونۃً شاگردوں کے سامنے رکھیں، ورنہ وہ معترض ہوں گے کہ یہ کہاں مدرس بن بیٹھے، ان کی عملی زندگی تو پڑھانے کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے معلم و مدرس بن کر جو پڑھا رہے ہو، اپنی زندگی کو اس پر منطبق کر کے عملاً شاگردوں کے سامنے رکھو۔

نبی پر کتاب کے نزول میں مصلحتِ خداوندی:

یہاں سے یہ مصلحت بھی معلوم ہوگئی کہ نبی کو کتاب دے کر کیوں بھیجا، بس کتاب خانہ کعبہ پر نازل فرما دیتے، وہاں سے نقل در نقل ہو کر اور آج کل فوٹو (عکس) چل رہا ہے، عکس کے ذریعہ تمام عالم میں تقسیم ہو جاتی، مگر ایسا نہیں کیا، کیونکہ اس طریقہ سے عملی نمونہ سامنے نہ آتا، وہ تو نبی کے کر کے دکھلانے سے ہی سامنے آیا ہے، نبی تعلیم بھی کرتا رہا اور کر کے دکھلاتا بھی رہا۔

یہ اس زمانہ میں نہایت ضروری ہے کہ استاذ شاگردوں کے سامنے اپنی زندگی کا عملی نمونہ پیش کریں، عملی عبادتی نمونہ بھی اور عملی اخلاقی بھی دونوں قسم کے نمونے پیش کرنے چاہئیں کیونکہ طلبہ کے سامنے اساتذہ کے اعمال زیادہ ہوتے ہیں، مہتمم کے زیادہ نہیں ہوتے وہ تو کوئی ضرورت پیش آ گئی تو مہتمم کے پاس درخواست لے کر چلے گئے اور استادوں کا درسگاہ وغیرہ میں شاگردوں کے ساتھ اکثر وقت نشست و برخاست، اُٹھنا، بیٹھنا، پڑھنا پڑھانا ہوتا رہتا ہے۔

مہتمم اور مدرس ہر ایک کا کام :

اس لئے اے اساتذہ و مدرّسین حضرات! پہلے اپنے آپ کو سنبھالو، مہتمم صاحب کو بعد میں کہنا، وہ منتظم ہونے کی حیثیت سے ہے، وہ تدریسی و تعلیمی حیثیت سے نہیں، تدریسی اور تعلیمی حیثیت سے تم ہو۔ تم مہتمم صاحب کی چال دیکھتے ہو، اور اس کے مطابق چلنا چاہتے ہو، اگر مہتمم اوقاتِ مدرسہ میں وقت کی پابندی نہیں کرتا، حالانکہ اس کو انتظاماً و سیاسۃً پابندی کرنی چاہئے تاکہ عملہ پر دباؤ رہے لیکن حقیقۃً اس پر پابندی نہیں ہے کیونکہ وہ تو ہر وقت مدرسہ کے کام میں لگا ہوا ہے، جو لوگ اس سے گھر پر آ کر ملتے ہیں، ان سے بھی نظامِ مدرسہ کے اعتبار سے ملاقاتیں کرتا ہے، بات چیت کرتا ہے، ان لوگوں کے دلوں کے رُجحانات کو مدرسہ کی طرف پھیرتا ہے، ان سے مشترکہ تعلق و محبت وغیرہ کا برتاؤ ہوگا، تو مدرسہ کی طرف ان کا رجوع اور تعلق بڑھے گا، مہتمم مختلف طریقوں کے ساتھ ان کا تعلق بڑھاتا رہتا ہے۔

اے مدرّسین صاحبان ! تم بھی اس کی نقل کرتے ہو، اس کو بھی پابند وقت بناتے ہو وہ گھر پر رہ کر بھی مدرسہ کا کام ہی کرتا ہے، کبھی مخلوق کے کام میں لگا ہوا ہے تاکہ مخلوق کی رجوعات مدرسہ کی جانب ہوں، کیا یہ رجوعات ضروری نہیں ہیں؟ جب ضروری ہیں تو اب

مخلوق کے ساتھ میل، ملاپ اور حسنِ سلوک ورواداری جو کچھ وہ کررہا ہے، وہ سب مدرسہ ہی کا کام ہوتا ہے، وہ لوگوں کو مانوس کرکے ان کے ذہن کو مدرسہ کی طرف راغب کررہا ہے اور معترض کے ذہن کو صاف کرنے کے لئے احوال وکوائفِ مدرسہ آمدوخرچ کا حساب، تعلیمی، تعمیری ترقیات جو ہوچکی ہیں، یا آئندہ لائحۂ عمل سوچا جارہا ہے، ان سب کو سُنارہا ہے تاکہ ذہن صاف ہوکر زبانِ اعتراض بند رہے، اور آئندہ کوئی زبان اعتراض کا جواب دے گا اور کلمۃ الخیر کے ساتھ کلام کرے گا، کیونکہ مہتمم نے پہلی ہی ملاقات میں ان کا ذہن صاف کرکے ان کی زبان پر مہر لگادی تھی، اب وہ خود بھی مدرسہ کی امداد کی طرف مائل ہوگا اور دوسروں کو بھی حالاتِ صحیح سے مطلع کرکے مدرسہ کی طرف متوجہ کرے گا، اگرکسی وقت اس کے سامنے مدرسہ کی امداد کا ذکر آئے گا تو کیا تعاون نہیں کرے گا؟ یقیناً ضرور کرے گا بلکہ دعوت تعاون میں معاون بن کر مہتمم صاحب کا شریکِ کار بن جائے گا، تو بھلا پھر معلم و مدرس ہوکر مہتمم لوگ تو وقت کی پابندی کرتے ہی نہیں تو ہم ہی پابندی کیوں کریں۔

مہتمم ہر وقت مدرسہ کا پابند ہے :

وہ تو ہر وقت پابند ہے، سورہا ہے تو خواب مدرسہ ہی کا دیکھ رہا ہے، جب بھی وقت مدرسہ کا پابند ہے تو پھر یہ قیاس مع الفارق کیسا ہے؟ کہ مہتمم پابندی نہیں کرتا ہے، تو ہم بھی پابندی نہیں کرتے، ہر ایک کا موضوع الگ الگ ہے تمہارا جو موضوع ہے تم اس کو ادا کرو۔ مہتمم کا جو موضوع ہے، مہتمم اس کو ادا کرے گا، ان ہی کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مہتمم وقت کی پابندی کرے، وقت پر جائے تاکہ مدرسہ کا جائزہ لے کہ وقت کی پابندی کے ساتھ، ٹھیک ٹھیک کام ہورہا ہے یا نہیں؟ کوئی ضرورت ہو تو غیر وقت بھی جائے، دیکھا بھالی اور نگرانی کے لئے کیونکہ مہتمم وقت ہی کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ تو ہر وقت مدرسہ کے لئے وقف ہے۔ تم تو چھ ہی گھنٹے کے لئے ہو، وہ بھی تم پورے انجام نہیں دیتے اور جو بڑی کتابوں

والے ہیں، ان کے تو چار، پانچ ہی گھنٹے ہوتے ہیں، یہ سب باتیں ضمناً آرہی ہیں جو نہایت ضروری ہیں، اس لئے وضاحت کے ساتھ عرض کردی گئیں۔

دو بیویوں میں انصاف :

پیرانی صاحبہؒ نے دوسری شادی کرنے پر فرمایا کہ آپ نے دوسری شادی کر کے مریدوں کے لئے دوسری شادی کا راستہ کھول دیا۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کھول دیا یا بند کر دیا؟ پیرانی صاحبہؒ نے عرض کیا بند کیسے کر دیا؟ حضرت والاؒ نے فرمایا اس لئے کہ وہ لوگ میرا عدل وانصاف جو تمہارے ساتھ ہے، اس کو دیکھتے ہیں تو سمجھیں گے کہ ایسا عدل و انصاف اور برابری ہم سے نہیں ہو سکتی تو دوسری شادی کرنے سے رُکاوٹ ہوگئی تو راستہ بند ہو گیا یا راستہ کھل گیا۔ چنانچہ تم جانتی ہو کہ کوئی چیز ہدیہ کی کسی رسّی میں بندھی ہوئی آتی ہے، تو جیسے وہ ہدیہ تقسیم کرتا ہوں باقاعدہ ناپ کر اس رسّی کو بھی تقسیم کرتا ہوں اور اشیاء کی تقسیم بھی اندازے سے نہیں کرتا بلکہ تول کر کرتا ہوں (چنانچہ خانقاہ میں حضرت والاؒ کی نشست گاہ کے قریب ایک ترازو رکھی ہوئی تھی جس کو حضرت والاؒ مزاحاً میزانِ عدل فرمایا کرتے تھے) اور اگر کوئی کپڑا آتا ہے تو تم دونوں سے پوچھتا ہوں کہ کس نوع و رنگ کا پسند کرتی ہو، پھر ایک کا پسند شدہ کپڑا زیادہ قیمت کا ہے اور دوسرا کم قیمت، تو دونوں کی قیمت کا اندازہ کرا کے جس کے پاس کم قیمت گیا، اس کو کمی کے برابر نقد پیسے دیدیئے جاتے ہیں، تاکہ دونوں کے ہدیہ میں برابری ہو جائے۔

نشست و برخاست میں انصاف :

غرضیکہ دوسری شادی کے بعد دونوں بیویوں میں عدل و انصاف کا مسئلہ بہت مشکل ہے۔ اسی طرح رات کے سونے میں تو برابری ہے ہی جیسا کہ آگے آتا ہے۔ حضرتؒ کا یہ معمول تھا کہ بعد عصر ٹہلنے جانے سے قبل تھوڑی دیر کو ہر ایک بیوی کے گھر

جایا کرتے تھے اور گھڑی دیکھ کر جتنی دیر ایک کے پاس بیٹھتے تھے، اتنی ہی دیر دوسری کے پاس بیٹھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ بھی بعد عصر تھوڑی دیر کے لئے ازواجِ مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس جایا کرتے تھے، حضرت والاؒ بھی سنت کی پیروی میں ایسا کیا کرتے تھے۔

اور سنئے فرماتے تھے کہ اب میں دُھلے ہوئے کپڑے بھی خانقاہ میں اپنے پاس ہی رکھتا ہوں کیونکہ اگر ایک گھر میں کپڑے رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت پیدا ہوتی کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔

نیز فرماتے تھے کہ ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلافِ عدل سمجھتا ہوں کیونکہ دوسری کا خیال لانے سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی جس کی باری ہے، یہ بھی حق تلفی ہے۔

نیز فرماتے تھے کہ میں دونوں بیویوں کے اعزہ واقارب سے بھی ان کے مراتب کے لحاظ سے ہمیشہ حسنِ سلوک اور مراعات کا معاملہ کرتا ہوں۔

بیوی سے مکان کے فائدے کا معاوضہ :

نیز دونوں بیویوں کے لئے الگ الگ گھر بنواتے تھے اور دونوں بیویوں کو ان کے کھانے وغیرہ کا خرچ ہر ماہ الگ الگ برابر، برابر دیتے تھے اور اپنے کھانے کا خرچ ہر ایک کو الگ دیا کرتے تھے۔ جب دونوں نے بہت اصرار کیا کہ بس اب تو یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے کھانے کا خرچ علیحدہ دیں، اس کو موقوف کیجئے تو حضرت والاؒ نے موقوف فرما دیا لیکن پھر بھی اپنے کھانے کا خرچ ہر ایک کی ماہانہ رقم میں حساب کر کے شامل فرما دیا کرتے تھے اور آخر عمر میں ہر ایک کو الگ الگ غالباً ایک ہزار روپیہ یک مشت دیدیا۔ پھر کسی مزاح کے

لہجہ میں ظاہر فرمایا دیا کہ یہ میں نے فلاں سَن تک کا کرایۂ مکان اور اپنی خوراک کا حساب لگا کر یک مشت روپیہ دیدیا ہے۔ کرایۂ مکان اس لئے ادا فرماتے تھے کہ دونوں مکان دونوں بیویوں کو ملک فرما چکے تھے، اس لئے اس تمتع کا معاوضہ بھی ادا فرماتے رہتے تھے۔

الغرض ...... اس طرح عمل کر کے دکھلا دیا، تو پیرانی صاحبہؒ سے اس قسم کے واقعات بیان کر کے فرمایا کہ میرے دوستوں کے سامنے یہ تفصیل موجود ہے، وہ دیکھیں گے کہ ادائے حقوقِ ازواج میں عدل و مساوات کی اتنی رعایت کرنی پڑتی ہے تو دشوار سمجھ کر عقدِ ثانی کی ہمت نہ کریں گے۔

حضرتؒ کے عدل کا ایک عجیب واقعہ :

انتہائی عدل پر ایک واقعہ اب یاد آیا کہ ایک کاشتکار حضرت والاؒ کے پاس دو تربوز لایا، یہ شخص جانا پہچانا تھا، آداب ہدیہ سے بصحبت حضرت والاؒ واقف تھا، ان سے ہدیہ کا لینا دینا تھا، اس لئے دونوں تربوز لے لئے۔ ورنہ حضرت والاؒ ہر ایک کا ہدیہ قبول نہ کرتے تھے، جب تک محبت سے دینا ثابت نہ ہو جائے کیونکہ حضور ﷺ نے ہدیہ کا اُصول مقرر فرمادیا ہے، **تہادوا تحابوا** ، ہدیہ دو، لو، آپس میں محبت رکھو جس کا مطلب یہ ہے کہ ہدیہ کے اندر سوائے محبت کی نیت کے دوسری کوئی نیت کرنا جائز ہی نہیں ہے، اگر ثواب کی نیت کرے گا، وہ ہدیہ نہیں رہے گا، صدقہ بن جائے گا۔ برکت کی نیت کرے گا تو رشوت ہوگئی، یہ بھی ہدیہ نہ ہوا، اگر خصوصی توجہ اور خوب دعائیں لینے کی نیت ہے تو یہ بدگمانی، بدعقیدگی ہوئی۔ یہ سب اغراضِ ہدیہ میں ممنوع ہیں، تو جب تک محبت ثابت نہ ہو جائے کسی طرح قبول نہ کرتے، پھر حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا دو تربوز کیوں لائے، ایک ہی لے آتے، اس گاؤں والے نے اپنی دیہاتی بول میں کہا : ''کیا تیرے دو بیوی نہیں ہیں؟''

حضرت والاؒ نے فرمایا کیوں نہیں صاحب دو ہی ہیں، اس نے کہا بس تو پھر ایک،

ایک کے لئے، دوسرا دوسری کے لئے، حضرت والاؒ نے فرمایا بات تو ٹھیک کہی آپ نے مگر دیکھو تو ایک تربوز کا وزن کم ہوا اور دوسرے کا وزن زیادہ ہوا، تو دونوں کے پاس برابر کہاں پہنچے، ایک کے پاس کم وزن کا پہنچ گیا، دوسری کے پاس زیادہ وزن کا پہنچ گیا تو یہ کونسا عدل و انصاف ہوگا۔ گاؤں والا کہنے لگا میں تجھے جانوں ہوں کہ میرے حضرت جی ایسے عادل و منصف ہیں، میں ان دونوں تربوز کو تلوا کر لایا ہوں۔

ادائیگی حقوق العباد اور جزئیاتِ حقوق میں عدل و مساوات کس قدر مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ بعض لوگوں کو دوسری بیوی کرنے کا شوق ہے، اس کے لئے بڑے علمِ دین، حسنِ تدبیر اور کمالِ عقل کی ضرورت ہے، ورنہ ظلم و تعدی سے بچنا بہت مشکل ہے۔

رنگِ شریعت کس طرح حاصل ہو ؟

اب سوال ہوتا ہے کہ شریعت کا یہ رنگ کس طرح حاصل ہو، تو اس کا طریق یہ ہے کہ کسی شیخِ کامل کی خدمت میں پہنچ کر خدا کی محبت اور خدا سے خاص تعلق پیدا کرو، جب دل محبتِ خدا کے رنگ میں رنگ جائے گا، تو شریعت کا رنگ مذکور آ جائے گا۔ چنانچہ میرے شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے پاس قانونِ شریعت کے جاننے والے بڑے بڑے علامہ پہنچے جو علم کے ساتھ دل لگائے ہوئے تھے، ان کے دلوں کو ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ایسا رنگ تھا کہ وہ شریعت کے ایسے ہی باریک احکام پر چلتے تھے، بتوفیقِ الٰہی ایسی کیفیت ہو جاتی ہے کہ جو دل میں بیٹھا ہوا ہے، اس کے خلاف کرنے کی طاقت و ہمت نہیں رہتی، خلاف کی طاقت سلب ہو جاتی ہے، حق تقویٰ دل کے اندر رچ بس جاتا ہے، اب اس سے ہٹ کر اس کا قدم کیسے اُٹھے گا، جب یہ حق تقویٰ بتوفیقہٖ تعالیٰ حاصل ہو جاتا ہے، تو سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔

عبادت کا صحیح مفہوم :

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

اے ایمان والو ! اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کرنے سے ڈرتے رہو، بچتے رہو، جیسا کہ ڈرنے کا اور بچنے کا حق ہے۔ (پ۴ ع۲)

مطلب یہ ہے کہ جیسے تم نے کفر وشرک کی معصیت کو چھوڑ کر ایمان اختیار کیا ہے، ایسے ہی ایمان کا جو حق ہے، اس کو بھی اختیار کرو، یعنی کفر وشرک کے علاوہ جو معصیت کی چیزیں ہیں، ان کو بھی چھوڑ دو' اٰمنوا میں تو کفر وشرک کو چھوڑ کر ایمان والی زندگی آ گئی اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ میں ظاہری، باطنی، اعمالی زندگی آ گئی، حقوق اللہ اور حقوق العباد داخل ہو گئے کہ ان حقوق میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کرنے سے بچتے رہو، ڈرتے رہو، جیسا کہ بچنے اور ڈرنے کا حق ہے، جیسے تم نے شرک وکفر کو چھوڑا ہے، ایسے ہی گناہِ کبیرہ، گناہِ صغیرہ اور مشتبہات کو بھی چھوڑ دو اور یہ صرف دس، پندرہ سال کے لئے نہیں بلکہ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ' یعنی تمہاری موت نہ آوے' مگر اس حال میں کہ تم پوری تابعداری کے ساتھ ہو۔ وقتِ موت تک تم پورے حق تعالیٰ کے قانون کے تابعدار بنے رہو، اسی حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا کرنے کا نام عبادت ہے، صرف نماز روزہ ادا کرنے کا، زکوٰۃ دینے کا اور زیادہ پیسہ ہو تو حج کرنے کا نام ہی عبادت نہیں ہے، اگر ان ارکانِ اربعہ کے علاوہ کسی اور چیز کا نام عبادت نہیں ہے تو پھر بندوں اور دوسری مخلوق کے متعلق اللہ تعالیٰ نے احکام کیوں نازل فرمائے ہیں۔

ظاہر و باطن کا تقویٰ :

غرضیکہ موت کے وقت تک مؤمنین سے تقویٰ کا مطالبہ ہے، ظاہری اعمال مامور بہا اور منہی عنہا کے متعلق بھی اور باطن اخلاق وعقائد اوراوامر ونواہی کے متعلق بھی، اور باطن کیا ہے؟ مثال کے طور پر تکبّر ہے، حسد ہے یہ باطن سے متعلق ہیں، جیسے شراب پینا چھوڑا ہے، جو ظاہر سے متعلق تقویٰ ہے ویسے ہی تکبّر کو چھوڑنا بھی ضروری ہے، جو باطن کا تقویٰ ہے یہ کیا بات ہے کہ تم نے شراب تو چھوڑ دی اور تکبّر نہیں چھوڑتے۔ جب خدا تعالیٰ کے خوف سے شراب چھوڑی ہے تو خدا کے خوف سے تکبّر کیوں نہیں چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے، یہ محاورہ ہے۔ شراب پینا خدا کے خوف سے نہیں چھوڑا بلکہ اس لئے چھوڑا ہے کہ پینے کے وقت یہ خیال رہتا ہے کہ شراب پینا خاندان کی شرافت ونجابت کے خلاف ہے، عزت کے خلاف ہے، اس سے لوگوں میں بدنامی ہوگی، اس لئے چھوڑی، اگر اس کو حکمِ خداوندی کے خلاف سمجھ کر اور خوفِ خدا کی وجہ سے چھوڑا تھا تو تکبّر کو کیوں نہیں چھوڑا۔ ڈکیتی، چوری کرنا تو چھوڑ دی کہ لوگوں کو معلوم ہوگا تو خواری اور شرمندگی ہوگی لیکن چھپ کے جیب میں سے نکال لینا نہیں چھوڑا، تو کیا یہ چوری نہیں ہے، اچکن والا تو موجود نہیں ہے، لیکن خدا تو موجود ہے، وہ ذاتِ احکم الحاکمین تو دیکھ رہی ہے، اسی طرح چوری تو چھوڑ دی، لیکن حرص ولالچ کیوں نہیں چھوڑا۔ رشوت کیوں نہیں چھوڑی، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا وغیرہ کیوں نہیں چھوڑا؟ اس لئے کہ سب کر رہے ہیں، اس کو کوئی عیب ہی نہیں جانتا۔ ارے مؤمن ہو کر اس کا عیب ہونا تیری نگاہ سے ایسا نکلا، کیا نہیں جانتا کہ یہ سب کفار ومشرکین کے کام ہیں، یہ تیرے اندر کفر وشرک کا کام ہو رہا ہے، رشوت لینا، سود (بیاج) لینا یہ تو کفر وشرک والوں کے کام ہیں، تو تو مؤمن ہے، پھر تجھ سے سود لینا کیسے ہوا، یہ تو تُو بندوں کا حق تلف کر رہا ہے، شرک والوں کا کام کر رہا ہے، اور پھر دعویٰ کر رہا ہے

اَنَا مُسْلِمٌ مُؤمن (میں مسلمان ومومن ہوں)

حقِ تقویٰ اختیار کرو :

جب تم مؤمن ومسلم ہو تو اس کا حق تقویٰ اختیار کرو، اطاعتِ کاملہ اعمالِ ظاہرہ اور اخلاقِ باطنہ میں مدنظر رکھو، یہی عبادت کی حقیقت ہے، اسی کو حق تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :

وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَأْتِیَکَ الْیَقِیْنُ کہ اے میرے پیارے محبوب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ، آخر الزمان، خاتم الانبیاء والمرسلین (ﷺ) اپنے رب کی عبادت کرتے رہو، موت کے وقت تک وَاعْبُدْ فرمایا ہے کہ عبادت کرتے رہو، صرف صَلِّ (نماز پڑھو) نہیں فرمایا، صُمْ (روزہ رکھو) نہیں فرمایا زَکِّ (زکوٰۃ دیتے رہو) نہیں فرمایا وَاعْبُدْ فرمایا ہے، نماز، روزہ اور عبادت میں یہی فرق ہے کہ عبادت تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کو شامل ہے عبادت کا مفہوم ایسا عام ہے کہ تمام احکامِ شرع کو حاوی ہے اور عبادت کا حکم رسول اللہ ﷺ کو اس لئے دیا گیا ہے کہ جب آپ خود اُمت کے سامنے جس طرح حکم ملا ہے، نہیں کریں گے تو اُمت کو کیا معلوم ہوگا کہ کس طرح کیا جائے گا، جس طرح آپ ﷺ لوگوں کو پیغامِ حق سنانے اور تبلیغ کرنے کے مکلف تھے، اسی طرح آپ اس کے بھی مکلف تھے کہ کر کے دکھائیں، یہ نہیں کہ آپ مخلوق کو تعلیماتِ اسلام اور طریقِ عبادت کے سکھانے اور فرضِ منصبی کی حیثیت سے تبلیغِ اسلام میں لگے رہنے پر ہی اکتفا کریں۔

مستقل وقت عبادت کا اہتمام کیا جائے :

چنانچہ دوسری جگہ سورہ اَلَمْ نَشْرَحْ میں ارشاد ہے :

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ جب آپ عبادتی تبلیغی کاموں سے فارغ ہو جائیں، تو اپنے اوپر عبادتِ ذاتی میں مشقت اُٹھایئے، مضبوطی کے ساتھ، مخلوق سے الگ ہو کر ذکر کرو

نوافل وغیرہ میں اللہ کی عبادت میں اپنے آپ کو لگایئے اور مخلوق سے علیحدگی کا وقت رات کا ہے، لہٰذا یہ یکسوئی رات کے وقت اختیار فرمایئے۔

وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ۝ اور رغبت کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ رہئے اس آیت شریفہ میں رسول اللہ ﷺ کو بھی مکلّف بنایا جا رہا ہے کہ اپنے لئے بھی کوئی مخصوص وقت ہونا چاہئے کہ جس میں اللہ کی یاد کے سوا کسی کا دخل اور شرکت غیر بالکل نہ ہو اور ذات بحت کے سوا کسی کی طرف بالکل توجہ نہ ہو۔

اور جب رسول اللہ ﷺ اس کے مکلّف ہیں حالانکہ کارِ تبلیغ میں مشغولی آپ کو توجہ الی الحق سے مانع نہیں ہو سکتی تو پھر اُمت کے خدامِ دین کے لئے یہ حکم کیوں نہ ہوگا، اسی لئے مدرسین بھی، مبلغین و مصنفین و مؤلفین بھی، واعظین و مناظرین بھی سب ہی اس بات کے مکلّف ہیں کہ کوئی وقت عبادت کا رات کے کسی حصہ میں اپنے لئے مستقل رکھیں۔

بعض معلّمین و مدرّسین یہ خیال کرتے ہیں کہ تعلیم و تعلّم میں مشغولی کے احادیث شریف میں بہت فضائل وارد ہوئے ہیں، لہٰذا یہ پڑھنا پڑھانا اور مطالعہ کرنا قائم مقام تہجد کے ہو جائے گا، واہ واہ، خوب سمجھے کہ تعلیم میں مشغولی سے تہجد معاف ہوگئی۔ اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم بھی تو تعلیم و تعلّم میں مشغول رہتے تھے، پھر ان سے بھی تہجد معاف ہو جانا چاہئے تھا۔ اللہ تعالیٰ اس سوءِ فہم سے سب کو محفوظ رکھیں، صدق و اخلاص نصیب فرمائیں۔

خاص طلبہ کو خطاب :

اپنا فرض منصبی پہچانو، پنجوقتہ نماز با جماعت مسجد میں تکبیر اولیٰ کے ساتھ پڑھو۔ وضو باقاعدہ کرو، مستحبات کا خیال کر کے کرو، انگلیوں کا خلال تک دھیان رکھ کر کرو، ابھی تو وضو بھی ٹھیک نہیں ہے، نماز کا پورے اخلاص و صدق کے ساتھ ہونا تو بعد کی بات ہے۔

جوانی کے کام :

ایک دن بعد فجر بعض مخصوص اعزہ اور خدام کی موجودگی میں اپنے ضعف کا ذکر فرمانا شروع کیا۔ پھر فرمایا نوجوانی میں میری طبیعت میں ذرا جھجک نہ تھی، بعض علماء سے مکالمہ ہوتا تھا، دلائل کے ساتھ جواب دیتا تھا۔ ذرا جھجک نہ ہوتی تھی، رؤسا، امراء، نوابین کی مجلس میں جانا ہوتا تھا، تو طبیعت بالکل نہ جھجکتی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ نواب مزمل اللہ خان، نواب بھیکم پور کے یہاں امراء، رؤسا کا اجتماع تھا۔ رؤسا آتے اور سلام کر کے کرسی پر بیٹھ جاتے۔ میں بھی برادرِ نسبتی جناب مولانا پیارے میاں صاحب کے ساتھ پہنچا تو بھائی صاحب تو تمام امراء کی طرح سلام کر کے بیٹھ گئے لیکن میں نے آگے بڑھ کر نواب صاحب سے مصافحہ بھی کیا، طبیعت میں ذرا جھجک نہ ہوئی، لیکن اب اس کے برخلاف حال یہ ہے کہ کوئی مجمع بھی آتا ہوا نظر آتا ہے تو طبیعت اولاً جھجک جاتی ہے۔ گو کام سب کا کرتا ہوں، سب کی سنتا ہوں، سب سے فرداً فرداً نمٹتا ہوں، لیکن اعصابی کمزوری کی وجہ سے طبیعت اوّل وہلہ میں متاثر ہو جاتی ہے۔

خدام دین کو بہت مضبوطی چاہئے :

پھر فرمایا ایک بات کہتا ہوں۔ غور سے سنو ! میری بات تو دوسری ہے جیسا کہ ابھی کہا کہ اعصاب کا ضعف ہے لیکن تم جوان ہو، اعصاب بھی مضبوط ہیں تم ایسی ویسی باتوں سے متاثر نہ ہونا۔ یاد رکھو مخالفین تو ہوا ہی کرتے ہیں اور بعض وقت اپنوں کی طرف سے ہوتی ہیں۔

پختگی اور مضبوطی کا ذریعہ :

تم یہ دیکھ لو کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں یا لکھ رہے ہیں قرآن و حدیث اور تعاملِ

صحابہ اور تعاملِ اکابر کی روشنی میں اس کا درجہ ہے۔ جب تحقیق ہو جائے کہ حق وہی ہے جو تم پر واضح ہوا ہے، تو انتہائی مضبوط رہو اور مخالفتوں کی پرواہ نہ کرو۔

حضرت گنگوہیؒ کی مضبوطی کی بعض حکایات :

بعض مسائلِ اختلافیہ میں حاجی صاحب کا مسلک کچھ نرم تھا، اختلاف کو ختم کرنے کے لئے ایک رسالہ "ہفت مسئلہ" لکھا جس میں انتظامِ شریعت کے بالمقابل اصل مسئلہ میں کچھ لینیّت (نرمی) اختیار کی گئی تھی۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ آخر میں نابینا ہو گئے تھے۔ جب رسالہ مذکورہ گنگوہ پہنچا تو بعض خدام سے فرمایا کہ پڑھ کر سناؤ کیا لکھا ہے؟ چنانچہ سننا شروع کیا۔ سُن کر فرمایا کہ اس کو میرے حمام میں جھونک دو۔ انتظامِ شریعت کی خاطر پیر کا رسالہ حمام میں جھونکوا دیا۔ لوگوں میں بہت شورش ہوئی کہ پیر کا رسالہ اور حمام میں جھونکوا دیا، مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ ہم تو صبر کئے بیٹھے ہوئے تھے، حاجی صاحب کے پاس بھی اطلاع پہنچی، حاجی صاحب کا خط مکہ مکرمہ سے آیا لکھا تھا کہ آپ نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا، آپ ہندوستان میں اسی کے مکلّف تھے اور اسی موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر یہ بھی تحریر فرمایا کہ مجھے آپ سے اللہ کے لئے محبت ہے جیسے اللہ کو بقا و دوام ہے، اسی طرح اللہ کے لئے جو محبت ہو، اس کو بھی بقا و دوام ہے۔

حضرت مجدد تھانویؒ کی مضبوطی کی بعض حکایات :

اسی طرح ہمارے حضرت والا مولانا تھانویؒ کے ایک مرید نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں اس طرح کلمہ پڑھ رہا ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ اشرف علی رسول اللہ یہ خواب ان مرید نے حضرت والا کو لکھا۔ حضرت والا نے جواب میں لکھا کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے پیر متبعِ سنت ہیں۔ بس اس جواب کی وہ تشہیر کی گئی کہ الامان والحفیظ۔ بعض

اپنوں کی جانب سے بھی اعتراضات کیے گئے، مگر حضرت والا پر ان تمام اعتراضات کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ جو لکھا تھا شریعت کے مطابق لکھا تھا اور جب عوام کی طرف سے جیسے وہاں خطاب حاجی کا ہوا تھا، یہاں خطاب مولوی صاحب کا مل گیا تو طالب علم کو کس طرح رہنا چاہئے، مولیٰ والا ہو کر رہنا چاہئے یا مُولی والا ہو کر مُولی جانتے ہو جو کھائی جاتی ہے۔

عنوان و معنون کا تلازم:

جب اس کو مولوی کا خطاب مل گیا، اسی طرح لڑکا حفظ کرنے لگا، اس کو حافظ جی کا خطاب مل گیا، تو لڑکا حفظ کرنے بیٹھ گیا، اس کو کہا جا رہا ہے آؤ حافظ جی، جب میزان ہاتھ میں آ گئی تو کہا جا رہا ہے، آؤ مولوی صاحب تو اس عنوان کا کیا تقاضا ہے، عنوان معنون سے خالی نہیں ہونا چاہئے تو جب یہ لڑکا حافظ جی اور میزان والا مولوی صاحب کہے جا رہے ہیں تو اس عنوان کا کیا تقاضا ہے، یہی تقاضا ہے کہ اس کی زندگی میں تقویٰ و طہارت آنا چاہئے۔ عنوان معنون کی خبر دیتا ہے، تو مولوی علم کی اور حافظ جی حفظ کی خبر دے رہا ہے، پس علم و حفظ کا جو تقاضا ہے، اس کو بجالانا چاہئے، عنوان سے معنون کی طرف استدلال کرنا یہ مثل دلیل اِنّی (دلیل لمّی اور دلیل انّی یہ استدلال کے دو طریق ہیں، جن کو علماء جانتے ہیں، مثلاً دھواں دیکھ کر سمجھ لینا کہ آگ موجود ہے، یہ دلیل انّی ہے اور آگ دیکھ کر پتہ لگا لینا کہ یہاں دھواں بھی ہے، دلیل لمّی ہے۔ اصطلاحِ منطق میں اوّل کو استدلال اور ثانی کو تعلیل کہتے ہیں) کے ہے اور معنون سے عنوان کا پتہ چلانا یہ دلیل لمّی کے مثل ہے۔ اثر سے مؤثر کی طرف استدلال کرنا یہ دلیل انّی ہے، اور مؤثر سے اثر کو معلوم کرنا یہ دلیل لمّی ہے۔

لفظِ مسلم کا کیا تقاضا ہے:

اسی طرح مسلمان جو ترجمہ ہے مسلم کا۔ تمہارے واسطہ حق تعالیٰ نے پہلی کتابوں

میں اوراس کتاب قرآنِ پاک میں مسلم نام رکھا ہے : هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا ۔ تو مسلم کا عنوان معنون سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔ مسلم کے معنیٰ تابعدار کے ہیں تو اے مسلمان تیرا عنوان معنون تابعداری سے خالی نہیں ہونا چاہئے، ورنہ تو کیسا مسلم ہے کہ تیرے معنون میں تابعداری رکھی ہوئی ہے، اور تو تابعدار نہیں ہے، کامل تابعداری کرنے والا، کامل حکم پر چلنے والا، تو اے مسلم تیرا عنوان معنون تابعداری کو چاہتا ہے، یہ عرض کرنا تھا، اس لئے کہا تھا سمجھے۔

پھر جب مسلم میں تابعداری رکھی ہوئی ہے تو مسلم مولوی کے ساتھ تو ایک صفت مولویت کی زیادہ لگی ہوئی ہے، تو مسلم مولوی کا معنیٰ تو اور آگے بڑھا ہوا۔ اب اپنے کو جانچ لو کہ میری نسبت کیسی ہے؟ کہیں میں ...... ع بدنام کنندۂ نکونامے چند

تو نہیں ہوں۔ عنوان کیا ہے؟ اور معنون کیا ہے؟ اَيُّهَا الطّلاب غور کیجئے، جب چلتے ہیں تو کتاب بغل میں ہے اور اس کا اثر دل میں ہونا چاہئے اور اس کا عملی ظہور جسم میں ہونا چاہئے۔ اس احقر فقیر غریب کی حدیث (بات) بھی غریب ہے، حدیث بھی تو صحیح، حسن اور غریب ہوتی ہے۔

طلبہ کو خطاب :

میرے عزیز بچو ! طالب علمو! اپنے کو پہچانو کہ آپ کون ہیں؟ کس طرح رہنا چاہئے۔ تمہارے ساتھ فصل لگ گئی ہے، فصل کھیتی نہیں، فصل امتیازی کہ کفر سے ہٹ کر تم مسلم ہو اور مسلم کے بعد مولوی ہو۔ یہ مولویت تمہارے لئے فصل امتیازی ہے، اس سے تم عوام سے ممتاز جماعت بن گئے ہو۔

اسلام وعلم کے آثار :

تو اس علم کا اثر قلب میں اور قلب سے جوارح (ہاتھ پاؤں) میں اثر امتیاز کا آنا

چاہئے من حیث المسلم اور من حیث المولوی جوارح میں سنجیدگی، متانت، وقار، قلب میں حلم، ایثار، فتوحات، توکل، قناعت وغیرہ صفات حسنہ قلبیہ، روحانیہ آنے چاہئیں، یہ فصل علم جوں جوں بڑھتی جائے گی، فصل قلبی اخلاقِ حسنہ بڑھتے چلے جائیں گے۔

فصلِ امتیازی کا ظہور قیامت میں :

اسی فصل امتیازی کی وجہ سے میدانِ حشر میں حق تعالیٰ کفار سے فرمادیں گے۔ وامتاز والیوم ایھا المجرمون ،اے کفارتم آج کے دن مومنوں سے جدا ہو جاؤ، جیسے دنیا میں تم مؤمنوں سے جدا رہے، یہاں بھی جدا رہو، تو اسلام کی فصلِ امتیازی ہے، اس نے شرکت سے جدا کردیا۔

ریاء شرکِ خفی ہے :

اسی طرح شرکِ خفی بوئے ریا بھی نہ ہونا چاہئے بس توحید خالص ہو، کیسی توحیدِ خالص؟ ایسی کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام نافی بھی ہے تو اس نافی نے کلمہ طیبہ کو لا سے شروع کیا جس کے معنیٰ نفی کے ہیں (یہ توفیقِ الٰہی سے آپ حضرات کی برکت سے نیا عنوان ہے) تو اس ذاتِ نافی نے کلمۂ طیبہ کو لا کے ساتھ شروع کر کے اشارہ فرمادیا کہ اے مؤمن! تیرے اندر سب سے پہلے غیر اللہ کی نفی ہونا چاہئے، اثبات پھر دیکھا جائے گا، تو لا نفی کو کہہ کر یہ مؤمن بھی غیر اللہ کے لئے نافی ہوگیا۔ قلب کے اندر بھی نفی اور زبان پر بھی نفی نفی تو غیر اللہ کی طرف ذرّہ برابر بھی مائل ہونا کیسا؟ یہ خلافِ توحید ہے، اسی لئے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار ۔اے مسلمانو! تم ظالم لوگوں کی طرف مائل نہ ہو، کہیں تم کو دوزخ کی آگ نہ لگ جائے، یہ بات شرکِ خفی ریا پر چلی تھی۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ مسلم کا عنوان اس کو چاہتا ہے، شرک جلی اور خفی دونوں سے پورا پرہیز ہو، کیونکہ وصف مؤمن اولاً نفس امتیاز کو چاہتا ہے اور پھر امتیاز پر امتیاز کو چاہتا ہے، قولاً بھی، حالاً بھی اور عملاً بھی، پھر وصف علم کے ساتھ اور زیادہ امتیاز کو چاہتا ہے۔

طلبہ کو خاص خطاب :

لھٰذا ایّها الطلاب ! فاطلبوا لعلم طلبًا جدًا علمًا کثیرًا نافعًا ۔ اے طلبہ تم فارغ البال ہو، طلبِ علم کے سوا تم کو کوئی کام نہیں۔ لہٰذا اس طرح علم اور طلبِ علم اور زیادتِ علم میں مشغول ہو، جس کی آپ کے سامنے کچھ تفسیر کی گئی۔

اس طرح علم اور زیادتِ علم میں مشغول شغل بحق کے ساتھ رہو۔ حق کہتے ہیں پوری سچی پکی کذب سے خالی، باطل سے ممتاز چیز کو۔ تو علم میں شغل بحق کے ساتھ مشغول ہو، متانت و سنجیدگی کا اہتمام ہو، وقار و حلم کو اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس طرح طلبِ علم اور زیادتِ علم میں مشغول بشغل حق رہنے کی توفیقِ ارزانی عطا فرمائیں۔ (آمین ثم آمین)

خدا حافظ، فی امان اللّٰہ۔

☆☆☆

ملفوظ

فرمایا مبتدی کو مختلف اہلِ حق کے پاس بیٹھنا بھی مضر ہے، پھر اہلِ باطل مبتدع وغیرہ کے پاس بیٹھنے کے کیا معنیٰ؟ ہاں اگر دونوں شیخوں کا مذاق ایک ہو تو اور بات ہے۔ حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ مختلف الوان کے بزرگوں کے پاس بیٹھنے سے منع کرتے تھے کیونکہ طریقِ علاج مختلف ہوتے ہیں۔ رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں طالب کا قلب مشوش ہو جاتا ہے۔ ابھی یہ مبتدی ہے، اس کا قلب شیخ کے ساتھ جما نہیں ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو دوسری جگہ ہیں، اپنے شیخ کے یہاں نہیں مثلاً وہاں کرامات ہیں، اپنے شیخ میں نہیں، وہاں شب بیداری ہے، نفل روزہ داری ہے، یہاں نہیں، اب یہ مرید خیال کر رہا ہے کہ بجائے وہاں کے یہاں بیعت ہو جاتا، تو اچھا تھا بس تشویش آ گئی، نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔

بعض مشائخ صاحبِ توجہ ہوتے ہیں، یہ مرید توجہ میں جا کر بیٹھ گیا، قلب میں سرسراہٹ اور رونق آ گئی۔ اپنے شیخ کے یہاں برسوں بیٹھا، ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا، بس سمجھنے لگا یہاں تری ہے، شیخ میں خشکی ہے، تشویش پیدا ہو گئی، یہ اس کو مضر ہے۔ مگر یہ حکم مبتدی کے لئے ہے لیکن اگر اعتقاد میں پختگی آ گئی ہے کہ کہیں بھی جاتا ہے، کیسا ہی دیکھتا ہے، اپنے شیخ کی طرف سے ذرا اعتقاد میں فرق نہیں آتا، اس کو مختلف مشائخ کے یہاں جانا مضر نہیں۔ یہ سلوک کا مسئلہ ہے۔ جس طرح فقہ کے مسائل ہیں، اسی طرح تصوف کے بھی مسائل ہیں۔

..............☆☆☆..............

ساتویں مجلس

تبدیلیٔ حالات میں تصحیحِ نیّت

اللہ تعالیٰ نیتوں کو خوب جانتے پہچانتے ہیں۔ ہر ایک کو اُس کی نیت کے اعتبار سے حق تعالیٰ کی طرف سے درستگیٔ اخلاق و اصلاحِ حال آتی ہے، جس کا نام ہدایت ہے، اب جس درجہ کا اخلاص ہوگا، اسی اعتبار سے ہدایت آئے گی۔ قرآن شریف میں ایک آیت ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ (پ۱۳، ع۸)

واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتے جب تک وہ لوگ اپنی حالت کو خود نہ بدلیں۔

اسی نے اصلاح کی طرف توجہ نہ کر کے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَایَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ ○ (پ۱۱ ع۱۰)

یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ذرا سا بھی لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود ہی اپنے

آپ کو تباہ کرتے ہیں۔

ایسے شخص نے اپنی طرزِ عمل سے گمراہی بلائی تھی۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس کو گمراہی دیدی کیونکہ تخلیق کی حیثیت سے خالق تو ہر شئی (چیز) کا وہی ہے ہدایت کا بھی ضلالت کا بھی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ (پ۲۲ع۱۴)

سو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

عقیدۂ مشیت پر شبہ کا ازالہ :

اس آیت سے عام لوگوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ جب ہدایت و ضلالت دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں تو ہم مجبور ہوئے؟ حالانکہ یہ بات نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بندہ ہدایت کے اسباب اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہدایت پیدا کر دیتا ہے اور گمراہی کے اسباب اختیار کرتا ہے تو ضلالت پیدا کر دیتا ہے۔ اس پیدا کرنے کو جسے تخلیق کہتے ہیں۔ یضل و یھدی سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے بندہ کا مجبور ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی لئے تو قرآن شریف کا ترجمہ دیکھنا بلا استاد جائز نہیں، بعض وقت بلا استاد کے محض ترجمہ دیکھنے سے بڑا شبہ پڑ جاتا ہے۔

بلا اُستاد ترجمۂ قرآن دیکھنے کا غلط نتیجہ :

افریقہ یا لندن سے ایک لڑکی کا خط آیا تھا جو بہت نیک، بڑی پابند صوم وصلوٰۃ، بڑی تلاوت کرنے والی اور بڑی دیندار ہے، وہ لکھ رہی ہے، بے چاری میاں کا رونا رو رہی ہے کہ نماز کے قریب نہیں جاتا، شراب پیتا ہے، دوسروں کی طرف نظر کرتا ہے اور میرا تعلق شریف گھرانے سے ہے، دین کے اعتبار سے بھی خاصی دیندار ہوں کہ الحمدللہ تعالیٰ طبیعت

میں دینداری ہے، پھر مجھے یہ ایسا شخص کیوں ملا؟ جو قرآن شریف میں یہ ہے :

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ ۚ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَ الطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ۔ (پ۱۸ع۹)

ترجمہ : یعنی خبیث' خبیثہ کے لئے اور طیب طیبہ کے لئے تو میں تو خبیثہ نہ تھی پھر مجھے ایسا شخص کیوں ملا؟ میں نے اس بے چاری کو جواب لکھ دیا کہ :

"اسی لئے بغیر استاد کے قرآنِ پاک کا ترجمہ دیکھنا جائز نہیں ہے اور اس آیتِ شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ جس مرد کی طبیعت خبیث قسم کی ہے اور اس کو بیوی طیبہ، دیندار اور خوبصورت سی مل گئی لیکن خباثتِ طبع کی وجہ سے اس کی خبیث طبیعت تو خبیثہ، بازاری عورت اور نمائشی عورت کی طرف چلے گی، ایسے ہی عورت خبیثہ کو مرد نیک دیندار اور طیّب مل گیا لیکن اس کی طبیعت تو خبیثہ ہے تو اس خبیثہ عورت کی طبیعت تو اس خبیث مرد کی طرف جو شوخئ مزاج والا، آوارہ بدچلن ہو، تو میاں کی خبیث طبیعت تو ادھر چل رہی ہے، تم تو ماشاء اللہ تعالیٰ دیندار اپنی جگہ پر ہو یہ خبیثہ کا تصور کیسا؟ وہ تو اس کی خبیث طبیعت ہے تمہاری طبیعت تو دینداری کی ہے ماشاء اللہ تعالیٰ"۔

وہ بیچاری یوں سمجھی کہ شاید میرے اندر کوئی خباثت تھی جو مجھے ایسا خبیث مرد ملا۔ تو یہ شبہ اسی لئے پیدا ہوا کہ ترجمۂ قرآن پاک کسی استاد سے نہیں پڑھا تھا، اسی طرح فَیُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ میں بھی اسی لئے شبہ ہوتا ہے کہ آیت کا صحیح مطلب نہیں سمجھا جاتا۔ مطلب وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا کہ اگر کوئی بُرے افعال اختیار کر کے ضلالت چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضلالت کو پیدا فرما دیتے ہیں کیونکہ خالق ہر چیز کے وہی ہیں۔

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خالق ہیں۔

خلق وکسب کی ایک مثال :

مثال کے طور پر ایک شخص کو منزلِ مقصود کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ دوسرا شخص اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے اچھا تمہیں راستہ معلوم نہیں ہے۔ آؤ میں تمہیں راستہ بتاؤں اور اس نے راستہ بتلانا شروع کر دیا۔ دیکھو سیدھے جاؤ پھر داہنی طرف کو مڑ جانا، پھر بائیں طرف کو ہو جانا۔ پہلا شخص کہتا ہے اب مجھے راستہ معلوم ہو گیا، مگر جب چلنے لگا تو بتائے ہوئے راستہ کے خلاف جدھر کنواں ہے اُدھر کو جا رہا ہے تو رہبر نے ہاتھ پکڑ کر کہا ارے ارے ادھر نہیں ادھر کنواں ہے اب وہ پہلا شخص کہتا ہے اجی کنواں کہاں ہے؟ میرا ہاتھ چھوڑ دے، اس نے ہاتھ چھوڑ دیا کیونکہ وہ خود ہی کنویں میں گرنا چاہتا ہے کوئی عقل کا اندھا ہو گا، آگے چلا اور اندھیرے کی وجہ سے کنویں میں گر گیا، تو اس شخص کو راستہ دکھانے والے نے کنویں میں تھوڑا ہی گرایا ہے، اس نے تو منع کیا تھا، وہ تو ہاتھ پکڑے ہوئے تھا، مگر وہ ہادی کو ساتھ نہیں لے گیا وہ ہاتھ چھڑا کر خود کنویں میں گرا ہے ورنہ دین اسلام کا حکم تو کچھ اور ہے جس کو فارسی کے اس شعر میں بیان کیا گیا ہے ....

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

اگر میں دیکھوں کہ نابینا جا رہا ہے اور سامنے کنواں ہے تو ایسے وقت خاموش بیٹھوں تو گناہ ہے۔

چنانچہ اگر تم دیکھو کہ نابینا جا رہا ہے اور آگے کنواں ہے تو اگر تم نماز بھی پڑھ رہے ہو تو تمہارا فرض یہ ہے کہ نماز کے مقابلہ میں نیت توڑ کر اس کو کنویں میں گرنے سے بچا لو، یہ اسلام کہتا ہے اور جب کوئی بیچارہ تعلیماتِ اسلامی پر عمل کرتے ہوئے نیت توڑ کر بچانا چاہ

رہا ہے ہاتھ پکڑ رہا ہے، تو نابینا صاحب چلا رہے ہیں کہ میرا ہاتھ کیوں پکڑ لیا، اس نے کہا ارے بھئی آگے کنواں ہے، تو نابینا کہتا ہے، چھوڑ میرا ہاتھ نہ معلوم تو کون ہے؟ اس نے کہا بہت اچھا تیری خوشی ۔ اس نے ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ کنویں میں گر گیا تو کنویں میں یہ خود گرا، یا اس (ہادی) نے گرایا اور اگر کوئی چٹ پٹا (ظریف) قسم کا آدمی ہے تو پیچھے سے تھوڑا سا دھکا بھی دیدے گا۔ خیر شریف آدمی تو ایسا نہیں کر سکتا تو بھلا اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت سے ہٹا دے اور گمراہی میں ڈالے، کہیں ایسا ہو سکتا ہے۔ العیاذ باللّٰہ، العیاذ باللّٰہ، العیاذ باللّٰہ۔

تحقیق کی حیثیت سے تو عزت و ذلت اور ہدایت و ضلالت سب کچھ اسی کے دستِ قدرت میں ہے لیکن اس کی تخلیق ہمارے کسب پر مرتب ہوتی ہے، ہم جیسے اعمال کرتے ہیں حق تعالیٰ ویسی ہی تخلیق مرتب فرما دیتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف ذلت اور ضلالت کا انتساب مت کرنا یہ تم اپنی سوءِ تدبیر سے خود مول لیتے ہو، بلکہ یوں دعا مانگو کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت بخشیں اور سب کی مغفرت فرماویں۔ (آمین ثم آمین)

اور جس درجہ کا اخلاص ہوگا اسی درجہ کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آئے گی، اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا کہ ان کو قابلیت ہدایت کی نہ دے اور پھر مواخذہ فرمادے مگر لوگ خود ہی اپنے آپ کو تباہ و برباد کرتے ہیں کہ قابلیت موہوبہ کو ضائع کر دیتے ہیں اور اس سے کام نہیں لیتے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال خوب جانتا ہے، اسی نیت کے اعتبار سے معاملہ کرتا ہے۔

نیتوں کی نگرانی ضروری ہے :

ہمیں اپنی نیتوں کو سوچنا اور سنبھالنا چاہئے۔ بزرگوں کی طرف اپنا انتساب (منسوب ہونا) لوگوں کی نگاہوں میں مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے، بہت سی اغراضِ فاسدہ والی نیتیں ہوتی ہیں جیسے جاہ طلبی، مال طلبی، لوگوں سے اپنے کاموں کا نکالنا، اپنا اعتماد

دوسروں پر قائم کرنا، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ صاحب فلاں جگہ فلاں صاحب سے تعلق رکھتے ہیں، تو ماشاء اللہ تعالیٰ سلیم الطبع صالح ہوں گے حالانکہ وہ کج طبع فاسد المزاج ہے، اپنا اعتماد لوگوں پر قائم کرتا ہے، دنیوی کام نکالنا چاہتا ہے اور شیخ کو دھوکہ میں ڈالنا اور رکھنا چاہتا ہے اور اپنی دنیا بنانا چاہتا ہے، لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ فلاں جگہ جاتے آتے ہیں اور فلاں شخص سے تعلق رکھتے ہیں' انہیں کی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے ہیں تو یہ شخص بھی ماشاء اللہ تعالیٰ انہی کی طرح دیندار ہوگا' اس اعتماد کے قائم ہو جانے کے بعد اس شخص نے کبھی دو سو روپیہ اُدھار لے لئے اور واپس دیدیئے، کبھی سو لئے اور واپس کر دیئے، کبھی پانچ سو روپیہ لے لئے اور واپس دیدیئے، بس اسی نسبت وانتساب سے اعتماد قائم ہو گیا، جب خوب اعتماد بیٹھ گیا تو ایک دم دس ہزار روپے قرض لے لئے، اب دس ہزار روپیہ قرض لینے کے بعد نہیں دیتا، ایسا ہو گیا گویا کہ بھول گیا تقاضا کرنے پر ٹال دیتا ہے، یہ سب تجربات وواقعات ہیں' تو اس کا مقصود تو بس کام بنانا تھا، اس کا مقصود تو یہ تھا کہ دس ہزار روپے آ جائیں، وہ آ گئے۔ جب ایسی نیت ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو کیا خاک نفع ہوگا اور کیا خاک ہدایت واصلاح ہوگی۔

الغرض بزرگوں کی طرف لوگوں کے آنے کی اور صحبت میں رہنے، بیٹھنے، اُٹھنے کی اور بیعت ہونے کی اور تعلق قائم کرنے کی نیتیں مختلف ہوتی ہیں، اسی نیت کے اعتبار سے نفع ہوگا، اگر اس کی نیت حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط اور قوی ترین کرنے کی ہے تو ویسا ہی فائدہ ہوگا اور اگر کسی دنیوی منفعت حاصل کرنے کی ہے تو اسی نسبت سے دنیا بھی حاصل ہو جائے گی، لیکن آخرت کا حصہ کتنا رہے گا۔ ہاں ایمان پر خاتمہ ہوا، تو جنت مل ہی جاوے گی لیکن اوّل ہی وہلہ میں مرتے ہی جنت ملنے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ دنیادار کو بھی مرتے ہی اوّل وہلہ میں جنت مل جائے تو پھر احکام کا مکلف کرنا کیسا ہے؟ گناہوں پر سزا کیوں

لکھی ہے؟ کفراور اس پر مجرم کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟

جنت ملنے کے دو (۲) درجے :

تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک تو من حیث الایمان جنت کا ملنا ہے اور ایک من حیث الایمان الکامل جنت میں داخل ہونا ہے۔ لہٰذا ایمانِ کامل کی حیثیت سے جنت کا ملنا اوّل وہلہ میں ہوگا اور مطلق ایمان کی حیثیت سے جنت کا ملنا اوّل وہلہ میں نہ ہوگا بلکہ سزا بھگت کر ہوگا۔

حاجی صاحبؒ کی غایتِ تواضع :

ایک شخص نے اپنے آپ کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کا داماد ہونا ظاہر کیا، حالانکہ آپ کی کوئی صاحبزادی ہی نہیں تھی، پھر داماد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب لوگ تحقیق تو کرنا جانتے ہی نہیں، سمجھے ہاں بھائی داماد ہوگا تو اس نسبت پر خوب دنیا کمانی شروع کر دی جہاں جاتا ہے خوب خدمت کی جا رہی ہے، بعض اولیاء اللہ عجیب و غریب متصف بصفاتِ حق و متخلق باخلاق اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں، حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ بھی ایسے ہی تھے کہ آپ جامع الصفات' بہ تو حق صفت رأفت و رحمانیت اور رحیمیت کے مظہر اتم، گویا کہ آپ سراپا رحمۃ للعالمین تھے جب کسی نے حضرت حاجی صاحبؒ سے کہا کہ حضرت فلاں شخص اپنے کو حضرت کا داماد ظاہر کر کے آپ کے مریدوں سے خوب دنیا حاصل کر رہا ہے چونکہ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر شفقت مروّت اور عبدیت غالب تھی تو آپ نے فرمایا کہ :

''ارے بھائی ! اب تک مجھ سے کسی کو دین کا تو کچھ نفع ہوا نہیں' اگر کسی کو دنیا کا نفع ہو جائے تو کیا میں اس کو بھی بند کر دوں''۔

سبحان اللہ کیا خوب تواضع اور عبدیت ہے تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ غیر واقعی نسبت سے بھی نفع حاصل کر لیتے ہیں۔

ایک ضروری انتباہ :

دنیوی نقطۂ نظر سے چاہے یہ لوگ کما لیں کہ کسبِ دنیا (دنیا کمانا) ان کے ذہن میں ہے کیونکہ اہل دنیا نے اکتسابِ دنیا کو صرف حصول مال ہی کے اندر محصور کر دیا ہے حالانکہ اکتسابِ دنیا نام ہے، مال و جاہ دونوں کے حاصل کرنے کا۔

ایک شرعی اُصول :

اور دینِ اسلام نے اکتسابِ دنیا کا جواز اس وقت رکھا ہے جبکہ اکتسابِ دنیا اُمورِ آخرت (آخرت کے کاموں) میں مخل نہ ہو یعنی آخرت کے جو اعمال و معاملات ہیں۔ ان میں مالِ دنیا کا حاصل کرنا خلل ڈالنے والا نہ ہو، تب اس مالِ دنیا کا کمانا جائز رکھا ہے اور اگر آخرت کے معاملات و اعمال میں اور آخرت کے کاموں میں اس کا کمانا خلل ڈالتا ہو تو جائز نہیں قطعاً حرام ہے۔ یہ قاعدہ ہے یہ اُصول ہے کہ اصلِ حیات یعنی آخرت کے کاموں میں خلل پڑ گیا تو ایسی دنیا مذموم (بری) ہے۔ حیاتِ دنیا آخرت کے کاموں کے لئے ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے :اَلدُّنیَا مَزرعة الاٰخرة۔ (التشرف) یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

حضور ﷺ کا مقصد یہ ہے کہ آخرت کے کاموں کو مقدم رکھو، ایسے دنیوی کاموں کو مت کرنا جن سے آخرت کے کاموں میں خلل پڑ جاوے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

طلب کسب الحلال فرِیضَة بَعْد الفریضه۔ (ترغیب وترہیب ج ۳ ص ۱۲)

دنیا کا کمانا فرض ہے مگر آخرت کے کاموں کے فرض کے ادا کرنے کے بعد۔

یہ اُصول اور کلیہ ہے مگر اب حال یہ ہے کہ کاشتکار صبح سویرے ہی اُٹھ کر کھیت پر

جنگل چلا جاتا ہے اور تاجر صبح ہی اُٹھ کر دوکان پر چلا جاتا ہے اور ملازم صبح ہی اُٹھ کر دفتر میں چلا جاتا ہے اور طالبِ علم غیر دینی صبح ہی اُٹھ کر پڑھنے چلا جاتا ہے۔ نماز کا نام ہی نہیں حالانکہ چاہئے تھا کہ سب سے پہلے صبح اُٹھ کر ضروریاتِ طبعیہ سے فارغ ہو کر پہلے وضو کرتا اور وضو کے بعد مسجد جا کر جماعت سے تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھتا اور پھر اُمورِ معاش کی طلب وتلاش میں نکلتا کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے :

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (پ۲۸ ع۱۲)

یعنی جب تم نماز پڑھ چکے تو اب مسجد میں مت بیٹھے رہو زمین میں پھیل جاؤ، نکل جاؤ۔ .... مگر کاہے کے لئے؟

سینما اور ٹی وی برائیوں کی جڑ ہے :

کیا سینما یا ٹیلی ویژن دیکھنے کے لئے جو آج جگہ جگہ سڑکوں پر چوراہوں پر بیٹھکوں اور گھر گھر میں بے حیائی' گمراہی کی جڑیں مضبوط کرنے اور قوم مسلم کو بگاڑنے کے لئے لگے ہوئے ہیں، دوسرے لوگوں کا کچھ نہیں بگڑتا کیونکہ وہ تو انتہائی کنارہ پر پہنچ چکے، ادھر مرا، اُدھر گرا، دوزخ نقد حال اس کے لئے لازم ہے، یہ تو بگاڑ مسلم ومؤمن کا ہے، جس کو مسلمان بھائی سمجھتے ہی نہیں، شب وروز بگڑتے چلے جارہے ہیں۔ سینما و ٹیلی ویژن وغیرہ یہ سب مسلمانوں کے بگاڑنے کا ایک اچھا خاصا تبلیغی ذریعہ ہے کچھ کہنا بھی نہیں پڑتا اور بگڑتے چلے جاتے ہیں۔

فواحش اور منکرات سے اجتناب :

جیسے لڑکوں کا لڑکوں کے ساتھ تعلق' میل جول یہ فتنہ ہے اور بڑا بھاری فتنہ ہے حتی

کہ جوانوں کا جوانوں کے پاس اُٹھنا بیٹھنا بھی فتنہ ہے، اسی طرح سے یہ ٹیلی ویژن و سینما بھی ایک بہت بڑا فتنہ ہے تو کیا مسجد سے نماز پڑھ کر اس کے لئے نکل جاؤ، ہرگز نہیں بلکہ تمہاری نماز تو منع کر رہی ہے ابھی تو بڑے عظیم الشان ذوالجلال والاکرام کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور بعظمت وجلالت ایک عظیم المرتبت کا نام لے رہا تھا، اس کے سامنے جھک رہا تھا، پیشانی رگڑ رہا تھا اور گردن جھکا کر بایں عظمت و محبت بیٹھا ہوا تھا اور وہاں سے ذرا نکلا، باہر آیا تو اب ٹیلی ویژن اور سینما میں جا رہا ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کو گھور رہا ہے، تاک جھانک رہا ہے اور دوسروں پر حقارت کی نظر ڈال رہا ہے، زبان کو بدکلامی اور بدزبانی میں ملوث کر رہا ہے، آپس میں گالی، گلوچ کر رہا ہے، فحش و منکرات میں مبتلا ہے تو کیا اس باعظمت وجلالت نماز کا یہی تقاضا تھا، وہ نماز تو سب فحش و منکرات سے منع کر رہی ہے۔

الغرض فانتشروا فی الارض سے سینما، ٹیلی ویژن اور گالی گلوچ کے لئے نکلنا مراد نہیں بلکہ حق تعالیٰ آگے خود اس کے غرض ارشاد فرماتے ہیں کہ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (اللہ کا فضل تلاش کرو) اس فضل کے تلاش کرنے کے لئے زمین میں پھیلنے کو فرمایا جا رہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ مسجد میں آنا اور بیٹھنا وہ بھی تو اللہ تعالیٰ کے فضل کے لئے ہے۔ اسی لئے تو بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل حاصل ہو، پھر اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک فضل حاصل ہو گیا تو اب دوسرے فضل کی طلب کرو تفسیر کے لئے خود مطالعہ کریں۔

ایک تفسیری نکتہ :

جب مسجد میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے گیا تھا اور وہاں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے ہی بیٹھا ہے لیکن نماز سے فارغ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ خود اسے نکال رہے ہیں اور عجیب عنوان ارشاد فرما رہے ہیں کہ فانتشروا فی الارض (زمین میں پھیل جاؤ)

ایک بلاغتی نکتہ :

یہاں صلہ فی ہے علیٰ نہیں، ورنہ قاعدہ سے علیٰ ہوتا کہ انتشار (پھیلنا) زمین کے اوپر ہوتا ہے، زمین کے اندر نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود فی جو ظرف کے لئے آتا ہے اس کا استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ علیٰ سطحیت اور لفظ فی تعمق پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ نظرت علی الکتاب کتاب پر سطحی نظر کی اور نظر فی الکتاب کتاب میں تعمق سے نظر کی۔ اسی طرح یہاں ممکن ہے کہ لفظ فی لا کر اس طرف اشارہ ہو کہ زمین پر چلنا، پھرنا تعمق کے ساتھ ہو، محض سطحیت کے ساتھ نہ ہو، یعنی کائنات ارض میں غور کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و یکتائیت کی معرفت حاصل کرتا رہے، نیز عالم کے تغیر و فناء کو سوچتا رہے تاکہ اس عالم میں زیادہ انہماک نہ ہو جائے، واللہ اعلم۔

الغرض ارشاد ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر زمین میں پھیل جاؤ۔ سوال ہوتا ہے کہ کس چیز کے لئے زمین میں پھیل جائیں؟ تو ارشاد ہوتا ہے :

وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ (اللہ کے فضل تلاش کرنے کیلئے نکل جاؤ)۔

سوال ہوتا ہے کہ اللہ آپ کے فضل حاصل کرنے کے لئے ہی تو فضل کے گھر (مسجد) میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس سے بہتر اور کونسا فضل ہے کہ اس کے لئے آپ نکلنے کا حکم فرما رہے ہیں۔ ارے وہ روزی ہے روزی وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ، اللہ کے فضل یعنی روزی کو تلاش کرو۔ یعنی فضل سے مراد روزی ہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد تم یہاں مسجد میں کیا بیٹھے ہو۔ زمین پر چلو، پھرو اور روزی کی تلاش کرو۔ تم یہ سمجھے کہ نماز پڑھنا، تسبیح پڑھنا اور تلاوت کرنا بس یہی فضل کا چاہنا ہے، ارے روزی کا تلاش کرنا، چلنا پھرنا، ڈھونڈنا یہ بھی فضل یعنی عبادت ہی ہے۔ چلو، نکلو، جاؤ اور وَ ابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ اللہ کے فضل کو تلاش کرو۔

تلاشِ روزی کے حکم میں نکتہ :

اور یہ اس لئے فرمایا کہ مجھے بھول کر روزی تلاش نہ کرنے لگیں کیونکہ روزی کو تو ہر صورت میں تلاش کرنا ہی ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تجارت' زراعت' صنعت و حرفت' مزدوری وملازمت میں مجھے بھول کر روزی تلاش کرنے لگیں اور جب وہ حاصل ہو جائے تو اپنی سعی و کوشش کا نتیجہ سمجھ کر اپنے اوپر نظر ہونے لگے بلکہ اس کو بھی میرا فضل سمجھیں کیونکہ دل ودماغ اور عقل میری دی ہوئی ہے، ہاتھ، پیر اور سب اعضاء میرے دیئے ہوئے ہیں۔ تم نے اپنی کس چیز سے کمایا؟ یہ سمجھ کس کی دی ہوئی تھی؟ پھر تم نے جو کمایا ہے ارے فلاں شخص نے کیوں نہیں کمالیا؟ یہ بھی تو میرا فضل ہی ہے تو اپنی کوشش کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ قارون کی طرح اپنی جدوجہد' بھاگ دوڑ کا نتیجہ سمجھ بیٹھا، کیا تجھے معلوم نہیں پھر کیا حشر ہوا! جب قارون نے یہ سمجھا کہ یہ جو کچھ مال و دولت ہے میری کوشش اور میرے علم وفن کا ثمرہ ہے، اس میں دوسرے کسی کا کوئی سہارا نہیں نہ خالق کا، نہ کسی مخلوق کا، مجھے جو کمانے کا فن آتا ہے یہ میں نے اس سے حاصل کیا ہے۔ اچھا' یہ سمجھتا ہے، بس آ گیا قہرِ خداوندی' وہ خزانہ بھی گیا، خود بھی گیا، سب درہم برہم ہوگیا۔

لہٰذا معلوم ہوا جو کوئی چیز بھی ہمارے پاس ہے وہ تو کیا ہم خود بھی ذاتی طور اپنے نہیں' کسی اور ذات کی ملکیت ہیں۔ تو اب جو چیز ہمارے پاس ہے، وہ بالذات ہماری نہیں کسی اور کی ہے۔ چنانچہ جس شخص کی فہمِ سلیم اور عقلِ مستقیم اس بات پر جم جاوے گی اس کو کسی بھی کمالِ ظاہری وباطنی خواہ مالی ہو، یا جاہی ہو، جسمانی ہو، روحانی قوت ہو، دولتی قوت ہو یا شاہی وملکی قوت ہو یا گروہ بندی کی قوت ہو کہ ایسی ایسی جماعتیں (پارٹیاں) ہمارے ساتھ ہیں، ان کی قوتوں کے حاصل ہونے پر بھی فخر و اختیال نخوت و اترانا پن کبھی نہیں آ سکتا۔ اسی لئے اہل اللہ جن کو حقیقۃً اہل اللہ کہتے ہیں ان کے اندر کبھی تکبّر کا نام نہیں آ سکتا،

وہ تو ہر چیز کو ادھر ہی منسوب کرتے ہیں۔

کسی کمال پر کبھی نہ اترانا چاہئے :

علمی و عملی اور تقویٰ و پرہیزگاری کا کمال بھی آ گیا تو ان سب کمالات کو حقیقی مسبب الاسباب جان کر حق تعالیٰ کے طرف ہی منسوب کرتا ہے۔ اپنے کسی کمال کی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ عطاءِ خداوندی سمجھتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلب ہو جاوے (چھن جاوے) اس لئے ہر ایسی حرکت سے، ہر ایسے فعل سے، ایسے کلام و کام سے بچتا ہوا رہے گا جو حق تعالیٰ کی مرضی کے ذرّہ برابر بھی خلاف ہو کہ کہیں یہ خطا و قصور اس عطاءِ خداوندی کے سلب (چھن) جانے کا سبب نہ ہو جائے۔

کمال کے عارضی سلب ہونے میں حکمت :

اور بعض دفعہ وقتی طور پر کمال (عارضی) سلب ہو جاتا ہے مگر اس کا سبب ہمیشہ خطاء ہی نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ اس کو اپنی طرف پورا متوجہ رکھنے کے لئے سلب فرما دیتے ہیں کہ اپنی طرف اس کی نظر نہ جائے اور اپنے اوپر ذرّہ نظر نہ رکھنے پاوے بلکہ میری طرف ہی مزید نظر جمی رہے۔ حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ کو گڑھی پختہ والوں نے مدعو کیا، آپ تشریف لے گئے اور آپ جہاں جاتے تھے وعظ کا سوال پہلے ہوتا تھا کیونکہ اسی لئے بلایا جاتا تھا۔ چنانچہ وعظ کہنے کے لئے منبر پر بیٹھ گئے، خطبہ پڑھا اور بعد خطبہ آیت بھی پڑھ دی۔ اب اسی آیت کو بار بار پڑھ رہے ہیں لیکن مضمونِ وعظ بیان کے لئے ذہن شریف میں نہیں آتا۔ جب دو چار مرتبہ آیت پڑھنے کے بعد بھی مضمون ذہن میں نہیں آیا تو سوچا اور چاہا کہ پہلے وعظوں میں سے ہی کسی وعظ کو دہرا دوں مگر وہ بھی ذہن میں نہیں آتا۔ بالآخر منبر پر سے یہ کہہ کر اُتر آئے کہ اس وقت ذہن میں کوئی مضمون نہیں ہے۔ لہٰذا بیان نہیں ہوتا۔

تو حضرت والا کو قوتِ علمیہ وعملیہ نہایت وافر درجہ پر ماشاء اللہ حاصل تھی لیکن اس وقت قوتِ علمیہ وقتی طور پر جو سلب ہوگئی، اُس کا سبب کوئی خطاء نہیں بنا بلکہ بعض حضرات کاملین واکملین کو ذاتِ باری تعالیٰ اور زیادہ چاہتے ہیں اپنی چھاتی (سینہ) سے لگانا اور لگائے رکھنا کہ لگے ہوئے تو ہیں ہی مگر دائماً لگائے رکھنا منظور ومحبوب ہوتا ہے۔

کسی بھی حاصل شدہ کمال پر ناز وفخر کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ کمالات خود تمہارے ذاتی نہیں بلکہ عطاءِ خداوندی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ خطاء ہونے پر سلب ہو جائے اور باقی نہ رہے تو زوال کا اندیشہ ہو گیا۔

قناعت وکفایت دونوں کا خیال ضروری ہے :

نعمت آئی تو اترانا پن نہ ہونا چاہئے تھا بلکہ قناعت سے کام لینا اور جب ختم ہو جاتی تو کفایت شعاری سے کام لینا چاہئے تھا، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ دولت آئی تو اترا گیا اور لگا خوب خرچ کرنے اور جب ختم ہوگئی تو لگا مانگنے کہ قرض دیدو، بس نہ قناعت ہی اختیار کی اور نہ کفایت شعاری کہ تُل کر (بہت جانچ کر) خرچ کرتا۔ شادی ہوئی اس میں خوب خرچ کر دیا۔ اب ہاتھ خالی ہو گیا تو مانگتا پھرتا ہے۔

منگنی بھی شادی کی طرح ہونے لگی :

اب تو یہ حال ہے کہ منگنی میں بھی پچاس' سو آدمی بلائے جاتے ہیں۔ ابھی چند روز کی بات ہے ایک صاحب آئے کہہ رہے تھے کہ منگنی میں پچاس' سو آدمی بلائے ہیں' میں نے کہا کہ جس وقت بات چیت منگنی کی ہوئی تھی دو چار آدمی تو موجود ہوں گے، کہا جی ہاں موجود تھے مگر پھر پچاس سو آدمیوں کو لڑکی والے کی طرف سے بلا رہا ہے۔ اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہہ دوں، آج مسلمان کا مسلمان پر اعتبار نہیں رہا کیونکہ جس وقت بات چیت ہوئی تھی

دو چار آدمی تو آئے تھے مگر حالات ایسے ہوگئے کہ مسلمان کا مسلمان پر اعتبار نہیں رہا۔اس لئے بات پکی ہونے کے بعد پچاس سو آدمیوں کو بلا رہا ہے تاکہ کل کو پھر نہ جائے، اور عقیقہ میں بکرے تو دو ہی ذبح ہوں گے لیکن برادری کو کھانا کھلانا ہے،اس لئے لاؤ ایک کٹڑہ بھی ذبح کرالوں اور پھر پلاؤ وغیرہ بھی ہوجاوے۔تو دیکھئے عقیقہ کیا ہوا اچھی خاصی شادی ہوگئی۔

عقیقہ کی شرعی حیثیت :

حالانکہ عقیقہ کی شرعی حیثیت صرف اتنی ہے کہ ساتویں دن بچہ کا سر منڈوا دو اور بالوں کی مقدار چاندی خیرات کردو، وہ بھی جب کہ پاس ہو اگر اللہ نے زیادہ دیا ہے لڑکی کے لئے ایک بکرا اور لڑکے کے لئے دو بکرے ذبح کر کے قربانی کی طرح تین حصے کرلو۔ ایک خود رکھ لو، ایک غریبوں میں تقسیم کردو اور ایک اپنے عزیزوں کو تقسیم کردو۔

زمین میں پھیلنے کی تیسری وجہ :

یہاں سے ایک اور بات معلوم ہوگئی جو نماز پڑھ کر زمین میں نکلنے کی تیسری وجہ ہے، وہ یہ کہ یہ عالم، عالم الاسباب، یعنی یہاں ہر چیز کے حصول کو اسباب کے ساتھ متعلق کر دیا ہے، پس ان اسباب کو جو کسی چیز کے حاصل کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے مقرر فرمادیئے ہیں، ان اسبابِ صحیحہ، جائزہ کو اختیار کرو، پھر کامیابی کی اُمید رکھو، تو جس طرح مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آنا فضلِ الٰہی ہے اسی طرح روزی کمانے کے لئے مسجد سے نکل جانا بھی فضلِ الٰہی ہے۔اسی طرح جائز طرح کمانے میں بھی ہاتھ، پاؤں، آنکھ، زبان کا ہلانا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور عبادت ہے، اجرِ عظیم ہے۔

فنا فی اللہ کا مفہوم :

ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر نظر رکھنا، اپنے ہاتھ، پیر، دماغ و عقل وغیرہ پر نظر رکھنے کو

پھینک دینا بس اللہ تعالیٰ پر نظر رکھنا اسی کا نام صوفیہ کی اصطلاح میں فنائیت ہے، اسی کو مٹائیت کہتے ہیں، یہ تمام نکتے فضل اللہ سے نکل رہے ہیں، دیکھئے کس طرح اپنے اوپر سے نظر ہٹادی کیسا ہی کمالِ جسمانی، کمالِ علمی، کمالِ عملی، کمالِ مالی، کمالِ دولتی، کمالِ ملکی ہو، ان سب سے نظر اُٹھا دینا چاہئے، اپنے کو فنائیت کے گھاٹ اُتار دیا، اپنے کو مٹیت کے اندر لے لیا، مٹی پن آ گیا، اپنے اوپر سے نظر ہٹالی، اسی کا نام فناء ہے اور اس بیچارہ کو اس فناء پر بھی نظر نہیں، اسی کو فناء الفناء کہا جاتا ہے۔

فناء کی حقیقت :

فناء کی حقیقت یہ ہے کہ تمہارا نفس جو شیطان کے ساتھ مل کر کہ نفس بادشاہ اور شیطان وزیر ہے یہ دونوں مل کر حق تعالیٰ کے حکم کے خلاف سبق پڑھاتے ہیں۔ یہ مخالفت نہ رہے، بس مرضی حق تعالیٰ کی رہ جاوے اور کام کرنے اور کلام کرنے سے پہلے سوچ لے کہ اس کام اور کلام میں حق تعالیٰ کی مرضی ہے یا نہیں، اگر ہو تو بولو اور کرو اور نہ ہو تو نہ بولو اور نہ کرو، جب ایسا ہو گیا تو فناء آ گئی۔ یہ ہے فناء کی حقیقت۔

اسلام رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا :

یہاں سے عوام کے اس اعتراض کا جواب نکل آیا جو مولویوں پر کیا جاتا ہے کہ یہ تو چاہتے ہیں کہ بس راہب بن کر مسجد میں بیٹھ جائیں۔ بھلا ایسا کوئی مولوی کہہ سکتا ہے؟ حق تعالیٰ تو یوں فرمائیں کہ نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں روزی تلاش کرنے کے لئے پھیل جاؤ اور مولوی اس کے خلاف کہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کوئی سیاحی مولوی ہو گا تو کہہ دے گا، حقیقی مولوی ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ سیاحی، عطائی مولوی کو کہتے ہیں جو گھر بیٹھے کتابیں دیکھ کر بلا استاذ پڑھے بیچارہ مولوی بن گیا ہو گا، وہ تو ایسی بات کہے تو کہہ دے یہ تو مولوی

نہیں ہے، یہ تو مولا والا نہیں ہے، ہاں مُولی والا ہے۔ "بات سمجھ میں آئی"۔

آپ مُولی جانتے ہیں (ایک سبزی ہے) مولوی میں مولیٰ بمعنیٰ اللہ اور یا نسبتی جیسے افریقی میں یاء نسبتی (افریقہ والا) اسی طرح مولوی اللہ والا اور مُولَوی (مُولی والا)۔ ایسے سیاح، عطائی کو تم نے خواہ مخواہ مولوی سمجھ لیا جہاں کسی نے لچھے دار تقریر کی مشق کی اس طرح کہ بس اس کی تقریر سنتے ہی رہو، کبھی تڑپا رہا ہے، کبھی ہنسا رہا ہے، کبھی رُلا رہا ہے، کبھی بڑے دلکش آواز کے ساتھ نعتیں پڑھ رہا ہے، خوب واہ واہ ہو رہی ہے اور جب وہاں سے اُٹھ کر آئے تو جیسے آئے تھے ویسے ہی خالی چلے گئے۔ کوئی چائے پلانے میں لگا ہوا ہے، کوئی شربت پلانے میں لگا ہوا ہے، کوئی مجلس کی آرائش میں لگا ہوا ہے، کوئی خیموں کے اندر لگا ہوا ہے، کوئی دیکھ بھال میں لگا ہوا ہے، جب مجلس ختم ہو گئی تو جس نے بلایا تھا انتظام کے عمدہ ہونے کی وجہ سے اس کی واہ، واہ ہو گئی، نعتیں وغیرہ پڑھنے والوں کی بھی واہ، واہ ہو گئی۔ تقریر کرنے والے کی بھی واہ، واہ ہو گئی اور آمد و رفت کے کرایہ کے علاوہ کچھ اور بھی مل گیا، جیسا داعی ہو، اپنی حیثیت کے موافق کرایہ سے زائد ہی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو گیا۔

وعظ کا مقصد اور نیت کا ثمرہ :

مگر وعظ کا جو مقصد ہے یعنی دینی فائدہ ہو، دنیا سے دل ہٹے اور آخرت کی طرف راغب ہو، وہ کسی کو حاصل نہ ہوا، بلانے والا بھی شہرت اور ناموری کے لئے بلاتا ہے، اس کو بھی دنیوی فائدہ تو چاہے ہو گیا لیکن آخرت کا ثواب نہ ملا کیونکہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں :

اِنّما الاعمالُ بالنیات و انما لامرء مانوی۔ (مشکوٰۃ شریف ۱/۱۱)

بس اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور بس ہر شخص کو وہی ملے گا جو اُس نے نیت کی

ہے۔

یعنی رسولِ مقبول ﷺ فرماتے ہیں کہ تمام کاموں میں نیت کا اعتبار ہے اگر نیت اچھی ہوگی تو ثواب ملے گا ورنہ نہیں۔ یہاں تک کہ ہجرت جو ابتداءِ اسلام میں بہت بڑا عمل تھا اس کی بھی یہی حالت ہے۔ چنانچہ آگے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں :

فمن کان هجرته الی الله و رسوله فهجرته الی الله و رسوله و من کان هجرته الیٰ دنیا یصیبها او امرء ة یتزوجها فهجرته الی ما هاجر الیه.

(متفق علیه (مشکوٰة : ۱/۱۱)

سو جس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے (یعنی یہ ہجرت لائقِ مدح ہے) اور جس کی ہجرت کسی دنیا کی طرف ہے کہ وہ اس کو مل جائے یا کسی عورت کی طرف ہے کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اس چیز کی طرف ہے جس کی ہجرت میں نیت کی ہے۔

مطلب ظاہر ہے کہ ہجرت جیسے نیک عمل میں بھی ثواب اسی وقت ملے گا جبکہ اللہ اور رسول کی خوشنودی کے لئے یہ عمل کیا ہے ورنہ ہرگز ثواب نہ ملے گا۔ دوسرے اعمالِ خیر کا بھی یہی حال ہے مثلاً کوئی شخص اللہ کے لئے مسجد بنواتا ہے یا کوئی شادی کے بعد سنتِ رسول سمجھ کر ولیمہ کرتا ہے تو بے انتہا ثواب ہے اور اگر شہرت و ناموری کے لئے ایسا کرتا ہے تو اُلٹا گناہ ہوا۔

الغرض اللہ تو یہ فرماویں کہ نماز پڑھ کر زمین میں پھیل جاؤ اور روزی کماؤ، حق تعالیٰ کا فضل سمجھتے ہوئے۔ جب مولیٰ (اللہ تعالیٰ) یہ کہہ رہا ہے تو بھلا کوئی مولوی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ راہب بن جاؤ؟ مسجد میں بیٹھے رہو؟ فهو یتهمنا (وہ ہم کو بہتان دیتا ہے) اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف کرے۔

روزی کمانا اور اللہ کی یاد :

لیکن یہ نکلنا اس روزی کے لئے ہو جو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کیونکہ وابتغوا من فضل اللّٰہ فرمایا گیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ یہ روزی کمانا اللہ کا فضل ہے تو حق تعالیٰ خود آگے ارشاد فرماتے ہیں: واذکروا اللّٰہ کثیرًا یعنی روزی کمانا جو اللہ کا فضل ہے، اس میں ایسے مت لگ جانا کہ مجھے بھول جاؤ اور جس طرح چاہو کمانے لگو، پھر وہ اللہ کا فضل کہاں رہے گا کہ نہ جائز کا خیال رکھا نہ ناجائز کا، نہ حلال کا خیال رکھا نہ حرام کا اور اس کمانے میں ایسا لگا کہ جب اس کے بعد نماز کا وقت آیا تو اس کا اس کمانے کے اندر بھی خیال نہ رکھا۔

یاد کی حقیقت :

اور جب تم اللہ کے فضل یعنی روزی کمانے میں لگو تو ایسے مت لگ جانا کہ اللہ کی یاد جو دل میں ہوتی ہے وہ بھی نہ رہے بلکہ کثرت سے اُس کی یاد دل میں رہے، جس کا یہ اثر ہو کہ حلال و حرام کا خیال رہے، جائز و ناجائز کا خیال رہے۔ اور اللہ کی یاد دل میں اس وقت جمے گی جبکہ نمازوں کو نمازوں کے اوقات میں صحیح طریقہ سے، کہ نمازوں کے جو آداب ہیں ان کے ساتھ اہتمام سے ادا کی جائیں۔

نماز جامعِ اذکار و عبادت ہے :

کیونکہ نماز جامعِ اذکار ہے، وہاں تسبیح بھی ہے، وہاں تحمید بھی ہے، وہاں تکبیر بھی ہے، وہاں ہاتھوں کو کانوں تک اُٹھا کر اس اشارہ کا یہ مطلب ہے کہ میں اس وقت دنیا کے تعلق اور دنیا کی محبت کو دل سے نکال کر پشت کے پیچھے پھینک رہا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ نے کلمۂ لا الٰہ الّا اللّٰہ نفی و اثبات تعلیم فرمایا تھا، دنیا کو اب عملاً اس کو کر کے دکھلا رہا ہوں، اب

میں نے دنیا کے تعلق و محبت کو دل سے نکال کر پھینک کر میں نے اپنے نفس کو پکڑ لیا ہے۔ لطیفۂ نفس ناف کے نیچے ہے، اسی جگہ ہاتھ باندھے جاتے ہیں تو اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ نفس کو پکڑ لیا، کہیں لوٹ کر نہ آ جاوے، اللہ تعالیٰ کا نام لینا شروع کر دیا۔ اللہ اکبر، تسبیح شروع کر دی، سبحان اللہ تحمید شروع کر دی الحمد للہ پھر القاب و آدابِ ذکر کرنا شروع کر دیئے، الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین ایاک نعبد پھر مانگنا شروع کر دیا و ایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و لا الضالین۔

جب کسی کو درخواست دیتے ہیں تو پہلے مدح و ثنا ہوتی ہے، القاب و آداب ہوتے ہیں، اسی فطری طریقہ کا حق تعالیٰ نے نماز کے اندر حکم صادر فرمایا ہے۔ اور ایاک نستعین میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سب کچھ تحمید و القاب اور عبادت سب آپ کی مدد کے ساتھ ہیں، آپ کی مدد کے بغیر مجھ سے کوئی عمل نہیں ہو سکتا، یہ جو کچھ ہو رہا ہے آپ کی مدد شاملِ حال ہے، عبادت بھی آپ کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے ایاک نعبد کے بعد و ایاک نستعین ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ عبادت بھی آپ کی مدد سے ہو رہی ہے، آپ کی مدد نہ ہو تو کوئی عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔

ایاک نعبد میں ایک نکتہ :

اس کے بعد علماء اور طلبہ کے سمجھنے کا ایک نکتہ بیان کرتا ہوں۔ یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تب تو ایاک نعبد و ایاک نستعین جمع کا صیغہ لانا درست ہے کہ امام کے ساتھ نماز میں بہت سے شریک ہیں، لہٰذا امام سب کی طرف سے درخواست کر رہا ہے لیکن جب تنہا نماز پڑھ رہا ہے تو اس وقت تو تنہا ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین کے بجائے واحد کا صیغہ پڑھنا چاہئے تھا۔ انفرادی حالت میں جمع

کا صیغہ کیوں لایا گیا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اکیلے نہیں ہیں ہمارے ساتھ روح بھی ہے، دل بھی شریک ہے، اس عبادت میں زبان بھی شریک ہے، ہاتھ بھی شریک ہیں، پیر بھی شریک ہیں، نیز اس عبادت میں مال بھی شریک، کپڑے بھی شریک کہ اس میں پیسہ خرچ کیا ہے۔ تو بندہ اس سارے مجموعے کو اللہ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ سو اس تمام مجموعے کو ازسرتاپیر اللہ کے سامنے پیش کر کے عبادت کر رہا ہے۔ اور چونکہ ایسی عبادت کوئی معمولی چیز نہیں ہے اس لئے ایاک نستعین میں اللہ تعالیٰ سے مدد چاہ رہا ہے کہ اے اللہ! ایسی عبادت کی توفیق بھی آپ ہی دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایاک نعبد میں ایاک باوجودیکہ مفعول بہٖ ہے جس کا حق فعل سے مؤخر ہونے کا ہے مگر یہاں تقدیم مفعول حصر کے لئے ہے یعنی صرف آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور چونکہ ایسی عبادت بلا صراط مستقیم کے نہیں ہو سکتی، اس لئے آگے صراط مستقیم کی ہدایت مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! سیدھے راستہ پر چلا، بالکل ٹھیک ٹھاک صحیح راستہ، اس راستہ پر سے کہیں ڈگمگا نہ جاؤں، اس طرح کہ نہ آنکھ غلطی کرنے پائے نہ زبان، نہ کان، نہ دل، نہ ہاتھ، نہ پیر۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو عبادت میں لگانے کے لئے پھر سوچنا نہ پڑے، دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ پھر سوچنا نہ پڑے، سوچا سچا یا دل میں بیٹھ جائے، اے اللہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ صراطِ مستقیم پر آخری دم تک قائم رہوں۔

صراطِ مستقیم پر کون ہیں:

یوں کہنے کو تو سب کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی صحیح راستہ پر ہیں لیکن میری عرض یہ ہے کہ جن لوگوں پر آپ کا خاص انعام ہوا ہے، ان کے راستہ پر چلایئے کیونکہ آپ کے انعام فرمانے کی وجہ سے معلوم ہو گیا کہ صحیح اور سیدھا راستہ انہی لوگوں کا ہے، اسی لئے آگے بدل لا کر عرض کرتے ہیں صراط الذین انعمت علیھم، جن پر آپ کی نعمتیں ہوئی ہیں

ان کا راستہ مانگتا ہوں جن کا بیان دوسری آیت میں ہے :

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۔

جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی نبیوں کے ساتھ، صدیقوں کے ساتھ، شہداء کے ساتھ اور صالحین کے ساتھ۔

یعنی ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ کے انعامات ہوتے رہے ہیں۔ وہ راستہ صراطِ مستقیم نہیں جس کے متعلق یہود و نصاریٰ بھی کہتے تھے کہ ہمارا راستہ صراطِ مستقیم ہے، اس کی تو میں نفی کر رہا ہوں۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔ ان کا راستہ نہیں جن پر آپ کا غضب نازل ہوا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم بھی صحیح راستہ پر ہیں یعنی یہودی اور نہ ان کا راستہ جو گمراہ ہیں یعنی نصاریٰ، بلکہ ان کا راستہ مطلوب ہے جو آپ کے محبوب ہیں، جن پر آپ کی نعمتیں ہوتی رہتی ہیں، یہودیوں والا، نصرانیوں والا، مشرکوں والا راستہ نہیں چاہئے۔ پھر آخر میں کہتا ہے آمین اے اللہ ! اس دعا کو قبول فرمالیجئے۔ ایمان پر قائم ہو گیا پھر چاہے ذہن میں یہ تفصیل رہے یا نہ رہے مگر جماؤ کے بعد اسی خیال کے ساتھ عبادت ہوتی ہے۔

ظاہری پاکی میں شبہ اور اس کا علاج :

ایک بات کی طرف ذہن منتقل ہو گیا وہ یہ کہ جو واقعی صوفی ہیں، جنہوں نے باطن کی صفائی کر لی ہے، خواہ مخواہ بعض اوقات ان کے پاس بھی شیطان آجاتا ہے اور ان کو ظاہری پاکی کے وساوس میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایک ظاہری پاکی ہوتی ہے، وضو، غسل وغیرہ اور ایک باطنی پاکی ہوتی ہے یعنی ریا وغیرہ سے قلب کو پاک کرنا۔ تو ظاہری پاکی میں بعض

وقت بڑی فضیحت ہوجاتی ہے، لوٹے پر لوٹے خرچ ہوجاتے ہیں مگر استنجاء اور وضو ہی نہیں ہوتا۔ یوں کہتا ہے کہ ابھی پاک ہی نہیں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اگر پاک نہیں ہوا تو آخر کیوں؟ شریعت کا تو یہی حکم ہے کہ ایک دفعہ نہیں تو دو دفعہ دھولو، بس کافی ہے اور اللہ کا رحم دیکھو کہ تم کو رسول اللہ ﷺ کی اُمت میں سے بنایا ورنہ پہلی اُمتوں میں تو ناپاکی کی جگہ قینچی سے کاٹنے کا حکم تھا۔ شریعت کے مقابلہ میں اپنی طبیعت چلاتا ہے، یہ تو اپنی طبیعت کو شریعت کے مقابلہ میں چلا کر ایک گونہ اعتراض کر رہا ہے۔ تو کیا تو یہ چاہتا ہے کہ جس طرح اُمتوں پر سختی کی گئی تھی کہ بلا کاٹے پاک ہی نہ ہوتا تھا، اُمتِ محمدیہ کو بھی توبہ توبہ یہی حکم دیا جاتا؟ کیا حق تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ تو نے میرے رحم کی اچھی قدر کی؟ بعضوں کو یہ وہم ہوجاتا ہے کہ کپڑے پر سے ابھی دھبّہ تو چھوٹا ہی نہیں، پھر پاک کس طرح ہو؟ اگر دھبّہ نہیں چھوٹتا نہ چھوٹے، شریعت نے دھبّہ چھٹانے کا مکلّف نہیں کیا۔ تین مرتبہ دھولیا، بس پاک صاف ہوگیا، جاؤ جا کے نماز پڑھو۔ ورنہ تو رحمٰن کے مقابلہ میں شیطان آ گیا، کہ وہم وشبہ میں ڈال کر جماعت سے روک رہا ہے۔ بعضوں کو پیشاب کے قطرہ کا شبہ ہوجاتا ہے کہ پیشاب سے فارغ ہی نہیں ہوتے۔ جہاں فارغ ہوئے جھٹ قطرہ آنے کا شبہ ہوگیا، پھر بعض کو قضاءِ حاجت کے بعد استنجاء کرنے میں شبہ ہوجاتا ہے کہ لوٹے پر لوٹے خرچ کر رہا ہے، مگر استنجاء ہی نہیں ہوتا، وہاں جماعت جارہی ہے، مگر صوفی صاحب کی پاکی ہی نہیں ہورہی ہے۔ ان صوفیوں کو حلال وحرام میں شبہ نہیں ہوتا۔ حلال وحرام میں وہم میں نہیں پڑتے، حرام ومشتبہ تو چھوڑ رکھا ہے، روزی حلال وطیّب ہے؟ مگر انہیں پاکی ناپاکی میں شبہ ہوتا ہے، نہارہے ہیں مگر غسل ہی ختم نہیں ہوتا۔

ایک وہمی کی حکایت:

ایک صاحب رئیس آدمی تھے اور رئیس ہونے کے باوجود بیچارے متقی قسم کے

آدمی تھے۔ نہا کر غسل خانہ سے کپڑے پہن کر باہر آئے آ کر بیٹھ گئے، ذہن وہم کی طرف چلا، نوکر کو آواز دی، نوکر آ گیا، کہا کہ غسل خانہ میں پانی رکھو، مجھے شبہ ہو گیا ہے، دوبارہ غسل خانہ میں گئے وہ کپڑے جو ابھی پہنے تھے، اُتار دیئے دوبارہ نہائے اور دوسرے کپڑے پہن کر پھر باہر آ گئے، آتے ہی پھر شبہ اور وہم آ گیا، آواز دے رہے ہیں، فلانے، نوکر فوراً آیا، اس سے کہا کہ پانی رکھو، مجھے شبہ ہو گیا ہے، اسی طرح کئی کئی مرتبہ ہوتا تھا، اسی طرح ان کا وضو بھی کئی کئی بڑے بڑے لوٹوں سے ہوتا تھا۔ جب تھانہ بھون حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں آنا جانا ہوا، اور حضرت کی باتیں سُنی تو سب وہم چلا گیا۔ ایک چھوٹے سے لوٹے سے وضو ہو جاتا تھا، اور غسل خانہ سے ایک دفعہ ہی غسل کر کے نکل آتے تھے۔

تو ایسے صوفیوں کو ظاہری ناپاکی اور باطنی ناپاکی میں بہت شبہ ہوتا ہے، ظاہری کا تو بیان ہو گیا اور باطنی وہ اخلاص وریا ہے کہ ایک کام دین کا کیا، اب ٹٹول رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں مخلوق کی طرف خیال جا کر میرے اخلاص میں فرق آ گیا ہو، کہیں ریا نہ ہو گیا ہو، اب بے چین اور پریشان ہو گیا۔

باطنی پاکی میں شبہ کی چند مثالیں :

ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا رکوع اور سجدہ اس طرح کر رہا تھا، اتنے میں ایک شخص آ گیا اور آ کر دیکھ رہا تھا خیال آیا کہ کہیں ریا نہ ہو گیا ہو، یا مثلاً ذکر کر رہا تھا ایک شخص وہاں سے گزرا یا آ کر بیٹھ گیا، وہ اس کے ذکر کو دیکھ رہا تھا، خیال آیا کہ کہیں ریا نہ ہو گیا ہو۔ یا تلاوتِ کلام اللہ اچھی آواز سے کر رہا تھا ایک شخص سن رہا تھا، خیال آیا کہ کہیں ریا نہ ہو گیا ہو۔ یہ ریا کا خیال اس کو پریشان کر رہا ہے۔ جیسے اس کو ظاہری پاکی ناپاکی میں شبہ ہو رہا تھا۔ اسی طرح باطنی پاکی ناپاکی ریا و اخلاص میں شبہ ہو رہا ہے، وہ کسی محقق کے پاس بیٹھ کر حقیقتِ اخلاص وریا کو ہی نہیں سمجھا۔ اخلاص وریا دونوں چیزیں اختیاری ہیں کیونکہ اخلاص

کی تحصیل کا حکم ہے اور ریا کے ازالہ کا حکم ہے اور جس چیز کا حکم ہوتا ہے، وہ اختیاری ہے، تو اخلاص کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دیکھ کہ تو نے اپنے ارادۂ اختیاری قلبی سے اس شخص کے دل میں اعزاز و وقعت حاصل ہونے کے لئے اپنی عظمت اس کے دل میں بٹھانے کے لئے اور اس لئے کہ دست بوسی قدم بوسی ہونے لگے، تو یہ تیری نیت تھی یا نہیں؟ اب وہ سوچنے بیٹھ گیا۔ یہ معلوم ہوا کہ میری نیت' میرا ارادہ ان باتوں میں سے کسی چیز کی طرف تھا ہی نہیں۔ اگر چہ اس وقت رضائے باری تعالیٰ کی نیت کا استحضار بھی نہیں تھا، تب بھی ریا نہ تھی، رضاءِ الٰہی حاصل تھی۔

الغرض اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ یہ خیال ریا نہیں ہے، جب ریا نہیں ہے تو اس کے بالمقابل وہ اخلاص ہے، جب ایک ضد گئی تو اس کے مقابل دوسری ضد آ گئی۔ پس معلوم ہوا کہ اخلاص بلاشبہ حاصل ہے۔

اعلیٰ درجہ کا آلہ و سبب ادنیٰ درجہ ہی ہے:

رضاءِ الٰہی کی نیت کے استحضار کے ساتھ نیک کام کرنا یہ اخلاص کا اعلیٰ درجہ ہے مگر اس اعلیٰ (بالعین) کا آلہ (بالالف) وہی پہلا درجہ ازالۂ درجہ ہے تو ازالۂ ریا جو اخلاص کا ادنیٰ درجہ ہے یہ آلہ (ذریعہ) ہے اعلیٰ درجۂ اخلاص ہونے کا۔ سمجھے، یہ فقیر کی باتیں ہیں، خدا کرے کہ سمجھ میں آ جائیں۔ جیسے یہ بلب روشنی کا آلہ ہے اس کے جلنے سے روشنی ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ دفعِ ریا آلہ ہے اخلاص کے اعلیٰ درجہ حاصل ہونے کا۔ دفعِ ریا یہ روشنی ہے جو اخلاص کے اعلیٰ درجہ کی طرف راستہ دکھائے گی۔

روزی کمانے کے لئے اللہ تعالیٰ کا فضل ہے نکل گئے، اب چاہے اس کے فضل ہونے کا استحضار ہے یا نہیں، لیکن وہ روزی کی تلاش و طلب میں حلال و حرام کا لحاظ و خیال رکھ کر حلال روزی کمار ہا ہے، جائز ناجائز کا خیال رکھ کر جائز روزی کمار ہا ہے، کہیں دوسرے

کا مال میرے پاس نہ آجاوے، اس کا خیال رکھ کر کما رہا ہے، اب چاہے رضاء کا استحضار، ذاتِ باری تعالیٰ کی یاد کا دل میں ہونا اور رہنا اس کا خیال ہے یا نہیں، بہرصورت اخلاص و رضا حاصل ہے، اگرچہ دل میں یاد کا استحضار نہیں ہے کیونکہ جو مقصود تھا، وہ حاصل ہے یعنی حلال کمانا اور دوسرے کا مال محفوظ رکھنا، دوسرے کا خواہ مخواہ دل نہ دکھانا، جس کا اللہ نے حکم کیا ہے وہ حاصل ہے، تو رضا حاصل ہے، یہ یادِ الٰہی کا دل میں بٹھانا اسی لئے تو تھا کہ حکمِ الٰہی کے موافق کام ہوتا رہے۔ یہ یادِ الٰہی اور ذکر لسانی تو مقصود کا ذریعہ تھا، یہ ذکر بالذات مقصود نہیں۔

اگر ہر وقت ذکر مقصود بالذات ہوتا تو تمام مسلمان جو یادِ الٰہی سے خالی ہیں لیکن کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق کرتے ہیں، ایسے تمام مسلمان گنہگار ہوں گے۔ مقصود تو ذاتِ باری تعالیٰ کی صحیح طاعت پر لگا رہنا ہے، ذِکر اس مقصود کا ایک ذریعہ ہے۔

روزی کمانے میں جائز ناجائز کا خیال رکھنا اور حلال و حرام کا خیال رکھنا اور اس طرح خیال رکھنا کہ دوسرے وقت میں جو نماز کا حکم آنے والا ہے، اس کو نہ بھول جانا، جب اگلے وقت کی نماز کا خیال دل میں ہے تو اب اس کمانے سے کہ یہ بھی عبادت ہے دوسری نماز تک جو وقت گزر رہا ہے یہ سب نماز ہی کے حکم میں ہے، تم اس وقت بھی نماز ہی کے اندر ہو۔ حدیث شریف ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

المرء فی الصّلوة ما دام ینتظر الصلوة فذالکم الرباط ، فذالکم الرباط ، فذالکم الرباط. (ھکذا معنیً فی ریاض الصالحین ص۱۸۷)

ترجمہ : آدمی نماز میں ہے جب تک نماز کے انتظار میں ہے، یہی رِباط ہے، یہی رِباط ہے، یہی رِباط ہے۔

رِباط کے معنی ہیں انتظارِ صلوٰۃ کے، یعنی نماز کے انتظار میں رہنا بھی حکماً نماز میں

ہنا ہے تو بالمعنیٰ نماز میں رہتے ہوئے زراعت کررہا ہے، تجارت کررہا ہے مگر شرط یہ ہے کہ دل میں یہی ہے کہ کہیں وقت نہ نکل جائے، کہیں نماز نہ نکل جائے، تو اس کھیتی کے وقت ور تجارت کے وقت میں بھی نماز ہی میں ہے۔

جب یہ مؤمن نفسِ ایمان کو ترقی دیتے ہوئے تعلق مع اللہ کے اس خاص درجہ کو پہنچ گیا جس کو اوپر بیان کیا گیا تو اب یہ مؤمنِ کامل اور دیندارِ کامل ہوگیا، اسی کا نام ولی ہے، گو پہلے بھی نفسِ ایمان والے کا نام ولی تھا لیکن کامل ولی نہیں، ناقص ولی، انقص ولی تھا، جیسے دنیوی نقطۂ نظر سے کسی کے پاس ایک روپیہ ہے تو لغتہً تو وہ مالدار ہے، مگر عرفاً اس کو مالدار نہیں کہا جاتا۔ تو ایسے ہی مالدار من حیث تصحیح العقائد ایمان تو ہے لیکن ایمان مالدار نہیں یعنی ایمانِ کامل نہیں۔

اس تفصیل کے بعد آگے ارشاد ہوتا ہے: **لعلکم تفلحون** ۔ یہ تمام ہونے کے بعد اب تم اُمید رکھو کہ پورے کامیاب ہو ، **لَعَلَّ** اُمید کے لئے آتا ہے اور فلاح کے معنیٰ کامیابی کے ہیں اور کامیابی صلاح کے بعد ہوتی ہے اور صلاحیت کی وہ باتیں ہیں جو اوپر بیان کی گئیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ تجارت اور کوئی دنیوی کام آخرت سے غافل نہ کرے۔ جب یہ درستگی آجائے گی تو اُمید رکھو، ادھوری کامیابی کی نہیں، پوری کامیابی کی۔

کمالِ ایمان مطلوب ہے :

کامل مؤمن ہونا مطلوب ہے اور کامل کامیابی کے لئے کامل ایمان شرط ہے۔ بھلا کوئی ناقص کامیابی چاہتا ہے؟ کسی نے ایک لاکھ روپیہ تجارت میں لگایا اور ایک لاکھ ہی واپس آگیا یا ایک روپیہ اوپر ایک لاکھ واپس آگیا تو اس کو کوئی کامیابی نہیں کہے گا۔ ہاں یہ کامیابی ہے کہ ایک لاکھ تجارت میں لگایا اور ایک لاکھ زاید ہو کر دو لاکھ آگیا تو اس کو کامیابی کہا جائے گا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہم کو عالمِ ارواح سے تجارت آخرت کے لئے بھیجا ہے، تو

تجارتِ آخرت کے لئے نفسِ ایمان کے ساتھ جب ایمان کے تقاضے کے ساتھ وہ با
ہوں گی جو ابھی عرض کی گئیں تو وہ تجارتِ آخرت ایمانِ کامل کے ساتھ کامیابی اور پو
کامیابی ہے۔

قرآن میں خود ایمان کی تکمیل کو تجارت کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ چنا
ارشاد ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ
(پ۲۸، ع

اے ایمان والو ! کیا میں تم کو ایسی تجارت نہ بتادوں جو تم کو دردناک عذا
سے نجات دے۔

یہ خطاب مؤمنوں کو ہے یا کافروں کو؟ ظاہر ہے کہ مؤمنوں کو ہے تو جب
مؤمن ہیں تو دردناک عذاب سے بچنے کی کیا بات ہے؟ مؤمن تو وہ ہیں ہی ایمان لا چکے
پھر دردناک عذاب سے بچنے کو، اسی لئے تو فرمایا گیا کہ ابھی کامل مؤمن نہیں ہے، اس
پوری کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ ابھی تو اسے تجارت کرنا ہے، وہ باتیں بجالانا ہیں جو ایما
کے تقاضے ہیں، ان کو آگے ارشاد فرماتے ہیں :

تؤمنون باللّٰہ و رسولہ۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا تو پہلے ہے، دونوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔
اللہ پر تو ایمان لے آیا مگر رسول پر ایمان نہیں لایا تو ابھی یہ مؤمن نہیں ہوا۔

دین کے راستہ میں جان و مال دونوں مطلوب ہیں :

اس کے بعد فرماتے ہیں: وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۔
اور اللہ کے راستہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ خوب کوشش کرو، اس کوشش کرنے کو

پانا کہتے ہیں۔ جیسے دنیوی تجارت میں اپنے آپ کو کھپاتا ہے کبھی آگرہ جارہا ہے، کہیں
شام جارہا ہے، کبھی دہلی جارہا ہے وغیرہ وغیرہ اور اپنا مال ساتھ لئے جارہا ہے تو اپنے مال و
جان کو تجارتِ دنیوی میں استعمال کرتا ہے اسی طرح تجاھدون فی سبیل الله، اللہ کے
راستہ میں اللہ نے جس راستہ میں چلنے کا حکم کیا ہے، اپنے آپ کو کھپادو، جان کو کھپادو جب
کامیابی ہے۔

قرآنِ پاک بھی ذکر ہی ہے :

ذکر کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے : واذکروا اللّٰہ کثیرا ۔اللہ کا
کثرت کے ساتھ ذکر کرو، ادھر قرآنِ پاک بھی ذکر ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (پ۱۴، ع۱)

بلاشبہ ہم نے ذکر قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآنِ پاک کی تلاوت اور اس کو سمجھنا ذکر ہے تو اس قرآنِ
پاک کو کثرت کے ساتھ حاصل کرنا ہے۔ حروف کو صحیح طور سے حاصل کرنے کے اعتبار سے
صحیح معنی کو کثرت سے جاننے کی حیثیت سے، احکام کو کثرت سے صحیح پہچاننے کی حیثیت
سے اور ان سب کو صحیح اور پورے طریقہ سے عمل میں لانے کی حیثیت سے۔ نصائح کو غور
سے سننے اور عمل کرنے کی حیثیت سے کہ جگہ جگہ کفار و مومنین کو قرآن کھٹکھٹاتا رہتا ہے،
ایک جگہ ارشاد ہے :

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ۔
(الرعد:۲۶)

اور یہ لوگ دنیوی زندگی پر اتراتے ہیں حالانکہ دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے
میں بس ایک حقیر سا سودا ہے۔

کہیں ارشاد ہے :

اِعۡمَلُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَا

فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ ۔(پ۲۷،ع۱۹)

یعنی جان لو بس دنیوی زندگی کھیل، کود اور زینت وزیبائش ہے اور ایک دوسر

پر فخر کرنا ہے اور مال واولاد میں بڑائی جتلانا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے :

فَمَا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیۡلٌ ۔(پ۱۰،ع۱۲)

کہ دنیوی زندگی اُخروی زندگی کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہے، چندروزہ ہے

پس مؤمن کی شان سے اس متاع قلیل پر کفایت وقناعت نہیں ہے۔اس متا

قلیل پر مؤمن کی آخرت کے مقابلہ میں نظر نہیں ہے۔

اعجازِ قرآن نبوت کی دلیل ہے :

قرآنِ پاک کا اعجاز دلالۃً قبولیتِ نبوت کے لئے مؤمن کو کافی ہے۔قرآنِ پاک

کا اعجاز یعنی اس کے سامنے تمام فصحاءِ عرب نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہہ دیا کہ قرآنِ پاک

اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے اور ہم عاجز ہیں ایسا کلام نہیں بنا سکتے تو ان پر ایمان لانے والو

کے لئے مؤمنوں کے واسطے دلالت اعجازِ قرآن ثبوتِ نبوت محمد ﷺ کے لئے کافی ہے

جب رسول اللہ ﷺ پر ان کا ایمان ہوگیا اور قرآن کا کلام اللہ ہونا معلوم ہوگیا تو دنیا

متاع قلیل ہونا ان کی سمجھ میں آ کر دنیا نظر انداز ہوگئی اور ان کی نظر آخرت پر ہی لگ گئی تو

آخرت کی تجارت کے اندر ہی لگ گئے، پھر وہ قرآنِ پاک کے اندر جن اعمالِ صالحہ کا ذ

کیا ہے، اس میں لگ گئے۔اس طرح کہ منہی عنہا سے رُک گئے۔ظاہری منہی عنہا کو بھ

چھوڑ دیا اور باطنی منہی عنہا کو بھی ترک کر دیا، جس طرح انہوں نے شراب پینا چھوڑا، ا

طرح ریا و تکبر کو بھی چھوڑ دیا اور اعمالِ صالحہ کو بجالانے لگے اور ان اعمالِ صالحہ کو قرآن مُعجز میں دیکھا تو آخر دم تک اعمالِ صالحہ کو پکڑ لیا، اسی اعتبار سے ان کو کامل کامیابی ہوگئی۔

حدیث وفقہ کلام اللہ کی تشریح ہے :

رہی حدیث وفقہ، تو حدیث بھی قرآنِ پاک ہی کی تشریح ہے، اس وجہ سے کہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے :

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ۔(پ۲۸ع۴)

جو کچھ رسول تم کو دیں اس کو لے لو اور حدیث رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا کلام ہے تو حدیث بھی کلام اللہ کی تشریح ہے، گو وہ وحی غیر متلو ہے۔ اور فقہ بھی قرآن ہی کی تشریح ہے کیونکہ ارشاد ہے :

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ۔(پ۵ع۸)

استنباط فقہ کے ذریعے سے ہی تو ہوتا ہے۔ نیز فقہ میں مسائلِ متفرقہ فی القرآن والحدیث کی تبویب کردی گئی ہے۔ مثلاً قرآنِ پاک میں وضو کا ذکر ہے، نماز کا ذکر ہے، اسی طرح قرآنِ پاک میں حلال وحرام کا ذکر ہے، لیکن ایک جگہ اکٹھا نہیں۔ تو قرآنِ پاک میں جو متفرقاً ذکر ہے، ان سب کو ایک جگہ پر اکٹھا ذکر کردینے کا نام فقہ ہے۔ مثلاً طہارت کے مسائل جو قرآنِ پاک میں متفرقاً ذکر تھے، وہ ایک جگہ کتاب الطہارات کا عنوان قائم کرکے اکٹھا کردیا۔ نماز کا بیان جو قرآنِ پاک میں متفرقاً تھا، اس کو فقہاء نے کتاب الصلوٰۃ کا عنوان قائم کرکے ایک جگہ اکٹھا کردیا ہے۔

الغرض کتاب اللہ مثل متن کے ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث اس کی شرح ہے اور ان دونوں کی تبویب فقہ ہے۔

منکرینِ حدیث کا جواب :

یہاں سے منکرینِ حدیث کا جواب نکل آیا جو یوں کہتے ہیں، ہمارے پاس قرآن سے دلیل لاؤ، کوئی کہتا ہے میں فقہ نہیں مانتا، حدیث سے جواب لاؤ۔ ماقبل کی تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ حدیث وفقہ دونوں کلام اللہ ہی ہیں اور ان سب کا مجموعہ دلائلِ اسلام واحکامِ اسلام ہیں، اگر ان میں سے کسی ایک سے حکم ثابت کردیا جائے گا تو ثبوت بالکل درست ہو جائے گا، یہ کہنا کہ قرآن سے دلیل بیان کرو غلط ہے، کتاب اللہ ہی تو کہہ رہی ہے کہ میرے رسول کے کلام کو مانو۔

دعویٰ میں مدعیٰ علیہ کی جانب سے مطلق شہادت کا مطالبہ کرنا تو درست ہے کیونکہ ثبوت مدعی کے لئے شہادت شرط ہے لیکن مدعی علیہ کا یہ کہنا کہ صاحب میں تو جب اس بات کو مانوں گا کہ فلاں جج صاحب آکر شہادت دیں تو کیا اس کا یہ کہنا صحیح ہے؟ ہر صاحبِ فہم کہے گا کہ صحیح نہیں۔ اس سے کہا جائے گا جو گواہ پیش کئے جارہے ہیں، ان میں جرح کرو، کوئی ایسی خرابی نکالو جس سے شہادت باطل ہو جائے، لیکن یہ کہنا کہ متعین طور پر فلاں جج صاحب آکر شہادت دیں تو مانوں گا، اس کی یہ بات نہیں مانی جائے گی۔

اسی طرح یہ کہنا کہ تمہاری بات تب شریعت سے ثابت مانوں گا جب قرآنِ پاک سے دلیل لاؤ، یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے۔ یہ علمی باتیں درمیان میں ضمناً آتی رہتی ہیں۔ آپ کے سامنے سلوک کی باتیں پیش کی جارہی تھیں، ریا اور اخلاص کی بات ہو رہی تھی، ظاہری اور باطنی پاکی میں وہم وخیال کا بیان کیا جا رہا تھا، اور نفسِ ایمان وکمالِ ایمان کا بیان کیا گیا، تمام تفصیل ذہن شریف میں آگئی ہوگی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہر چیز میں مقصود کمال ہے۔ لہٰذا ایمان میں بھی مطلوب کمالِ ایمان ہے اور وہ موقوف ہے۔ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ۚ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۚ۔ پر جس کا حاصل ہے کمالِ اتباعِ شریعت

ظاہراً و باطناً اس کو مضبوطی سے پکڑ لینا چاہئے۔

خلاصہ :

الحمد للہ تبدیلی حالات کے متعلق تصحیحِ نیت کی باتیں توفیقِ الٰہی سے حضرت والا کی برکت سے زبان پر آتی گئیں، پھر آپ کے دل میں بیٹھ گئیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مؤمن انتظارِ صلوٰۃ کی وجہ سے ہر وقت نماز میں ہے اور ہر وقت اخلاص میں ہے، ہر وقت ایمان کے ساتھ کمالِ کامیابی میں ہے۔ حق تعالیٰ ہم کو اپنی رضا پر چلتے رہنے کی توفیقاتِ ارزانی سے نوازیں۔ (آمین ثم آمین)

آٹھویں مجلس

حصولِ مطلوب کیلئے طریقِ صحیح

کباب اردو کا لفظ ہے، گوشت اور مصالحہ ملا کر سیخ پر پکایا جاتا ہے، اور کباب عربی کا لفظ بھی ہے، باب کے معنیٰ دروازہ اور کاف تشبیہ کے لئے ہے یعنی دروازہ کی طرح، تو کباب کا دروازہ منہ ہے، منہ میں رکھو گے تو کباب اندر پیٹ میں جائے گا، جب باب سے داخل کیا جائے گا تو اندر پہنچے گا۔

کامیابی طریقِ صحیح سے ہوتی ہے:

یہاں سے یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ جس کام کا جو طریق ہے، راستہ اور دروازہ ہے اس کو اختیار کیا جاوے گا تو فتح یاب (کامیاب) ہے ورنہ نہیں۔ یہ کامیاب فارسی کا اسمِ فاعل سماعی ہے، امرِ حاضر پر کوئی اسم داخل کردو تو فارسی کا اسمِ فاعل سماعی بن جاتا ہے تو کامیاب میں کام تو اسم ہے اور یاب یافتن سے امرِ حاضر ہے، یافتن مصدر، مضارع یابد،

اس کے آخر سے دال دور کر دو تو یاب رہ گیا، اس پر کام داخل کر دیا، تو کامیاب ہو گیا۔ یہ اسمِ فاعل سماعی بن گیا اور اسمِ فاعل قیاسی اس کا دوسرا طریق ہے کہ امر حاضر کے آخر میں لفظ ندہ بڑھا دو، اسم فاعل قیاسی بن جائے گا جیسے گوئی سے گوئندہ قیاسی ہر مصدر سے بنایا جا سکتا ہے اور سماعی کو ہر مصدر سے نہیں بنا سکتے بلکہ اہلِ لسان نے جس مصدر سے استعمال کیا ہے، اسی سے ہم بنا سکتے ہیں۔ تو کامیاب یہ فارسی کا اسمِ فاعل سماعی ہے، اس کے معنی ہوئے مقصد پانے والا یعنی جس کام کو چاہتے تھے وہ کام ہو گیا۔ اس کام کے حاصل کرنے کا جو طریقۂ صحیح دروازہ تھا، اس کو حاصل کرنے چلا تو منزل پر پہنچ گیا، تو کباب بھی پیٹ میں جب پہنچے گا جب وہ صحیح دروازہ منہ کو اختیار کرے گا۔ صحیح دروازہ اختیار کیا، صحیح منزل پالی، ورنہ کامیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کان میں رکھ لو یا ناک میں رکھ لو، سوراخ تو یہاں بھی ہے مگر اندر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غرض جو صحیح طریق استعمال کرے گا صحیح نتیجہ پالے گا، کامیاب ہوگا ورنہ نہیں۔

قاعدہ مذکورہ کا قرآن سے ثبوت :

اور یہ مسئلہ قرآنِ پاک میں بھی ہے :

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (پ۲، ع۸)

زمانۂ جاہلیت میں حالتِ احرام میں اگر گھر میں آنا چاہتے تھے تو دروازہ سے نہیں آتے تھے بلکہ پیچھے سے نقب لگا کر آتے تھے اور اس کو نیکی اور ثواب کا کام سمجھتے تھے، اس پر قرآن نے فرمایا کہ یہ کوئی نیکی کی بات نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشتوں سے داخل ہو، لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص حرام (چیزوں) سے پرہیز کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو۔ اُمید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اس آیت سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ جس کام کے کرنے کا جو طریق صحیح ہے، اس سے کام کیا جائے، جب ایسا ہوگا تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیاب نہ ہو۔

اس قاعدہ میں دنیوی کاروبار اور اُخروی کام سب داخل ہو گئے، جس کام کو بھی کرو اس کے کرنے کا صحیح طریقہ سیکھو، کسی بھی کام کے کرنے سے پہلے اس کا صحیح علم حاصل کرو، جب علمِ صحیح اس کے حاصل کرنے کا ہوگا وہ کام صحیح، صحیح انجام پاوے گا چاہے دنیوی کام ہو یا اُخروی کام ہو۔

دنیا اور آخرت کے کاموں کی نوعیت الگ الگ ہے :

مگر آخرت کے کاموں کی نوعیت الگ ہے اور دنیا کے کاموں کی نوعیت اور ہے آخرت حاصل ہونے کی تجارت کا طریقہ اور ہے اور دنیا حاصل کرنے کی تجارت اور۔ کل آپ کے سامنے آخر میں ایک آیت شریفہ تلاوت کی گئی تھی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ (پ۲۸، ع۱۰)

اے ایمان والو ! کیا میں تم کو ایسی تجارت کا پتہ نہ بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے تو یہ تجارتِ آخرت ہی تو ہے کہ جس کے ذریعہ سے عذابِ الیم سے نجات ہو جائے۔ آگے ارشاد ہے :

تؤمنون باللّٰه ...... اللہ پر ایمان لاؤ یعنی اللہ کو جیسا ماننا چاہئے ویسا مانو، ورنہ تو مشرکین بھی اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کرتے تھے، لیکن جیسا اللہ تعالیٰ کو علم وقدرۃ اور ارادہ وغیرہ میں ماننا چاہئے تھا ویسا نہیں مانتے تھے جس کو توحید کہتے ہیں۔

توحید وشرک کی حقیقت :

اور اگر وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں ان کو دوسروں کی طرف منسوب

کر دیا تو پھر توحید کہاں رہی؟ شرک ہو گیا، حق تعالیٰ ہر چھوٹی اور بڑی چیز سب پر وہی قادر ہے، وہی دیتا ہے تو توحید ہے اور اگر دنیوی حکام کی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی سمجھا کہ بڑی چیز اللہ سے مانگی جائے اور چھوٹی چیز اس کے فرشتوں سے بھی مانگی جا سکتی ہے جیسا کہ بڑے کام کیلئے تو کلکٹر صاحب ہیں اور چھوٹے موٹے کام ان کے پیش کار سے بھی کرائے جا سکتے ہیں۔ ان فرشتوں کو اللہ کا پیشکار مان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ سے کہہ دیں گے، اللہ تعالیٰ ان کی بات مان لیتے ہیں۔ تو چھوٹے موٹے کام ان سے کہدو۔

یا عبدالقادر شیئا لِلّٰہ کہنا شرک ہے :

اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کہدو، وہ انتقال کر گئے تو کیا بات ہے؟ منتقل ہی تو ہو گئے ہیں یہیں بیٹھے بیٹھے کہدو ان کو خبر پہنچ جائے گی یا عبدالقادر شیئا لِلّٰہ العیاذ باللہ یہ کہہ رہا ہے کہ کچھ آپ بھی عنایت فرما دیجئے، بجائے خدا سے مانگنے کے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے مانگ رہا ہے اور وہ بھی مرنے کے بعد، یہ شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ مشرکینِ مکہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے : لیقربونا الی اللہ زلفٰی ، کہ ہم ان بتوں کی عبادت اس لئے کر رہے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں باوجود اس عقیدہ کے وہ مشرک ہی رہے، اسی طرح کسی مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا کہ ان کو بھی خدائی کاموں میں دخل ہے یہ بھی شرک ہے۔

قریب بشرک ایک نئی تعبیر :

اور ایک بات شرک تو نہیں مگر قریب بشرک ہے کہ مسلمان خود دعا چھوڑ کر بزرگوں سے کہتا ہے، آپ دعا کریں اور جوان سے کہا جاتا ہے کہ بھائی آپ خود بھی تو زبان سے دعا اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کریں تو کہتے ہیں اجی ہماری کیا دعا؟ اس کے معنیٰ یہ ہیں گویا مومن

یوں کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری نہیں سنتے، العیاذ باللہ۔ اس کے یہ معنیٰ نکلے یا نہیں نکلے کہ آپ اللہ کے آدمی ہیں، آپ کی سنتے ہیں، ہماری نہیں سنتے، تو یہ شرک کے قریب پہنچ گیا، اگرچہ مشرک نہیں ہوا، یہ نئی تعبیر ہے کہ مشرک تو نہیں ہے مگر قریب بشرک ہو گیا۔

حضرت مجدد تھانویؒ کی حکایت :

ایک شخص نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہی کہا کہ میری کہاں زبان ہے کہ میں دعا کروں تو حضرت والا نے فرمایا تمہیں کلمہ شریف یاد ہے؟ کہا ہاں یاد ہے، پوچھا کیا ہے؟ انہوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس پر فرمایا اچھا اس کے لئے تو تمہاری زبان میں اہلیت وقابلیت ہے، اتنے بڑے کلمہ کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے گا اور دعا کرنے کے لئے تمہاری زبان کے اندر اہلیت وقابلیت نہیں ہے۔ اتنا بڑا کلمہ تو زبان سے نکال سکتے ہو اور دعا زبان سے نہیں نکال سکتے۔ جب تم نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا تو تم نے اللہ کے واحد، ایک ہونے کو مانا اور وہ کلمہ قبول ہو گیا یا قبول نہیں ہوا، ظاہر ہے کہ قبول ہو گیا جب تمہاری زبان سے یہ کلمہ، یہ بات نکلنا قبول ہو گیا تو دوسری بات جو تم زبان سے نکالو گے تو قبول نہیں ہو گی؟ اچھا سمجھا کہ شیطان نے راستہ مار دیا، شرک کے قریب ہونے کا سبق پڑھا رہا ہے، مشرکین کے قریب پہنچا دیا، لہٰذا خود بھی دعا کرو، پھر دوسروں سے بھی دعا کراؤ، کون منع کرتا ہے۔

یہاں بھی جو صحیح طریقہ اللہ کے سامنے حاجت پیش کرنے کا تھا، اس کو چھوڑ دیا اور دوسرا طریقہ صرف بزرگوں کے پاس جا کر دعا کرانے کا اختیار کر لیا۔

الغرض کام کرنے کا جو طریقہ صحیح ہے اس کو اختیار کرنے سے کام بنتا ہے۔

صحیح طریقہ کی بعض مثالیں :

اگر کوئی قلم بنانا چاہتا ہے اور بجائے چاقو سے چھیلنے کے انگلی سے چھیل رہے ہیں تو

کیا قلم بن جائے گا؟ ہرگز نہیں۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ چاقو ہو اور اس کی دھار تیز ہو۔ ذبح کرنے کے لئے صرف لوہا کافی نہیں، لوہے کی بنی ہوئی تیز دھار دار چیز ہونا چاہئے۔ یہ مختلف قسم کی مثالیں ہیں، زمین جوتنے کے لئے ہل چلا رہے ہو تو اس میں لوہے کی کھرپی (پھالی) بھی ہونا چاہئے۔

یہ بیان وَاْتُو الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا پر چلا تھا کہ اس کی عبارۃ النص سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہوؤ، پشت سے سوراخ کر کے مت داخل ہوؤ، اور اسی سے یہ قاعدہ بھی مستنبط ہو گیا کہ ہر چیز کو اس کے قاعدے کے موافق کرو۔ کسی چیز کو شریعت سے ثابت کرنے کے لئے عبارت النص (صریح قرآنِ پاک) ہی ضروری نہیں ہے۔ قرآنِ پاک تو اصولِ کلیہ اور قواعدِ کلیہ کو لئے ہوئے ہے، جزئیات وفروعات کو لئے ہوئے نہیں ہے، الّا ماشاء اللہ، ان اُصولِ کلیہ سے استنباطِ صحیح کے ساتھ جن کو فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، ان کے موافق جزئیات کو نکالا جاتا ہے۔

استنباطِ باطل کی مثال :

استنباط صحیح ہونا چاہئے یہ نہیں کہ لفظِ صلوٰۃ سے دھوکہ میں آجاؤ کہ صلوٰۃ کے معنیٰ دعا کے بھی ہیں، صلوٰۃ کے معنی رحمت کے بھی ہیں، اب کوئی سہل الحصولی کے طور پر نماز کے ادا کرنے سے بچنے کے لئے صلوٰۃ کے معنیٰ صرف دعا کے لے لے اور پانچ وقت بیٹھ کر صرف دعا کرلیا کرے جس میں وضو کی بھی قید نہیں۔ بس بلا وضو بیٹھ کر دعا کرلی اور نماز ادا ہوگئی، اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے نماز کی موجودہ شکل منقول نہ ہوتی، بس وہ بھی دعا کرلیا کرتے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، تو اس قسم کا قیاس واستنباط باطل ہے ایسا قیاس کرنا ہرگز جائز نہیں۔

صرف لغت دیکھ کر تفسیر کرنا جائز نہیں :

صرف لغت دیکھ کر قرآنِ پاک کی تفسیر کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، جب تک کہ مفسرین سے جو تفسیر منقول ہے اس کو نہ اختیار کیا جائے، اسی لئے کتنا ہی اردو پڑھا ہوا یا انگریزی پڑھا ہوا یا فارسی پڑھا ہوا ہو' قرآن مجید کا ترجمہ بلا استاد عالم کے پڑھنا جائز نہیں' اگرچہ ترجمہ اردو ہی میں ہو' اور کیسی ہی عمدہ اردو پڑھا ہوا ہو' ادیب کامل اور مولوی کامل کا امتحان دیئے ہوئے ہو' اگر ایسا کرے گا گمراہ ہو جائے گا۔

محض لغوی تفسیر کے بطلان کی ایک نظیر :

ارشادِ باری تعالیٰ ہے : اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۔ہم نے ذکر کو نازل کیا ہےاور ہم ہی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

اس آیت میں بھی قرآن کا ذکر نہیں بلکہ ذکر کا بیان ہے تو اگر ایسا ہی محض لغت سے استدلال ہے تو بس قرآنِ پاک چھوڑو، بس تسبیح لے کر بیٹھ جاؤ اور ذکر کرتے رہو اور ذکر اللہ تعالیٰ کا نام لینا ہے، بس اللہ کا نام لیتے رہو، مگر اس کا کوئی بھی قائل نہیں بلکہ یہاں بالاتفاق قرآنِ پاک مراد ہے اور اس پر قرینہ بھی ہے کہ آگے ارشاد ہے: وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ کہ ہم اس ذکر کی حفاظت کریں گے، تو حفاظت تو کسی خارجی چیز کی ہوا کرتی ہے، تو سیاق وسباق بتلا رہا ہے کہ یہاں ذکر سے مراد قرآنِ پاک ہے، جس کو نازل کیا ہے اس کو ذکر سے تعبیر کیا ہے۔ ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے وہ ذاکر ہے۔ حدیث شریف میں ہے :

کل مطیع للہ فهو ذاکر۔

یہاں مطیع پہلے سے ہے اور ذاکر بعد میں ۔ پس معلوم ہوا کہ ذاکر اطاعت اور

فرمانبرداری سے بنتا ہے، ہم ذکر اس کو سمجھے کہ بیٹھے ہوئے اللہ، اللہ کرتے رہو، درود شریف پڑھتے رہو بلکہ درود شریف پڑھنے کا، اللہ، اللہ کرنے کا اثر آنا چاہئے کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے جس وقت جس کام کے کرنے کو، جس صحیح طریقہ سے حکم کیا ہے اس وقت اس کام کو اس صحیح طریقہ سے بجالاتے رہنا، یہ ذکر کی حقیقت ہے اور یہ ذکر کی نوعیت ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک عورت کو انتباہ :

اسی لئے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ اپنے جسم کو گندھواتی ہے، زمانۂ جاہلیت میں کافر لوگ ہاتھ پر سوئی سے کالے، نیلے نشان لگوالیا کرتے تھے، اس کو گندھوانا کہتے ہیں، جیسے اب اہلِ ہنود کے اندر ہے اور اس کو کچھ خوبصورتی میں شامل کرتے ہیں، تو زمانۂ جاہلیت میں کفار و مشرکین اپنے ہاتھ وغیرہ گندھوالیتے تھے، اسلام میں اس کی ممانعت ہوگئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس عورت سے فرمایا یہ تو حرام ہے، تم نے یہ کیسے گندھوایا؟ اس عورت نے کہا اس کا حرام ہونا قرآن میں تو کہیں نہیں آیا ہے، میں نے تو سارا قرآن پڑھا ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا تو نے قرآن پڑھا ہی نہیں' اگر پڑھتی، سمجھ جاتی' کیا اس میں یہ آیت نہیں ہے :

مَآ اٰتٰـكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰـكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ ۔

جو رسول اللہ ﷺ تم کو دیں اس کو لے لو اختیار کرو اس پر عمل کرو اور جس چیز سے تم کو منع کریں اس سے بچو، اس کو مت کرو۔

اس نے کہا کہ یہ آیت تو ہے، فرمایا جب یہ آیت ہے تو رسول اللہ ﷺ ہی نے گندھوانے سے منع کیا ہے، فرمایا ہے کہ لعنت ہے اس عورت پر جو اپنے جسم کو گندھواتی ہے اور لعنت ہے اس پر بھی جو گودتی ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے گندھوانے اور گندھنے والی پر

لعنت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا کہ جو رسول دیں، اس کو لے لو، تو یہ حکم قرآن سے ثابت ہوا یا نہیں؟ اس عورت کی سمجھ میں آ گیا، کہا میں توبہ کرتی ہوں۔ تو دیکھئے عبارت النص اس آیت کا کیا ہے اور دلالت کس بات پر ہو رہی ہے۔

ہر چیز کی دلیل قرآن سے طلب کرنا منع ہے:

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر چیز کی دلیل صراحۃً قرآن شریف ہی سے طلب کرنا منع ہے کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ فرماویں اس کو اختیار کرلو۔ اس نے بطورِ اشارہ کے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے احکام ایسے ہیں جو قرآنِ پاک میں صراحۃً نہیں مگر رسول ﷺ کے فرمائے ہوئے ہیں، ان کو اختیار کرو، جس طرح ایمان کے لئے کلمۂ طیبہ **لا الہ الا اللّٰہ** کی ضرورت ہے، اسی طرح **محمد رسول اللّٰہ** کو شامل کرنے کی ضرورت ہے، بلا شمولِ تصدیقِ رسولؐ اور اقرارِ رسالتِ رسولؐ تصدیق قلبی اور اقرار لسانی معتبر نہیں ہے۔

قرآن وحدیث دونوں پر عمل کرنا ضروری ہے:

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس طرح میرے حکم پر عمل ضروری ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ جس کام کا حکم دیں اس پر بھی عمل کرنا ضروری ہے، تو جیسے تصدیقِ قلبی میں کمال، رسالت کو شامل کرنے سے ہوا تھا اسی طرح عمل میں کمال، رسول اللہ ﷺ کے فرمودہ ارشادات پر عمل کر کے آئے گا۔

اسلام کامل، دین کامل صرف قرآن پاک پر عمل کرنے سے ہی نہ ہوگا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام کو قرآن کے ساتھ شامل نہ کرلیا جائے، تو اگر دیندارِ کامل بننا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے احکام کو ماننا ضروری ہے۔

زیادتِ ایمان کا طریقہ احکام پر عمل کرنا ہے :

نفسِ ایمان تو کلمہ پڑھنے سے حاصل ہو گیا لیکن زیادتِ ایمان جو مطلوب ہے وہ بلا احکام پر عمل کئے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتا اور زیادتِ ایمان مطلوب ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا کہ جب قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے وہ اس کو سنتے ہیں تو ان کے ایمان میں زیادتی ہو جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآنِ پاک کی آیتوں کو سن کر ان کے مطابق عمل کرنے پر ایمان کی زیادتی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو مقامِ مدح میں بیان فرما رہے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ نفسِ ایمان پر زیادتِ ایمان مطلوب ہے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرتے رہو، ایمان میں زیادتی ہوتی رہے گی۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ محض الفاظ کے معنیٰ لغوی دیکھ کر قرآن کی تفسیر کرنا جائز نہیں، بلکہ علماءِ تفسیر نے جو معانی بیان کئے ہیں ان کو نظر میں رکھ کر تفسیر کرنا ضروری ہے۔

ذکر و شغل فہمِ قرآن کے لئے مثلِ شرط ہیں :

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ذکرِ حقیقی وہ قرآنِ پاک اور حکم احکم الحاکمین کو ماننا ہے تو بطورِ قاعدہ کلیہ کے سمجھنا چاہئے کہ ذکر و اشغال فہمِ قرآن پاک کے لئے مثلِ شرط ہے جس طرح نماز بلا وضو کے صحیح نہیں ہو سکتی، اسی طرح قرآن کے صحیح معانی و مطالب کو سمجھنا بلا ذکر و شغل کے نہیں ہو سکتا کیونکہ ذکر و شغل سے باطنی صفائی حاصل ہوتی ہے، جس سے قرآن کے معانی سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

ذکر و شغل کسی دنیوی غرض سے نہ ہونا چاہئے:

لیکن یہ ذکر و شغل کرنا کسی اُمیدِ دنیوی پر نہ ہو بلکہ رضائے الٰہی کے لئے ہو، کسی اور نیت سے نہ ہو کہ مال بڑھے اور زیادہ ہو جائے، قرضہ ادا ہو جائے، مقدمہ میں کامیاب ہو جائے، کل مطیع للہ میں لفظ للّٰہ بتا رہا ہے کہ کوئی دنیوی غرض نہ ہو، حتیٰ کہ اس سے بھی خالی الذہن ہو کہ کیا ملے گا اور کتنا ملے گا اور کب ملے گا، دنیا میں ملے گا یا آخرت میں ملے گا؟ اس تمام سے خالی الذہن ہو کر بس تم تفویض کرو نبیوں کی طرح کہ انہوں نے ہمیشہ تفویض سے کام لیا ہے۔ وافوض امری الی اللّٰہ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ انہوں نے کوئی بدلہ نہیں چاہا بلکہ یہ فرمایا ان اجری الا علی اللّٰہ ہمارا بدلہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہے۔ بس تم تفویض کرو۔ اسی میں تمہارے لئے سکونِ قلبی ہے، ورنہ بس تشویش ہی تشویش ہے کہ ابھی تو کچھ ملا نہیں بس انتظار کر رہا ہے کہ کب ملے گا، انتظار خود تشویش ہے، انتظار خود موت کے برابر ہے، مثل مشہور ہے "انتظار اشد من الموت" تو اللہ تعالیٰ تو تمہارے دماغ کو سکون دینا چاہ رہے ہیں، تمہاری زندگی کو سکون سے گزروانا چاہ رہے ہیں، تم خود اپنے آپ کو پریشانی میں ڈالنا چاہتے ہو، یہ ذہن میں خیال رکھ کر کہ کب ملے گا، کیسا ملے گا، کتنا ملے گا، کس وقت ملے گا؟ تو جواب معلوم ہو گیا کہ ان سب سے خالی الذہن ہو کر خدا کے سپرد کرو۔ تمہارے زیادتِ ایمان کا یہی تقاضا ہے کہ ان تمام چیزوں سے خالی الذہن رہو۔ نفسِ ایمان سے تعلق مع اللہ ہو گیا ہو اور تمام اغراض سے خالی ہو جانا یہ شدت تعلق مع اللہ کا تقاضا ہے۔

شدت تعلق مع اللہ کا مطالبہ:

شدت تعلق مع اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق ہو کہ کسی مطلوب سے بھی ایسا تعلق نہ ہو، اپنی جان سے بھی ایسا تعلق نہ ہو اور اولاد، مال و دولت، بادشاہت وغیرہ

سے بھی ایسا تعلق نہ ہو جیسا اللہ تعالیٰ سے ہو، اس کے مقابل کسی چیز سے بھی ایسا تعلق نہ ہو، ایمان لانے کے بعد مؤمن سے اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ بس میری اطاعت میں لگے رہو اور کیا ملے گا! اس سے قطع نظر کرلو، اس کو تفویض کہتے ہیں، اس میں بڑی راحت ہے۔

تفویض' اللہ کا ذاتی حق ہے :

اور تفویض کو راحت و سکون کی نیت سے اختیار کرنا جائز ہے مگر اعلیٰ تفویض یہ ہے کہ تفویض کو حق تعالیٰ کا ذاتی حق سمجھ کر اختیار کرے' جیسے حیاۃ' علم و قدرت' سمع و بصر وغیرہ حق تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں، اسی طرح تفویض اللہ تعالیٰ کا ذاتی حق ہے، کہ اطاعت میں لگا رہے اور نتیجہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے۔

اسی کو مشائخِ زمانہ اپنے مریدوں کو سکھاتے ہیں اور ان کے دل میں بٹھاتے ہیں کہ حصولِ ایمان کے بعد زیادتِ ایمان میں لگے رہو، جو موقوف ہے اطاعتِ کاملہ پر۔ اسی اطاعت میں سے ایک جز دعا کرنا بھی ہے کہ اپنے مطلوب جائز کے لئے اللہ تعالیٰ سے خوب دعا مانگو اور اعلیٰ درجہ کی چیز جنت الفردوس مانگو، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جنت میں سے جنت الفردوس مانگو اور جنت الفردوس کا ملنا دنیا میں نہیں آخرت میں ہے۔ گو کامل مطیع کو دنیا میں بھی اس کا ذائقہ چکھا دیں، چکھا دینا اور بات ہے اور کھانا اور بات ہے، کھانا جس کو کہتے ہیں وہ تو اپنے محل یعنی جنت میں ہی ہوگا۔ ہاں مطیعِ کامل کو یہاں دنیا میں بھی جنت کا مزہ چکھا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ظہور کا انتظار کرنا عبدیت کے خلاف ہے۔

دنیا میں اطمینانِ قلبی جنت الفردوس ہے :

ذاتِ باری تعالیٰ مؤمن کے لئے پوری اطمینان و طمانیت کی زندگی چاہتے ہیں، تو

یہی اطمینان اور پوری طمانیت کی زندگی جنت الفردوس ہے، تو اس اللہ والے کو جو ایسا ہے کہ نتیجہ سے خالی الذہن ہے، اس کو دنیا کے اندر ہی جنت الفردوس کا ذائقہ آ گیا ابھی نہیں آیا۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔

جس نے عملِ صالح کیا خواہ مرد ہو یا عورت پس ضرور اس کو پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے۔

اطمینان ذکر اللہ میں ہے :

انسان دنیوی مال و دولت میں سکون کی زندگی کے طالب ہے، لیکن قلب کے اندر جس کو طمانیت اور سکون کہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کا طریق صرف ذکر اللہ ہے، اور ذکر اللہ کمالِ اطاعت ہے، اسی اطاعتِ کاملہ کو ذکر اللہ کہتے ہیں اسی سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۔

جو لوگ ایمان لائے اور ان کے قلوب ذکر اللہ سے اطمینان پکڑتے ہیں۔

سو آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ایمان لائے اور اپنے دلوں کے اندر اطمینان کو ڈھونڈ رہے ہیں ان کا اطمینانِ قلب ذکر اللہ سے ہوگا تو ذکر اللہ سے مؤمن اپنے قلب میں اطمینان کو لے رہا ہے۔ اسی لئے آگے حق تعالیٰ صیغۂ تنبیہ سے مزید متنبہ فرما رہے ہیں :

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔ جان لو اچھی طرح سے، کہ اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی قلوب اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

اطمینان حاصل ہونے کا صحیح طریق، صحیح دروازہ جس کے ہم طالب ہیں ذکر اللہ اور اطاعتِ کاملہ ہے، اس کے سوا سکون حاصل ہونے کا باب (دروازہ) معلوم ہو گیا کہ وہ ذکر اللہ اور اطاعتِ کاملہ ہے۔ اس شخص کو ایسا اطمینان ہوتا ہے کہ چاہے اس مؤمن کے

پاس ایک ڈھیلہ بھی نہ ہو، ایک کوڑی بھی نہ ہو مگر یہ مست ہے کیا مطلب؟ یعنی ذکر کی لذت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش ہے کیوں خوش ہے؟ پہنچ جاؤ بخاری شریف میں، امام بخاریؒ نے باب حلاوۃ الایمان باندھا ہے، اس کو بھی ایمان کی حلاوۃ ولذت حاصل ہونے لگی ہے، اس لئے اپنے فقر وفاقہ کی حالت میں ہی مست ہوگا۔

طریقِ اطمینان وہی ہے :

ایک بات اور ذہن میں آئی کہ ہر شخص اس دنیا میں اطمینان کا طالب ہے، کوئی ایسا نہیں جو اطمینان نہ چاہتا ہو، اب ایک صورت تو یہ تھی کہ اپنی عقل سے اطمینان حاصل کرنے کا طریقہ سوچتا اور ایک یہ کہ احکم الحاکمین نے ہمارے پوچھنے سے پہلے ہی بتلا دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر اپنی عقل سے سوچتے تو اطمینان حاصل کرنے کا صحیح باب نہ ملتا۔ اسی لئے جن لوگوں نے اپنی عقل سے اطمینان حاصل کرنے کا طریقہ سوچا ان کی منتہیٰ بادشاہت ہے، وہ یہ سمجھے کہ بادشاہت میں پورا اطمینان حاصل ہے۔

بادشاہت میں بھی اطمینان نہیں :

حالانکہ اگر پوری دنیا کا بادشاہ بھی ہوجائے تب بھی اطمینان حاصل نہیں، اسی لئے مشہور ہے کہ ایک گدڑی میں دو فقیر سو سکتے ہیں، مگر ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے، ان کو چین ہو نہیں سکتا اور یہ ایک موٹی سی بات ہے کیونکہ ہر وقت اس کو یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ کہیں میرے ملک پر کوئی حملہ نہ کردے، کہیں کوئی وزیر اندرونی بغاوت نہ کردے، کہیں مجھے کوئی قتل نہ کردے وغیرہ۔ جب بادشاہ کو یہ خیال آ گیا کہ فلاں بادشاہ میرا ملک لینے کے خیال میں ہے تو اس کی نیند بھاگ گئی۔

تجارت میں بھی چین نہیں :

تاجر کو یہ خیال آ گیا کہ میری تجارت میں کہیں ٹوٹا نہ آ جائے، لہسن کا بھاؤ سات سو روپیہ من سے گر کر اب ڈیڑھ سو روپیہ من پر آ گیا، اس کو فکر لگ گئی، اس مال کو روکوں یا بیچ دوں اور روکوں تو کب تک روکوں، کہیں خراب نہ ہو جائے، روٹی کھا رہا ہے' مگر سوچ یہ رہا ہے، تو درحقیقت روٹی اُسے کھا رہی ہے۔ تو سوچنے کی بات ہے یہ تاجر دنیوی اتنا مال ہوتے ہوئے یہ چین میں ہے یا وہ مطیعِ کامل جس کے پاس کچھ بھی نہیں وہ چین میں ہے۔ یہ تاجر دنیوی تندرست ہے، اچھی صحت والا ہے کہ چھینک بھی نہیں آئی مگر تندرست ہونے کے باوجود طمانیتِ قلبی اور قرارِ دل نہیں ہے اور وہ جو مطیعِ کامل ہے اگرچہ بیمار ہے لیکن بیماری کی حالت میں اس کا قلب باقرار ہے، باسکون ہے، اس لئے کہ اس کے قلب کے اندر صرف تعلق ہی نہیں بلکہ شدتِ تعلق مع اللہ ہے یعنی اس ذات کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے، اس گہرے تعلق کا اثر تفویض ہے اور اطاعتِ کاملہ کے ساتھ تفویض کا اثر تسلیم ہے کہ جو واقع ہوا یہ اس کے ساتھ ہے، سر جھکا ہوا ہے، حکم کی تعمیل میں سر جھکا ہوا ہے، ذاتِ حق کی اطاعت میں باطاعتِ کاملہ سر جھکا ہوا ہے، اس تسلیم کا ثمرہ کیا ہوگا؟ رضا ہوگی، فکر کی بات پیش آئی، رضا یعنی خوش اور بہت خوش' یوں کہتا ہے اچھا اور مارلو' اچھا اور دبوچ لو' کسی حالت سے پریشان نہیں ہوتا۔

مؤمن کو قبر محبت میں بھینچتی ہے :

حدیث میں آتا ہے کہ مردے کو قبر بھینچتی ہے' کسی کو نہیں چھوڑتی' لیکن مؤمن کو اس طرح بھینچتی ہے جیسے ماں بچے کو گود میں لے کر محبت میں بھینچتی ہے، جیسے محبوب جبکہ واقعی محبت ہو، عفت مآب محبت ہو تو جیسے محبوب محب کو گود میں لے کر بھینچتا ہے، اس بھینچنے میں

مزہ آتا ہے اور اگر دشمن بھینچے تو کیا ہوگا؟ بھینچنا تو در کنار اگر یوں کہنی سے اشارہ کر کے بھی چلا جاوے تو تکلیف ہوگی اور محبوب پورا بھینچ رہا ہے، تب بھی سکون ہے اور اگر یوں کہہ رہا ہے ....

نکل جائے دم تیرے قدموں کے آگے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

یہ رضا ہے جو اس کو حاصل ہے، تو وہ بیمار جو مطیعِ کامل ہے، وہ اس بیماری کی حالت میں خوش ہے اور وہ پوری صحت والا جس کے قلب میں اطمینان نہیں ہے وہ بیمار ہے، گو تندرست معلوم ہو رہا ہے، مگر بیمار ہے اور یہ بیمار معلوم ہو رہا ہے مگر تندرست ہے۔

ایک بزرگ سردی میں اپنی چادر اوڑھے بیٹھے تھے، ایک شخص آیا اور ان کی چادر کے اندر ہاتھ لے جا کر اس زور سے چٹکی لی کہ اس سے زیادہ زور سے چٹکی نہیں لے سکتا تھا اور دوسرا آہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، مگر وہ بزرگ خاموش بیٹھے رہے، کچھ بھی آہ نہ کی، پھر سامنے آ کر وہ شخص معافی مانگنے لگا اور کہا میں معافی چاہتا ہوں۔ بزرگ نے فرمایا، معافی کاہے کی؟ کہنے لگا آپ کو مجھ سے تکلیف پہنچی۔ فرمایا کیسی تکلیف؟ مجھے تو کچھ خیال نہیں۔ عرض کیا کہ میں نے آپ کے چٹکی لی تھی اور اتنی زور کی چٹکی لی تھی کہ بلا آہ کئے رہ نہیں سکتا۔ فرمایا کہ میں تو خیال کر رہا تھا کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے اور محبت میں چٹکی لی ہی جایا کرتی ہے۔ اس لئے بے چارہ چٹکی لے رہا ہے، اس کا جی خوش ہو رہا ہے، تو مجھے تو اس چٹکی کا کچھ خیال نہیں ہوا۔ تو جب ایک مخلوق انسان دوسری مخلوق انسان کی طرف سے اس تصور و تعلق کو لا کر اس چٹکی پر تکلیف کا احساس نہیں کرتا تو ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے بیماری کے آنے پر تکلیف روحانی کا کیا خیال کرے گا گو جسم کو تکلیف ہو رہی ہے، مگر جسم کی تکلیف کا احساس نہیں، اس کے قلب میں تسلیم آ چکی ہے۔

محبت عمل کو آسان کر دیتی ہے:

جب یہ ہے تو بھلا ذاتِ باری تعالیٰ، اس محبوبِ حقیقی کی طرف سے کسی کام کے کرنے کا حکم آوے گا، تو جس جسم سے اس کام کو کیا جاتا ہے وہ اس کے کرنے میں کیا تکلیف کا احساس کرے گا؟ بلکہ ہرگز نہیں اس کام کو نہ کرنے میں تکلیف کا احساس کرے گا اس کو نماز کے پڑھنے میں تکلیف کا کیا احساس ہوتا نہ پڑھنے میں احساس آئے گا کہ ہائے اس کام کو کرتا تھا وہ مجھ سے رہ گیا۔ روئے گا کہ میرا دعویٰ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بلکہ شدت تعلق کا ہے تو اس کا بتلایا ہوا یہ حکم مجھ سے کیوں رہ گیا؟ اس شدت تعلق والے کی کمر ٹوٹ گئی۔ اب جب تک اس کا بدل نہیں کر لیتا کمر سیدھی نہیں ہوتی' اس کو چین نہیں آتا۔

ترکِ عمل بھی زیادتِ تعلق کا سبب ہے:

لیکن اس بے چینی میں بھی چین ہے، اس لئے کہ اس بے چینی میں حق تعالیٰ کے ساتھ پھر شدت تعلق ہو گیا، ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف توجہ اور زیادہ سے زیادہ ہو گئی۔ اس شدتِ تعلق والے مؤمن نے چھوڑا نہیں تھا بلکہ چھوٹ گیا تھا۔ بندۂ مؤمن کامل مؤمن کی اگر کسی وقت کی نماز چھوٹ گئی کہ سو گیا، بیدار نہ ہو سکا تو بے چین ہو گیا۔ اس بے چینی میں چین آ گیا، اس طرح کہ یہ بے چین ہوا' رویا' گڑگڑایا' ذاتِ باری تعالیٰ نے اس کو اس بہانہ سے اپنی طرف اور غایت توجہ کے ساتھ لگا لیا، اسی طرح باری تعالیٰ ذرا چٹکی بھی لے لیتے ہیں کہ اس کو اطاعتِ کاملہ کے ساتھ توجہ تو ہے ہی لاؤ، ذرا چٹکی بھی لے لو وہ اس طرح کہ اچھا خاصہ معمول ادا کر رہا تھا کہ معمول چھڑوا دیا، جو واجبات میں سے نہیں صرف مستحبات میں سے تھا، اس چھوٹنے پر بے چینی آئی، بے چین ہوا، حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھا، چین آ گیا ایک چھوڑنا ہوتا ہے اور ایک چھڑوانا۔

واقعہ لیلۃ التعریس :

حدیث میں واقعہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر فرما رہے تھے، چلتے چلتے آخر رات ہوگئی، تھکان ہوگیا، صحابۂ کرامؓ تو رسول اللہ ﷺ کے عاشق تھے۔ تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ سوجائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم بھی سوجاؤ۔ رسول اللہ ﷺ ایسے پیر نہیں تھے کہ مریدوں کی راحت کا خیال نہ فرماویں۔

اس لئے فرمایا تم بھی سوجاؤ۔ اب سوال ہوا کہ جب سب سوجائیں گے تو صبح کی نماز کہیں ایسا نہ ہو قضا ہوجائے کہ سورج نکل آئے اور سب سوتے رہ جائیں۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں جاگوں گا، آپ سوجائیں۔ اب اطمینان ہوگیا، چنانچہ تمام صحابہؓ اور رسول اللہ ﷺ سوگئے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ برابر جاگتے رہے، یہاں تک کہ جب صبح ہونے میں کچھ دیر باقی رہ گئی تو اونٹ کے کجاوے سے ٹیک لگالی۔ بس ٹیک لگانا تھی اور حضرت بلالؓ کو نیند آنا تھی، وہ بھی سوگئے جب وہ بھی سوگئے تو اب بیدار کون کرے، سورج نکل آیا، سورج کی شعاعیں رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور پر پڑگئیں، آپ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو سورج نکل آیا، تمام صحابۂ کرامؓ بے چین ہوگئے، بے قرار ہوگئے کہ صبح کی نماز قضاء ہوگئی۔ آپ ﷺ نے ان بے چینوں کو تسلی دی۔

فکرمند اور بے فکر کا فرق :

جو شخص اپنی آخرت کی فکر اور اصلاحِ نفس کی فکر کھاتا رہتا ہے، اس کو تسلی دی جاتی ہے اور جہاں بے فکری ہوتی ہے، اس پر فکر ڈالی جاتی ہے کہ تم سے فلاں معمول قضا ہوا، تم آٹھ نفلیں پڑھو تاکہ فکر پیدا ہو اور جہاں سے پہلے فکر ہوتی ہے، اس سے کہا جاتا ہے کوئی فکر کی بات نہیں۔ یہاں بھی رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا،

تمہاری طرف سے اختیاری نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا کہتا ہوں لاتفریط فی النوم اس نیند میں کوتاہی نہیں ہے۔ یہ ایک تکوینی بات تھی جو ہوگئی اور تکوین سے بھی تشریع مقصود ہے، یعنی اگر نماز قضا ہو جائے تو اس کے ادا کرنے کا کیا طریق ہے۔ صحابۂ کرامؓ کے عمل سے یہ بتلانا مقصود تھا۔ تو تھی تو یہ تکوین، مگر بن گئی تشریع اس لئے کوئی فکر کی بات نہیں، پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس جگہ سے چلو۔ دوسری جگہ چل کر ہم نماز ادا کریں گے۔ یہاں شیطان کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ آگے چل کر اذان کہی سنتیں پڑھیں، پھر تکبیر کہی گئی اور جماعت سے نماز پڑھی۔ طریقہ معلوم ہوا کہ جب نماز قضاء ہو جائے تو اذان واقامت کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھی جائے۔

تو یہ نماز صحابۂ کرامؓ سے چھوٹ گئی تھی، اس چھوٹ جانے پر بھی غم ہوا۔ یہ ہے اطاعت تعلق مع اللہ، اسی کو شدتِ تعلق مع اللہ کہتے ہیں۔ اس شدتِ تعلق کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی مستحب معمول بھی ترک ہو جائے تو غم آ گیا، اس غم کے اندر بھی مزہ ہے، اس رونے کے اندر بھی مزہ ہے کہ اور زیادہ تعلق مع اللہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ یہ غم اور رونا زیادتِ تعلق مع اللہ کی عملی شہادت ہے اور منجانب اللہ بشارت آ رہی ہے کہ تم کو میرے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہے کہ ایک مستحب کے چھوٹ جانے پر تمہارا یہ حال ہے، پس بظاہر یہ غیر مطمئن ہے، مگر اس کی طمانینت کہیں نہیں گئی۔

صحابۂ کرامؓ کا عشق، طبعی روحی تھا:

ارے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عشق عقلی ہی نہیں تھا، ارے طبعی سے بھی زیادہ طبعی روحی تھا۔ حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے کہ آپ رات کو چارپائی کے پاس پیشاب کا برتن رکھ لیا کرتے تھے کہ رات میں پیشاب آئے تو اس میں فارغ ہو لیں۔ (نشر الطیب ناقلا عن شمیم الحبیب: ص:۱۶۲۔ از: محشی) صبح کو ایک صحابیہؓ کو دیا کہ پھینک آئیں۔ انہوں نے

خیال کیا واہ، واہ آج تو موقع ملا ہے۔ اس پیشاب کا محل کوئی دوسری جگہ کیوں مقرر کروں اے اس پیشاب کا محل میرے اس مٹکا یعنی پیٹ سے بہتر اور کیا ہوگا، سو رسول اللہ ﷺ کے پیشاب کو پی گئیں۔ رسول اللہ ﷺ کا پیشاب پاک ہے اور سنئے! آپ نے قضاء حاجت فرمائی۔ زمین آپ کے فضلہ کو نگل گئی۔ زمین بھی آپ کی عاشق ہے کہ پھٹ گئی اور آپ کے فضلہ کو نگل گئی تو بھلا زمین جس کو بے حس خیال کرتے ہیں، جب وہی آپ پر عاشق ہے تو انسان تو آپ کا حقیقی پروانہ ہے، پھر اس کو کسی کی ملامت کی کیا پروا' وہ صحابیہؓ پیشاب پی گئیں۔

ترکِ مستحب پر رنج کبھی کیفیت شوقی سے ہوتا ہے :

کسی مستحب کے ترک پر غم یہ درحقیقت غم نہیں بلکہ شوقی کیفیت کا ظہور ہے۔ مؤمنوں کو جنت میں داخل ہونے کے بعد کسی قسم کی کوئی حسرت نہیں ہوگی لیکن حسرت ہوگی تو اس بات پر کہ دنیاوی حیات میں میرا فلاں سانس ذکر سے خالی کیوں گیا؟ لیکن وہ حسرت غم کی نہیں بلکہ ایک شوقی اور خیالی کیفیت ہوگی کہ اس میں بھی ایک ذوق ہوگا۔ یہ ایک نظیر اہلِ جنت کی پیش کی ہے، اسی طرح دنیا کے اندر مطیعِ کامل کا کوئی مستحب معمول چھوٹ گیا تو گویا کہ اس مطیعِ کامل کو جنت الفردوس کا مزہ آ گیا کہ جیسے جنت میں ترکِ ذکر پر حسرتِ ذوق ملی ہوئی ہوگی، اسی طرح دنیا میں بھی ترکِ معمولِ مستحب پر یہ کیفیت ہوگی۔ تو مؤمن کو دنیا میں ہی جنت الفردوس کا ذائقہ آ گیا، کھانا تو پھر دیکھا جائے گا ذائقہ تو آ ہی گیا۔

تسبیح کا اثر اطاعتِ کاملہ ہے :

تو جو لوگ ہاتھ میں تسبیح لے کر ذکر کرتے رہتے ہیں کہ زبان چل رہی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ تسبیح پڑھنے والے کے دل میں بھی اس تسبیح کا اثر ہے یا خالی زبان ہی چل رہی ہے۔ اگر یوں کہتا ہے کہ ہاں میرے دل میں بھی ذکر ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ جب زبان بھی

ذاکر ہے اور دل بھی ذاکر ہے تو کیا باری تعالیٰ کے حکم کی ہر موقع پر صحیح اطاعت کرنا بھی تمہارے اندر ہے؟ اگر صحیح اطاعت بھی ہے تو مبارک اور نہیں ہے تو تیرا عمل شہادت دے رہا ہے کہ صرف زبان پر تسبیح ہے دل میں تسبیح نہیں ہے، اگر ہے تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف تجھ سے کیوں صادر ہو رہا ہے، کہ کسی نے کوئی ذرا خلافِ طبیعت بات کہہ دی تو لڑنے کیوں لگا۔

معلوم ہو گیا کہ یہ تسبیح بس زبان تک ہے، گلے میں اٹک گئی، ابھی نیچے نہیں اُتری، اگر نیچے اُترتی تو دل کے اندر پہنچتی اور پھر تیرے اندر اطاعتِ کاملہ کا نام ہے، چاہے زبان پر ذکر ہو، چاہے نہ ہو، حق تعالیٰ کا ذکر دھیان دل میں ہو، چاہے نہ ہو، مگر جس موقع پر جس اطاعت کو صحیح طریقہ سے کمال درجہ پر کرنا چاہئے تھا وہ ہے تو ذکر ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو اگرچہ زبان پر ذکر ہے، مگر ذاکر نہیں ہے۔

ملا جامیؒ کی توبہ کا واقعہ:

بعض اہل اللہ کی ظاہری حالت دیکھ کر دھوکہ ہو جاتا ہے جیسا کہ ملا جامیؒ کو دھوکہ ہو گیا تھا جس کا واقعہ یہ ہے کہ ملا جامیؒ تلاشِ شیخ میں نکلے، خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی خدمت میں پہنچے، اس زمانہ میں یہ نقشبندی مشائخ میں سے تھے، وہاں دروازہ پر دربان بیٹھا ہوا ہے، بلا اجازت اندر نہیں آسکتے، چنانچہ اجازت لی، جب پہنچے تو دیکھا شیخ زرق، برق لباس پہنے ہوئے، گدّے، تکئے لگائے ہوئے بیٹھے ہیں، قالین بچھے ہوئے ہیں، فرش، فروش عمدہ قسم کے لگے ہوئے ہیں، دربان دروازہ پر ہے۔ تو یہ ملا جامیؒ بڑے عالم تھے۔ اس لئے خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی ظاہری حالت دیکھ کر سمجھے یہ کیا بزرگ ہوں گے اور پڑھا ......

ع — نہ مرد آنکہ دنیا دوست دارد

یعنی وہ مردِ خدا نہیں جو دنیا کو دوست رکھے، پھر اندر نہیں گئے بلکہ چق کے پاس

سے ہی واپس ہو گئے اور مسجد میں آ کر رات کو سو گئے، خواب میں دیکھا کہ میدانِ حشر قائم ہے، نفسی، نفسی ہو رہی ہے، ملاجی کی بھی نوبت آ گئی ان پر کسی کا قرضہ تھا وہ تقاضا کر رہا ہے، وہاں ملاجی کے پاس قرضہ ادا کرنے کو کیا رکھا تھا، کوئی جان پہچان نہیں' سخت حیران ہیں کہ دیکھا ایک پالکی چلی آ رہی ہے۔

اس میں کوئی صاحب سوار ہیں، خدام ساتھ ہیں انہوں نے پوچھا یہ پکڑ دھکڑ کیسی ہو رہی ہے، لوگ کیوں جمع ہیں؟ خدام تحقیق کرنے لگے اور آ کر عرض کیا کہ حضرت کوئی صاحب ملا جامی ہیں' ان پر کسی کا قرضہ ہے، قرض خواہ مطالبہ کر رہا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہاں میرے پاس دینے کو کچھ نہیں' یہ سُن کر انہوں نے فرمایا اوہو یہ بات ہے اچھا جاؤ ہم نے جو یہاں پیشگی جمع کر رکھا ہے اس میں سے ملا جامی کا قرضہ ادا کر دیا جائے۔ چنانچہ ملا جامی کا قرضہ ادا ہو گیا، چھٹکارا ہو گیا، پالکی اُٹھ کر چلی، ملا جامی نے جو جھانک کر دیکھا تو متحیر ہو گئے کہ یہ تو وہی ہیں جن کو چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں : اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ.

یعنی تمام دو ۔ ت جو دنیا کے اندر دنیوی حیثیت سے ایک دوسرے کا دوست بنا ہوا تھا، قیامت کے دن وہ ایک دوسرے کا دشمن بن جائے گا کہ میں تیرے کہنے میں آ گیا تھا، میں تو نماز کو جا رہا تھا تو نے روک لیا تھا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں : اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ۔ سوائے متقیوں کے کہ ان کی دوستی باقی رہے گی۔

اس میں حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ اگر دوستی کرنا ہو تو متقی سے کرو، دنیا میں بھی اس سے نفع ہو گا اور آخرت میں بھی نفع ہو گا۔

الغرض ...... جب ملا جامیؒ نے دیکھا کہ یہ تو وہی ہیں جن کو چھوڑ کر چلا آیا تھا گھبرا گئے اور گھبراہٹ میں آنکھ کھل گئی۔ رات کا وقت تھا صبح کرنا مشکل ہو گئی، خدا خدا

کر کے صبح ہوئی، نمازِ صبح سے فارغ ہوئے وہ بزرگ بھی نماز سے فارغ ہوئے، ملا جامیؒ لپکے اور پیروں میں گر پڑے، ان بزرگ نے پکڑ لیا کہ ارے لڑکے کیا بات ہے؟ عرض کیا معافی چاہتا ہوں مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، میں نے وہ مصرعہ پڑھ کر چلا آیا تھا۔ بزرگ نے فرمایا کہ جب تم نے وہ شعر اپنی خوشی سے پڑھا تھا اب ہمارے کہنے سے پڑھ دو، عرض کیا حضرت وہ تو میری غلطی تھی، فرمایا نہیں ہماری خوشی ہے کہ تم پڑھ دو۔ چنانچہ پڑھ دیا ......

ع نمرد است آنکہ دنیا دوست دارد

فرمایا کہ مصرع ناقص ہے اس میں کمی رہ گئی۔ اس کے ساتھ دوسرا مصرعہ بڑھانا چاہئے۔ ع اگر دارد برائے دوست دارد

اب پورا شعر اس طرح ہوگیا ....

نمرد است آنکہ دنیا دوست دارد
اگر دارد برائے دوست دارد

تم نے ٹھیک کہا کہ اس کو مردِ خدا نہیں کہنا چاہئے جو دنیا کو دوست رکھے لیکن اگر رکھے تو اس دوست کے لئے رکھے کہ اس مال کو دوست کے کہنے کے مطابق کمایا اور اس دوست کے کہنے کے مطابق خرچ کیا۔

خلاصۂ مجلس :

خلاصہ یہ ہے کہ ترکِ طلب خلق اور سعی طلب حق ہو، یہی وہ چیز ہے جس کے لئے آپ نے سفر کیا ہے، مہمان خانہ (خانقاہ) میں قیام پذیر ہوئے ہیں۔ کیا یہ ایک مجلس کافی نہیں ہوسکتی؟ سوچو صرف ایک مجلس کافی ہوسکتی ہے اس طرح کہ اپنے اختیار سے اعضاءِ باطنی سے اخلاقِ رذیلہ کا دفع اسی وقت اور اخلاقِ حمیدہ کا حصول اسی وقت' بس صالح بن

گئے۔ صالح بن کر چلے گئے، توفیقِ الٰہی پر نظر رہے، نظر اپنی سعی پر نہیں اور دعا کرتے رہو۔ خلاصہ یہ کہ جسماً بھی اطاعتِ کاملہ اور قلباً بھی اطاعتِ کاملہ اور روحاً بھی اطاعتِ کاملہ اور مالاً بھی اطاعتِ کاملہ۔ کسب بھی طاعتِ کاملہ کے ساتھ اور اس کا صرف کرنا بھی طاعتِ کاملہ کے ساتھ۔ فضول خرچی سے نکل گیا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔

فضول خرچی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ۔

فضول خرچی کرنے والے شیطان کے دوست ہیں۔

اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ مطیعِ کامل کون ہے؟ تو کیا کہیں گے؟ ذکرِ کامل، ذکرِ حقیقی کرنے والا ہے، اور ذکرِ حقیقی کرنے والا کسے کہتے ہیں؟ تو آپ جواب دیں گے مطیعِ کامل۔ اور یہی اشد تعلق مع اللہ اور یہی مطلوب ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔حق تعالیٰ سے ہم کو تعلق مع اللہ تو ہے ہی مگر اللہ تعالیٰ کا فرمان اشد حُبًّا لِّلّٰهِ کا ہے جس کی پہچان اطاعتِ کاملہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

نویں مجلس

اتباعِ اکابر اور زیادت فی العلم

ایک صاحب رئیس قسم کے آئے تو فرمایا: یہ صاحب بہت بھولے ہیں، سیّد ہیں، وزیر ہیں، وکیل بھی ہیں، ان سے عہدہ داری کی حیثیت سے میں نے ایک بات کہی کیونکہ نو تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے ان سے کہا کہ یہ جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے، حضرت والا کے ارشادات ہیں اور حضرت والا کے ارشادات قرآن و حدیث کے ارشادات کی تشریح ہیں۔

اکابر اور ہم میں فرق:

جو کچھ علم قرآن و حدیث میں اکابر کو ملا ہے ہمیں تلاش کے بعد بھی نہیں مل رہا۔ اکابرین پر کامل اعتماد ہونا چاہئے اور آج کل ہم جیسے چھوٹوں کو اتنا بھی علم نہیں کہ کسی دریا میں سوئی ڈالیں اور سوئی کے نکوے پر پانی لگ کر آ جائے، ہمیں تو ان کے مقابل اتنا علم بھی نہیں اور ہم اکابرین کو اپنا جیسا سمجھنے لگے، علم اور چیز ہے اور معلومات اور چیز ہے۔

لوگوں کی چار اقسام ہیں :

لوگوں کی چار اقسام ہیں: تو ایک وہ شخص ہے جس میں عقل بھی ہو اور ہمت بھی ہو اور دوسرا اس کا عکس کہ نہ عقل ہو نہ ہمت' تیسرا وہ شخص ہے کہ عقل تو ہے مگر ہمت نہیں' چوتھا وہ شخص ہے کہ ہمت تو ہے' مگر عقل نہیں' تیسرے کا عکس۔ تو بہترین سے بہترین اور اصلی سے اصلی وہ مؤمن ہے کہ جس میں عقل بھی ہو اور ہمت بھی ہو اور جس میں عقل تو ہے مگر ہمت نہیں' ہمت' جرأت' دلیری' مستقل مزاجی' اپنی جگہ ڈٹا رہنا نہیں، تو ایسا شخص اپنا نقصان کرے گا' ذلیل ہوگا' نفع سے محروم رہے گا' لیکن ایسے شخص سے کوئی فتنہ' کسی قسم کا جھگڑا پیدا نہیں ہوگا، ایسا شخص خود اپنا تو نقصان کرے گا لیکن اس سے دوسروں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ شخص جھگڑے سے خالی ہے اور چوتھا شخص کہ جس کے اندر ہمت تو ہے لیکن عقل نہیں ایسے شخص سے فتنہ ہوگا کہ عقل نہ ہونے کی وجہ سے بات کے موقع ومحل کو سمجھے نہیں، جرأت کرے گا، آگے بڑھ کر سامنا کرے گا، فتنہ کھڑا ہوگا' کیونکہ وہ نہ مردم شناس ہے' نہ کلام پر قادر ہے۔ اصلِ تصوف کا مدار یہ ہے۔ نہ کہ صرف نفلیں پڑھ لیں' ضربیں لگالیں' اس سے کچھ فائدہ اپنا ہو گیا تو ہو گیا ہو' مگر اب تو ضربوں کا زمانہ بھی نہیں رہا، اب تو زمانہ جہرِ مفرط وشدید کا بھی نہیں رہا۔

حضرت والاؒ کی تعلیم متقدمین کا نچوڑ ہے :

متقدمین اکابرین کے ارشادات اور ان کی تعلیمات ان کے زمانے کے اعتبار سے انہی لوگوں کے ساتھ خاص تھیں اور اس زمانہ میں حضرت والا حضرت مجدد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی جو تعلیمات ہیں' ان پر چلنے میں ہی نفع اور ضرر کا دفعیہ ہے، متقدمین کی کتابیں متقدمین کے لئے ہیں' ہم جیسوں کے لئے حضرت والا کی کتابیں، متقدمین کی کتابوں کا

زمانہ کی پوری رعایت رکھتے ہوئے نچوڑ ہیں۔ کیونکہ حضرت والا نے زمانہ کو پہچانا تھا، مختلف قسم کے اشخاص کو دیکھا، برتا تھا اور ان کے حالات و معاملات کا تجربہ کیا تھا۔ اب حضرت والاؒ کی کتابیں دیکھنا چاہئیں۔

مطالعۂ کتب میں بھی اتباعِ شیخ ضروری ہے :

لیکن اس میں بھی یہ تفصیل ہے اگر کسی کو واقعی تعلق کسی سے اعتقاد و اعتماد کا ہو جائے تو جو کتاب وہ متعین کرے اس کو دیکھنا چاہیے، اس کے سوا کسی دوسری کتاب کو نظر اُٹھا کر نہ دیکھنا چاہیے، دوسری کتاب جب وہ تجویز کرے تب دیکھے، اور طالب علم کو اپنے زمانہ طلب علم میں درسیات پورے انہماک کے ساتھ پورے جذبہ کے ساتھ اپنے آپ کو پورا اس میں لگا دے۔

ضرورتِ طبعیہ اور ضرورتِ شرعیہ سے جو وقت بچے وہ طالب علم طلب علم میں خرچ کرے، بس اپنے آپ کو عیناً ولساناً طلبِ علم میں منہمک کر دے۔ اس طرح طالب علم جب طلبِ علم میں مشغول ہوگا تو وہ علمِ نافع بنے گا ورنہ دوسری مشاغل اگر مانع ہوں گی تو علم حاصل ہی نہ ہوگا اور اگر حاجب ہوں گی تو حصول میں نقص رہے گا۔

استاذ بھی دراصل طالب علم ہی ہے :

رہا استاد اور مدرس تو وہ بھی طالب علم نہیں رہی ہے۔ یہ تو بقائے انتظام اور حفاظتِ مراتب کے لئے ہماری اصطلاح اور ہمارا ایک محاورہ ہوگیا ہے کہ وہاں بیٹھا متعلم ہوگیا' یہاں بیٹھا معلم ہوگیا، یعنی زیادتِ علم میں لگ گیا اور زیادتِ علم سے شکم بھرتا ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے رسولِ مقبول ﷺ کو فرمایا ہے: قُلْ رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا۔

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کو علم پہلے سے ہے، لفظ ''زِدْ'' بتلا رہا ہے جس کے معنی

ہیں زیادہ کیجئے تو لفظ " زِدْ " سے معلوم ہوا کہ علم تو پہلے ہی سے ہے آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

انا اٰتیت علم الاوّلین و الاٰخرین، تورات کا بھی علم ہے انجیل زبور صحفِ ابراہیم و موسیٰ اور صحفِ آدم کا بھی علم ہے (علٰی نبیّنا و علیھم الصلوٰۃ والسّلام) مگر پھر حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یوں کہو اللہ تعالیٰ میرے علم کو اور زیادہ کیجئے۔

معلوم ہوا کہ دوسری چیزوں کی تحصیل میں تو قناعت ہو سکتی ہے مگر تحصیلِ علم میں قناعت نہیں۔

رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا کی عجیب تفسیر :

یہ کلام اللہ کی بلاغت ہے کہ دعا زیادتِ علم کا حکم دے کر حاصل شدہ علم کی حفاظت کا بھی حکم کنایۃً دیدیا اور جو حاصل نہیں ہے اور حاصل کرنے کے قابل ہے اس کی زیادت کا حکم صراحۃً فرمادیا اور جو حاصل کرنے کے قابل نہیں ہے اس سے اعراض کرنے کو بھی فرما دیا کیونکہ جو علم حاصل کرنے کے لائق نہیں ہے جب تم اس میں لگ گئے تو جو علم ضروری تھا اور اس میں زیادت کا حکم تھا، اس میں نقص ہو گیا، علم غیر ضروری حاجب ہو گیا، تو علم ضروری میں نقص ضرور آئے گا۔ (ھکذا فی بیان القرآن للمجدد تھانوی و فی معارف القرآن للفقیہ الباکستانی)

آیت کی تفسیر یہ ہے کہ جو علم حاصل ہے اس حاصل شدہ کی تو حفاظت میں غفلت نہ کرے اور اس کی حفاظت کے ساتھ زیادتِ علم میں لگا رہے اور علم غیر نافع سے اعراض کرتا رہے۔

علمِ غیر نافع، لائقِ اعراض ہے :

جو علم نفع نہ دے وہ لائقِ اعراض ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے طلبِ علم کے سلسلہ میں دو قسم کی درخواست ذاتِ باری تعالیٰ سے کی۔ ایک تو اس جملہ کے ساتھ :

اللّٰھم انی اسئلک علمًا نافعًا۔

اے اللہ! میں تجھ سے علمِ نافع کی درخواست کرتا ہوں۔

نافع کی قید لگادی جس سے معلوم ہوگیا کہ جو علم نافع نہ ہو وہ لائقِ تحصیل نہیں اور دوسرے اس عنوان کے ساتھ گو مضمون ایک ہی ہے:

اللھم علمنی ماینفعنی۔

اے اللہ! مجھ کو اس چیز کا علم دیجئے جو مجھ کو نفع دے۔

ان دونوں ارشادوں سے معلوم ہوگیا کہ جو علم نافع نہیں ہے، اس کا ارادہ کرنا ممنوع ہے، لیکن پھر بھی صراحۃً رسول اللہ ﷺ نے علم غیر نافع سے پناہ چاہی ہے۔ ارشاد ہے: **اللّٰھم انّی اعوذبک من علمٍ لاینفعنی۔**

اے اللہ میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے۔

معلوم ہوا کہ علم غیر نافع میں اگر وقت خرچ کیا تو تضییعِ اوقات ہے اور اگر مال خرچ کرنا پڑا تو اضاعتِ مال ہے۔ یہ سب آخرت کا کام ہے کیونکہ آخرت کی کامیابی تحصیلِ عمل پر موقوف ہے اور تحصیلِ عمل تحصیلِ علم پر موقوف ہے۔ اس لئے طلبِ علم میں خود کو لگانا یہ آخرت ہی کا کام ہے۔ جب طلبِ علم آخرت کا کام ہے تو اسی لئے ایک جگہ غیرت دلانے کے لئے عجیب عنوان اختیار فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

الدنیا مزرعة الأخرة۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

طلبہ کو حصولِ علم کی تلقین:

اگر کسی کسان کی زندگی دیکھی جائے تو از ابتداء تا انتہاء شروع سے آخر تک جب تک غلّہ گھر میں نہ آجائے کس قدر مشقت اُٹھاتا ہے، نہ گرمی دیکھتا ہے نہ سردی' نہ دن دیکھتا ہے نہ رات' بہت دیکھا جائے کہ دنیا کا طالب اس طرح چست و چالاک رہے اور اس علم کا

طالب جو مقدمہ عمل ہے' اس میں یہ تکاسل اور یہ تکاہل۔ اے علمِ دین کے چاہنے والو! تمہاری غیرت کو کیا ہوا؟ کھیتی کرنے والوں سے سبق لو جو دنیاوی معمولی فانی زندگی کے لئے اپنے آپ کو اس طرح کھپا رہا ہے تو تم کو باقی زندگی مکمل عمدہ بنانے کیلئے کہ وہاں ذرّہ برابر ضرر نہ پہنچے اپنے آپ کو علم میں منہمک کرنا چاہئے۔ جس کا طریقہ اوپر بیان کیا گیا کہ اُمورِ طبعیہ، سونا، کھانا، پیشاب، پاخانہ وغیرہ اور اُمورِ شرعیہ نمازِ پنج وقتہ وغیرہ کے علاوہ تمام اوقات میں طلب علم میں منہمک ہونا چاہئے۔ طالبِ علم تین چیزوں کا اہتمام کرلے' علم آجائے گا اگر کوئی مقام فی الحال سمجھ میں نہ بھی آیا تو قریب ہی سمجھ میں آجائے گا۔ ایک تو مطالعہ' دوسرے اسباق کی پابندی بکمالِ غور اور دل کی حاضری کے ساتھ، تیسرے تکرار کرنا۔

مدرس کا مقام متدرس سے بلند ہے، یہ مدرس زیادتِ علم میں لگا ہوا ہے، جب معلم سنجیدہ' صاحبِ وقار' صاحبِ متانت اور صاحبِ علم ہوگا اور ضروریاتِ شرعیہ کا کامل طریقہ اختیار کئے ہوگا' تو متعلم پر بہترین اثر ہوگا، چنانچہ جو ہمارے بزرگ گزرے ہیں اُن کے اساتذہ ایسے ہی ہوتے تھے یا شیخ ہوتے تھے یا کالشیخ ہوتے تھے، سیّد وہی نہیں جو خاندانی اعتبار سے سیّد ہو بلکہ سید القوم خادمھم قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے۔ اب سیّد تو ہیں مگر مخدومیت کی شان ایسی پیدا ہوگئی کہ خادمیت کا نام ہی نہیں۔ مدرس ہو کر ایسا بیٹھ گیا کہ خادمیت جس طریقِ زندگی کو متقاضی ہے ادھر توجہ ہی نہیں۔

طلبہ کے مطالعہ کا طریقہ:

طلبہ کو مطالعہ اس نیت وطریق سے کرنا چاہئے گویا کہ اسے صبح پڑھانے جانا ہے، پڑھنے نہیں جانا ہے جب یہ نیت ہوگی تو مطالعہ کا طریقہ کچھ اور ہوگا، وہ تلاش کرے گا کہ عبارت پر یہ نمبر چھ (۶) کیوں پڑا ہوا ہے، اس کے اوپر حاشیہ پر نظر گئی تو وہاں بھی نمبر چھ (۶) پڑا ہے، وہ سوچے گا کہ اوہو اس کے متعلق حاشیہ میں کچھ لکھا ہے، بس وہ حاشیہ دیکھنا

شروع کردے گا اور ذہن کھلنے اور چلنے لگے گا۔

ایک ذہین طالب علم کی حکایت:

ایک طالب علم استاد کے پاس پڑھتا تھا ایک مقام پر اس نے استاد کی تقریر پر اعتراض کرنا شروع کردیا، استاد کا ناک میں دم آ گیا اور کہا ارے بھائی! یہاں تو اس قسم کے اشکالات نہیں ہیں، یہ تم کہاں سے نکال رہے ہو؟ عرض کیا: حضرت! رات میں مطالعہ کر رہا تھا دیکھا، عبارت پر دس لکھا ہے میں سمجھا کہ یہاں دس اشکال ہوں گے تو رات بیٹھ کر یہ اشکالات میں نے گھڑے ہیں' ان کو بیان کر رہا ہوں۔ استاد نے کہا ارے بھائی! یہ نشان اشکالوں کا نہیں ہے بلکہ حاشیہ کا ہے۔ دیکھو! اس عبارت پر بھی دس لکھا ہے اور اوپر کونے پر بھی دس لکھا ہے۔ اس نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس کونے میں جس کو حاشیہ کہتے ہیں اس عبارت کے متعلق کچھ لکھا ہوا ہے۔ تم اس کو دیکھ لو حاشیہ میں اس کو کچھ حل کیا ہے۔ یہ نشان اس لئے ہے، نہ کہ اس میں اعتراضوں کی طرف اشارہ ہے۔

ذہن علمِ نافع میں چلانا چاہئے:

ذہن اس علم کی طرف چلانا چاہئے جو نافع ہو، خواہ مخواہ ذہن چلانا کہ استاد سے بھی بڑھ گیا، یہ تو تضییع اوقات ہے' کچھ حاصل نہیں بلکہ مضر ہے جسمانی صحت کے لئے بھی مضر ہے کہ دماغ جلد ضعیف ہو جائے گا اور علم ضروری کی زیادت کے لئے بھی مضر ہو گیا۔

نفسِ علم اور زیادتِ علم کا حصول:

اس کے بعد ایک بات اور بیان کرتا ہوں کہ نفسِ علم اور زیادتِ علم کے دو محل ہیں' ایک وہ شخص کہ اس کا ذہن زیادہ نہیں چلتا' اس کا حافظہ بھی اچھا نہیں ہے یا حافظہ اور ذہن تو اچھا ہے لیکن وہ فارغ البال نہیں ہے، اس پر اہل وعیال کی معاش کا کافی بوجھ آ پڑا ہے' تو

اس کو نفسِ علم کی تحصیل پر کفایت کر لینا چاہئے کیونکہ ارشاد ہے :

طَلَبُ العلمِ فریضۃ علٰی کلّ مسلم۔

علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

اور جو شخص ذہین ہے، حافظہ بھی اچھا ہے اور متعلقین کے معاش کی ذمہ داری سے بھی فارغ البال ہے، اس کو زیادتِ علم میں لگنا چاہئے کہ ارشاد ہے: وقل ربّ زدنی علمًا ایسا شخص کہ انسانی زندگی کی جو ضروریاتِ شرعی معاشی یا معادی ہوں یا معاشرتی و معاملاتی ہوں یا من حیث العبادت ہوں' ان سب کے احوال پر حاوی ہو۔

علمِ تفصیلی کا سیکھنا فرضِ کفایہ ہے :

اہلِ علم کی ایک ایسی جماعت کا ہونا تمام مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے۔ تو نفسِ علم کا حاصل کرنا اپنی اپنی ضروریات کے اعتبار سے فرضِ عین ہے اور جمیع علوم کا تفصیل کے ساتھ حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے' اگر تمام مسلمانوں میں کوئی عالم بھی علوم کا حاوی نہ ملے تو سارے مسلمان گنہگار رہوں گے۔

الغرض ...... زیادتِ علم کا حصول ہر ایک کے لئے ضروری نہیں ہے، کیونکہ ربّ زدنی علمًا کا خطاب کیسی ذات کو ہو رہا ہے؟ وہ ذات ایسی ہے کہ معاشی حیثیت سے استغناء ہے' توکل ہے' قناعت ہے' وہ ذات کون ہے؟ وہ نبی کریم ﷺ کی ذات ہے۔

عالم کی صفات :

یہیں سے یہ نکلا جو شخص زیادتِ علم کا طالب ہے، اس کے اندر قناعتی شان، توکلانہ شان' فراغتِ ذہنی' فراغتِ قلبی ہونا چاہئے۔ اپنی زندگی زیادتِ علم میں ہی صرف کر دے۔ یہ شخص صحیح معنیٰ میں نائبِ رسول ہے۔ اس کو چاہئے کہ تبلیغِ احکام میں لگا رہے،

عقائد کی بھی تبلیغ کرے، عبادات کی بھی تبلیغ کرے، معاملات کی بھی تبلیغ کرے، معاشرت کی بھی تبلیغ کرے اور اخلاق کی بھی تبلیغ کرے۔ اب یہ شخص اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ساتھ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کا بھی مصداق ہے۔

مفتی کیسے طالب علم کو بنانا چاہئے:

جو شخص اچھی استعداد والا ہے، ذمہ داری کو سمجھنے والا ہے، امانت وضمانت اور دیانت کو جانتا، سمجھتا ہے، اپنے کو اچھی طرح جانچ لے پرکھ لے، اس کو علم کی تکمیل کرنا چاہئے، زیادتِ علم میں لگنا چاہئے، افتاء وغیرہ سیکھنا چاہئے ورنہ نہ سیکھے، اسی ذوقِ علمی کے ساتھ قلبی قناعت، توکل علی اللہ اور استغناء بھی ضروری ہے، حرص وطمع سے نفور ہو، ورنہ تو روپیہ کے لالچ میں غلط فتویٰ دے گا، ایسے کو مفتی بنانا حرام ہے۔ جہاں مفتی بنانے کا وجوب ہے وہیں حرام بھی ہے۔

الغرض ...... مفتی بنانے کے لئے ایسے کو داخل کرنا چاہئے کہ اس کی استعدادِ علمی بھی صحیح ہو کہ مطالعہ سے بے پڑھی کتاب کو بھی صحیح نکال لیتا ہو، نہ اس نے عالمگیری پڑھی نہ قاضی خان پڑھی، نہ شامی پڑھی، نہ درمختار پڑھی مگر استعدادِ علمی ایسی وافر ہے کہ مطالعہ سے مشکل مقام کو بھی حل کر لیتا ہے اور بالخصوص اس زمانہ میں تو مفتی کو بہت ذہین اور وافر استعداد والا ہونا چاہئے کہ عجیب عجیب معاملاتی اور معاشرتی حالتیں پیش آ رہی ہیں، اسی لئے اہلِ مدارس کو افتاء میں داخل کرنے کے لئے سخت امتحان لینا چاہئے۔ اس وقت بعض تجارتی صورتیں عجیب وغریب سامنے آ رہی ہیں۔ استفتاؤں کو دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ یا اللہ یہ کیا قصہ ہو رہا ہے تو اس زمانہ میں تو استعدادِ علمی اور عجیب قسم کی ہونا چاہئے۔ یوں تو تمام مفتی ہیں، مگر قیمتی نہیں اور جو قیمتی ہے وہ ہر مستفتی کے ساتھ نہیں ہو لیتا، وہ کسی کا دباؤ نہیں مانتا۔

رئیس فی العلم دباؤ نہیں مانتا :

ایک ہوتا ہے امیر' مالدار اور ایک ہوتا ہے رئیس' نواب' صاحبِ ریاست دونوں کے مزاج میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ صاحبِ ریاست رئیس ونواب کسی کا دباؤ نہیں مانتا۔ رئیسِ ریاست کا یہ مزاج ہے کہ وہ کسی رعیت کے فرد کے دباؤ میں کیوں آئے گا؟ اور جو دباؤ میں آ گیا وہ رئیس العلم نہیں ضعیف العلم ہے۔ اس میں تحصیلِ علم کے ساتھ طمع دنیوی بھی ہے، یہ طامع ہے اس لئے دباؤ مانتا ہے ورنہ عوام کا دباؤ خاص پر چہ معنیٰ؟ جو عوام اپنی خواہشات پورا کرنے کے لئے دباؤ مالی ڈال کر فتویٰ حاصل کر لیتے ہیں تاکہ سرخرو ہوں کہ میں نے تو فتویٰ لے کر یہ کام کیا ہے، ایسے عوام لائقِ ملامت ہیں اور وہ مفتی جو دباؤ میں آ کر فتویٰ دیدے رئیس العلم نہیں ہے، وہ امیر العلم نہیں ہے، غریب العلم ہے، رئیس میں استغناء ہوتا ہے۔ امارت کی شان استغنائی ہوتی ہے جو دولت مند رئیس نہیں ہے' امیر نہیں ہے' تجارتی' زراعتی طور پر دولت کی فراوانی کی وجہ سے دولت مند بن گیا ہے۔ اس کا مزاج رئیسانہ اور امیرانہ نہیں ہوتا، اس کا مزاج طامعانہ اور حریصانہ ہوتا ہے تو پیسے کی فراوانی اور ہے اور ریاست کی فراوانی اور ہے۔

منصبِ وہبی اور حاصل کردہ میں فرق :

منصبِ خداداد ی اور ہے اور خود حاصل کردہ منصب اور ہے، جس کو خداداد ی منصب حاصل ہوگا، اس کا دماغ عجیب شان رکھتا ہوگا، وہ خود حاصل کردہ منصب والے کے دماغ کی شان نہیں ہوسکتی۔ اس نے تو کھینچا تانی کر کے کشاکشی سے' دولت لٹا لٹا کر ایک منصب لے لیا، لیکن اس کا دماغ تو خود لالچی ہے، وہ تو پہلے ہی سے لالچی ہے، اب آ گیا منصب وعہدہ، تو اس نے تو خرچ ہی اس لئے کیا ہے، اِدھر دیدو' اُدھر لے لو' جب منصب مل

جائے گا' دو چار آدمی پاس آ کر بیٹھیں گے وہ لیتے رہیں گے، اِدھر دیتے رہیں گے۔

رئیسانہ مزاج والے کو خواہ خاندانی ہو یا خاندانی سے لئے ہوئے ہو، اس کو غلط جگہ بیٹھنے سے احتراز واجتناب ضروری ہے، ورنہ وہ خاندانی چیز بھی چلی جائے گی اور جو چیز کسی کی صحبت سے آئی تھی، وہ بھی چلی جائے گی، جیسے علم یہ خاندانی چیز نہیں، جب پیدا ہوا تو عالم نہیں تھا، بعد میں حاصل کرنے سے علم آیا ہے، تو جس سے علم حاصل کیا ہے وہ خاندانی تھا، اس سے متعلق ہو گئے تو اس کا خاندانی اثر طالب علم میں آ جاتا ہے۔ اس خاندان والے نے غیر کی صحبت نہیں اختیار کی، تو طالب علم غیر کی صحبت کیوں اختیار کرے۔ طلبہ کو غیر کی جگہ نہیں بلکہ خواص کی جماعت میں بیٹھنا چاہئے۔ تاکہ کہیں عوام کے طبقہ میں حقارت نہ ہو جائے۔

اہلِ علم کو مشتبہ جگہ سے بھی بچنا چاہئے :

طلبہ کو ایسی جگہ سے بھی پرہیز کرنا چاہئے جو شبہ کی ہو مثلاً سینما کے دروازہ پر کھڑے کسی عزیز کا انتظار کر رہے ہیں، تو لوگ اس کو مطعون کریں گے اگر وہ صفائی سے کہہ دیں کہ ایک عزیز کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تو عوام یہی کہیں گے کہ یہ بھی کوئی کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

الغرض ...... اہلِ علم کو مشتبہ جگہ میں بھی نہ بیٹھنا چاہئے تو ایسے لوگوں کے پاس بیٹھنا جو عوام کے طبقہ میں شامل ہیں کہاں درست ہے؟ تم اس کا خیال رکھو کہ ہم نے علم کس سے حاصل کیا ہے، وہ ماخوذ منہ کیسا ہے؟ اس نسبت کو خیال کرو جو تم کو اس کے ساتھ حاصل ہے، میری مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے کیونکہ جو علم ہم حاصل کرتے ہیں اس کے اصل معلم رسول اللہ ﷺ ہیں، انہی کے اعمال واقوال کو مدارسِ عربیہ میں پڑھایا جاتا ہے، لوگ کہیں گے یہ ہیں رسول اللہ ﷺ کے نائب۔ کیا اس علم کا یہی تقاضا ہے کہ اخلاق ایسے ہوں، معاملات ایسے ہوں' اس طرح آپس کا رہنا سہنا ہو، اسی طرح عوام کو بھی رسول

اللہ ﷺ کی عادات واخلاق کے خلاف سے بہت بچنا چاہئے ورنہ اغیار کہیں گے، دیکھو یہ ہیں نبی آخرالزماں ﷺ کی اُمت۔ کہتے ہیں رسالت ہمارے نبی پر ختم ہوگئی، لیکن نبی کو یہ عقیدۃً تو مانتے ہیں عملاً نہیں مانتے۔

دین صرف نماز میں منحصر نہیں :

نماز پڑھنا فرض ہے مگر مسلمانوں کا دین صرف نماز میں محصور نہیں ہے۔ دیکھو اس نمازی کا حال کہ اس سے دوسرے کو کیسی تکلیف پہنچ رہی ہے، دیکھو یہ کیسا نمازی ہے؟ کہ قرض لے کر دے نہیں رہا ہے۔ شاید علمِ نبی سے یہی پہنچا ہے کہ قرض لے کر مت دو۔ دیکھو ابھی اس نے دوسرے کو کیسا تکلیف دہ کلمہ کہا، کہ بیچارہ کا دل دُکھ کر رو رہا ہے، اس سے تو وہ نسبت جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہے خراب ہوگئی۔

الغرض ...... صاحبِ علم کو ایک نسبتی علمِ نافع من جانب اللہ پہنچایا ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہے۔ زندگی کے کسی عملی شعبہ کو اس میں نہیں چھوڑا گیا ہے۔

طالب علم کو کیسا ہونا چاہئے :

اسی طرح جب طالب علم کے ہاتھ میں میزان آئی تو وہ بھی مایۂ دل اور مستقبل کی حیثیت سے مولوی ہوگیا، ایک عام آدمی بھی طالب علم کو دیکھ کر کہتا ہے کہ آیئے مولوی صاحب اور ہاتھ میں آئی ہے میزان' جس کے معنیٰ ہیں ترازو' تو ہمارا عمل بھی تلا ہوا ہونا چاہئے۔ بھولا پن دور ہونا چاہئے۔ ایک پلڑے میں علم رکھو، جو کہ ایک عمل بھی ہے اور دوسرے پلڑے میں دوسرے اعمال رکھو، پھر جانچو کہ عمل علم کے مطابق ہے یا نہیں اگر دونوں پلڑوں کا وزن برابر ہے تو سبحان اللہ! واہ واہ اس علم کو، ورنہ خود سمجھ لو کہ ہم کیا کررہے ہیں؟

مایؤول کی ایک عام مثال :

بمبئی میں ایک مسافر خانہ حاجیوں کے ٹھہرنے کے واسطہ ہے، جب بحری جہاز سے حج کے لئے سفر کیا جاتا تھا۔ تو حجاج اس مسافر خانہ میں ٹھہرتے تھے۔ تو وہاں قلی سامان ڈھونے کے لئے لگے ہوتے تھے، تو جو صاحب حج کرنے کے لئے جاتے تھے وہ قلی ان کو حاجی صاحب کہہ کر پکارتے تھے، تو یہ حاجی صاحب کہنا وہی مایؤول کے اعتبار سے ہے، وہ بھی مختصر المعانی اور منطق میں کلام کر رہا ہے، حالانکہ اس نے نہ مختصر المعانی پڑھی، نہ منطق، لیکن وہ بھی ان اصطلاحات میں کلام کر رہا ہے کیونکہ علوم محاوراتِ اہلِ لسان سے ہی مدوّن کئے جاتے ہیں۔

الغرض...... یہ قاعدہ ہے کہ جو کسی کام کو میں شروع کر دیتا ہے تو اس کو اس کام کی مخصوص صفت کے ساتھ موصوف کر دیا جاتا ہے۔ مایؤول کے اعتبار سے تو اس حاجی نے بھی سفرِ حج شروع کر دیا، پاسپورٹ بھی ہو گیا تو ارادۂ حج کی وجہ سے حاجی ہو گیا اور اگر کہیں احرام باندھ لیا اور مر گیا تو حدیث شریف میں آتا ہے ایسا حاجی قبر سے احرام باندھے ہوئے اُٹھے گا۔ تو مایؤول کے اعتبار سے قلی کہہ رہا ہے حاجی صاحب، حالانکہ حج نہیں کیا ہے، ایسے ہی ہمیں خطاب مولوی صاحب کا مل گیا۔ تو طالب علم کو مولیٰ والا ہو کر رہنا چاہئے۔

عنوان و معنون کا تلازم :

عنوان معنون سے خالی نہیں ہونا چاہئے، تو جب یہ حفظ کرنے والا حافظ جی اور میزان والا مولوی صاحب کہے جا رہے ہیں تو اس عنوان کا تقاضا ہے کہ اس کی زندگی میں تقویٰ اور طہارت آنا چاہئے، عنوان معنون کی خبر دیتا ہے تو مولوی، علم کی اور حافظ جی، حفظ کی خبر دے رہا ہے۔ پس علم و حفظ کا جو تقاضا ہے اس کو بجالانا چاہئے۔ عنوان سے معنون کی

طرف استدلال کرنا یہ مثلِ دلیل اِنّی (دلیل لمّی اور انّی یہ استدلال کے دو طریق ہیں، جن کو علماء جانتے ہیں مثلاً دھواں دیکھ کر سمجھ لینا کہ آگ موجود ہے، یہ دلیل انّی ہے اور آگ دیکھ کر پتہ لگالینا کہ یہاں دھواں بھی ہے، دلیل لمّی ہے، اصطلاحِ منطق میں اوّل کو استدلال اور ثانی کو تعلیل کہتے ہیں۔ از محشی) کے ہے اور معنون سے عنوان کا پتہ چلانا یہ دلیل لمّی کے مثل ہے۔ اثر سے مؤثر کی طرف استدلال کرنا یہ دلیل انّی ہے اور مؤثر سے اثر کو معلوم کرنا یہ دلیل لمّی ہے۔

لفظِ مسلم کا تقاضا :

اسی طرح مسلمان جو ترجمہ ہے مسلم کا، تمہارے واسطہ حق تعالیٰ نے پہلی کتابوں میں اور اس کتاب قرآنِ پاک میں مسلم نام رکھا ہے :

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِي هٰذَا۔ تو مسلم کا عنوان معنون سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔ مسلم کے معنیٰ تابعدار کے ہیں، تو مسلمان کو تابعداری سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔

پھر جب مسلم میں تابعداری رکھی ہوئی ہے تو مسلم مولوی کے ساتھ تو ایک صفت مولویت کی زیادہ لگی ہوئی ہے، تو مسلم مولوی کا معنیٰ تو اور آگے بڑھا ہوا ہے۔ اب اپنے کو جانچ لو کہ میری نسبت کیسی ہے؟ کہیں میں ......

ع بدنام کنندہ نکونامے چند

تو نہیں ہوں۔ عنوان کیسا ہے؟ اور معنون کیا ہے؟

طالب علم جب چلتے ہیں تو کتاب بغل میں ہے مگر اس کا اثر دل میں ہونا چاہئے اور اس کا عملی ظہور جسم میں ہونا چاہئے۔

طلبہ کو خطاب :

عزیز طالبعلمو! اپنے آپ کو پہچانو کہ آپ کون ہیں؟ کس طرح رہنا چاہئے، تمہارے ساتھ فصل لگ گئی ہے، فصل کھیتی نہیں، فصلِ امتیازی کہ کفر سے ہٹ کر تم مسلم ہو اور مسلم کے بعد مولوی ہو، یہ مولویت تمہارے لئے فصلِ امتیازی ہے، اس سے تم عوام سے ممتاز جماعت بن گئے ہو۔

اسلام وعلم کے آثار :

تو اس علم کا اثر قلب میں اور قلب سے جوارح (ہاتھ پاؤں) میں اثر امتیاز کا آنا چاہئے۔ من حیث المسلم اور من حیث المولوی جوارح میں سنجیدگی، متانت، وقار، قلب میں حلم، ایثار، فتوحات، توکل، قناعت وغیرہ صفاتِ حسنہ قلبیہ، روحانیہ آنے چاہئیں، یہ فصلِ علم جوں جوں بڑھتی جائے گی، فصلِ قلبی اخلاقِ حسنہ بڑھتے چلے جائیں گے۔

فصلِ امتیازی کا ظہور قیامت میں :

اسی فصلِ امتیازی کی وجہ سے میدانِ حشر میں حق تعالیٰ کفار سے فرمادیں گے :

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ۔

اے کفار! تم آج کے دن مؤمنوں سے جدا ہو جاؤ، جیسے دنیا میں تم مؤمنوں سے جدا رہے، یہاں بھی جدا رہو۔ تو اسلام یہ فصلِ امتیاز ہے اس نے شرک سے جدا کر دیا۔

ریا شرکِ خفی ہے :

اسی طرح شرکِ خفی بوئے ریا بھی نہ ہونا چاہئے، بس توحیدِ خالص ہو، کیسی توحید خالص؟ ایسی کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام نافی بھی ہے۔ تو اس ذاتِ نافی نے

کلمۂ طیبہ کو "لا" کے ساتھ شروع کر کے اشارہ فرما دیا کہ اے مؤمن! تیرے اندر سب سے پہلے غیر اللہ کی نفی ہونا چاہئے، اثبات پھر دیکھا جائے گا، تو لائے نفی کو کہہ کر یہ مؤمن بھی غیر اللہ کے لئے نافی ہو گیا۔ قلب کے اندر بھی نفی اور زبان پر بھی نفی تو غیر اللہ کی طرف ذرہ برابر بھی مائل ہونا کیسا؟ یہ خلافِ توحید ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ـ

اے مسلمانو! تم ظالم لوگوں کی طرف مائل نہ ہو، کہیں تم کو دوزخ کی آگ نہ لگ جائے۔

مسلم کا عنوان اس کو چاہتا ہے، کہ شرکِ جلی اور خفی دونوں سے پورا پرہیز ہو کیونکہ لطفِ مؤمن اولاً نفس امتیاز کو چاہتا ہے اور پھر امتیاز پر امتیاز کو چاہتا ہے قولاً بھی، فعلاً بھی، حالاً بھی اور عملاً بھی، پھر وصفِ علم کے ساتھ اور زیادہ امتیاز کو چاہتا ہے۔ اے طلبہ! تم فارغ البال ہو، طلبِ علم کے سوا تم کو کوئی کام نہیں، لہٰذا اس طرح علم اور طلبِ علم اور زیادتِ علم میں مشغول رہو، جس کی آپ کے سامنے کچھ تفسیر کی گئی۔

اس طرح علم اور زیادتِ علم میں مشغول شغل بحق کے ساتھ رہو۔ حق کہتے ہیں پوری، سچی، پکی، کذب سے خالی اور باطل سے ممتاز چیز کو، تو علم میں شغل بحق کے ساتھ مشغول ہو، متانت و سنجیدگی کا اہتمام ہو، وقار و حلم کو اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس طرح طلبِ علم اور زیادتِ علم میں مشغول بشغلِ حق رہنے کی توفیقِ ارزانی عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین

ملفوظ

مبتدی کو مختلف اہلِ حق کے پاس بیٹھنا بھی مضر ہے، پھر اہلِ باطل مبتدع وغیرہ کے پاس بیٹھنے کے کیا معنی؟ ہاں اگر دونوں شیخوں کا مذاق ایک ہو تو اور بات ہے۔ حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ مختلف الوان کے بزرگوں کے پاس بیٹھنے سے منع کرتے تھے، کیونکہ طریقِ علاج مختلف ہوتے ہیں، رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں طالب کا قلب مشوش ہو جاتا ہے، ابھی یہ مبتدی ہے، اس کا قلب شیخ کے ساتھ جما نہیں ہے، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جو دوسری جگہ ہیں، اپنے شیخ کے یہاں نہیں مثلاً وہاں کرامات ہیں، اپنے شیخ میں نہیں، وہاں شب بیداری ہے، نفل روزہ داری ہے یہاں نہیں، اب یہ مرید خیال کر رہا ہے کہ بجائے وہاں کے یہاں بیعت ہو جاتا تو اچھا تھا، بس تشویش آ گئی، نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔

بعض مشائخ صاحبِ توجہ ہوتے ہیں، یہ مرید توجہ میں جا کر بیٹھ گیا، قلب میں سرسراہٹ اور رونق آ گئی۔ اپنے شیخ کے یہاں برسوں بیٹھا ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا، بس سمجھنے لگا یہاں تری ہے، شیخ میں خشکی ہے، تشویش پیدا ہو گئی، یہ اس کو مضر ہے، مگر یہ حکم مبتدی کے لئے ہے لیکن اگر اعتقاد میں پختگی آ گئی ہے کہ کہیں بھی جاتا ہے، کیسا ہی دیکھتا ہے، اپنے شیخ کی طرف ذرا اعتقاد میں فرق نہیں آتا، اس کو مختلف مشائخ کے یہاں جانا مضر نہیں۔ یہ سلوک کا مسئلہ ہے جس طرح فقہ کے مسائل ہیں، اسی طرح تصوّف کے بھی مسائل ہیں۔

دسویں مجلس

حفظِ ماتقدّم

حفظِ ماتقدّم :

آنکھ ہر وقت کام کرتی ہے' اگر تنہا ہے تب بھی کام کرتی ہے' اگر کوئی اور ہے تب بھی کام کرتی ہے، گھر سے باہر نکلے تو آنکھیں کام کریں گی ورنہ چلے گا کیسے؟ وہ تو کھلی رہیں گی، زبان تو نہیں کام کرے گی، کان تو نہیں کام کریں گے، آنکھ کام کریگی، تو اب حفظ ماتقدم کہ آنکھ ہر وقت کام کرتی ہے۔ لہٰذا میں اپنی طبیعت کے اندر ایسی چیز کو قائم کروں کہ اس کے قائم ہونے کے بعد آنکھ غلطی نہ کر سکے۔

حرص کی نگاہ :

حرص کی آنکھ نہ پڑنے لگے کہیں لالچ کی نگاہ نہ پڑنے لگے، یہ سب بدنگاہی میں داخل ہے۔ یہ نہیں کہ مرد بے داڑھی مونچھ کا لڑکا یا عورت جس کو عربی میں کہتے ہیں اِمْرأة ان کی طرف نگاہ ہے، کسی کے کارخانوں کو دیکھ کر لالچ کی نگاہ پڑی، کسی کی دوکانوں کو دیکھ کر

لالچ کی نگاہ پڑی، کسی کو بڑے عہدے پر ہوتے ہوئے دیکھ کر لالچ کی حرص کی نگاہ اور حسد کی نگاہ پڑی۔ یہ سب لالچ کی نگاہ ہیں، نگاہِ بد یہ لالچ کی نگاہ ہے، یہ حرص کی نگاہ ہے، یعنی جو چیز بعد میں پیش آنے والی ہے، نقصان کی، ضرر کی، حرج کی، اس سے بچنے کے لئے پہلے ہی سے حفاظت کر لینا اس کے بچنے کے لئے پہلے ہی سے سامان کر لینا، جو اس کے بچنے کے سامان ہیں، اُسے کہتے ہیں حفظِ ماتقدم کے طور پر حفاظت کرنا، اس چیز کا جو ضرر کی بات پیش آنے والی ہے، پہلے سے اس لئے آنکھ کو جو نقصان کی بات پیش آنے والی ہے، حرص کی نگاہ، طمع کی نگاہ، حسد کی نگاہ تو پہلے ہی سے علاج کر لینا چاہئے کہ اپنے اندر سے حسد نکل جائے، دنیا کی طمع حرص نکل جاوے اور یہ نگاہِ بد سے حفاظت ہو جاوے تو طبیعت کو جس کو نفس کہتے ہیں، ایسا بنا لیا جاوے کہ بدنگاہ نہ پڑے، نگاہ پڑے کہ نگاہ تو پڑنے کے لئے ہے ہی نگاہ پڑے لیکن نگاہ کے ساتھ بد نہ ہو۔

نگاہِ بد سے حفاظت کا قاعدہ کلیہ:

جس کا ایک قاعدہ کلیہ اگر جما لیا، اچھی طرح سے بس وہ قاعدہ کلیہ کافی ہے ورنہ جزی جزی چیزوں کا انتظام اور جزی جزی حالتوں کے امراضِ نفسانی کا دور کرنا یہ تو بہت مشکل ہے، اُس کی تو بڑی تفصیل ہے، بس یہ سمجھ لیجئے کہ دنیا کی جو بھی ایسی چیزیں ہیں، وہ ضرر سے خالی نہیں، اگرچہ ان میں کچھ نفع بھی ہو لیکن جس چیز میں ضرر غالب ہے اور نفع وہمی ہے، وقتی ہے، وہ چیز تو بالضرور بچنے کی ہے، اس سے بچنا ضروری ہے اور پھر اس کے ساتھ شریعت نے بھی کہہ دیا تو اور تاکید ہو گئی ہے، بہت ہی زیادہ ضروری ہے، تو لالچ کی نگاہ اور حرص کی نگاہ ڈالنے سے فائدہ کیا ہوا؟ تھوڑی دیر کے لئے تکلیف ہو گئی، رنج ہو گیا، ہائے میرے پاس ایسا نہیں ہے اور طبیعت کہہ رہی ہے کہ کوشش کر، تو بیٹھے بٹھائے پریشانی اچھا خاصا سکون تھا، مصیبت مول لے لی پھر اس کی بھی ایک جڑ ہے، وہ اگر دل میں بیٹھ جاوے

تو اس سے بڑی ہی آسانی ہو جائے کہ دنیا اور اس کے اندر جو کچھ ہے فانی نہ باقی۔ فانی رہنے والی چیز نہیں، ختم ہونے والی چیز ہے، نہ یہ حسن باقی رہنے والا، نہ یہ خوبصورتی باقی رہنے والی، نہ جس کے پاس دولت ہے، وہ باقی رہنے والی ہے اور جس کے پاس کچھ بڑے سے بڑا عہدہ ہے نہ وہ باقی رہنے والا، جس کے پاس قلعہ اور محل ہے، نہ وہ باقی رہنے والا، سب فانی ہیں۔

طلب وکسب :

وہ کسب ہے اس کو طلب نہیں کہتے ہیں اور کسب ہی کی اجازت ہے۔ ضرورت کے موافق جو چیز ضروری ہے، اس کی تو ضرورت ہے، لازم ہے اس ضروری کے ساتھ خیال فرمائے گا، اس ضروری شئی کے ساتھ اگر کچھ راحتی شکل ملی ہوتی ہے، کچھ فرحت کی چیز لگی ہوئی ہے تو اس کے بھی حاصل کرنے کی اجازت ہے، اس ضروری کے ساتھ اس کے بھی حاصل کرنے کے لئے تو اجازت ہے، لیکن ضروری چیز کے حاصل کرنے کے ساتھ یہ ایک آسائشی چیز ہے، فرحتی چیز ہے، اس کے بھی حصول کی اجازت ہے' اگر بسہولت تم سے ہو سکے کہ ضروری میں تو خلل نہ پڑ جاوے۔ اجازت ہے اس کے پیچھے پڑ جانا کہ ضرورت بھی رہ گئی، وہ آگے کی چیز حاصل نہیں ہوئی اور ضروری چیز بھی حاصل رہنے سے رہ گئی، اس کو کہتے ہیں کھپانا کہ غیر ضروری میں اس طرح لگا کہ ضروری کے اندر ضرر آ گیا اور حرج ہو گیا۔

حفظ ما تقدم کی دلیل :

تو حفظ ما تقدم یہ ہے کہ جو چیز آئندہ کوئی ضرر کی پیش آنی والی ہے، اس کے آنے سے پہلے بچنے کے اسباب اپنائے جائیں' ان کو اختیار کر لیں، یہ نہیں کہ وقت پر اختیار کر لیں گے، ایسا نہیں اور اس کی دلیل قرآن شریف میں ہے :

وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ یعنی اپنے بچاؤ کے سامان جس زمانہ میں جس چیز کے لئے

جیسے ہوا کرتے ہیں، ان کو اختیار کرو مضبوطی کے ساتھ۔ "خذوا" اختیار کرو، حاصل کرو، پہلے سے اس سامان کو مہیا کرو، اسی لئے پھر یہ فرمایا، اس اثبات کے بعد نفی...... وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ۔ (پارہ:۵، سورۂ نساء رکوع:۱۵)

تو خُذُوْا حِذْرَكُمْ اپنے بچاؤ کے سامانوں کو جمع کرو ادھر کیا فرمادیا: لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ اپنے ہتھیاروں کی طرف سے غافل مت ہو جاؤ کوئی حافظ نہیں ہے، تو اَسْلِحَتِكُمْ لَوْ تَغْفُلُوْنَ ہے نہیں لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ ہے یا نہیں ہے اپنے اسلحہ یعنی ہتھیاروں سے غافل مت ہو جاؤ، اُدھر ان سے غفلت نہ ہونا جو ضروری چیز ہے، اس کا حاصل کرنا ضروری ہے اور مقدم ہے، وقت پر نہیں، حفظ ماتقدم يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا اپنی سرحد کی حفاظت کا پورا سامان رکھو، اے ملک والو! جو تمہاری ملک کی چاروں طرف کی حدیں ہیں، ان چاروں طرف کی حدوں کو پوری طریقہ سے حفاظت کے سامان وہاں رکھو کہ کوئی دشمن کسی جانب سے داخل نہ ہو جاوے تو دیکھئے حفظ ماتقدم ہو گیا یا نہیں۔ یہ ضروری ہے۔

حفظ ماتقدّم سے غفلت:

یہ نہیں کہ جب وقت آوے گا، اس وقت دیکھا جاوے گا، اس وقت کرلیں گے، یہ غفلت ہے، جب جاڑے قریب سے آرہے ہیں تو پہلے ہی سے اگر سامان سردی حفاظت کا نہیں ہے تو کرو جتنا تم سے ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کی حالت' حیثیت الگ الگ ہے، گرمی آوے گی، اس گرمی کی تپش سے بچنے کے لئے جو تم سامان حفاظت کا کر سکتے ہو کرو، برسات آنے والی ہے، برسات کے آنے سے پہلے بارشوں کے آنے سے پہلے اپنے مکانوں کی حفاظت لپائی پتائی سے چھتوں کی حفاظت کرو، مٹی وغیرہ ڈال کر کہ چھت میں پانی اندر نہ آجاوے۔ تو پہلے سے گھر کی چھتوں کی حفاظت کرلو، جب برسات آوے گی دیکھا

جاوے گا ایسا نہیں۔

ایک خنزیر کا واقعہ :

ایک شخص چلا جا رہا تھا، ایک خنزیر (سور) اپنے دانتوں کو درخت سے تیز کر رہا تھا، تو اس چلنے والے نے کہا خنزیر سے کہ اپنے دانتوں کو تو تیز کیوں کر رہا ہے؟ کیا تو نے کوئی شکار دیکھا ہے؟ تو خنزیر نے کہا واہ ! آدمی واہ انسان ! یہ کہاں کی کونسی عقل ہے، جب میں شکار کو دیکھوں اور پھر دانت تیز کروں تو شکار ہاتھ کس طرح آوے گا، مجھے تو دانتوں کو تیز کر کے اس کو پکڑنا ہے، پہلے ہی سے تیز کر کے رکھنا ہے، اسی لئے میں پہلے سے تیز کر رہا ہوں۔ اگر شکار کے وقت میں تیز کروں گا تو شکار ہاتھ میں کہاں آوے گا، تو دیکھو خنزیر پر جو ایسی چیزیں ہوتی ہیں، اس میں تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ہائے افسوس کہ انسان انسان ہو کر اور پھر اس عقلِ صحیح سے کام نہ لے اور پہلے سے تیاریٔ حفاظت کے سامان کی جو ہونا چاہئے نہ رکھے اور جبکہ اس عقلی چیز کے ساتھ ساتھ شرعی چیز بھی آ گئی ہو، ادھر سے بھی حکم معلوم ہوتا ہے کہ پھر تو یہ بہت ہی مہتم بالشان ہے، پھر تو اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ لہٰذا اس کے اہتمام کی طرف اور زیادہ متوجہ ہونا چاہئے۔

حفظِ ماتقدم کیا ہے ؟

حفظ ماتقدم یہ ہے کہ جو چیز آئندہ غالب اندیشہ کی معلوم ہو رہی ہے تکلیف کی ضرر کی اور نقصان کی ذلت کی، اس سے بچنے کا پہلے سے سامان جمع کر لینا چاہئے، اختیار کر لینا چاہئے۔

بھوک سے پہلے کھانے کا انتظام :

بھوک ایک چیز ہے اور یہ تکلیف کی چیز ہے۔ بھوک تو یہ نہیں کہ جب بھوک لگے

گی جب آٹا نکال کر پانی ڈال کر اس کو گوندھ کر پیڑا بنا کر آگ چولہے میں لگا کر توا رکھ کر گرم
ہونے پر پھر اس پیڑے کو بڑھا کر اب چولہے پہ توے پہ ڈالیں گے۔ آگ میں سینک کر
پھر نکالیں گے، ایسا نہیں بلکہ پہلے سے ہی کھانا پکا کر رکھ لینا ہے، نہ کہ بھوک لگے گی، بازار
سے آٹا لے آئیں گے، نمک لائیں گے، مرچ لائیں گے، کھانے سے پہلے گھر میں مہیا رکھ
چاہئے اور پھر اس کو بھوک لگنے سے پہلے پکا کر تیار کر کے رکھ لینا چاہئے کہ بھوک لگنے کے
وقت کھانے بیٹھ جاوے۔ آ گئی مثال حفظ ما تقدم کی کہ ہر چیز کے مختلف اسباب ہوتے
ہیں۔ مختلف سامان ہوتے ہیں، تو جس جس وقت میں جس جس چیز کا جو جو طریقہ اسباب کا
ہے، اس کو جمع کرنا تو ملکی طور پر بھی فرما دیا کہ لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِکُمْ تم اپنے
ہتھیاروں سے غافل مت ہو جانا، پہلے ہی سے جمع کر رکھنا۔ جس زمانہ میں جن ہتھیاروں
کی بالمقابل استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

جیسا زمانہ ویسے ہتھیار :

جس زمانہ میں کہ پہلے بھالہ اور تلوار پھر وہ بندوقیں نکل آئیں، پھر وہ توپیں نکل
آئیں، پھر اور کیا کیا نکل آئے، پھر میدانی کے علاوہ ہوائی نکل آئے، تو جس جس زمانہ میں
جن جن حفاظتی سامانوں کی ضرورت ہو، اس کا پہلے کے موسم کے آنے کے اعتبار سے اور
طرح، سردی کے موسم کے آنے کے اعتبار سے اور طرح۔

بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا سامان :

بچپن کے ہونے کے اعتبار سے بچے پن کی حفاظت اور طرح اور جوانی آنے
جوانی کی حفاظت کے سامان کچھ اور طرح، بڑھاپے ہونے کی حالت میں بڑھاپے کے
سامان اور طرح، تو جس جس وقت میں جس جس اعتبار سے ضرورت حفاظتی ہو، ال

ضرورتوں کومہیا کرنا ہے۔

ہر شخص کی ضروریات الگ الگ ہیں :

اورضرورت ہر شخص کی الگ ہے، کیاایک شخص ہے، بس اس کے ساتھ کوئی اور دوسرانہیں تو اپنے ایک شخص ہونے کی حیثیت سے اپنی ضرورت کے سامان کومہیا کرلے، ایک لحاف ایک گدّہ جیسی اس کی حیثیت ہے، غریبی کی، امارت کی، ناداری کی، افلاس کی اور مالداری کی، اکیلا ہے۔

آنے والی ضرورتوں کا انتظام :

جب شادی کرلی تو ضروریات بڑھ گئیں، پہلے ایک لحاف ایک گدّہ کافی تھا، اب ایک اورلحاف اورایک اور گدہ کبھی الگ بھی سوئیں گے نہ کہ بیوی کے ساتھ ہی سوئیں گے، روزانہ کی ضرورت بڑھ گئی، اب بچہ ہوگیا، تو اب بچہ کی ضرورتیں جو بچپن کے لئے ضرورتیں ہیں اس کومہیا کرنا ہوگا؟ ضرورت بڑھ گئی، اب اس کوجمع کرو، اس کے عزیز واقربا بھی ہیں، اس سے کون خالی مشکل سے ہوگا، وہ بھی آتے جاتے رہتے ہیں، جب وہ بھی آتے جاتے رہتے ہیں اورآپ کے پاس اپنے اور بیوی کے لئے لحاف اورگدّہ تھا، مہمان آگیا اب اس کے لئے کیا ہوگا ضرورت بڑھ گئی، ہر شخص کی ضرورت الگ ہے تو ضرورت بڑھ گئی، اب اس کو دوایک لحاف گدے اپنے گھروالوں کی ضرورت کے علاوہ کہ مہمانوں کی ضرورت پوری کرنا ہے، رکھتا ہے۔

ضرورت کے ساتھ سامانِ راحت :

ضرورت کے ساتھ سامانِ راحت کی اجازت ہے تو وہ درجہ تو وجوب کا ہے اور یہ درجۂ استحباب کا ہے۔ پہلے آپ کو فرض و واجب ادا کرنا پڑے گا، نفلیں بعد میں۔ وہ بھی

ایک درجہ ہے نفلوں کا ادا کرنا وہ بھی ایک درجہ ہے، لیکن جو چیز ضروری اور وہ جو وجوب کے درجہ میں ہے اس کو ادا کرنا پہلے ہے، اس کے ساتھ جماعت کے ساتھ اہتمام رکھنا پہلے ہے، پھر نفلوں کا درجہ، نہ کہ نفلوں کی تو بھرمار ہے اور فرض و واجب کا اہتمام اور جماعت کا اہتمام جو ہونا چاہئے وہ نہیں ہے۔ یہ دینی مثال پیش کی ہے۔

دنیوی ضرورتوں کا انتظام بھی دین ہے :

اس نظیر کے اعتبار سے کہ جس کو دنیاوی ضرورت کہتے ہیں وہ دنیاوی نہیں ہے، وہ بھی دین ہی کی خاطر ہے، اپنی جان مال عزت آبرو کی حفاظت کے لحاظ سے ہے، اگر اس میں فرق آ گیا تو دین کے کام میں فرق آ گیا۔ دین کے کام میں فرق نہ آنے کی وجہ سے ان کاموں کی ضروری اور استحبابی، استحسانی ضرورت ہوگی، بقائے دین کی خاطر تو اصل وہ ہے کہ کسبِ حلال فرض ہے لیکن جو اُخروی ضوری فرض چیزیں ہیں، ان کے ادا کرنے کے بعد، نہ کہ ان سے تغافل کے ساتھ کہ ضروری تو وہ ہے سامانِ بقا پھر یہ سامانِ فنا، اس سامانِ بقا کے لئے اس لئے حلال کی قید لگا دی۔ اگر حرام کو حاصل کر رہا ہے جمع کر رہا ہے، تو پھر حصولِ بقاء کہاں، تو بقاء کی بقاء کے لئے کہاں، بلکہ وہ تو بقاء کے لئے مضر ہے، زمانہ بقاء کے لئے، آخرت کے لئے وہ تو مضر ہے، اسی لئے حلال کی قید لگا دی اور حلال کی قید کے ساتھ کیا لگا دیا۔

دینی فریضہ کی ادائیگی کے بعد دنیوی معاش کا کام :

بعد الفریضہ یعنی فریضے زمانہ بقاء اُخروی کے بعد یہ حاصل حلال کا کرنا ہے، نہ کہ صبح ہی اُٹھ کر فریضہ اُخروی کو چھوڑ کر زراعت و تجارت یا وہ عدالت یا دفتر کی طرف بھاگ جانا ہے، تدریس میں لگ جانا ہے، تصنیف و تالیف میں لگ جانا ہے، وہ بھی دین ہے لیکن یہ دین مقدم ہے کہ صبح کو اُٹھ کر پہلے فریضہ صلوٰۃ، اس کے بعد دوسرے فرائض۔

دنیا میں رہ کر آخرت کا سامان :

حفظ ماتقدم کہ آنکھوں کے اندر جو باتیں پیش آویں گی، ان کے ضرر سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ حفاظت کا سامان کرلو کہ آخرت کے ضرر کے سامان سے حفاظت ہو، کیونکہ ایمان آخرت کے عقیدہ کا نام ہے، کہ آخرت ہے، جس میں حساب و کتاب، باز پُرسی، معاملے کی پیشی ہوگی۔

حفظ ماتقدم تو دنیا کے اندر رہتے ہوئے مرنے کے بعد جو پیش آنے والی چیزیں ہیں ضرراً اور نفعاً تو اس کا حفظ ماتقدم اس عالم کے اندر نفع حاصل ہونے کے لئے اور ضرر سے بچنے کے لئے اس عالم میں ضروری ہے۔ حفظِ ماتقدم کہ برسات سے پہلے حفاظت حفظِ ماتقدم، گرمی سے پہلے بچنے کی حفاظت حفظِ ماتقدم، سردی آنے سے پہلے بچنے کے لئے ضرر سے حفظ ماتقدم، تو آخرت میں جانے سے پہلے اس عالم کے اندر سامان حفظِ ماتقدم اب تو آ گئی سمجھ میں بات حفظ ماتقدم کہ اس عالم دنیا کے اندر حفظِ ماتقدم ہے۔ ایک دوسرے عالم میں جا کر راحت کے ساتھ رہنا اور ضرر سے بچ کر رہنا بعض کی طبیعت شرمیلی ہوتی ہے، ایسی غیریت قسم کی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کی ٹیڑھی آنکھ کرنے کو بھی گوارا نہیں کرتا، ٹیڑھی نگاہ کر کے دیکھنے کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ جیسے دنیاوی طبیعت ستھری پاکیزہ نکھری لطیف ہوتی ہے کہ ذرا سی بدبو کو بھی گوارہ نہیں کرسکتا کہ حضرت والا نے واقعہ سنایا۔ ۱۸۵۷ء میں جو غدر ہوا تھا، بس انگریز آیا تو اپنے مخالفین کی گرفتاریاں کیں، ان میں لکھنؤ جو ایک حکومت تھی، ان کے چچا گرفتار ہوگئے، پھانسی کا حکم دے دیا، یہ حضرت مولانا میرے شیخ حکیم الامت مجدد الملت نے فرمایا۔

لکھنؤ کے نواب صاحب کی پھانسی کا واقعہ :

تو چچا نے یہ کہا مقصد تو آپ کا یہ ہے کہ میں ختم ہو جاؤں مر جاؤں، تو مجھے پھانسی

دینے کی ضرورت نہیں اور آپ کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ وہ اس طرح سے کہ کسی میلے کچیلے بھنگی کو بلا لو اور اس کو میرے سامنے سے پاس سے نکال دو، اگر میں بچ جاؤں تو پھانسی دے دینا، اگر مر جاؤں تو آپ کا مقصد حاصل ہے کہ مر گیا۔ بڑا تعجب ہے یہ بھی کونسا دماغ ہے، ایک میلے کچیلے بدبودار بھنگی کو بلا لیا اور ان چچا صاحب کے پاس سامنے ہو کر نکالا' جب بالمقابل وہ بھنگی پاس ہو کر گزرا، اس کی بدبو دماغ کو چڑھ گئی، دماغ پھٹ گیا، مر گیا تو دیکھا آپ نے دنیاوی اعتبار سے بعضوں کا مزاج کیسا عجیب نازک ہوتا ہے، اس لئے آپ ان نوابوں کے بیت الخلا میں بدبو نہیں پائیں گے، وہ تو خوشبوئیں چھڑکتے رہتے ہیں' رکھی رہتی ہیں تو بعضوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو ٹیڑھی نگاہ کو بھی گوارا نہیں کرتے، اور یہ مؤمن آخرت میں حساب کتاب کی پیشی کا معتقد ہے۔ اب ان مؤمنوں میں بعض مؤمنوں کی ایسی طبیعت بھی ہوگی، اپنی جگہ پر حفظ ماتقدم بھی کہ ٹیڑھی نگاہ سے بھی آخرت کے اندر بچا رہوں، ملامت کی نگاہ سے بھی بچا رہوں، چہ جائیکہ آگے عتاب کی نگاہ، اپنی جگہ پر وہ اس کا اہتمام کرتا ہے۔ تو وہ فرض' واجبات' سنن اور مستحبات کا اہتمام رکھتا ہے، محرمات اور مشتبہات اور مکروہات سے بچنے کا بھی اہتمام رکھتا ہے۔

صحت کا خیال :

اب اس کے پاس سامانِ صحت کے ایسے نہیں کہ نفلیں ادا کر سکے، زور کا مریض ہے، زور کا کمزور ہے، زور کا ضعف ہے۔ اس لئے قید لگائی کہ بلحاظِ صحت و سہولت کیونکہ اگر نوافل کا اہتمام کرتا ہے تو صحت خراب ہوتی ہے، اگر نوافل کا اہتمام کرتا ہے صحت تو ہے مگر سہولت نہیں دشواری ہوتی ہے، تعب مشقت سے خود ہی بچنے کا خیال فرمایا۔ مثلاً : نماز کہ کھڑے ہو کر طاقت نہیں ہے، تو بیٹھ کر اور بیٹھ کر نہیں، تو لیٹ کر سر کے اشارے سے' اب وہ بھی نہیں ہے تو چھوڑ دو' تو صحت کا خیال ذات باری تعالیٰ نے لحاظ فرما کر اُخروی کام جو

مقدم ہے دنیاوی کاموں پر اس کی رعایت مصالحِ انسانی کو لحاظ فرماتے ہوئے خود ہی (اس لئے احقر نے کہا کہ صحت اور سہولت) وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ اپنے آپ کو جان کر ہلاکت کی جگہ پر مت لے جاؤ، ہلاکت کی چیز کو مت کرو، ہلاکت کے اندر جان بوجھ کر مت ڈالو بلکہ حفاظت کرو تو آخرت جس پر ...... ہم ایمان لائے ہوئے ہیں، حفظ ماتقدم کہ دنیاوی زندگی کے اندر وہاں جو بات پیش آنے والی ہے، نفع کی یا ضرر کی تو حفظِ ماتقدم نفع کی چیز کی طرف مشغول اور ضرر کی چیز سے بچنے کے لئے مشغول حفظ ماتقدم اسی لئے فرمادیا کہ یہاں آنے پر تم عذر کرو گے تو وہ اس وقت سنا نہیں جائے' یہاں آ کر توبہ استغفار کرو گے تو سنا نہیں جائے گا...... وہ حفظ ماتقدم وہیں تھا، عذر پیش کر دینا، اعتراف کر لینا طلبِ مغفرت اور استغفار کا چاہ لینا یہ وقت نہیں ہے۔ سردی آنے سے پہلے متعدد مثالیں پیش کی ہیں، دھوپ وغیرہ کی۔ تو وہ عالمِ آخرت وہاں پہنچنے کے بعد سامانِ نفع کے حاصل کرنے کا یا ضرر سے بچنے کا نہیں ہے، پہلے سے کیوں نہ کر لیا تھا، ہم نے تو کہا تھا۔ حفظ ماتقدم پر بات چل رہی ہے، آج کہ حفظ ماتقدم کسے کہتے ہیں، سنا تو بہت دفع ہوگا، حفظ ماتقدم تو آنکھ سب سے زیادہ زیادہ کام کرتی ہے، جب کوئی بولے گا، آپ سن لیں گے، جب کوئی آپ کو بات کرنا ہوگی آپ بولیں گے، جب کوئی بول کر جواب چاہتا ہو' آپ بولیں گے۔

حفظ ماتقدم میں آنکھ کا کام سب سے زیادہ ہے :

لیکن آنکھ تو ہر وقت کام کرتی ہے۔ آپ تنہا ہیں تب بھی کام کر رہی ہے باہر ہے، تب بھی آنکھ کام کر رہی ہے، گھر میں تب بھی آنکھ کام کر رہی ہے، آنکھ تو ہر وقت کام کرتی ہے، آپ بیت الخلاء میں ہیں' تب بھی آنکھ کام کر رہی ہے، مستور اعضاء مکشوف ہوں' ان کی طرف دیکھ کر طبیعت کیا کہتی ہے، آنکھ پڑ رہی ہے، آنکھ کیا کہتی ہے تو آنکھ کا تو ہر وقت کا

کام ہے، جلوت کے اندر بھی، خلوت کے اندر بھی، گھر کے اندر بھی، بازار کے اندر بھی، ہر وقت ہے تو ایسا طبیعت کا حال حفظ ماتقدم بنالیا جاوے کہ یہ نگاہ اپنے وقت کے اوپر محفوظ رہ جائے، ضرر کی چیز سے' نگاہِ بد سے' نگاہِ حرص سے' نگاہِ طمع سے' نگاہِ حسد سے کہ اندر کی طبیعت ایسی بنالی تو جزئیات تو بہت ہیں کس کس مرض کا علاج کس کس تدبیر کے ساتھ ہے۔

دنیا کی فنائیت کو سوچو :

دنیا باقی رہنے والی نہیں ہے، اگر آ بھی گئی تو رہے گی نہیں تو میں کیا حرص کروں؟ کیا طمع کروں؟ کہ مرد اور امراۃ کی طرف بھی نگاہِ بد یہ طمع ہی تو ہے کیا کروں؟ تو اس عالم کا فانی ہونا دل کے اندر جم گیا یعنی باقی نہ رہنا' ہمیشہ محفوظ نہ رہنا اور جب فنا اس کا جم گیا تو ایسی چیز کی طرف رغبت کا ہونا' قدر کا ہونا یہ نکل گیا، جب نکل گیا تو طلب کا ہونا بھی نکل گیا، جب طلب کا ہونا نکل گیا، تو بضرورتِ استعمال کا کرنا رہ گیا کہ آنکھ جس ضرورت کے لئے استعمال ہوسکتی ہے' استعمال ہے' جس ضرورت کے لئے ضرورت ہے' اس کا استعمال ہوسکتی ہے، استعمال ہے' آگے اس کا استعمال نہیں ہے تو نہ یہ نظر طمع کی ڈالی جارہی ہے، نہ حرص کی ڈالی جارہی ہے اور طمع کی نگاہ، نگاہِ بد ہے تو نگاہِ بد سے حفاظت حفظِ ماتقدم گفتگو شروع ہوئی تھی کہ حفظِ ماتقدم کسے کہتے ہیں، یہ اس کی تفصیل ہے اور یہ نگاہِ بد یہاں کے لئے تو مضر ہے ہی گفتگو آخرت کی ہے، وہاں کے لئے بھی مضر۔ تو یہ جو عالم ہے جس کو دنیا کہتے ہیں' یہ عالمِ آخرت کے حفظِ ماتقدم کے لئے ہے۔

سامانِ شادی کی مثال :

اور ایک دوسری مثال کہ کسی کے گھر لڑکی ہے، خوب پروان چڑھ رہا ہے، اس کی شادی ہوگی تو جس دن شادی ہوگی، اس دن سامانِ شادی کا آپ جمع کریں گے یا اس سے پہلے حفظِ ماتقدم، کہ جو چیز پیش آنے والی ہے، ہماری نظر میں قریب سامان اس کا پہلے

سے اپنی حیثیت کے مطابق کرو کہ جو ضرر پیش آنے والا ہے، اس وقت پر اس سے حفاظت کرو، نہ کہ جس دن شادی ہوگی یا ایک دن پہلے آپ سامان کا انتظام کریں گے۔ بہت دن پہلے سے آپ اس کا انتظام کریں گے۔ یہ ہوگا حفظ ماتقدم، کہ جو نفع کی چیز سامنے آنے والی ہے، غالب پہلے سے اس کا سامان اور جو ضرر کی چیز سامنے غالب آنے والی ہے، اس سے بچنے کا پہلے سامان۔ تو ایسے ہی ہمارے سامنے ایمان ہے، عاقبت کا۔ اس کے پیش آنے سے پہلے اس کے نفع کے سامان کا پہلے مہیا کرنا اور اس کے اندر ضرر سے بچنے کے سامان کو پہلے مہیا کرنا۔

عاقبت اندیشی :

اسے کہتے ہیں عاقبت اندیش۔ اس کی نظر انجام پر ہے کہ اگر میں یہ سامان وہاں کے نفع کے مطابق نہیں کروں گا تو نفع کیسے ہووے گا اور یہاں میں سامان وہاں کے ضرر سے بچنے کا نہیں کروں گا تو ضرر سے بچنا کس طرح ہوگا۔ اس کو ہمارے محاورے میں کہتے ہیں کہ انجام پر نظر عاقبت اندیش آدمی ہے، دور بیں شخص ہے، دور اندیش آدمی ہے، آخرت میں اگر کوئی عذر کرنے لگے کہ میں توبہ کرتا ہوں، اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں' میں معذرت پیش کرتا ہوں تو نہیں سُنا جائے گا۔ دُنیا میں جو ضرر کی باتیں ہو چکی تھیں، اس کی تلافی کر دینا اور جو نافع نفع حاصل کرنے کی چیزیں تھیں' تو بقدرِ قوت ولحاظ' صحت وسہولت وہاں کرنے کی تھی۔ جن کے کرنے کا حکم تھا، فرض' واجب' سنت ادا کی' محرمات سے بچا لیکن محرمات سے بچ کر مکروہات سے بھی بچا مشتبہات سے بھی بچا، جس مزید نفع پر نفع ضرر کی جو شق تھی' ملامت کی اس سے بھی بچا کہ میں نے تو مثال پیش کی تھی۔

لطیف طبائع کا حال :

مؤمن بعض ایمان کی لطافت اس درجہ رکھتا ہے کہ وہ ٹیڑھی آنکھ ٹیڑھی ملامت کی

نگاہ اس سے بھی بچنے کی کوشش کرتا ہے کہ میں مشتبہات سے بھی بچوں، مکروہات سے بھی بچوں نہ کہ صرف محرمات سے بچوں۔ بعض ذرا سی بدبو کی چیز کو گوارہ نہیں کرسکتا، اسی لئے نظیریں پیش کرتا چلا آرہا ہوں، دینی اعتبار سے بھی سے سُنئے، کیا شریعت کہتی ہے گندہ دہن کے ساتھ مسجد میں آنا جماعت کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں ہے، گندہ دہن منہ بعض کو مرض ہوتا ہے، گندہ دہن کا تو شریعت یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو مسجد میں آنا جائز نہیں ہے، گھر پڑھے کہ برابر والوں کو تکلیف ہوگی، بعض ایسے ہیں سب گندہ ذہنی والے نہیں ہیں، لطیف نزاکت رکھنے والے بھی ہیں، وہ بچتا ہے، ہٹتا ہے، اس لئے نہیں کہ اس گندہ ذہنی والے کی کی تحقیر ہے، ڈر لگتا ہے کہ کہیں تیرے اندر بھی گندہ ذہنی نہ ہوجاوے، تو اس کو تحقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے، اس لئے کہ مزاج اس کو گوارہ نہیں کرتا ہے، اس لئے بچتا ہے، اس لئے ہٹتا ہے۔

تعلّی کسی حال میں جائز نہیں :

دنیوی دولت اور وجاہت کے اترانے پن کے اعتبار سے دینی اونچے سے اونچے صاحبِ تقویٰ تبرع کی حیثیت سے تعلّی جائز نہیں ہے کہ دوسروں کی تحقیر بھی نہ ہو اور اپنے اندر تعلّی نہ ہو، تعلّی ہوگی تو تحقیر بھی ہوگی، اور جب تعلّی اپنے اندر نہیں ہے بلکہ تذلل اپنے اندر ہے تو دوسرے کا حقیر ہونا کیسا؟ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں اور شریعت کہتی ہے کہ گندہ ذہنی کے ساتھ تو کیا بلکہ کچا پیاز کھا کر بھی مت جاؤ۔ بعض ایسے بھی ہوں گے لطیف المزاج کہ کچا پیاز کھا کر جانے میں ایک قسم کی بو ہے وہ بو بھی اُن کو ناگوار ہوگی۔ تو اب سمجھئے گا کہ بعض طبیعتیں جب ایسی ہوتی ہیں تو آخرت کے متعلق بھی وہ فرائض و واجب و سُنن ہی پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ بقدرِ صحت و سہولت نوافل کا بھی اہتمام کرے گا اور صرف محرمات سے نہیں بچے گا بلکہ محرمات سے مکروہات اور مشتبہات تک میں بچے گا، جس کا حکم بھی دیا گیا ہے :

الحلال بیّن والحرام بیّن و بینھما مشتبھات۔ (الترغیب ج:۲ص۵۵۴)

مشتبہات سے بھی بچو :

اگر مشتبہات کوئی ضرر کی چیز نہیں ہے اور کسی خاص نفع سے رُک جانے کی بات نہیں ہے تو کیوں حکم دیا کہ فاستنزھوا عن المشتبھات کہ مشتبہات سے بچو۔ دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ضرر پہنچ جاوے تم کو، کہیں ایسا نہ ہو کہیں نفع کی آگے کی چیز سے تم محروم ہو جاؤ۔ فاستنزھوا یہ نزہت اس کا مادہ فاستنزھوا نزہت حاصل کرو۔ ایمان کے اندر مشتبہات سے بچ کر فاستنزھوا مشتبہات کہ مشتبہات سے کس چیز کے لئے سوال پیدا ہوتا ہے۔ نزہت طلب کرو، فاستنزھوا باب استفعال سے ہے جس کی ایک خاصیت طلب ہے۔ نزہت طلب کرو اپنے اندر کس چیز کے لئے، ایمان کے لئے، کس چیز سے، مشتبہات سے بچ کر۔

مدارس تعلیم کے لئے اور خانقاہیں انطباقات کے لئے ہیں :

مدارس تو تعلیم کے لئے ہیں اور انطباقات کے لئے خانقاہیں ہیں، بلا اس کے چارہ نہیں ہے۔ یہ شفا خانے ہیں باطنیات کے، جیسے شفا خانہ، ہسپتال امراضِ جسمانی کے لئے ہیں' ایسے ہی یہ خانقاہیں ہسپتال ہیں' شفا خانہ ہے' امراضِ نفسانی کے دفع ہونے کے لئے تو جیسے مدرسہ ضروری ہے، ایسے ہی یہ خانقاہ کا وجود بھی ضروری ہے۔ چارہ نہیں ورنہ متقدمین سے یہ سلسلہ کیوں چلا، اس کی بنیاد کیوں ڈالی گئی، کل بہت تفصیل سے بات دو گھنٹے ہو چکی ہے، اس پر مدرس' مصنف' مؤلف' مناظر یہ نہیں کہہ سکتا، یہ نہیں کہنا چاہئے کہ میں ضروریاتِ شرعیہ کے علاوہ دین میں ایسا لگا ہوا تھا کہ میں تو فرائضِ شرعیہ کے ادا کرنے کے بعد ایسا مشغول تھا کہ مزید نفع حاصل کرنے کے لئے مجھے فرصت نفلوں کی نہیں تھی۔

چاہے بازپُرس نہ ہو یہ کتنے نقصان کی بات ہے کہ تاجر دنیا کا تو ایک لاکھ خرچ کر کے چاہتا ہے کہ وہ لاکھ ہوں' ایک لاکھ تو میرا خرچ ہو ہی گیا' ایک لاکھ اور' اور دینی نفع کا حاصل کرنے والا بس بقدرِ ضرورت' غیرت دلائی ہے۔

منھومان لایشبعان صاحب العلم و صاحب الدنیا۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم ص:۲۷)

غیرت دلائی ہے اس وقت پورا بیان کرنا نہیں ہے، اسی طرح سورۂ الم نشرح لک صدرک ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظھرک و رفعنا لک ذکرک فاذا فرغت فانصب۔

تعلیم اور تبلیغ کے ساتھ ذکر :

آپ تبلیغی کام کے اندر کہ جس کے لئے آپ کو بھیجا گیا ہے، جب اس سے فارغ ہو جاویں فرغت تو اپنی ذاتی عبادتی متعلق ذات کے لئے مشقت تعب اُٹھائے گا : فاذا فرغت فانصب تعب مشقت اُٹھائے گا کہ دوسرے وقت میں پھر ذکر کے اندر اور عبادت کے لگ جائے گا، تو آپ تبلیغی دینی جس کام کے اندر مشغول ہیں، اس سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ذاتی عبادتی متعلق کو مشقت میں آپ ڈالئے گا کہ رات کو اُٹھ جائے گا، ذکر میں لگ جائے گا، اب چاہے من حیث التلاوۃ ہو' من حیث النوافل ہو، من حیث التسبیح ہو' تو رسول ہو کر جب آپ کی پوری زندگی اللہ کی عبادت ہی کے لئے ہے اور مخلوق کی خدمت دینی ہی کے لئے مشغولی ہے، اس کے باوجود بھی حق تعالیٰ آپ کو فرما رہے ہیں کہ اپنے ذاتی عبادتی متعلق ذات سے اس میں آپ مشقت کو برداشت کیجئے گا، فانصب کا لفظ ہے تعب کو اُٹھائے گا۔

معلوم ہوا کہ ہاں کچھ تعب ہوتی ہے، آخرت میں کوئی تعب نہیں، ہم کو سنایا ہے جبکہ آپ کے بندگانِ مؤمنین کی جس کا مزاج طبیعت شریعت کے مطابق بن جاتا ہے، تو

آپ کے لئے تو تعب کی بات نہیں، فانصب تو کوئی مدرس یہ نہیں کہہ سکتا میں درس میں لگا ہوا ہوں کہاں تہجد، کہاں تسبیح، کہاں نفل۔ یہ جی کو خوش کرنے کی بات ہے۔ اپنے ساتھ حسنِ عقیدت ہے، بڑے مغالطے اور دھوکے کے اندر ہے، باوجود فرصت ہونے کے نفلیں نہیں پڑھتا، وقتی نمازیں بھی کبھی نہیں پڑھتا، اشراق وچاشت، اوّابین، تہجد تو کیا پڑھے گا، یہ ہم کو تنبیہ کی گئی ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ فرما کر ہم کو تنبیہ کی ہے۔ اے علماء کی جماعت، اے نائبانِ رسول ذرا کان کھول کر سُن لو میں نبی سے کیا کہہ رہا ہوں، لہٰذا تدریس کی معذرت کو پیش نہیں کر سکتے، تصنیف وتالیف میں مشغولی کو نہیں کہہ سکتے، اپنا نفع اپنے ضرر سے بچنا مقدم ہے۔ ان لنفسک علیک حقًا دوسروں کی دینی خدمت میں ایسے لگ گئے، کہ تم کو اپنی دینی خدمت ترقی کی اور ضرر سے بچنے کی منافع کے حصول کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی ہے۔

رہائش، آسائش، زیبائش اور نمائش کا فرق :

رہائش ضرورت ہے، مکان سائے دار ہووے، ذرا کپڑا بدن میں پہننے کے لئے ہووے، رہائش یہ تو ضروری ہے، واجب ہے، اور اس کے آگے کیا ہے؟ آسائش یعنی آرام راحت، کہ اگر تیرے اندر اس کی طاقت ہے، اجازت ہے، آسائش کے سامان مہیا کر لو، کسی پر زور ڈال کر نہیں، کسی سے قرضہ لے کر نہیں، کسی سے مانگ کر نہیں، یہ تو سب حرام ہے۔ لہٰذا آسائش کے سامان کرو، رہائش میں سہولت ہوگی، فرحت ہوگی اور اس سے دینی کام کے اندر طبیعت منجذب ہوگی۔ یہاں سلیم الطبع سے گفتگو ہو رہی ہے، عقلِ مستقیم والے سے گفتگو ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمت اپنے اوپر دیکھ رہا ہے، طبیعت شرما رہی ہے کہ میرے افعال، میرے اعمال ایسے اور ان کی طرف سے نعمتوں کی بوچھاڑ ایسی الطاعم الشاکر کالصائم الصابر اچھا کھا کر شکر گزار بندہ ایسا ہے جیسا کہ روزہ رکھ کر صبر کرنے والا۔ گفتگو مؤمن سے ہو رہی ہے، جس کا مزاج سادہ ہوتا ہے، جس کا مزاج سلیم ہوتا ہے، جس کی عقل مستقیم ہوتی

ہے گفتگو اس سے ہو رہی ہے تو آسائش یہ کیا ہو گیا مستحب، تو رہائش کا درجہ تو وجوب کا اور آسائش کا درجہ مستحب کا، اب آگے چلئے زیبائش جس کو زینت کہتے ہیں، میرے حضرت کی طبیعت فاقیہ کی زیادہ تھی، اب آگے کیا ہے زیبائش جس کو زینت کہتے ہیں جی اگر وسعت ہے تو، پہلے قید لگے گی، اگر وسعت ہے تو تجھ کو زیبائش کی بھی اجازت ہے کہ وہ مباح ہے، یہ میرے حضرت کے الفاظ ہیں کہ وہ کیا ہے مباح ہے تین درجے ہو گئے پہلا درجہ وجوب کا، دوسرا درجہ مستحب کا، تیسرا درجہ مباح اباحت کا، اب چوتھا درجہ حرمت کا یعنی نمائش، اترانا پن' تو دوسروں کی نگاہ میں اعزاز پن' اپنی طبیعت کے اندر عجب اترانا پن' تو عجب بھی حرام اور تکبر کہ اپنے کو اچھا سمجھ کر دوسرے پہ حقارت کی نگاہ ڈالنا تکبر اور اپنے علم کو اپنی نظر کے اندر خود پسندی، عجب، دونوں حرام۔ نمائش اپنی نگاہ میں یوں تو اعلیٰ باتیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔

حضرت علیؓ کا جمعہ کے روز اچھے کپڑے پہن کر چلنے کا واقعہ :

حضرت علیؓ جا رہے ہیں، کچھ اچھے کپڑے جمعہ کو پہن لئے ہیں، کچھ نظر کپڑے پہ پہنچ گئی ہے، ذرا کچھ پسند سا آ گیا ہے، آستین کو چاک کر دیا، پوچھنے اور دریافت کرنے پر بتلایا کہ مجھے کچھ پسند سا آ گیا تھا، مجھے اندیشۂ عجب ہو گیا تھا، اس لئے میں نے اس کو عیب دار کر دیا۔ یہ تو اعلیٰ حضرات کے کام ہیں تو اشتباہ ہو گیا۔ تو عجب بھی حرام اور تکبر تو بطریق اولیٰ، دوسرے پر حقارت کی نگاہ تو چاہے کتنا ہی بُرا ہو' نبی بھی حقارت کی نگاہ نہیں ڈالتا تو بھلا ولی تو کیا ڈالے گا، اترانہ پن کیسا، اُمیدوار ہوتا ہوا خوف رکھتا ہوا عبادت کرے، اللہ کی عبادت کرے ڈرتے ہوئے اور اُمیدوار ہوتے ہوئے۔ آ گئی بات سمجھ میں۔

اللہ کی عبادت کرو خوف رکھتے ہوئے :

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو خوف رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس طرح پر کہ اترانہ پن نہ آ جاوے اور نا اُمیدی کا سوال نہیں ہے کہ تم عبادت میں لگے ہوئے ہو،

لہٰذا اُمیدوار ہوتے ہوئے نااُمیدی کی جڑ کاٹ دی۔ اُمیدوار ہوتے ہوئے نااُمیدی کا سوال نہیں ہے لیکن اس کے بالمقابل اترانہ پن نہ ہوتے ہوئے کہ اپنے اندر تعلّی آ گئی، دوسرے پر تحقیر کی نگاہ ڈالی، ہوگیا علاج، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، ڈرتے ہوئے، جھجکتے ہوئے اور اُمید رکھتے ہوئے، اس سے یہ نکل آیا کہ عبادت نہ کرتے ہوئے اُمیدوار عبادت نہ کرتے ہوئے عبادتوں کے کاموں سے بچتے ہوئے معاصی کے حرکتوں کو رکھتے ہوئے، اُمیدوار نفی ہوگئی کہ عبادت کرتے ہوئے اترانہ پن نہ ہونے پاوے، وہ ذات کیسی ہے، اترانہ پن نہ ہونے پاوے اور نااُمیدی بھی نہ ہونے پاوے لیکن عبادت نہ کرتے ہوئے معصیت کرتے ہوئے اُمیدواری، فرماتے ہیں:

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (پ۲۲ ع۱۳)

دھوکے باز تم کو دھوکہ میں نہ ڈال دے، ضرورت کا سوال تھا، حفظ ماتقدم کی بات شروع ہوئی تھی۔ جی تو ہر شخص کی ضرورت معلوم ہوگئی، اگر اکیلا ہے تو اس کی اور ضرورت اور جب بیاہ شادی ہوگئی بیوی ہوگئی تو اس کی اور ضرورت۔ جب بچہ ہوگیا تو اور ضرورت متعلقین اور مہمان آنے جانے لگے تو اور ضرورت۔

تو معلوم ہوا کہ ہر شخص کی ضرورت جداگانہ ہے، بادشاہ کی اور ضرورت ہے۔ اسی حفظِ ماتقدم میں فرمایا: خُذُوْا حِذْرَكُمْ۔ اپنے بچاؤ کے سامانوں کو کیا کرو اختیار کرو بچاؤ کے سامانوں کو اختیار کرو جمع کرو محفوظ کرو لو تغفلون عن اسلحتکم ' ہتھیاروں کی طرف سے غافل مت ہوجاؤ۔ حکمت الگ الگ بتادی ادھر یہ بتادیا اثبات، ادھر نفی ایسا مت کرو ورابطوا اپنے ملک کی سرحد کی حفاظتیں چاروں طرف سے رکھو کہیں ایسا نہ ہو دشمن کسی جانب سے خالی دیکھ کر گھس آوے۔ شیطان نے بھی کہہ دیا کہ میں دائیں سے، بائیں سے، آگے پیچھے سے آؤں گا چار سمتیں ہیں۔

انسان عالمِ صغیر ہے اس کی سرحدیں :

چاروں سمتوں کی حفاظت بس تم ایک مجسم عالمِ صغیر ہو اے انسان ! تم ایک مجسم عالمِ صغیر ہو، تمہاری بھی سرحدیں ہیں، اس میں ایک سرحد آنکھ بھی ہے۔ یہ عرض کیا گیا تھا حفظ ماتقدم اپنی طبیعت کو اس درجہ کی جو طریق اسباب و سامانِ وسائل ہیں بنا لینا، کہ یہ آنکھ نگاہِ بد سے بچی رہے، لالچ کی نگاہ سے بچی رہے، حرص کی نگاہ سے بچی رہے، حسد کی نگاہ سے بچی رہے، اپنے آپ کو پہلے سے ایسا بنالو کہ کہیں نگاہِ حرص نہ پڑے گا، نگاہِ طمع نہ پڑے، نگاہِ حسد نہ پڑے نگاہِ تکبر نہ پڑے وغیرہ۔

تکبر وہ نگاہ ہی تو ہے نگاہِ تکبر نہ پڑے، نگاہِ عجب نہ پڑے، نگاہِ حسد نہ پڑے، نگاہِ طمع نہ پڑے، نگاہِ حرص نہ پڑے، یہ آنکھ پہلے کام کرتی ہے اور سب سے زیادہ یہ کام کرتی ہے۔ کان تو بعد میں جب کوئی کہے گا سنیں گے، جب بولنے کی بات ہوگی زبان کام کرے گی اور یہ آنکھ۔ حفظِ ماتقدم طبیعت کو جو اس کے طرق ہیں، سامان و اسباب ہیں، ذرائع وسائل ہیں، ایسے اختیار کرتے چلے جاؤ کہ طبیعت اس درجہ کی ہو جاوے کہ اس نگاہ کی حفاظت ہو اسی لئے حفظ ماتقدم کے طور پر ہی ذاتِ باری تعالیٰ نے کیا فرمادیا :

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ (پ۱۸، ع۱۰)

حفظ ماتقدم ہے کہہ دیجئے مؤمن مردوں سے جب یہ باہر نکلیں تو کیا کریں، اپنی نگاہوں کو اوپر دیکھ کے نہ چلیں، دائیں بائیں دیکھ کر نہ چلیں، آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے نہ چلیں بلکہ کہدو : قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔

نگاہ نیچی رکھنے کا حکم :

غض بصر، نگاہ نیچی یہ حفظ ہو گیا۔ حفظ ماتقدم ہو گیا تو پہلے ہی سے ایسا طریق اختیا کرو کہ یہ نگاہِ بد صرف اَمرد اور امرأتوں کے ساتھ نہیں بلکہ اس دنیا کی زیب وزینت اور

آرائش اور جاہی لوگوں کو دیکھ کر اور بڑے بڑے کارخانوں کو کسی کے پاس دیکھ کر بڑے بڑے عہدہ داروں کو آرام زیبائش اور زینتوں کے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھ کر تمہاری آنکھیں بدنہ پڑ جاویں۔

اس عالم کے اندر رہنا دوسرے عالم میں جانے سے پہلے جہاں منافع بھی، مضار بھی ہے، راحت و تکلیف بھی ہے، خوشی اور غم بھی ہے۔ اس عالم میں جانے سی پہلے حفظ ماتقدم یہاں پر ان سامانوں کو مہیا کر لینا ہے، ان سامانوں کو اسباب کو اور رسائل کو اختیار کرنا ہے، ذرائع کو اختیار کرنا ہے کہ منافع کا حصول اور مضرتوں سے حفاظت، حفظ ماتقدم کیا، وہاں عذر سنا جائے گا۔ میں معافی چاہتا ہوں' میں توبہ کرتا ہوں' مجھے دو (۲) نفلوں کے پڑھنے کی اجازت دے دیجئے، تاکہ آگے ترقی ہو جاوے، تو زیادہ نفع کی اور راحت کی چیز حاصل ہو جاوے، ضرر سے بچنے کا کچھ سامان ہو جاوے، کیا وہاں عذر قبول ہوگا، معذرت قبول ہوگی، اس لئے کہ جو تقدم کی چیز تھی، اس عالم دنیا کے اندر رہنے کی، وہاں تھی۔ ان باتوں کی حفاظت کرے، سامان کے اختیار کرنے کی آج کہتا ہے۔ یہ تو میں نے اطلاع کردی تھی، حتیٰ کہ غرغرہ کی بھی کیفیت ہو جاوے، کہ اس عالم کے کچھ سامان احوال سامنے آگئے تب بھی استغفار قبول نہیں، اب تو پیشی ہوگی۔

فرض' واجب' سنت' مستحب سب اپنے اپنے درجے میں مطلوب ہیں :

لیکن یہ کیوں کہا گیا ہے کہ یہ فرض ہے، یہ واجب ہے، یہ سنت ہے، یہ مستحب ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب اپنے اپنے درجہ میں مطلوبات میں سے ہیں۔ معروفات میں سے ہیں نہیں۔ اُدھر دوسری جانب نفی کی محرمات' مکروہات مشتبہات منکرات میں سے ہیں۔

اسی طرح منکرات بھی ہیں:

جس طرح محرمات سے اپنے درجہ کے اعتبار سے بچنا ہے، ایسے ہی مکروہات بھی تحریمیہ وتنزیہیہ اپنے درجہ پر بچنے کے لئے ایسے ہی مشتبہات اپنے اپنے درجہ کے اعتبار سے کیا ہیں، منکرات میں سے ہیں۔

یہ درجہ ہے، جو مکروہات سے بھی پرہیز کرے گا تو کیا محرمات پر ہاتھ ڈالے گا۔ جب مشتبہات سے بھی اس کی ناپسندیدگی ہے، کراہیت ہے، مشتبہات سے بھی، کیا محرمات کی طرف انجذاب تقاضہ اقدام ہوگا، آئی بات ذہن شریف میں، اُلٹے چلئے اُلٹے چلئے مشتبہات سے بچا، مکروہ سے بچا، تنزیہات سے بچا، محرمات سے بچا، اب ادھر آئے گا معروفات میں جو مستحبات کا اہتمام کرے گا۔ جی کیا واجبات سنن کو چھوڑ دے گا؟ کیا واجبات کو چھوڑ دے گا؟ کیا فرائض کو چھوڑ دے گا؟

ترتیب اس کا شوق اس کا ذوق اس کی نسبت اللہ کی طرف ہے، دیکھ رہا ہے، جان رہا ہے، علم الیقین کہ مستحبات کا جب اہتمام ہے تو بھلا سنن کا چھوڑنا کیسا واجبات کا چھوڑنا کیسا فرائض کا بالترتیب یہ ترتیب ہے۔

جب تہجد کا اہتمام کرے گا، جماعت چھوڑ دے گا، نماز کا ترک کرنا تو کیا جماعت چھوڑ دے گا۔ یہ ترتیب ہے، یہ حفظ ماتقدم اپنی طاقت کے مزاج کے مطابق اگر چھت اس کی کچی ہے اور طاقت اللہ تعالیٰ نے اس کو دی ہے، لینٹر ڈلوائے، اترانہ پن نہیں ہے ضرورت ہے کہ بجائے کچی چھت کے کیا کرے پکی چھت رہے ورنہ پریشانی ہوگی، برسات میں پانی ٹپکے گا۔

اس کے پاس سامان ایسے موجود ہیں، جی تو ایسی جب جسم میں طاقت ہے، قوت ہے، صحت اچھی ہے اور دنیاوی ضرورتوں سے فارغ ہے، تو پھر نفل کا چھوڑنا کیسا؟ مستحبات

کا ترک کیسا؟ سنن کا ترک کیسا؟ اگر ہے تو پھر چھت ہی کچی چھوڑ دی جاتی۔ یہ لینٹر کا ڈلوانا کیسا؟ تو جیسے حفظ ماتقدم، ضروریات کی تفصیل، فاذا فرغت فانصب دلیل بن گئی۔

زمانۂ طالب علمی میں حضرت تھانویؒ کی نصیحت:

حضرتِ والا کو جب معلوم ہوا کہ میں کچھ محنت سی کرتا ہوں' تو فرمایا کیا یہ خیال کر رکھا ہے کہ یہ ہی طالب علمی کا زمانہ ہے اس طرح محنت کی جاوے کہ صحت میں خلل نہ پڑے۔ صحت کا خیال فرض ہے، شرعاً یہ میں کہہ رہا ہوں' صحت کا خیال۔ کیا یہ ہی زمانۂ طالب علمی کا ہے۔ طالب علمی کا زمانہ تو یہ طالب علمی ختم ہونے کے بعد شروع ہوگا۔

یوں فرمایا یہ جب کان میں آواز پڑ گئی تو اب مزاج طالب علمی کا رہ گیا۔ آپ بھی طالب علم' میں بھی طالب علم' تو یہ مجالس جو ہیں یہ تربیت ہی کے لئے ہیں لیکن تربیت موقوف ہے تعلیم پر جو کہ وہ علم ہے جو متعلق بالظاہر ہے' متعلق بالباطن اور امام صاحب نے فقہ کی یہ ہی تعریف کی ہے۔ تعمیر الظاهر والباطن۔ تو یہ مجالس جہاں جہاں ہوتی ہوں۔

شیخ صاحبِ فن ہوتا ہے' امراض اور اس کے معالجات کو جانتا ہے:

پیر ہونا الگ بات ہے، شیخ ہونا الگ بات ہے، شیخ صاحبِ فن ہوتا ہے' وہ امراض سے واقف' امراض کے اُتار چڑھاؤ سے واقف' یہ امراض کے معالجات سے واقف' ایک ایک مرض کے کئی کئی معالجات سے واقف' مزاج شناس' موقع شناس' امیر کا مزاج، غریب کا مزاج، جوان کا مزاج، بڈھے کا مزاج اور جیسے اطباء مزاج کے اعتبار سے مرض کو پہچان کر دوا تجویز کرتے ہیں' تشخیص کے بعد اسی لئے مسئلہ سلوک کا ہے، شیخ کا علم انبیاء کا سا یعنی صحیح ٹھیک۔ علم صرف پڑھنے کا نہیں کہتے، علم کسی حق بات کے جاننے کو کہتے ہیں، خواہ پڑھ کر بالتفصیل عربیہ کے اندر، فارسی کے اندر یا اردو کے اندر سُن کر پوچھ پوچھ کر۔

علم بذریعۂ صحبت :

بعض اُمی ہوئے ہیں۔ کتابی علم اُن کو حاصل نہیں تھا، مگر بڑے مشائخ میں سے ہوئے ہیں۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کون سے عالم تھے؟ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری ان کے پہلے شیخ ان کا نام بھی عبدالرحیم شاہ تھا، وہ اُمی تھے۔

شیخ کا علم انبیاء کا سا، تجویز اطبّاء جیسی، سیاست بادشاہوں کی سی :

شیخ کا علم انبیاء کا سا، تجویز اطبّا کی سی۔ یہ نہیں کہ ایک نسخہ یاد کرلیا سب کو وہ ہی لکھ دیا۔ جیسا مریض ویسی دوائی اور سیاست بادشاہوں کی سی یعنی نگرانی، روک ٹوک، نگرانی سیاست یعنی تدبیر حسن مزاج کو دیکھ کر، موقع کو دیکھ کر، وقت کو دیکھ کر، رنگ مزاج کو دیکھ کر، یہ نہیں کہ ہر ایک کو ہر ایک کے سامنے ٹوکنا شروع کردیا، کبھی جلوت میں کہا جائے، کبھی خلوت میں کہا جائے، کبھی نرمی سے کہا جائے گا، کبھی تیزی سے کہا جائے گا، کبھی یوں بھی کہہ دیا جائے گا، شہر بدر، خانقاہ سے نکل جاؤ، یہاں سے اُٹھ جاؤ، سیاست بادشاہوں کی سی، تو شیخ صاحبِ فن ہوتا ہے۔

خلاصۂ مجلس :

لیکن اس کے ساتھ ہی تعلیم کے مختلف قسم کے بیانات ہوئے ہیں، اس میں توفیقِ الٰہی سے آج حفظ ماتقدم کی بات چلی تھی۔ حفظ ماتقدم اس میں تفصیل ہوگئی، ضروریات ہر ایک کے الگ الگ بیان کیے گئے، پھر درجے جو شریعت کے اندر بیان کیے ہیں، اس کا ذکر آ گیا تدریس مدرس میں طالب علموں کا ذکر بھی آ گیا اور پورا کا پورا عالم جو تفصیلی ہے، یہ بھی آ گیا کہ ہر انسان عالمِ صغیر ہے، تو جس عالمِ کبیر میں رہتے ہوئے چاروں سمتوں کو دیکھتے ہوئے حفظِ ماتقدم، کہ جس چیز کے ضرر کا اندیشہ سامنے آنے والا ہے، معلوم کردیا گیا ہے کہ

یہ ضرر ہے، اس کے اندر ضرر ہے۔

یہاں بطورِ نمونے کے ہے لیکن دوسرے عالم کے اندر پورا ضرر ہے، اگر ضرر کی چیز استعمال کی ہے یہاں نمونے کے طور پر۔ اور یہ نفع کی چیز ہے، نمونے کے طور پر ہو جائے کم و بیش نہ ہو جائے لیکن نفع کامل وہ دوسرا عالم ہے، اور بتا دیا گیا۔

لہٰذا آخرت میں جانے سے پہلے حفظِ ماتقدم اس عالم کے اندر مضرات و ضرر کی چیزیں ہیں، ان سے بچنے کا اہتمام اور جو اس عالم میں نفع کی راحت کی چیزیں ہیں ان کے حصول کا اہتمام، یہ حفظ ماتقدم ہے۔

دُعا :

اس عالم کے اندر اللہ تعالیٰ ہمیں اس زندگی پر پورے اہتمام کے ساتھ، پوری نظر و نگاہ کے ساتھ، پورے اہتمام کے ساتھ، پورے احتساب کے ساتھ ہمیں رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

گیارہویں مجلس

مجاہدہ وشانِ فناء

ارشاد فرمایا کہ تمام انسان اس عالم میں مجاہدہ کے لئے پیدا ہوئے، اور عالمِ ارواح میں مشاہدۂ حق میں تھے، لیکن مجاہدہ نہیں تھا، تمام ملائکہ مشاہدۂ حق میں ہیں مگر ان کو ترقی نہیں ہے، چونکہ وہاں مجاہدہ نہیں، بس جو جس درجے کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، اس درجے پر ترقی سمجھے۔ اپنے لئے تو عالمِ ارواح میں بھی انسان مشاہدۂ حق میں تھا، روح بیکار نہ تھی، مشاہدۂ حق میں تھی لیکن مجاہدہ نہیں تھا، اب اس عالم میں جب حق تعالیٰ نے پیدا فرمایا مشاہدۂ حق بمجاہدہ پیدا کیا، قرآن شریف میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔

یعنی کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم یقین لائے اور ان کو جانچ نہ لیں گے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا چھوڑ دیا جاوے یہ کہہ کر اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ انسان کا اٰمنّا کہہ کر بس بس وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (سورۃ العنکبوت) اور آزمایا نہ جاوے، آزمایا جاوے گا وہ آزمایا جانا مجاہدہ ہے۔

مشاہدہ بمجاہدہ :

اس عالم کے اندر انسان کو برائے مشاہدہ بمجاہدہ بھیجا گیا ہے۔ چونکہ طرح طرح کا مجاہدہ ہے، نفس کے اس مخالفت اور مقاومت میں طرح طرح کے انفرادی اور اجتماعی حقوق اللہ سے متعلق اور حقوق العباد سے متعلق ہیں اور جب مجاہدہ کرے گا، مشاہدہ میں آسانی ہوتی چلی جاوے گی، پھر وہ مجاہدہ، مجاہدہ نہیں رہے گا، بلکہ مشاہدہ رہ جاوے گا، یعنی وہ مشقت' محنت' مقاومت' مخالفت سوچ سوچ کر رہ رہ کر مختلف مضامین اختیار کرتے ہوئے نہیں رہے گی وہ اس کی طبیعت بن جاوے گی مجاہدہ نہیں رہے گا۔

نیت پر ثواب :

یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ جب مجاہدہ نہیں رہے گا، پھر وہ اجر بھی نہ ہو، اجر تو ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی نیت تو تاحیات مجاہدہ کے ساتھ بھی امتثالِ اوامر نواہی تھا اور جب یہ نیت تھی تو اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَات وہی اجر ہے، اجر کہیں نہیں گیا۔ تو یہ کہنا کہ مجاہدہ والے کو دوگنا ثواب ملے گا، ایک تو کام کا اور ایک اس پر مشقت۔ اور جو مجاہدہ سے نکل گیا، اس کو بھی دوسرا حصہ ملے گا بر بنائے نیت۔ اب جتنے بھی اوامر نواہی ہیں مأمور بہا و منہی عنہا ان سب کا امتثال بمشاہدہ سہل تر ہو جائے گا۔ قرآن شریف کی ایک آیت ہے اُس میں ہے بِاَعْیُنِنَا آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اس اضافے کی کیا بات تھی، جب یہ فرما دیا بِاَعْیُنِنَا اب وہ کام آسان ہو گیا، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، بِاَعْیُنِنَا یہ مشاہدہ ہے۔

اسی مشاہدہ کو رسولِ پاک ﷺ نے حدیث جبرئیل میں بیان کر دیا ہے۔ جس کو تعبیر کیا ہے احسان کے ساتھ ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانّہ یراک وہاں کَاَنَّ ہے یہاں اِنَّہٗ ہے، ورنہ حقیقت میں کون دیکھ سکتا ہے، پھر وہ بھی تو

مشاہدہ کے متعلق بیان ہے۔

ہر سانس عبادت :

عبد کی تو زندگی کا ہر پہلو، زندگی کا ہر عمل، زندگی کا ہر سانس عبادت ہے۔ نماز پڑھے، روزہ رکھے، کسی کے پاس مال ہے زکوٰۃ دینے کا موقع ہو یا حج کرنے کا موقع ہو یا قرآن شریف کی آیت تلاوت کرنے کا موقع ہو یا کسی کو شوق ہو اللہ تعالیٰ کا نام لینے اور ذکر کرتے رہنے کا، کوئی کام اس کا متعین نہیں۔

عبدیت کا مفہوم :

اس لئے کہ اس کو عبد کہتے ہیں اور عبد کا کام ہر وقت خدمت گزاری، کوئی کام اُس پر متعین نہیں، بندہ، انسان، مؤمن یہ ملازمت کے طور پر نہیں ہیں، جیسا کہ ملائکہ بلکہ ان کی ہستی تو غلامیت کے طور پر ہے اور غلام کے لئے کوئی کام مقرر نہیں، جب چاہے جس قسم کا چاہے اعلیٰ سے اعلیٰ، ادنیٰ سے ادنیٰ، اوسط سے اوسط جس کام کو چاہے کہہ دیوے کہ بیت الخلاء صاف کرو، مہمان کے پاؤں دباؤ، بازار سے سودا لاؤ بہت اچھا، اور نوکر کو کسی مخصوص کام کے لئے رکھتا ہے، اُس کام کے علاوہ اور کام آپ اُس سے نہیں لے سکتے، لینا چاہے انکار کردے، اس کو حق ہے بخلاف غلام کے۔

غرضیکہ جس حال میں رکھے اور جس نام سے پکارے گوارا ہے۔ اس کا کوئی کام مقرر نہیں ہے، تو اس انسانِ غلام کی زندگی کے جتنے شعبے ہیں، اس کی زندگی سے متعلق وہ سارے کے سارے عبدیت کے تحت ہیں، غلامیت کے تحت ہیں، اس کو بلا اجازت بولنا بھی جائز نہیں، اُٹھ کر جانا بھی جائز نہیں، ہر چیز آقا کی اجازت پر ہے اور شعبے اس کی زندگی کے بہت ہیں، پھر جن کو ظاہری طور پر عبادت کہا جاتا ہے صرف وہی نہیں ہیں، اس سے ہٹ

کر جن کو عبادت نہیں سمجھا جاتا، وہ بھی عبادت ہے، جس کا تخیل عبادت نہیں ہے۔ وہ بھی عبادت ہے، ملازمت کے بھی، اجارے کی بھی حدود ہیں، اس کی شرطیں اور قیدیں ہیں، کب تک لو گے، کیا کام لو گے اور کیا دو گے، سال بھر میں کتنی چھٹی دیا کرو گے، اُن چھٹیوں کی تنخواہ دو گے یا نہیں دو گے، اگر بیمار ہو گیا تو کام تو ہوگا نہیں مجھ سے، تب بھی مجھے کچھ ملے گا یا نہیں ملے گا، یہ ہے نوکری، یہ ہے ملازمت۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان جو غلامیت کے اندر ہے اُس کا کوئی کام متعین نہیں ہے جو کام چاہے جس وقت چاہے جس طرح چاہے کرنا ہوگا۔ کھیتی بھی کرنا چاہے تو اپنی رضا سے نہیں کر سکتا، تجارت بھی کرنا چاہے تو اپنی رضا سے نہیں کر سکتا، قرضہ بھی دے، تو اپنی رضا سے نہیں دے سکتا۔ صدقہ بھی دے تو اپنی رضا سے نہیں دے سکتا، زکوٰۃ بھی دے تو اپنی رضا سے نہیں دے سکتا، حج بھی کرے تو اپنی رضا سے نہیں کر سکتا، زکوٰۃ کے سلوک کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا، روزے کے سلوک کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا، حج کے سلوک کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا، اپنی رضا سے نہ بیچ سکتا ہے، نہ خرید سکتا ہے، اس کے بھی سلوک ملحوظ رکھنا پڑیں گے، کسی کو شریک بھی اپنی رضا سے نہیں کر سکتا، یہ جزئیات ہیں اور آپ حضرات پر تو سب واضح ہیں، فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیجئے گا۔ کِتَابُ الْاِجَارَۃ نہیں پڑھایا جاتا کتاب البیوع نہیں پڑھائی جاتی، کتاب الزکوٰۃ نہیں پڑھائی جاتی۔

پرورشِ اولاد کی اندر بھی شرطیں ہیں، ازدواجی زندگی کی بھی شرطیں، یہ نہیں کہ جس طرح چاہا، جب چاہا، جس کو چاہا، بیوی بنا لیا، جب چاہا جس کو چاہا دیکھ لیا، جب چاہا، جس چیز کو چاہا سن لیا، جب چاہا، جس طرح جس کے ساتھ چاہا، بول لیا اور جب چاہا جہاں چاہا چل دیا، جو بھی کام ہوگا وہ مالک کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

فعل اور عمل میں فرق :

عمل اور فعل میں فرق ہے۔عمل وہاں بولا جاتا ہے جہاں اختیار کو دخل ہو اور فعل عام ہے خواہ بلا اختیار ہو یا با اختیار ہو۔ یہ فرق ہے فعل میں اور عمل میں، اسی لئے بخاری شریف کے شروع میں جو حدیث آئی ہے اُس میں وہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ فرمایا ہے اِنَّمَا الْاَفْعَالُ نہیں فرمایا ہے۔تو سانس ایک فعل ہے، جس کا تعلق اختیار سے بھی ہے، بلا اختیار کے بھی ہے۔

ہر سانس عبادت :

ہم انسان بقبولِ ایمان بالخصوص بقولِ شخصے ہمارا بال بال بندھا ہوا ہے، جکڑ بند ہے، جب سانس اندر جا رہا ہے تو کسی کی بڑائی کے خیال کے ساتھ یا باہر آ رہا ہے تو کسی کی بڑائی کے خیال کے ساتھ' اس لئے انسان کی ہستی غلامیت کے ساتھ ہے، ملازمتی حیثیت سے نہیں ہے کہ ایک کام مقرر ہے، اگر ایسا ہوتا تو بقول شخصے میاں بیوی راضی، کیا کرے گا قاضی۔ یہ محاورہ ہے یعنی جب مرد عورت میں رضا ہوگئی پاس رہنے کی، رضا ہوگئی الگ ہونے کی، تو الگ ہوگئے۔ الگ ہونے کی بھی شرط ہے، دیکھو کتاب الطلاق کتنی موٹی ہے، کہیں رجعی ہورہی ہے، کہیں مُغلّظ ہورہی ہے، کہیں تعلیقی ہورہی ہے، نکاح یہ بھی عبادت ہے، جس سے چاہیں کرلیں، گواہوں کی کیوں شرط لگائی کیا ضرورت تھی۔ یہ خطبہ کا پڑھایا جانا' سورتوں کا' آیتوں کا پڑھایا جانا یہ تو کوئی شرائط میں سے نہیں ہے، یہ تو تبرکات میں سے ہیں۔ یہ مہر کا قصہ، انکار بھی کردے تب بھی جب میاں بیوی راضی، کیا کرے گا قاضی۔

تو زندگی کے جتنے شعبے شمار کرائے، گنائے ہیں، سب سے اونچی عبادت روزانہ کی اور پانچ وقت کی نماز جس کو سارا جہاں مسلمان اور غیر مسلم بھی اُس کو

عبادت ہی کہتے ہیں، اُس میں بھی آزاد نہیں کہ جب چاہے جس طرح چاہے اور جس ہیئت کے ساتھ چاہے ادا کرے، نہیں تو وہ بھی مُقیّد ہے اوقات کے ساتھ، خیریت سے وہ بھی مقید ہے کسی مکان کے ساتھ، وہ بھی مقید ہے کسی خاص ہیئت کے ساتھ، اگر ہیئت میں بھی فرق آ گیا تو عمل میں فرق آ گیا کہ اس ہیئت کے خلاف کیوں ہوا۔

نماز کی مثال :

جیسا کہ ایک صحابی نماز پڑھ رہے تھے جب فارغ ہوئے تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا :

ارجع فصل فانک لم تصل الخ ۔(ترغیب ج ا ص: ۳۴۰)

جاؤ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی۔

انہوں نے پھر پڑھی، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا۔ پھر پڑھی یوں ہی فرمایا، تین دفعہ فرمایا :

عرض کیا : **عَلِّمْنِیْ یَارَسُوْلَ اللّٰہ**۔

اے اللہ کے رسول مجھے آپ ﷺ نماز پڑھنا سکھلا دیجئے۔

تب آپ ﷺ نے ان کو پڑھنا سکھلائی، دیکھئے کیا یہاں رکوع نہیں کیا تھا، کیا سجدہ نہیں کیا تھا، کیا قومہ وقیام نہ تھا، کیا جلسہ نہ تھا، کیا قرأت نہ تھی، کیا تسبیحات نہ تھیں؟ سب کچھ تھا اس کے باوجود فرمایا، پھر سے پڑھو، نماز نہیں ہوئی، نماز پڑھو۔

معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی ہیئت ہے مخصوص اس ہیئت مخصوصہ کے چھوڑنے پر ان کو بلایا، وہ افعال تو ہیں جو نماز کے اندر ہوتے ہیں، مگر جس ہیئت کذائیہ کے ساتھ ہونا چاہئے وہ نہیں ہے، آزادی سلب ہوگئی، وہ عبادت کہلائے جانے کے قابل نہ رہی، اس میں بھی آزادی نہیں یعنی ہیئت کے اندر بھی آزاد نہیں، تم اس طرح کیوں نہیں جھکے، اس طرح

سجدہ میں کیوں نہیں گئے، اس طرح کیوں نہیں بیٹھے، اس طرح کیوں نہیں کھڑے ہوئے۔ دوسری عبادت کا بھی عبادت میں شامل کرنا ممنوع، اب کسی نے کہا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ نماز میں جواب دیا وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ تو نماز فاسد ہوگئی۔ کتنی قید ہوگئی، حُریت میں کتنی غلامیت کس درجہ کی آگئی۔ سلام کا جواب تو واجب ہے، خارج الصلوٰۃ وہ نماز کے اندر مُبطل صلوٰۃ مفسد صلوٰۃ، باطل، آپ اس انسان کی زندگی کے جس بھی شعبے پر نظر دوڑاتے چلے جاویں حریت ختم غلامیت ہے۔

بادشاہ بھی آزاد نہیں :

بادشاہ بھی بادشاہت نہیں کرسکتا، غلامیت سے خارج ہوکر، کہ جس طرح چاہوں میں بادشاہت کرلوں' دوسرے کی سلطنت حکومت کو بھی جس طرح چاہے لینا، نہیں لے سکتا اور لے کر جس طرح چاہوں کروں نہیں کرسکتا، اس کی بھی حدود ہیں، شرائط ہیں اور قیود ہیں۔ تو ملک گیری اور ملک داری اس میں بھی آزاد نہیں ہے، اس میں بھی غلامیت ہے، میں تو بادشاہ ہوں لیکن تم بادشاہ کسی بادشاہ کی نگرانی میں ہو، کسی بادشاہ کی ماتحتی میں ہو اور ماتحت کو اصل مالک کا حکم ماننا ضروری ہے۔ اس اصلِ مالک کے ماتحت کو اصل مالک کا حکم ماننا ضروری ہے۔ اس اصلِ مالک کے تحت تم مجازی مالک ہو، بادشاہ! تم حاکم اُس احکم الحاکمین کے تحت میں ہو، لہٰذا اس کے خلاف قانون سزا نہیں دے سکتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن۔ (سورۃ الذاریٰت) کہ اس انسان کے پیدا کرنے کا منشاء کیا ہے' کیوں پیدا کیا یعنی لِیَعْبُدُوْن عبدیت، اس کا کوئی کام مقرر نہیں اور ہر کام میں مقیّد ہے، حتیٰ کہ کھانا پینا اس میں بھی آزاد نہیں، اس میں بھی مقیّد ہے، یہ الگ بات ہے کہ کچھ شرطیں' کچھ قیود وجوب کے درجے میں ہیں' کچھ غیرِ وجوب کے درجے میں۔

کامل رضا :

اور کامل رضا غلام آقا کے ساتھ چاہتا ہے اور کامل رضا جب ہی حاصل ہو گی، جب اُس کی پوری رضا کے مطابق وہ کام ہوگا' ورنہ ناقص ہے۔ اگرچہ بعض چیزیں درجۂ وجوب میں نہیں، مگر حکما تو ہیں۔ دیکھنا یہ پڑے گا کہ کہا کس نے ہے، یہ دیکھنا نہیں پڑے گا کہ یہ کس درجہ میں ہے، یہ دیکھنا پڑے گا کہ کس درجہ والے نے کہا ہے۔

جیسا حاکم ویسا حکم :

اگر ایک سپاہی کہتا ہے کہ میں پانی پیوں گا، بہت اچھا وہ رکھا ہے گھڑا، کہہ دیا آپ نے، تو پی لے گا اور کلکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں' کلکٹر صاحب نے کہا پانی پیوں گا، تو کہہ دیں گے آپ کہ وہ رکھا ہے گھڑا، کلکٹر تو دور کی بات ہے' بڑی چیز ہے تھانہ دار آ جائے میں پانی پیوں گا۔ بہت اچھا سرکار! خود اُٹھے گا گھڑے میں سے پانی کٹورے میں لے گا اور خود جا کر پیش کرے گا تو یہ فرق کیوں ہوا' سپاہی و چوکیدار بھی تو کہہ رہا ہے' اُسی کام کو، کلکٹر، تھانہ دار بھی کہہ دیا ہے۔ اس سپاہی کو تو کہہ دیا کہ وہ رکھا ہے گھڑا اور اس تھانہ دار کو خود پیش کر رہا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ عامل کو دیکھنا ہوگا کہ کہنے والا کون ہے، اُسی کے مطابق عمل کرنا اور انجام دینا ہوگا۔ یہ سوال مسلمان ہو کر اور تو کہتا ہے، درجۂ انّـی کے اندر کہہ سکتے ہیں' لیکن درجۂ عملی کے اندر تو ہر عمل کو یکساں سمجھنا چاہئے اور جبکہ تو کامل درجے کا طالب بھی اپنے آپ کو کہتا ہے اور ہر ہر شخص درجۂ کاملی کا طالب ہے، مجبوری الگ بات ہے تو یہ سوال نہیں ہوگا۔

کھانے میں پابندی :

کھانا اپنی اختیاری بات ہے مگر طبعی چیز ہے کہ جس طرح چاہیں ہم کھالیویں اور جس چیز کو ہم چاہیں کھالیویں نہیں ہوسکتا، جن جن چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے وہ

ہی کھانا ہوں گی اور جس طرح کھانے کے لئے کہا ہے، اس طرح کھانا ہوگا، چاہے خرید کر کھاوے، چاہے بلاخرید کھاوے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ بھی کیا سوال کر رہے ہیں، تم اُس باغ کے آم لے کر آئے ہو، کھانے کے لئے۔ ارے وہ باغ تو جب بکا تھا، جب اُس میں کیری کا نام بھی نہیں تھا، خالی پھول ہی آیا تھا، کیری کا بھی نام نہیں تھا، پھل تو کیا ہوتا اور اس باغ کا تو آم لے کر آیا ہے کھانے کے لئے، تو کھا نہیں سکتا، کیوں میں تو پیسے دے کر لایا ہوں' میں نے چوری کی ہے، کوئی ڈاکہ ڈالا ہے، میں نے پیسے دیئے ہیں۔ جناب آپ نے کتنے ہی پیسے دئے ہوں' آپ کو کھانا جائز نہیں ہے۔ اس باغ کے آم کا یہ آم کھانا کہ اس طرح بیچا گیا تھا جائز نہیں ہے، آزادی سلب ہوگئی یا نہیں سلب ہوگئی، نہیں کھا سکتے۔

اگر یہ معلوم ہو کہ یہ باغ فلاں وقت بکا تھا اور اُس کا یہ آم ہے، کھانا جائز نہیں ہے، کتنا مقید ہوگیا میں تو پیسے دے کر لایا ہوں، چوری تھوڑی کی ہے، تو معلوم ہوا کہ جس چیز کو کھانا چاہے کھالے، ایسا نہیں کرسکتا کہ جس طرح کھانا چاہے کھالے، نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی عذر نہیں ہے، کمر کا درد، موٹا ہونا، بیمار ہونا، پالتی مار کر نہیں کھا سکتا، چہار زانوں ہو کر نہیں کھا سکتا۔ یہ تو کھانے کی بات ہے دنیاداری کی بات ہے، لوگ یہی سمجھتے ہیں لیکن کھانے کے لئے بھی مقید کردیا۔ جب ایمان بالخصوص لے آیا تو ساری آزادی سلب ہوگئی، مقید ہوگیا، کھانا نہیں کھا سکتا، اتنا مقید ہوگیا' یوں کھالو بلا بسم اللہ پڑھے ہوئے کھالو، لیکن وہ کھانا بھی بلاشرکتِ شیطان نہیں ہے۔ بظاہر نظر نہیں آرہا مگر اس کھانے میں شیطان شریک ہے۔ کیا کوئی شخص دشمن کو اپنی کسی چیز مین شریک کرنا گوارہ کرتا ہے اور شیطان دشمن ہے اور جب ہے' اور یہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے، معلوم کرادیا گیا ہے کہ بغیر بسم اللہ کے تو کھانا کھاوے گا، تو تیرا دشمن جو شیطان ہے' وہ شریک ہے اور یہ مان چکے ہو کہ دشمن کو شریک کیا نہیں جاتا، ارے شیطان دشمن کو شریک کیوں کر رہے ہو، تو بسم اللہ چھوڑ کر اس نے خود دشمن شیطان کو اپنے

کھانے میں شریک کیا نہیں۔ آزادی سلب ہوگئی یا نہیں ہوئی۔ کھانے کے اندر بھی آزادی سلب غلام ہے کہ اس طرح کیوں کھایا تو نے ہاں کوئی غیر مسلم ہے، کوئی مصلحتِ خاص ہے، آ گیا، آپ کھانا کھا رہے ہیں، آیئے کھانا کھایئے، وہ بھی بیٹھ گئے کھانے کے لئے، اب آپ جانتے ہیں نہیں، آیا ہے، یہ کوئی آپ جانتے ہیں نہیں اور آپ کھانا کھا رہے ہیں، تو پوچھیں گے یا نہیں پوچھیں گے؟ آپ پر بے مروّتی کیسی آیئے کھانا کھایئے، وہ بیٹھ گیا کھانے کے لئے، بسم اللہ نہیں پڑھی اُس نے، اب آپ چونک گئے، آپ نے اُس شخص سے کہا کہ اچھا آپ نے بسم اللہ تو پڑھی نہیں' کیسی بسم اللہ۔ اُفو! آپ کون ہیں؟ کہ فلاں آدمی ہوں اوہو! اچھا دستر خوان سے اُٹھ جایئے، اُٹھ گیا ٹھیک ہے لیکن آپ پر عتاب ہوگیا، سنتے رہیئے آپ نے اُٹھا دیا، بسم اللہ نہیں پڑھی، اس لئے آپ پر عتاب ہوگیا، گو عتاب کی آواز نہ آوے اور جہاں آئی ہے، آئی ہے، عرب کی سخاوت مشہور ہے، ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے چلی آرہی ہے، اب بھی سخی ہیں، وہ پیسہ کو پیسہ سمجھتے ہی نہیں ہیں، اسلئے عرب ہندوستان کو کہتا ہے بطال، بخیل۔ بخیل، اس کو کھانا ہی نہیں آتا، وہ روز مرغ کھاتے ہیں، اُنہیں پرواہ ہی نہیں ہے کہ شام کو رہے گا یا نہیں رہے گا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ :

حضرت ابراہیم علیہ السلام بلا مہمان کے کھانا ہی نہ کھاتے تھے، دستر خوان بچھ گیا ہے، مہمان کوئی ہے نہیں آ گئے دروازے پر کہ کوئی مل جاوے، تو لاؤں بلا کر اب مل گیا، کوئی بُلا لیا، آیئے آیئے کھانا کھایئے! اُس نے کھانا شروع کر دیا، بسم اللہ نہیں پڑھی، ارے تم نے بسم اللہ نہیں پڑھی' کون ہے؟ تو اس نے کہا مجوسی ہوں، میں تو آتش پرست، آگ کے پوجنے والے، تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا اچھا اُٹھ جاؤ دستر خوان سے، وہ اُٹھ گیا، وحی آ گئی کہ اے ابراہیم وہ تمہارا مہمان تھا اور تم بلا کر بھی لائے وہ تمہارا مہمان تھا، بسم اللہ پڑھی یا نہ

پڑھی وہ تو ہمارا معاملہ ہے جس کا وہ مکلف نہیں ہے تم نے کیوں اُٹھایا دستر خوان سے، اب لگے ابراہیم علیہ السلام تلاش کرنے، عتاب آ گیا، محبتانہ عتاب ہے، یہ عتاب نہیں ہے ڈھونڈا تلاش کرکے، لے بھی آئے۔ ہم سے غلطی ہوگئی ہے آؤ آؤ کھانا کھاؤ، اُدھر چہار زانوں ہوکر بیٹھ رہے ہیں اور ادھر بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھا رہے ہیں۔

بعد وضو بھی ہاتھ دھوؤ :

اس کا خیال نہ کیا جائے کہ میں ابھی نماز پڑھ کر آیا ہوں' ابھی وضو کیا تھا اور میرے ہاتھ عبادت میں لگے ہوئے تھے۔ سجدے میں شریک' رکوع میں شریک' قومہ میں شریک' قیام میں شریک' دُھلے ہوئے بھی عبادت کئے ہوئے بھی۔ اب دھوؤں گا تو عبادت میں جو اُس پر ایک رنگ اور نور آیا ہوگا وہ دُھل جاوے گا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ ہاتھ دھوؤ نہیں سمجھ میں بات آئی۔ جب عبادت کریں گے تو اعضاء میں نور نہیں آوے گا اور وہاں کیا حکم لگایا جارہا ہے کہ نماز پڑھتے ہی آیا ہے، دستر خوان لگا ہوا ہے، بیوی اور اماں کو معلوم ہے کہ اس وقت کھانا کھاتا ہے، نماز پڑھنے کے بعد آوے گا۔ دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا، اُس پر کپڑا اچھا دیا، مکھی وغیرہ سے حفاظت کے لئے بیٹا آیا' میاں آیا' باپ آیا' کھانا کھانے کے لئے کپڑا اُٹھا کے بیٹھ گئے، ارے بیٹا ہاتھ تو دھولئے ہوتے۔ اماں میں تو ابھی نماز پڑھ کر آیا ہوں، ہاتھ خوب دھوئے تھے وضو میں اور یہ اعضاء عبادت کے نور لگے ہوئے ہیں اس کے اندر اور آپ ہاتھ دھونے کے لئے کہہ رہی ہیں۔ بیٹا میں نہیں کہہ رہی، جس کا تو اُمتی ہے اُس نے کہا ہے، ارے بیٹا میں نہیں کہہ رہی، جس کا تو بندہ ہے اُس نے کہا ہے، وہ نور کہیں نہیں جاتا بلکہ اُس نور میں اور نور آجاوے گا، وہ نور آیا ہے عبادت کا نماز پڑھنے کی حالت میں۔ اب اس حکم کی تعمیل سے ہاتھ دھوؤ تو اور نور آجائے۔ تو نورٌ علی نور ہوگیا ہم کیا سمجھے نور گھٹتا نہیں بلکہ اور بڑھے گا۔

بظاہر تو عقل بھی کہہ رہی ہے، ابھی تو نماز پڑھی ہے، ابھی تو ہاتھ دھوئے تھے، کوئی دوسری چیز استعمال نہیں کی، کوئی چیز چھوئی نہیں، تو کیا میرے ہاتھوں میں کچھ لگ گیا، بعض کہتے ہیں انگریزی تعلیم یافتہ کہ میرے ہاتھوں میں کیا لگ گیا۔

بعض جدت پسندوں کا اعتراض :

ان مولویوں نے بھی پریشان کر دیا۔ یہ دین مولویوں کے گھر کا بنایا ہوا ہے۔ مولویوں کے اوپر کتنا بہت سخت اعتراض ہے۔ کتنی سخت بات ہے، یہ نہیں خیال کرتے، اتنی بھی عقل سے کام نہیں لیتے کہ مولویوں کو کیا ضرورت پڑی اپنی آزادی سلب کرنے کی جیسے تم اپنی آزادی کو' راحت کو' چین کو اور جس طرح چاہو کھانے کو اور جس چیز کو چاہو کھانے کو تو مولویوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنے آپ کو مقید کر دیں، وہ بھی جس طرح چاہیں کھا سکتے ہیں اور جس طرح بیٹھ کر چاہیں کھا سکتے ہیں۔

مؤمن مقید ہے :

تو اپنے کو مقید کیا، اس سے تم اندازہ کرلو، یہ اپنے آپ کو مقید کیوں کیا انہوں نے، اس میں تو دقت ہے' اس میں تو پریشانی ہے' اس میں تو تکلیف ہے' پھر یہ اپنے آپ کو مولویوں نے تکلیف میں کیوں ڈالا، پریشانی میں کیوں ڈالا، اس لئے ڈالا کہ انہوں نے عبدیت کا حق ادا کرنا چاہا اور تم نے عبدیت سے باہر نکل کر کام کرنا چاہا۔ آپ بھی کھا سکتے ہیں' آخر ہم بھی کھا سکتے ہیں۔

یہ کہتے ہیں ان کے پاس تو ہے نہیں کچھ پہننے کو کس طرح اچھا کھائیں' کس طرح اچھا پہنیں، تو کھانے کے معاملہ میں غریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا بعض ایسے ایسے مولوی ہیں کہ تم سے زیادہ اُن کے پاس ہے تو وہ بھی کھا سکتے ہیں نا۔ وہ مُرغ بھی کھا سکتے ہیں،

راستہ میں کوئی مرغی پھر رہی ہے کوئی مولوی صاحب آ رہے ہیں، نماز پڑھ کر مُرغی مل گئی وہ پکڑ لی اور ذبح کر کے کھالی تو جس طرح تم آزاد ہو وہ بھی آزاد ہو کر کھا سکتے ہیں، مگر نہیں تو ہر مولوی کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ غریب ہے، غلط ہے۔

تو یہ اتنا بھی تو نہیں سوچتے کہ انہوں نے اپنی آزادی سلب کیوں کی۔ مولوی صاحب چہار زانو پالتی مار کر کھانا نہیں کھاتے، اس میں آرام نہیں ہے، آرام ہے تم کھا سکتے ہو، تو وہ بھی کھا سکتے ہیں لیکن وہ کریں کیا انہیں تو پیدا کرنے میں آقائے حقیقی، مالکِ حقیقی کا اس طرح حکم معلوم ہوا ہے کہ آزادی سلب ہو گئی۔ غلامیت کے ساتھ کھاؤ، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانا کھاتے تھے، اس طرح کھاتے تھے، جس طرح کوئی ادنیٰ غلام کھا رہا ہے، اس طرح آپ کھانا کھا رہے ہیں، یہ سب لکھا ہوا ہے۔ احادیث میں سب تذکرہ آپ کے کھانے کا اُکل کا، شُرب کا، سب لکھا ہوا ہے کہ کس طرح بیٹھتے تھے، کس طرح کھاتے تھے، آپ ﷺ کھاتے ہوئے اپنی اُنگلیوں کو کس طرح چاٹتے تھے، ہر ایک اُنگلی کو تین دفعہ چاٹتے تھے، آج چاٹتے ہوئے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کو عار آتی ہے، اگر چوسنے لگ گیا تو لالچی ہے، اسے کبھی کھانے کو نہ ملا چاٹ رہا ہے اُنگلی۔ میں نے تو اپنے ایک بیان میں توفیقِ الٰہی سے افریقہ و لندن میں کہا تھا یوں کہتے ہیں چاٹنا ابھی اس کو منہ میں دیا اور پھر منہ میں دیا، بہت اچھا، کبھی آم کھائے ہوں گے، ابھی منہ میں دیا چوسا پھر نکال لیا پھر منہ میں دیا، بار بار لعاب لگ رہا ہے اس آم کے اندر، پھر چاٹ رہا ہے، آم کھا رہا ہے، تو اس میں اور اُنگلی میں کیا فرق ہے؟ یہ سُن کر بعض صاحبان مسکرانے لگے تھے، اس کو جواب الزامی کہتے ہیں۔ تو کھانے کے اندر بھی مقید ہو گیا، اس طرح بیٹھو، بسم اللہ پڑھو، پہلے ہاتھ دھوؤ اور دونوں کو دھوؤ صرف سیدھا نہیں کہ جس سے کھانا کھانا ہے، دونوں دھوؤ ایک کا دھونا کافی نہیں، بسم اللہ پڑھو اُنگلیوں کو چاٹتے رہو، پانی پیو یا کھانا کھاؤ تو سیدھے ہاتھ سے۔ اس

میں بھی قید لگادی۔ اب بائیں ہاتھ سے اگر لقمہ منہ میں رکھے گا تو وہ منہ میں نہیں جائے گا، چباوے گا، منہ میں نہیں جائے گا۔ جب بھی تو کھانا ہوگیا، پیٹ بھرایا نہیں، بھرا جب بھی بھر گیا، یہ کیفیت ہے آج کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ، جب پینا ہو تو پانی دائیں ہاتھ سے پیو' کیوں ہاتھ سنا ہوا ہے، دایاں اُنگلی سنی ہوئی ہے' ہتھیلی تو نہیں سُنی ہوئی ہے اگر سنی ہوئی ہیں تو بائیں ہاتھ سے اُٹھاؤ گلاس بھرے ہوئے کو اور پانی کو بائیں ہاتھ سے بھرلو بائیں ہاتھ سے اُٹھاؤ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھو، اگر گلاس کے گرنے کا اندیشہ ہو تو بائیں ہاتھ کا سہارا لگادو، جب حکم کی عظمت ہوگی غلام کے اندر، اس حکم کو جس طرح بجالانے کا حکم ہوگا، تو ذوقِ طبیعت خود اُس کے صحیح استعمال کرنے کا ڈھنگ طلب کرے گی۔ دیکھا آپ نے غلامیت پیش کی جارہی ہے، اور جب پیو تو گلاس کو کٹورے کو منہ لگا کر، ہونٹ لگا کر ایک ہی سانس میں نہ پی جاؤ، جانور کی طرح سے کہ بس مُنہ لگایا اور پی گیا۔

کھانے کے آداب :

یہ آدابِ معاشرت ہورہے ہیں کھانا سکھایا جارہا ہے، پینا سکھایا جارہا ہے، جس کو ہم عبادت نہیں سمجھتے اُس کا عبادت ہونا بتلایا جارہا ہے' سکھایا جارہا ہے کہ یہ بھی کتنی اونچی عبادت ہے، اس کے بھی کتنے بڑے درجے ہیں، بعض بات کہنے کی تو نہیں ہوتی مگر جب دیکھا جاوے عقلی اعتبار سے اور خیال کیا جاوے تو نماز تو ایک چند وقتی عبادت ہے، چلو پانچ وقت بھی اُن شرطوں کے ساتھ شب و روز میں اب تو آزاد ہوگئے، مگر یہ کھانا پینا تو ہر وقت کا ساتھ لگا ہوا ہے، جنگل میں لگا ہوا ہے، بازار میں، ریل کے سفر میں یا ہوائی جہاز میں، ہر وقت لگا ہوا ہے، اب وہ ہر وقت کی اس کے ساتھ قید بھی لگی ہوئی ہے، تو نماز کی تو وقتی چیز وہ قیدیں تھیں چلو برداشت کرلی ہوگیا اور یہ ہر وقت کا جو کھانا پینا لگا ہوا ہے، اب اِن اِن شرطوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کھاتے پیتے رہنا کوئی معمولی بات ہے بڑا مجاہدہ ہے، وہ مجاہدہ تو

وقتی نماز کے ساتھ تھا لیکن یہ مجاہدہ تو اس سے بھی بھاری ہے، کھڑے ہو کر نہ پیو بیٹھ کر پیو، سیدھے ہاتھ سے پیو، کھاؤ، دیکھو کھاتے وقت آواز نہ آنے پاوے، چپڑ چپڑ کی جیسے جانور کھایا کرتا ہے، اُس کی آواز ہوا کرتی ہے، جب پانی پیو تو آواز نہ آنے پاوے، جیسے جانور پیا کرتا ہے کہ اُس کی آواز آ رہی ہے، کھانے پینے میں کتنی قیدیں ہوگئیں اور یہ ہر وقت انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، تو ہر ہر وقت میں جب یہ کھانا پینا ہوگا، ان قیدوں ان شرطوں کے ساتھ کتنا مجاہدہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا. اور وہ لوگ جنہوں نے مشقت برداشت کی ہمارے راستے میں اور یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہے کھانا پینا۔ مشقت ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی ہے، آزمائش ہو رہی ہے وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ کیا یہ سوچ رہے ہو کہ آزمائے نہیں جاؤ گے۔ نہیں بلکہ آزمائے جاؤ گے۔ طرح طرح سے آزمائے جاؤ گے۔ خیال شریف میں باتیں آئیں۔

اعتمادِ کامل :

یہ مت پوچھو کہ کیوں؟ یہ وہاں پوچھا کرتے ہیں کہ جہاں پر اعتبار نہیں ہوتا۔ ہم نے پورے طریقہ سے اُن پر اعتبار کر لیا ہے اور یہ سمجھ کر اعتبار کیا ہے کہ جو حکم فرمایا ہے اُس حکم میں اگر منع کا ہے، تو کوئی ضرر ہے اور کرنے کا ہے، تو کوئی نفع ہے۔ پھر یہ سوال بھی ختم کہ کس درجہ کا منع ہے، پھر تو غلام ہی کیا ہوا، غلام کا تو بہت اچھا سرکار ہمیں یہ بھی پوچھنا نہیں ہے کہ کیوں کرنے کے لئے فرمایا ہے۔

تعلق کا تقاضہ :

انہی میں بعض ایسے ہیں کہ اگر ایسا کہہ بیٹھا اور ایسا خیال کر گزرا تو اس خیال کر گزرے پر بیٹھنے کے بعد ہی اس کو معلوم ہو گیا کہ میرے قلب کے اندر وہ جو تعلق تھا اور

رابطہ تھا، ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ اس میں ضعف آ گیا، اس میں کمزوری آ گئی ہے۔ وہ احساس نہیں ہے ابھی وہ لطافت نہیں آئی ہے، ابھی تعلق کی ورنہ اُن کو فوراً احساس ہوجاتا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، میری زبان پر اس بات کی کہ اس تعلق کی وجہ سے اس کے اندر یہ اثر آیا کہ کم تعلقی ہے اور یہ سوال ہونا خود کم تعلقی کی دلیل ہے۔ ابھی تعلق کے اندر کمی ہے، اس تعلق کو مضبوط کر، اس رابطے کو قوی کر، کہ یہ سوال ہی قائم نہ ہونے پاوے۔ یہ سوال ہی نہ آنے پاوے۔

ذکر کا اثر :

کتنے عرصہ سے میں ذکر کر رہا ہوں، کر رہا ہوں، میں نے تو کچھ دیکھا نہیں، میری تو وہی پہلے جو میری حالت تھی، وہ اب بھی معلوم ہو رہی ہے، میں تو اپنے اندر کوئی تبدیلی دیکھا نہیں۔ ارے یہ تبدیلی نہیں ہوئی کیا، تو اس طرح ذکر کرتا تھا، کیا تیرے ہونٹ لب ہلے ہوئے رہتے تھے، ذکر کے اندر کیا کہے گا کہ نہیں اور اب ہر وقت ذکر کرتا رہتا ہے، تو یہ تبدیلی ہوئی یا نہیں ہوئی۔ ہزار قربان یہ خود مستقل احکم الحاکمین کا احسان ہے کہ اس وقت تیری زبان کہاں چلتی اور اب تیری زبان کہاں چل رہی ہے، یہ اُس کی توفیق ہے یا غیر توفیق ہے تو مستقل خود احسان ہے، اس طرح کیا مانگتا ہے، میں نے تو کہیں اپنے اندر تبدیلی دیکھی نہیں۔ پہلے تو تلاوت نہیں کرتا تھا؟ نہیں! اور اب تین پارے روز پڑھتا ہے تو یہ تبدیلی آئی یا نہیں آئی اور کیا چاہتا ہے، اُس کا احسان ہے، اگر بادشاہ کچھ کام کے لئے کہے، رعیت کے کسی آدمی سے، تو کتنا خوش ہوتا ہے اور دوسروں سے بھی کہتا پھرتا ہے کہ بادشاہ سلامت نے مجھے خدمت میں رکھ لیا ....

منت منہ کہ خدمت سلطان مے کنی
منت شمار از او کہ بخدمت بداشتت

کہ بادشاہ پر احسان مت رکھ کہ تو نے بادشاہ کا کوئی کام کیا خدمت کی تجھ جیسے اور کتنے پھرتے ہیں تمنا کرتے ہوئے بادشاہ کا احسان سمجھ، کہ تجھ سے کام لے لیا۔

اگر ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں بہترین سے بہترین خوشبوؤں کی چیزوں سے زبان کو بھی تو معطر کر دیتا تو بھی اس قابل نہ تھا کہ اس کا نام تیری زبان پر آوے۔ اس گندی چمڑے کی اس میں لعاب کتنا بھرا ہوا ہے کہ بار بار تھوک رہا ہے تو اور اُن کے باوجود اُس کا نام لے رہا ہے۔ آپ خیال فرمائیے کہ کتنا بڑا کام ہے، یہ کیا سوال کرتا ہے تو تیرے اندر اُس کے نام لیتے رہنے سے ذکرِ الٰہی کے لیتے رہنے سے تیرے اندر اضمحلال آیا کہ نہیں، عجز، انکسار، عبدیت کی شان، غلامیت کی حالت آئی ہے یا نہیں، طبیعت ٹوٹی ہوئی ہے کہ نہیں؟ کہتا ہے کہ ہاں یہ تو دیکھتا ہوں، جب تو یہ دیکھتا ہے تو، تو تجھے نہیں معلوم کہ اس نے کیا کہا ہے، اس نے یہ کہا ہے کہ اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ یہ منکسرہ کا فاعل ہے قُلُوْبُهُمْ اسم فاعل۔

ٹوٹے ہوئے دل والے :

عمل کرتا ہے نہیں اسم فاعل، یہ منکسرہ کا فاعل ہے قُلُوْبُهُمْ اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ٹوٹے ہوئے دل کے پاس ہوتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو ٹوٹے ہوئے دلوں والوں کے پاس بیٹھو، میں اُن کے پاس بیٹھا ہوا ہوں، کتنی بڑی خوشخبری ہے اور یہ ذاکر دل ٹوٹا ہوا ہے، منکسر ہے، اُس کے پاس اللہ بیٹھا ہوا ہے، تو اُس کو ایسے اللہ والے کے پاس بیٹھنے سے اجتناب پرہیز کرتا ہے، تجھ کو تو اور زیادہ سے زیادہ جا جا کر بیٹھنا چاہیئے تھا کہ وہاں اللہ بیٹھا ہوا ہے، کوئی کہے گا کہ کہاں بیٹھا ہوا ہے، سورج بیٹھا ہے، تمہارے پاس تمہاری گود میں بیٹھا ہے، سورج بیٹھا ہے تب ہی تو، لیکن سورج کے آثار سب پر ہیں یا نہیں ہیں، اگرچہ کوٹھے پر بیٹھا ہوا ہے اگرچہ کمرے میں بیٹھا ہوا ہے، کواڑیں

بھرے ہوئے ہیں، تب بھی سورج کے آثار سورج ایک ہے یا کئی ہیں، لیکن سارے عالم پر چھایا ہوا ہے۔ سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے، تو ذاتِ باری تعالیٰ سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے، سارے عالم پر چھائے ہوئے ہیں، موم بتی جلتی ہوئی کے بارے میں، اگر تم کسی سے پوچھنے لگو یا تم سے کوئی پوچھنے لگے، کہ اس موم بتی کا منہ کدھر ہے تو تم کیا کہو گے؟ یہ موم بتی جو روشن ہو رہی ہے، آپ نہیں بتا سکتے کہ اس کا منہ کدھر ہے، ذاتِ باری تعالیٰ کو پوچھتا ہے کہ اس کا منہ کدھر ہے۔

معلوم ہوا کہ ان باتوں کو سوچا نہیں کرتے، ان باتوں میں غور نہیں کیا کرتے جو من حیث العقائد عقیدت کی سی ہیں۔ ان میں ذہن نہیں دوڑایا کرتے۔ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے شیطان گمراہ کر کے رہے گا، کسی گڑھے میں ایسا ڈال کر رہے گا کہ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں منسکر ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوں اور ٹوٹا ہوا دل جتنا کہ ذاکر کا ہے اتنا کسی غریب کا نہیں ہے۔ اس لئے بھی ذاکر جتنا غریب ہے جس کو غریب حقیقتاً کہتے ہیں سارے جہان کے اندر غیر ذاکر غریب ہے ہی نہیں جتنا غریب کہ اللہ اللہ کرنے والا ہے، اتنا غریب جس کے پاس کہ ایک پیسہ بھی نہیں ہے، وہ بھی اتنا غریب نہیں ہے۔ جتنا بیمار یہ اللہ اللہ کرنے والا ہے، وہ دوسرا بیمار جو بخار جاڑے وغیرہ میں اُتنا بیمار نہیں ہے۔ اصل غریب کے معنی آتے ہیں مسافر کے یعنی سفر آخرت۔ تو جتنا سفر کے اندر یہ ذاکر ہے اتنا غریب کہاں ہے، گھر میں وہ ذاکر بھی بیٹھا ہوا ہے اور گھر میں وہ غریب بھی بیٹھا ہوا ہے، لیکن وہ غریب جو گھر میں بیٹھا ہوا ہے، سفر میں نہیں ہے، اور یہ ذاکر گھر میں بیٹھا ہوا ہے مگر سفر میں ہے۔ اس دلیل پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كن في الدّنيا كانك غريبٌ اوعابر سبيل.

(رياض الصالحين باب فضل الزهد في الدنيا :ص:۲۳۷)

دنیا کے اندر تو اس طرح رہ جیسے کہ مسافر رہتا ہے، یا راستہ چلنے والا۔

مسافر کو سامان اگر عیش کے بھی ہوں تو کہاں رہے عیش جب تک چین ہی نہیں، رہ رہ کر گھر یاد آ رہا ہے، تو وہ مسافر ہے یا نہیں لیکن وہ گھر میں ہے، اگر چہ وہ غریب ہے، لیکن وہاں مسافر نہیں اور یہ شخص جو ذاکر ہے، گھر ہے، اچی محل ہے، بہترین کوٹھی کے اندر ہے، بہترین کمرے کے اندر ہے لیکن مسافر ہے۔ یہ مسافر نہیں ہے۔

درویش کا واقعہ :

ایک درویش کے پاس ایک بادشاہ آیا کرتا تھا جنگل میں، وہ کسی کا گدھا کھو گیا تھا، گھر سے نکل گیا تھا، بعض دفعہ گدھے چرتے ہوئے راستے میں نکل جاتے ہیں۔ اب وہ تلاش کرتا پھر رہا ہے، اتفاق سے گدھا مسجد میں گھس گیا، وہ ڈھونڈتا ڈھونڈتا مسجد کے پاس آ گیا تو ملا جی کہہ رہے تھے کہ کیا ہو گیا؟ لوگوں کو کہ گدھے کو چھوڑ رکھا ہے، مسجد میں آ گیا، تو گدھے والا باہر سے کہتا ہے کہ ملا جی کیوں ناراض ہو رہے ہو، کیوں خفا ہو رہے ہو، کیوں چیخ رہے ہو، گدھا تھا جو مسجد میں آ گیا تم نے کبھی ہم کو بھی دیکھا ہے مسجد میں آتے ہوئے۔

دیکھا آپ نے مسلمان کی بات کہ مسجد میں آنے والوں کو گدھا کہہ رہا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں کیا کچھ ہوں۔ پہلے تو بادشاہ آتے تھے، درویشوں کے پاس اب تو غریب بھی نہیں آتا۔ امیر تو کیا آوے گا بچارا، مگر اس وقت بادشاہ آتے تھے تو درویش کے پاس کچھ گولیاں تھیں، گولیاں وہ بھی بھلے مانس، جب کھاویں بادشاہ کے سامنے کھائیں۔ ہو گی کوئی مصلحت اُن کی وہ جانے۔ روز ایک گولی نکالی وہ کھالی تو بعض دفعہ آنے جانے میں بیٹھنے اُٹھنے میں کوئی کام کس کا دیکھتا ہے تو سمجھتے تھے کہ کیا کھاتے ہیں یہ کیسی گولی ہیں اور روز کھاتے ہیں تو بادشاہ کے دل میں بھی یہ خیال آ گیا کہ کیسی گولیاں ہیں، یہ جو روزانہ کھاتے ہیں، تو درویش کو کشف ہو گیا کہ اس بادشاہ کے دل میں یہ خیال آیا ہے۔ غور فرمایئے یہ ایسا ہے۔

سوال کی ایک صورت :

جیسا کہ کوئی کسی کے پاس اچھی چیز رکھی ہوئی ہو جیسے کہ یہ قلم رکھا ہوا ہے، اب کسی کی نگاہ پڑے اُوفو یہ تو نئی سی چیز ہے، کبھی دیکھی نہیں تھی، کیسی نئی سی چیز ہے۔ مولوی جی یہ کہاں سے لیا بڑا اچھا ہے۔ ماشاء اللہ بڑا اچھا ہے۔ اب وہ مولوی جی کچھ شریف ہے، خاندان کی کچھ شرافت لئے ہوئے ہے۔ تھوڑی بہت دفعہ کہا کہ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں مل جاتا ہے تو اچھا، اچھا میرا جی یہ چاہتا ہے کہ آپ لے لیجئے' نہیں نہیں نہیں میں تو خالی معلوم کرنا چاہ رہا تھا، مولوی جی نے کہا نہیں نہیں آپ لے لیجئے گا۔ اب یہ شریف آدمی ہے اس پوچھنے پر کیسے رُکے اور کیسے نہ دیدے۔ یہ تو حسّی چیز تھی اور یہ دل میں خیال آنا یہ ایک معنوی چیز تھی اور درویش نے کہا کہ لیجئے لیجئے آپ بھی کھا لیجئے تو درویش نے گولی بادشاہ کو دے دی کہ رات کو کھالینا لے جاؤ، وہ لے آیا گولی تھی بڑی تیز کھانے کو تو کھا گیا لیکن ہضم کس سے ہو، اُس کے اندر کچھ اور اندر کی چیز ہونی چاہئے تھی، جو وہ ہضم ہو، وہ سمجھا کہ یہ جسم ہی کافی ہے۔ اس گولی کے ہضم کرنے کے لئے یہ حضرتِ والا سنا رہے ہیں۔ بیچ میں حضرتِ والا کی سُنائی ہوئی بات یاد آئی راجہ کے پان کی۔

راجہ کے پان کا قصہ :

بڑے لوگ پان کھاتے ہیں' بڑے قیمتی پان کھاتے ہیں۔ اُن کے پانوں کے اندر بڑی قیمتی چیزیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں کہ سینک میں وہ چیز لگائی اور پان میں لگا دی اور منہ میں رکھ لیا۔ بڑی مقوی بڑی مبہی' بڑی مشتہی۔ (سمجھتے ہو مُبھی قوتِ باہ) تو راجہ پان کھائے ہوئے تھا اتفاق سے قضائے حاجت کی پڑ گئی ضرورت۔ وہ گیا بیت الخلا میں، جن کا مخصوص ہر وقت بھنگی رہتا ہے اور بیت الخلا کمرے کی طرح صاف

شفاف رہتا ہے اور خوشبو آتی ہے انہیں کہاں برداشت ہے، بدبُو کی تو وہاں کونے میں رکھا ہوا ہے مرتبان سا اس نے وہ پان جو منہ میں تھا وہ اس میں ڈال دیا۔ بیت الخلاء میں پان کس طرح کھاوے لطیف المزاج ہاں کثیف المزاج۔ پان کھا کر بیت الخلاء میں کہ وہ نکلے گا ہی نہیں فُضلہ جب تک کہ حُقّہ نہ پیتا رہے کتنا بھاری قبض ہوئی ہے ایسا ہوا ہے، ویسے ہی نہیں میں جو بات کہوں گا تو وہ بات کہوں گا جو واقعی ہے، تو پان ڈال دیا، اُس نے قضائے حاجت سے فارغ ہو کر۔ راجہ آیا باہر اور فوراً بھنگی صاف کرنے کے لئے بیت الخلا میں گیا، اُس وقت فلش سسٹم کا ایجاد نہیں ہوا تھا۔ پہلے جھٹکا مارا پانی آ گیا تو فوراً بھنگی داخل ہو گیا صاف کرنے کے لئے۔ اُس نے دیکھا کہ وہاں مرتبان جو اس قسم کا ہے وہ اس میں دیکھا کہ پان پڑا ہوا ہے۔ وہ بالکل صاف شفاف تھا اور وہ پان جو پڑا ہوا تھا اُس نے اُٹھا کر کھا لیا۔ بھنگی نے وہ پان کھا لیا لیکن تھوڑی دیر میں بے چین ہو گیا، گھر پہنچ گیا لگا بیوی کو پریشان کرنے، وہ گھبرا گئی۔

جب تو قوتِ باہ تھی، امساک بڑے زور کا تھا، ابھی فراغت کیسی بیوی پریشان ہو گئی، بادشاہ کو اطلاع کی گئی۔ راجہ کو اطلاع دی راجہ نے کہا ذرا دیکھنا کہ بیت الخلا کے اندر پان ہے یا نہیں ہے؟ اجی وہ تو پان اُس نے کھایا ہوا ہے او ہو یہ اس کا اثر ہے۔ اس پان کا اثر ہے تو راجہ تو برداشت کرتا تھا، اُس کی تو کئی بیویاں تھیں، بیگمات تھیں، لونڈیاں تھیں، لیکن یہ کیا برداشت کرے نہیں برداشت کر سکا، بلاؤ حکیم جی کو بلاؤ حکیم جی کو۔

یہ حضرتِ والا نے راجہ کے پان کا واقعہ سنایا تو درویش نے وہ گولی تو دے دی بادشاہ کو بادشاہ نے کھا تو لی جب گھر گیا تو بے چین، چار بیگمات ہیں اس کی، چاروں کے پاس گیا اور جو لونڈیاں ہیں اُن کے پاس بھی گیا مگر ہیجان ختم نہیں ہوتا، پریشان ہو گیا رہ رہ کے خدا خدا کر کے تو کچھ سکون ہوا اور جب سکون ہوا تو اب کیا خیال کر رہا ہے بادشاہ اُف فو

میرے ایک گولی کھانے میں تو یہ حال ہوا اور یہ روزانہ ایک گولی کھاتا ہے، دیکھو یہ درویش بھی عجیب ہوتے ہیں، دیکھو کہاں جنگل میں رہتا ہے، جنگل میں کہ فقیر کی فقیری بھی بنی رہے اور مزے بھی خوب اُڑاتا رہے، جب میں ایک گولی کھانے کے بعد اتنی عورت اور بیویوں کے پاس گیا تو اس کے پاس تو روزانہ نا معلوم کتنی عورتیں آتی ہوں گی کہ روزانہ کھاتا ہے، وہ ایک گولی کھانے میں یہ اثر تو اس کے روزانہ کھانے میں کتنا اثر ہوتا ہوگا۔ یہ درویش جو ہوئے، ہوگئی بدگمانی، اپنے اوپر قیاس کر بیٹھا بدگمانی لیکن اس کے باوجود پہلے لوگ عجیب تھے کہ یہ گمان آتو گیا آنے کو، لیکن درویش کے پاس آنا نہیں چھوڑا بادشاہ آتا رہا۔ درویش کو اس کے خیال کا کشف ہوگیا کہ اس کو گولی کھا کر یہ خیال اور یہ بدگمانی ہوئی ہے میرے متعلق، درویش گھبرایا ہوا اُوفو اور کہا کہ جناب بادشاہ سلامت ایسا معلوم ہوا ہے کہ آپ کی زندگی ختم ہوگئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ موت کا نام تو موت سے بھی زیادہ بُرا معلوم ہوتا ہے۔

بادشاہ سے درویش نے کہا اُوفو چالیس دن ہیں آپ کی موت کے لے یہ سُن کر چہرہ فق پڑ گیا زرد ہوگیا، موت کے نام سے، نہیں نہیں کچھ خیال نہیں کیجئے گا، ارے آپ کے شہزادے صاحب ہیں، ولی عہد ہے، اُن کو آپ سپرد کردیجئے، اور اللہ کی عبادت میں آپ لگ جایئے گا، کوئی ایسی بات نہیں ہے، اب تو اُس کا چہرہ فق پڑ گیا، اُوفو آپ تو اتنا سُن کر ہی فق ہوگئے، تو چالیس (۴۰) دن میں آپ کتنے دُبلے اور کمزور ہوجائیں گے۔ جوں جوں موت کا وقت قریب آتا جاوے گا، اچھا اچھا میں آپ کو وہ گولی دیتا ہوں آپ کمزور نہیں ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تو اُن کو چالیس گولی گن کر دے دی، ایک گولی روز کھالیا کیجئے گا انشاء اللہ آپ کی صحت اچھی بنی رہے گی، آپ کا جسم اچھا بنا رہے گا، اسے یہ خیال بھی نہ ہوا کہ ایک گولی کھانے سے تو یہ ہوا تھا اور یہ چالیس دے رہا ہے کھاؤں گا تو کیا بنے گا۔

بہرحال وہ گولیاں لے لیں چالیس دن گزر گئے، روز کھاتا ہے جب چالیس دن گزر گئے اور موت نہیں آئی، اب دوسری بات کھڑی ہوگئی، اب دوسری بدگمانی شروع ہوگئی۔ اب یہ ہے کہ کیسے درویش ہیں کیسا جھوٹ بولتے ہیں، یوں کہا کہ چالیس دن تیری زندگی ہے چالیس دن بھی گزر گئے موت کہیں بھی نہیں آئی، اوپر سے میری سلطنت بھی چھڑوادی۔ یہ کیسے درویش لوگ ہیں، پھر آیا بادشاہ درویش کے پاس، کہ حضور آپ نے تو میری سلطنت بھی چھڑوادی کہ آپ نے تو کہا تھا کہ تیری زندگی چالیس دن ہے اور میری سلطنت آپ نے ولی عہد کو دلوادی، درویش نے کہا کہ وہ سلطنت گھر میں ہی تو ہے کسی غیر کے پاس تو نہیں ہے وہ تو آپ واپس پھر لے سکتے ہیں۔ اس کو تو چھوڑیے وہ تو کہیں نہیں گئی، تمہارے پاس ہے۔

میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کو وہ گولی جو دی تھی وہ آپ روز کھاتے تھے یا نہیں کھاتے تھے کہ جی ہاں وہ نہ کھاتا تو میرا زندہ ہی رہنا مشکل تھا۔ ایک گولی آپ نے کھائی تھی اور اب روزانہ آپ ایک گولی کھاتے تھے اور آپ فرمارہے ہیں کہ روز کھاتا تھا تو کتنی بیگمات کے پاس جاتے تھے آپ؟ کتنی بیگمات کے پاس' بیویوں کے پاس' لونڈیوں کے پاس جاتے تھے، اُس نے کہا کہ حضرت وہ بیگم اور لونڈی کہاں یاد تھی مجھے تو موت جو سامنے کھڑی تھی، وہ یاد تھی۔ کہاں کا بیگم کے پاس جانا۔

درویش نے کہا کہ سُن تجھ کو تو پھر بھی چالیس دن کی مہلت تھی اور فقیر کو تو سانس کی بھی مہلت نہیں کہ اندر جاتا ہے تو باہر آتا ہے یا نہیں آتا اور باہر آیا ہے تو اندر جاتا ہے یا نہیں جاتا؟ پھر وہ ایک گولی میرا کیا کرے گی؟ جواب دیدیا کہ تو نے یہ گمان کیا تھا کہ روز ایک گولی کھاتا ہے اور میں نے ایک گولی کھائی تھی' کتنی بیویوں عورتوں کے پاس گیا، اس کے پاس تو روزانہ بیویاں آتی ہوں گی۔ یہ ظاہر نہیں کیا، بادشاہ سمجھ گیا اور کہا کہ حضور میں

معافی چاہتا ہوں' پیروں میں گرا کہ حضور مجھے یہ گمان پیدا ہوا تھا۔ یہ آپ نے میرے گمان کا جواب دیا ہے، میں معافی چاہتا ہوں معاف فرما دیجئے گا۔ دیکھا آپ نے میں یہ کیا کہہ رہا تھا کس بات پر میں نے کہا ہے۔

ذاکر آخرت کا مسافر :

ذاکر بن کہ غریب محل میں بیٹھا ہوا ہے، آسائش کے سارے سامان جمع ہیں، لیکن یہ ذاکر ہے، مسافر ہے : اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ کا مصداق نہیں ہے یعنی وہ تو ساعت بساعت ہر لحہ مسافر ہے یعنی غریب ہے۔ اگرچہ آسائش کے سارے سامان موجود ہیں۔ کھانے پینے' پہننے کے' رہنے سہنے کے' بستر کے' اُٹھنے بیٹھنے کے آسائش کے سارے سامان موجود ہیں' مگر جو غریب کہلائے جاتے ہیں' ان سے زیادہ یہ غریب ہے۔ اور جس طرح اُن غریبوں کے دل ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں' ان سے کہیں زیادہ اس ذاکر کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ خیال شریف میں بات آئی۔

ٹوٹے ہوئے دل :

اس کا دل ٹوٹا ہوا ہے تو حق تعالیٰ کیا فرما رہے ہیں۔ حدیثِ قدسی ہے: اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ۔ اگر تم مجھ کو پانا چاہتے ہو' میں اُن کے پاس ہوتا ہوں وہاں جاؤ۔

اور وہ کون ہیں زیادہ دل ٹوٹے ہوئے وہ ذاکرین ہیں' وہ سالکین ہیں جانچیں کہ ہمارا دل اس طرح ذکر کر کے ٹوٹا ہوا ہے کہ نہیں ٹوٹا ہوا ہے، پرکھو کسوٹی پر۔ یہ کسوٹیاں ہیں کہ .ہمارا دل ٹوٹا ہوا ہے کہ نہیں وہی اُچھل کود ہے وہی تیزی ہے یا نہیں۔ خیال فرمایئے گا کہ حق تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے تو ذاکرین اگرچہ بظاہر چاہے وہ غوثِ پاک عبدالقادر جیلانیؒ کی طرح سے کیوں نہ ہوں جو ابدال سے اوپر درجہ ہوتا ہے غوث کا اور اگر کسی ابدال کا انتقال ہو جاتا ہے

تو غوث مقرر کرتا ہے، اس ابدال کی جگہ دوسرے ابدال کو، منجانب اللہ اس کا یہ مقام ہوتا ہے تو اگرچہ وہ غوثِ پاک کی طرح سے کیوں نہ ہو کہ روزانہ مُرغ پلاؤ کھایا کرتے تھے۔

اچھا کھانا، اچھا پہننا درویشی کے خلاف نہیں :

مشہور ہے کہ درویشوں میں جتنا درویش غوثِ پاکؒ نے اچھے سے اچھا کھایا ہے اور اچھے سے اچھا پہنا ہے، ایسا شاید کسی نے نہیں کھایا پہنا۔ مشہور ہے روزانہ مُرغ پلاؤ کھاتے تھے۔ غوثِ پاک کو کوئی نہیں کہے گا، ڈر لگے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے لئے ہم زبان کچھ ہلا دیں تو ہمارا تختہ ختم ہو جاوے، گھر جل جاوے، کہیں غوثِ پاک ناراض نہ ہو جاویں۔

درویش پر اعتراض :

اگر بچارہ کوئی اور درویش ہے مگر غوثِ پاک کی طرح سے خیال میں نہیں آ رہا ہے اور اگر وہ مُرغ پلاؤ روز کھاوے تو دس (۱۰) اعتراض ہیں، اس درویش سے بھی حسد ہو گیا او ہو یہ تو روز مُرغ پلاؤ کھاویں، اِن کے یہاں تو روز مُرغی جاوے پکنے کے لئے تو اس بے چارے درویش سے حسد ہو گیا کہ اچھا پہننے لگے اُفو تو دن لگ گئے۔ دیکھو یہ درویش ہے یہ درویش ہے۔ ایسا پہنتے ہیں یہ درویش ہیں، یہ اللہ والے ہیں یہ، اسے کچھ خبر نہیں کہ اللہ والا کسے کہتے ہیں۔ لیکن غوثِ پاک کو نہیں کہہ سکتا ڈر لگے، وہاں تو خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں میرا گھر جل جائے، نامعلوم کیا ہو جائے، تو تجھ سے تو نہیں مانگا۔

درویش کو اللہ تعالیٰ کھلاتا ہے :

وہ تو اپنی جگہ پر بیٹھا ہے، اللہ تعالیٰ کھلاتے ہیں کہ وہ اللہ کا آدمی ہے اور اپنے آدمی کو کھلایا ہی جاتا ہے، وہ تو غلام ہے، وہ تو غلامیت کا توفیقِ الٰہی سے حق ادا کر رہا ہے تو ایسے

غلام سے آقا راضی ہوگا اور جب راضی ہوگا تو آقا ہی کھلاوے گا اور جو آقا ایسا ہوگا کہ کھاتا نہیں ہے، کھلاتا ہے تو وہ نہیں کھلائیگا ایسے غلام کو؟ ایسا گمان مت کر اگر چہ درویش کو کچھ خبر نہیں ہے لیکن اللہ کو تو خبر ہے کہ اللہ والے کے ساتھ یہ گمان کر رہا ہے یہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تختہ پلٹ جاوے، کہیں ایسا نہ ہو کہ نقصان پہنچ جاوے تجھ کو، اُن کو تو معلوم ہے وہ درویش تو کچھ نہیں کہتا کسی کو، خاموش بیٹھا ہے۔

رسولِ پاک ﷺ کے پاس جبرائیل علیہ السلام آ رہے ہیں، کیا کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ اُحد کا پہاڑ میں آپ کے لئے سونے کا کردوں۔ رسولِ پاک ﷺ کیا فرماتے ہیں میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک وقت کھالوں ایک وقت بھوکا رہوں ایک وقت چولہے کے اندر آگ ہو اور ایک وقت ٹھنڈا پڑا رہے۔

آپ ﷺ کا لباس اور کھانا :

آپ ﷺ نے مرغی بھی کھائی ہے اور یمن کی چادر اور کپڑے بھی پہنے ہیں، کیونکہ طریق اس وقت وہ ہی تھا۔ یمن کی بہترین قیمتی چادریں بھی اوڑھی ہیں اور تہبند بھی باندھا ہے۔ دو دو سالن بھی کھائے ہیں، دو دو پہننے کے جوڑے بھی رہے ہیں، دو دو جوتے بھی رہے ہیں، اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک عدد سے زیادہ چیز آپ کے پاس کھانے پہننے کی رہی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ متعدد چیزیں ایک نوعیت کی کسی شخص کے پاس ہوں تو وہ درویشی کے اور زہد کے خلاف نہیں۔

متعدد جوڑے زُہد کے خلاف نہیں :

آٹھ جوڑے کپڑے ہیں، بارہ جوڑے کپڑے ہیں، چار چار جوڑے جوتے ہیں، آٹھ آٹھ، دس دس، بارہ بارہ ہر جوڑے کے ساتھ ٹوپیاں ہیں اور جتنے پائجامے اتنے ہی

کمر بند اور جتنے کرتے اتنے ہی بنیان جتنے کرتے کپڑے جوڑے اُتنی ہی ٹوپیاں جوتوں کی ضرورت نہیں کیونکہ کمر بند تو ڈالنا پڑے گا۔ پائجامہ میں تو اتنے جوتے بھی ہوں لیکن وہاں ایک جوڑی سے زیادہ جوڑی جوتے ہیں۔ اُس کے پاس تین جوڑے ہیں' چار جوڑے ہیں چھ جوڑے ہیں۔ اس سے بات ثابت ہوگئی کہ رسولِ پاک ﷺ کے پاس ایک عدد سے زیادہ عدد اُسی چیز کی تھیں، یہ زُہد کے خلاف نہیں ہے۔

غوثِ پاک کا واقعہ :

غوثِ پاک کے بارے میں مشہور ہے کہ مُرغ پلاؤ کھا رہے ہیں' کس سے مانگتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ بھیجتے تھے، کیونکہ وہ صحیح معنیٰ میں غلام تھے۔ اللہ تعالیٰ بھیجتے تھے۔ یہ نہیں کہ روز طباق آیا کرے۔ مَنَّ وَالسَّلْویٰ یہ بھی مَنَّ وَالسَّلْویٰ ہے، کھا رہے ہیں، پہننے کا یہ حال ہے کہ چاہے روز پہن لے قیمتی سے قیمتی چیز پہننے کا یہ حال، کہ بادشاہ اُس کپڑے کو نہیں خرید سکا کہ جس کپڑے کو عبدالقادر غوثِ پاک نے خریدا۔

مجلس میں ہر شخص اپنے فرض کو سوچے :

دورانِ مجلس ہر ایک اپنے مرض کو سوچتا رہتا ہے، اس کا علاج جانچتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو اور اس مرض کو اگر بیان کیا جاوے تو دور کرنے کی کوشش میں وہیں وہیں' بیٹھے بیٹھے کرتا رہتا ہے۔ اچھائی کی کوئی بات سنتا ہے تو قدر کرتا ہے، عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک تاجر کی غوثِ پاک کی خدمت میں ملاقات کے واسطے حاضری ہوئی، ملاقات ہوگئی۔ فرمایا کہاں سے آئے ہو کیسے آئے ہو؟ بتا دیا کہ فلاں جگہ سے آیا ہوں، اس طرح سے آیا ہوں، آپ کپڑے بیچتے ہیں؟ عرض کیا کہ جی ہاں فرمایا کہ اب بھی کپڑے پاس ہیں' موجود ہیں۔ عرض کیا کہ جی ہاں موجود ہیں میرے پاس ہیں۔

غوثِ پاک فرمار ہے ہیں کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بہت اچھا کھول کر رکھ دیا، ایک کپڑا پسند آ گیا، اس کی کیا قیمت ہے؟ اُس نے کہا کہ حضور اس کی قیمت تو بہت زیادہ ہے۔ غوثِ پاک نے کہا کہ ہم تم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس کی کیا قیمت ہے؟ حضور اس کی قیمت اتنی ہے کہ میں بادشاہ کے پاس سے آ رہا ہوں، بادشاہ نے اس کو خریدنا چاہا جب میں نے اس کی قیمت بتلائی تو بادشاہ کے پاس اس کی قیمت نہیں نکلی، کیونکہ بادشاہ کو بیت المال سے اپنے مقررہ وظیفہ سے زائد لینا تو جائز نہیں۔ غوثِ پاک نے فرمایا کہ آپ بتائیے تو' تو اُس نے بتادی کہ اتنی قیمت ہے۔ غوثِ پاک نے خادم سے کہا جو کہ پاس رہتا تھا کہ دیکھو حجرے میں جاؤ، ہمارے فلاں جگہ روپے رکھے ہوئے ہیں وہاں سے نکال لاؤ اور اس کو دیدو۔ کپڑے والا حیران رہ گیا چلا گیا۔

بات چھپتی نہیں' بادشاہ کو معلوم ہو گیا۔ بادشاہ مسلمان ناراض ہو گیا، اپنی توہین سمجھی، کپڑے کو خریدنے کے بعد خادم سے کہا درزی کو بُلا کر لاؤ، اس کا ہم چوغا سلوائیں گے، وہ درزی بھی آ گیا، درزی سے فرمایا کہ یہ کپڑا ہے، اس کو لے جاؤ اور اس کا چوغا سی دو۔ نمونہ کے لئے چوغا لے جاؤ، بہت اچھا، لے گیا۔ کپڑے سیتا تھا اس نے کانٹ چھانٹ کر دی۔ کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد اس میں کمی آ گئی اور کپڑا ہے نہیں' اُدھر سے وزیر چلا۔ بادشاہ نے کہا وزیر سے کہ جاؤ کہ جس کپڑے کو ہم نہیں خرید سکے' اس کو کیوں خریدا؟ اس میں ہماری توہین ہے۔ عبدالقادر صاحب سے جا کر سوال کرو، اُدھر وزیر آ رہا ہے اِدھر درزی آ گیا۔ وزیر بیٹھا ہوا ہے باتیں کر رہا ہے مگر ہمت نہیں پڑتی کچھ سوال کرے۔ رعبِ شاہی حق تعالیٰ کا دیا ہوا ڈرا ہوا بیٹھا ہے۔ وزیر کے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اتنے میں خادم آیا اور عرض کیا وہ درزی آیا ہے۔ فرمایا کیا کہتا ہے؟ وہ جو حضور نے سینے کے واسطے کپڑا دیا تھا، اس میں ایک آستین کے کپڑے کی کمی رہ گئی ہے۔ ایک آستین پوری ہے اور دوسری آستین پوری

نہیں ہے۔

غوثِ پاک نے فرمایا دیکھو وہ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا پڑا ہوا ہے حجرے میں اس کو اٹھا لاؤ اور درزی کو دے دو اور اس سے کہو کہ جتنا آستین کے اندر کسر اور کمی رہ گئی ہے، اس ٹاٹ کے ٹکڑے کو وہاں لگا دو آستین پوری ہو جائے گی۔ ٹاٹ کا ٹکڑہ کتنے قیمتی کپڑے کے اندر آستین میں جوڑ لگایا جا رہا ہے، ٹاٹ کا ٹکڑہ درزی کو دے دو۔ اب تو وزیر کے ہوش اُڑ گئے کہ اُفو ان کی نظر میں یہ قیمتی کپڑا اور ٹاٹ دونوں برابر ہیں بھلا کیا جوڑ ہے کہ اس ٹاٹ کا ٹکڑہ لگایا جاوے آستین کے جوڑ میں۔ اب کہنے کی کیا ہمت حضور اجازت ہو چلا گیا اور بادشاہ سے جا کر کہا کہ حضور یہاں توہین کا سوال نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی شان کے لئے اپنی بڑائی کے لئے دنیا کو اپنا دکھانے کے لئے یا تکبر اجاہ بڑائی کا اظہار کرنے وہاں تو نام ہی نہیں ہے اس کو نعمتِ الٰہی سمجھ کر شکراً اللہ لے لیا ہے، اسی لئے حضور، میں نے دیکھا کہ اس کپڑے کے اندر جو کمی رہ گئی ہے ایک بالشت جوڑ کی آستین پوری نہیں تو ٹاٹ دیدیا کہ درزی سے کہدو کہ اس کا جوڑ لگا دو، تو اُن کے نزدیک تو ٹاٹ اور وہ کپڑا دونوں برابر ہیں۔ انہوں نے اپنی شان دکھلانے کے لئے نہیں خریدا۔ حضور اس میں کوئی توہین کی بات نہیں معلوم ہو رہی۔

بادشاہ بھی حیران رہ گیا کہ اُفو اتنا قیمتی کپڑا اور ٹاٹ کا جوڑ لگایا جا رہا ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس دنیا کی کوئی ان کے اندر لذت شوق پورا کرنا کہ بڑائی کے طور پر پہن کر باہر نکلے، یہ نہیں ہے جیسی ہماری عادتیں ہوا کرتی ہیں لوگوں کی، کہ اچھے اچھے کپڑے پہن کر باہر نکلتے ہیں تو دکھا رہا ہے اور خود دیکھا بھی جا رہا ہے۔

یہ اہل اللہ ہیں ! اہل وعیال بیوی بچوں کو کہتے ہیں۔ تو جیسا آدمی ہوگا بیوی بچوں کو ویسا ہی تو بناوے گا جب وہ گھر کا میاں اپنے اہل وعیال کو اس طرح پر رکھے گا،

بناوے گا، اللہ اپنے اہل اللہ کو کس طرح رکھے گا۔ اللہ دیتا ہے، تیرے منہ میں کیوں پانی بھر بھر کر آتا ہے۔ کیوں جلن ہو گیا، حسد ہو گیا کہ لوگ اس کو کیوں پوچھتے ہیں؟ لوگ اس کی طرف رجوع کیوں کرتے ہیں، لوگوں کی نظروں کے اندر اس کی یہ شان کیوں ہے؟ جیسے کسی دنیا والے کو لوگ پوچھتے ہیں' جلن آ گئی' تجھ سے مانگا تو نہیں؟ تمہارے دروازے پر تو نہیں گئے، ڈاکہ تو نہیں ڈالا، چوری تو نہیں کی، کسی سے سوال تو نہیں کیا، پوچھ کر دیکھ لو۔

غریب کی بات چل رہی تھی مسافر کی، دیکھو کھانے کو کیسا اچھا ہے ان کے پاس، پہننے کو کیسا اچھا ہے ان کے پاس، بستر اور قالین ان درویشوں کے پاس کیسے ہیں، خاص کر نقشبند درویش کیسے ہیں، لیکن ان ساری چیز اور سامان ہونے کے باوجود پھر کیا ہیں غریب؟ تو اس اللہ والے سے جو کہ وہ تقویٰ کے ساتھ ذکر کی کثرت کرتے ہوئے تقویٰ کا زیادہ سے زیادہ اہتمام رکھتے ہوئے ذکر کی کثرت کے ساتھ یہ اللہ والا ہو کر، اس سامانِ نفیس کے ساتھ یہ بھی غریب ہے۔ اس سے زیادہ کوئی غریب نہیں۔

ٹوٹے ہوئے دِل والے :

اور غریب کا دل ٹوٹا ہوا ہوتا ہے، مسافر کا دل ٹوٹا ہوا کہ کب گھر جاؤں اور جب دل ٹوٹا ہوا ہو اور دل ٹوٹے ہوئے کے متعلق فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تو کیا فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کہ اگر تم مجھ کو پانا چاہتے ہو تو اللہ والوں کے پاس ہوتا ہوں میں۔ میں غریبوں کے پاس نہیں ہوتا۔ اُن کے پاس بھی ہوتا ہوں۔ سب کے پاس ہوتا ہوں لیکن اللہ والوں کے پاس خاص کر، کیونکہ میں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں، ان کے پاس ہوتا ہوں اور دل ٹوٹے ہوئے اللہ والوں کے ہیں۔ لہٰذا اگر تم مجھ کو پانا چاہتے ہو تو میں اُن کے پاس ہوتا ہوں۔ مریضوں میں دیکھو تو زیادہ مریض اللہ والا ہے اور مرض تو نظر نہیں آتا۔ ایسا مرض لگا ہوا ہے اور ایسا غریبی پن آیا ہوا ہے۔ ایسا دل ٹوٹا ہوا ہے کہ یوں کہتا ہے میں

اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میری بخشش نہ ہوئی تو میں کتے اور خنزیر سے بھی بدتر ہوں۔

درویش :

درویش جس کو صحیح معنیٰ میں اہل اللہ کہتے ہیں، اُن کا جتنا دل ٹوٹا ہوا ہے اور جتنا کسرِ نفسی اُن کے اندر انکسار آیا ہوا، دوسروں کو اتنا نہیں ہے، اس لئے کسی بیمار کے منہ سے آپ نے یہ نہیں سُنا ہوگا کہ میں کتے اور خنزیر سے بہتر ہوں اور یہ اللہ والوں کے منہ سے آپ بار بار سنیں گے کہ میں کتے خنزیر سے بدتر ہوں۔ عجیب فناءِ بقا جمع ہو رہا ہے، بقا بھی ہے فناء بھی ہے، چوبیس گھنٹہ کا، جو بات سمجھ میں آجائے سمجھ لینا اور جو بات سمجھ میں نہ آوے اُسے چھوڑ دینا کہ اصل جاگنا ہے سونا نہیں ہے۔

غلام حکم کے تابع :

آقا نے حکم دے دیا اپنے غلام کو، کہ اس غلام پر ترس کھایا ہے رحم فرمایا ہے، اس لئے حکم ضروری دے دیا کہ میں تجھ کو سونے کا حکم دیتا ہوں کہ سو جا، بہت اچھا آپ سُلاتے ہیں، سوتا ہوں ورنہ میں تو جاگتا۔ غلام تو خدمت کے لئے کھڑا رہنا چاہتا ہے۔ جس کو شریعت کی اصطلاح میں طاعت کہتے ہیں، کہ وہ تو چوبیس گھنٹے طاعت کے لئے کھڑا رہنا چاہتا ہے، طاعت کے لئے تیار ہے۔ آقا کہتا ہے کہ نہیں سو جاؤ لیٹ جاؤ۔ میں نے تو رات آرام کے لئے بنائی ہے لہٰذا تم آرام کرو۔

حضرت جنیدؒ کا واقعہ :

حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں ایک عورت آئی کہ میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں، پردے کے پیچھے بیٹھ گئی۔ حضرت جنیدؒ بغدادی نے فرمایا کہ پوچھو کیا پوچھتی ہو؟ اس نے کہا کہ میں یہ پوچھتی ہوں کہ میرا شوہر جس کی میں بیوی ہوں وہ دوسری شادی کرنا

چاہتا ہے۔

جنیدؒ بغدادی نے فرمایا کہ مرد کو تو اگر عدل وانصاف کے ساتھ رہے تو چار بیویوں تک کی اجازت ہے۔ وہ تو صرف دوسری ہی کرنا چاہتا ہے، تو اس عورت نے ٹھنڈا سانس لیا، ٹھنڈا سانس لے کر کہا کہ حضرت میں کیا کروں؟ اگر شریعت مجھ کو اجازت دیتی تو میں اپنے چہرہ کا نقاب ہٹا کر آپ کو دکھاتی اور پھر پوچھتی کہ مجھ جیسی جس کے نکاح میں ہو اُس کو دوسری طرف نگاہ کرنا روا ہے؟ اپنے حسن کی تعریف کر رہی ہے، اپنی خوبصورتی کی تعریف کر رہی ہے کہ جس کے نکاح میں ہوں اس کو دوسری طرف نگاہ کرنا روا ہے؟

جنیدؒ بغدادی پر حال طاری ہو گیا اور گر گئے۔ وہ عورت چلی گئی، جب ہوش سکون آیا تو خادمِ خاص نے کہا : حضرت یہ کیا قصہ ہوا؟ جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ مجھ کو حدیث شریف میں حق تعالیٰ کا فرمان یاد آ گیا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :

"اے بندو ! میرے اور تمہارے درمیان جو نور کا حجاب پڑا ہوا ہے، اگر میں تم کو وہ نور دکھاتا اور پھر پوچھتا کہ مجھ جیسا جس کا اللہ ہو اُس کو دوسری طرف نگاہ کرنا روا ہے؟"

جس کے دل میں جو جیسا بسا ہوا ہوتا ہے اس کا خیال وہیں جاتا ہے۔ آقا غلام سے کہہ رہا ہے کہ سو جا ورنہ غلام تو طاعت کے لئے کھڑا تھا۔ آپ حکم دے رہے ہیں، اس لئے سوتا ہوں، تو جس وقت جس طرح سونے کے لئے کہا، جس وقت جس طرح کھانے کے لئے کہا، جس وقت جس طرح پہننے کے لئے کہا، جس وقت جس طرح چلنے کے لئے کہا صرف نماز اور عبادت ہی کے لئے نہیں ہے۔ اُس وقت اُس طرح کرتے رہنا غلام کا کام ہے۔ انہوں نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے، جو جو وقت مقرر کر دیا ہے، بس اور باقی پوری زندگی جاگنا ہے.........۔

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سایے تلے
حشر تک سوتا رہے خاک کے سایے تلے

نوکراور غلام کافرق :

فرشتے ملازم کی حیثیت سے ہیں، نوکر کی حیثیت سے ہیں اور یہ انسان غلام ہونے کی حیثیت سے ہے۔ فرشتوں کا کام مقرر ہے نہ گھٹا سکے، نہ بڑھا سکے، جس وقت جو حکم دیا ہے اور اس غلام کا کوئی کام مقرر نہیں ہے، جس وقت جس نوعیت کے ساتھ جس طرح پر اس کام کے کرنے کا حکم دیا ہے اجازت دی ہے اس طرح سے کرتے رہنے کا نام غلام ہے۔

مشاہدۂ حق :

عالمِ ارواح میں یہ روحِ انسانی مشاہدۂ باری تعالیٰ کے اندر تھی۔ مشاہدۂ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مشغول تھی۔ اُسی مشغولی کے لئے انسان کو مجاہدہ کے ساتھ اس عالم کے اندر بھیجا ہے۔ تاکہ اس مشاہدہ کے اندر چار چاند لگ جاویں۔ اس مشاہدہ کے اندر جو نور ہے اس عالمِ ارواح کے اندر یہ اس مجاہدہ کے ساتھ اُس عالم میں جاکر نورٌ علیٰ نور ہو جاوے تو یہ عالم اس انسان کے اندر جس میں یہ رہتا ہے۔ مجاہدہ کا عالم ہے، لیکن یہ جدوجہد یہ کوشش و مشقت اس عالم میں ابتدائے عالم کے ساتھ ہے، اور جب اس ابتدائے عالم کے ساتھ جدوجہد اور مشقت کے اندر لگا رہا، اب وہ مشقت طبیعت ہوگئی، اب وہ مشقت مشقت نہ رہی، وہ مجاہدہ مجاہدہ نہ رہا، اب تو شیر اور شکر دونوں مل کر ایک ہو گئے۔ شیر کے معنیٰ دودھ اور شکر کے معنی میٹھا۔ جب دودھ نکالا جا رہا تھا، تو مشقت تھی اور جب شکر بنائی جا رہی تھی تو مشقت تھی اور جب بنی بنائی آ گئی اب مشقت کا نام ہی نہیں ہے۔ اب یہ غلامیت، عبدیت، عبادت کے ساتھ مشقت سے نکل کر طبیعت بن گئی۔

مجاہدہ کے بعد ہدایت :

اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے: وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا یہ مشقت* ہے ہمارے راستہ میں، جنہوں نے مشقت برداشت کی ہماری طرف۔ مُسافر نے سفر طے کرتے ہوئے مشقت برداشت کی۔ ہم اس کو اُس راستے پر چلنا آسان کردیں گے۔

لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (سورۂ عنکبوت: پ:۲۱)

ضرور بالضرور ہم اپنے اس راستے کے چلنے والے جو ہمارے اس گھر کی طرف آنے کی مشقت اُٹھا رہا ہے۔ ہم دکھلا دیں گے ان کو اپنے راستے رضا کے اور قرب کے، ثواب کے یعنی جنت کے جنہوں نے ہمارے راستوں میں چلنے کی مشقت برداشت کی ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

یقیناً اللہ تعالیٰ ایسے اخلاص والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ اُس کے ساتھ ہے تو اُس کو مشقت کیا ہے تو اِس راہ میں کھڑا ہونے کے لئے تمہیں کچھ شاق نہیں گزرنا چاہئے کہ اس راستے میں کیسے کھڑا ہوؤں، تو کھڑا تو ہو جا۔ بس راستے کو میں کھول دوں گا، یہ ہے انصاف۔

رُوح کا مشاہدۂ حق :

عالمِ ارواح میں یہ بے کار نہ تھا۔ مشاہدۂ حق کے اندر تھا، مگر ترقی سے رُکا ہوا تھا اور ترقی مجاہدہ پر موقوف تھی۔ تو اس عالم میں ذاتِ باری تعالیٰ نے اس انسان کو اپنے اُس مشاہدہ کے ساتھ مجاہدہ کے لئے بھیجا ہے، جس کو ذاتِ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ذکر فرمایا ہے :

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا۔

تمہارے صرف اٰمَنَّا کہ ایمان لے آئے یہ کہنے پر آزاد چھوڑ دیں اور تم کو آزمایا

نہ جاوے نہیں۔ بلکہ تم کو آزمایا جاوے گا طرح طرح سے تم کو آزمایا جاوے گا یعنی کھانا پینا وغیرہ وغیرہ جس میں کھیتی کیاری وغیرہ مزدوری اور مُلازمت وغیرہ ساری چیزیں آپ کے سامنے زندگی کے شعبے کی حتیٰ کہ سانس لینا یہ بھی پیش کردی۔

عالمِ امتحان :

حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ عالم عالمِ امتحان ہے۔ یہ عالمِ آزمائش ہے۔ اس امتحان میں پاس ہوکر آنا یعنی جن جن جگہ پر جس جس وقت میں جس جس کام کے لئے جس جس ہیئت کے ساتھ ہمیں کہا ہے کہ اس طرح کرو اُسی طریقہ سے کرتے ہوئے آنا تو یہ عالم عالمِ مجاہدہ ہوا۔ یہ عالمِ مجاہدہ بالمشاہدہ ہے۔ یہ عالمِ مجاہدہ کا مشاہدۂ حق کے لئے اور جوں جوں مجاہدہ ہوتا رہے گا' مشاہدہ حق تعالیٰ کا ہوتا رہے اور جب مشاہدہ بڑھتا چلا جاوے گا ہر چیز کے اندر سہولتِ طبعی بڑھتی چلی جاوے گی، جس کو قرآن شریف میں حق تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو فرمایا کہ آپ اسی طرح ہے کام میں لگیں۔ گویا ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ دشمن کو کہنے دیجئے، آپ ﷺ ان کے کہنے کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ آپ ہمارے سامنے ہیں' دشمن میں دشمن نفس بھی ہے۔ دشمن میں دشمن شیطان بھی ہے۔

لہٰذا اے سالک ! اے ذاکر ! اے تقویٰ کے اہتمام رکھنے والے ! یہ نفس اور شیطان دشمن کو کہتے رہیں کہنے دو تم اُن پر کان کیوں دھرو، تم تو ہمارے کام میں ہمارے سامنے لگے رہو' کام کرتے رہو' ان کی طرف دھیان مت دو۔ کتنا سہل ہے۔ یہ وساوس کی طرف' خیالات کی طرف' خطرات کی طرف کان لگانے کی دھیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خیال ہے تو اصل مقصود ذاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ ہے اور اس کے لئے طرح طرح کے مجاہدے ہیں۔ ابتداءً مجاہدے ہیں' پھر عینِ مشاہدے ہیں تو واقعی ہم مشاہداتِ باری تعالیٰ چاہتے ہیں۔ یہی مقصودِ زندگی ہے۔ اس کے لئے مجاہدہ سے ڈرنے کی' گھبرانے کی

بات نہیں ہے' جدوجہد کرتے رہو۔

کیا بات چلی تھی؟ یہ بات تھی کہ پنکھے چلنے بند ہو گئے۔ پنکھے چل رہے تھے اور جب سب بچارے یہاں آ کر بیٹھ گئے تو پنکھے بند ہو گئے۔ میں نے کہا تھا کہ جب ضرورت تھی ہوا کی جب تو بند ہو گئے اور جب کوئی تھا نہیں ہوا کی ضرورت بھی نہیں تھی تو خوب چل رہے تھے۔ تو خیر کوئی بات نہیں ہے، ہماری آپ کی زندگی تو مجاہدہ کی زندگی ہے۔ اسی مجاہدے میں یہ بھی ایک مجاہدہ ہے کہ گرمی ہے۔ حالانکہ ہوا کی ضرورت ہے مگر ہوا نہیں ہے۔

بِاَعْیُنِنَا ...... اب ذاتِ باری تعالیٰ دیکھ رہے ہیں کہ یہ میرے لئے یہاں آ کر بیٹھے ہیں اور ہوا وہ بند ہو چکی ہے۔ اب اسی دل لگانے کے ساتھ اور شوق کے ساتھ بیٹھتے ہیں، تو میں نے عرض کیا تھا کہ مجاہدہ آ گیا جس کے لئے مشاہدہ ہو گیا کہ ماشاء اللہ یہ مجاہدہ آیا تھا وقتی طور پر اُس مجاہدہ سے کوئی نہ گھبرایا بلکہ اُسے جی لگانے کے ساتھ اُسی شوق کے ساتھ برابر کان جھکا کر دل لگا کر سننے کے لئے تشریف فرما رہے۔ یہ شاہد ہے یہ حالت' یہ کیفیت' جمے ہوئے رہ کر سُننے کی ہے، شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص کے ساتھ یہ شہادت ہے اس بات کی' کہ یہ محسنین میں سے ہیں اور یہ شہادت محسنین ہونے کی شہادت ہے کہ ان محسنین کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے تو آپ حضرات محسنین میں سے ہیں اور محسنین کے لئے معیت کا وعدہ فرمایا ہے۔ آپ محسنین کے لئے اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہے۔ یہ مبارک اور خوشخبری کی بات ہے۔ آپ حضرات کے لئے مبارکباد ہے۔ یہ پنکھوں کے بند ہونے کی ہوا کی مجاہدہ کی بات تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنیٰ میں غلامیت کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین. فی امان اللہ۔

☆☆☆

بارہویں مجلس

ایمان کے تقاضے

خط و کتابت میں رسم:

ارشاد فرمایا کہ بعض حضرات کی یہ عادت ہے کہ جب کوئی خط لکھتے ہیں تو اس کے آخر میں لکھتے ہیں کہ گستاخی معاف فرمائیں۔ اب یہ رسم ہوگئی اگر یہ احساس ہوا ہے تو لکھی کیوں، سوچ کر لکھتے اور جب ایسا نہیں ہے تو لکھ کیوں رہے ہو۔ اس کا جواب میں کسی کو کچھ دیتا ہوں، کسی کو کچھ دیتا ہوں۔ جیسا ہوتا ہے ویسا ہی جواب لکھتا ہوں۔ بعضوں کو لکھ دیتا ہوں کہ یہ جملہ زائد ہے اور ان میں جگہ تو ہے تھوڑی سی تو جیسے اور رسمیں بیاہ شادی وغیرہ کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کچھ خط و کتابت کی بھی رسمیں ہیں۔ شادی بیاہ کی رسموں کو تو کہتے ہیں کہ یہ منع ہیں اور اپنی خط و کتابت کے اندر رسم اختیار کر رکھی ہیں وہ منع نہیں، چونکہ گنی چنی رسمیں ہیں وہ اور بدعت کی رسمیں بھی گنی چنی چیزیں ہیں۔ بدعت، بس اور جو خود بدعت کا کام کر رہا ہے، اس کو احساس ہی نہیں کہ میں بدعت کا کام کر رہا ہوں۔

پاس انفاس :

پاس انفاس، نفس کے معنی سانس کے ہیں، یعنی سانسوں کا لحاظ رکھنا، کہ بدوں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کے سانس کا آنا جانا نہ ہو۔ پاس کے معنی ہیں لحاظ۔ سانسوں کا آنا جانا غفلت کے ساتھ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یاد کے ذکر کے ساتھ ہو بلا تلفظ۔ بلا حروف، بلا حرکتِ لسان۔ اس کے معنی ہیں دھیان، اور دل ہی دل کے اندر یاد بھی تو ذکر اللہ ہی ہے۔ وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ۔ یہ نفس کا مطلب ہے۔

ہمہ وقت تربیت :

ربُّ العالمین ہر وقت انسان کی تربیت کرتے رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا احسان ہوگا کہ ایک جگہ وَاذْكُرُوا اللّٰه ہے اور یہاں پر وَاذْكُرْ رَبَّكَ ہے۔ تربیت کا تعلق اندر سے ہے۔ تیری ہر وقت وہ تربیت کرتے رہتے ہیں، تیرا ذکر تو ہر وقت رہتا ہے کسی اعتبار سے بھی ہو کسی وجہ سے بھی ہو۔

پس اگر انسان خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اپنی طرف توجہ خاص چاہتے ہو تو وہ تو ہر وقت متوجہ رہے ان کی تو ہر وقت توجہ ہے، ہر وقت نزولِ رحمت ہے۔

خصوصی رحمت حاصل کرنے کا طریقہ :

لیکن اگر خصوصی توجہ چاہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ فاذکرونی اذکرکم (بقرہ: پ۲) یہ خصوصی ذکر ہے۔ یوں تو رحمت کفار پر بھی ہے۔ بسم اللہ کے اندر اللہ کے بعد رحمٰن پھر رحیم ہے۔

رحمٰن اور رحیم کا فرق :

عمومی رحمت کی صفت کے اعتبار سے تو رحمٰن ہے اور خصوصی رحمت کے اعتبار سے

جو کہ مسلمانوں کے ساتھ ہے رحیم ہے من حیث الدنیا من حیث الآخرۃ اسی لئے کفار سے کہدیا جائے گا :

وَامۡتَازُو الۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ۔ (یٰس پ:۲۳)

تم مؤمنوں کی طرف جا رہے ہو اے مجرمو! تمہارا یہاں پر کوئی حصہ نہیں، تم الگ ہو جاؤ۔

تو رحمت تو کفار کے ساتھ بھی ہے۔ رحمٰن اس میں سب آ گئے کفار و مسلم سب آ گئے۔ پھر رحیم کی کیا بات ہے، رحمٰن کے اندر بھی ایک حرف زیادہ ہے۔ رحمٰن کے حرف ہوئے پانچ، رحیم میں چار۔ رحمٰن کفار اور مؤمن دونوں کے لئے مشترک ہے۔ رحیم میں ایک حرف گھٹ گیا، کافر نکل گئے، خصوصی رحمت مؤمن کے لئے ہے، دنیا کے اندر بھی اور آخرت کے اندر تو ہے ہی کامل۔

مؤمن کے لئے بیماری بھی رحمت ہیں :

اگر بخار آ جائے مؤمن کو تو وہ بھی رحمت ہے اور کافر کو بخار آ جائے تو وہ رحمت نہیں ہے وہ نقمت ہے۔ مؤمن کو اگر آ گیا تو نعمت ہے درجات بڑھتے ہیں، کفارہ ہوتا ہے، درگذر ہی ہو جائے اور اگر کافر کو بخار آ جائے وہاں درجات کے بڑھنے کا کیا سوال ہے؟ اس کی تو نجات ہی نہیں ہے، تو عمومی رحمت میں تو اشتراک ہے مؤمن کے ساتھ بھی اور کافر کے ساتھ بھی ہے۔ کیا کافر کے ساتھ میں حفاظت کرنے والے فرشتے نہیں، وہاں اور نوعیت ہے یہاں پر اور نوعیت ہے کیا کافر کی روح نکالنے کے لئے فرشتہ نہیں آتا؟ لیکن وہاں اور نوعیت ہے اور یہاں اور نوعیت ہے، وہاں نقمت کے ساتھ ہے اور یہاں رحمت کے ساتھ ہے، یہاں نعمت کی طرف بلانے کے ساتھ ہے وہاں نقمت کی طرف بلانے کے ساتھ ہے۔

بلانے بلانے کا فرق ہوتا ہے۔ایک بادشاہ کی طرف سے دعوتی بلاوا ہےاور ایک مجرمانہ بلاوا ہے۔دونوں میں بڑا فرق ہے۔

قرآنِ پاک میں رحمت اور رحمانیت ہی کا ذکر ہے :

قرآنِ پاک میں کسی بھی حیثیت سے کسی بھی نوعیت سے کسی بھی شکل سے آیات رکوع سورتیں کسی بھی آیت کے ساتھ ہوں اُس میں رحمت و رحمانیت ہے، اگر فرعون کا قصہ ہے قارون کا قصہ ہے جس قوم کا بھی قصہ ہے قومِ ثمود کا قصہ ہے قومِ ہود کا قصہ ہے کہیں صرصر ہواؤں کا قصہ ہے کہیں چیخ کے ساتھ فنا کرنے کا قصہ ہے وہ سب کا سب رحمٰن اور رحیمیت ہی کے ساتھ ہے اگر دوزخ کا بھی ہے عذاب کا بھی وہ سب کا سب رحمت ہی ہے رحمانیت ہی ہے۔

حفظِ ماتقدّم :

ہر وہ چیز کہ جس کے کرنے سے آئندہ اندیشہ غالب ضرر کا ہے، اس سے بچ جانا یہ ہے حفظِ ماتقدم۔قومِ عاد کا قصہ کیوں بیان کیا؟ قومِ ہود کا قصہ کیوں بیان کیا؟ مشرکین کے واقعات کیوں بیان کئے؟ یہود و نصاریٰ کے قصے کیوں نقل کئے؟ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برتاؤ اور سلوک کو کیوں ذکر کیا، ان پر عذابوں کا کیوں ذکر آیا؟ وہ کیا ہے حفظِ ماتقدم کہ تم تو دیکھو پہلے سے سنا رہا ہوں میں ایسا ہوں میری عادت ایسی ہے، ہوشیار سمجھ لو، ایسا نہ ہونے پاوے :

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ۔

تم ایسے مت ہوجانا کہ جنہوں نے انتہائی درجہ کی احسان فراموشی کی تھی۔سورۂ حشر کے اخیر رکوع کے اندر وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۔(سورۂ حشر پ:۲۸) کہیں تمہیں بھی لقب نہ مل جاوے فاسق ہونے کا۔

مؤمن اور کافر کے فسق میں فرق:

کفار کے فاسق ہونے کا لقب اور حیثیت کے ساتھ ہوگا اور مسلمان کے فاسق ہونے کا لقب کوئی اور حیثیت سے ہوگا۔ نفسِ فعل میں اشتراک ہے۔ وہاں اعتقادیت کی حیثیت سے ہے اور یہاں عمل کی حیثیت سے ہے، کہ کیا تمہارا عمل اعتقادی صحیح توحیدی ہوکر اور پھر مشرکانہ عمل کو عقیدہ نہ سہی خیال فرمایئے تمہارے اعضاء اتنے ہی بھول گئے تو مؤمن کو اور حیثیت سے فاسق کہا جائے گا اور کافر کو اور حیثیت سے کہا جائے گا۔ نوعیت کا فرق ہے اور جب یہ بات ہے کہ تمہارے اعتقادِ حاضر ناظر، یقینی جو دل کے اندر تم لائے ہو، اس کا تقاضا کیا ہے، اعمالِ جوارح خلاف سے بچے ہوئے رہیں۔ خلاف میں استعمال نہ ہونے پاویں۔

ایمان کا تقاضہ وفاداری ہے:

ایمان لاکر مؤمن خاص اللہ کے ہوگئے اور جب اس کے ہوگئے تو خلاف کرنا بے وقوفی ہے۔

شیخ مذکر ہے:

شیخ مذکر ہوتا ہے اور قائم مقام تسبیح کے ہوتا ہے۔ تسبیح ہاتھ میں ہوتی ہے، تو یہ یاددہانی کروار ہی ہوتی ہے، تو شیخ قائم مقام تسبیح کے ہوگیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے بھی ایک سلسلہ میں یہ ہی فرمایا تھا کہ تسبیح ہماری مذکر محسنہ ہے، میں کیسے چھوڑ دوں۔ کسی شخص کے پوچھنے پر فرمایا کہ کیسے چھوڑ دوں یاددہانی ہوتی رہتی

ہے۔ بھولی ہوئی چیزوں کو یاد دلایا جاتا رہتا ہے۔ تو ایمان لاکر مؤمن ہوکر بغیر مؤمن ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ تو مؤمن ہے ہی وہ اور حیثیت سے ہے اور آپ مؤمن اور حیثیت سے۔

هُوَاللّٰهُ الَّذِىْ لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الخ۔

ایمان کا تقاضہ وقارِ عہد :

تو ایمان لاکر مؤمنو ! تم خود مؤمن کے ہوگئے۔ اب تمہارے جوارح اور تمہارے انفس، جانیں اور اموال ان میں سے کسی چیز سے بھی میرے حکم کے خلاف استعمال نہ ہوں، یہ بے وفائی کیسی؟ معاہدہ ہو چکا ہے جب ایک مؤمن نے حاضر ناظر ہونے کا عقیدہ بتصدیقِ قلبی کرلیا تو اس کا معاہدہ ہو چکا ہے ایسی توحید کا بشمول محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لہٰذا اس معاہدہ کو خوبصورتی سے نبھانا ضروری ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ (سورۃ المائدہ پ۶)

دوسری جگہ ہے :

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ۔ (پ۵ع۴)

عقود تو ہوگیا' حاضر ناظر کا عقیدہ اور عہد ہوگیا۔ حاضر ناظر کے عقیدہ کے ساتھ وفاداری کا معاہدہ ہوگیا۔

عقد اور عہد :

ایک عقد ہوتا ہے' اور ایک عہد ہوتا ہے۔ مثلاً قاضی صاحب نے لڑکے سے کہا تمہارا نکاح فلاں لڑکی جو فلاں کی ہے بعوض اتنے مہر کے' تمہارے ساتھ کیا' تم نے اس کو اپنے نکاح میں قبول کیا' تو کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے میں نے قبول کیا' تو عقد ہوگیا' اس کو عقد کہتے ہیں۔ اس نے جب یہ کہا کہ قبول کیا تو عقد ہوگیا۔ اس عقد میں عہد آگیا یعنی اس کی

پوری ضروریات‘ اس کے پورا نان ونفقہ کا‘ اس میں عہد آ گیا کہ پورا کروں گا۔ اگر بیوی کھانے پینے کے لئے کہے اور میاں صاحب کچھ خیال نہیں کرتے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ کھانے پینے کا خرچہ کیسا ہے؟ جب نکاح ہوا تھا تو قاضی صاحب نے تو کہا نہیں تھا۔

ایسے ہی جب تصدیقِ قلبی کے ساتھ عقد لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا تو اس میں عقد پہلے ہو گیا جس کو اعتقاد کہتے ہیں اور اس اعتقاد کے ساتھ۔ عہد آ گیا کہ اب جو آپ فرمائیں گے وہ کروں گا۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ بنیاد اگر مضبوط ہو تو تعمیر کئی منزل بنالو، سنا گیا ہے کہ بعض جگہ سولہ‘ سترہ‘ بیس اور تیس منزلیں ہیں‘ لیکن اگر بنیاد ٹھیک نہیں ہے تو بنالے گا؟

کلمہ طیبہ بنیاد ہے :

یہ ہے بنیاد لا الٰہ الا اللّٰہ بشمول محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یہ عہد لیا اور تعمیر اسلام وہ احکام‘ قوانین ہیں تو جس حکم کا بھی فرمان ہے۔ یہ ہے تعمیر، نہ تعمیر عبادت میں فرق، نہ تعمیر معاملہ میں فرق، نہ تعمیر معاشرہ میں فرق، نہ تعمیر اخلاق میں فرق، یعنی اندر اور باہر سے کوئی فرق نہیں، تو جوارحِ اندرونی یا بیرونی چونکہ قلب بھی جوارح میں سے ہے۔ وہ ظاہر نہیں ہے اور مال باہر میں سے ہے تو گویا یہ کہہ کر کہ لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اپنے آپ کو حوالہ کر دیا کس کے، ذاتِ حق کے، اِنَّ اللّٰـهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ کہ تم تو بکے ہوئے ہو یہ تعبیر ہے، با کا ایک معنیٰ عوض کے بھی ہیں‘ جہاں اساک کے اور مقابلہ وغیرہ وغیرہ کے ہیں‘ تو یہ سب عوض ہو گیا۔

تب ہے بِاَنَّ جب تم بکے ہوئے مال ہو کر ہمارے ہو گئے تب جنت بھی تمہاری ہو گئی۔

عالمِ برزخ کی مثال :

اس کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ نے کسی کو دعوت دی، اب وہ گیا تو بادشاہ کا ایک محل ہے جاتے ہی اس محل کے اندر داخل نہیں ہوگا، بلکہ پہلے سے ایک کمرہ اترنے کے لئے راحت رسانی کا مقرر کردیا ہے۔ تو یہ جو پہلا کمرہ دیا ہے، یہ برزخ ہے، وہ قیام گاہ نہیں' وہ ظلّی برزخی ہے۔ وہ اصل تو جب پورا عالم ختم ہوکر پورا آخرت کا معاملہ پوری کیفیت عوض یہ اسی کا نمونہ ہے تو داخل فی الجنۃ ہوگیا، چونکہ اس نے جو عقد کیا تھا، اس نے پوری وفاداری کے ساتھ انجام دیا ہے۔

مؤمن ہوکر غفلت کیسی :

تو مؤمن ہوکر یہ بھول کیسی ہے؟ نفس بھول تو معاف ہے۔ یہ بھولا رہنا کیسا ہے۔ اس لئے مؤمن کی ذات میں محرکات حفظِ نسیان کے اور تحریکِ یاد کے موجود ہیں۔ اس لئے کہ تیرے اندر محرکات تحریکات یاد کی موجود ہیں تو یہ بھولا رہنا کیسا ہے، وہ معاف نہیں ہے، بھول تو معاف ہے، لیکن بھولا رہنا معاف نہیں ہے۔ اس نسیان کی تلافی کرو' چونکہ محرک موجود ہے۔

فقہی مثال :

مسئلہ فقہی جیسا کہ نماز ہے اگر نماز میں نسیان ہوجائے تو کیا وہ معاف ہے، اگر معمولی سی کوئی کمی ہوگئی تو پھر یہ سجدہ سہو کیسا، چونکہ تمہارا نماز کے اندر ہونا محرکات موجود ہیں، تحریکات موجود ہیں، حرکاتِ انتقالیہ لسانیہ اعضائیہ جوارحیہ موجود ہیں۔ لہٰذا اس کی تلافی کرنی چاہئے، اگر زیادہ ہے تو اعادہ کرو، پھر دوبارہ محفوظ رکھے، ورنہ تو یہ کرو بلا تجدیدِ ایمان، آئندہ نسیان نہ ہو، ایسی سزا دو نفس کو کہ آئندہ غلطی نہ ہوسکے، چونکہ یہ سرسری نہیں یا تو نماز کا

اعادہ ہوگا یا سجدہ سہو، اس کا تدارک ہوگا۔ کیوں اس لئے کہ محرکات اس کے موجود ہیں۔ یہ تو قصداً ہے کہ تمہاری زبان ایسی خلاف کیوں چلی، تمہاری آنکھیں خلاف کیوں چلی، تمہارے کان خلاف کیوں لگے، تمہارے اعضاء خلاف کیوں استعمال ہوئے، کیونکہ ان کی یاد کے محرکات موجود ہیں۔

مؤمنوں کی مثال عملِ نماز جیسی ہے، عملِ صوم جیسی نہیں ہے، روزہ پر کوئی محرک نہیں، تو روزہ کی بھی بھول ہو سکتی ہے، روزہ کی واقعی بھول ہو سکتی ہے۔

اگر کوئی آ گیا اور اس کو معلوم ہے کہ اس کا روزہ ہے، اب یہ رحمت ذرا دیکھو کہ کہیں یہ شخص زیادہ کچھ کمزور تو نہیں ہے، اگر ایسا یقیناً تمہیں محسوس ہو رہا ہے تو اس سے ابھی مت کہو کہ تیرا تو روزہ ہے، کھانا چھوڑ دے گا اور اگر ایسا شخص نہیں ہے تو پھر فوراً یاد دلا دو۔

امام صاحب کچھ ایسے ہیں کہ وہ بھول جاتے ہیں یا بھول گئے اور نماز تو جماعت کے ساتھ ہے پیچھے مقتدی محرکین موجود ہیں، لہٰذا مقتدی حافظ صاحب جو پیچھے ہیں، اُنہوں نے بتحریکِ لسان یاد دلا دیا، نماز ہی کے اندر ہی درستی ہوگئی۔

عہدِ اَلَسْت کی مثال :

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی ۔ (سورۃ الاعراف پ۹)

اسی عقیدہ کے ساتھ یہاں کی زینتیں، یہاں کی آرائشیں، یہاں کا حسن و جمال ظاہری جو قائم کیا گیا ہے۔ اس دنیا کو ہمارے لئے زینت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ہم دیکھیں ذرا اس کی زینت اور آرائش کے اندر مبتلا ہو کر کون ہم کو بھولتا ہے؟ کون یاد رکھتا ہے؟ اور قرآن شریف میں ہے کہ ایسی بھول کہ وہ عقد بالکل ختم ہو گیا اور جن کو عقد دیا ہے، اس عقد کا تقاضہ وعدہ ہے وہ جو قالو بلیٰ کہا تھا عقدِ عہد الست بربکم، یوں نہیں کہا،

الست بالاھکم دعویٰ دلیل کے ساتھ ہےاور وہ دعویٰ عجیب ہوتا ہے کہ جس میں دلیل پہلے ہو،اور دعویٰ بعد میں ہو۔

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ یہ بِرَبِّکُمْ میں بتلا رہا ہے کہ ایسا کوئی تمہاری پرورش کا ظاہری و باطنی کسی قسم کا بھی ہے، کیا کوئی دوسرا ہے؟ زمین نے کہا کہ نہیں، تو پھر دوسرے کی عبادت کیسی ہے۔ دوسرے کے ساتھ وفاداری کیسی ہے۔ رب تو وہ تمہارا اور وفاداری دوسری مخلوق کے ساتھ تو انسان مخلوق کی تو عقد پہلے ہے اور اس کے ساتھ ہی عہد ہے، چونکہ بعض چیزیں ساتھ ساتھ ہوئی ہیں، جیسے عقد نکاح کا ہوا تھا تو ساتھ ساتھ ہی اسی وقت ہی عہد تھا۔ لا الہ الا اللہ جب کہا بشمول محمد رسول اللہ تو اس عقد کے ساتھ عہد ہو گیا تمام اعمال کے ظہور کا، نفس اور مال یہ ہی دو چیزیں ہیں، اسی لئے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ جان کو پہلے لگاؤ، مال تو بعد میں ہوا کرتا ہے، جان تو ساتھ لگی ہوئی ہے اور آگے کیا فرمایا و اموالھم اور دو ہی چیزیں ہیں جان اور مال۔ لہٰذا جان اور مال سے وفاداری کا ثبوت دو، جہاں جان مانگے جان دیدو اور جہاں مال مانگے مال دیدو اور جہاں جان خرچ کرنے کو کہیں، وہاں جان دی ہوئی یہ ہماری ہے اور مال بھی دیا ہوا، وہ ہمارا ہی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ۔ (سورۃ البقرہ پ:۳)

یہ سب کچھ ہم نے دیا یہ تمہاری سعی اور کوشش۔

اچھا تم قارون کی طرح ہو جس نے کہا تھا مجھے ایک فن اور ہنر اور علم آتا ہے، اس کے ذریعہ سے میں نے اس کو کمایا ہے، کسی دوسرے کی مدد اس میں شامل نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی غیبی امداد ہے، اس کے اندر جس میں انحطاط اور غیر حاضر کا کچھ فرق ہو، نہ کسی انسان کی مدد شامل ہوئی ہے کہ جو اس کا کوئی حق دار ہو کہ میں اس کو دیدوں۔

من حیث الامداد بھی نہیں ہے اور اس میں کسی انسان کی امداد بھی نہیں ہے۔ یہ تو

میں نے اپنے علم و ہنر سے کمایا ہے۔ نتیجہ اس کا کیا نکلا اس عہد کے عقد کے ساتھ توڑنے کا، کہ وہ خود اور وہ مال زمین میں دھنس گیا۔ اس کا ذکر قرآنِ شریف میں ہے۔

اور اس کے علاوہ عقل کہتی ہے کہ یہ ہاتھ کس کے ہیں' ان کو کس نے بنایا اور عقل کس نے دی ہے، اب یہ جوان کے ذریعہ سے کمایا، وہ کس کا دیا ہوا ہے، جن ہاتھوں سے کام لیا ہے، جس عقل سے کام لیا ہے، جس کلام و زبان سے کام لیا ہے، تو اسی کی دی ہوئی چیز سے تو تم نے کسی چیز کو حاصل کیا ہے تو وہ اسی کا تو ہوا، نام تمہارا لگا دیا ہے' انتظاماً، ورنہ کل کو کہدے گا' واہ! تمہارا کیا ہے؟ وہ تو اللہ کا ہے، تمہارا کیا ہے اس میں؟

لہٰذا تم تو ایسے عیش کرو، ایسے آرام کرو، ایسا پہنو اور ایسا کھاؤ اور میں محروم ہوں، اس لئے میں تمہارے گھر سے نکال کر لے گیا، تمہاری جیب سے نکال کر لے گیا، تمہارے ہاتھ میں سے چھین کر لے گیا، کہ اللہ کا ہے اور میں اللہ کا ہوں، انتظام خراب ہو گیا، انتظام درہم برہم ہو گیا، تو یہ نسبت جو لگا دی ہے، مال کی طرف یہ نظاماً و انتظاماً ہے۔ یہ حقیقتاً نہیں ہے یہ مجازاً ہے، حقیقت و مجاز پڑھا ہوگا، مختصر المعانی وغیرہ میں، تو یہ نسبت جو ہے یہ حقیقت نہیں ہے یہ مجاز ہے کیوں نظاماً و انتظاماً حقیقت کی نسبت ادھر ہی ہے۔ رزقنا کم تو جان دی ہوئی، اسی کی اور مال دیا ہوا، اسی کا ہے تو یہ نسیان کیسا ہے، یہ بے توجہی کیسی ہے، رب کہاں ہے اور جواب ہوگا مجازی بھی اگر ہو کسی نے کچھ دیدیا اور ضرورت میں دیدیا تو محسن ہوگا یا نہیں اور دیا تو مربی ہوگا یا نہیں ہوگا؟ معطی ہوگا یا نہیں ہوگا۔ تو معطی کا، محسن کا احسان مان کر احسان فراموش ہونا چاہئے یا احسان بدل اور جب وہ اپنے کسی کام کے لئے کہے تو اس کو انکار کر دینا چاہئے یا اقرارِ عمل سے اس کو کرنا چاہئے، یہ دلائلِ عقلیہ ہیں کہ آج کل عقل بہت چل رہی ہے، ورنہ مؤمن کو دلائلِ عقلیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ایمان کا تقاضا تسلیم کرنا ہے :

ایمان کی فطرت ہے ماننا اور اگر نہیں مانا اور عمل میں نہیں لایا، یہ خلافِ فطرت کیوں بدلی؟ دنیا کی آب وتاب پر نظر کرنے سے بدل گئی۔

گستاخی معاف ہو لکھنا رسم ہے :

لوگوں نے رسم کو گِنا چُنا خیال کرلیا، صرف یہ چیزیں رسم کی بات سمجھے۔ بیاہ' شادی' غمی اور خوشی وغیرہ اور دن ورات جو رسمی باتیں ہوتی ہیں، ان کا خیال ہی نہیں کیا کہ یہ رسمی ہیں بدعت کو بھی لوگوں نے گنا چنا شمار کر رکھا ہے کہ بدعت کی بھی صرف چند چیزیں ہوگئی ہیں اور حالانکہ ہم سے بھی دن رات نہ معلوم کتنی بدعتیں ہوئی رہتی ہیں۔ ادھر خیال ہی نہیں ہے۔

پاس انفاس کا مطلب :

اس پر عرض کیا تھا پاس انفاس' یہ کیوں کیا کہ سلوک میں' تصوف میں' جہاں پر اور چیزیں ہیں، پاس انفاس بھی ہے، گویا بعض اعتبار سے۔ تو پہلے پاس کے معنیٰ سمجھئے، پاس کے معنیٰ لحاظ کے ہیں، جس کو ہم رات دن بولتے ہیں کہ آپ کو کوئی پاس لحاظ نہیں ہے کہ جو چاہے کہہ دیا اور جو چاہے کر گزرے، کوئی پاس ولحاظ ہی نہیں۔

دوسرا لفظ ہے انفاس' یہ نفس کی جمع ہے۔ نفس کے معنیٰ ہیں سانس، تو پاسِ انفاس کے معنیٰ ہوئے، سانسوں کا لحاظ رکھنا، سانس اندر جاتا ہے اور باہر آتا ہے، پہلے اندر گیا پھر باہر آیا، تو ان سانوں کا لحاظ رکھنا ہے کہ اگر یہ سانس اندر گیا تھا اور باہر نہ آتا تو کیا درد نہیں ہوتا، واقعات ہیں، باہر تو آ گیا اور اندر نہ جاتا تو اندر جا کر باہر نہ آتا، تو کیسے زندہ رہتا اور باہر آوے مگر اندر نہ جاوے تو کیا حیاۃ باقی رہتی ہے، تو یہ حیوٰۃ کا بقا یہ سانس کے برابر بلا قیمت نعمت عطاءِ ربِ حقیقی' محسنِ حقیقی' معطی حقیقی' ہمہ وقت ہے اس کی قیمت کوئی دے سکتا

ہے؟ اس کی قیمت یہ ہی ہے کہ اس ذات کی ایسی عبادت کی جائے جو جان اور حیاۃ کا دینے والا ہے۔

ہر سانس محرک ہے:

تو پھر یہ سانس بھولنے کی بات ہے یہ تو محرک ہے، سانس کا اندر جانا اور باہر آنا یہ ہی تو محرک ہے، کسی ذات کی یاد کی، جس ذات کی طرف سے کہ یہ محفوظ ہے۔ اور یہ ذاتِ ربانی ہے۔ للہذا ان سانسوں کا لحاظ کرو بدلحاظ مت ہو جاؤ۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ ایھا السالکون ایھا الطالبون یہ ہے تصوف، یہ ہے سلوک، جس کے متعلق آج کہتے ہیں۔ پڑھے لکھے بھی، کہ یہ تصوف کیا ہوتا ہے۔

بلا تصوف کے ایمانِ کامل نہیں ہو سکتا، بلا سلوک طے کئے ہوئے ایمانِ کامل نہیں ہو سکتا۔ باطن سے متعلق تصوف اور سلوک ہے اور جو ظاہر سے ہوتا ہے، اس کا نام فقہ ہے تو یہ سانسوں کا لحاظ' سانسوں کا خیال' سانسوں کا دھیان یہ تصوف کا ایک جز اور بہت اونچا جز ہے۔ جز اس کو عبادت مت سمجھو، من حیث الفرائض، من حیث الواجبات، من حیث السنن، من حیث المستحبات، یہ عبادت میں سے بالذات نہیں ہے، اس لئے اس کو عبادت نہیں کہیں گے۔ للہذا اہلِ مصر کا یہ کہنا کہ ہندوستان کا تصوف جوگیانہ ہے، یہ کہنا غلط ہے۔ میری گفتگو اس سلسلہ میں اہلِ مصر سے ہو چکی ہے، جب میں مصر گیا تھا اور وہاں پر ایک بہت بڑا مدرسہ ہے، جو قاہرہ میں ہے میں وہاں پر گیا تھا۔ اسی وقت پروفیسر وغیرہ آئے تھے ملنے کے لئے گفتگو ہوئی تھی، ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کا تصوف جوگیانہ ہے۔

الحمد للہ کہ حضرتؒ کی برکت سے فضلِ الٰہی سے ان کو خوب جواب دیا ان کے ذہن میں یہ ہے کہ پاس انفاس یہ جوگیوں کا طریقہ تھا، ہندوستان میں جوگی آج کل تھوڑے ہی ہیں، یہ ہزاروں برس رہ چکے ہیں، ان کا طریقہ ان کے ذہن میں یہ ہے اس کو

کچھ صوفیاءِ کرام نے مشائخِ عظام سے اختیار کیا کہ جو گیا نہ خضر نے ثابت کیا کہ ہرگز نہیں۔ اس کو کوئی بھی شیخ اپنی ذات میں عبادت سمجھے یہ ہے بدعت۔ لیکن بالواسطہ عبادت ہے کہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کا دل میں دھیان رکھنا' اللہ تعالیٰ کی یاد کا دل میں جما ہوا راسخ ہونا، لیکن اس کا طریق کیا اختیار کریں جو ایسا ہو جاوے کونسی تدبیر ایسی اختیار کریں جو اس بات پر قائم ہو جائے، اس کے مختلف طُرق ہیں' ان طُرق میں سے ایک طریق پاس انفاس بھی ہے۔ سانسوں کا لحاظ بھی ہے، اس کا ایک طریق ہے، یہ اشغال کہلائے جاتے ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو اشغال کہتے ہیں' ایک ہے اذکار' ایک ہے مراقبات' ایک ہے اشغال جمع شغل کی یہ طریق مختلف قسم کے ہیں۔ مراقبات مختلف قسم کے ہیں' اشغال مختلف قسم کے ہیں۔

ذکر کی تاکید :

ذکر کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ ہے :

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ. (سورۂ مائدہ پ:۵)

لیٹے' بیٹھے' کھڑے تو یہ لیٹے بیٹھے کھڑے ہر وقت کا مطالبہ ہو گیا۔ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ صبح و شام مجھ کو یاد کرو۔ یعنی اس کا ذکر کرو۔ یہ محاورہ ہے یعنی ہر وقت۔ اور یہ ہر وقت یاد آسان ہے کچھ اس کا طریق ہے، جب تک اس طریق کو اختیار نہیں کیا جائے گا۔ تو یہ مطالبہ پورا نہیں ہوگا۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ . (سورۂ اعراف پ۹) پیش کی تھی، اپنے رب کا ذکر کرتے رہیے۔ ذکر کے معنی یاد، اپنے رب کو یاد کرتے رہو کہاں دل دل میں، جی جی میں، اپنے اندر ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنی ذات کو اپنے آپ کو نفس سے تعبیر کیا ہے كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۔(سورۂ انعام پ۷) كَتَبَ لازم کرلیا كَتَبَ کے معنی کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنی ذات میں رحمت کو لازم کرلیا، جس کو میں نے آخر میں عرض کیا تھا۔ باب

قرآنِ پاک کا بسم اللہ الرحمن الرحیم ہو گیا۔ لازم ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے تو رحمانیت اور رحیمیت' رحمانیت عام اور رحیمیت خاص مؤمن کے لئے' رحمانیت عام مؤمن غیر مؤمن کے لئے اور خاص رحمت وہ مسلمان مؤمن کے لئے ہے، ورنہ رحمان میں تو رحمت آ گئی، پھر یہ رحیم کیسا؟

جب یہ ہے تو پورا قرآنِ پاک کسی قسم کا بھی ذکر چاہے عذاب ہی کا ہو۔ دوزخ کا ذکر کر کے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ اور جنت کا ذکر کر کے پھر نعمتوں کا پھر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ اعلاء نعمت کیوں؟ رب کی کس کس نعمتوں کی تکذیب کرو۔

تو جو بیان دوزخ کا، دوزخ کے اندر عذابوں کا ہے یا قیامت کے عذابوں کا ذکر ہے یا دنیا کے اندر کفار' ثمود' عاد وغیرہ کا بیان عذابوں کے ساتھ ہے، یہ سب رحمت ہے۔ یہ حفظِ ماتقدم ہے۔ یہ سمجھایا ہے کہ جو ایسے ہوئے ہیں' ان کے ساتھ میری عادت ایسی ہے۔

لہٰذا تم ایسے مت ہو جانا یا تم ایسے مت بننا، تمہاری عادت اس طرح نہ ہوئے۔ اس درجہ کا نسیان نہ آ جاوے، تو یہ رحمت ہوئی یا نہیں ہوئی؟ تو پورا قرآنِ پاک رحمت ہے تو ذاتِ باری تعالیٰ نے فرما دیا:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ تمہارے رب نے رحمت کو لازم کر لیا۔

پھر اس کا شکریہ، اس کی یاد، اس کا دھیان، اس کا خیال لازمِ ایمان ہو گیا اور یہ رہنا آسان ہے، یا مشکل کیا خیال ہے؟ اگر آسان ہے تو یہ پانچ وقت کی نماز کے اندر غفلت کیوں ہو رہی ہے؟ صاحبِ علم ہو کر بھی جماعت کا ترک کیوں ہو رہا ہے؟ صاحبِ علم ہو کر بھی تکبیرِ تحریمہ، تکبیرِ اولیٰ کا ترک کیوں ہو رہا ہے؟ صاحبِ علم ہے اور صبح کو نماز جماعت تکبیرِ اولیٰ اکثر و بیشتر ترک ہو رہی ہے کیوں؟ اس لئے کہ یاد نہیں ہے، دھیان نہیں ہے، خیال نہیں ہے' اگر ایسا ہوتا تو ترک ہوتا؟ یہ مطلوب ہے کہ اپنے دل کو ایسا بنا لیا جاوے۔

خوف وطمع :

خَوْفًا وَّطَمَعًا یعنی خَوْفًا وَرَجَاءً. طَمَعًا کے معنیٰ ہیں رَجَاءً . وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اور اللہ کی عبادت کرو جھکتے ہوئے ڈرتے ہوئے ناز کرتے ہوئے نہیں اتراتے ہوئے نہیں یہ کھلم کھلا میرے سامنے گناہِ کبیرہ اور بے حیائی کا کام کر رہا ہے پھر میں اس کو حقیر کیوں نہ جانوں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ڈرو تو پہلے کیسا تھا اور اب توبہ کر کے کیسا ہو گیا ہے۔ تبدیلی اس کے اندر بھی آ سکتی ہے کہ توبہ کر کے آخر دم تک ولی بنا رہے اور تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بنا ہوا تقویٰ والا بھی بگڑ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو اندیشہ کر کہ یہ تقوے کے ساتھ ہوتا ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تقویٰ چھوڑ بیٹھوں، تقویٰ چھوٹ جاوے مجھ سے تو ادھر یہ اعتماد رکھو کہ توبہ کر کے آخر دم تک ولی بنا رہے اور اپنے لئے یہ اندیشہ قائم کروں۔ خدانخواستہ ایمان تبدیل نہ ہو جاوے۔

لہٰذا اپنے اوپر اترانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور دوسرے پر حقارت کی نگاہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے تمام اہل اللہ نے واقعی جو اہل اللہ ہیں، انہوں نے کہا ہے قسم کھا کر کہتے ہیں، کہ ہم کتے سے بدتر ہیں، تو مسئلہ سمجھ میں آ گیا۔ ماضی کو سوچے کہ پہلے ہم کیسے تھے؟ تربیت سے کیسے ہو گئے؟ مستقبل کو سوچ لو کہیں ایسا نہ ہو کہ تبدیلی ہو جاوے، موجودہ حال کو تصور کر رہے ہو، تم کیسے تقوے کے ساتھ ہو کیا اندیشہ نہیں ہے؟ اس لئے فرمایا اللہ کی عبادت کرو ڈرتے ہوئے جھجکتے ہوئے، اندیشہ رکھتے ہوئے کہیں اترانہ پن نہ آ جاوے۔ عبادت میں اترانہ پن، غرور پن نہ آ جاوے اور کیا فرمایا دوسرا لفظ طمعاً کہ جب تم عبادت کرو کس طرح سے خوف رکھتے ہوئے کہ اترانہ پن نہ آ جاوے، تکبّر نہ آ جاوے اپنے کو کچھ سمجھنے لگو اور یہ بھی نہیں تو نا اُمیدی کا کیا سوال ہے؟ اُمید رکھتے ہوئے وہ مسئلہ سمجھ میں آ گیا جو پڑھا آپؐ نے کتابوں میں الایمان بین الخوف و الرجاء

سمجھ میں آ گیا۔

الحمدللہ علمی گفتگو ہورہی ہے، کتابیں حل ہورہی ہیں انشاءاللہ اچھی طرح سمجھ میں آیا یا نہیں آیا۔ اسی لئے فرمادیا کہ بغیر کرنے کے اُمید رکھنا دھوکہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ (سورۂ لقمان پ:۲۱) دیکھو دنیاوی زندگی جو لیل ونہار کی اور زیب وزینت کی، آرائش کی، حسن وجمال کی کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں دھوکہ میں ڈال دے اور بلا اعمال کے اُمید رکھنے لگو۔ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۔ دیکھو تمہیں کہیں دھوکہ باز دھوکہ میں ڈال دے وے۔ حق تعالیٰ نے جواب دیدیا حفظ ماتقدم ہوگیا کہ دیکھو یہ دنیاوی زندگی اور یہ شیطان دھوکہ باز تم کو دھوکہ میں نہ ڈال دے بلکہ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔

پورا کلامُ اللہ رحمت ہے:

تو پورا کلام اللہ یہ رحمت ہے۔ جہاں دوزخ کا بیان ہے وہ بھی رحمت، جہاں قہر کا بیان ہے وہ بھی رحمت، جہاں عذابوں کا بیان ہے وہ بھی رحمت ہے۔ یہ گفتگو پاسِ انفاس پر چلی ہے تو یہ پاس انفاس یہ ذاتِ خود عبادت نہیں ہے بلکہ کسی عبادتِ مقصودہ کا ذریعہ ہے۔ طریق ہے اور جو کسی مقصود کا ذریعہ ایسا ہوا کرتا ہے وہ بھی مقصود میں داخل ہوجاتا ہے۔ بالواسطہ وہ خود مقصود اپنی ذات میں ہے لیکن مقصود بالذات کا طریقِ حصولِ مقصود کے لئے تو بالواسطہ عبادت ہے جیسے عرض کیا تھا۔

علاج معالجہ کرانا عبادت ہے:

بیمار کا علاج کرانا یہ بھی عبادت ہے، دوا کھانا بھی عبادت ہے، اپنی ذات میں مباح ہے، لیکن یہ نیت کرلی جائے کہ رسولِ پاک ﷺ نے دوا استعمال کی تھی، میں بھی کروں عبادت بن گئی۔ تصوف صوفیائے کرام کا، محققین کا، جو ہندوستان کے اندر گزرے

ہیں، اولیاءِ کرام ان کی تجویز یہ مِنْ حیث العبادت اپنی ذات میں ہرگز، ہرگز نہیں ہے۔

لہٰذا اہلِ مصر کا کہنا کہ ہندوستان کا تصوف جوگیانہ ہے یہ بالکل غلط ہے۔

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ حرکت زبان کی نہیں، بلا حرکتِ لسان، بلا حرکتِ الفاظ دل ہی دل میں اپنے ربّ کی یاد، ذکر کے معنیٰ ہیں۔ اس میں زبان کی حرکت نہیں، زبان پر الفاظ نہیں، اللہ کلمہ شریف لا الٰه الا اللّٰه وغیرہ وغیرہ نہیں ہیں، اور جب یہ نہیں ہے تو چپکے چپکے اور عاجزی کے ساتھ محبت کے ساتھ چپکے چپکے کیا ہے؟ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً، چیخ پکار کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آواز سے کرنا بھی ہے تو اجازت ہے، لیکن چیخ پکار نہ ہو کہ ایسی آواز ہلکی سی کہ کسی سوتے ہوئے کی آنکھ نہ کھل جائے یہ تشریح ہے۔ نمازی کی نماز میں فرق نہ آجاوے۔ دوسرے کے ذکر میں فرق نہ آجاوے۔

تضرع کا مفہوم :

اس سے مراد عاجزی، انکساری، فنائیت، پستی نہ کہ ہستی۔ طبیعت میں اضمحلال، عاجزی، انکساری، اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا ہے تضرع ڈرتے ہوئے خفیہ آہستہ آہستہ اگر زبان کی حرکت کرنا بھی ہے تو آہستہ آہستہ اور اگر کچھ اور ذرا تھوڑی سی آواز کرتا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ چیخ پکار ہو جاوے اور کپڑے پھاڑنے لگو اور لوٹ پوٹ ہونے لگو، ایسے کیفیات کے طالب بن گئے، یہ خلافِ شرع ہے، غیر اختیاری آجائے تو خیر اس آیاتِ شریفہ میں پورا تصوّف چل رہا ہے۔ غیر اختیاری آجائے اور آجاتا ہے، یہ حال پیدا ہوتا ہے، ذکر کرتے ہوئے جنہوں نے ذکر کیا ہوگا وہ جانتے ہیں لیکن یہ کوئی شرعی چیز کہ اگر یہ چیز نہیں آئی تو سمجھتا ہے کہ پہلے اولیاء اللہ کا کچھ حال ایسا بھی تھا اور میرا تو یہ حال ہی نہیں۔ لہٰذا میں کہاں ولی بنا، لہٰذا میرا سلوک کہاں طے ہو رہا ہے، میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا اس لئے تذکرۃ الاولیاء کا مطالعہ سب کے لئے دیکھنا جائز نہیں ہے، پہلے حقیقت کو اس کی سمجھ لو پھر دیکھ لینا

پھراس میں یہ حل ہوجاوے گا کہ ایسے بھی ہوئے ہیں اللہ کے بندے۔تو اتنا بھی نہیں ہے کہ دوتین ہزار دفعہ ذکر کرلوں وہ ایسے ہوئے تھے تو یہ غیرت دلانے کے لئے، ترغیب کے لئے، ترہیب کے لئے، مضامین اور اولیاء اللہ کے تذکرے، سستی دور ہونے کے لئے اور چستی پیدا کرنے کے لئے نہ کہ ان جیسے حالات پیدا کرنے کے لئے اور نہ ان جیسی کیفیات اپنے اندر لانے کی تمنا رکھنے کے لئے اور نہ ہونے پر افسوس حسرت کرنے کے لئے اس لئے نہیں، وہ قوتِ لایموت کھاتے تھے، ہاں کھاتے تھے لیکن پیٹ بھر کر نہیں کھاتے تھے۔

تو وَاذْکُرْ رَبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ میں فی ہے، اور فی ظرف کے لئے ہے۔ اس کا ظرف دل ہوگیا، اپنے دل میں اس کی یاد، اب یہ دل میں اس کی یاد رکھنے اس کا کوئی طریقہ اور کوئی سبب ہونا چاہئے کہ سبب پیدا نہ ہو' منجملہ اور چیزوں کے کہ متعدد چیزیں ہیں' کسی کو کثرتِ ذکر سے ہی یہ بات پیدا ہوجاتی ہے' تکثیر ذکرِ لسان ہی سے یہ بات پیدا ہوجاتی ہے، کوئی ایسا غبی قسم کا سا ہے تو اس کو پاسِ انفاس تجویز کردیتے ہیں۔سانسوں کے ذریعہ سے دھان بلا تلفظ' بلاحرکتِ لسان کچھ چلا تو لیکن اچھی طرح نہیں چلتا، یہ شیخ' حکیم کا کام ہے، یہ طبیبِ روحانی کا کام ہے، کسی کو حبس دم تو حبس دم کی بھی کئی صوتیں ہیں ایک ہی نہیں ہے اور شغل پاس انفاس کی بھی کئی صورتیں، ایک ہی نہیں، اب یہ طبیب کی طبیعت پر کہ ذوق کا پہچاننا مریض کا، طالب کا، کہ جس طرح وہ تجویز کرتا ہے اس پر چلتے رہنا۔

پاسِ انفاس کا فائدہ :

اس کا اثر یہ ہوگا کہ دل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر' اللہ تعالیٰ کی یاد' اللہ تعالیٰ کا دھیان جم گیا' تو زندگی کی تمام معمولات اور تمام اُمور میں دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور جب یاد ہے تو دشمن سے بھی حدودِ شرع سے تجاوز نہیں کرسکتا ہے، دشمن کے ساتھ بھی حدودِ شرع سے باہر نکل کر عملی معاملہ نہیں کرسکتا ہے۔ جہاد میں بھی ہوشیار مجھے نہ بھولنا وہاں بھی حدودِ شرع کے

اندر رہنا، دشمن سے کوئی برتاؤ خلافِ شرع نہ ہونے پاوے، تجاوز نہ ہوجاوے، یہ کب جبکہ دل کے اندر اللہ تعالیٰ سما گیا، سرایت کر گیا ہے، رگ رگ، بال بال بندھ گیا ہے یہ ہے تصوّف، یہ ہے سلوک۔

حضرت علیؓ کا واقعہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منہ پر جہاد کے موقع پر ایک یہودی دشمن نے تھوک دیا اور حضرت علیؓ اُوپر چھاتی پہ بیٹھے تھے، گردن پر تلوار پہنچ گئی، اس کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا حالانکہ اس پر تو اور غصہ آنا چاہئے تھا، اتنی توہین کیسی ہستی کے چہرہ پر تھوک دیا کوئی چھوٹا موٹا آدمی نہ تھا، کس خاندان کا تھا، عند اللہ کیسے رُتبہ کا تھا، لوگوں کی نظروں میں کیسی عظمت تھی، اس کے چہرہ پر یہ بھی نہیں کہ کپڑوں پر۔ اس کو ذرا سوچنا ایمانداری سے گوارہ کر سکتا ہے، کیوں گوارہ کیا، اس لئے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد آ گئی، ہٹ گئے چھوڑ دیا، اس کو تعجب ہوگیا اور تعجب کی بات بھی ہے، فطرتِ بشری جس میں کچھ حیوانیت رکھی ہوئی ہے وہ بھلا کیسے چھوڑ دے گا؟ یہ کیا قصہ ہے تو چھوڑ دیا، پوچھا کیوں؟ کہا کہ جب تم نے میرے چہرہ پر تھوکا تو طبیعت میں ذرا کچھ احساس آیا۔ اس میں طبیعت شامل ہوگئی، غیر طبعی، طبعی طور پر غیر مقصدی شامل ہوگئی، طبیعت شامل ہوگئی، طبیعت پر ایک اثر آیا اب جب میں تجھ کو ذبح کرتا، قتل کرتا، مار ڈالتا تو صرف ذاتِ حق کے لئے نہ کرتا اپنی ذات کے لئے کرتا۔ اور اس کو چھوڑ دیا، یہ چھوڑ دیا یہ چھوڑنا کب ہوا جبکہ ذات کے اندر، دل کے اندر، اللہ کی یاد آ گئی، دل میں غفلت نہیں تھی ورنہ فوراً قتل کر دیا جاتا، ہمارے دلوں میں غفلت ہے وہ دھیان یاد نہیں ہے کہ وہ طریق اختیار نہیں کئے۔

احساسِ کمتری کیا ہے؟

آج کل کہتے ہیں کہ یہ احساسِ کمتری کوئی اچھی چیز نہیں ہے تو یہ ایک رسم ہوگئی

ہے احساسِ کمتری تو بڑی چیز ہے، ہاں ذلت سے بچنا ضروری ہے، اپنے کو کچھ سمجھنا بھی تو حرام ہے، ہر ایسے طریق سے بچنا ضروری ہے جو لوگوں کی نگاہ میں ذلت ہو، اس سے تو بچتا نہیں ہے اور اگر کسی نے کچھ کہہ دیا تو اپنے کو احساسِ کمتری نہیں ہے تم کو تر کی بتر کی جواب دینا چاہئے، تکبر میں آ گیا، آج کل کی احساسِ کمتری تکبر ہے۔

ذلّت کے کاموں سے بچو :

تو عنوان ہے یہ ایسی حرکتوں کو ایسے عملوں کو ایسے فعلوں کو ایسے کھیلوں کو جن میں ذلت ہے چھوڑ دو۔ مثلاً اہلِ علم کا، طلبہ کا، بستی والوں کے ساتھ جوڑ لگانا، بستی والوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، محلّہ میں، قصبہ میں گھومنا، چلنا، پھرنا یہ کوئی عزت ہے، اس کو ذرا سوچو یہ کوئی عزت کی بات ہے، یہ ذلت کی بات ہے، دو کانوں کی بات ہے یا عزت کی بات ہے، اس کو تو چھوڑتا نہیں ہے اور کسی نے کچھ کہہ دیا تو احساسِ کمتری جو ذلت کی بات ہے، ان کو چھوڑو، اس میں کمتری ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تم ذلیل ہوتے ہو، تم ہلکے ہوتے ہو، تمہارا اعزاز جاتا ہے، اگر تمہیں کھیلنے کا شوق ہے تو اپنے ہی لڑکوں میں کھیل لو، یہ بستی والوں کے ساتھ کھیلنا کیسا، باہر جا کر باہر والوں کے ساتھ کھیلنا کیسا اور گھروں میں آج کل کیا لگا ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن وہاں اس میں کھیلیں آ رہی ہیں، ان کے گھر جا کر دیکھنا کیسا ؟ کیا اس میں توہین، ذلت نہیں ہے، خاص کر طالب علم کے لئے، کہ کیا کہیں گے وہ نماز کا وقت ہے، نماز کے وقت ٹیلی ویژن پر بیٹھا ہوا ہے۔ طالب علم اور دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے، تو وہ گھر والے کیا خیال کریں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی لحاظ کی وجہ سے کچھ نہ کہے، یہ ذلت ہے یا نہیں ہے اگر ایسا ہی شوق ہے اگر چہ یہ شوق اچھا نہیں ہے مگر خیر آپس میں ہی کھیل لو، بستی والوں کے ساتھ نہ کھیلو، باہر جا کر نہ کھیلو، دل بہلا لو، اس میں ہار جیت کا خیال مت کرو کہ روٹھنا شروع کر دو، لڑنا شروع کر دو، کہ میرے تو بارہ رنز بنے ہیں اور تو دس ہی

کہہ رہا ہے۔ یہ تو تفریح کے لئے ہے۔ ذرا جسم کھولنے کے لئے ہے، جسم کو بنانے کیلئے ہے، اس میں ہار جیت کی کیا بات ہے جو بگڑتے ہو' سکون سے رہو' دوستوں کے ساتھ رہو' محبت سے رہو۔ یہ ضمناً بات آ گئی ہے۔

مسائل سلوک مدلّل ہیں :

اور پھر یہ صحابۂ کرامؓ نے کیا کہا؟ یہ دلائل ہیں توفیقِ الٰہی سے سلوک کے کوئی ان کا دعویٰ بلا دلیل کسی آیت واحادیث وتعامل صحابہؓ کے نہیں کیا بعض صحابہؓ نے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اب تو ہمیں پیشاب پاخانہ کے لئے بول و براز کے لئے جانا اور بیویوں کے پاس جانا بھی مشکل ہو گیا ہے، کس طرح جائیں؟ سمجھے کیا مشکل ہو گیا پائجامہ کھولو اور بیٹھ جاؤ نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا دل میں دھیان اللہ تعالیٰ کی یاد' حیاو شرم کیسے ننگا ہونا یہ چیز تھی۔ یہ چیز کیا بتلا رہی ہے کہ دل میں اُوفو اس قدر ذاتِ باری تعالیٰ کی یاد کی۔ ہر قسم کے بیٹھے ہوئے ہیں تو ایک مجلس بھی کافی ہو سکتی ہے، طالبِ صادق کے لئے اور ہر قسم کی باتیں پیشِ خدمت کی جا رہی ہیں۔ ایک مجلس بھی طالبِ صادق مخلص کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ بس ذرا سی ہمت کی ضرورت ہے۔ پہلو بدلنے کے لئے کہ بائیں سے دائیں آ جاؤ توفیقِ الٰہی سے طالبِ صادق حریص کے لئے تو پیغمبر ﷺ نے کیا فرمایا؟ امتثالِ امر کے لئے امتثالًا للامر کہ اس وقت یہ ہی حکم ہے۔ مقصود تو طاعت ہے اور وہ طاعت عبادت ہے کہ ان کی حکم کی تعمیل میں ہے کہ امتثالِ امر عبادت ہے تو طاعت لہٰذا بیت الخلاء جاؤ، لہٰذا بیوی کے پاس جاؤ کہ بنایا اس طرح پر ہے کیوں جس کو اس کی ضرورت احتیاج حاجت پیش آوے گی اُدھر کیا حکم دیا کہ میرا دھیان، کیا حکم دیا میری یاد، اُدھر کیا حکم دیا کہ ننگے ہو جاؤ' غیر محل میں نہیں تو پھر یاد کہاں ہے دھیان کہاں ہے؟ یہ امتثال للامر نہیں ہے وہ تو اعراض لامر ہے' یہ تو ظلم ہے' وضع الشیء فی غیر محلہٖ ظلم کی تعریف پڑھی ہوگی۔ شئی کو اس

کے غیر محل میں استعمال کرنا یہ ظلم ہے تو یہ کیا حکم ہے؟ امتثالِ امر ننگے ہونے کا اور جب نہاؤ گے تو کیا ہو گے۔ غسل کس طرح کرے' کپڑے پہن کر وہی کپڑے پانی کے اندر پہنتے ہو باہر نکل جاؤ یا ننگے ہوں گے کپڑوں کو اُتاریں گے یا ئیں تو جہاں عریانی ہے وہاں اطاعت بھی، عبادت بھی، تو یہ اثر صحابۂ کرامؓ پر کس چیز کا آیا تھا' وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ کا آیا تھا۔ تضرع اور خفیہ کے ساتھ آیا تھا۔ اب تو آپ حضرات کی سمجھ میں بات آئی۔

یہ آیتیں کیا ہیں تصوف کی ہیں سلوک کی ہیں۔ آپ عبد ہیں اور عبد کے لئے عبادت تو عبد کے لئے ہمہ وقت عبادت یا صرف نماز ہی کے اندر عبادت یا روزہ رکھے تب ہی عبادت نماز کے اندر حکم دیا جبرائیل علیہ السلام کو۔ آتے تھے حاضر ہوتے تھے دربارِ رسالت ﷺ میں اور کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کا سوال بھی کیا تھا۔ ما الایمان مَا منطقی اصطلاح ہے کہ جو سوال کر رہا ہوں' اس کی جو حقیقت ماہیت ہو اس کا جواب دو تو ما الایمان کا جواب دیا تھا۔ حقیقتِ ایمان ہی بیان کی۔ ما الاسلام حقیقت اور ماہیت اسلام کی بیان کی، پھر کیا کہا تھا ما الاحسان کیا جواب دیا...... ان تأکل خبذا، العیاذ باللّٰہ۔

کہ نیت باندھو اور دوکان میں لگے رہو' کھڑے تو یہاں ہو اور دوکان پر لگے رہو یوں تو نہیں کہا، بلکہ کیا کہا ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ کانک تراہ کیا ہے کہ تو اللہ کی عبادت کر اس طرح گویا کہ تو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ خیر ابھی ایسا نہیں فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ (مسلم شریف جلد اوّل) اگر ابھی نہیں ہے کہ ابھی ایسی مشق نہیں ہوئی ابھی ایسا اپنے آپ کو نہیں بنایا تو یہ تو یقینی ہے تیرا اعتقاد ہے۔

فانہ یراک تو یہاں فانّہ ہے اور وہاں کانّ ہے۔ فرق آ گیا سمجھ میں۔ وہاں کانّ ہے اور یہاں فانّ گویا کہ وہاں کہا تھا' ابھی مشق ایسی ہوئی نہیں' مگر یہ تو تیرا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں اور کیسے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ جب تو عبادت کرے تو وہ تجھ کو

یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے، تو اس طرح عبادت کر، پھر اس میں غفلت ہو سکتی ہے، بھولتے رہنے کا سوال ہو سکتا ہے۔ اتفاقاً بھول اور بات ہے، وہ اس کے خلاف نہیں۔ سہو کا سوال اس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ ہاں کوئی مرض ہی پیدا ہو گیا۔ وہ تو ایک عارضی چیز ہے اور نادر چیزوں کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ یقیناً وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے، اب جب وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے تو کس طرح پڑھنا چاہئے۔ آزادی کے ساتھ' لاپرواہی کے ساتھ' وقار کے ساتھ یا بے سکونی کے ساتھ کہ کہیں بازار چلا گیا تو کبھی حجرہ میں چلا گیا، کبھی کھیت میں چلا گیا، کبھی کھانے میں چلا گیا وغیرہ وغیرہ تو یہ دھیان ہوا یا نہیں ہوا۔ یہ دھیان مطلوب ہو گیا یا نہیں ہو گیا۔

جب یہ دھیان مطلوب ہو گیا تو اب اس کا تجربہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ دھیان وہاں جماوے۔ خشوع ہو خضوع۔ خضوع اعضاء کے ساتھ ہے' خشوع قلب کے ساتھ اور ابھی آپ نے کیا فرمایا تھا کہ عبد کا کام عبدیت، عادت ہے اور پیدا بھی اسی لئے کیا گیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ. لہٰذا اس کی ہر وقت کی زندگی کیا ہو گئی، عبادت اور عبادت کے لئے لازم کیا ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا دل میں دھیان۔ اب اللہ تبارک و تعالیٰ کا دھیان ہو کس طرح سے جو اکثر اوقات یا ہمہ وقت اس کے کچھ طریق ہیں، اس کے آداب ہیں، اس کے کچھ مسائل ہیں' اس کا کچھ ڈھنگ ہے، اور جو صوفیاء محققین کے پاس ہے۔ اس کے لئے ان کی تعلیم لینے کی ضرورت ہے' خود سے نہیں ہو سکتا عادۃً خلاف ہے۔ تو جو مطلوب ہے :

من حیث السلوک من حیث التصوف من حیث القلب من حیث الروح من حیث الباطن ۔ تو عند اللہ مطلوب ہے۔ عند الرسول مطلوب ہے اور جو عند الرسول مطلوب ہو، وہ عند اللہ بھی مطلوب ہے' تم نے تو اقرار کیا تھا۔ کانک تراہ۔

تو یہ ہے۔ بسم اللہ شروع کیا تھا' الرحمٰن الرحیم پھر کہا تھا' وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِیْ

نَفْسَکَ تو ہمارا پورا جسم مع قلب و روح ذاتِ باری تعالیٰ عقد کے ساتھ کیا ہے۔ عہد اب ہمارا عقد ہو گیا۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ تو یہ بدعہدی کوئی اچھی چیز ہے چاہے جس سے پوچھ لینا سب جانتے ہیں کہ بدعہدی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ خلاف عہدی اچھی چیز نہیں ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے :

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ. جو عقد ہوا ہے اس کو پورا کرو، جب انسان کا انسان سے کوئی عقد ہو، اس کا پورا کرنا، تو اس کلام کی بلاغت کیا کہتی ہے کہ جب مخلوق کا مخلوق کے ساتھ عہد ہو جائے تو پھر بدعہدی نہیں ہونی چاہئے، عقد کی وفا ہونا چاہئے، تو مخلوق کا خالق کے ساتھ عقد کیا ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی اور وہ کیا ہے دنیا کے اندر بلسان اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ بات کیا شروع ہوئی تھی کہ اپنے خط میں یہ لکھ دیا کرتے ہیں کہ گستاخی معاف کرنا اگر کچھ ایسا لفظ لکھا گیا ہو تو معاف کرنا۔ اپنا حال لکھ رہا ہے اور وہ اس کو گستاخی سمجھ رہا ہے اور خلافِ ادب سمجھ رہا ہے۔ احقر نے اس پر عرض کیا تھا کہ رسم اور بدعت یہ چند چیزوں کے اندر غمی اور خوشی کے موقع پر وہیں محصور ہو کر رہ گئی۔ بعض عباداتی شکل کے اندر بدعت اور ہم سے جو دن رات رسمی چیزیں چلتی اور ہوتی رہتی ہیں اور بدعت کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا کچھ خیال ہی نہیں ہے، یہ بات شروع ہوئی تھی۔

بعض ناواقف کہتے ہیں کہ یہ تسبیح ہاتھوں میں لینا بدعت ہے اور اپنے ہاتھ میں تسبیح موجود ہے۔ اب ایسے کوڑھ مغزوں کو کون سمجھاوے۔ کھجور کی گٹھلیاں تھیں، کنکریاں تھیں، اپنے پاس رکھ لیں، ان کو شمار کر رہے ہیں، ان کو اٹھا کر رکھ رہے ہیں۔ یہ کنکریاں اس وقت تسبیح ہو گئیں۔ اہلِ علم کو چاہئے کہ صحیح وسعتِ معلومات طلباء کو دیں۔ صرف معلوماتِ وسعت کی کافی نہیں ہے بلکہ وسعتِ علمی معلوماتی ہو کر نظرِ عمیق بھی ہونی چاہئے، ورنہ کیوں پڑھایا۔ عبارت النص دلالت النص نظرِ عمیق ہونا چاہئے۔ اس لئے اپنے حرکات کو اپنے سکنات کو

اپنے اعمال کو اپنے احوال کو اپنے کیفیات کو اپنے افعال کو شریعت کے سانچے میں اس کا جائزہ اور احتساب لیتے رہنا چاہئے کہ حدود شرع سے تجاوز ہو کر کوئی کام کسی وقت بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کا دھیان، اللہ تعالیٰ کی یاد قلب کے اندر جمانا، قائم ہو جانا، اس کے مختلف طرق ہیں، جو مشائخ کے یہاں سے اس کو حاصل کیا جاتا ہے۔

حضرت باقی رحمۃ اللہ علیہ خط بنوا رہے ہیں، حجامت بنوا رہے ہیں، لب بننے کی باری آ گئی، حجام نے کہا کہ ذرا اب تھوڑی دیر کے لئے مہربانی فرما کر ذکر کو منقطع فرما دیجئے ورنہ تو لب قطع ہو جائے گا۔ آئے ہائے! کیا کہا کہ لب قطع ہو جائے گا۔ یہ محبت یہ فریفتگی کیا کہا کہ لب کا قطع ہونا منظور ہے لیکن ذکر کا منقطع کرنا منظور نہیں۔ اسی حالت میں بنا سکتے ہو تو بناؤ ذکر کا قطع کرنا منظور نہیں لب کا قطع ہو جانا منظور ہے۔

یہ کیا چیز ہے؟ جو جم گئی تھی، دل میں کیا چیز تھی؟ جس کی محبت ہوتی ہے، اس کی ہر وقت یاد ہوتی ہے یا نہیں ہوتی؟ دھیان آتا رہتا ہے یا نہیں آتا رہتا تو ذاتِ باری تعالیٰ حق یہ حق، حق تعالیٰ کا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنیٰ میں اخلاص عطا فرماویں۔ آمین۔

واقعاتِ مسیح الامت

واقعہ :(مورخہ ۵/صفر ۱۴۰۴ھ)

ایک فارغ التحصیل عالم نے جو کہ بیعت بھی ہیں عریضہ لکھا تھا، اس میں لکھا : بندہ کے لئے کچھ وصیت فرمائیں اور بندہ کے علاوہ دو مدرس اور ہیں ان کے متعلق بھی کچھ نصیحت ارشاد فرمائیں۔

جواب میں حضرتِ والا دامتِ برکاتہم نے یہ تحریر فرمایا :

آپ دونوں کو ایک ہی بات ہے :

اوّل اخلاص، دوم افادہ، سوم وقت کی پابندی، چہارم شفقت، پنجم قناعت، ششم نظر کی حفاظت، ہفتم خلوت کا موقع طالب علم کو نہ دیا جانا، ہشتم ذاتی خدمت طالب علم سے نہ لیا جانا، نہم اس کے ذاتی ہدیہ تحفہ سے بحکمت عذر کرنا، دہم طالب علم کو تحقیری کلمات سے اجتناب کرنا۔ آپ مہتمم ہیں ذمہ دار ہیں اس لئے عرض ہے کہ حساب صاف اور صحیح رکھنا۔

استادوں کا احترام، نرم کلام، کسی کی شکایت پر فریقین سے بلا تحقیق عملدر آمد نہ ہو۔

اساتذہ کے لئے ہدایات :

(۱) اوّل اظہارِ استعداد (۲) تقویٰ (۳) وقار (۴) تراحم (۵) حلِ کتاب (۶) نظام وانتظام جو اپنے ذمہ نہ ہو اس میں دخل نہ دینا (۷) طلبہ سے ذاتی خدمت نہ لینا (۸) طالب علم خصوصاً امرد کو تنہائی کا موقع نہ دینا، اگر اتفاق ہو جائے (کسی ضرورت سے آجاوے) تو دروازے کا کھلا ہوا ہونا (۹) قناعت۔ (بروز جمعہ ۲۱ رصفر ۱۴۱۰ھ، بعد نمازِ عصر)

واقعہ :

ایک طالب علم آئے اور اپنی جسمانی بیماری کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ میرا پڑھنے میں جی لگ جائے اس کے لئے دعا فرماویں اور کچھ پڑھنے کے لئے بتلادیں۔

حضرت جی دامت برکاتہم نے دُعا فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ درود شریف اور استغفار چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے پڑھتے رہنا۔

واقعہ :

چند طلبہ حضرت سے مصافحے کے لئے اور دُعا کے لئے آئے۔

حضرتِ والا نے علمِ نافع کی دُعا فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ علمِ نافع وہ ہے جو مقارن بالعمل ہو مداوم علی الطاعات ہو۔

تیرھویں مجلس

اخلاص وصدق

ایک سائل آئے' ان کو حضرتِ والا نے دو روپے دیدیئے، ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا یہاں بہت سے سائل آتے رہتے ہیں، الحمد للہ تعالیٰ جو توفیق ہوتی ہے پیش کرتا رہتا ہوں۔ بعض بہت جھگڑالو ہوتے ہیں' برابر آتے رہتے ہیں' اُن کو میں نے کہہ دیا ہے جو میں دیدوں چاہے بیس دیدوں یا دس، پانچ دیدوں اس پر خوش رہنا چاہئے، پھر فرمایا:

سائل پر احسان نہ جتلانا چاہئے:

سائل پر احسان نہ جتانا چاہئے۔ حق تعالیٰ فرمارہے ہیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى۔ (پ۳ ع۴)

اے مسلمانو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف دے کر ضائع مت کرو۔

بلکہ اس کا احسان ماننا چاہئے کہ اس کی وجہ سے ہمیں صدقہ کی توفیق ہوگئی اور حق تعالیٰ سے توفیق مانگتے رہنا چاہئے :

اللّٰھم وفقنی لما تحبّ وترضٰی مِن القول والعمل والفعل والنیة والھدی انک علٰی کل شیءٍ قدیر۔

اے اللہ ! مجھے ان چیزوں کی توفیق دیجئے جن کو آپ محبوب رکھتے اور پسند کرتے ہیں چاہے قول ہو یا عمل، فعل ہو یا نیت یا طریقہ ہو بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔

یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، تو حق تعالیٰ سے توفیق مانگتے رہنا چاہئے اور سائل کا احسان مند ہونا چاہئے ورنہ حدیث شریف میں آیا ہے :

''ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ مسلمان زکوٰۃ لئے لئے پھرے گا مگر کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملے گا''۔

خود کو مقدس نہ سمجھنا چاہئے :

اسی لئے حق تعالیٰ نے دوسری جگہ اصحابِ تقویٰ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ (پ۲۷ع۶)

اپنے آپ کو مقدس مت سمجھو، مقدس مت جانو وہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کون مقدس ہے کیونکہ باوجود تقویٰ اختیار کرنے کے ممکن ہے اس میں کوئی ایسی چیز شامل ہو، جس کا تمہیں پتہ بھی نہ چلتا ہو اور وہ حق تعالیٰ کے علم میں ہے، جو تقویٰ کو مکدر کر دیتی ہے، جس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، ہمیں نہیں۔ اخلاص بہت اونچی چیز ہے، اسی اخلاص کے خلاف ہونے سے گو اعتقادی نہ ہو شرک آ گیا، چنانچہ حق تعالیٰ فرما رہے ہیں، صوفیاءِ محققین و مدققین کے پاس اپنے مدعیٰ کے اثبات کے لئے قرآن وحدیث سے دلائل موجود ہیں۔ تو حق تعالیٰ فرما

رہے ہیں :

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا ۝

ترجمہ : جو کوئی اپنے ربّ کی ملاقات کا اُمیدوار ہے اس کو چاہئے عملِ صالح کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

یہاں بعبادۃ اللّٰہ نہیں کہا، بعبادۃ ربّہ فرمایا ہے۔ اس میں بھی ایک نکتہ ہے تو دیکھئے یہ فرمایا ہے کہ اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک مت کرو۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں شرک سے مراد ریاء ہے، تو ہوسکتا ہے کہ متقی کے عمل میں ریا خفی ہو۔ دیکھئے اس آیت میں اخلاص کی دعوت دی ہے۔

اس آیت میں بتلا دیا کہ ہاں اس زندگی کے بعد مرنا ہے، مر کر حشر مجموعی (قیامت) میں اس کی ملاقات اللہ تعالیٰ سے ہوگی، وہاں ایک ایک دانہ، ایک ایک قطرہ کا سوال ہوگا، تو اب مسلمان کو سوچنا چاہئے کہ مجھے اس عالم کے اندر کس طرح رہنا چاہئے، میرے ہر ہر سانس کا جائزہ لیا جائے گا۔ مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کیا حق ادا کیا تھا، اس سانس کا جو اندر جا رہا تھا، اگر اندر نہ جاتا تو کیا ہوتا؟ اور جو باہر آ رہا تھا اگر نہ آتا تو کیا ہوتا؟ جب تو سو رہا تھا، تو کیا اپنے اختیار سے سانس لے رہا تھا' اگر وہیں سانس گھٹ کر رہ جاتا اور موت واقع ہو جاتی تو کیا ہوتا۔ بلا اختیار و مجاہدہ اور بلا کاوِش سانس کا آنا جانا رہتا ہے، اگر سوچ سوچ کر سانس کا آنا جانا ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ سوچنے کی باتیں ہیں۔

بعض تعلق مع المخلوق بھی تعلق مع الخالق ہی ہے :

ہاں جو مخلوق' خالق کے ساتھ زیادتِ تعلق کا ذریعہ و وسیلہ ہے اس کے ساتھ تعلق' تعلق مع الخالق ہی ہے' وہ تعلق مع المخلوق ہے ہی نہیں' کیونکہ اس مخلوق کا تعلق خالقِ حقیقی

سے زیادتِ تعلق کا سبب بن رہا ہے بلکہ ایسی مخلوق کی تو خدا سے مہیا کرنے کی درخواست ہے، جس سے خالق کے تعلق میں زیادتی ہوتی ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ خود اس کی درخواست فرمارہے ہیں:

اللّٰھم ارزقنی حُبّک و حبّ من ینفعنی و حبّه عندک۔

کہ اے اللہ! اپنی محبت کا رزق عطا فرما اور اس شخص کی محبت کا جو آپ کے نزدیک آپ کی محبت کے لئے مجھے نافع ہو۔

اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ جس مخلوق کی محبت خالق کی محبت میں نافع ہو وہ مخلوق سے محبت نہیں خالق ہی سے محبت ہے اور اس محبت کو حدیث میں رزق سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے ہی وہ عمل جس سے باری تعالیٰ کی محبت میں زیادتی ہو، وہ عمل بھی خدا کے لئے ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

انّی اسئلک حبّک وحبُّ من یحبک و حبّ عمل یقرب الیٰ حبک۔ اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اس کی محبت جو تجھ سے محبت رکھے اور ایسے عمل کی محبت کی توفیق مانگتا ہوں جو تیری محبت کے قریب کرے۔

ورنہ اس کے برخلاف ارشاد ہے:

اعوذ بعزّتک من شر ما عَملتُ.

میں آپ کی عزّت کے طفیل سے اپنے عمل کی برائی سے پناہ چاہتا ہوں۔

اور ارشاد ہے: **واعوذبک من سَاعة السّوء ومن صَاحب السّوء۔**

اور آپ سے بُری گھڑی سے اور بُرے ساتھی سے پناہ چاہتا ہوں۔

بُرا عمل اور بُرا ساتھی، ساتھی نہیں:

وہ ساتھی کیسا؟ وہ عمل کیسا؟ جس سے حق تعالیٰ کی محبت میں کمی آوے۔ اس کے

ساتھ اُٹھنا بیٹھنا کیسا؟ وہاں آنا جانا کیسا؟ تو حضور نے بُرے عمل سے پناہ مانگی ہے، بُری گھڑی سے پناہ مانگی ہے۔ اس لئے لَا اِلٰـہَ میں لَا کے ذریعہ سے ان سب چیزوں کو کاٹ کر نفی کر رہا ہے، اور جو خیر ہیں' ان کی نفی نہیں کر رہا ہے۔ اسی میں سیئات بھی آ گئے' ان کو بھی لَا سے کاٹ دیا، پھر سیئات کا ارتکاب ہوتے رہنا کیسا؟ (یہ جملہ ارشاد فرمایا ہوتے رہنا جو استمرار کو چاہتا ہے۔ از محشی)

انسان میں اُنس و نسیان کا عجیب لطیفہ :

ہاں بتقاضائے بشری ہو گیا، جہاں اس کے اندر من حیث المادّۃ اللفظیہ اُنس ہے، وہیں اس میں من حیث المادۃ الخلقیہ نسیان بھی ہے۔ اس لئے گا ہے نسیان' گا ہے شر کا ظہور ہو گیا، تو بازپُرس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چھوٹی موٹی بات تو ہو ہی جایا کرتی ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد :

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ط۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ تم فحش و منکرات سے بچتے رہو۔ یوں چھوٹی موٹی بات ہو گئی اس پر اللہ تعالیٰ نظر نہیں کرتے، تمہارا وجود تو ممکنات سے ہے، اس لئے برائی کا بھی امکان ہے، مگر سوء کا ہوتا رہنا کیسا؟ اسی سوء سے سیئات ہیں' اسی سوء سے صاحب السوء، بُرا ساتھی ہے، بُرے دوست ہیں' یہ سب شریک میں داخل ہیں' من حیث العمل' من حیث العقیدہ نہیں ابھی آپ کے سامنے آیت پڑھی تھی :

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝

یعنی اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے یعنی اس عملِ صالح کے اندر ریا نہ ملنے پائے ریاء کی آمیزش سے وہ عمل عملِ صالح نہیں رہے گا، صحیح معنیٰ میں پورے

طریقہ سے، بلکہ اس میں تکدر آ جائے گا۔

اس آیت کے جزاوّل فمن کان یرجوا لقاء ربہ میں ایک خاص نکتہ ہے کہ تم میری ملاقات کے اُمیدوار بھی ہو اور شرکِ عملی، ریا بھی کرتے ہو یہ کس طرح مناسب ہے؟ اور عملِ صالح میں رضاء کی بھی قید ہے جس پر ذاتِ باری تعالیٰ کی رضا مرتب نہ ہو، اس کو عملِ صالح نہیں کہا جائے گا، دیکھنے میں وہ عملِ صالح ہے، مگر جب بقوانینِ شرعیہ رضا مرتب ہوئی تو وہ مرضیات میں سے کہاں ہے؟ مثلاً زوال کے وقت نماز پڑھ رہا ہے، تو عملِ صالح ہے مگر رضا نہیں ہے۔ رات کو جاگا نفل بھی پڑھیں، تلاوت بھی کی ذکر بھی کیا لیکن آخر رات میں پڑ کر سو گیا کہ صبح کی جماعت چلی گئی۔ کیوں ایسے وقت سویا کہ جماعت چلی گئی تو اس عملِ صالح کے ساتھ سوء مل گیا کہ ترکِ جماعت ہو گئی۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ رات کو سوتا اذان کے بعد اُٹھ کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا۔ اس نے نوافل کا ایسا اہتمام کیا کہ جماعت چھوٹ گئی تو عملِ صالح میں سوء شامل ہو گیا۔

تحصیلِ خشوع کے لئے ترکِ جماعت جائز نہیں :

اسی طرح بعض لوگ اہتمامِ خشوع کے لئے جماعت چھوڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم نے بہت مرتبہ تجربہ کیا ہے جماعت کی نماز میں ایسا خشوع نہیں ہوتا جیسا تنہا پڑھنے میں ہوتا ہے۔ اس لئے گھر نماز پڑھتے ہیں۔ ارے اللہ کے بندے جاہل! وہ نماز جو مسجد میں جا کر جماعت سے بوساوس پڑھی جاتی ہے، گھر میں پڑھی گئی لاکھوں خشوع والی نماز سے بہتر ہے۔ یہ شخص جو مسجد جا کر نماز پڑھتا ہے شریعت کا بندہ یعنی تابع ہے اور تو اے گھر میں نماز پڑھنے والے طبیعت کا بندہ ہے اور طبیعت کے بندہ کو مشرک کہتے ہیں اور شریعت کے بندہ کو خدا کا بندہ کہتے ہیں۔ تو دیکھئے وہ اپنے نزدیک خود کو مخلص سمجھ رہا ہے اور شریعت اس کو مشرک کہہ رہی ہے لیکن یہ مشرک عملی ہے۔

ایک بادشاہ کی حکایت :

یہاں پر ایک شاہ صاحب آئے تھے، جن کے ایک ہزار مرید تھے، پٹیالیہ کے رہنے والے تھے (سامنے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) میں وہاں رہتا تھا۔ مسائلِ سلوک کی باتیں ہوتی رہتی تھیں، کئی دن قیام رہا، انہوں نے کہا کہ متعدد مشائخ سے ملتا ہوا آ رہا ہوں۔ ایک دن میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ عصر کی اذان ہوگئی میں اُٹھ کر نماز پڑھنے چلا گیا وہ نہیں گئے۔ نماز کے بعد میں ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ان سے پوچھا آپ مسجد میں نماز پڑھنے نہیں گئے؟ بولے میں نے یہیں پڑھ لی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ جواب دیا کہ میں اس وقت ایسی کیفیت کے اندر تھا کہ اگر اُٹھ جاتا تو وہ کیفیت باقی نہ رہتی، میں نے پوچھا تین حالتیں ہوتی ہیں، حالتِ غیبت، حالتِ استغراق، حالتِ سکر۔ تو کیا آپ کو ایسی غیبت تھی کہ نہ اذان سُنی اور نہ نماز کے لئے جانے والوں کا احساس ہوا کہ یہ نماز کو جا رہے ہیں، ایسے غرق تھے؟

اُنہوں نے کہا جی نہیں ایسی کیفیت نہیں تھی بلکہ پوری بیداری تھی، اذان سُننے کی بھی، آپ کے نماز کو جانے کی بھی، وہ بیچارے ناواقف تھے، اسی لئے تو بقدرِ ضرورت شریعت کا علم حاصل کرنا فرض ہے۔ بدوں اس کے اس کا شیخ بننا جائز ہے وہ شیخ کیسے ہو سکتا ہے جو علمِ شریعت سے ناواقف ہو۔ اب چاہے عربی کی مفصّل کتابیں پڑھ کر علم حاصل کریں، چاہے اردو کی معتبر کتابیں پڑھ کر علم حاصل کریں، چاہے کسی عالم سے پوچھ پوچھ کر علم حاصل کریں یا کسی عالم کی مجلس میں سُن سُن کر علم حاصل کریں، مگر علم حاصل ضرور کریں۔

ضرورتِ علم پر ایک بزرگ کی حکایت :

شیخ عبدالقدوس گنگوہی شیخ عبدالحق ردولوی کی خدمت میں ردولی پہنچے، جا کر بیعت کی درخواست کی، تو شیخ عبدالحق ردولوی نے پوچھا تم نے کچھ علمِ دین حاصل کیا ہے؟

عرض کیا ابھی تک کچھ حاصل نہیں کیا۔ فرمایا پھر سلوک میں داخل ہونے سے گمراہی ہوگی، آپ پہلے دین کا علم حاصل کیجئے، پھر آیئے، دیکھئے علم کو سلوک حاصل کرنے پر ترجیح ہوگئی۔ اس علمِ دین کا مرکز دہلی تھا۔ چنانچہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے عرض کیا بہت اچھا، کوئی حجت نہیں کی۔ جب جانے کے لئے اُٹھنے لگے تو فرمایا ذرا سننا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ پڑھ کر آئیں گے تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔ خیر! میرا بیٹا زندہ ہوگا، اس سے آپ استفادہ کریں۔ عرض کیا بہت اچھا، اگر آج کسی سے کہہ دیا جائے کہ فلاں جو ہمارے سلسلہ میں داخل ہیں آپ اصلاح کا تعلق ان سے کرلیں تو مانتا ہی نہیں لیکن یہ شخص اس شیخ کو بھی نہیں مانتا' اگر اس کو مانتا ہوتا تو اس کو بھی مانتا۔ جب اس کو نہیں مانتا تو اس کو بھی نہیں مانتا۔

صرف جاننا کافی نہیں :

اگر کوئی شخص کہے کہ اللہ کو تو مانتا ہوں لیکن اس کے پیغمبر کو نہیں مانتا۔ جب پیغمبر کو باوجود معجزہ کے نہیں مانتا، کہ معجزہ دلیل وشہادت ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں مانتا۔ جب اس کے پیغمبر ہونے پر اللہ کی شہادت موجود ہے اور پھر نہیں مانتا تو کیسے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے اور ماننے کا نام ایمان ہے جاننے کا نام ایمان نہیں ہے۔ اللہ کو جانتے تو سارے کفار ہیں مگر اس جاننے سے مؤمن نہیں ہوجاتے۔

اسی طرح شیخ کو صرف جاننے سے مرید نہیں ہوجاتا' ماننے سے مرید ہوتا ہے اور اگر نہیں مانتا تو اسے مرید نہیں کہتے' تو اگر مرید کسی سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کی ہدایت کے بعد یوں کہے کہ مجھے تو اس سے عقیدت نہیں تو شیخ سے فروتر ہوکر رہنا چاہتا ہے۔ تو یہ مُرید نہیں مَرید ہے' جیسا کہ قرآنِ پاک میں ہے : **شیطانًا مّریدا**۔

دیکھئے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے مان لیا اور عرض کیا بہت اچھا اور علم حاصل کرنے چلے گئے۔ جب علم سے فارغ ہوکر تشریف لائے تو واقعی شیخ کا انتقال ہوچکا تھا، ان

کے بیٹے سے تعلق قائم کرلیا کیونکہ ان سے ہی تعلق قائم کرنے کے لئے فرمایا تھا مگر نسبت دونوں طرف کی حاصل ہوئی۔ یہ بات اس پر چلی تھی کہ جاہل شیخ نہیں ہوسکتا اور بات ان پٹیالیہ کے شیخ صاحب کی ہورہی تھی، جنہوں نے کیفیتِ خاص میں مشغول ہونے کی وجہ سے جماعت ترک کردی تھی، تو میں نے ان سے پوچھا' آپ غیبت میں تھے یا استغراق میں تھے اور سکر تو بہت اونچی چیز ہے، اس میں حجابات اُٹھ جاتے ہیں، یہ تو بہت اونچی چیز ہے، انہوں نے کہا کہ ان میں سے کوئی چیز نہیں تھی' میں نے اذان بھی سُنی اور نماز کو جاتے ہوئے دیکھا تو میں نے کہا اس کیفیتِ خاص سے تنہا نماز پڑھنا وساوس والی جماعت کی نماز سے کئی درجہ بہتر ہے کہ جماعت کی نماز شریعت کے موافق ہے اور تنہائی کی نماز طبیعت کے موافق ہے۔ یہ جواب سُن کر ان کی آنکھیں کھل گئیں، بیچارے ناواقف تھے، ان کو اس کا علم ہی نہ تھا، نہ مسائلِ سلوک سے واقف تھے، نہ مسائلِ شریعت سے واقف تھے، ایسا شخص شیخ نہیں پیر ہوا۔ شیخ اور چیز ہے اور خالی پیر اور چیز ہے۔ وظیفچی کا نام پیر ہے کہ نوافل کا اہتمام ہورہا ہے اور واجبات کو ترک کررہا ہے۔ دیکھو کیسا اچھا شیخ ہے۔ شیخ کہتے ہیں صاحبِ فن کو۔ یہ کلام ضمناً عملِ صالح میں رضاء کی قید پر آ گیا تھا۔

اخلاص کا حصول شرکِ خفی کے ترک سے ہے، یہ بہت اونچی چیز ہے۔ جب اخلاص آجاتا ہے تو خلاصی بھی ہوجاتی ہے، کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اخلاص تو ہو اور خلاصی نہ ہو۔ اس لئے کہ جیسے ایمان کو اختیار کرکے شرک وکفر جلی کو چھوڑا ہے اسی طرح اخلاص صحیح معنیٰ میں آکر شرکِ خفی بھی چھوڑ دیا۔ تو اب خلاصی نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اخلاصِ صحیح کے بعد ازالۂ رذائل ضروری ہے:

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب اخلاص صحیح معنیٰ میں حاصل ہوگیا تو پھر اخلاقِ رذیلہ ذمیمہ سے سارے کے سارے سے یکلخت خلاصی نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ

اخلاصِ قوی آ گیا تو تمام اخلاقِ رذیلہ سے بالکل خلاصی ہوگئی۔

اصلاحِ نفس کا گُر :

ارے ! ایک ایک خلق رذیل کا کہاں تک علاج کروں گے اور کب تک کرو گے اس کے لئے تو عمرِ خضر چاہئے۔ ارے اخلاص پیدا کرلو، سب کا علاج ہوگیا۔ ایک خلق کے ازالہ میں بڑا مجاہدہ کرنا پڑے گا اور جسم بھی گھل جائے گا، بس یہ بات بڑی خوشی کی ہے کہ اصلاح کے لئے ایک تو اخلاص پیدا کرلو اور پھر یہ تلاش کرلو کہ اس کام کے کرنے کا صحیح طریق کیا ہے؟

صدق واخلاص کی حقیقت :

صدق کا حاصل یہ ہے کہ جس عمل اور جس عبادت کو جس طرح سے ادا کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے کہ عمل میں سوائے رضاءِ الٰہی کے کسی قسم کی کوئی بھی، کبھی بھی کوئی عمل دوسری غرض سے نہ ہو، تو یہ ہوسکتا ہے کہ کسی عمل میں اخلاص تو ہو اور صدق نہ ہو، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ صدق ہو اور اخلاص نہ ہو کیونکہ صدق کی تعریف میں اخلاص بھی داخل ہے۔ ان دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔ دو چیزوں کے درمیان منطق میں چار قسم کی نسبت بیان کی جاتی ہے تساوی تباین، عموم وخصوصِ مطلق، عموم وخصوص من وجہ اگر منطق پڑھی اور سمجھی ہو تو جہاں صدق ہوگا، اخلاص ضرور ہوگا اور جہاں اخلاص ہو ضروری نہیں کہ صدق بھی ہو۔

خلاصہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو فرما رہے ہیں کہ عمل میں صدق بھی ہو اور اخلاص بھی ہو۔ چنانچہ آیۃ وَلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ٥ میں اخلاص کا ذکر ہے جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ صحابی جنہوں نے جدید الاسلام ہونے کی وجہ سے نماز سکونِ ارکان کے ساتھ ادا نہیں فرمائی تھی، دوبارہ چلنے کے لئے اور پھر تلاش کرے گا

کہ اس عمل کو بجالانے کا صحیح طریقہ بقانونِ الٰہی' آداب کے ساتھ کیا ہے؟ تو اب علم کی تلاش ہوگی کیونکہ بدوں علم کے عمل کرنے کا صحیح طریقہ نہیں معلوم ہوسکتا۔ تو اب اخلاص کے ساتھ اس عمل کا صدق بھی حاصل ہوگیا اور اگر عمل کو اس کے صحیح طریقہ کے ساتھ نہیں کیا تو اخلاص تو ہے لیکن اس عمل میں صدق حاصل نہیں ہوا۔ ابھی نقص رہ گیا، ابھی تکمیل حاصل نہیں ہوئی کس طرح؟

اخلاص وصدق کا امتیاز حدیث سے

سنئے ایک صحابی نماز پڑھ رہے تھے حضور ﷺ تشریف فرما تھے' انہوں نے نماز پڑھ لی، سلام پھیر دیا، حضور ﷺ نے فرمایا: قُمْ وَصَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ۔ کھڑے ہوجاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ حالانکہ نماز پڑھی تھی، کس کے لئے پڑھی تھی وہ صحابی تھے، اس کو ذہن میں رکھئے گا، میری گفتگو درسی ہوتی ہے مشائخ جیسی نہیں ہوتی، پیروں جیسی نہیں ہوتی، میں طالب علم ہوں طالب علمانہ بات کرتا ہوں' یہاں سبق پڑھایا جا رہا ہے، بلا کتاب' توفیقِ الٰہی سے' فضلِ الٰہی سے' حضرت والا کی برکت سے' تو وہ صحابی تھے اور صحابی کے اندر اخلاص تو ہوگا نہیں؟ نعوذ باللہ' نعوذ باللہ۔ اگر اخلاص نہ ہوگا تو ریاکاری ہوگی، ان صحابی کے اندر' ظاہر ہے یہ کون کہہ سکتا ہے کہ صحابی میں ریاکاری تھی بلکہ یقیناً اخلاص تھا تو ان کی اخلاص والی نماز کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: قُمْ وَصَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ کھڑے ہوجاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ بیچارے اتباعِ رسول میں کھڑے ہوگئے اور دوبارہ نماز پڑھی، آپ ﷺ نے فرمایا قُمْ وَصَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ۔ کھڑے ہوجاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تین دفعہ اسی طرح ہوا۔ چوتھی مرتبہ جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو ان صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! تو اسی طرح پڑھنا آتی ہے، آپ تعلیم فرمادیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز کا طریقہ ارشاد فرمایا

کہ جب نماز کو کھڑے ہوؤ، تو تکبیر کہو، پھر جو قرآن آسان ہو اسے پڑھ، پھر اطمینان سے رکوع، پھر سیدھے کھڑے ہو جاؤ، یعنی اطمینان سے قومہ کرو پھر اطمینان سے سجدہ کرو، پھر اطمینان سے جلسہ کرو پھر تمام نماز اسی طرح کرو۔ ھکذا فی ابی داؤد ج ا ص ۱۲۴۔

جب اس صحابی نے اس طرح نماز پڑھی تو حضور ﷺ نے نہیں فرمایا کھڑے ہو جاؤ، نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی۔

سوال یہ ہے کہ پہلے بھی پڑھی تو حضور ﷺ نے فرمایا پھر پڑھو اور اس مرتبہ بھی پڑھی حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ پھر پڑھو، پہلی مرتبہ کیا کمی رہ گئی تھی۔

تو جواب یہ ہے کہ صدق کی کمی رہ گئی تھی، اس میں صدق نہ تھا یعنی جو آدابِ صلوٰۃ، سکونِ ارکان کے ہونے چاہئے تھے وہ نہ تھے۔ خشوع کا تعلق ہے قلب سے اور خضوع کا تعلق ہے جوارح سے۔ جیسے قلبؔ کے اندر سکون ہونا چاہئے، سکوت ہونا چاہئے کہ ادھر اُدھر کا سوچنا نہ ہونا چاہئے، ایسے ہی جوارح کے اعضاء کا اِدھر اُدھر ہونا بھی نہ چاہئے۔ حرکاتِ اعضاء مختلف قسم کی خلافِ وضع نماز چل رہی ہیں، تو یہ اعضاء کے سکون کے خلاف ہے۔ ہاتھ کبھی کہیں حرکت کر رہا ہے، حرکاتِ متعافہ کے خلاف کبھی یوں کر رہا ہے، کبھی یوں کر رہا ہے، قیام و رکوع و سجدہ کو جس طرح آنکھ جما کر ادا کرنا چاہئے تھا، اس طرح ادا نہیں کر رہا ہے، نہ ہاتھ قابو میں ہے، نہ آنکھ قابو میں ہے، یہ خضوع نہیں ہے۔ یہ خلافِ صدق ہے، ارکان کو جلدی جلدی ادا کر رہا ہے، ابھی رکوع میں پہنچ کر اعضاء کو سکون نہیں ہوا تھا، حرکت باقی تھی کہ جھٹ کھڑا ہو گیا۔ کھڑا ہونے میں جو اعضاء کو حرکت ہوئی تھی، ابھی اس کو سکون نہیں ہوا کہ سجدہ میں چلا گیا، سجدہ میں ابھی سکون نہیں ہوا تھا کہ بیٹھ رہا ہے، ابھی بیٹھنے کی حرکت ختم نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے سجدہ میں چلا گیا، یہ خلافِ صدق ہے کہ حکم کو اس کے جس درجہ اور آداب کے ساتھ ادا کرنا چاہئے تھا یہ اس طرح ادا نہیں کر رہا ہے، نماز

دوبارہ سہ بارہ پڑھنے کا حکم فرمایا، کیونکہ ان کی نماز میں صدق نہیں تھا۔

صحابی مذکور میں صدق کیوں نہ تھا ؟

یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ تو اسلام کے عاشق تھے' پھر اس صحابیؓ کی نماز میں صدق کیوں نہیں تھا؟ اس کے ایک جواب کی طرف تو اوپر اشارہ ہو چکا کہ ابتداءِ اسلام تھا' احکام آہستہ آہستہ تدریجاً نازل ہوئے ہیں' اب تک ان صحابیؓ کو صدق کی حقیقت معلوم ہی نہیں تھی جب علم ہو گیا تو صدق بھی آ گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ان صحابیؓ کو جس طرح نماز پڑھنے کا علم تھا' اس طرح نماز پڑھی تو جس صدق کے اپنے علم کے مطابق مکلف تھے اس کو بجالائے۔ علم سے پہلے اس کے مکلف ہی نہ تھے۔ لہٰذا کوئی شبہ نہیں۔ یہ میں نے صحابیت کے درجہ کو باقی رکھنے کے لئے عرض کیا ہے، پس ان کا وہی صدق تھا، عند اللہ مقبول تھا، مگر رسولِ پاک ﷺ ان کی مقبولیت کو بڑھانا چاہتے تھے۔ شیخ یعنی رسول اللہ ﷺ ان کے صدق کو اونچا اٹھا رہے ہیں' گویا فرما رہے ہیں کہ ابتداءِ اسلام کی وجہ سے تمہارے علم کے مطابق تمہارا صدق نہیں ہے' مگر علم عند اللہ میں صدق اور ہے، اس کمی کو پورا کیجئے، اس کا علم حاصل کیجئے۔

معلوم ہوا کہ علمِ شرع کا درجہ بڑا اونچا ہے، اس سے چھٹکارا نہیں لیکن علم حاصل کرنے کے لئے عربی ہی پڑھنا ضروری نہیں علم ہو چاہے جس طرح ہو جیسا اوپر بیان کیا عربی کی معتبر کتابیں پڑھ کر ہو یا اردو وغیرہ کی معتبر کتابیں پڑھ کر ہو یا کسی عالم سے پوچھ پوچھ کر ہو یا ایسے معتبر عالم کی مجلس میں بیٹھ کر ہو۔ حدیث شریف میں بھی طلبُ العلم فریضۃ اور اطلبُوا العلم وارد ہوا ہے طلبُ الکتب فریضۃ یا أُطلبُ الکتب نہیں وارد ہوا ہے۔ نیز علم پہلے ہی سے ہے اور تدوینِ کتب بعد میں ہوئی ہے ہاں کتابتِ قرآن وحدیث وہ حضور ﷺ کے زمانہ ہی میں شروع ہو گئی تھی، ہڈیوں پر لکھ لیا، پتوں پر لکھ لیا،

چمڑے پر لکھ لیا، خیر تو کتابت تو پہلے ہی تھی۔

کتابت زمانۂ مدید سے ہے :

ارے میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں غور سے سنو! کتابت تو سابق زمانہ ہی سے چلی آرہی ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں تمام اشیاء کو نازل ہونے سے پہلے ہی لکھ دیا ہے، اس کے بعد نزول ہوا ہے۔ تو قرآنِ پاک میں آیا ہے :

نٓ ۝ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝

اوّل نون ہے اور پھر واوٗ قسمیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قلم کی قسم کھا رہے ہیں۔ جہاں حق تعالیٰ نے اور چیزوں کی قسم کھائی ہے وہیں قلم کی بھی قسم کھائی ہے کہ دیکھو قلم کیسی چیز ہے؟ اور قلم کہاں ہوگا؟ اُنگلی میں اور اُنگلی کہاں ہوگی؟ ہاتھ میں اور ہاتھ کہاں ہوگا؟ ذات میں۔ اب یہ فقیر اس قسم کے متعلق کیا کہے، قلم کی کیا قسم کھائی نہ معلوم کیا کیا اس سے استلزام ہو رہا ہے۔ یہ قسم کن چیزوں کو مستوجب و مستلزم ہو رہی ہے؟

اُستاد کی انوکھی تقریر لکھ لینا چاہئے :

تو کتابت بھی ضروری ہوگئی' خاص کر ہمارے اس زمانہ میں کہ حافظے بہت کمزور ہیں اور بالخصوص ہم طالب علموں کے لئے اگر واقعی طالب علم ہے تو قلم کاپی ساتھ رکھے اور استاد کی انوکھی تقریر کو فوراً لکھ لے۔

طلب اور کسب میں فرق :

طالب علم اور ہے اور کاسبِ علم اور ہے۔ طالبِ علم کو بھلا اس کا کہاں موقع ہے کہ اس کا دل اِدھر اُدھر سوچنے لگے' اگر مطالعہ کی فرصت نہیں ہوتی وہ طالب علم نہیں ہے۔ یہ کاسبِ علم ہے۔ دیکھو! حلال وطیّب دنیا حاصل کرنے کے لئے باوجود طیّب ہونے کے

حدیث میں لفظِ کسب استعمال فرمایا ہے، لفظِ طلب کا استعمال نہیں فرمایا۔ ذرا سوچئے! پڑھنا، پڑھانا اتنا آسان کر رکھا ہے، کھیل بنا رکھا ہے پڑھنے، پڑھانے کو۔ حلال وطیّب مشغلہ کو لفظِ کسب سے تعبیر کیا ہے، طلب سے تعبیر نہیں کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

کسبُ الحَلال فریضةٌ بَعْد الفریضه۔ حلال کی تلاش کے لئے لفظِ کسب استعمال کیا ہے، طلب نہیں کیونکہ طلب کہتے ہیں اپنے آپ کو مطلوب کے اندر کھپا دینے کو اس طرح کہ کسی دوسری چیز کی طرف رُخ نہ ہو، اس میں لگنا اور لگانا اور کھپانا تو بھلا کہاں ہوسکتا ہے، یہ ہے فرق طلب اور کسب میں۔

معلوم ہوا کہ کسب صدق کو نہیں چاہتا، سرسریت کو چاہتا ہے اور طلب وہ فکر وغور کو چاہتا ہے، سرسریت کافی نہیں ہے، توفیقِ الٰہی، فضلِ الٰہی، میرے شیخ کی برکت، طلب و کسب کا فرق بیان کیا گیا کہ طلب فکر کو چاہتا ہے، کسب فکر کو نہیں چاہتا اور فکر ایک ہی ہے، پھر فکر علم کے ساتھ دوسری جانب کا فکر کیسا ہے؟ وہی در حقیقت طالب علم ہے، طالبِ تربیت ہے، طالب اخلاقِ حسنہ ہے، طالبِ وصالِ حق ہے؟ طالبِ وصول الی اللہ ہے، جو مطلوب کی طلب میں اپنے آپ کو کھپائے ہوئے ہے۔

کسب کے لئے اپنے آپ کو ذلت میں ڈالنے کی ضرورت ہے۔ جو شخص دنیا کا طالب ہے دنیا حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو کیسا ذلیل اور حقیر کرتا ہے اور کسی کی تذلیل اور تحقیر کی پروانہیں کرتا۔ تو اس کے مقابلہ میں طالبِ آخرت بھلا کسی بھی حقارت کی پروا کرے، یہ کیسے گوارہ ہوسکتا ہے؟ اور کسب کے اندر اپنے آپ کو ذلیل کرنا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: السّوالُ ذلٌّ ۔ سوال ذلت ہے۔

دیکھئے! دنیا کے حاصل کرنے کے لئے سوال کی اجازت نہیں دی کہ اس میں ذلت ہے۔ طالبِ آخرت کو کسی کی پروا نہ کرنا چاہئے کہ لوگ کیا کہیں گے؟

ایک سبق آموز واقعہ :

ایک قصہ حضرت [illegible] رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس شریف کا یاد آ گیا۔ ظہر کے بعد کی مجلس ہو رہی تھی کہ ایک صاحب آئے، ملاقات ہوگئی' باتوں باتوں میں ذکر آ گیا کہ میں نے ریل میں نماز نہیں پڑھی، حضرتِ والا نے پوچھا کیوں نہیں پڑھی؟ کہا کہ اس ڈبہ میں ہنود ہی ہنود تھے، مجھے یہ خیال ہوا کہ نماز پڑھوں گا، ان کے سامنے رکوع' سجدہ میں جاؤں گا' کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ ہنسیں' بس یہ سنتے ہی جلال آ گیا۔ فرمایا :

تو پھر یہ تو ہمارے ایمان پر بھی ہنستے ہیں تو ایمان کو بھی چھوڑ دو۔ مجلس سے اُٹھ جاؤ، مجلس سے اُٹھا دیا۔ میں نے یہ واقعہ بطورِ نظیر کے پیش کیا ہے۔ تو اہلِ دنیا' دنیا کے کمانے میں تو عزت، ذلت کی کچھ پروا نہیں کرتے، طالبِ آخرت اپنی عزت و ذلت کا خیال کرتا ہے۔ دیکھئے! دنیا مطلوب ہے، اس میں اپنے آپ کو کھپا رکھا ہے کہ جا رہا ہے کلکتہ' جا رہا ہے دہلی' جا رہا ہے مراد آباد' کہاں چیز سستی ملے گی، کہاں مہنگی ملے گی، سستی خرید کر مہنگی جگہ لے جا رہا ہے۔ مارا مارا پھر رہا ہے تو یہ دنیا کا طالب ہوا یا کا سب ہوا، نہ کھانے کی فکر ہے، نہ سونے کی فکر ہے، نہ گھر سے بے گھر ہونے کی فکر ہے کہ راستہ میں کیا ہوگا؟ پورا اپنے آپ کو کھپا رکھا ہے۔

طالبِ دُنیا سے طالبِ علم کو سبق :

تو طالبِ آخرت کو اس طالبِ دُنیا کے مقابلہ میں شرمانا چاہئے، غیرت آنی چاہئے۔ دیکھو! اس طالبِ دنیا نے اپنے جسم اور دل کو طلبِ دنیا میں کیسا کھپا رکھا ہے۔ اس کو دوسری باتوں کے سوچنے کی کہاں فرصت ہے؟ تو طالب علم کیسا طالب ہے کہ غیر علم کے سوچنے کی دل میں جگہ دینے کی فرصت ہوگئی۔ ہاں متقدمین صحیح معنیٰ میں طالب علم تھے' ذرا

ان کے واقعات کو سنو! ان کے واقعات کو دیکھو! کسے کہتے ہیں طالب علم؟ بات دور پہنچ گئی۔

گفتگو ہو رہی تھی اخلاص کی کہ جب اخلاص آ گیا تو یہ مخلص مجسم اخلاص طلبِ علم میں لگ گیا کیونکہ بلا تفصیلی علم کے اخلاص تو ہوگا' صدق نہ ہوگا، پھر صدق کے معنٰی بیان کئے تھے کہ عمل کو جس طریقہ سے کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے، اس درجۂ کمال سے بجالانا صدق ہے اور بدوں کمالِ آداب سیکھے ہوئے اس عمل کو کمال کے ساتھ ادا کرنا نہیں ہوسکتا' تو علم کا سیکھنا کس درجہ فرض ہوگا کہ کمالِ عمل جو فرض ہے اس کا موقوف علیہ علم ہے۔ علم نہ ہونے کی وجہ سے اس صحابی میں جن کی نماز کا واقعہ اوپر ذکر کیا گیا، اخلاص تو تھا صدق نہ تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ ابتدائے اسلام کا زمانہ ہونے کی وجہ وہ درجہ ان کا صدق ہی تھا، محمود تھا، مگر حضور ﷺ نے یعنی شیخ نے یوں چاہا کہ اس درجہ صدق سے آگے جو درجہ صدق ہے' وہ بھی حاصل ہو جائے، تو ہر عمل میں جیسے درجۂ اخلاص کا ضروری ہے، اس میں درجۂ صدق کا بھی ضروری ہے، ورنہ نقص رہے گا، اسی لئے پیغمبر کو بھیجا، تا کہ ہر عمل کو کر کے دکھلا دیں ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ پورا' صحیح لکھا ہوا قرآنِ پاک تختیوں پر لکھ کر اُتار دیتے کہ لو یہاں سے دیکھ لو مگر ایسا نہیں کیا کیونکہ ساری اسلامی زندگی عملی زندگی ہے تو یہ پیغمبر کر کے دکھلائیں گے جیسے یہ کریں، تم بھی کرو۔

پیغمبر کی نقل بھی باعثِ قرب ہے :

یہ الگ بات ہے کہ اصل تو پھر اصل ہی ہے لیکن یہ نقل بھی اصل کے قریب، قریب ہے اور جب قریب، قریب ہے تو قرب بھی ہے۔ ہم کو اسوۂ حسنہ کا مکلّف کیا گیا ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

تمہارے واسطے رسول اللہ ﷺ کا بہترین نمونہ ہے۔

آپ کی عملی زندگی، عملِ جوارح، عملِ مالی، عملِ اخلاقی، عملِ معاملاتی عملِ معاشرتی، عملِ عبادتی سب ہمارے سامنے ہے، آپ نے سب کچھ کر کے دکھا دیا۔ نقلاً بعد نقل نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اب جب یہ ہے کہ نقلاً بعد نقل ہوتا چلا آ رہا ہے تو اپنے جو اکابر ہیں' ان کے عمل کو دیکھو۔ اب رسول اللہ ﷺ کو عمل کرتے دیکھنا ممکن نہیں ہے لیکن آپ کے مطیع اور نائب موجود ہیں، ان کو دیکھنا لازمی ہے۔

علماء کی زندگی کیسی ہونا چاہئے ؟

یہاں سے اندازہ کیجئے کہ علماء کی زندگی کس نوعیت کی ہونا چاہئے، من حیث العبادۃ' من حیث المعاملۃ' من حیث المعاشرۃ، من حیث الاخلاق۔ اندازہ کیجئے، ان کے اعمال میں' ان کے اخلاق میں' ان کی معاشرت میں' ان کے معاملہ میں اخلاص بھی ہو اور صدق بھی ہو۔ نہایت خضوع' نہایت خشوع ہو اور یہ خشوع نماز ہی کے لئے مطلوب نہیں ہے' نماز میں تو خشوع مقبولیت کے لئے مطلوب ہے ورنہ یہ خشوع قلب کا ذاتِ باری تعالیٰ کو ہمہ وقت مطلوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے قلب غیر خاشع سے پناہ مانگی ہے۔ ارشاد ہے : اللّٰھم انّی اعوذبک من قلبٍ لایخشعُ۔

اے اللہ ! میں پناہ مانگتا ہوں ایسے قلب سے جس میں خشوع نہ ہو۔

اور خشوع کے بالمقابل قساوت اور سختی ہے اور یہ خشوع خشیت سے پیدا ہوتا ہے۔

ارشاد ہے : خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ۔ جب خشیت ہوگی باری تعالیٰ کی تو دل میں خشوع ہوگا یا قساوت ہوگی؟

سوچئے ! بات کہاں جارہی ہے توفیقِ الٰہی سے جب خشوع ہوگا تو خشیت ہوگی اور جب خشیت ہوگی تو خشوع ہوگا۔ اب سوچئے ہمارے اندر قساوت زیادہ ہے یا خشوع؟

ملائمت زیادہ ہے یا سخت دلی۔ ذاتِ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک کے اندر قساوتِ قلبی کو کفار کی طرف منسوب کیا ہے۔ واہ! اللہ میاں واہ! آیت دل میں ڈال دی۔

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ.

(حضرتِ والا پر اس وقت ایک حال طاری تھا، بار بار فرمایا واہ اللہ میاں واہ آپ نے آیت یاد دلا دی مجھ فقیر کو آپ کا شکریہ۔ از: مجشی) سنتے رہو میں کیا کہہ رہا ہو: الم یان للذین امنوا (الآیۃ) اے ایمان والو! اے مؤمنو! کب وقت آئے کہ تمہارے قلوب کے اندر خشوع پیدا ہو، کس وقت کا انتظار ہے، کونسی گھڑی کا انتظار ہے، اے مؤمنو! کیا ابھی تک تمہارے اندر خشوع پیدا نہیں ہوا، ذاتِ باری تعالیٰ نے مؤمن سے کس چیز کا مطالبہ کیا ہے خشوع یا قساوت کا؟ ظاہر ہے خشوع کا، ہمہ وقت کا یا صرف نماز میں؟ ہمہ وقت، سوچئے ذرا ! کیا اس علم کا یہ تقاضا ہے کہ تمہارے اندر قساوت ہو، اپنوں کے ساتھ بھی اور غیروں کے ساتھ بھی۔ جب گھر میں قدم رکھتا ہے تو قساوت کے ساتھ نہ کہ خشوع کے ساتھ۔ باہر قدم رکھتا ہے تو قساوت کے ساتھ نہ کہ خشوع کے ساتھ' کیا ایمان کا یہی تقاضا ہے؟ جس میں تم کہتے ہو کہ میں مؤمن ہوں' ہاں مؤمن تو ہو' مگر کمالِ رضا نہیں ہے، یہ نقص کا قصہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

ولاتکونوا کالذین اوتوا الکتٰب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم ط وکثیرٌ منھم فٰسقون ٥

یعنی کیا تم ان لوگوں کے مثل ہونا چاہتے ہو جن کو کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا' پھر ان کے قلوب سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت سے کافر ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ ان یہود و نصاریٰ کی طرح نہ ہو جانا جن کو کتاب دی گئی تھی، پھر انہوں نے اپنی کتاب کے حکم کے برخلاف شہوات و معاصی میں انہماک شروع کیا' پھر اسی

حالت میں زمانہ دراز گزر گیا اور توبہ نہ کی، پھر توبہ نہ کرنے کی وجہ سے ان کے دل بہت سخت ہو گئے کہ اضطراری ندامت و ملامت جو گناہوں پر ہوا کرتی ہے وہ بھی نہ رہی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس قساوت کی بدولت ان میں بہت سے آدمی آج کافر ہیں۔

سو اے مسلمانو ! تم ایسے مت ہونا اور گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ کر لینا' مبادا کہیں وہ معصیت منجر الی الکفر نہ ہو جائے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کا تقاضا خشوع ہے پس مؤمن کو خاشع ہونا چاہئے۔

یہ گفتگو اخلاص و صدق پر ہو رہی ہے' اللہ تعالیٰ مؤمن سے اخلاص و صدق دونوں کو چاہتے ہیں اور ان دونوں کا تقاضا خشوعِ قلب ہے جو ہمہ وقت ہونا چاہئے غفلت کیسی؟ اللہ تعالیٰ ہم سب مؤمنوں کو اخلاص اور صدق کے ساتھ تادمِ آخر قائم رکھیں۔ آمین ثم آمین۔

..................☆☆☆..................

چودھویں مجلس

اسلامی تہذیب اور صفائی

تدبیر کا بہانہ زیبا نہیں:

جب انسان دنیا میں آیا تو کیا تقدیر دیکھ کر آیا تھا کہ دنیا میں آ کر کہتا ہے کہ میں کیا کروں؟ میری تقدیر میں یہی تھا، میں تقدیر پر رہ کے مطابق جو کر رہا ہوں‘ تو کیا کسی کو یاد ہے کہ چلو اوپر سے نیچے کو، تقدیر کے موافق کام کریں گے‘ ہرگز نہیں!

اللہ نے اختیار دے کر بھیجا ہے:

بلکہ جو اختیار اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اس کو لے کر آیا ہے کبھی چڑھنے کا، کبھی اُترنے کا، کبھی چلنے کا، کبھی بیٹھنے کا، کبھی لیٹنے کا، کبھی کھڑے ہونے کا، تو جیسے چڑھنے، اُترنے میں، چلنے پھرنے میں، بیٹھے لیٹنے میں اپنے اختیار کو کام میں لا رہا ہے تو اطاعت میں بھی اس کو کام میں لائے۔

تصوّف کی حقیقت :

جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَ قُعُوْدًا عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۔(النساء:۱۰۳)

کہ کھڑے بیٹھے اور کروٹوں پر پہلے بھی اللہ کی یاد یعنی مامور بہا "کرنے کے اختیاری کام" ان کو کرتے رہو۔ منہی عنہا "ترک کرنے کے اختیاری کام" ان کو چھوڑتے رہو۔ بس ذرا دوسری چیز جو مانع ہو رہی ہے، اُمورِ اختیاریہ "مامور بہا" کے کرنے سے اس کا مقابلہ کرنا ہے اور اسی طرح جو منہی عنہا چھوڑنے کے ہیں' ان کے چھوڑنے میں کوئی چیز مانع آ رہی ہے۔ اس بلا کو ہمت اختیاریہ دفع کرنا ہے۔ بس یہ ہے تصوف۔

چار دن رہے صالح بن کر مصلح بھی ہو گئے اور وہاں چار سال رہے مگر صالح بھی نہیں ہوئے مصلح تو کیا ہوتا ہے؟

چلّہ کے مفید ہونے کی شرط :

کچھ لوگوں کو چلّے کرنے کا شوق ہو جاتا ہے، حدیث شریف میں بھی چلّہ کا ذکر آیا ہے، اس میں برکت ہے لیکن کب؟ جب کہ خلوص ہو، سوائے رضائے الٰہی کے اور کوئی اس میں کسی قسم کی نیت نہ ہو، بس دل میں فکرِ آخرت ہو، عظمت حق محبّت ہو۔ توفیقِ الٰہی سے صالح بھی بن گیا اور مصلح بھی بن گیا، پیر بن کر چلے گئے، لیکن کب؟ جبکہ پیَر تلے رہے۔

اُصول کی ضرورت واہمیت :

اُصول ہی کام دیں گے، مسائل فروع کب تک یاد رکھو گے یہ فروعی، جزئی "ایک خلق کا" تزکیہ کب تک کرتے رہو گے، اُصول کو پکڑ لو، سارے جزئیاتِ نفسانی کا علاج ہو گیا۔ مسائل تو بہت ہیں یہ اُصول ہیں تب چلو ایک چلّہ صحیح لیکن اس طرح سے کار آمد نہیں

ہوگا ایک چلّہ، جو عرض کر رہا ہوں اس طرح پر رہنے میں ایک چلّہ کافی ہوگا، ان شاء اللّٰہ تعالٰی ۔ کہ ذرا بائیں سے دائیں کو لانا ہے۔ بایاں شر ہے دایاں خیر ہے، بایاں نفس ہے، دایاں روح ہے، اور وہ بھی خیریت سے دائیں طرف تو بہ کرلے کہ بائیں سے دائیں کو لے آئے، اور کیا کرنا ہے؟ مثلاً آپ کو لیٹنا ہے ہوا چاہئے آپ کو، اور چارپائی ہے اندر، تو چارپائی کو اندر سے ہوا میں لانا اور ہوا میں سے پھر اندر لے جانا، اُٹھانا پڑے گی یا نہیں اُٹھانا پڑے گی؟ کھینچو گے؟ چلو کھینچ کر ہی سہی، مگر جب بھی اندر سے باہر لے جائیں گے تب بھی اُٹھا کر یا کھینچ کر لیجانا پڑے گی۔

ذکر لا الٰہ کا طریق :

ایسے ہی یہاں سے "بائیں چھاتی کے نیچے سے" دائیں طرف کھینچ کر لے آ ؤ، لا الٰہ کے لا کو یہاں سے دل کی طرف کھینچو لا کو کاٹتا ہوا اور پھر الٰہ کو کھینچو، ادھر لا ؤ روح کی طرف دائیں طرف اور پھر "ہا" "کہدو" "ہا" کہتے ہی سب غیر اللہ پیٹھ کے پیچھے پھینک گئے اور پھر اِلا اللہ کہو، بس اللہ میاں آ گئے ۔ کیا سمجھے؟ مخلوق گئی اور خالق صاحب الجلال و صاحب الجمال بجمال وجلال آ گئے، اس طرح لا الٰہ الا اللّٰہ کا ذکر ہے، تب آتا ہے مزا، جب تک ذرا جہر نہ ہو اور جب تک ذرا پوری ضرب نہ ہو کیا ذکر ہے؟ ہاں یہ تسبیح تو ہے تعلق مع اللہ کے لئے، مگر جو تاثیر کلمۂ طیبہ میں طیب ہونے کے لئے ہے جب تک اس طرح ذکر نہیں کرے گا طیب نہیں بنے گا۔ یہ کلمۂ طاہرہ بھی ہے اور کلمۂ طیبہ بھی ہے، تو تسبیح سے طاہرہ تو ہو جاوے گا، مگر طیبہ جب ہوگا جب اس طرح ذکر کیا جائے جو اوپر ذکر کیا گیا۔

طیب کے معنیٰ ہیں لذیذ، مزیدار جبھی تو اس کا کلمۂ طیبہ نام رکھا نہ کہ کلمۂ طاہرہ؟ یہ کلمۂ طاہرہ پہلے ہے، طیبہ بعد میں ہے، پاکی پہلے ہے مزیداری بعد میں۔

یہ کلمہ طیبہ بھی ہے اور طاہرہ بھی :

جب لا الٰہ کہا طاہر بن گیا جب اِلا اللہ کہا طیب بن گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ جب لا الٰہ کہا مخلوق گئی جب الا اللہ کہا خالق آ گیا، جب مخلوق گئی طاہر ہو گیا، جب خالق آیا طیب ہو گیا، تو لا الٰہ اللہ کے ذکر کے اندر طاہر ہونا بھی ہے اور طیب ہونا بھی ہے۔

ذکر کے اثر کا اُصول :

یہ اُصول سمجھنا ضروری ہے کہ اختلاط سے بچتے رہو، خلط ملط اچھی بات نہیں، دیکھو! شوربا بہترین ہے، ذرا قطرہ پیشاب کا گر گیا ناپاک ہو گیا، سب بیکار ہو گیا اور ذرا کرکراپن شوربے میں آ گیا کہ مصالحہ کی سل کو اچھی طرح دھویا نہیں تھا، اس پر مٹی ریت کا اثر تھا، اسی پر کوفتوں کے لئے گوشت پیس لیا، مصالحہ بھون کر کوفتے بنا لئے، جب لقمہ لے کر کوفتے میں سے منہ میں رکھا تو کرکراپن، تو شوربا تو بڑا خوشبودار ہے، خوش رنگ ہے، مگر خوش ذائقہ نہیں۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کی لطافت کی حکایت :

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خادمِ خاص مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ جو بعد میں مہتمم دارالعلوم دیوبند بنے۔ آخر میں مولانا یحییٰ صاحبؒ بھی خادمِ خاص رہے، تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب چائے بنا کر پلایا کرتے تھے۔ حضرت والا نے ایک مرتبہ کا واقعہ سُنایا کہ چائے بنا کر لائے، مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ کچھ کچے پن کی بو آ رہی ہے، دوسرے دن چائے بنا کر لائے تو کہا آج نہیں ہے کچاپن، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سوچ میں پڑ گئے بیچارے، کہ جس طرح چائے کے برتن' چائے دانی' دودھ دانی' پیالی دھویا کرتا تھا' آج بھی اسی طرح دھوئے ہیں' یہ آج فرق ہوا تو کیوں ہوا،

غور کرتے رہے، غور کرتے کرتے سمجھ میں آیا کہ جب پہلے برتن دھویا کرتا تھا تو جو پانی ٹپکتا رہ جاتا تھا، میں اس کو ہاتھ سے پوچھ دیا کرتا تھا لیکن آج جو میں نے دھوئے تو دھو کر تولئے سے صاف کئے تو اس کی تری باقی نہیں رہی اور پہلے تری باقی رہ جاتی تھی، اس لئے آج فرما رہے ہیں کہ کچا پن نہیں ہے۔ یہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی لطافتِ مزاج کی بات ہے کہ اتنی تری بھی محسوس ہوگئی۔

اختلاط کا اثر :

تو دیکھئے مٹی کے اثر سے کرکرا پن آ گیا اور پانی کے اثر سے کچا پن رہ گیا۔ یہ ہے اختلاط کا اثر، تو اسی طرح لوگوں کے پاس اُٹھنے بیٹھنے کا خلط ملط کا اثر یہ ہے کہ آنکھیں بھی کچھ خراب ہونے لگیں، کان بھی خراب ہو چلے، زبان بھی آزادانہ چلنے لگی، کیوں؟ اس لئے کہ وہ جو توفیقِ الٰہی سے شیخ کے پاس رہ کر حاصل ہوا بھی تھا، اب وطن پہنچ کر خلط ملط ہونے لگا۔ اتنا پکا رنگ نہیں تھا کہ اس پر غیر کا اثر نہ آوے، جب آپ کا لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہوا تو لحاظ آنے لگا، تو لحاظ و رعایت میں وہ کیفیت جو طاہر و طیب ہونے کی تھی، لحظہ بلحظہ جانے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں جو شخص کہ حکمت لے کر گیا ہے حکمت کے ساتھ بدلحاظ بن گیا۔

اختلاط سے بچنے کی ایک تدبیر :

میرے پاس خطوط آتے ہیں بیچارے بعض مدرسین لکھتے ہیں "دلوں میں خلوت کی محبت ہوگئی تھی، دوسرے مدرسین آ کر بیٹھ جاتے ہیں، مجھے تنگ کرتے ہیں' اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں' میں کیا کروں؟"

میں نے لکھ دیا کتاب لے کر بیٹھ جاؤ جب اِدھر اُدھر کی بات شروع کریں تو کہو اوہو! بھئی کتاب دیکھ رہا تھا بہت اچھا مضمون نظر آیا اور انہیں سُنانا شروع کر دو، شوق ہوگا

بیٹھیں گے ورنہ کہے گا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں' پھر ان شاءاللہ حاضر ہوں گا۔ اس تدبیر سے چلا جائے گا یا تو پھر آئے گا نہیں اور اگر آئے تو جب دو تین دفعہ اس طرح دیکھے گا تو پھر کہنا بھی نہ پڑے گا۔

علم کا تقاضا خلوت کی محبت ہے :

بشرطیکہ اپنے اندر خلوت کی محبت ہو، اور ہونا چاہئے کہ حبب الیہ الخلاء پہلے ہی بخاری شریف میں پڑھایا جاتا ہے۔ جب حضورِ اکرم ﷺ کو خلوت محبوب ہوئی اور خلوت کے ذریعہ سے آپ کا دل جب بنا دیا تب کہیں جا کر بذریعہ وحی علمِ قطعی کا نزول ہوا۔ حالانکہ حضورِ اکرم ﷺ کو آدم علیہ السلام سے (یاد پڑتا ہے) تقریباً تین ہزار برس پہلے نبوت مل چکی تھی، آدم علیہ السلام تو بعد میں پیدا ہوئے مگر اس عالم میں ساری چیزیں آنے والے شاہ کے لئے بہترین طریقہ سے مکمل ہوگئیں، تب ظہور من حیث الجامعیت اس عالم کے اندر آپ کی نبوت و رسالت کا ہوا' لیکن جب تک حضور ﷺ نے پہلے عبادت خلوت کے ساتھ نہیں کر لی اور خلوت سے جب تک محبت نہیں ہوگئی تب تک وہ علوم قطعی بذریعہ وحی آپ پر نازل نہیں ہوئے۔

بلا محبت خلوت علوم مخصوصہ کا ورود نہیں ہوسکتا :

اور ہم طلبہ اور اہلِ علم یوں چاہ رہے ہیں کہ وحی بمعنیٰ وارد، کشف، فراست، الہام بلا خلوت کی محبت کے نازل ہونے لگے ......ع این خیال است ومحال است وجنوں یہ خیالی پلاؤ ہیں' جب نبی جس کی خاطر جہاں' زمین' آسمان' سب کچھ پیدا کیا، جب اُن پر علوم بدون محبتِ خلوت کے نازل نہیں ہوئے تو کیا ہم پر نازل ہوجائیں گے؟ ہرگز نہیں، ہاں کچھ الفاظ و نقوش معلومات کی حیثیت سے حاصل ہوجائیں گے، علم تو نازل

ہونے سے رہا۔

عالم' جاہل برابر نہیں ہو سکتے :

عالم اور جاہل برابر نہیں ہوتا، عالم جاہل برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ نہ یہاں دنیا میں برابر' نہ وہاں آخرت میں برابر' عالم یہاں بھی برتر' وہاں بھی بہتر' حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ ط
اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ o

کیا علم والے اور جہل والے کہیں برابر ہوتے ہیں، لیکن وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہلِ عقلِ سلیم ہیں۔

حدیث میں آیا ہے : **فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم۔**
عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تمہارے ادنیٰ شخص پر' تو عالم کی بڑی فضیلت ہے۔

علماء کی عملی کوتاہی نہیں دیکھنا چاہیئے :

تم مولوی صاحب کی طرف دیکھتے ہو کیسے کام کرتے ہیں اور اپنے کو نہیں دیکھتے کہ تم بھی تو جاہل ہو، انہیں تو خبر ہے کہ جو کام میں کر رہا ہوں حق تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اور تجھے تو یہ بھی خبر نہیں تو تُو توبہ کیسے کرے گا اور وہ تو نادم ہے توبہ بھی کرے گا، اُسے معلوم ہے کہ میں بیمار ہوں علاج کرے گا اور تو بیمار ہے تجھے بیماری کی خبر نہیں تو علاج کیسے کرائے گا؟

تو عالم بہر حال بہتر ہی بہتر ہے اگر چہ اس سے گناہ بھی ہو جائے وہ گناہ کو گناہ سمجھے گا اور جاہل گناہ کو گناہ نہیں سمجھے گا گناہ پر اصرار رکھے گا اور عالم تائب ہوگا، توبہ کرے گا، اور حدیث میں ہے :

التائب من الذنب کمن لاذنب لہ۔

گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ گویا اس نے گناہ ہی نہیں کیا۔

تو اوّل تو بہت مشکل ہے کہ عالم جہنم میں جائے اور اگر بالفرض جائے گا تو جہنم سے نکل کر پھر بہت اونچا مقام پائے گا۔

اے عالمو ! اپنے آپ کو پہچانو :

تو اے عالمو ! اپنے آپ کو پہچانو! جب تم اپنے آپ کو نہیں پہچانو گے تو دنیا میں تمہیں مخلوق کیسے پہچانے گی، پہلے اپنے کو پہچانو۔ طالبانِ علمِ دین نے اپنے کو پہچاننا چھوڑ دیا، اگر تم اپنے آپ کو پہچانتے تو دوسرے تو دیکھتے ہی پہچان لیتے۔

جب تک گانے والے کو اپنا گانا خود پسند نہیں آوے گا، سُننے والے کو بھی وہ گانا پسند نہیں آوے گا، مشہور ہے کہ جب ناچنے والی کو اپنا ٹھمکا پسند نہیں آوے گا تو دوسروں کو کیا پسند آوے گا۔ یہ مثل مشہور ہے۔

مجالس میں بیٹھنا کب مفید ہے ؟

مجالسِ اصلاح میں بیٹھنا چاہئے، بشرطیکہ اعتمادِ کامل اور اعتقادِ جازم بھی ہو، اس سُنانے والے پر، تب آکر بیٹھنا چاہئے، ورنہ نہیں بیٹھنا چاہئے کہ اور زیادہ بگڑنے کا اندیشہ ہے کیونکہ بہت سی بات سمجھے گا تو ہے نہیں نہ معلوم کیا گڑبڑ کرے اور غلط سمجھ جاوے، سُنانے والے پر پورا اعتقاد ہو، جب آکر بیٹھے ورنہ نہیں بیٹھنا چاہئے، اگر اعتماد و اعتقاد نہیں ہے تو بجائے سنورنے کے اور بگڑے گا، اس لئے بھی بعض سے پوچھ لیتا ہوں کہ پوری مجلس کے اندر بیٹھو گے یا بیچ میں اُٹھ جاؤ گے، اگر کہتا ہے بیچ میں جاؤں گا تو کہہ دیتا ہوں جاؤ ابھی جاؤ تمہیں بیٹھنا جائز نہیں جب تک کہ پوری مجلس کے اندر نہ بیٹھے، بیٹھنا جائز نہیں۔

عالمگیرؒ کی حکایت :

بادشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مجلس میں ایک صاحب ادھورے وعظ میں اُٹھ کر چلے گئے تھے، انہوں نے ادھوری بات سُنی تھی، لوگوں سے غلط بیان کردی، حالانکہ اس بات کے متعلق پورا بیان آگے آرہا تھا، اس کو سُنا نہیں، اس لئے غلط بیانی ہوگئی۔

عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو چونکہ بادشاہ ہیں اس لئے اعلان کر دیا کہ وہ وعظ کے اندر بیٹھے جو اخیر تک بیٹھے ورنہ نہ بیٹھے، یہ واقعہ حضرتِ والا نے سُنایا تھا۔

علماء نے اپنا مقام چھوڑ دیا ہے، اس لئے عوام کو موقع مل گیا ہے ورنہ مسئلہ ہے کہ امام کے پیچھے وہ کھڑا ہو جو صاحبِ علم ہو، علمِ دین رکھتا ہو، اب تو بڑھ بڑھ کر امام کے پیچھے جاہل کھڑے ہوتے ہیں، مسئلہ ضرور ہے' مگر زمانہ فتنہ کا ہے، زمانہ اضمحلال کا ہے، کچھ نہیں کہا جاسکتا، وہ تو جاہل ہے، عالم پر رُعب دکھاوے گا۔

اسی طرح مسئلہ ہے کہ صف امام کے دونوں جانب برابر ہو، اگر دائیں جانب کچھ زیادہ ہوں تو کوئی بات نہیں، بائیں جانب زیادہ نہ ہوں۔ امامت ایک منصب ہے، امام کو چاہئے کہ دائیں بائیں دیکھے، صف کو درست کرے، اسی لئے امام بااثر ہونا چاہئے، چار پیسے کا امام نہیں۔ "یہ علوم ہیں شریعت کے یہ اصول ہیں"۔

تو حضرت والاؒ نے بائیں جانب جو صاحب تھے ان سے فرمایا آپ ذرا دائیں جانب آجایئے وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے، کہنا نہیں مانا، بگڑ گیا موڈ، پھر ایک اور صاحب جو کچھ جان پہچان کے تھے وہ نظر آگئے تو اُن سے کہا، یہ تو ہٹتے نہیں آپ ہی آجایئے گا، وہ بیچارے چلے گئے، سمجھے آپ یا نہیں سمجھے؟

یہ حضرت والا کے زمانے کا قصہ ہے اور اب تو یہ زمانہ اور زیادہ فتنہ کا ہے، اب تو جاہل اپنے آپ کو عالم سے اچھا سمجھ رہا ہے، سب سے پہلے مسجد میں چلا جاتا ہے، چلا جانا

ہی چاہئے اور عالم صاحب کو فرصت نہیں ہے مسجد میں سب سے پہلے جانے کی، دین کا کام کر رہے ہیں، خدمتِ خلق میں لگے ہوئے ہیں، وہ جاہل سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے، زمانہ فتنہ کا ہے، کہہ کر دیکھ لو منہ کی کھانی پڑے گی، اس لئے خاموش رہے۔

زمانۂ فتنہ میں خاموشی اُصولِ شریعت سے ہے :

یہ بھی اُصول ہے شریعت کا کہ جب ذرا فتنہ کا اندیشہ ہو تو خاموش ہو جاؤ، بولو مت چپ چاپ رہو، ورنہ اپنے منہ کی کھانی پڑے گی۔

جامعیت سے کام چلتا ہے :

امر بالمعروف میں بڑی فضیلت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر۔ (آلِ عمران:۱۱۰)

امر بالمعروف پکارتے پھرتے ہیں لیکن صرف ایک آیت سے کام نہیں چلتا، ساری آیتوں کو ملا کر کام چلتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث شریف سے کام نہیں چلتا، اس ایک حدیث کے متضاد دوسری ساری حدیثوں کو ملا کر کام چلتا ہے، بعض کی عادت ہوتی ہے کہ کہیں کتاب میں کچھ دیکھ لیا، اب سب کو دکھاتا پھرتا ہے اور دوسری جگہ اس کے خلاف مل جاوے، تو پھر کیا ہوگا؟ جو پڑھو سمجھ کر پڑھو، ہدایہ جو پڑھائی جاتی ہے، وہ کتاب بہت عجیب و غریب ہے، وہ فیصلہ کی اور حکم کی کتاب ہے، وہ عدالت کی کتاب ہے، ایک انگریز کہتا تھا کہ اگر ہدایہ (جو عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے) نہ ہوتی تو ہم عدالت کا کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایسی کتاب ہے، انگریز یوں کہہ رہا ہے، اور ہم آج پڑھنے والے پڑھانے والے، جس طرح پڑھنا چاہیے، اس طرح نہیں پڑھ پا رہے۔

سفرِ لندن کا واقعہ :

حضرت والا مسیح اللہ خانؒ جب لندن گئے تھے تو لندن میں دو یونیورسٹیاں جو بہت بڑی ہیں اور کیسا اونچا ان کا نام ہے دونوں یونیورسٹیوں میں تشریف لے گئے، ایک انگریز ان کے ساتھ تھا اور چابی اس کے پاس تھی، وہ کمرے کھولتا رہتا تھا دکھاتا رہتا تھا، دونوں یونیورسٹیوں کا کتب خانہ دیکھا بڑا اونچا، کئی منازل پر مشتمل، ہماری عربی کی ساری کتابیں وہاں موجود تھیں، ایک کتاب کے کئی کئی نسخے موجود تھے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ''بیان القرآن'' بھی وہاں موجود تھی، مثنوی شریف کی شرح ''کلید مثنوی'' بھی، جو ہمارے یہاں عربی کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ سب وہاں موجود تھیں، اور ایسے ایسے موٹے موٹے رجسٹروں میں کتابوں کے نام درج تھے، دو منزلہ پر جا کر میں تھک گیا، تیسری منزل پر وہ انگریز لے جانے لگا، میں نے کہا اب تھک گیا ہوں اب میں اوپر نہیں چڑھ سکتا۔

بہر حال دونوں کو جا کر دیکھا وہاں بورڈنگ جس میں لڑکے رہتے ہیں۔ کیا پوچھو کتنا صاف' کتنا شفاف تھا۔ انتظام ایسا کہ باہر کا ملنے والا، دار الاقامہ میں آ کر نہیں مل سکتا، باپ بیٹے سے نہیں مل سکتا، اپنی آنکھوں سے دیکھا' دربان موجود ہے، وہ پوچھتا ہے، کس سے ملنا چاہتے ہو؟ اپنے لڑکے سے، اس نے کہا بہت اچھا، گیا اور اس کے لڑکے کو بلا لایا' اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کا لے جانا ضروری ہو، تو کہتا ہے آئیے میرے ساتھ، لڑکے کو اطلاع کی، لڑکا اپنے کمرے میں جہاں رہتا ہے وہاں سے دوسرے کمرے میں جو خالی ہے چھوٹا سا، وہاں بیٹھ کر باپ سے باتیں کر رہا ہے، یا آگے برآمدہ بنا ہوا ہے، جیسے ہمارے یہاں برآمدہ ہوتا ہے، وہاں جاؤ، وہاں بھی میز کرسی ہے، وہاں تو نیچے بیٹھنے کا سوال ہی نہیں ہے۔

باپ بیٹے سے بھی دار الاقامہ میں اس کمرہ میں جا کر نہیں مل سکتا، یہاں تو ویسے ہی معاملہ ہے۔

یہ دیکھا ہم نے جا کر وہاں...... تو کتب خانہ کو بھی دیکھا، طلبہ کو بھی دیکھا اور دربان کو بھی دیکھا، کنجی بر ، کلید بردار ہمارے ساتھ تھے، نیز یونیورسٹی دیکھنے کے لئے پاس لینا پڑا، یہ نہیں یونہی چلے جاؤ، اور جا کے مدرسہ کے اندر گھس جاؤ، نہیں، دربان روکے گا، پوچھے گا، آپ کے پاس اجازت نامہ ہے؟ اگر نہیں ہے تو مہتمم صاحب انگریزی میں پرنسپل صاحب سے کہتے ہیں، ان سے اجازت لے کر آؤ۔ ہمیں یہ طریقہ معلوم تھا، اس لئے پہلے اجازت لے لی گئی تھی، جب دیکھنے گئے تھے ہم۔

سفرِ مصر:

مصر بھی گیا، مصر کی یونیورسٹی جو دارالسلطنت قاہرہ میں ہے وہاں پہنچا۔ بڑی لمبی چوڑی یونیورسٹی ہے، ایسی کہ کیا ہی کہنا وہاں جانے کی بھی اجازت لینی پڑی حالانکہ عربی درسگاہ ہے وہاں پر بھی ایک ہماری جان پہچان کے تھے وہ گئے کہ ہندوستان کے ایک ''ایسے ایسے'' شخص آئے ہوئے ہیں، یونیورسٹی دیکھنا چاہتے ہیں، اجازت مل گئی اندر گیا جب اندر پہنچا تو درس ہو رہا تھا، جو مدرس پڑھا رہے تھے ہمارے ساتھی نے ان سے اندر جا کر کہا کہ ہمارے شیخ ہیں، درسگاہ میں آ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھو! یہ ہوتی ہے تہذیب، بڑے بڑے ہوتے ہیں، وہ تقریر چھوڑ کر، فوراً اُٹھ کر باہر مجھے لینے کے لئے آئے، اور پھر درسگاہ میں لے گئے، سینکڑوں لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، سمت بہ سمت تاکہ اپنے استاد کو دیکھ سکیں، جب میں اندر پہنچا، سب لڑکے کھڑے ہو گئے، بڑے شاندار لڑکے، بڑے بہترین لباس والے لڑکے، سب نے کھڑے ہو کر خوشی کی تالیاں بجائیں جوان لوگوں کا طریق ہے، مجھے ناگوار ہوا، تو میں نے ان کے استاد سے کہا:

''التصفیق للنساء و التکبیر للرجال''۔

تالیاں عورتوں کے لئے ہیں، مردوں کے لئے نہیں مردوں کے لئے تکبیر ہے۔

تو استاد نے کہا: ہندوستان کا شیخ یوں کہتا ہے، فوراً لڑکوں نے اس کا بدل کیا۔ نعرۂ تکبیر' اللہ اکبر۔ ان کی تہذیب دیکھی! فوراً بدل کیا، اسے کہتے ہیں تہذیب، اور ہمارے عربی پڑھنے والے لڑکے تو بڑے لوگ ہیں، بڑے خاندانی لوگ ہیں، مہذب لوگ ہیں، آداب کو سمجھتے ہیں، یہاں تو گاجر، مولی ہیں' یہ کیا سمجھیں تہذیب کسے کہتے ہیں۔

وہاں کے حالات جو میں عرض کر رہا ہوں، یہ سب ہمارے یہاں کے ہیں، مطالعہ سے انہوں نے اختیار کیا، دنیاوی نقطۂ نظر سے انہوں نے فائدہ اُٹھایا اور ہم خالی ہو گئے، اگر ہمارے یہاں کوئی بڑا شخص آ جاوے، اور مہتمم صاحب ان کو مدرسہ دکھلانے اپنے ساتھ لاویں تو لڑکے حجروں سے نکل نکل کر دیکھ رہے ہیں کہ کون ہیں جیسے کوئی تماشے والا آ گیا ہو، کمروں سے، برآمدوں سے نکل نکل کر دیکھ رہے ہیں اور وہاں ایسا نہیں، سب اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں، درس نہیں ہو رہا مگر اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے کمروں سے نکل کر کوئی نہیں دیکھتا۔

مطالعہ کا شغف:

لندن کی یونیورسٹی میں ہم کتب خانہ میں گئے، کتب خانہ کے اندر دو انگریز ایک عورت اور ایک مرد مطالعہ کر رہے تھے، میں اس کمرہ میں گیا جس میں مطالعہ کر رہے تھے، حالانکہ وہ میرے قریب تھے، لیکن ایک نے تو آنکھ سے یوں کر کے بھی نہیں دیکھا، ایک نے ذرا یوں کر کے دیکھا بس فوراً اپنے کام میں لگ گیا۔ دیکھتا نہیں رہا اور یہاں عربی مدرسوں میں برابر دیکھ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تماشہ والا آ گیا۔

غیروں کے اچھے طریقہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے:

نصرانی تہذیب دیکھی آپ نے؟ یہ شرمانے کی شرمندہ ہونے کی بات ہے کہ

نہیں؟ اور ہے یہ ہمارے گھر کی چیز، انہوں نے مطالعہ سے اختیار کرلی، ان کو ہم مہذب کہہ رہے ہیں، اپنے کو بدتہذیب کہہ رہے ہیں، کبھی جا کر کمرے دیکھ لو کتنے صاف ملیں گے۔

خیر! کمرے جیسے بھی ہیں کچھ تو صاف رہنا چاہئیں یا کوڑا کباڑ رہنا چاہئے؟ جا کر دیکھ لو ! بستر بھی ٹھیک نہیں ملے گا، تکیہ بھی ٹھیک نہیں ملے گا، اُلٹا سیدھا پڑا ہوگا، جہاں بیٹھیں گے جوتے بھی وہیں اُتار رکھے ہوں گے، چوکھٹ سے باہر بھی نہیں چوکھٹ سے اندر اُتار رکھے ہیں۔ سمجھے مولوی صاحبان ! غلط تو نہیں کہہ رہا؟ اگر غلط کہہ رہا ہوں تو آپ وہاں رہتے ہیں، دیکھ لیجئے گا، یہ باتیں سننے کی ہیں اور غیرت کھا کر اپنے گھر کی چیز اختیار کر کے ایسے بننے کی ہیں، مگر کچھ احساس ہی نہیں ہوتا، بولنا بھی نہیں آتا، وہاں پر مدرسہ کے اندر کوئی باہر کا آدمی بلا اجازت جا نہیں سکتا، یہاں اگر روک دیں، دربان منع کردے تو بگڑے گا اور کہے گا کہ اس میں اجازت کی کیا بات ہے؟ یوں سمجھے ہیں کہ مدرسہ میرا ہے اور اگر چندہ دے دیا تو پھر تو یوں سمجھے کہ میں مالک کل مدرسہ کا ہوگیا اور اگر کہیں روٹی دے دی کسی طالب علم کو، تو بس، پھر کچھ مت پوچھو، پھر تو یوں سمجھے، کہ میں آقا بن گیا اس طالب علم کا، اُسے اپنا غلام سمجھنے لگا، یہ تہذیب ہے؟ مگر وہاں باپ بھی بیٹے سے کمرہ میں جا کر نہیں مل سکتا، مدرسہ کے اندر بھی داخل بلا اجازت کے نہیں ہوسکتا۔

یہ ہمارے گھر کی باتیں ہیں، کیا قرآن شریف میں نہیں ہے؟

یا یھا الذین امنوا لاتدخلو ابیوتاً غیر بیوتکم حتّٰی تستانسوا وَ تسلموا علٰی اھلھا ط ذلکم خیر لکم لعلکم تذکرون o

اے ایمان والو! تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو، جب تک کہ (اُن سے) اجازت حاصل نہ کرلو اور (اجازت لینے سے قبل) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو، یہی تمہارے لئے بہتر ہے، یہ بات تم کو اس لئے

بتلائی ہے تا کہ تم خیال رکھو (اور اس پر عمل کرو)۔

ادارہ بھی ایک گھر ہے :

تو یہ ادارہ جو ہے یہ ایک گھر ہے، آخر آپ بلا اجازت کیوں آئے مدرسہ کے اندر، ہم نے مانا کہ آپ اسی محلہ میں رہتے ہیں' مگر مدرسہ کے اندر بلا اجازت کیسے آئے؟ ہاں دربان کس لئے ہے، آپ نے اس سے کہا ہوتا، وہ مہتمم صاحب کی اجازت لیتا جب آپ اندر آتے، یہاں تو محلے کے لڑکے کھیلتے ہیں، مسجد کے سامنے میدان ہے وہاں کھیلتے ہیں اور اندر جا کر بھی کھیلتے ہیں اگر منع کردو، تو ابا جان آ جائیں لڑنے کے لئے، جیسے مدرسہ کیا ہے' یہی ہمارا گھر ہے۔ یہ دیکھ کر آیا ہوں میں مصر کی یونیورسٹی اور لندن کی یونیورسٹیوں میں۔

وہ مہذب لوگ ہیں، یہاں تو سارا محلہ غیر مہذب ہے، کس کس سے لڑائی مول لیں۔ ان کو چاہئے تھا کہ اپنے لڑکوں سے کہتے کہ "تم کیوں جاتے ہو مدرسہ میں کھیلنے، کرکٹ کھیلتے ہو، وہ مدرسہ ہے یا چوپال، مدرسہ ہے یا بازار، تم کیوں گئے مدرسہ میں۔ اگر مدرسہ میں جاؤ تو پڑھنے کے لئے جاؤ، کھیلنے کے لئے کیوں گئے؟"

یوں منع کرتے، مگر ماں باپ میں سے تو کوئی منع نہیں کرتا اگر مدرسہ والا کہہ دے تو لڑائی مول لے لو، کیا یہ باتیں سننے کے نہیں ہیں؟ اجی غت ربود ہو رہا ہے۔

باپ کو بھی گھر میں بلا اجازت نہیں جانا چاہئے :

اہلِ علم بھی' پڑھے لکھے بھی' قرآن شریف پڑھے ہوئے بھی گھروں میں بلا اجازت داخل ہوتے ہیں حالانکہ مسئلہ ہے کہ گھروں میں اجازت لے کر داخل ہونا چاہئے، حتیٰ کہ باپ کو بھی گھر میں اجازت لے کر جانا چاہئے، نہ معلوم لڑکیاں کس حال میں بیٹھی ہیں، گھروں میں اجازت لے کر داخل ہونا کیا یہ سلوک کا سبق نہیں ہے؟

پوری شریعت سلوک کا سبق ہے :

کیا لا الہ الا اللہ کی تسبیحیں اور نفلیں پڑھنا ہی خالی تصوف اور سلوک و شریعت رہ گئی؟......بس تسبیح پڑھتے رہو، بیٹھے بیٹھے اور جو چاہے کرتے رہو؟ پہلے آدمی بنو، وظیفہ پھر پڑھنا۔ ابھی ذکر ہوا کہ باپ کو بھی اجازت لے جانا چاہئے، میاں بھی گھر میں بلا اجازت جاسکتا ہے، نہیں شاید کوئی اجنبی عورت بیٹھی ہو یا عورت ہی اس حال میں بیٹھی ہو کہ شوہر کو دکھانا پسند نہیں کرتی، پہلے پوچھو، تب داخل ہو، یہ ہمارے گھر کی تعلیم ہے، لیکن ہمارے گھر کی تعلیم سے فائدہ وہ لوگ اُٹھا رہے ہیں۔ جن کے پاس ہماری کتابیں ہیں، ان کا مطالعہ کرتے ہیں، اس لئے انگریز اس کو اختیار کرتے ہیں، جب انگریز گھر میں آئے گا تو گھنٹی بجائے گا، اندر سے گھنٹی کا جواب آوے گا' تب جاوے گا۔

وقت کی پابندی کا سبق :

زمانہ حکومتِ برطانیہ میں کسی نواب، رئیس سے انگریز کو ملنا ہوتا تو وقت مقرر کیا جاتا۔ چنانچہ فلاں وقت آئے گا۔ اب وہ انگریز پہنچ گیا، دروازہ پر گھنٹہ لگا ہوا ہے، گھنٹہ دیکھا، ابھی وقت ہوا نہیں چند منٹ باقی ہیں، دروازہ پر کرسی رکھی ہوئی ہے، وہیں بیٹھ گیا، اس سے پہلے اطلاع بھی نہیں کرسکتا، اندر تو کیا جاتا۔ یہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ ہاں وقت ہوگیا، گھنٹی بجادی جو باہر لگی ہوئی ہے، اب اندر سے اجازت آئی تو انگریز ملنے کے لئے اندر جارہا ہے۔

قانون کی پابندی کا سبق :

میں علی گڑھ بڑے ڈاکخانہ میں گیا، میں نے اندر جا کر جو کام تھا وہ کیا، اتنے میں ایک انگریز بائی سائیکل پر آیا، بائی سائیکل سے اُتر کر جہاں ٹکٹ لفافہ وغیرہ بکتے ہیں وہاں

آیا۔ ڈاکخانہ کے دروازہ کے قریب ہی ایک کمرہ بنا ہوا ہے، لفافہ وغیرہ وہاں بکتے تھے، اس کو گوند کی ضرورت تھی، دروازہ پر کھڑے کھڑے اس نے ٹکٹ بیچنے والے کلرک سے بات کی، وہ ہندوستانی تھا اور انگریزوں کی حکومت تھی، تو اس ہندوستانی نے انگریز سے کہا کہ اندر آجائیے۔

جس کی حکومت ہوتی ہے، اس کا بچہ بھی سمجھتا ہے کہ میری حکومت ہے، اور جو حکومت میں رہنے والے ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم محکوم ہیں، یہ ایک فطری اثر ہے''۔

اس ہندوستانی نے انگریز سے کہا کہ اندر آجائیے، لیکن انگریز اندر نہیں گیا اور اس نے کہا: ''یہ اوپر کیا لکھا ہوا ہے؟'' کہ ''اندر آنا منع ہے''۔ اُس نے دوتین بار اندر آنے کو کہا مگر انگریز اندر نہیں گیا۔ انگریز مہذب ہے باتہذیب ہے، باہر کھڑا رہنے میں اپنی توہین نہیں سمجھ رہا ہے، اور ہم اس میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ...الغرض وہ انگریز اندر نہیں گیا اور وہیں سے اپنا کام کر کے اور بائی سائیکل پر چڑھ کر چلا گیا۔

چیزیں برتنے کے لئے ہیں، فیشن کے لئے نہیں :

ایک انگریز بائی سائیکل پر چلا جا رہا ہے اور ایک ہندوستانی بائی سائیکل پر آ رہا ہے، وہ انگریز اس ہندوستانی کی سائیکل کے برابر سے گزرا، اس ہندوستانی کے ہاتھ میں گھڑی تھی، اس انگریز نے کہا: ''کیا ٹائم ہوا ہے؟'' اس ہندوستانی نے کہا ''میری گھڑی بند ہے''۔ انگریزی نے کہا ٹھہرو! وہ ہندوستانی ''مسلمان بھائی'' ٹھہر گیا۔ انگریز سائیکل سے اُترا، وہ بھی اُترا، انگریز اس ہندوستانی کے پاس گیا اور آہستہ سے ایک تھپڑ مارا اور کہا: ''گھڑی ٹائم کے لئے ہے فیشن کے لئے نہیں''۔ اگر خراب تھی تو تم نے گھڑی ساز کے یہاں کیوں نہیں بھیجی؟ ہاتھ پر کیوں باندھی؟

ان کی نکالی ہوئی چیز ہے، وہ جانتے ہیں کہ گھڑی کو کس لئے استعمال کرنا چاہئے،

کس طرح اور کس وقت استعمال کرنا چاہئے، گھڑی بند ہے اور باندھے ہوئے پھر رہا ہے، یہ فیشن کے لئے تھوڑا ہی ہے، انہوں نے تو اپنی ضرورت کے لئے چیزیں ایجاد کی ہیں۔ ان کا جو لباس ہے، وہ اُن کے ملک کے اعتبار سے ہے، کیونکہ وہ سرد ملک ہے، اگر لباس لپٹا لپٹا یا نہیں پہنے گا، کسا کسایا نہیں پہنے گا، تو اس ملک کی ہوا اس کا کام تمام کر دے گی۔

بیت الخلاء میں قالین:

جب میں لندن گیا سردی کا موسم تھا، میرے لئے بہت سردی تھی، ان کے لئے بہت کم تھی، بارش ہو رہی ہے، اولے پڑ رہے ہیں، پھر بھی وہ ویسے ہی پھر رہے ہیں، میں ہر وقت چادر اوڑھے رہتا تھا، اوپر سے ناشتہ کے لئے نیچے کمرے میں آیا تو میزبان نے کہا موزے تو ہیں نہیں "موزے پہن لیجئے"۔ میں نے کہا ارے بھئی موزوں کی کیا ضرورت ہے؟ کہنے لگے نہیں حضرت! یہاں کی سردی ایسی نہیں ہے یہ تلوے سے نکل کر دماغ میں پہنچے گی۔

تو میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ ایک خاص قسم کا کپڑا دیواروں سے لگا ہوا ہے، اور جب بیت الخلاء گیا تو دیکھا کہ ایک ہلکی قسم کی قالین بچھی ہوئی ہے۔ جی ہاں! قالین بیت الخلاء میں بچھی ہوئی ہے!! گو عمدہ قسم کی نہیں تھی مگر تھی قالین۔

میں نے پوچھا یہاں بیت الخلاء کے اندر بھی قالین ہے؟ کہا جی ہاں یہاں کی سردی بہت سخت ہے، زمین پر پیر نہیں رکھ سکتے، جوتے پہنے ہوئے قالین پر رکھتے ہوئے تب بیت الخلاء کے قدمچہ پر پہنچیں گے۔ میں سمجھا تھا کہ فیشن کے طور پر، زینت و زیبائش کے طور پر ایسا ہے، اور وہاں کیا معلوم ہوا کہ نہیں صحت کی ضرورت کے طور پر ہے، اب ہم نے ان کی دیکھا دیکھی ان چیزوں کو فیشن میں اختیار کر لیا، وہ فیشن کے اوپر نہیں چلتے بلکہ ان کا لباس وہاں کی ضرورت کے اعتبار سے ہے۔

ہندوستانی لباس بطورِ فیشن پہنتا ہے :

اور ہم نے ان کی دیکھا دیکھی فیشن کے اعتبار سے شروع کردیا۔ اب دیکھ لو! یہاں ہندوستانی پائجامہ کیسا پہن رہے ہیں؟ اوہو، ہو!! رانوں سے چمٹا ہوا، معلوم ہو کہ نیچے کا حصہ موٹا ہے یا پتلا، دیکھ کر بھی جی بُرا ہو جاوے، اگر کچھ خوبصورت سا ہو، خاص کر اس زمانہ میں تو دیکھ کر طبیعت بھی مائل ہونے لگے۔ تو وہ لوگ فیشن کے طور پر نہیں پہنتے، وہ تو ہم نے نقل کر لی۔ دیکھو! اس انگریز نے کیا کہا کہ گھڑی فیشن کے لئے نہیں ہے، یہ ضرورت کے لئے ہے، جب بند ہے تو باندھ کیوں رکھی ہے؟ ایسے ہی وہ کہتے ہیں کہ یہ ہندوستانی بے وقوف ہیں، ہم نے تو لباس پہنا اپنے یہاں کی ضرورت کے اعتبار سے اور ہندوستانی ہمارے لباس کی نقل کر رہا ہے فیشن کے اعتبار سے۔ یہ بہت بے وقوف ہے اسے عقل نہیں ہے۔

انگریز کی ڈگڈگی :

انگریز نے بندر کی ڈگڈگی بجادی، بندر ناچنے لگا، تو ہندوستانی ناچ رہے ہیں، انگریزوں کی نقل کی فیشن کے واسطے اور یہاں کوئی اور حکومت آئی تو ان کا جی خوش کرنے کے واسطے لگے ننگے سر پھرنے، ہمارے جوان ننگے سر پھر رہے ہیں۔ یہاں تک کا کرتہ پہن لیا، مسلمانی کرتہ بھی گیا، ٹوپی بھی گئی، کہیں خدانخواستہ ننگے پیر نہ پھرنے لگیں، کیونکہ میں تو اس ملک کے بھی کئی شہروں میں گیا ہوں، مدراس گیا ہوں، تو وہاں کا لباس اور ہے، وہاں تو تھانے دار بھی ننگے پیر پھرتا ہے، مدراس میں دیکھا کہ وہاں تھانیدار ننگے پیر چل رہا ہے، کیونکہ وہاں کی معاشرت ہی ایسی ہے، جیسے ہمارے بہت سے گاؤں دیہات والے ننگے پیر پھر رہے ہیں، نہ معلوم ان کے کانٹے چبھتے ہیں کہ نہیں۔ عورتیں ننگے پیر پھر رہی ہیں، نہ معلوم انہیں سردی لگتی ہے یا نہیں لگتی؟

تو مدراس میں اچھا خاصہ آدمی بھی ننگے پیر چل رہا ہے۔ میں نے مدراسیوں کو

کھاتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں ریل کے ڈبہ میں تھا، میں نے دیکھا کہ چاول سامنے ہیں، ایک سینک سی لکڑی اس کے پاس ہے، بجائے ہاتھ سے کھانے کے اس لکڑی سے نہ معلوم کس طرح وہ چاول کھا رہے ہیں اور ہم پانچوں انگلیوں سے کھاتے ہیں تو ہر جگہ کے کھانے کا طریقہ اور ہے، پہننے کا طریقہ اور ہے یہ نقل کیسی ہے؟

ہم نقال ہیں:

تو یہ ہندوستانیوں کا لباس جو ہے، وہ نقالی ہے اور پھر ہندوستانی مسلمان اختیار کرے دوسروں کا لباس، تو کیا وہ بہروپیا ہے، کبھی ہندوؤں کا لباس لے لیا' کہیں انگریزوں کا لباس لے لیا، کبھی کسی اور کا، تو بہروپیا ہو گیا یا نہیں ہو گیا؟ ننگے سر ہی پھرنے لگا، میرے پاس آتے ہیں تو میں ضرور ٹوکتا ہوں، کہتا ہوں ٹوپی کہاں گئی؟ کوئی بچہ ساتھ ہوتا ہے تو کہتا ہوں ٹوپی نہیں ہے، بچہ کی ٹوپی کہیں کوا لے گیا ہوگا، ارے یہ بڑے ساتھ تھے، ان سے بھی کوا نہ مارا گیا، اور تیری ٹوپی کوا لے گیا، اوہو! کیسا کوا تھا وہ، اس طرح کہتا ہوں، کہتا سب کو ہوں، چاہے موٹر کار میں بیٹھ کر کیوں نہ آوے، اگر پائجامہ ذرا بڑا پہنے ہوئے ہے، ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں، تو کہتا ہوں، اوہو بھئی دیکھو! لنگی یا پائجامہ ایڑیوں کے نیچے ہے، کہیں پھنس نہ جاوے، کہیں میلا نہ ہو جائے، اس طرح کہتا ہوں، لٹھ مار بات نہیں کرتا، جو تہذیب کے خلاف ہو، یہاں شلوار کا نام ہی نہیں تھا جب سے یہ پنجابی لوگ آئے شلوار پہننا شروع کر دی' عورتوں نے بھی پہننا شروع کر دی۔

پہلے پردہ بہت تھا:

یہاں پردہ بے انتہا تھا، ہندوستانی مسلمان شریفوں کے یہاں پردہ بے انتہا تھا، یہ پیچھے ''اچھی بی'' کا گھر ہے، یہ سامنے ہمارا گھر ہے، جب گھر میں زندہ تھیں تو اگر ان کو اچھی بی کے یہاں جانا ہوتا تو وہ زمانہ ڈولی کا تھا، ڈولی آوے گی دروازہ کے اندر رکھی جاوے گی،

اس میں بیٹھیں گی، اچھی بی کے گھر کے دروازہ میں ڈولی والے رکھ کر ہٹ گئے باہر نکل گئے، تب جاکر اُتریں گی، اب ڈولی کا نام ہی نہیں رہا، اب تو جانا آنا پیدل ہوتا رہتا ہے۔

اب تو حکومت اور ہے نیا زمانہ ہے، یہ آثارِ قدیمہ بتلا رہا ہوں تاکہ تم سمجھو۔

میرے والد صاحبؒ کے چھ، سات بچے اِدھر پیدا ہوئے اُدھر مرے، اور میں کچھ دن زندہ رہا، تو زندہ رہنے کی اُمید ہوگئی، پھوپھی صاحبہؒ کی شادی کسی اور جگہ ہوئی تھی وہ آئی ہوئی تھیں، اس زمانہ میں بارش خوب زوروں کی ہوا کرتی تھی، بڑی لوئیں چلتی تھی تو بارش بڑے زور کی ہو چکی تھی، پانی اِدھر سے اُدھر بہہ رہا تھا اور کچھ ہلکی ہلکی بوندیں سی بھی ٹپک رہی تھیں، میری پھوپھی صاحبہ نے کہا کہ میں تو بچہ کو اپنے گھر لے جاؤں گی، ان کا مکان چھ سات کوس کے فاصلہ پر تھا، جہاں شادی ہوئی تھی والد صاحبؒ سے چھوٹی بہن تھیں، وہ بڑے بھائی تھے، انہوں نے کہا کہ بارش بہت ہو چکی ہے اور ابھی بارش ہو بھی رہی ہے، ایسے میں لے جانا تو بہت مشکل ہے، کہنے لگیں ''میں تو آج ہی لے کر جاؤں گی''۔ تریا ہٹ مشہور ہے، بڑی مشکل ہوئی، والد صاحبؒ نے فرمایا: ''ڈولی والوں کو جانا مشکل ہوگا''۔ کہنے لگیں ''میں آج ہی جاؤں گی''۔ مجبوراً کہاروں کو بلایا، کہار آگئے اور پوچھا ''میاں کیا حکم ہے؟''۔ والد صاحبؒ نے فرمایا کیاں بتاؤں؟ بچہ کو لے جانا چاہ رہی ہے میری بہن، ڈولی کی ضرورت ہے، آپ پہنچا دیں گے؟'' کہاروں نے کہا دیکھو بارش ہوئی ہے ابھی راستہ کیسا ہو رہا ہے اِدھر ابھی بوندا باندی بھی کچھ ہو رہی ہے۔

والد صاحبؒ نے بہن یعنی ''ہماری پھوپھی صاحبہ'' سے کہاروں کی بات بیان کی۔

پھوپھی صاحبہ نے کہا ''میں آج ہی جاؤں گی' ڈولی لے کر آؤ''۔ خانصاحبن تھیں بیچاروں کو ڈولی لانا پڑی۔ پھوپھی صاحبہ مجھ کو ڈولی میں بٹھا کر چلیں' چھ سات کوس کا سفر تھا، مگر اب تو ڈولی کا نام بھی نہیں، تو پہلے بات اس طرح چلتی تھی کہ بلا لاؤ! ہم نے زمانہ کچھ اور دیکھا ہے، اب انحطاط کا زمانہ ہے تو اس انحطاط کے زمانہ کو دیکھ کر چلنا پڑے گا۔ ذرا صبر کے ساتھ کچھ

شکر کرتا ہوا چلنا ہوگا۔ مجھ سے پوچھو یہ ریاست کے انتظامی اُمور تھے، اس کو ظلم نہیں کہتے' اس کو سختی نہیں کہتے۔

دولت میں مساوات خلافِ فطرت وانتظام ہے :

ولو بسط اللّٰہ الرزق لعبادہٖ لبغوا فی الارض ۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا کے سب کے سب انسانوں کو دولت برابر دے دوں، ایسا نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اگر ایسا کیا جاوے گا تو کوئی کسی سے دبے گا نہیں کیونکہ برابری آ گئی اور جب دے گا نہیں تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جاوے گا۔ یہ بدانتظامی ہے کہ سب کو دولت برابر دے دی جاوے، سب کو یکساں طریقہ سے رکھا جاوے۔ آج مزدور کاشتکار کو ملنا مشکل پڑ گیا ہے۔

کہتا ہے پہلے میرے یہاں نولائی کرو، پہلے میرے یہاں ہل چلاؤ، پھر میں تمہارے یہاں جاؤں گا۔ نظام خراب ہو گیا تو اب تو بیٹا باپ کا مقابلہ کر رہا ہے۔

شرفاء کی تہذیب کا حال :

اب تو شرفاء کے بیٹے بھی ویسے نہیں رہے جو ہم نے شرفاء کا زمانہ دیکھا ہے: میں ایک رئیس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، میری زندگی عورتوں میں نہیں گزری ہے، بھائیو! دتاؤلی کا قصہ ہے، سب سے بڑی ریاست پہلے دتاؤلی تھی، وہاں کے نواب فیض محمد خان صاحب تھے، جن کے چھ بیٹے تھے، ایک لڑکی تھی، حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز ہمارے دادا پیر نے فرمایا کہ نوابوں میں نواب اگر کسی کو ولی دیکھنا ہو تو فیض محمد خان صاحب کو دیکھ لو۔ دتاؤلی کے نواب تھے تو میں ان کے صاحبزادہ عیسیٰ خان صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، چھوٹی عمر تھی، داڑھی کچھ معمولی سی نکلی تھی، کسی وجہ سے گیا تھا، میں نے اپنے آنے کی اطلاع کی، ان کے کارندے تھے، انہوں نے اجازت دیدی میں اندر پہنچا، وہ بیٹے پوتے والے تھے، لیکن جب میں پہنچا تو کھڑے ہو گئے، یہ تہذیب تھی ہمارے

یہاں، اور میں چھوٹا سا تھا، ان کے بیٹے بھی مجھ سے بہت بڑے بڑے تھے لیکن مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا تشریف رکھئے، پھر گھنٹی بجادی، ان کا لڑکا اندر سے آیا، مگر دیر میں آیا، شاہی سلام کیا یعنی ذرا جھک کر، یہ بات الگ ہے کہ یہ سلام ناجائز ہے۔ خانصاحب نے چپکے سے جواب دیا اور ترچھی نگاہ کے ساتھ لڑکے کی طرف دیکھا، لڑکا کانپ گیا، اب بولتے نہیں خان صاحب، میں یہ تماشہ دیکھ رہا ہوں، کھڑا ہوا ہے، کچھ وقفہ کے بعد کہا دیر کیوں ہوئی؟ لڑکا سہم گیا، پھر کہا جاؤ! وہ چلا گیا ہم نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ اب اس طریق کو برت نہیں سکتے، اب استعمال نہیں کر سکتے، انحطاط کا زمانہ ہے، اضمحلال کا زمانہ ہے اور سُنو! ہمیں رات کو ایک دفعہ گھر آنے میں دیر ہو گئی، کبڈی کھیلنے چلے گئے تھے بڑوں کے ساتھ، عشاء کی نماز ہو گئی، اب طبیعت کانپ گئی ہمارے یہاں کوئی خانصاحب کا لڑکا بے نمازی نہیں تھا عورتیں بھی بے نمازی نہیں تھیں، نماز پڑھ کر مسجد سے گھر آیا، کنڈی کھلی ہوئی ہے، میں اندر گیا، کنڈی لگادی، والد صاحبؒ بڑے سخت ناراض تھے، بے انتہا خفا تھے۔ پوچھا: ''دیر کیوں ہوئی؟''

عرض کیا وہ فلاں فلاں بڑے لڑکے کبڈی کھیلنے چلے گئے تھے، ہم بھی چلے گئے، وہاں اس لئے دیر ہو گئی۔ فرمایا: ''نماز پڑھ لی؟'' عرض کیا جی پڑھ لی۔ فرمایا: ''آج تو معاف کرتا ہوں اگر آئندہ ایسا کیا تو ٹھیک نہیں''۔ عرض کیا بہت اچھا، ہم کانپ گئے اور اب؟ بیٹا کپکپا رہا ہے باپ کو تو جس نے یہ زمانہ دیکھا ہو، اس کا پھر اس وقت کس طرح گزارا ہو رہا ہوگا؟ تقابل دکھا رہا ہوں اُس زمانہ اور اِس زمانہ کا، اور اس سے پہلے تقابل دکھایا تھا، مصر اور لندن یونیورسٹیوں کا اور امام کے پیچھے مسجد میں کھڑے ہونے کا، کہ حکم تو یہ ہے کہ اہلِ علم امام کے پیچھے کھڑے ہوں، مگر اب جاہل اَڑ کھڑا ہوتا ہے۔ تو تقابل دکھا رہا ہوں۔ لہٰذا یہ زمانہ کچھ ایسا ہی ہے، اس میں بڑے نیچے ہو کر رہو، بولو مت، ورنہ منہ کی کھاؤ گے، بس خاموش!

علماء صاحبان زمانہ کو پہچانیں :

ہر جگہ مسئلہ بتلانا بھی مشکل ہے، شریعت کہہ رہی ہے کہ زمانہ کو دیکھو، اے علماء! ہاں ہر جگہ نہ بولو جہاں : ''من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه'' ہے وہیں ''فان لم يستطع فقبلبه'' بھی ہے۔

جس کا مطلب ہے خاموش رہو، بولو مت، منہ کی کھاؤ گے۔ یہ نہیں کہ ہر جگہ مسئلہ بگھارنے لگے، مسئلہ بتاؤ، لیکن اہلِ علم کا، علماء کا یہ کام نہیں کہ ہر جگہ مسئلہ بگھارنے لگے، بولنے لگے، پہلے دیکھ لو کہ مخاطب کیسا ہے جس سے میں کہہ رہا ہوں؟ وہ آدمی کیسا ہے، کیسے مزاج، کیسی طبیعت کا ہے؟ کہیں پھکّڑ تو نہیں، کہیں زبان دراز تو نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ان خان صاحب کے واقعہ سے دکھلایا ہے کہ تہذیب کسے کہتے ہیں۔ ادب واحترام کسے کہتے ہیں، بڑے چھوٹے کا علم اثر کسے کہتے ہیں، تہذیب تو نام ہی کسی اور چیز کا ہے، کہا جاتا ہے هَذَّبَ الشَّجَرَ اس نے درخت کو مہذب کیا۔ باغیچہ ہوتا ہے ایک ہم جیسوں کا باغیچہ ہوتا ہے، ایک رئیسوں اور نوابوں کا باغیچہ ہوتا ہے، تو نوابوں کے باغیچوں میں ملازم ''مالی'' ہوتا ہے، وہ جو درخت لگے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو چھانٹتا ہے، کوئی اونچی شاخ ہے کوئی نیچی شاخ ہے، ان کو چھانٹ کر کیسا کرتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر چارپائی بچھا کر لیٹ جاؤ۔ یہ ہے عربی کی لغت هذّب کی تفصیل، یعنی شاخیں پوری یکساں کانٹ چھانٹ کر برابر ٹھیک کر دی۔

اس کو کہتے ہیں تہذیب جس سے عربی کا لفظ هَذَّبَ بنا، جس کے معنی اوپر بیان کیے گئے، پھول بھی بنائے جاتے ہیں، جو لوگ جانتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ پھول بھی بنائے جاتے ہیں، تو یہ تہذیب انسان ہی کے لئے نہیں ہے، بلکہ درختوں کے لئے بھی ہے، یہ تہذیب پھولوں کے لئے بھی ہے اور بتاؤں؟ یہ تہذیب کتوں کے لئے بھی ہے، جو کتے

بڑے بڑے رئیس لوگ رکھتے ہیں، انگریز لوگ رکھتے ہیں، نواب لوگ رکھتے ہیں، شکار کے لئے جو کتے رکھے جاتے ہیں، اُن کو بھی تہذیب سکھائی جاتی ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ''کتابُ الصید'' پڑھی ہوگی، کتاب الصید میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کے سکھانے کا طریقہ سکھایا ہے، بتایا ہے یہ کیا جانے بچارے بیٹھے ہوئے، انہیں کیا معلوم؟ یہ سمجھے کہ ہمارے یہاں عربی مدارس میں یہی نماز، روزہ پڑھایا جاتا ہے۔

تو ہم عدالت کا کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ہدایہ ہمارے یہاں پڑھائی جاتی ہے اور مسلمان کیا سمجھتے ہیں۔ یہی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ سکھایا جاتا ہے، اور کیا سکھایا جاتا ہے یاد رکھو! ہمارے یہاں وہ سب کچھ پڑھایا جاتا ہے جو کالجوں کے اندر پڑھایا جاتا ہے۔

حضرت مجددِ تھانویؒ کا گھر میں داخل ہونے کا طریق :

حضرتؒ جب گھر جاتے تھے تو سیدھے ہاتھ میں بیت ہے، چلے جا رہے ہیں، دروازے پر پہنچے، بیت سے کواڑ کو تین دفعہ بجا رہے ہیں، پھر فرما رہے ہیں: ''السلام علیکم'' اندر سے بچہ بولا آجایئے، میں یہ سب منظر دیکھ رہا ہوں، لیکن نہیں گئے جب بڑے شخص کی آواز آئی ''تشریف لایئے'' جب اندر گئے بڑے میاں ''یہ بڑے میاں محبت میں کہہ رہا ہوں''۔ اپنے گھر میں داخل ہو تو اجازت لے کر، لیکن مولوی صاحب ہیں کہ چلے جا رہے ہیں کہ جہاں پردہ بھی ہے، لیکن اب تو پردے اُٹھ گئے، پھوپھی زاد، خالہ زاد، چچازاد، تایا زاد اور ماموں زاد وغیرہ وغیرہ، قریب کے رشتہ داروں سے کیا پردہ نہیں ہے؟ جس سے نکاح ہے اس سے پردہ بھی ہے، دیکھئے گھر میں چلے جا رہے ہیں، گھسے ہوئے اور وہیں جا کر بیٹھے، برابر میں کیا اندھیر کھاتہ ہو رہا ہے؟

اسی طرح سے ادارہ ''مدرسہ'' چہار دیواری کے اندر ہے، چہار دیواری کی کیا

ضرورت تھی اور پھر اونچی اونچی دیواروں کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی وہاں عورتیں رہتی ہیں، تو جیسے رہنے کا گھر ہے، اسی طرح ادارہ اور مدرسہ بھی ایک گھر ہے، تو پھر عام آدمی کا مدرسہ کے اندر بلا اجازت جانے کا سوال کیا؟ اگر اپنے بیٹے سے ملنا ہے یا رشتہ دار سے ملنا ہے، تو پہلے اجازت لو مہتمم صاحب سے، اگر مہتمم وہاں نہیں ہیں تو ان کا قائم مقام ہوگا، دربان سے کہو کہ اطلاع کردے، میں ملنا چاہتا ہوں۔ یہ تو کیا ہوتا اب تو مدرسہ کے پھاٹک کے اندر گلی ڈنڈا ہی کھیل رہے ہیں، منع کردو تو برا مانے گا۔

اسی طرح ابا جان آئے کسی سے پوچھا میرا فلاں نام کا بیٹا کہاں رہتا ہے، کسی نے بتلا دیا فلاں کمرے میں ہے، بس سیدھے اسی کمرہ میں گھسے چلے جا رہے ہیں، اب لڑکے کس حال میں بیٹھے ہوئے ہیں، لیٹے ہیں، کیا کر رہے ہیں، انہیں اس کی کچھ پرواہ نہیں، بس گھستے چلے جا رہے ہیں، جیسے اپنی کوٹھی میں جا رہے ہوں، کیا تہذیب ہے اور یہ کیا ادب و لحاظ ہے؟ کیا یہ باتیں سُننے کی نہیں ہیں؟ مدرسہ والوں کو سننے کی ضرورت نہیں؟ ذمہ داروں کے سننے کی نہیں ہیں؟ ہم نے کچھ اور زمانہ دیکھا ہے، اب تو خاموش رہو، انحطاط کا زمانہ ہے، گرا پڑا زمانہ ہے بولو مت، لڑائی مول لے لی جائے گی۔

تو ہماری کتابوں کے مطالعہ سے انگریزوں نے دنیا کا نفع اُٹھایا، تہذیب کا نفع حاصل کیا، ہمیں معلوم ہے کہ اسلام کے آنے سے پہلے لندن وغیرہ انگلستان کا کیا حال تھا؟ ہمیں معلوم ہے ہم نے تاریخ پڑھی ہے، ایسے تھے جیسے کوئی جانور ہوتا ہو، انسانیت تھی کہاں؟ یہ تو ہماری کتابوں کے مطالعہ سے بنے ہیں، اور ہم بگڑ گئے، پڑھ کر بھی۔

انہوں نے تو مطالعہ سے تہذیب حاصل کر لی اور ہم پڑھ کر بھی تہذیب حاصل نہیں کرتے، حجروں کو جا کر دیکھ لو، کیسے صاف پڑے ہوں گے، کبھی جا کر دیکھتے بھی نہیں ہیں ذمہ داران کہ کمروں کا کیا حال ہے؟ حجروں کا کیا حال ہے بستر کیسے کیسے ہو رہے ہیں،

چارپائی تکئے کیسے ہورہے ہیں، جوتے کہاں پڑے ہوئے ہیں اور جاکر کیا دیکھیں، اگر آج جاکر دیکھ بھی لیا اور کہہ سُن بھی لیا تو دو تین روز مشکل سے ایسا رہے گا اور اس کے بعد پھر وہی بیڈھنگا پن، وہ تو اسی کی طبیعت کا رنگ ہی کچھ اور قسم کا ہے ''غیر مہذب'' وہ تو اسی طرح رہے گا، تو روز، روز کون جاکر کہے جب تک کہ اپنے اندر ہی کچھ تہذیب نہ آجاوے، ایک دفعہ کہہ دیا، دو دفعہ کہہ دیا، اس طرح اس اس طریقہ سے رہو، یہ لڑکوں کے بھی سننے کی باتیں اور ذمہ داروں کے سننے کی بھی باتیں ہیں۔ اجی ! آج مجلس عجیب ہورہی ہے کیا یہ مجلس نہیں ہے کیا یہ باتیں سننے کی نہیں ہیں؟ سمجھنے کی نہیں ہیں؟ کیا یہ تہذیب اخذ کرنے کی نہیں ہے؟ عربی طلبہ کو کیسی تہذیب حاصل کرنا چاہئے، دوسروں کی تہذیبوں کو سن کر کیسا مہذب بننا چاہئے؟

ایک انگریز مسلمان کا واقعہ :

ایک انگریز بیچارہ اچھے خاندان کا مسلمان ہوگیا، اس کا جی چاہا کہ میں ہندوستان جاؤں، ہندوستان آیا تو وہ رئیس نوابوں سے کچھ بڑے لوگوں سے ملتا جلتا رہا، بیٹھتا اُٹھتا رہا، نماز کا وقت آگیا، تو محلہ کی مسجد میں وہ انگریز نماز پڑھنے کے لئے آیا، چار چھ آدمی جن سے وہ انگریز مل کر آیا تھا اس کے ساتھ آگئے، جب وضو کرنے نالی پر بیٹھا تو دیکھا نالی خراب ہورہی ہے، میلی کچیلی ہورہی ہے، انگریز نے کہا: ''کیا یہاں کوئی صفائی کرنے والا نہیں''؟ تو ساتھیوں نے کہا جی ہاں صفائی والا ہے۔ انگریز نے کہا: اوہو! پھر یہ نالی کس قدر گندی ہورہی ہے، اس میں کوڑا کباڑ اٹکا ہوا ہے''۔ تو مسلمان مؤذن بولے: ''ارے مسلمان تو ہوگیا تو لیکن تیرے دماغ کے اندر سے انگریزیت کی بُو نہیں گئی، صفائی صفائی صفائی لئے پھر رہا ہے''۔

تو وہ مسلمان کیا سمجھا کہ صفائی انگریزوں کے یہاں ہے، صفائی انگریزوں کے یہاں کی چیز ہے، اور انہوں نے سیکھا ہے ہم سے اور، مسلمان کیا سمجھا؟ کہ اُن کے گھر کی

چیز ہے، اپنے گھر کی چیز کو کہہ رہا ہے کہ ان کے گھر کی چیز ہے۔

ان میں سے ایک نے اس مسلمان انگریز سے کہا کہ آپ اس کی بات کا کچھ خیال نہ کیجئے گا، یہ مؤذن بیچارے ایسے ہی بھولے بھالے سادہ لوگ ہوتے ہیں۔ ان شستہ مسلمانوں کو خیال ہوا کہ کہیں انگریز بُرا اثر نہ لے، اس انگریز نے کہا: ”میں اس پر ایمان نہیں لایا اسلام کا مطالعہ کر کے اسلام کو سمجھ کر اس پر ایمان لایا ہوں، مجھ کو معلوم ہے کہ اسلام کے اندر صفائی کا کیا درجہ ہے؟“

صفائی کا شرعی اُصول :

اللہ تعالیٰ کا فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچا رہے ہیں، نَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ یہ صفائی کا اُصول ہے۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اسلام کے اندر کچھ اُصول ہیں تو اُنہیں میں سے صفائی کا ایک اُصول یہ ہے کہ نظفوا افنیتکم، فناء جانتے ہو گھر کے باہر جو پھاٹک ہوتا ہے اس پھاٹک کے باہر جگہ ہوتی ہے اس کو فناء کہتے ہیں۔ تو اسلام، اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ کیا تعلیم دے رہے ہیں کہ تمہارے نکلنے کے دروازہ کے باہر جو جگہ پڑی ہوئی ہے اس کو صاف رکھو۔ یہ نہیں کہا کہ گھروں کو صاف رکھو، یہ کلام کی بلاغت ہے۔ یہ فرمایا کہ دروازہ کے باہر صاف رکھنے کا کیسا حکم ہوگا؟ اس کو خود سمجھ لو۔ شہروں میں میونسپلٹی ”صفائی کا محکمہ“ اور قصبات میں ٹاؤن ایریا ”صفائی کا محکمہ“ یہ ہم سے سیکھا ہے کہ نالیوں کو صاف رکھو، سڑکوں کو صاف رکھو، اگر کوئی چیز پڑی ہوئی مل جایا کرے تم ہاتھ سے اُٹھا کر ایک طرف رکھ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کیلے کا چھلکا پڑا ہو، پیر پھسل جائے، اینٹ وغیرہ پڑی ہوئی ہے، کوئی تیزی میں جاوے، ٹھوکر لگے گر جاوے، اندھا جاوے، ٹھوکر لگے گر جاوے، کانٹے پڑے ہوئے ہوں، ان کو ہٹا دو۔ حدیث میں ہے :

اماطة الاذیٰ عن الطریق۔ یہ ایمان کا جز ہے یعنی جو چیز تکلیف دہ ہو وہ راستہ

سے ہٹادو تو دیکھئے! محکمۂ صفائی ہمارے یہاں ہوگیا، سڑکوں کا صاف کرنا، نالیوں کا صاف کرنا ہم سے سیکھا ہے۔ اب تو معلوم ہوگیا کہ اسلام کیا ہے؟ اسلام کی تہذیب کیا ہے؟ اسلام میں صفائی کا درجہ کیا ہے؟ آداب کیا ہیں؟

نَظِّفُوْا اَفْنِیَتَکُمْ سے تصوف کا ثبوت :

جب میں لندن گیا تھا تو وہاں ایک شہر میں مجھے دعوت دی تھی، میں نے یہ حدیث نظفوا افنیتکم پوری پڑھی تھی اور میں نے کہا تھا کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کے اندر صفائی ہے اور اسلام میں صفائی نہیں۔ حالانکہ اسلام نے تو دروازہ کے باہر جو جگہ ہے اس کے بھی صاف کرنے کا حکم کیا ہے۔ اس سے اندازہ کرو کہ جب گھر کے باہر کی صفائی کا حکم ہے تو گھر کے اندر کی صفائی کا حکم کیوں نہ ہوگا؟ اور جب گھر کی صفائی کا حکم ہے تو خود بدن جو انسان کا جز ہے اس کی صفائی کا کس قدر حکم ہوگا کہ وہ تو انسان کا جز ہے، انسان کا وجود ہی جسم اور روح سے ہے اور پھر اس حدیث شریف سے احقر نے آپ کے خادم نے تصوف ثابت کیا تھا اس طرح سے کہ جب جسم کے صاف کرنے کا حکم ہے جو کہ انسان کا ظاہری جز ہے تو پھر روح جو باطنی جز ہے جس سے انسان کے بدن کا قوام اور بقا ہے۔ تو اس کی صفائی کا نام تصوف ہے۔

طالب علم شاہِ دین ہے :

طالب علم واقعی شاہِ دین ہے اور بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے؟ غیر مہذب ہوتا ہے کہ جہاں چاہے جا کر بیٹھ گیا جس گلی میں چاہے چلا گیا جس بازار میں چاہے چلا گیا، اڈوں پر جا کر گھومنے لگا جو جی میں آیا کرلیا، یہ تہذیب ہے تمہاری، تمہارے ساتھ غیر قسم کے عام آدمی بھی آ کر شریک ہو کر تماشہ دیکھیں، کھیلیں، یہ کیا طریقہ ہے تمہارا؟ اگر کھیل کھیلنا ہے تو

اپنی جگہ پر کھیلو، کون منع کرتا ہے، نمازوں کا خیال رکھو، اسباق و درس کے گھنٹے کا خیال رکھو، کون منع کرتا ہے، مگر دوسرے آ کر کیوں شریک ہوئے؟ تم طالب علم ہو اپنے کو پہچانو۔ تم اپنے کو پہچانو گے تب ہی تو لوگ تم کو پہچانیں گے ورنہ یوں کہیں گے کہ یہ ہیں طالب علم، جو پھر رہے ہیں اِدھر اُدھر، اگر شہروں میں پڑھ رہے ہیں تو چاندنی چوک میں پھر رہے ہیں، بازاروں میں پھر رہے ہیں، پارکوں میں چلے گئے، باغیچوں میں چلے گئے، یہ عربی کا طالب علم ہے، یہ تہذیب ہے۔

وہ علم کا مقام کیا ہے؟ یعنی ذاتِ باری تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ پر علمِ قطعی بطریقِ وحی نازل فرمایا، اسی کو عربی کا طالب علم حاصل کرتا ہے۔ اب اس کے اندر دیکھ لو کہ کیسی تہذیب ہونا چاہئے اور کیسی تہذیب باہر ہونا چاہئے۔

آج تہذیب کا بیان ہوا، تو جب دروازہ سے باہر صفائی کا حکم ہوا ہے تو کپڑے میلے ہونا چاہئیں اور کپڑوں کے اندر کا بدن میلا ہونا چاہئے اور جو بڑی چیز مدارِ زندگی ہے یعنی روح وہ میلی ہونی چاہئے۔ یہ دروازہ کے باہر تہذیب اور صفائی کیا کہہ رہی ہے؟ کہ اس کو صاف رکھو؟ اور جو گھر کا صحن ہے اس کو میلا رکھو؟ اور جو گھر کا رہنے کا کمرہ ہے اس کو میلا رکھو؟ جہاں لیٹنا، بیٹھنا، اُٹھنا، سونا ہو اس کو میلا رکھو؟ اور یہ جسم سے باہر کی چیزیں ہیں، آگے چلو کپڑے میلے رکھو؟ بدن کو میلا رکھو؟ دل کو میلا رکھو؟ اور روح جس پر مدار ہے زندگی کا، کہ روح چلی گئی تو پھر کیا ہوگا؟ تو وہ روح جو کہ اصل الاصول ہے، اس روح کو میلا رکھو، سمجھے؟ یہ حدیث شریف کیا کہہ رہی ہے، مختصر اجمالی مسئلہ تصوف کا ہو گیا، طریقت کا ہو گیا، سلوک کا ہو گیا، یہی ایک حدیث شریف کافی ہے اور روح کے لئے پہلے چیز کیا ہے؟ ایمان ہے نہ کہ کفر جو کہ پورا میلا ہے تو روحانیت کے لئے پہلی چیز تو ایمان ہونا چاہئے، پھر ایمان کے جو تقاضے ہیں وہ ہونا چاہئیں کہ ظاہر کی صفائی ہو اور باطن "دل" کی صفائی ہو کہ اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ ہو، نہ کہ اخلاقِ مذمومہ یعنی رذیلہ اس میں ہوں۔ دیکھ لیجئے، یہ حدیث شریف کیا

کہہ رہی ہے۔

ذکر لا الٰہ الا اللہ کا طریق اور اس کا اثر :

اب احقر سب کچھ عرض کرتا ہوا پھر وہیں لوٹتا ہے جہاں سے بیان شروع کیا تھا کہ سلوک تزکیۂ نفس، تخلیہ نفس، تحلیہ و زینتِ روح میں فقط اتنا کرنا پڑتا ہے کہ بائیں جانب سے ہٹ کر دائیں جانب آنا ہے، بائیں جانب خراب ہے، دائیں جانب اچھی ہے، بائیں جانب قلب ہے اور نیچے کا حصہ نفس ہے، نفس کو مہذب کرتے ہوئے نفسانی شاخیں کاٹتے ہوئے اس طرح کہ لَا کاٹتا ہوا جا رہا ہے کہاں؟ قلب کی طرف پھر وہاں سے الٰــہ کھینچتا ہوا داہنی طرف 'رہا ہے اور جب لا کہا تو پھینک دیا پشت کی پیچھے ساری مخلوق کو، تو ساری مخلوق پھینک گئی اور جب الا اللّٰــہ کہہ رہا ہے الا اللہ تو بس خالق رہ گیا۔ یہ ہے مختصر طریقِ ذکر لا الٰہ الا اللہ۔ آ گئی سمجھ میں بات۔ یہیں بیٹھے بیٹھے مخلوق نکل گئی کہ نہیں نکلی؟ یہ ہے لا الٰہ الا اللّٰہ کہ جو ہر وقت مخلوق کے اندر گھسی ہوئی ہے توحید میں شرک ہو رہا ہے، گو شرک جلی نہ سہی، اور طرح طرح کے شرک ہیں یہ لا الٰہ الا اللّٰہ اس کو نکالنے کے لئے ہے۔

شروع میں یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ لا الٰــہ طاہر ہے اس سے طہارت ہوگئی، الا اللّٰہ طیب ہے جب لا الٰہ کہا تو مخلوق پسِ پشت پھینک گئی، جب الا اللّٰہ کہا خالق رہ گیا مخلوق سے درگذرا، مخلوق سے نظر انداز ہو گیا لیکن اس کو ہمارے افعال و اخلاق بتلائیں گے کہ مخلوق سے نظر اندازی ہوگئی کہ نہیں ہوئی۔ اس کے اعمال، اس کے افعال و اخلاق گواہی دیں گے صرف دعویٰ کرنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے، وہ اعمال و اخلاق بتلائیں گے کہ الا اللّٰہ آیا کہ نہیں آیا، ذکر تو کر رہا ہے، لا الٰہ کا لیکن دل سے مخلوق گئی یا نہیں گئی، الا اللہ آیا کہ نہیں آیا، ذکر تو کر رہا ہے لا الٰہ کا لیکن دل سے مخلوق گئی یا نہیں گئی الا للّٰہ کہہ تو رہا ہے لیکن خالق رہ گیا بشمول حب محمد رسول اللہ ﷺ یا نہیں، اس کا پتہ اعمال و اخلاق دیں گے۔

شرح عقائد میں توحید پڑھی ہوگی، یہ ہے توحید کی حقیقت جو عرض کی گئی، یہ ہے طریقِ ذکر جس سے توحید آتی ہے نہ کہ صرف طریق تسبیح، ہر چیز کا ایک اثر ہوتا ہے کب؟ جبکہ اس کو اس کے طریقہ کے موافق استعمال کیا جاوے، میرے بھائیو! کچھ سن رہے ہو کہ نہیں سُن رہے؟ ابھی تو ہمیں ذکر کی حقیقت بھی نہیں معلوم اگرچہ مولوی صاحب ہو گئے ہیں، معاف کرنا مجھے! ابھی تو اس کی بھی معرفت نہیں ہوئی، کہ کلمہ یوں کہہ رہا ہے تو افعال، اقوال، احوال اور اخلاق یہ گواہی دیں گے کہ مخلوق دل سے نکلی کہ نہیں نکلی؟ اور خالق سمایا کہ نہیں سمایا۔

حدیث قدسی ہے، حق تعالیٰ فرما رہے ہیں، کہ میں کہیں نہیں سما سکتا سوائے مؤمن کے قلب کے، کہ وہ قلب کیسا ہونا چاہئے۔ تو کیا مخلوق بھی ہو اس قلب میں اور خالق بھی، جب مخلوق ہوگی تو وہ کہاں آئیں گے، اس کا طریق یہی ہے کہ لا الٰہ کہتا ہے مخلوق پسِ پُشت ڈال دی، الا اللہ کہتا ہے خالق ہی خالق رہ گیا۔

دُعا:

اللہ ہمیں صحیح معنیٰ میں مہذب بتہذیب اخلاق کرے، خدا کرے ہم لا الٰہ الا اللہ کو صحیح طریقہ سے سمجھ لیں، جان لیں، پہچان لیں اور اس کے مطابق اعمال، احوال، اخلاق مدامِ طاعت کے ساتھ، مدامِ ذکر حق تعالیٰ کا کرتے ہوئے حاصل کرنے کی سعی بمساعی جمیلہ ہونے لگے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں اور توفیق طالبِ مخلص کو عطا فرماتے ہیں۔

خدا حافظ

☆☆☆

پندرھویں مجلس

عقلیہ، غضبیہ، شہویہ کے اعتدال کا نام مردِ کامل ہے

مباح چیز سے بھی نصیحت لی جاسکتی ہے:

تو یہ ٹیپ کھیل ہے خیر چلو جیسے اور کھیل ہیں یہ بھی ایک کھیل ہے، اس کھیل سے کھیلتے رہیں تا کہ دل کی ظلمت کھیل کھیل ہو جاوے۔ زبر زیر کا فرق ہے اور کچھ نہیں، کَھیل کِھیل، کَھیل زبر کے ساتھ ہے، کِھیل زیر کے ساتھ، اور زبر وہ ہے تکبر اور زیر وہ عبدیت، عجز وانکسار ہے تو زبر ہٹے اور زیر آوے یعنی کسرِ نفسی اور جب کسرِ نفس آوے تو دل میں جو کسر تھی، وہ دل کی کسر نکل گئی۔ وصلِ حق کی طرف سر اُٹھالیا، بس پھر کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ مخلوق سے نظر انداز ہو گیا اور خالق پر نظر باندازِ خاص عبدیت کے ساتھ ہو گئی، کیونکہ دل کی ظلمت کی کھیل، کِھیل اُڑ گئی۔ اگر یہ بات سمجھ میں آجائے تو رکھ لینا

یہ مختصر جملہ ہے بہت مختصر، اس کی شرح تفصیل بڑی لمبی ہے، مگر سمجھداروں کے لئے یہ متن بھی کافی ہے کہ یوں کہا ہے **العاقل تکفیه الاشارہ** کہ عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے۔

مرد ہو تمرد نہ ہو، کیا کہہ رہا ہوں؟ مرد ہو تمرد نہ ہو۔ تمرد بابِ تفعل سے ہے، تو تمرد نہ ہو، جب تمرد ''بابِ تفعیل کا مصدر'' نہیں ہوگا تو تمرد ''مشتق'' بھی نہیں ہوگا کہ شیطان کو حق تعالیٰ نے ملعون فرمایا ہے، اس کے تمرد کی وجہ سے قرآنِ پاک میں ہے :

وان علیک لعنتی الی یوم الدین ○

اور بے شک تجھ پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک۔

سرکش کا سر کھینچ کر رکھ دیا جاتا ہے :

تو شیطان نے ذاتِ باری تعالیٰ کے مقابل تمرد یعنی سرکشی کی، اللہ تعالیٰ نے اس کی سرکشی بڑھتی ہوئی، تمرد بڑھتے ہوئے دیکھا، کہ سمجھانے پر بھی نہیں مانتا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا سر کھینچ کر رکھ دیا، یعنی ملعون ہو گیا، رحمت کا محل نہ رہا۔ اُس نے خود ہی اپنے طرزِ عمل، طرزِ حال سے کہا مجھے آپ کی رحمت کی ضرورت نہیں، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کھنچ گئی اور اب بھی ایسے سرکشوں سے کھنچ جاتی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنی ذات پر رحمت کو لازم کرلیا ہے کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں افتتاحِ کلامِ پاک **بسم اللہ الرحمن الرحیم** میں اللہ کے ساتھ رحمٰن اور رحیم فرمایا ہے، جس سے اشارہ رحمت کی طرف ہوتا ہے اور پھر اپنے کلام میں صراحتاً، نصاً فرمایا ہے: **کتب ربکم علی نفسه الرحمة**۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر، نفس کے معنیٰ ذات کے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کرلیا ہے، تم چاہو گے آجائے گی، تم نہ چاہو گے تو نہیں آئے گی، تو متمرد پر رحمت کا کیا سوال؟ وہ تو محل نہیں رہا۔

باپ بھی اپنے بیٹے متمرد کو عاق کر دیتا ہے، اب آگے مسئلہ مفتی صاحب سے

پوچھ لینا کہ عاق کرنا کیسا ہے؟ اور کب ہے؟ اور کس لئے ہے؟ لیکن یہ مشہور اور ثابت ہے کہ بیٹے متمرد کو باپ عاق یعنی اپنی میراث سے محروم کر دیتا ہے اور دوسرا بیٹا جو مرد ہے، متمرد نہیں ہے اس کے نام سب جائیداد کر دیتا ہے، تمرد ایسی چیز ہے؟

باپ 'ربّ مجازی ہے :

باپ ربّ مجازی ہے، ذاتِ باری تعالیٰ نے جو ربِ حقیقی ہیں، اپنے حقوق کے بیان کے ساتھ ربّ مجازی' باپ کے حقوق بھی بہت عجیب وغریب بیان فرمائے ہیں کہ ''اُف'' بھی نہیں کہہ سکتے :

ولا تقل لهما اف ولاتنهرهما۔

سو ان کو کبھی اُف بھی مت کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا۔

اُف بھی نہیں کہہ سکتے کتنی بڑی بھاری بات ہے کہ اپنے ماں باپ کو ''ہوں'' بھی مت کہو، جب سامنے کھڑے ہو، یا بیٹھے ہو، تو سرِ نگاہ نیچی کرو، جب بات کرو تو نرم کلام ہو، نرم آواز اور شستہ الفاظ ہوں، ہاتھ سے ادب نہ جانے پاوے اور اُن آداب کے ساتھ ایک اور ادب بتلاتا ہوں، جس کو حق تعالیٰ ہی فرماتے ہیں کہ :

وقل رب ارحمهما کما ربّیٰنی صغیرًا۔

''اے اللہ! میرے ماں باپ پر اس طرح رحم فرمایئے جس طرح انہوں نے میرے بچپنے میں، مجھ پر رحم فرما فرما کر میری پرورش کی ہے''۔

تو دُعا بھی سکھادی کہ اس طرح کہو، یہ حقوق بتلا دیئے ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب بیٹا متمرد ہے تو باپ حق سے اسے محروم کر رہا ہے کیونکہ غلط سے غلط صحبتیں ہیں اس کی، بد سے بدتر صحبتیں ہیں اس کی، نہ معلوم وہ رقم کہاں خراب کرے گا یا کہیں بے حیاؤں میں ختم کرے گا۔

تو بات تمرد کی ہو رہی تھی، شیطان کو کہا ہے متمرد، تو تمرد نہ ہو پھر کیا ہو؟ تمرد کی تے ہٹا دو (یہاں یہ بھی فرمایا" میں اردو میں بول رہا ہوں تے ہٹادو اور قاری صاحب یا حافظ صاحب کہیں گے تا ہٹادو تو اردو بول رہا ہوں، اردو میں تو الف بے تے ثے جیم کہا جاتا ہے، اب جب میاں جی، حافظ جی قاعدہ عربی کا پڑھائیں گے تو الف، با، تا، ثا کہے گا، میں تو اردو بول رہا ہوں) کیا رہ گیا؟ مرد، یعنی انسان تو اسی سے نکل آیا کہ مرد "انسان" میں تمرد کیسا؟ اور پھر مسلمان!! اس میں تو تمرد بہت بعید ہے، اگر مسلمان میں تمرد ہے تو شکل کا تو انسان ہے مگر صفات میں شیطان ہے۔

انسان اور شیطان کا امتیاز :

تجھے اللہ نے انسان بنایا ہے، شیطان تو جنوں میں سے ہے، وہ نار سے پیدا کیا گیا ہے، اب جتنی سرکشی اس میں آجاوے، ناریّت اور شعلہ بھڑک جاوے تھوڑا ہے اور تم کو تو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ "تقابل دکھا رہا ہوں" پھر یہ ناریّت کا شعلہ کیسا؟ اللہ نے تو شعوری، عقلی صفت کو دے کر تم کو بھیجا ہے، مٹی سے بنایا ہے۔ تو شکل میں تو انسان ہے، مگر صفت میں شیطان کہ تمرد یہ شیطانی چیز ہے، سرکشی یہ شیطانی صفت ہے، تو ایسے شخص کا سر کھینچ کر رکھ دیا جاتا ہے، یعنی حق تعالیٰ کی رحمتِ خاص سے دور ہو جاتا ہے اور اس کو ملعون کہا جاتا ہے اور ملعون کہتے ہی اسے ہیں جو حق تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوا۔

انسان کو مرد ہو کر رہنا چاہیئے :

تو اے انسانو ! اور بالخصوص مسلمانو ! مرد ہو کر رہو، مرد کا کام بھڑکنے کا نہیں ہے، شعلہ زنی کا نہیں ہے، وہ چھچھورا ہے، بزدلا ہے، جنّیت لئے ہوئے ہے۔

مسلمان سے عفت، شجاعت، حکمت مطلوب ہیں :

تین چیزیں مسلمان سے مطلوب ہیں اور باقی اس مطلوب کے سوا افراط و تفریط

والی چیزیں وہ ممنوع ہیں، وہ تین چیزیں یہ ہیں: عفت، شجاعت، حکمت۔ قوتِ شہویہ میں عفت، قوتِ غضبیہ میں شجاعت، قوتِ عقلیہ میں حکمت، یہ تین چیزیں مطلوب ہیں، جب یہ تین چیزیں مطلوب ہیں تو جس کے اندر یہ تینوں چیزیں بکمال پائی جائیں گی، اس کو ''مردِ مسلم کامل'' کہا جائے گا اور جتنی جتنی اس کے اندر کمی ہوگی، اسی اسی اعتبار سے مردِ کامل ہونے میں کمی ہوگی، اب چاہے عفت میں کمی ہو، چاہے شجاعت میں کمی ہو، چاہے حکمت میں کمی ہو۔

مجادلہ میں مردانگی مطلوب ہے :

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں دعوت کا حکم فرمایا ہے تو موعظت اور مجادلۂ حسن سے پہلے حکمت کے ساتھ دعوت دینے کو فرمایا ہے: **اُدعُ الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ** پھر کہا **والموعظۃ الحسنہ** اور ذرا جب کوئی چھیڑ چھاڑ کرے تو فرمایا: **وجادلھم بالتی ھی احسن**، اس میں فرمادیا کہ مرد ہو کر گفتگو کرو، چھچھورا پن نہیں، نہایت اونچے حسنِ اخلاق کے ساتھ مناظرہ اور مکالمہ کرنا۔

اپنے کمالِ مردانگی کو مت چھوڑ دینا، یہاں پر بھی اپنی خوش اخلاقی کا ثبوت دینا، گالم گلوچ پر، تیز لہجے پر، ناشائستہ الفاظ پر نہ اُتر آنا۔

وجادلھم بالتی ھی احسن، حسن بھی نہیں کہا، اَحسن، اسمِ تفضیل فرمایا اور یہ کب ہوگا؟ جبکہ نفس کو پورا قابو میں کرلیا ہے، اس کی مخالفت، اس کی مقاومت کرتے کرتے پورا قابو میں کرلیا۔

نفس خلق ہے ''مخلوق'' ہے خلق سے نظر انداز ہو، تو لہٰذا نفس سے بھی جو کہ وہ خلق ہے، اس سے بھی نظر انداز ہو جاؤ، اس پر نظر کیسی؟ جب اس پر نظر نہیں اور خالق پر نظر اور خالق نے کیا حکم دیا تھا کہ فرمایا تھا : **وجادلھم بالتی ھی احسن**، صوت ''آواز'' کے

اندر بھی احسنیت ہو اور کلام کے اندر بھی احسنیت ہو، اگر تمہاری نظر نفس "مخلوق" پر پہنچ گئی تو مردِ کامل ہونے سے ہٹ گئی۔

تبلیغ کا حق اصلاً مردِ کامل کو ہے :

تو اصلاً تو تبلیغ کا حق اس کو ہے جو مردِ کامل ہو، جس کی تعریف ہو چکی اور اگر مردِ کامل نہ ہو نا قص ہی سہی، لیکن تبلیغ کرنے کی حالت میں تبلیغ کرتے ہوئے "مردِ کامل" بننے کی اپنی نیت ہو۔ اصل کام تو تبلیغ کرنا اس کا ہے جو مردِ کامل ہے لیکن اگر ایسا نہیں تو میں منع نہیں کر رہا ہوں تبلیغ کو، البتہ تمہارے اندر نیت مردِ کامل بننے کی ہو، اگر یہ بھی نہیں ہے تو تم کو تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہے، دوسرے کو تو تم جنت کی رہبری کر رہے ہو اور خود اپنی ذات کے لئے راہ بین بھی نہیں ہو۔ اپنے لئے راہ بین بنو، پھر راہنما بننا اور اگر اپنے لئے راہ بین نہیں ہو تو دوسروں کے لئے راہنما بھی نہیں ہو سکتے۔ تبلیغ کا انکار تو نہیں البتہ طریقِ تبلیغ کے کچھ اُصول ہیں، کیونکہ شریعت میں ہر چیز کے حدود ہیں اور خود عقل کا بھی تقاضا ہے۔

احکامِ شرع عقل کے مطابق ہیں :

جتنے احکام ہیں سب عقلِ صحیح، عقلِ مستقیم کے مطابق ہی ہیں، اگر کسی کی عقل میں نہ آویں تو یہ نہیں کہیں گے کہ احکام عقلی نہیں، تمام احکام عقلِ مستقیم کے مطابق ہیں، تو عقل یہ کہتی ہے کہ کہیں میرا کوئی کام حد سے ہٹ کر نہ ہو جاوے، کہیں میرا کوئی کام حد سے بڑھ کر نہ ہو جاوے۔ یہ بھی نہ ہو کہ خوب ٹھونس کر کھانے سے پیٹ بھرے، یہ حد سے بڑھ گیا، اور یہ بھی نہیں کہ فاقہ کشی کر رہے ہیں کہ کھاتے ہی نہیں، یا کچھ کھا لیا، پیٹ بھر کر نہ کھایا، یہ تفریط ہو گئی، تو دونوں صورتوں میں شریعت کی حد سے نکل گیا، ادھر افراط ہو گئی، اِدھر تفریط ہو گئی۔

بہت کھانا افراط اور کم کھانا تفریط ہے :

ٹھونس ٹھونس کر کھانا افراط ہے اور بالکل نہ کھانا یا کم کھانا یہ تفریط ہے تو جیسے شریعت میں تجاوز عن الحد سے منع کیا گیا ہے' ویسے ہی عقل بھی یہی کہتی ہے، کیا عقل کہتی ہے کہ خوب ٹھونس ٹھونس کر کھاؤ یا بالکل نہ کھاؤ؟ ہرگز نہیں اس لئے قرآنِ پاک کے اندر ذاتِ باری تعالیٰ نے احکام کو بیان فرماتے ہوئے یہ بھی بیان فرمایا :

تلک حدود اللہ یہ ہیں اللہ کی حدیں' ان سے مت ہٹنا، یہ بھی تو ایک قسم کی سرکشی ہے کہ جب کھانے پر آیا تو اُس طرح کھا رہا ہے اور کھانا چھوڑ دیتا ہے تو اس طرح۔ یہ بھی ایک قسم کا تمرد ہے' یہ حد سے تجاوز کر گیا، حد سے ہٹتا جا رہا ہے، ملکوں کی سرحدیں ہوتی ہیں، اب کوئی شخص اپنے ملک کی سرحد سے دوسرے ملک کی سرحد میں چلا گیا' تو گرفتار ہو گا یا کہ آپ اپنے ملک کی سرحد چھوڑ کر دوسرے ملک میں کیوں گئے؟ لہٰذا گرفتار ہو گئے۔

تو یہ پورا کا پورا جو آسمان میں اور آسمان کے اوپر ہے اور زمین میں اور زمین کے نیچے ہے اللہ کا ملک ہے :

وللّٰہِ ملک السمٰوٰت والارض.

تبارک الذی بیدہ الملک۔

اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی۔

وہ (خدا) بڑا عالی شان ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے۔

اور جب اللہ کا ملک ہے اور اس میں رہ رہے ہو تو اس کی حدود میں رہو، اس کی سرحد سے باہر نہ نکلو۔

مسائل حدود اللہ ہیں :

اور یہ حدود اللہ کے قوانین ہیں جن کو احکام کہا جاتا ہے اور جن کو ہماری اور آپ کی

بولی میں مسائل کہا جاتا ہے۔ وہ مسائل ہی اللہ کے قانون ہیں۔

اسلام کے پانچ جز ہیں :

لہٰذا اللہ کے قانون اور حد سے باہر نہ نکلو ان کے اندر رہو، عقائد کی درستگی کی

حیثیت سے بھی، اور عبادت کی حیثیت سے بھی، معاملات کی حیثیت سے بھی، معاشرت کی

حیثیت سے بھی اور اخلاق کی حیثیت سے بھی، تصحیح عقائد کے بعد یہ چار چیزیں ہیں

عبادات' معاملات' معاشرت' تہذیب' اخلاق' ان حدود کے اندر رہو، اپنے شوق کو پورا مت

کرو' بعض دین کے شوق میں تجاوز کر جاتے ہیں جیسا کہ بعض لوگ مسلمان ہو کر دین سے

ہٹ کر (عمل نہ کر کے) تجاوز کر جاتے ہیں، ایسے ہی بعض دیندار دین سے بڑھ کر تجاوز کر

جاتے ہیں کہ کھانا چھوڑ دیتے ہیں، رات کا سونا چھوڑ دیتے ہیں۔

بزرگوں نے کھانا اور سونا چھوڑنا علاجاً کیا ہے :

اپنے نفس کے علاج کے لئے، کوئی رات سونے کو چھوڑ دے، چھوڑ دے، کوئی

کھانے کو چھوڑ دے، چھوڑ دے، لیکن تمام رات کا جاگنا اور کھانا چھوڑ دینا جو جسم پر ضعف

بیماری کا سبب ہوتا ہے، وہ حدود سے آگے بڑھنا ہے۔ علاجاً چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے

کہ اس سرکش نفس کو کچلنے کے لئے چھوڑتا ہے، کہ اے نفس! یہ تکاہل کیسا؟ یہ سُستی کیسی

تجھ سے صبح کی نماز میں اب تک اُٹھنا نہیں آیا، نفس کا علاج کر رہا ہے لیکن اس رات بھر کے

جاگنے کو عبادت نہیں سمجھتا، علاجاً یہ احقر نے سوال مقدر کا جواب دیا، یہ جاگنا اصلاً شریعت کا

حکمِ اصلی نہیں ہے، اصلاً تو رات کا کچھ حصہ سونے کا ہے اور رات کا کچھ حصہ جاگنے کا، کیونکہ

سونا بھی امرِ الٰہی ہے ورنہ :

و هو الذی جعل لکم للیل لباسًا و النوم سباتًا و جعل النهار

نشورًا ○ (الفرقان:۴۷) (اور ایسا ہے، وہی اللہ جس نے تمہارے لئے رات کو پردہ کی چیز اور نیند کو راحت کی چیز بنایا اور دن کو زندہ ہونے کا وقت بتایا) کیوں فرمایا ہے؟

یہ رات کیسی ہے؟ تو رات کا کچھ حصہ آرام کے لئے بنایا کہ نہیں بنایا ہے؟ اس کا ترک کر دینا اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھنا نہیں ہے؟؟ ضرور ہے۔

سونا اور جاگنا بہ تحتِ حکمِ الٰہی عبادت ہے :

اس لئے صحابۂ کرامؓ کہتے ہیں کہ جس طرح جاگ کر تہجد پڑھنے میں ثواب اور قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ ہم کو سونے کے اندر بھی ثواب اور قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ جاگنا حق تعالیٰ کے حکم کے تحت ہوا ہے' ایسے ہی سونا بھی حق تعالیٰ کے حکم تحت ہوا ہے، تو وہ جاگنا بھی عبادت اور وہ سونا بھی عبادت۔ اور انسان، مسلمان ہمہ وقت عبادت کا مکلف ہے ہمہ وقت۔ نماز روزہ کی حیثیت سے بھی، وہ بھی عبادت کے تحت ہے اور معاشرت کے اندر بھی، وہ بھی عبادت کے تحت ہے اور اخلاق، وہ بھی عبادت کے تحت ہیں، یہ پوری زندگی اس انسان مسلمان کی عبادت کے تحت ہے۔

لہٰذا اس پر آپ منطبق کر لیجئے، ذاتِ باری تعالیٰ کے اس ارشاد :

وما خلقت الجن والانس اِلَّا لیعبدون کو' اس میں مَا نفی الا کے ساتھ ہے، جب نفی کے ساتھ الا آتا ہے تو حصر ہو جاتا ہے تو معنی کیا ہوں گے؟ کہ میں نے انسان اور جن کو عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ معاشرت کی زندگی بھی، معاملات کی زندگی بھی' اخلاق کی زندگی بھی اور عبادت کی زندگی بھی' یہ سب کی سب عبادت کے ماتحت ہیں۔

زراعت' تجارت وغیرہ بہ تحتِ حکمِ الٰہی' عبادت ہیں :

لہٰذا زراعت ''کھیتی''، تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ اسبابِ معیشت یہ سب کے

سب اگر بتحتِ حکمِ الٰہی ہیں، تو عبادت ہیں۔ جب حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے انسان اور جن کو اپنی عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسجد میں جا کر ٹھہرو، عام طور سے یہی سمجھتے ہیں عبادت کے لفظ سے کہ تسبیح لئے بیٹھے رہو، اللہ اللہ کرتے رہو، کلمہ شریف پڑھتے رہو، درود شریف پڑھتے رہو، تو پھر یہ کھیتی کیسی؟ یہ پیٹ کیوں پیدا کیا؟

انسان فرشتوں سے بڑھ سکتا ہے:

افسوس تم فرشتے ہو کر رہنا چاہتے ہو، تم کو تو اس لئے پیدا کیا ہے اے انسانِ مؤمن! کہ تو فرشتوں سے بھی بڑھ جاوے، اس طرح کہ جو موانع ہیں عبادت کے، ان کو اُٹھا دے اور جو فرائض و شرائط ہیں عبادت کے، ان پر جم جاوے، یہ بات فرشتوں میں کہاں ہے؟ حق تعالیٰ فرشتوں کو دکھانا چاہتے ہیں، دیکھو! میری ایسی مخلوق بھی ہے، کہ ان کی زراعت بھی میرے حکم کے تحت، ان کی ملازمت بھی میرے حکم کے تحت، ان کا جاگنا بھی میرے حکم کے تحت۔

اگر کوئی نماز پڑھے اور پانچوں وقت کی پڑھے، لیکن غیر وقت میں پڑھے، طلوع کے وقت پڑھے، زوال کے وقت میں پڑھے، غروب میں پڑھے، یا روزہ عید کے دن رکھے، بقر عید کے دن رکھے، تو کیا یہ حدود کے اندر ہے؟ اگر کوئی مولوی صاحب اس سے منع کریں، تو کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیسے مولوی صاحب ہیں؟ کہ نماز سے اور روزہ سے منع کرتے ہیں۔ روزہ کے تو بڑے فضائل ہیں اور نفل روزہ کے بڑے ہی فضائل ہیں۔ ارے روزہ رکھنے کو منع نہیں کر رہے ہیں، یہ ذاتِ باری تعالیٰ کے حکم سے جو تجاوز کر رہا ہے، اس سے منع کر رہے ہیں، عید کے دن، بقر عید کے دن روزہ رکھنا تو حرام ہے، اسی طرح طلوع، غروب، زوال کے وقت میں نماز پڑھنا حرام ہے، تمہیں خبر نہیں ہے اس حد کی، اور انہیں خبر

ہے اس حد کی، اس لئے تجھ سے کہہ رہے ہیں۔

تو یہ تجارت' یہ زراعت' یہ ملازمت' یہ صنعت وحرفت وغیرہ وغیرہ آپس کے معاملے' آپس میں باہر اور اندر رہنا سہنا' معاشرت کی زندگی' یہ سب کے سب حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے حکم کے تحت ہو' اور جب تمہاری پوری زندگی میرے حکم کے تحت ہے تو تم عبادت میں ہو، دیکھنے میں تو کھیتی کر رہے ہو لیکن تم عبادت میں ہو۔

بہ تحتِ حکمِ الٰہی پہرہ دینا بھی عبادت ہے :

پولیس کا ملازم، اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے، مہینہ میں تنخواہ ملتی ہے، اس سے وہ اپنے اور بیوی بچوں کے نفقہ کا کام چلانے کے لئے پولیس کی ملازمت کرتا ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے :

''ان لنفسک علیک حقًا ولزوجک علیک حقًا''۔

وہ چوکیدار رات کو پہرہ دیتا ہے، گشت کرتا ہے اور وہ بجائے اللہ اللہ کہنے کے یوں کہہ رہا ہے، جاگو ہوشیار! جاگو ہوشیار! اور ایک فارغ البال شخص اس اخیر رات میں مسجد کے اندر لا الٰه الا اللّٰه، اللہ اللہ کی صدا لگا رہا ہے تو مسجد میں بیٹھ کر اس کو جو ثواب وقرب مل رہا ہے اس چوکیدار کو بھی وہی ثواب اور قرب حاصل ہو رہا ہے۔

جو ثواب وقرب اس کو حاصل ہے مسجد میں بیٹھ کر' وہی اس چوکیدار کو بھی (ضرور) حاصل ہے۔ وہ فارغ البال ہے، اس لئے وہ طریقِ عبادت اختیار کر رہا ہے اور یہ بیچارہ فارغ البال نہیں ہے، اس لئے یہ طریقِ عبادت اختیار کر رہا ہے، وہ ملازم ہے رات میں پہرہ اور گشت کے لئے اس کا وقت متعین ہے، اگر اس نے اس کو ترک کر دیا تو اس کا یہ کمانا نفقۂ حلال ہے؟ ہرگز نہیں، تو یہ پہرہ دار گشت و پہرہ بطاعتِ حکمِ الٰہی کر رہا ہے اور زبان پر اللہ اللہ کرتا نہیں ہے نہ لا الـه الا الـلّٰه کرتا ہے، لیکن بطاعت وحکم الٰہی پہرہ دے رہا ہے۔

لہٰذا ثواب اور قرب میں کچھ کمی نہیں آئی۔

بیماری میں چارپائی پر نماز پڑھنا بھی اطاعت ہے :

اسی طرح سے کوئی صاحب مکہ معظمہ میں مقیم ہیں، وہاں بیمار ہو گئے، حرم شریف تک جا نہیں سکتے، گھر پر چارپائی پر ہی نماز پنجوقتہ ادا کر رہے ہیں، وضو میں پانی نقصان دیتا ہے، اس لئے تیمّم کرتے ہیں تو حرم شریف میں جا کر اُس باصحت' باقوت شخص کو جو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب مل رہا ہے، وہی گھر میں' چارپائی پر تیمّم کے ساتھ پڑھنے والے کو مل رہا ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے : ''**لایکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعھا**''۔ تو حرم شریف جانا اس کی وسعت سے باہر ہے وہ تو کمزور ہے اگر ذرا چلا تو گر پڑے گا، اُسے اندازہ ہے کہ میں چلا تو گر پڑوں گا' اگر چلا اور گر پڑا' تو اس سے سوال ہو گا تجھ سے چارپائی سے تو اُترا نہیں جاتا تھا، پھر تو چلا کیوں حرم شریف کی طرف؟

جب حرم شریف میں جانے، نہ جانے کا یہ حکم ہے تو پھر محلہ کی مسجد میں جانا ایسے بیمار پر کیسے ضروری ہو گا۔ ہاں جسم میں قوت ہے جا سکتا ہے تو جائے' لیکن اگر قوت نہیں ہے تو جیسے کہ ابھی میں نے عرض کیا۔ اس کے لئے یہی حکم ہے، حرم شریف کی حاضری سے بیچارہ معذور ہے، لہٰذا جو ثواب و قرب حرم شریف میں جا کر ملتا ہے وہی چارپائی پر لیٹ کر نماز پڑھنا بھی بتحتِ حکم تھا، اور یہ چارپائی پر نماز پڑھنا بھی بہ تحتِ حکم ہے۔

تو معلوم ہوا کہ جو کام بہ تحت حکم احکم الحاکمین ہے، وہ عبادت ہے، لوگ غلط سمجھے، جو یوں کہتے ہیں کہ اوہو! بلا وضو کے بھی کوئی نماز ہے مسجد کی بھی شرط نہیں، بھلا وہ بھی کوئی نماز ہے؟ ایسا شخص جاہل ہے۔

عابد اور عارف کا فرق :

وہ عابد جو گھر پر اس طرح پنج وقتہ نماز پڑھ رہا ہے، وہ عابد بھی ہے اور عارف باللہ

بھی ہے اور جو اس کے ہوتے ہوئے گھر پر نماز پڑھ رہا ہے اور حرم شریف میں حاضری کی محرومی کا تصور کر کے رنج کھا رہا ہے تو یاد رکھئے گا وہ عابد تو ہے مگر عارف نہیں۔ عابد ہونا اور بات ہے اور عارف ہونا اور بات ہے، عارف اُسے کہتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی پہچان آ گئی ہو اور عابد وہ ہے کہ ذکر و شغل تو بہت کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا پہچاننا جسے پہچاننا کہتے ہیں، نہیں ہے۔

ایک عابد کا واقعہ :

جیسا کہ میرے حضرت مولانا التھانوی صاحبؒ نے ایک واقعہ سنایا کہ مکہ معظّمہ میں ایک صاحب بے چارے بیمار ہو گئے اور حرم شریف کی حاضری سے بیچارے معذور ہو گئے، جب وہ تندرست ہو گئے تو ہمارے پیر دادا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں مجلس میں حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی ہوئی، پھر ملال و رنج کے لہجہ میں کہا:

”حضرت میں اتنے دن حرم شریف کی حاضری سے محروم رہا، حرم شریف میں حاضر نہ ہو سکا، گھر پر ہی نماز پڑھتا رہا“۔

حاجی صاحب نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کا آپ کو حرم شریف میں حاضری کا حکم ہوتا رہا، آپ وہاں آتے رہے اور جب اللہ تعالیٰ کا حکم گھر پر بستر پر پڑ کر نماز پڑھنے کا ہوتا رہا، تو وہاں ادا کرتے رہے، تو آپ ملال کیوں فرما رہے ہیں؟ اس وقت وہ حکم کے تحت تھا۔ اب یہ حکم کے تحت ہے، وہ صاحب کچھ دیر بیٹھے، پھر چلے گئے، جب مجلس ختم ہو گئی اور کچھ مخصوص صاحبان رہ گئے تو حاجی صاحب نے فرمایا :

”یہ جو ابھی آئے تھے عابد تو ہیں، عارف نہیں ہیں“۔

یہ دلیل احقر نے پیش کی، وہ کلیہ پیش کیا تھا اور حاجی صاحبؒ اپنے زمانہ کے ایسے تھے کہ مکہ معظّمہ میں جو علماء بڑے بڑے خطاباتِ دین کی میراث کے پائے ہوئے تھے وہ

بھی حاجی صاحبؒ کی خدمت میں مجلس شریف میں حاضر ہوتے تھے تو حاجی صاحبؒ فرما رہے ہیں کہ یہ عابد تو ہیں ابھی عارف نہیں، عارف وہ ہے کہ جب حرم میں بلایا، چلے گئے، نہیں بلایا، نہیں گئے۔

اس لئے احقر نے عرض کیا تھا کہ عابد ہونا اور بات ہے، عارف ہونا اور بات ہے۔

حدود کا تحفظ ضروری ہے :

حدود کا مضمون اپناؤ، یہ فرض ہے، ضروری ہے اور جہاں حد سے تجاوز ہوا خواہ ذاتِ باری تعالیٰ کے فرمان سے پیچھے ہٹ کر یا آگے بڑھ کر، کہ یہ دونوں خلافِ حدود ہیں تو وہ قربِ الٰہی اور وصول الی اللہ سے محروم ہے۔ حد سے بڑھنا اور حد سے پیچھے ہٹنا، یہ دونوں کے دونوں ممنوع ہیں۔

حق تعالیٰ کے یہاں تاویلیں نہیں چلیں گی :

اپنے جی میں خوش ہولو، اپنے جی میں تاویلیں کرلو، کہ ہم بھی معذورین کی فہرست میں داخل ہیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ....

کار ہا با خلق آری جملہ راست
با خدا تزویر وحیلہ کے رواست

یعنی تو مخلوق کو تو اپنے طرزِ عمل سے دکھا سکتا ہے کہ یہ کام ٹھیک کر رہا ہے لیکن ذاتِ باری تعالیٰ کے سامنے یہ تیرا حیلہ حوالہ چل نہیں سکتا۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جی ہاں یہ تاویلیں ہیں کہ مسجد میں اس لئے نہیں جاسکتا فلاں عذر ہے اور حالانکہ جاسکتا تھا، تو یہ حیلہ ہوگیا، تو مخلوق تو سمجھ گئی کہ ہاں عذر ٹھیک ہے، لیکن تیرا تعلق تو خالق سے ہے، کیا سمجھے؟ یعنی مخلوق سے روگردانی کر، مخلوق سے نظر انداز ہو، نظر بر خالق رکھ، تو مخلوق کو

دھوکہ دے سکتا ہے، خالق کو نہیں دے سکتا، متوجہ کر دیا، متنبہ کر دیا۔

تو انسان مسلمان کی پوری زندگی ایمان وعقائد کی تصحیح کے بعد، کاہے کی ہے؟ عبادت کی ہے، کب؟ جبکہ اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر عبادت کرے۔

عورت کے گھر کا کام ہی عبادت ہے:

اسی لئے عورت کے لئے گھر کی چہار دیواری کے اندر رہ کر بچوں کی پرورش، گھر کی صفائی، گھر کا نظام وانتظام اپنے لئے' اپنے شوہر کے لئے ناشتہ، کھانا پکانا، مہمان آجائیں تو مہمان نوازی کا خیال رکھنا۔ یہ سب کا سب عبادت ہے، اور اگر آپ یوں کہیں کہ عورت تو کہنا نہیں مانتی تو آپ اصلاح کرتے رہئے آپ کو ثواب ملے گا۔

ناشتہ پر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ یاد آگیا، ناشتہ کی دلیل پیش کر رہا ہوں، قرآنِ پاک میں یہ واقعہ آیا ہے:

''واذ قال موسٰی لفتٰه لاابرح حتّٰی ابلغ مجمع البحرین او امضی حقبًاo''

اس آیت میں بڑے مسائل وجزئیات ہیں، ان سب کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کے حکم سے سفر کیا۔ حضرت یوشع علیہ السلام کو ساتھ لے لیا، چلتے چلتے ایک جگہ پتھر سے ٹیک لگا کر سو گئے، جب بیداری ہوئی تو یوشع علیہ السلام سے فرمایا ارے بھائی! وہ جو مچھلی ناشتہ کے لئے رکھی تھی وہ ناشتہ ذرا لاؤ، میں تھک گیا۔

اٰتِنا غداء نا لقد لقینا من سفرنا هذا نصبًاo

تو غداء صبح کا کھانا، معلوم ہوا کہ جہاں دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا ہے وہاں ناشتہ بھی ہے، یہ تین وقت ہو گئے ہماری اصطلاح میں ناشتہ دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا، تو صبح ہی بیوی صاحبہ ناشتہ کی فکر میں لگ گئی' اب اشراق وچاشت کس وقت پڑھے تو مرد جو

فارغ البال ہے اُسے فرصت ہے اشراق وچاشت کی۔

اشراق کے وقت ہی چاشت پڑھ لے :

اگر چہ چاشت کچھ دیر بعد میں ہے لیکن اشراق کے وقت فرصت ہے تو اشراق کے وقت ہی چاشت کو پڑھ لے، کس طرح؟ اس طرح کہ اشراق کی نماز پڑھ کر رُک جاوے، دو چار منٹ یا ذرا اُٹھ جاوے کہ فصل ہو گیا، تو اشراق کے بعد ہی چاشت بھی پڑھ لے کیونکہ پھر اُسے فرصت نہیں ملے گی، تدریس کا کام ہے، پڑھانے کا کام ہے تو اب اس کو وقت کہاں ملے گا بالخصوص سردی کے موسم میں دن بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

طالب علم کو کہاں فرصت ہے اس فکر میں ہے کہ تعلیم میں حرج نہ ہو، تکرار کرانے میں حرج نہ ہو، مطالعہ میں حرج نہ ہو، اسباق کی پابندی، آموختہ میں حرج نہ ہو، تو اس کو کہاں فرصت ہے اور ہے بیچارے کو نفلوں کا شوق لہٰذا بعد فجر تلاوت کرتا رہا اور سورج نکلنے کے دس منٹ بعد اشراق پڑھ لی اور اسی وقت دو چار رکعت بیچارے نے اور پڑھ لی۔

''یہ مسائلِ سلوک ہیں صاحبِ سلوک کے لئے''، مسائل کے نہ جاننے سے بیچارہ گھبرا جاتا ہے، جیسے مکلّف بالغ، عاقل کے لئے فقہ کے مسائل ہیں، ایسے ہی سلوک کے بھی مسائل ہیں۔

تہجد کی بارہ رکعات ہی لازم نہ کرے :

یہ نہیں کہ بارہ رکعات ہیں تہجد کی، تو پوری بارہ ہی پڑھے، جیسا موقع ہو، جیسی سہولت ہو، جیسی صحت ہو کہ ''کام سے بڑھ کر سہولت' مرض سے بڑھ کر صحت'' تو بدرجۂ صحت بدرجۂ سہولت، اگر موقع چار کا ہے تو چار پڑھ لے، آٹھ کا ہے آٹھ پڑھ لے، چھ کا ہے چھ پڑھ لے، دس کا ہے دس پڑھ لے اور بارہ انتہا ہے لیکن بارہ رکعات متعین نہیں کرنا چاہئے۔

سلوک کی تعلیم ہشاش بشاش رہنا ہے :

اس لئے کہ سلوک کی تعلیم یہ ہے کہ دل کو ہشاش بشاش رکھنا، ہنس مکھ رکھنا، رنجیدگی سے بچانا، طبیعت کے بجھے ہوئے رہنے سے بچانا۔

احقر نے طبیعت کے بجھے ہوئے رہنے سے کہا ہے، تو طبیعت کو بجھے ہوئے رہنے سے بچانا، کیونکہ زمانہ کی رفتار و گفتار اور کچھ مراحل ایسے آرہے ہیں کہ طبیعت بجھ سی جاتی ہے، تو سلوک بجھے ہوئے رہنے سے منع کرتا ہے۔

بجھے ہوئے دل سے کوئی کام نہیں ہوتا :

سلوک میں داخل ہونے والے جس کو طالب علم کہتے ہیں، سلوک یہ تعلیم کررہا ہے کہ خبردار ! دل کو بجھا ہوا مت رکھنا، بات سمجھ میں آئی ڈاکٹر صاحب! آپ تو کل جارہے ہیں، آپ کشمیر کے ہیں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ طالب علم کے لئے کہاں فرصت ہے۔

طلبہ کے لئے رائج کھیل ٹھیک نہیں :

جب چاشت و اشراق کے لئے یہ کہا جارہا ہے کہ چاشت کو اشراق کے وقت ہی پڑھ لو، تو پھر کھیلنے کے لئے کہاں فرصت ہے آپس میں ملنے جلنے کی کہاں فرصت ہے، آپس میں بیٹھنے اُٹھنے کی، اِدھر اُدھر کی باتوں کی کہاں فرض ہے جب چاشت اور اشراق کے لئے یہ کہا جارہا ہے تو اِدھر اُدھر کھیلنے کودنے کہاں جارہا ہے۔

اللہ کا خوف کتنا ہونا چاہئے :

خوفًا کے معنیٰ ہیں ڈرتے ہوئے، اس لئے کہ میری عبادت کرتے رہنے سے کہیں تمہارے اندر تکبر نہ آجاوے، کہیں عجب وخود پسندی نہ آجاوے، اس لئے ڈرتے ہوئے، توفیق کی دعا کرتے ہوئے نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے، عبادت کرتے رہو اور

جب تم عبادت کے اندر لگے ہوئے ہو اور تکبر سے بچنے کے لئے خوف بھی اپنے اندر لے آئے ہو، تو اُمیدوارِ رحمت نہ ہونا کیسا؟

رحمت سے نا اُمیدی کفر کا کام ہے:

اس لئے کہ نا اُمیدی یہ کافر کا کام ہے۔ **انہٗ لا یایئس من روح اللّٰہ الا القوم الکفرون** ۔اور تمہارے لئے تو یہ حکم ہے **لاتایئسوا من روح اللّٰہ** ۔اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا اُمید مت ہو، نا اُمید ہونا یہ کفر کی بات ہے اور پھر سالک سلوک میں داخل ہو کر عبادت کے اندر لگا ہوا اور اس طرح خوف؟ وہ تو کفر کی طرف جانے لگا اور عبادت کرتے ہوئے تقویٰ اختیار کرتے ہوئے جا رہا تھا، ایمان کی تقویت کی طرف تو اس سالک کے پاس شیطان آ گیا، اس نے خوف دلا کر نا اُمیدی کی طرف لے جانا شروع کر دیا۔

نا اُمیدی کی بات نہ زبان پر لاؤ' نہ قصداً دل میں:

ایسی نا اُمیدی کی بات زبان پر مت لاؤ، اور دل کے اندر ''قصداً'' مت لاؤ، تمہاری طبیعت بجھ جائے گی۔ اے سالک! تیری طبیعت کی کشش جو حق تعالیٰ کی طرف محبت میں ہونا چاہئے تھی وہ نہیں رہے گی، وہ بشاشت نہیں رہے گی' اور ایمان چاہتا ہے بشاشت کو' جیسا کہ بخاری شریف میں ہے:

''وکذلک الایمان حین تخالط بشاشتہ فی القلوب''۔

ایمان کا ایسا ہی حال ہے (کہ آ جاتا ہے تو جانے کا نام نہیں لیتا) جبکہ اس کی بشاشت دلوں میں گھل مل جاتی ہے۔

بشاشت ہے تو ایمان بڑھتا ہوا چلا جائے گا اور بشاشت نہیں ہوگی تو ایمان گھٹتا ہوا

چلا جائے گا، اسی کو بشاشت کہتے ہیں اور کسے کہتے ہیں؟

نفسِ ایمان بھی بشاشت کو چاہتا ہے :

تو اوّل تو ہر مؤمن کے اندر ایمان ہے اس کے اعتبار سے بشاش' لیکن جب ایمان کے ساتھ عبادت بااخلاص' سلوک بالترتیب ادا کر رہا ہے، فرائض کا' واجبات کا' سنتِ مؤکدہ کا' چھوڑنا تو کیا نوافل کی بھی پابندی کر رہا ہے۔ لِلّٰہ رضاءالٰہی کی نیت کے ساتھ، تو پھر یہ ناامیدی کیسی؟ ''شیطان آ گیا'' وہ تو قسم کھا کر آیا ہے یا قسم کھا کر نہیں آیا؟ ضرور قسم کھا کر آیا ہے وہ یوں کہہ کر رہا ہے :

لاتخذن من عبادک نصیبًا مفروضًا ۔لامِ تاکید بانونِ ثقیلہ ہے، کہ میں ضرور تیرے بندوں سے اپنا مقرر حصہ اطاعت کا لوں گا' **ولاضلّنھم** اور میں ان کو گمراہ کرونگا **ولامنینّھم** میں اس انسان کے اندر ایسی دنیا کی ہوسیں ڈالوں گا، ایسے منصوبے بھر دوں گا جو اطاعت کے کام کا نہ رہے **وَلَا مرنھم** اور میں ان کو تعلیم دوں گا۔

فلیبتکن آذان الانعام ،جس سے وہ چوپایوں کے کانوں کو تراشا کریں گے' کسی نے پوچھا ارے بھائی! یہ کان چھیدا ہوا کیوں ہے؟ تو کہتا ہے اجی مولوی جی! کوئی بیماری تھی، اس لئے چھدوالیا **ولّامرنّھم** اور میں ان کو تعلیم دوں گا، **فلیغیرن خلق اللّٰہ** جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے کہ اچھی صحیح صورتوں پر نہ رہیں، کبھی فیشن کے سر کے بال بڑھا لئے، کبھی لباس فیشن کے پہن لئے، کبھی چہرہ اسلام سے ہٹ کر دوسروں کا چہرہ اختیار کر لیا، عورت کے اگر داڑھی ہو جائے، بعض کے ہو جاتی ہے، ہم نے دیکھا ہے، بال نکل آتے ہیں، اس کو حکم یہ ہے توڑ دے، اس کو کھینچ دے۔

اسلامی حدود سے نکلنا اسلامی صورت بگاڑنا ہے :

اور صورت بگاڑنے کی معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ داڑھی مونڈائے صرف، بلکہ جو چیز بھی

اسلامی حدود سے باہر ہے، جیسا کہ آج مسلمانوں کا طبقہ بگڑتا چلا جا رہا ہے، سر کی ٹوپی اُتر گئی، ننگے سر پھرتا ہے' صورت بگڑ گئی، لباس وہ پہنتا ہے جو اسلام کے خلاف ہے، جکڑا جکڑا یا، رانوں سے لگا ہوا، پیچھے سے لگا ہوا اور یہاں سرین تک کا کرتا جو کرتی ہے اگر گھٹنے تک ذرا ہوتا تو کچھ چھپا رہتا، تو شیطان جو قسم کھا کر آیا ہے' میں ان کی صورتوں کو بدلنے کا حکم دوں گا، تو بدل رہے ہیں کہ نہیں بدل رہے؟ لباس کے اعتبار سے' چہرے کے اعتبار سے' کھانے کے اعتبار سے کہ بجائے بیٹھ کر کھانے کے، میز کرسی پر کھاتے تھے اور اب تو بجائے اس پر بیٹھ کر کھانے کے کھڑے کھڑے کھاتے ہیں۔ میز پر کھانے لگا دیئے' دعوتوں' شادی بیاہ وغیرہ میں' خیر کھڑے کھڑے کھا لیتے ہیں، اب تو شادی بیاہ وغیرہ کی دعوتوں میں ناچتے ناچتے کھاتے ہیں' یہاں سے یہ کھا لیا، پر آگے بڑھ گئے، پیچھے والا آگے آ گیا، تو ناچتے ہوئے کھا رہے ہیں، یہ بھی صورت بدلنا ہی ہے۔

صورت صرف چہرہ ہی کو نہیں کہتے:

آپ کے پاس میراث کا مسئلہ آتا ہے، آپ اسہام تقسیم کر دیتے ہیں، باپ کو اتنا ماں کو اتنا، بہن کو اتنا، بیوی کو اتنا، سہام تقسیم کر کے آپ نیچے لکھتے ہیں کہ صورتِ مسئلہ یہ ہے پھر آپ لمبی لکیر کی شکل میں لکھتے ہیں میت ـــــــــــ ، پھر اس کے نیچے رؤس وسہام قائم کرتے ہیں تو یہ جو آپ اور پر لکھتے ہیں صورتِ مسئلہ یہ ہے، تو کیا اس کی بھی ناک ہے، اس کے بھی کان ہیں۔

تو صورتِ مسئلہ جو لکھا آپ نے تو کیا وہ چہرہ ہے اس کا۔ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی صورت جدا ہوتی ہے۔ یہاں آپ جدول نقشہ کو صورت کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا جو صورت اسلامی ہے اور جو صورت صحیح مردی ہے کہ ابتداء ہوتی تھی تمرد سے اور تے ہٹا کر مرد سے، تو یہ صورت اختیار کی ہے، اس مسلم نے ''غیر مسلمی''، خلافِ اسلامی'' کی یہ تمرد نہیں تو پھر اور کیا

ہے؟ سرکشی نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ تمرد، تمرد اور سرکشی، سرکشی میں فرق ہوتا ہے "یہ دفع دخل مقدر کیا ہے" مگر تمرد ہے یا نہیں ہے؟ سرکشی ہے یا نہیں؟ لباس بھی اور، چہرہ بھی اور، کھانے کا طریق بھی، تو شیطان نے قسم کھائی تھی تا کہ ضرور بالضرور ان کی صورتوں کے اندر تغیر و تبدیلی پیدا کراؤں گا، میں ان کے اندر غیروں کی چیزیں پیدا کراؤں گا۔

قرآنِ کریم میں فَلَيُغَيِّرُنَّهُمْ میں غیر کا لفظ ہے نا، اور غیر مؤمن میں بھی غیر ہے اسی غیر سے تو لام تا کید با نونِ تا کید لگا کر فَلَيُغَيِّرُنَّ بنا ہوگا کہ یہ غیروں کی باتیں اختیار کریں گے، غیروں کی باتیں جو اسلام سے خارج ہیں، اسلام میں داخل نہیں ہیں، میں ان غیروں کی صورت، شکل، لباس کے اندر ان کو کردوں گا۔

لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مخلص بندوں پر میرا بس نہیں چلے گا، اس لئے ان کو مستثنیٰ کردیا: الا عبادک منهم المخلصين ٥ کہ جو آپ کے بندے مخلص ہوں گے، ان پر میرا قابو نہیں چلے گا، وہ جانتا تھا، بڑا گھاگھ ہے، اس لئے استثناء کر دیا۔

شیطان باشارۃ النص یوں کہہ رہا ہے کہ میں جو بگڑا ہوں اور بگاڑنے کی جو قسمیں اس طرح کھا رہا ہوں' اس لئے کہ میں عالم تو تھا، عابد تو تھا مگر میں مخلص نہ تھا۔ یہ کہہ رہا ہے کہ میں مخلص نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں ایسا کیوں ہوتا؟ اے علماء کرام! اے عابدینِ عظام! مجھ سے سبق حاصل کرلو، "پھر مکرر" اے علماء کرام! اے عابدینِ عظام! مجھ سے سبق حاصل کرلو، میں عالم تھا میں عابد تھا لیکن مخلص نہ تھا، اس لئے اس نوبت کو میں پہنچ گیا۔ اے عالمو! ذرا اپنے علم کے ساتھ اخلاص کا استحضار رکھنا، اور اے عابدو! ذرا اپنے لئے رضائے الٰہی کا خیال رکھنا اور جو ان کا حکم ہو' اس میں برابر بدون اس کے کہ کیا ملے گا، لگے رہنا، اس سے خالی الذہن ہو کر رہنا کہ علمِ دین حاصل کرنے سے اور عبادت کرنے سے کیا ملے گا؟ بس اصل مخلص ہو جاؤ گے۔ اسی لئے مولانا اور عبادت کرنے سے کیا ملے گا؟ بس عالموں سے

زیادہ سالک اور کون ہوگا؟ ....

یا بم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس سے قطع نظر، وہ حاصل ہو، یہ میری اِک تمنا ہے، لیکن میری اس پر نظر نہیں ملے، چاہے نہ ملے، اس سب سے نظر انداز ہو کر، اسی کا ہو کر حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ یہ ہے حقیقی اخلاص...... اور جو یوں کہہ رہا ہے کہ میں تو عبادت کرتے کرتے اور تلاوت کرتے کرتے اور وظیفے کرتے کرتے مر مٹا، مجھے تو کچھ ملا نہیں، بیماری وہیں، غریبی وہیں، دشمنوں کی بوچھاڑ بھی وہیں، اور جو دنیاوی چیزیں ضرر کی تخیل میں ہوتی ہیں وہ سب وہیں، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کو عبادت، فرائض، واجبات نہ چھوڑ دے یہ سوچ کر کہ میں مؤمن تو ہوں لیکن کافروں کو تو ایسا، ایسا مل رہا ہے، "آ گیا شیطان"، اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی پناہ میں محفوظ رکھے۔ (آمین)

دنیوی ہوسیں سلب علم کا سبب ہوسکتیں ہیں :

جب دنیاوی طمعیں اور ہوسیں حصولِ علم اور عبادت کے کاموں کے ذریعہ اس عالم و عابد کے اندر شیطان نے پھیلا دیں، کہ **ولاُمنینّھم** کا یہی مفہوم ہے اور وہ ملتی نہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عبادت ہی چھن جائے، یہ علم ہی چھن جائے۔ دیکھ لیجئے **انما الاعمال بالنیات** تو بخاری شریف میں پہلے پڑھایا جاتا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمۃ الباب سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ اسی لئے ہے کہ امام بخاریؒ بطورِ اشارہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ طلبِ علم میں اپنی نیتیں دیکھ لو، کیا ہیں؟

الغرض شیطان بزبانِ قال تو یہ کہہ رہا ہے کہ آپ کے مخلص بندوں پر میرا اثر نہیں ہوگا اور بزبانِ حال یہ کہہ رہا ہے کہ میں مخلص نہیں تھا اگر میں مخلص ہوتا تو میرا یہ حال عالم

ہونے، عابد ہونے کے باوجود نہ ہوتا۔

مردوں کے خطاب میں عورتیں بھی داخل ہیں :

تو اللہ تعالیٰ مؤمن مرد کو "مرد ہوکر" رکھنا چاہتے ہیں۔ مؤمن مرد میں سبھی آ گئے، مرد بھی اور عورتیں بھی آ گئیں، یہ تو محاورہ ہے، قرآن شریف میں جگہ جگہ یایھا الذین آمنوا، یایھا الناس مذکر کے صیغے ہیں تو کیا عورتیں اس میں داخل نہیں ہیں؟ ضرور ہیں، تو ذاتِ باری تعالیٰ مؤمن مرد کو مرد بن کر رہنے کی تعلیم فرما رہے ہیں اور تمرد سے بچنے کا حکم دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ شیطان سے سبق حاصل کرلو، وہ متمرد تھا باشتقاقِ تمرد، اس لئے دیکھو اس عالم، عابد کا کیا حشر ہوا؟ غلطی ہونا اپنی جگہ پر، یہ تو انسان کا خاصہ ہے مگر متمرد جس کو سرکش کہتے ہیں، کہ مان کر دیتا ہی نہیں ایسے سرکش اور متمرد کا تو سر کھینچ دیا جاتا ہے یعنی اس کا سر کاٹ دیا جاتا ہے۔

"سرکش" کشیدن سے ہے جس کے معنیٰ ہیں کھینچنا، یہ سرکش اسمِ فاعل سماعی ہے، فارسی کا کشیدن سے کش امر حاضر معروف ہے اور سر یہ اسم ہے اور ایک اسم اور امر حاضر معروف مل کر اسم فاعل سماعی بنتا ہے، سماعی اسے کہتے ہیں کہ ہم نے اہل فارس سے اسی طرح سُنا ہے، اس لئے ہم اسی طرح کہہ رہے ہیں، تو سماعی کا قاعدہ مقرر نہیں ہوتا اور قیاسی اور چیز ہے کہ اس کا قاعدہ مقرر ہوتا ہے، تو اہلِ فارس کشیدن سے اسم فاعل سرکش بناتے ہیں کہ جس کے معنیٰ ہیں سر کھینچنے والا، اور سرکشی کا اثر یہی ہوتا ہے کہ اس کا سر کھینچ دیا یعنی کاٹ دیا جاتا ہے، اسی سرکش کو عربی میں متمرد کہتے ہیں جو تمرد سے مشتق ہے اور تمرد کی تے نکال دیجئے تو مردرہ گیا۔

عمل مطلوب ہے نہ کہ زوالِ مادہ :

تو معلوم ہوا کہ مؤمن مرد کو مرد ہوکر رہنا چاہئے، قوتِ شہوت کا گویا عملی حیثیت

سے قلع قمع کر دیا، ''لفظ حیثیت سے'' میں نے دفع دخل مقدر کیا ہے کیونکہ مادہ تو ہے لیکن عملاً مرد ہو کر رہنا چاہئے۔ اور مرد ہو کر رہنے کی تین باتیں ہیں، جن کو پہلے عرض کیا تھا وہ جس میں جس درجہ کی ہوں گی اس کو مردِ کامل یا ناقص کہا جائے گا۔ وہ کیا ہیں؟ قوتِ شہویہ میں عفت' اگر قوتِ شہویہ میں پہلے غلطی ہوگئی ہے تو توبۂ نصوح ہوگئی، بس بے فکر' حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

یاایھا الذین آمنوا توبوا الی اللّٰہ توبۃً نصوحًا ،یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ تجھ انسان سے خطا نہیں ہوگی، لیکن یوں کہتا ہوں کہ خطا نہ ہوتی رہے' جو ہوگئی۔

توبۂ نصوح کے بعد آدمی بزرگ بن سکتا ہے:

اے مؤمنو! اس سے توبۂ نصوح ''پکی توبہ کرلو'' کہ ندامت کے ساتھ ماضی سے توبہ کر لی اور مستقبل کے لئے پکا عہد کر لیا کہ اب میں اس کے پاس اور ایسی خلافِ شرع باتوں کے پاس نہیں جاؤں گا، یہ توبۂ نصوح ہوگئی، بڑے بڑے اولیاءِ کرام ہوئے ہیں ان کا تذکرہ سنیں تو تعجب ہو جائے، جی ہاں!

فضیل بن عیاضؒ کی توبہ:

ایک بزرگ گزرے ہیں فضیل بن عیاضؒ، چشتیہ کے شجرہ کے اندر ان کا نام آتا ہے، یہ ابراہیم بن ادھمؒ کے شیخ ہیں، اور ان کے شیخ عبدالواحدؒ اور ان کے شیخ حسن بصریؒ اور ان کے شیخ حضرت علیؓ اور پھر حضورِ اکرم ﷺ ہیں ہی۔

شجرہ کا محفوظ رکھنا یہ بھی سلوک کا مسئلہ ہے، تو فضیل بن عیاضؒ بڑے پکے ڈاکوؤں کے سردار ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے جو توبہ کی ہے تو کیا بنے؟ بڑے اولیاء کرام میں سے ہو گئے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں اور جب امام صاحبؒ نے بیس افراد کو

تدوینِ فقہ کے لئے جمع کیا تھا تو فضیل بن عیاضؒ کو بھی بلایا گیا تھا۔ بعض فقہاء نے امام صاحبؒ سے تعجباً عرض کیا کہ آپ نے ان کو بھی فقہاءِ کرام کے ساتھ ترتیبِ فقہ میں بلالیا تو امام صاحبؒ نے کیا فرمایا؟ کہ :

''یہ ایسا شخص ہے اگر ہم سے کوئی بات دین کے خلاف کی دیکھے گا تو ضرور ٹوکے گا، اس لئے رکھ لیا ہے''۔

دیکھو ! فضیل بن عیاضؒ کی کتنی اونچی بات ہوگئی۔ اسے کہتے ہیں توبۂ نصوح، کہ جو ماضی میں ہوگیا، ہوگیا مگر توبہ کی پکّی ندامت کے ساتھ۔

توبہ کیلئے ندامت طبعی کافی نہیں ندامت شرعی مطلوب ہے :

لیکن صرف طبعی ندامت کے ساتھ نہیں، طبعی ندامت اور چیز ہے، عقلی شرعی ندامت اور چیز ہے، مثلاً کوئی چور چوری کرنے گیا، نقب دیا، اتنے میں چوکیدار اسی گلی میں آگیا، اس چور نے دیکھ لیا، شرمندہ ہوگیا اور بھاگا، تو یہ شرم اس کی طبعی ہے، عقلی شرعی نہیں ہے۔

ندامتِ شرعی کی حقیقت :

غور سے سنئے ! ندامتِ شرعی عقلی کا اعتبار ہے کہ آئندہ اس کام کے پاس اس کام کے پیچھے، اس کام کی طرف نہ جائے تو دیکھو! میں نے ولی کی ایک مثال دی کہ ماضی میں کیسے تھے؟ توبہ کے بعد کیسے ہوگئے، ایسا بڑے بڑے اولیاء کا حال ہے میں کس کس کا نام لوں۔

بعض بزرگ مولوی نہ تھے مگر مولوی گر تھے :

اور ایسے ایسے بھی گذرے ہیں کہ جنہوں نے عربی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا،

مولوی تو کیا ہوتے، ہماری اصطلاح ہے کہ میزان سے لے کر بخاری شریف وغیرہ دورۂ حدیث شریف تک پڑھنے کا نام مولوی ہوتا ہے، تو بعض اولیاء اللہ ایسے گذرے ہیں کہ ایک حرف نہیں پڑھا عربی کا لیکن مولوی صاحبان اور عالموں کے لئے عالم گر بن گئے۔

شیخ کو وقتاً فوقتاً اصلاح و تبلیغ ضروری ہے:

کہیں ایسا نہ ہو شیخ صاحب کے یہاں حلقہ ہو رہا ہے، شیخ صاحب گردن جھکا کے بیٹھ گئے، مریدین کیا، کیا، تصور کر رہے ہیں، نہ معلوم عرش پر پہنچ گئے ہیں یا کرسی کی سیر کر رہے ہیں' ارے! کر رہے ہوں گے جو کچھ کر رہے ہوں گے لیکن مریدین کے پلے تو کچھ نہ پڑا۔ جب آپ کے پاس سے "خانقاہ" سے گھر پہنچیں گے تو چونکہ ان کے کانوں میں تو سلوک کی کوئی بات بھی نہیں پڑی' روک ٹوک بھی نہیں ہو رہی ہے' پھر تو جو باتیں پیش آویں گی' ان کے پیش آنے پر رہبری کون کرے گا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ کو ٹرا ہونا چاہئے، یہ مولانا ہی کے لفظ ہیں کہ شیخ ٹرا ہونا چاہئے، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ معین الدین چشتی کی خدمت میں تیس سال رہے، حضرت والا فرماتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ بہت بڑے عالم ہیں، اور حضورِ اکرم ﷺ کے روضۂ اطہر پر مدینہ منورہ میں حاضری رہتی تھی۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ معین الدین ہندوستان جاؤ! تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل میں ہندوستان آئے تھے، راستہ میں جگہ جگہ لوگ ان سے بیعت ہوتے رہے، چلتے چلتے یہاں پہنچ گئے، لمبا قصہ ہے تو دیکھئے قطب الدین بختیار کاکیؒ عالم نہیں تھے، لیکن ایسے شیخ عالم کے پاس بہ نیتِ اصلاح، بہ طلبِ صادق، بفکرِ آخرت رہے۔ آخر سند سلسلۂ اجازت لے کر دہلی آئے، پھر کیسے ہوئے؟ ایسے ہوئے کہ شیخ بابا فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ جو متبحر عالم تھے، خواجہ قطب

الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

صحابی تو نہیں، جنید ہو سکتے ہیں :

میرے حضرت فرماتے تھے کہ صحابی تو نہیں بن سکتا نبوت ختم ہو چکی لیکن جنید بن سکتا ہے، بس ندامت کے ساتھ ماضی سے توبہ کر لے مستقبل کے لئے عہد کر لے، جو نمازیں چھوٹ گئی ہیں ان کو ادا کرنے کا اہتمام شروع کر دے، جو روزے رہے ہوئے ہیں ان کے ادا کرنے کا اہتمام کر لے، اگر خدا نے مال دیا ہے تو پچھلی زکوۃ ادا کرنے کا اہتمام شروع کر دے اور زیادہ مال ہے تو حج بیت اللہ کا اہتمام کر لے اور اگر کسی کا مالی حق ہے اس سے معافی مانگ لے یا اگر مال پاس ہے جا کر ادا کر دے۔ جو حقوق اللہ، حقوق العباد اس طرح ادا کرنے کا اہتمام شروع کر دے تو وہ ولی ہو گیا، توبہ سے معصیت معاف ہوتی ہے، حقوق معاف نہیں ہوتے۔

عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ متمرد نہ بنو مرد ہو کر رہو اور مرد ہو کر رہنے کی صورت یہ ہے کہ تین چیزیں ہیں قوتِ شہویہ، قوتِ غضبیہ، قوتِ عقلیہ۔ ان تینوں چیزوں میں اعتدال کا نام ''مردِ کامل'' ہونا ہے۔

تو بات اس پر چلی تھی کہ قوتِ شہویہ پہلے تھی جیسی تھی اب توبہ کر لی پھر توبہ پر بعض اولیاء اللہ کا ذکر آ گیا تھا، کہ ایسے تھے اور پھر توبہ کرنے سے ایسے ہو گئے۔ جب قوتِ شہویہ سے توبہ کی تو اس کے اندر توبہ کر کے اعتدال آ کر عفت آ گئی۔ قوتِ غضبیہ کے اندر توبہ کر کے اعتدال آ کر شجاعت آ گئی، اور قوتِ عقلیہ کے اندر اعتدال آ کر افراط و تفریط سے بچ کر حکمت آ گئی۔ ان تینوں قوتوں میں تین تین درجے ہیں، پہلا درجہ افراط، دوسرا درجہ تفریط اور تیسرا درجہ اعتدال، اسی درجۂ اعتدال کا نام قوتِ شہویہ میں عفت ہے، قوتِ غضبیہ میں شجاعت ہے اور قوتِ عقلیہ میں حکمت ہے۔

تو شیطان کے اندر تمرد تھا، اس لئے متمرد ہو گیا، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ملعون ہو گیا۔ اسی لئے حق تعالیٰ کیا فرماتے ہیں، انسان مؤمن مسلمان کو؟ کہ تم کو موت کے وقت تک مرد ہو کر رہنا چاہئے۔ جب عفت شجاعت اور حکمت آ گئی تو مرد ہو گئے، جب مرد ہو کر رہے گا تو کوئی رنج کی بات پیش آ جاوے گی تو کیا رنجیدہ ہو کر رہے گا؟ ہرگز نہیں ورنہ پھر کیا مرد ہوا کہ رنج کی بات پر رنجیدہ ہو کر رہتا ہے۔ ''ضمناً کلام آ تا رہتا ہے''۔

گفتگو سالک سے ہو رہی تھی، تو اے سالک! سلوک کو طے کرنے والے تیرے پاس دنیاوی اعتبار سے رنج کی بات پیش آنے پر تو کیا رنج ہو، دین کی بات میں بھی اگر کسی وقت کمی معلوم ہو، رنج طبعی ہونا تو ہے، رنجیدہ رہنا نہیں ہے، حق تعالیٰ رنجیدہ رہنے سے منع کرتے ہیں۔ میں نے ایک عابد صاحب کے حرم شریف میں بیمار ہوتے کا واقعہ سنایا تھا اور یہ بھی پیشِ خدمت کیا تھا کہ میرے دادا پیر صاحب نے کیا فرمایا تھا؟ ''عابد ہونا اور بات ہے اور عارف ہونا اور بات ہے۔ لہٰذا اے مسلمان ! ''مردِ کامل'' ہونا چاہئے۔

☆☆☆

سولہویں مجلس

تصدیق وعمل صراطِ مستقیم ہے

اُصولی اور مسلم بات یہ ہے کہ جس شخص کو جس شخص سے کوئی غرض ہے اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرے اور اگر اس کے ساتھ کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کو منالے۔ جب یہ مقدمہ تسلیم ہے۔

اللہ کو خوش رکھنے کی کوشش عقلی چیز ہے :

تو جو ایسی ہو کہ اس کو تو کسی سے بھی، کسی قسم کی بھی، کبھی بھی حاجت نہیں، کوئی غرض نہیں، کوئی کام ان کا پڑا نہیں اور سب اسی کے محتاج ہیں تو ایسے کو تو اور بھی زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی سعی بتامہا وکمالہا کرنا چاہیے اور اگر کچھ کوتاہی ہو جائے اور ممکن الوجود سے ممکن ہی ہے، کہ کوتاہی ہو جائے تو جلدی سے منانے کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ رحمت کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں :

اور پھر وہ ایسی کرم والی طبیعت کا ہے اور ایسی جود و سخا والی ذات ہے کہ وہ تو اپنی

رحمت بھیجنے کے لئے، نازل کرنے کے لئے بہانہ دیکھتے ہیں ......

ع رحمت حق بہانہ می جوید ...... اللہ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے۔

کتب ربکم علیٰ نفسہ الرحمۃ۔

تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت فرض کرلی ہے۔

''اللہ تعالیٰ تو روٹھتے نہیں، تم روٹھتے ہو، تم منالو''۔ ابھی تمہارے ہاتھ ان کو منانے کے لئے اُٹھیں گے بھی نہیں صرف دل میں منانا آیا ہے، وہ مان گئے یعنی راضی ہوگئے، تو یہ بات مسلم ہے۔ جب یہ بات مسلم ہے تو اگر دیر ہو تو یہ دیر ہماری طرف سے ہے اُدھر سے دیری نہیں۔ باپ جو رب مجازی ہے وہ اپنی اولاد کے اعزاز کو، منافع کو سوچتا ہے اور مضار اور اضرار واضلالِ اولاد کے لئے کبھی اس کے خیال میں نہیں آتا۔ جب شفقتِ پدری مربی حقیقی کی طرف سے باپ میں اس طرح واقع ہے تو اس مربی حقیقی میں تو شفقت کی کوئی انتہا نہیں، رحمت کی کوئی انتہاء نہیں، کرم کی کوئی انتہاء نہیں۔

رسول بھیجنا بھی کرم کا تقاضہ ہے:

اسی لئے مربی حقیقی نے اپنی رحمت سے بلاسوال کے اپنے کرم سے یوں چاہا کہ میں اس انسانِ ممکن الوجود کی طرف اپنے خاص بندے ''رسولوں'' کو بھیجتا رہوں، یہاں تک کہ انتہاء خاتم النبیین اپنے حبیب محمد ﷺ پر کردوں؛ تو اس کو تو اپنی حاجت کسی قسم کی من حیث العبادۃ بھی نہیں؛ اس کو اپنے لئے عبادت کی کیا ضرورت؟

تو اس ربّ حقیقی نے اپنے کرم سے، جود سے، سخاء سے، رحمت سے یہ چاہا کہ رسولوں کو بھیجوں اور آخر میں اپنے حبیب نبی آخرالزماں کو بھیجوں، کیوں بھیجوں؟ اس لئے کہ میری مخلوق انسان کے لئے جو منافع کی چیزیں ہیں، ان کو پہنچادیں اور جو مضار (نقصان کی) چیزیں ہیں ان کو بتلادیں کہ منافع کی چیزوں سے عمل میں لاکر نفع اُٹھاویں،

دنیوی بھی اور اُخروی بھی اور جو مضار کی چیزیں ہیں ان کو بھی تسلیم کر دیں، بتا دیں تا کہ وہ ان مضار کی چیزوں سے ہٹ کر ضرر سے بچے رہیں تو اس میں مخلوق انسان ہی کا نفع ہے اور دو ہی چیزیں ہوتی ہیں منفعت کی یا مضرت کی۔

کلام اللہ بوصفِ اعجاز باعثِ تصدیق ہے :

تو ذاتِ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک بوصفِ اعجاز نازل فرما کر اس کے قطعیت کے طور پر کلام اللہ ہونے کی تصدیق قلب میں بٹھادی۔ جب کلام اللہ کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق ہوگئی، تو جو مضامین ہیں ان کا تسلیم کرنا ہوگیا اور تصدیق وتسلیم کو عمل لازم ہے، تو تصدیق وعمل یہی صراطِ مستقیم کامل ہے، اسی میں منافع کا ذکر ہے، اسی میں مضار کا ذکر ہے، لہٰذا اب تم مکلف ہوگئے، اب چاہے تم منافع کو اختیار کرو اور چاہے تم مضار کو اختیار کرو۔ قوتِ ارادیہ، قوتِ اختیاریہ، قوتِ عقلیہ بعقلِ مستقیم وفہمِ سلیم تمہارے اندر ودیعت کی ہوئی، پیدا کئے گئے ہو۔ ہم نے تو تمہارے سامنے رسول بھیج کر اور کلام اللہ بوصفِ اعجاز روانہ کر کے مضامین عمل من حیث النافع والمضار رکھ دیئے ہیں۔ اب تم منافع کو اختیار کر کے منعم علیھم ہو جاؤ مقبول بن جاؤ، اور چاہے تم مضار کو اختیار کر کے منتقم علیھم بن جاؤ اور کوئی مضمون من حیث العمل تمہاری طاقت اور وسعت سے باہر نہیں۔ یہ تو میری رحمت کے خلاف ہے کہ ایسے عمل کو تم پر لادوں جو تمہاری طاقت سے باہر ہو اسی لئے کلیہ بیان کر دیا :

"لایکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعھا"۔

اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت میں ہو۔

تو یہ انسان بشر پورا کا پورا اپنی جگہ پر مکلف ہوگیا۔

یَھْدِی اور یضل من حیث التخلیق ہیں :

کسی قسم کی کسی وقت بھی، کوئی بھی جس میں لوگوں کی نگاہوں میں ذلت ہو، میں

نے سوچا عبدالرب اگر تو نے علماءِ دیوبند کی تواضع جو مشہور ہے اس کو اختیار کیا تو بری طرح تیری پٹائی ہوگی۔ اس لئے میں نے کہا: ''جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ ہم ہیں حضرت مولانا عبدالرب صاحب دہلی والے''۔

یہ سن کر وہ پہرہ دار ڈر گیا اور کہا حضور معاف فرمائیں، میں نے پہچانا نہیں 'نواب صاحب سے نہ کہیے گا''۔ ''ہاں نواب صاحب سے نہ کہیے گا کیوں نہ کہوں؟ ہمیں ٹوکتا ہے تو' جانتا نہیں ہم کون ہیں؟'' پہرہ دار نے کہا: ''نہیں صاحب! میں بیوی بچوں والا ہوں، مجھے نواب صاحب برخاست کردیں گے، میرا روزگار چلا جائے گا''۔ فرمایا: اچھا! اچھا جا، معاف کردیا''۔

تو یہ جو مولانا عبدالرب صاحب فرما رہے ہیں تو کیا تکبر تھا؟ یہ انہوں نے تکبراً کہا تھا؟ نہیں' یہ صورۃً تکبر تھا' حقیقۃً تواضع' تذلل سے بچنا ہے، تو حب جاہ ممنوع ہے، وقتی طور پر کسب جاہ یہ ممنوع نہیں ہے کہ جیسے براز (پاخانہ) اندر کچھ رہنا چاہئے ورنہ حرارتِ عزیزیہ گئی، ایسے ہی اگر کبھی تکبر اندر سے بالکل گیا تو جس کو حیاۃ کہتے ہیں وہ گئی۔

حالتِ تُرابیت مطلوب ہے:

لیکن اس کا استعمال ہر ایک شخص نہیں کرسکتا، جب تک کہ باطن کی حالتِ تُرابیت کی نہ ہوگئی ہو کہ اپنے کو تمامی مخلوق سے بدتر جانتا ہے اور تمامی مخلوق کو اپنے سے بہتر جانتا ہے۔ ہر مؤمن کے مقابلہ میں تو ایسا حالاً جانتا ہے اور غیر مؤمن کے مقابلہ میں حیوان خنزیر سے بھی اپنے آپ کو مآلاً کمتر سے کمتر جانتا ہے، کہ اگر میرا خاتمہ ایمان پر نہ ہوا تو خنزیر مجھ سے اچھا ہے، اس سے کوئی حساب، کتاب سوال و جواب نہیں ہے۔ اور میرے ساتھ حساب کتاب، سوال و جواب کا معاملہ ہے، یہ معنیٰ ہیں اس کے جو بزرگوں نے کہا ہے، اکابر نے کہا ہے اور سب نے کہا ہے کہ ہم تو کتے، خنزیر سے بدتر ہیں تو

یہ مآل کے اعتبار سے فرمایا ہے۔

الغرض ...... یہ استعمال تکبر صوری ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ دیانۃً معاملہ اس بندۂ مؤمن کا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ ایک قضاءً معاملہ، ایک ہے دیانۃً معاملہ۔ تو دراصل بندۂ مؤمن کا ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے۔ دعویٰ تو ہر شخص ہر چیز کا کرسکتا ہے۔ حالات شاہد ہوتے ہیں دعویٰ پر۔

حضرت مولانا دیوبندیؒ کی ترابیت کا واقعہ :

حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ جو شیخ الہند کے ساتھ ملقب ہو گئے ہیں۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کو ناگواری ہوتی تھی کہ شیخ العلم کو شیخ الہند کہتے ہیں۔ ان کا واقعہ ہے کہ کانپور میں ایک بہت بڑا جلسہ تھا جیسے مدرسوں کے سالانہ جلسے ہوتے ہیں، اس میں بڑے بڑے علماء کو دعوت دی گئی تھی، مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی بہت بڑے معقولی، بڑے صاحب ریاضی، وہ بھی مدعو تھے، مولانا محمود الحسن صاحب وعظ کر رہے تھے وعظ کہنے کی ان کی عادت نہیں تھی، مگر فرمائش پر وعظ کہہ رہے تھے، اتنے میں مولانا لطف اللہ صاحب علیگڑھی بھی مجمع میں پہنچے، کسی نے نظر اُٹھا کر جو دیکھا تو اچانک بلند آواز سے کہا اوہو! مولانا لطف اللہ صاحب آ گئے، اب جو لوگوں کی نگاہیں پہنچیں تو دیکھا واقعی مولانا لطف اللہ صاحب جلسہ گاہ میں تشریف لے آئے ہیں۔ جب آوازیں بلند ہوئیں تو مولانا محمود الحسن صاحب کی بھی نگاہ پڑ گئی، جب مولانا کی نگاہ ان پر پڑی تو جو لفظ بول رہے تھے وہیں چپ ہو گئے، زبان بند فرمالی اور فرمایا آیئے مولانا تشریف لایئے، پھر بڑے تپاک، بڑے اعزاز کے ساتھ فرمایا : آیئے کرسی پر تشریف رکھئے اور اپنا وعظ ختم فرما دیا۔ مولانا لطف اللہ صاحب نے وعظ فرمایا پھر دوسرے وعظ ہوتے رہے۔

اس جلسہ میں جو مولانا محمود الحسن صاحب کے شاگرد تھے، ان کو بڑا رنج ہوا، بہت

رنج ہوا کہ مولانا وعظ بڑا مدلّلانہ اور مبرہنانہ فرمارہے تھے۔ اُس وقت علماءِ دیوبند کے متعلق یہ مشہور تھا کہ فقیہ تو ہیں' یہ محدث تو ہیں' مگر معقولی' منطقی نہیں ہیں اور آج مولانا بڑے معقولی اور منطقی دلائل کے ساتھ وعظ فرمارہے تھے تو ہمارے استاد صاحب کو تو بیان جاری رکھنا چاہیئے تھا تاکہ ان کو معلوم ہوجاتا کہ علماءِ دیوبند بھی منطق سے خالی نہیں ہیں۔ حضرت مولانا نے یہ کیا کیا؟ جب مولانا اپنے مستقر پر پہنچے تو شاگرد بھی اس مستقر پر پہنچ گئے اور بعض نے ہمت کر کے' جرأت کر کے کہا کہ حضرت یہ کیا کیا، کہ اپنے بیان کو آپ نے ختم فرمادیا، کیا اچھا ہوتا کہ یہ بیان جاری رہتا اور مولانا لطف اللہ صاحب کو معلوم ہوجاتا کہ ایسا نہیں ہے جیسا ہم سمجھتے تھے، علماءِ دیوبند بھی معقول اور منطق سے خالی نہیں ہیں۔

حضرت ! آپ نے یہ کیا کیا؟ اس سے بڑا رنج ہوا۔ مولانا محمود الحسن صاحب نے کیا فرمایا، کہ میں نے اسی لئے بند کردیا تھا، مجھے بھی یہ وسوسہ تھا، خیالی، غیر اختیاری آگیا تھا تو اب جو بیان ہوتا وہ اپنے لئے ہوتا، رضاءِ الٰہی کے لئے نہ ہوتا اس لئے میں نے بند کردیا، دیکھا یہ ہے تواضع۔ وہ خیال کچھ واہمہ کبر کا آگیا تھا نہ کہ حقیقتِ کبر، اس کی وجہ سے بھی وعظ ترک فرمادیا اور فرمایا کہ جو تمہیں خیال آیا مجھے بھی یہی خیال آیا۔

حضرت علیؓ کی ترابیت کی حکایت :

جیسا کہ واقعہ مشہور ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا، کہ جنگ میں ایک شخص پر قابو پالیا، سینے پر بیٹھ گئے، تلوار کاٹنے کے لئے گردن پر جاری ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے اچانک اس نے حضرت علیؓ کے چہرہ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ اس کے اوپر سے اُٹھ گئے اور اس کو چھوڑ دیا۔ اس نے کہا کہ اب تو جلدی مجھے قتل کردینا تھا کہ میں نے آپ کے چہرہ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اسی وجہ سے میں نے تجھ کو چھوڑ دیا، کہ ہمارا ہر کام رضاءِ الٰہی کے لئے ہوتا ہے۔ جب تو نے تھوکا تو طبعی طور پر مجھ پر ایک اثر ہوا، اب میں تجھ کو اگر قتل کرتا

تو اپنے لئے کرتا نہ کہ اللہ کی رضا کے لئے، اس لئے چھوڑ دیا۔

دیکھا ! ہمارا آپ کا یہاں بیٹھنا اسی لئے تو ہے کہ یہ چیزیں ترک کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے اپنے اندر قائم ہوں۔ اسی لئے تو یہ سفر ہے (بہت سے علماء اور طلبہ دور دراز سے تعطیلاتِ سالانہ میں اصلاحِ نفس کے لئے آتے ہیں' ان کو خطاب ہے۔ از: محشی) اگر یہ نیتیں نہیں ہیں تو وہ سفر سقر (دوزخ) ہے۔

تو ہمارے ان اکابر کی حالتِ تواضع دیکھی! تکبر کا نام بھی نہیں اور جہاں استعمال کیا ہے جیسا کہ میں نے مولانا عبدالرب صاحب کا تذکرہ کیا وہ صورۃً ہے، ذلت سے حفاظت کے لئے ہے، ضرر سے حفاظت کے لئے ہے، اگر یہ صورت نہ ہوتی تو مولانا عبدالرّب صاحب کے الفاظ سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ میں بھی یوں ہی کہتا جو اکابر وعلماءِ دیوبند کا طریقہ رہا ہے کہ میں ہوں ناچیز، ہیچمدان، حقیر، فقیر، میں یوں ہی کہتا، لیکن اس موقع پر یہ کہنا شرعاً میرے لئے مجاز نہیں تھا کہ اس میں ذلت ہوتی بلکہ اس ذلت سے بچنے کے لئے شرعاً دوسرا طریق اختیار کرنا ضروری تھا، ان کا جملہ "اگر میں علماءِ دیوبند کی طرح تواضع اختیار کرتا" بتلا رہا ہے کہ اگر واقعہ کی موجودہ صورت نہ ہوتی تو میں بھی وہی علماءِ دیوبند کا طریقہ اختیار کرتا، مگر وہ صورت ونوعیت ہی ایسی تھی کہ میں نے الفاظِ تواضع کہنا شرعاً جائز نہ سمجھا۔

استفتِ قلبک ہر ایک کا معاملہ نہیں ہے :

لیکن ہر شخص اپنے معاملہ میں مفتی بن جائے اور صحیح فیصلہ کر لے، یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ یہ حق تعالیٰ کے ساتھ دیانۃً معاملہ ہے، اسی لئے فرمایا ہے استفت قلبک' لیکن یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ یہ ان کا کام ہے جو جانتے ہیں کہ رائی کے دلنہ کے برابر بھی واقعی، حقیقی اگر کبر ہے تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ بھلا وہ حضرات یہ جانتے ہوئے کیسے

استعمال کرسکتے ہیں حقیقتِ کبر کو اور جہاں استعمال کیا ہے، یہ نوعیت ہے یعنی کسب جاہی کی نوعیت ہے۔ حب جاہی کی نوعیت نہیں ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، آپ حضرات نے پڑھا ہوگا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں :

''میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں گا و لافخر ، میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا و لافخر ، اور آدم علیہ السلام اور ان کے سوا جتنے نبی ہیں سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور مجھ سے سب سے پہلے زمین شق ہوگی و لا فخر ، آپ نے ایک حدیث میں اپنے خاندان کو بھی بیان کیا ہے کہ: انا خیرهم نفسا و خیرهم بیتاً میں تمام میں ذات کے اعتبار سے بھی بہتر ہوں اور خاندان کے اعتبار سے بھی بہتر ہوں لیکن یہ سب منجانب اللہ نعمتیں ہیں، میرا اس میں کوئی دخل نہیں جس پر فخر ہو سکے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ ساری نعمتیں عطائی ہیں، اگر میں ان کے بالمقابل فخر کرنے لگوں تو یہ میری خطا ہے۔ اسی لئے لافخر، لافخر، لافخر، لافخر ، بار بار حضور ﷺ فرمار ہے ہیں، تو جب نسب کو بیان کرتے ہوئے بھی یہ انداز ہے تو اور فضائل تو بہت اونچے ہیں کہ ......

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ ایں مختصر

خدا کے بعد آپ ہی بڑے ہیں مختصر بات یہ ہے۔

اور ہم اُمتِ مسلمہ بالخصوص علماءِ کرام، جانشینِ رسول، اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ کے مکلف ہیں اور آپ خود عطاءِ نعم پر الفاظ امتیازی فرمار ہے ہیں، پھر ساتھ اس کے لافخر ، لافخر، لافخر تو نائبِ رسول بھی کسی موقع پر ان الفاظ کو استعمال کر لیتا ہے اور کہتا ہے لافخر، لافخر اور یہ سب تحدیث بالنعمۃ ہے۔ وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ۔

تحدیث بالنعمۃ میں نکتہ :

اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ پرورش کرنے والے کی نعمت کے تذکرہ سے عبادت کی

طرف قدم بڑھتا رہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایسے منعمِ حقیقی کی اور عبادت کیوں نہ کروں۔ تو نائبِ رسولؐ جو واقعی نائبِ رسولؐ ہیں کہ نیابت کی اس کے اندر صفات ہیں اور پھر وہ اپنی کوئی صفت بیان کر رہا ہے تو فخراً نہیں بیان کر رہا ہے بلکہ اظہارِ نعمت کے طور پر کہہ رہا ہے۔

ایک صحابیؓ کا واقعہ :

حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک صحابیؓ آئے، ان کے جسم پر کپڑے اچھے اور صاف ٹھیک سے نہیں تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا :

''تمہارے بدن پر ایسے کپڑے ہیں' کیا تمہارے پاس مال نہیں ہے؟''

انہوں نے عرض کیا : ''ہے''۔ اونٹ بھی ہیں' بکریاں بھی ہیں' پیسے بھی ہیں''۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا :

''پھر تمہارے جسم پر اللہ تعالیٰ کی نعمت کو کیوں نہیں دیکھتا ہوں؟ تمہارے بدن پر ایسے کپڑے کیوں ہیں؟''

ایک اور حدیث ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ ایک جنازہ میں شریک ہیں' صحابہؓ بھی شریک ہیں' آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ صحابہؓ سے آگے ہی چلنے کی نہ تھی۔ صحابۂ کرامؓ کی کوشش تو یہی تھی کہ ہم پیچھے چلیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی صحابہؓ سے آگے ہو جاتے کبھی پیچھے ہو جاتے۔ اس وقت اتفاقاً آگے تھے، آپ ﷺ نے جو آگے سے سرِ مبارک پھیر کر دیکھا تو صحابۂ کرامؓ کے کندھوں پر چادر نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا : ''سوگ مناتے ہو؟'' جیسا ہمارا طریقہ ہے کہ ماتم کرتے ہیں اور نہ معلوم اظہارِ غم کے لئے کیا کیا طریقے نکال رکھے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تم باہر نکلتے تھے تو چادر اوڑھ کر نکلتے تھے پھر چادر کیوں نہیں ہے؟ لوٹو اور چادر اوڑھ کر آؤ۔ لوٹے اور چادر اوڑھ کر آئے۔ یہ اس طرح ماتم منانے کا کیا مطلب؟ تو کیا صحابۂ کرامؓ کے اندر فخر تھا، دکھاوا تھا، ریاء تھی؟ ہرگز

نہیں، وہ تو سارے کے سارے ولی ہیں، جو صحابی ہے ولی نہیں؟ ضرور ہے، تو جب ولی ہیں تو اخلاقِ رذیلہ ضمیمہ سے صاف ہیں۔

تو صحابہؓ چادریں اوڑھ کر نکلا کرتے تھے، تو کیا فخراً نکلا کرتے تھے، اگر یہ نکلنا فخر ہے والعیاذ باللہ تو پھر ولی کیسے تھے؟ لیکن ان کی ولایت مسلم ہے اور اس طرح نکلنا معلوم ہوا تو کیا یوں کہہ سکتے ہیں کہ تکبراً چادر اوڑھ کر نکلتے تھے۔

جب اللہ تعالیٰ نے نعمتیں بے بہا دی ہیں' تو ان کا ظہور ہمارے طعام واکل کے اندر، لباس وغیرہ کے اندر کیوں نہ ہو وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ کا یہی مقتضا ہے۔ اسی سے معلوم ہو گیا کہ جب حضور کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا تو جو حضور کے اسوۂ حسنہ دیانۃً واقعی اپنے اندر لئے ہوئے ہیں، وہ بھی اسی طریقے سے اپنے کو ظاہر کرتا ہے کہ چوغہ پہن کر نکلتا ہے جو نکلتا ہے، اس پر اعتراض نہ کیجئے گا کہ اوہو! چوغہ پہن کر نکل رہے ہیں۔ رومال ڈال کر نکل رہے ہیں اوہو ہو!۔ یہ بے باکی کیسی؟ جو منہ میں آیا، سو کہہ دیا اور جس کو چاہا کہہ دیا تو اس کے باطن سے واقف ہے؟ معلوم ہوتا ہے، تیرے اندر خوفِ خدا نہیں، غیبتیں کرتا پھرتا ہے، تہمتیں لگاتا پھرتا ہے، تیرے اندر خوفِ خدا نہیں ہے، اگر تیرے ذہن میں کوئی اعتراض کی بات آئی تھی، تو اس سے خفیہ طور پر جا کر کہتا، اگر واقعی تجھے اس کی محبت ہے، تو اس سے جا کر کہتا، نہ کہ لوگوں میں لگاتا پھرتا ہے، اگر تخطیہ کی بات ہے تو اس سے کہتا نہ کہ اس کا تخطیہ گاتا پھرتا ہے، ایک قطعہ یاد آ گیا ....

خواہی کہ شود دلِ تو چوں آئینہ
دہ چیز بروں کن از درون سینہ

سینہ مثلِ آئینہ ہو جائے اس کا طریقہ:

اگر تو یوں چاہتا ہے کہ تیرا سینہ مثلِ آئینہ کے ہو جائے تو دس چیزیں ہیں اُصولی

طور پر، یہ نہیں کہ دس ہی ہیں کچھ فروعی ہیں' اصولی طور پر جو دس چیزیں ہیں، ان کو بیان کر رہے ہیں .... ۔

حرص و امل و غضب و دروغ و غیبت
ریا و حسد و بخل کبر و کینہ

اَمَل' یہ الف سے ہے، یعنی لمبی لمبی آرزوئیں، من گھڑت منصوبے، یہ دس چیزیں ہوگئیں، ان کو نکالو اپنے اندر سے جب تمہارا سینہ مثل آئینہ ہوگا تو ایسے شخص کو حق ہے کہ صورۂ جاہ کا اظہار کرے۔ یہ ہر ایک کو مجاز نہیں۔ کبھی کہیں شیخ باطن کے ساتھ زانوئے ادب تو طے ہوا نہیں اور خود سمجھ بیٹھا کہ ساری چیزیں میرے اندر سے نکل چکی ہیں، مٹی پنا میرے اندر آ گیا ہے، ذرا کچھ کہہ کر دیکھ لو، کتنا غضب ناک ہوتا ہے۔

تصدیق و عمل صراطِ مستقیم ہے :

شروع میں یہ عرض کیا جا رہا تھا کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا کلام جو صفتِ اعجاز کے ساتھ ہے، اس کی تصدیق اور اس کے اندر جو مضامین ہیں، ان پر عمل تو تصدیق و عمل یہی صراطِ مستقیم کامل ہے۔ یہ معنی ہیں اهدنا الصراط المستقیم کے۔

اہلِ کتاب ہونا صراطِ مستقیم پر ہونے کیلئے کافی نہیں :

ورنہ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ میں صراطِ مستقیم پر ہوں' یہودی بھی کہہ دیگا، نصرانی بھی کہہ دے گا، مشرک بھی کہہ دے گا۔ قرآن شریف میں ہے :

وزیّن لهم الشیطان ما کانوا یعملون٥

ہر ایک کا عمل شیطان نے اس کے سامنے مزین اور حسین کر دیا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ اهدنا الصراط المستقیم کا بدل لائے صراط الذین انعمت علیهم جو منعم

علیھم ہیں وہ ہیں صراطِ مستقیم پر اور وہ انبیاء علیھم السلام ہیں شہداءِ حقیقی ہیں، وہ صدیقین ہیں، وہ صالحین ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

و من یطع اللّٰہ و رسولہ فاولٰئک مع الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین و الصدیقین و الشھدآء و الصّالحین○

اس کی شرح کردی اور کھول دیا تا کہ ہر ایک یہ نہ سمجھ جائے کہ میں صراطِ مستقیم پر ہوں۔ اب آگے ضرورت تھی نہیں، لیکن پھر اور صاف کر دیا کہ دوسروں کو اہلِ کتاب سمجھ کر سمجھنے لگیں کہ وہ صراطِ مستقیم پر ہیں، اگر ہم نے ان کے طریق کو اختیار کرلیا تو کیا حرج ہے؟ اس لئے آگے فرمایا: غیر المغضوب علیھم و لا الضالین وہ تو راہِ ضلالت پر، راہِ غضب پر ہیں، مراد ہیں یہودی اور نصرانی جو کہ اہلِ کتاب رہے ہیں، یہ کلام کی بلاغت ہے کہ جو اہلِ کتاب سے نہیں ہیں، تو وہ بطریقِ اولیٰ مغضوب علیھم اور ضالین میں سے ہیں۔ جب اہلِ کتاب کے لئے میں کہہ رہا ہوں کہ وہ صراطِ مستقیم پر نہیں بلکہ راہِ ضلالت پر' راہِ غضب پر ہیں تو غیر اہلِ کتاب بدرجۂ اولیٰ صراطِ مستقیم پر نہیں ہوں گے۔ لہٰذا صراط المستقیم کی شرح صراط الذین انعمت علیھم فرما کر احتراز ہو گیا غیر مسلم سے، کہ مراد صراطِ مستقیم سے اسلامِ حقیقی ہے، تو جتنے بھی غیر مسلم وہ سب کے سب نکل گئے، ان سے احتراز ہو گیا، یہ قیدِ احترازی ہے۔

تو بھائی موٹی سی بات ہے کہ ہم کو جس سے غرض ہو گی اور اس کو ہم سے کوئی بھی غرض نہیں تو ہمیں تو اس کو راضی رکھنے کی پوری پوری سعی و کوشش کرنا ہو گی اور ذرا کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف اپنے اندر دیکھے تو فوراً جلد سے جلد اس کو منانے کی کوشش کرے، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس لئے میرے حضرت نے فرمایا کہ حق تعالیٰ تو روٹھتے نہیں تم روٹھتے ہو کہ گناہ کرتے ہو، لہٰذا تم منالو۔

توبہ کی انوکھی تعبیر :

اور وہ ایسے ارحم الراحمین ہیں کہ ذرا بہانہ رحمتِ خاص کے نزول کا ہوا فوراً رحمتِ خاص کا نزول ہو گیا اور مان گئے' کیونکہ حق تعالیٰ جانتے ہیں کہ بندہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا چارہ میرے ماننے کے سوا کوئی نہیں ہے، وہ میرے سوا کسی اور کو جانتا اور مانتا ہی نہیں ہے، تب ہی تو سر جھکا رہا ہے میرے سامنے ندامت کے ساتھ' کہ اس کا کوئی چارہ نہیں ہے۔ چلو وقتی ہی سہی' مگر میں کہہ رہا ہوں توبہ کرنے کو' میرے کہنے سے کہہ رہا ہے' مگر کہہ تو رہا ہے بہ ندامت' اس لئے مان گئے، اس کی نگاہِ دل، نظرِ قلب میری طرف آئی کہ میں اس کا منظورِ نظر ہوں، اسی کا نام انابت الی اللہ ہے اور انابت الی اللہ والے مُنیب سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے بھی ابراہیم علیہ السلام کے اوصاف کو بیان کرتے ہوئے ذاتِ باری تعالیٰ نے فرمایا :

ان ابراھیم لحلیمٌ اَوَّاہٌ مُّنیبٌ ٥ بلا شک وشبہ ابراہیم بہت ہی بردبار ہیں، کسی نے کچھ کہہ دیا، دل پر بوجھ پڑ گیا، اس کو اُٹھا لیا جب کوئی خلافِ طبیعت بات کہے گا تو بوجھ پڑے گا یا نہیں، ضرور پڑے گا، اس کو اُٹھا لیا، یہ ہے حلیم۔ اَوَّاہ بڑے نرم دل، یہ حضور کے جدِ امجد کے اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں، سب ہی نبی ایسے تھے، بعض چیزیں ہوتی ہیں تغلیب کی۔

اہلِ علم کو خطاب :

اہلِ علم حضرات ! آپ سوچئے کہ ہمارے اندر پڑھ لکھ کر حلم کس درجہ کا ہے، پھر سوچئے، کہ ہمارے اندر کس درجہ کی شفقت ہے، یعنی اوّاہیت نرم دلی، پھر سوچئے کہ آگے حق تعالیٰ منیبٌ فرما رہے ہیں، منیب انابت بابِ افعال سے ہے، میری طرف رجوع

کرنے والا، معلوم ہوا کہ انابت بڑی خوبی کی صفت ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں تو انتہائی درجہ کا محتاج ہوں اور ذاتِ باری تعالیٰ بوصفِ صمدیت ہیں، مجھ کو چارہ نہیں ہے، بدون ذاتِ باری تعالیٰ کی انابت کے، اس لئے رجوع کر رہا ہے۔ انابت کے یہی معنی ہیں، جہاں یہ انابت آئی بس مان گئے تو دیر ہماری طرف سے ہے۔ ان کی طرف سے دیر کا سوال ہی نہیں ہے۔

توبہ کی ایک اور تعبیر :

اس کو یوں سمجھ لیں۔ استاد نے شاگرد کا جب سبق سُنا تو اس سے کوئی غلطی ہوگئی، استاد نے کہا کھڑے ہو جاؤ، وہ کھڑا ہوگیا، اب بیچارہ ڈر کے مارے کچھ کہتا نہیں، اس کا حوصلہ یہ کہنے کا نہیں ہوتا کہ معاف کر دیجئے، جب کچھ تھوڑی سی دیر ہوگئی، کھڑے ہوئے تو استاذ صاحب فرما رہے ہیں :

''کیا کہتا ہے؟ آئندہ یاد کرکے لائے گا''۔

بچہ فوراً کہہ دیتا ہے : ''جی ہاں آئندہ یاد کرکے لاؤں گا''۔

اسے استاد نے تلقین کر دی کہ جو میں کہہ رہا ہوں یہ کہدے تو میں کہہ دوں گا بیٹھ جا۔ چنانچہ اس نے کہہ دیا، استاد نے بٹھا دیا۔ اسی طرح ذاتِ باری تعالیٰ بندہ کو سکھا رہے ہیں کہ تو یوں کہہ دے کہ میں توبہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے سکھائے ہوئے کو وہ کہہ رہا ہے، اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں : ''معاف''۔

حضرات ! خلاصہ یہ نکلا قرآنِ پاک بدلائلِ اعجاز کی تصدیق اور اس کے مضامین پر عمل۔ تو تصدیق و عمل یہ ہے صراطِ مستقیم کامل۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی صراطِ مستقیم پر تادمِ آخر قائم رہنے کی توفیق ارزانی سے نوازیں۔

(آمین)

ملفوظ

فرمایا حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا بول و براز پاک تھا، بعض صحابیات برکۃؓ اور اُم یمنؓ نے اس بول کو پی لیا تھا، کیونکہ آپ ﷺ نور ہیں، مگر آپ ﷺ کو دنیا میں بھیجا جانا تھا افادہ اور استفادہ کے لئے، تو اگر آپ ﷺ نورِ محض ہوکر آتے جسم کا لباس آپ کو نہ پہنایا جاتا تو ہم کو استفادہ نہ ہوسکتا تھا، ہم اُسوۂ حسنہ کو دیکھ کر کس طرح کرتے مثلاً نماز میں رکوع، سجدہ، حروف کی ادائیگی کس طرح کرتے، زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت وواجب کی مقدار کس طرح کرتے، روزہ رکھنے کا کیا طریق ہے؟ یہ سب تفصیلات کیسے معلوم ہوتیں، اس لئے آپ ﷺ کو جسم کا لباس پہنا کر اس عالم میں بھیجا گیا تاکہ مخلوق کے لئے استفادہ کرنا آسان ہوجائے، مگر اصل فطرت کے اعتبار سے آپ ﷺ نور ہیں اور نور پاک ہے تو نور میں جو چیز ہے وہ بھی پاک ہے، اس لئے علماء نے آپ ﷺ کے بول و براز کو پاک فرمایا ہے، مگر چونکہ آپ ﷺ کے اجزاءِ تالیفیہ بشر کے ہیں' اس لئے تمام احکام آپ ﷺ پر تکلیفی حیثیت سے واجب ہیں۔

چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ وہ بقعۂ ارض جس سے آپ ﷺ کا جسمِ اطہر مس کئے ہوئے ہے، وہ عرشِ اعظم سے بھی افضل ہے، تو ''بیت اللہ'' سے آپ ﷺ کا مقام کس قدر افضل ہوگا، مگر قضاءِ حاجت کے وقت آپ ﷺ بھی کعبہ کا احترام فرماتے تھے، یہ حال کی باتیں نہیں ہیں، مقام کی باتیں ہیں۔ حال وسطِ سلوک کی کیفیت ہے اور مقام منتہائے سلوک کا مقتضیٰ ہے۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز سیاہ جوتہ نہیں پہنتے تھے، کسی نے پوچھا کہ سیاہ جوتہ کیوں نہیں پہنتے ؟ فرمایا بیت اللہ شریف کا غلاف سیاہ ہے، اس لئے طبیعت گوارہ نہیں کرتی، ہم جیسے روکھے سوکھے تو اس حکایت کو سُن کر نا معلوم کیا گمان کرنے لگیں، لیکن عشق کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے، وہ سمجھایا نہیں جا سکتا۔ اس میں صرف علم الیقین، عین الیقین کافی نہیں ہے بلکہ حق الیقین کا جب درجہ آتا ہے جب سمجھ میں آتا ہے، اس سے پہلے مان لینا چاہئے۔ اعراض وانکار نہیں کرنا چاہئے۔ تو ان صحابیاتؓ نے رسول اللہ ﷺ کا بول پی لیا، یہ محبت وعشق کا ہی تو اثر ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کا خون پاک تھا۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فصد کرائی، اس سے خون نکلا، مالک بن سنان اور عبداللہ بن زبیر رضی اللّٰہ عنہما نے بجائے کہیں ڈالنے کے وہ خون خود پی لیا۔ محبت میں نامعلوم کیا کیا ہوتا ہے، دور کیوں جایئے یہاں ہندوستان میں تو یہ طریق نہیں، یورپ میں رہنے والوں میں یہ بات ہے کہ بیوی کا پیار ہونٹ چوس کر یا زبان باہر نکلوا کر لیتے ہیں، تو دیکھئے وہ محبت کا اظہار کس عجیب طریقہ سے کرتے ہیں۔

یہاں ایک بات یاد آ گئی اہلِ یورپ کہتے ہیں کہ دوسرے کا جھوٹا پانی نہیں پینا چاہئے کہ دوسرے کے جراثیم (کیڑے) اس کے منہ میں چلے جائیں گے۔ سبحان اللہ جھوٹا پانی پینے سے تو کیڑے چلے جائیں گے۔ اس لئے بعضے وہی گلاس سے کپڑا لگا کر پانی پیتے ہیں اور زبان چوسنے کے بعد اس میں جو لعاب آیا اس میں کیڑے نہیں جائیں گے۔ اس کے برخلاف حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے :

سور المؤمن شفاءٌ ...... کہ مؤمن کے جھوٹے میں شفا ہے۔ حضور ﷺ کا منشاء یہ ہے کہ کافر کے کفر کی حیثیت سے جو چیز اس کی نظر میں بری ہے، اس کے خلاف کیا

جائے۔بعض کفار کے یہاں چھینک آنا بدفالی ہے کہ کام کو جاتے ہوئے چھینک آجائے تو نحوست سمجھتے ہیں، کام سے واپس آجاتے ہیں۔اس کے برخلاف ہم کو حکم ہے کہ اگر کسی کو چھینک آجائے تو الحمد للہ کہو چھینک سے دماغ ہلکا ہوتا ہے جوایک نعمت ہے۔اسی طرح ان کے یہاں عورت کو اگر حیض آجائے تو بستر' چارپائی' کھانا پینا' برتن وغیرہ سب الگ کردیا جاتا ہے، ہمارے یہاں سوائے نماز' روزہ' تلاوت اور وطی وغیرہ کے سب کام اسی طرح بدستور رہتے ہیں۔چنانچہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں بحالتِ حیض جس برتن سے پانی پیتی تھی، آپ ﷺ بھی اسی برتن سے وہیں منہ لگا کر پانی پیتے تھے، جہاں میں منہ لگاتی تھی، تو محبت کی ادائیں عجیب ہوتی ہیں۔

حدیث میں ہے آپ ﷺ جہاں جہاں بیٹھے تھے جہاں جہاں جو کام کیا تھا، وہیں وہیں ایک صحابیؓ نے وہ کام کیا۔یہ سکھانے کی بات نہیں ہے بلکہ اندر کی چیز خود سکھاتی ہے۔تعلیم کب تک ہوگی اسی طرح جس سے محبت ہوتی ہے اس کے چہرہ پر چھپ کر نظر ڈالتے ہیں اور یہ بہتر بھی ہے مگر اس طرح دیکھے کہ اس کو معلوم نہ ہو، جیسے ماں باپ کے چہرہ پر عظمت واحترام کے ساتھ محبت کی نظر ڈالنا بڑا ثواب ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عالمِ ربانی کے چہرہ کو دیکھنا ایسا ہے جیسے میرے چہرہ کو دیکھنا اور میرے چہرہ کو دیکھنا خدا کے چہرہ کو دیکھنا ہے۔

☆☆☆

سترھویں مجلس

اِیمان واِسلام اوراس کے تقاضے

مورخہ ۱۸ صفر ۱۴۱۱ھ بمطابق ۹ ستمبر ۱۹۹۱ء بروز یکشنبہ بوقتِ صبح

ابتدائے اِسلام میں سلام کا شیوع :

اوائلِ اسلام میں سلام کا بہت کثرت سے معمول تھا، ابتدائے اسلام کے بعد اتنی تاکید نہیں رہی، ابتدائے اِسلام میں تو اس قدر سلام کا شیوع تھا کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ دو صحابی جا رہے ہیں اور سامنے آ گیا درخت اب درخت کے اندر سے کیسے نکلتے، ایک صحابی تو اِدھر سے نکلے اور دوسرے صحابی اُدھر سے نکلے، جب آگے چلے اب دونوں مل گئے، جب دونوں ملے سلام بھی ہو رہا ہے، مصافحہ بھی ہو رہا ہے اتنے فصل سے سلام بھی ہو رہا ہے مصافحہ بھی ہو رہا ہے، اُس وقت اس کی ضرورت تھی۔

ابتدائے اسلام کی بعض باتوں پر عمل دینی فہم نہیں :

آج کل بعضے ابتدائے اسلام کی باتوں پر عمل کرتے ہیں پتہ تو کچھ ہے نہیں

بیچارے کو، فقہ تو جانتے نہیں، حدیث شریف کہیں پڑھ لی ہوگی اور کہیں سے سُن لی ہوگی۔

سلام میں تفریط وافراط :

تو اُس وقت تو وہ رنگ تھا سلام کے مصافحہ کا خیر یہ سلام مصافحہ تو جزئی چیز ہے لیکن عام طور پر مسلمانوں کا حال تفریطی ہوگیا ہے کہ مسلمان اعتدال سے نکلتا جارہا ہے سلام کا نام ہی نہیں؟ نہ وہ سلام کرتا ہے اور نہ سلام کا جواب دیتا ہے، گزرتا چلا جارہا ہے اور وہاں کا کیا حکم تھا بخاری شریف میں ہے اَفْشُوا السَّلَامَ کہ سلام کو پھیلاؤ، تعمیم کرو، تشہیر کرو، سلام کو رائج کرو، سلام کرو تم (ہر ایک کو) جس کو پہچانتے ہو یا نہیں پہچانتے۔ تو میں نے بتلا دیا کہ وہ ابتداءِ اسلام کا حال ہے، لیکن اَب کیا ہے؟ اَب تفریط ہے جیسا کہ ابھی عرض کیا یا افراط ہے جیسا کہ بعضوں کے یہاں تو نمازوں کے بعد سلام ومصافحہ، خاص کر صبح کو جو اہلِ بدعت ہیں وہ کیا کرتے ہیں۔ نماز کے بعد سلام ومصافحہ ہر ایک کا حال ہے اور ہم جیسے جو ہیں کہ برابر ہو کر ایک مسلمان نکلتا چلا جارہا ہے، اب نہ وہ سلام کرتا ہے اور نہ یہ سلام کررہا ہے تو کہیں اِفراط ہے، کہیں تفریط ہے، اعتدال نہیں رہا، حالانکہ اِسلام پورا پورا اعتدال کا حکم دیتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو ذاتِ باری تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اعتدال کا حکم دیا ہے۔ اب ہمارا حال یہ ہے کہ دین کے کاموں پر اگر آجاتے ہیں تو افراط ہوگیا اور اگر اِس سے کچھ آزادی سی آگئی تو تفریط ہوگیا۔ اعتدال کی توضیح کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان واسلام کے الفاظ سے ہی اعتدال معلوم ہوتا ہے چنانچہ ...... :

لفظِ ایمان کے مادہ میں غور اور سبق :

لفظِ ایمان کا مادہ اَمَنْ ہے ، مادہ جب بولیں گے تو وہ الف میم نون ہے

اور وہ ہمزہ، عُرف اور اصطلاح الف ہی کی ہے تو ایمان کا مادہ الف میم نون ہے اب ملا دو تو ''اَمن'' ہو گیا۔

لفظِ سلام کے مادہ میں غور اور سبق :

اور سلام کا مادہ؟ سین، لام، میم اب ملا دو تو سَلَم، سلامتی ہو گیا۔ تو اب ایمان کا تقاضا جو اَمن ہے اور سلام کا تقاضا جو سلامتی ہے اس میں جو احکام ہوں گے متعلق بالاعمالِ ظاہرہ اور احکام متعلق بالاعمالِ باطنہ وہ سب کے سب اعتدال پر ہوں گے کہ جس میں امن بھی رہے اور سلامتی بھی رہے۔ ایمان کا لفظ کہہ رہا ہے کہ جو احکام مِنْ جَانِبِ اللہ آئیں گے وہ اِفراط و تفریط سے خالی ہوں گے اور اِفراط و تفریط دونوں کے دونوں نہ اَمن کے ہیں اور نہ سلامتی کے۔ افراطی اعمال کب تک کرے گا، کب تک نبھاوے گا تو تمام احکام میں خواہ وہ احکام اعمالِ ظاہرہ سے متعلق ہوں یا اعمالِ باطنہ سے متعلق ہوں اِن سب میں اعتدال ہے۔ اِفراط و تفریط کا سوال ہی نہیں۔

اِستقامت کا بیان :

اسی کا نام ہے اِستقامت کہ برابر موت تک چلتا رہے یہ اعتدال ایسی چیز ہے کہ حالتِ اعتدال موت تک ہی چلتی رہے گی جو دین میں داخل ہو کر اِفراط میں آ جاتے ہیں وہ حالتِ موت تک نہیں چل سکتی۔

دفعِ دخلِ مقدّر :

یہ الگ بات ہے کہ مشروعیّت ہی کی حیثیت سے مشروع کو ادا کرنے میں اعتدالِ شخصی جزئی طور پر الگ الگ ہو سکتا ہے۔ ہر ایک کا اعتدال الگ الگ ہو سکتا

ہے، وہ ایک جزئی چیز ہوگی کہ بعض بزرگ تمام رات جاگتے تھے رات بھر جاگتے تھے۔ تو اِس پر ممکن ہے کہ کسی نے کتاب میں بزرگوں کے واقعات دیکھ لئے ہوں اِن کو اشکال ہو تو یہ چیز جزئی ہے۔ اس بک کے لئے وہی اعتدال ہے جیسے حضرت حاجی صاحب نے فرمایا جب کسی نے اِن سے رات بھر عبادت کرتے رہنے پر سوال کیا کہ حضرت! لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفساً اِلَّا وُسْعَھَا۔ فرمایا کہ یہ تمہارے لئے ہے، میرے لئے نہیں، تو یہ دفع دخلِ مقدّر ہے۔ وہ ایک جزئی چیز ہے اور شخصی چیز ہے، تو یہ اعتدال ہر ایک کا الگ الگ ہوسکتا ہے اس کا اعتدال یہی ہے لیکن مسئلہ نہیں یہ جزئی چیز ہے اور یہ ساری چیزیں صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں ہو چکی ہیں۔

شخصی اعتدال کی ایک مثال :

حضورِ اکرم ﷺ نے غزوات میں سے کسی غزوہ کے لئے انفاقِ مال کا اعلان فرما دیا۔ لا لا کے لوگوں نے سامان سامنے رکھ دیا۔ اب آپ کسی سے کچھ پوچھ رہے ہیں کہ کچھ مخصوص بھی ہوا کرتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا عمرؓ ! کیا لائے ہو؟ عرض کیا آدھا سال لے آیا ہوں آدھا گھر چھوڑ آیا ہوں، پھر فرمایا ابوبکرؓ تم کیا لائے ہو؟ عرض کیا گھر صاف کر دیا، سب لے آیا ہوں، حضرت ابوبکرؓ کا اعتدال یہی تھا، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تو اعتدال سے نکل گئے یہ تو اِفراط ہوگئی، اِن کا یہی اعتدال تھا اور حضرت عمر فاروقؓ کا یہی اعتدال تھا۔

دوسری مثال :

ایک مثال یہ ہے کہ جہاد کے لئے بھرتی ہو رہی ہے، ایک بچہ بھی آ رہا ہے بھرتی ہونے کے لئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ناپ میں آتے نہیں؟ تو

اب داخل نہیں ہوسکتا۔ وہ بچہ پنجوں سے کھڑا ہو گیا جہاد میں شریک ہونے کے شوق میں پنجوں سے کھڑا ہو گیا، جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ اس کا تو اس درجہ شوق ہو رہا ہے تو اس کا اعتدال یہی تھا، اِس کو بھرتی کرلیا۔ دوسرا بھی دیکھ کر آ گیا، اس کا بھی جی چاہ رہا تھا اِس کے اس شوق کو دیکھ کر اس کو بھی بھرتی کرلیا دونوں کو بھرتی کرلیا، حالانکہ ناپ میں پورے نہیں تھے۔

اِنتباہ....!

اب اِن چیزوں کے سمجھنے کے لئے کیا حدیث شریف پڑھنا کافی ہو جائے گا؟ روایتوں کا پڑھنا کافی ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں ہوسکتا جب تک روایت سے درایت ملی ہوئی نہ ہو تو عامۃً تو یہی ہے کہ تمام احکام میں اعتدال ملحوظ رہے۔ سب اعتدال میں ہیں جزوی چیز الگ ہے جو کہ ممکن ہے اور فضلِ الٰہی ہے، فضلِ الٰہی سے ممکن ہے، سورۂ مزمل کے شروع میں یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ خطاب تو خاص ہے مگر حکم عام ہے بعض دفعہ خطاب تو خاص ہوتا ہے حکم عام ہوتا ہے یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ آگے ہے قُمِ الَّیْلَ اس میں کوئی قید نہیں ہے۔ اس کے معنی ہیں تمام رات کھڑے رہو، پھر آگے کی کیا ضرورت تھی جو فرما دیا اِلَّا قَلِیْلًا پھر آگے ہے پھر نِصْفَهٗ پھر آگے اَوِ انْقُصْ مِنْهُ پھر آگے ہے قَلِیْلًا اور اَوْ زِدْ عَلَیْهِ کتنی زیادتی ہے اس میں، گویا یہ فرما رہے ہیں کہ تم میں کوئی ایسا ہوگا کوئی ایسا ہوگا آزادی رکھ دی (یعنی مقدارِ شب بیداری میں اختیار دیدیا)

اب شب بیداری ہر ایک کی حیثیت کے اعتبار سے الگ الگ، کوئی رات بھر جاگ رہا ہے اس کے جی کا اعتدال یہی ہے۔ کوئی اس سے ناقص اور کوئی انقص، پھر

کوئی اور ناقص وانقص سے بھی اور زیادہ، تو ہر ایک کا اعتدال الگ الگ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آزادی دیدی، صرف قُمِ الَّیْلَ فرما کر نہیں چھوڑا؟ تو مطلوب اعتدال ہے، لفظِ ایمان بتلا رہا ہے کہ ایسی عبادت کرو کہ جس میں تمہارے اندر اَمن رہے، یہ اس لئے کہا کہ ایک بدامنی عام ہوتی ہے اور ایک بدامنی جزوئی ہوتی ہے، ایسا کھانا کھایا کہ بدامنی ہوگئی، بدہضمی ہوگئی یا ایسا کھانا کھایا کہ صرف چکھ لیا۔

یوپی کے لوگ کے ذہین ہونے پر لطیفہ :

کوئی بے چارہ لکھنؤ چلا گیا اور ایک دعوت میں شریک ہوا۔ اب یوپی کے لوگ بڑے ذہین ہوتے ہیں، تو وہ دیکھ رہا ہے کہ لکھنؤ کے لوگ جو کھانا کھا رہے ہیں وہ اطمینان سے ذرا سا لقمہ لے رہا ہے اور ذرا سے سالن میں لگا رہا ہے۔ اس نے دیکھا یہ تو بڑی مشکل ہوگئی، اس نے کیا کیا؟ لقمہ ذرا سا لیا اور ذرا سا سالن میں چھولیا، پھر لقمہ ذرا سا لیا پھر سالن میں چھولیا، ناک سے سونگھ کر رکھ دیا، کھایا نہیں، لکھنؤ والے تو کھا بھی رہے تھے مگر اِس نے کھایا نہیں تو لکھنو والے جو کھا رہے تھے کہنے لگے یہ کیا؟ اِس نے کہا کہ میرا پیٹ تو سونگھنے ہی سے بھر جاتا ہے، یہ بھی ایک اعتدال ہے۔

ایک دیہاتی کی مثال :

حکیم جی کے پڑوس میں کوئی گاؤں والا تھا۔ تو جب ایک دفعہ بیمار ہوا تو حکیم جی کو نہیں بلایا تھا، مگر وہ پھر ٹھیک ہوگیا، پھر کسی دن نزلہ زکام ہوگیا، پھر کھانا کھا رہا تھا، کھانا کھانے کے بعد کہا: ارے بٹیہ! میں کھانا تو کھا چُکا ذرا چھا (چھاچھ) دیدے میں پی لوں، لڑکی نے کہا اچھا باوا، حکیم جی پڑوس میں تھے ہی اُن کے گھر میں بھی آواز گئی، حکیم جی نے کہا کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ کھانے کے بعد چھا پی رہا ہے، اور نزلہ زکام اِس

کو زور کا (یعنی سخت) ہو رہا ہے، اب نزلہ زکام دور پہنچ جاوے گا اب بلاوے گا مجھے۔

حکیم جی نے کہا کہ اگر ہاں بیچ میں پی لیتا تو کچھ نقصان نہیں تھا، وہ آواز سن لی پڑوسی نے تو پڑوسی نے کہا کہ ارے بٹیہ حکیم جی کہہ رہا ہے کہ بیچ میں پی لیتا تو اچھا تھا، لاؤ دو روٹی تو میں کھا چکا دو روٹی اور لے آؤ بیچ میں کرلوں گا چھاچھ کو۔ تو اس کا اعتدال یہی ہے۔

تو یہ تطبیقات ہیں اصل وہی ٹھہرے گی یعنی اعتدال' تو اس کو اس کھانے میں بدہضمی بدامنی نہیں ہوگی؟ تو ایک بدامنی ہوتی ہے عام اور ایک بدامنی ہوتی ہے خاص جزئی وشخصی، ایسے ہی امن ایک ہوتا ہے عام اور ایک ہوتا ہے امن جزئی وشخصی۔

تو مقصد یہ ہے کہ امن کا باقی رکھنا عامۃً یا جزئیاً، شخصیاً، اجتماعاً وانفراداً۔

ایمان بتلا رہا ہے کہ امن ہو اسلام بتلا رہا ہے کہ سلامتی ہو۔ اب جب اس طرح سے چلے گا : رَبُّنَا اللّٰہ کہہ کر تو استقامت ہو جائے گی اور مقصود استقامت ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا دلیل پہلے ہو اور دعویٰ بعد میں ہو۔ یہاں پر اِسْتَقَامُوْا کی دلیل رَبُّنَا اللّٰہ ہے۔ اِسْتَقَامُوْا یہ مطلوب ہے اللہ تعالیٰ کو، اور استقامت پر سب کا عمل ہونا چاہئے کیونکہ آپ نے ہی تو کہا تھا رَبُّنَا اللّٰہ جب رَبُّنَا کہا تو اس کہنے میں حق تعالیٰ کا خوف بھی آ گیا، اور حق تعالیٰ کی محبت بھی آ گئی، اور جب خوف بھی آ گیا اور محبت بھی آ گئی تو پھر اطاعت عبادت کس کی؟ جس کی شان ایسی ہو اسی کی عبادت وطاعت ہوگی، اسی کو اللہ کہتے ہیں تو رَبُّنَا کہہ کر اللہ کہا ہے۔ اسی کی عبادت ہوتی ہے اور جس کی عبادت ہوتی ہے، اسی کا نام اللہ ہے، لہٰذا وہ اللہ ہی عبادت کئے جانے کا مستحق ہے، دوسرا نہیں۔

اس لئے کہ وہ ربّ تربیت پرورش کرنے والا ہے، نفع ونقصان اسی کے ہاتھ میں ہے، اگر کچھ خلاف کرلیا تو ڈرنے لگے، خوف کھانے لگے۔

خوف سے اطاعت آتی ہے :

ایسا نہیں جیسا کہ ہمارا آج کا زمانہ ہے کہ بیٹا باپ کے ڈر سے نکل گیا اس لئے طاعت سے نکل گیا۔ راضی ناراضگی کا خیال نہیں رہا اور اس سے پہلے کا زمانہ تھا کہ بیٹا باپ سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ مُربی مجازی پرورش کرنے والا ہے، طبیعتوں میں سادگی تھی تو دل میں محبت تھی باپ کی ماں کی اور ڈر بھی ساتھ ساتھ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر میں خلاف کروں یا نافرمانی کروں تو اباجی کہیں مجھے دھکا نہ دیدیں پھر روٹی کہاں سے کھاؤں گا اور کون کب تک دے گا۔ تو سمجھتا تھا کہ میرا ربّ مجازی تو یہی ہے، تو وہ بیٹا ڈر رہا ہے اور محبت بھی عجیب اور خوب قسم کی کر رہا ہے کہ نفع اسی سے ہے اور ضرر کا اندیشہ بھی اسی سے ہے۔

ربِّ حقیقی کو نفع وضرر کا مالک سمجھنا اور اس کا اثر :

ٹھیک اسی طرح ربِّ حقیقی ہے کہ نفع بھی اسی سے ہے اور ضرر کا بھی اندیشہ اسی سے ہے، کیا اللہ تعالیٰ کا نام نافع اور ضار نہیں؟ تو جب یہ کہا تو فوراً طبیعت کی سلامتی ہوئی اور عقلِ مستقیم میں آ گیا کہ وہی ڈرنے کی چیز ہے وہی محبت کرنے کی چیز ہے۔ کیونکہ میری زندگی کا سہارا پورے کا پورا اسی پر ہے۔ جب میرا نفع وضرر اسی کے ہاتھ اسی کے قبضہ میں ہے تو پھر اسی کا ہو کر رہوں، اگر کسی اور سے نفع اور ضرر کی اُمید ہو لیکن ربّ کے مقابلہ میں اس کے نفع کی اور اس کے ضرر کی اُمید غالب نہ ہو بلکہ غالب اسی کا نفع وضرر ہو تو جب حُکمِ ربّ متضاد آ جائے (یعنی مخلوق کے حُکم کے بالمقابل) تو اس کے متضاد حُکم میں مخلوق کا کیا حُکم؟ ربّ کا حُکم ہی مانا جاوے کہ میں نے اس ربّ کو اللہ کہا ہے۔ لہٰذا میں نے جب رَبُّنَا اللّٰہ کہا ہے کہ وہ دلیل ہے اِس دعوے کی تو میں

استقامت سے کیسے ہٹوں؟اس رَبُّنَا اللّٰہُ کہنے پر جما ہوا کیوں نہ رہوں ڈٹا ہوا کیوں نہ رہوں۔وہ چیز جس نے فطرتِ سلیمہ کے اختیار کرنے کو ملقب فرمادیا،اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کہ استقامت رَبُّنَا اللّٰہ کہہ کر جو تیری فطرت سلیمہ ہے یہ فہم سلیم کا تقاضہ ہے کہ جب اس کی فطرت یہ ہے سلامتی کے ساتھ امن کے ساتھ تو میری فطرت ہے تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا فرشتے آئیں گے اور یہی کہیں گے یعنی جب تو ایسا ہے تو غمگین اور خوف زدہ کیوں ہوں۔ بشارت سنادی کہ اب غم وحزن کا ہونا نہ ہوگا، رَبُّنَا کہہ کر اللّٰہ کہنا اور استقامت کا ہونا یہ ہے اعتدال۔

اِعتدال و اِستقامت کے درجات کے اعتبار سے بشارت :

اِعتدال ہر شخص کا علیحدہ ہے الگ الگ ہے،اسی اعتبار سے اَنْ لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا بھی الگ الگ ہے،مومن آخر دم تک ایمان پر بھی رہا اور من وجہٖ اسلام میں بھی رہا ایمان میں بھی رہا،تو من وجہٖ امن میں رہا اور من وجہٖ سلامتی میں رہا،اب دوسری بشارت ہے اسی اعتبارِ اِعتدال پر اس کے لئے بھی اَنْ لَا تَخَافُوْا وَلَاتَحْزَنُوْا ہے تو یہ ہر مومن کے لئے ہوگیا اور کافر کے لئے نہیں رہا اَنْ لَا تَخَافُوا وَلَاتَحْزَنُوا کافر کے لئے نہیں رہا مومن ہی کے لئے رہا۔

حدود کی حیثیت سے احکام سب کے لئے برابر ہیں :

اعتدال کا جو درجہ ایمان واسلام میں ہے وہ درجۂ حدود میں ہے (یعنی محدود اور متعین مقدار فرائض میں ہے)اِن حدود میں تو کمی بیشی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ پانچ وقت کی نماز، چار وقت کی فرض رہ گئی ، یہ حدود ہیں اِن حدود میں تو کمی بیشی نہیں

ہوتی، ہاں حدود سے آگے جو چیزیں اور اعتبار سے ہیں ان میں کمی بیشی ہوتی ہے اب وہ کمی بیشی ہر ایک کے حالِ اعتدال پر جداگانہ ہے۔

جملہ معترضہ :

ہاں یہ الگ بات ہے کہ حدود میں ہی ذاتِ باری تعالیٰ کسی کی معذوری کو منظور فرما کر پہلے ہی سے اس معذور کے لئے حدود کے اندر کچھ کچھ تخفیف فرمادیں۔ کوئی حاملہ غیر سے پیش کردی گئی رجم کا حکم ہے لیکن کیا کہا جارہا ہے کہ جب وضعِ حمل ہوجائے تب رجم کیا جائے گا بچہ کا کیا قصور ہے وہ بھی رجم ہوجائے گا تو رجم تو اپنی جگہ باقی رہا لیکن فی الفور اور بالفعل ایک عارض پیش آ گیا تو حد اپنی جگہ باقی رہی۔

نماز میں تقلیل وتخفیف :

نماز پنجگانہ کی مسافتِ شرعی میں اس کی حد یعنی مقدار میں تقلیل ہوگئی۔ مثلاً حضر میں ہے لیکن علالت اور ضعف کھڑے ہونے کو منع کررہا ہے تو ذاتِ باری تعالیٰ نے اِس حد میں جو قیام فرض ہے اس میں سہولت اور تخفیف فرمادی کہ بیٹھ کر اور لیٹ کر بلاوضوء، مٹی سے تیمّم، حدود اپنی جگہ پر ہے، وقتی تخفیف تقلیل ہوگئی۔

ہر مؤمن کا نفس، نفسِ مطمئنہ ہے :

ہر مؤمن جو (صحیح عقیدے کے ساتھ رہتا ہے) ہر مؤمن کا نفس نفسِ مطمئنہ ہے کہ یہ مطمئنہ مقابلہ میں خبیثہ کے ہے (یہ اصطلاحی مطمئنہ نہیں جو لوّامہ، امّارہ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے ۱۲ نصیر احمد) دوسرا خبیثہ ہے اور وہ کافر کا ہوتا ہے، مؤمن کا نفس خبیثہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو واقعی مؤمن ہے موت کے وقت اُس کو معلوم ہوتا ہے کہ میرا

ایمان پر خاتمہ ہو رہا ہے۔

فرشتہ جو ہر مومن کی جان نکالتا ہے، وہ اس کو خطاب کرتا ہے یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ بس کیا غم کھایا اِرْجِعِی اِلٰی رَبِّكِ اور لفظِ نفس مؤنث ہے تو صفت بھی رَاضِیَۃً مؤنث لائے، اے نفس چل، لَوٹ لَوٹ رجوع کر، کہ تو رجوع کرتا رہا تھا، کیا سمجھے؟ تو رجوع کرتا رہا تھا! کہ اگر تجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو رجوع الی اللہ کرتا رہتا تھا، کوئی غلطی ہو تو بھائی مجھے معاف کرتے رہنا، فقیر ایسی ہی باتیں کیا کرتا ہے، تو کر گذرتا تھا، کر گذرتا تھا، لیکن حفاظتِ ایمان اب تک ہے تو رجوع کرتا رہتا تھا، کبھی زبان سے کرتا تھا، کبھی دل میں کرتا تھا تو رجوع کر اِرْجِعِی چل تو تو رب کو راضی رکھنے والا تھا، جب کوئی بات ہوگئی خلافِ راضیہ کوئی بات ہوگئی تو تو اس رب کو مناتا رہتا تھا۔

حضرت مجدّد ملت حکیم الامت قدس سرہٗ کا ارشادِ گرامی :

حضرت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نہیں روٹھتے، تم روٹھتے ہو، تم منالو، وہ راضی ہو جاتے ہیں، ذرا سی دیر میں بات بن جاتی ہے، زبان سے بھی کہنے کو نوبت نہیں آتی، ہاتھوں کے بھی پسارنے کی نوبت نہیں آتی، دل میں شدّت سے ندامت آگئی، مَن گیا من گیا، مؤمن جب بیمار ہو جاتا ہے، جب بیماری طول پکڑ لیتی ہے، اس کے سامنے موت تو ابھی آئی نہیں مگر موت دل میں آگئی، اب اپنے کئے ہوئے پر کوئی مؤمن ایسا ہے جو پچھتاتا نہ ہو؟ اندر ہی اندر کُٹھن ہو رہی ہے اور یہی پچھتانا ہے، یہی ندامت اور توبہ ہے، تو یہ بیمار بیماری کی حالت میں تائب ہو رہا ہے، اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّاذَنْبَ لَہٗ ادھر حالت رضا ہوگئی اور ادھر حالتِ مرض ہوگئی لہٰذا تو رضاء کی حالت میں اس کی طرف چل اور اس کی طرف سے تو اپنی مرضی کی حالت میں چل، نہ غم کی ضرورت

ہے اور نہ خوف کی ضرورت ہے، چل یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً چلو چلو، پھر اس کی روح نکل جاتی ہے، اور پھر بشارت ہوتی ہے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ کہ جو میرے مخصوص بندے ہیں ان میں داخل ہو جاؤ، یہاں جو عبادی فرمایا عبادی تو سارے بندے ہیں مگر کلام کا سیاق کیا کہہ رہا ہے؟ وہ آپ کے بندے کون سے ہیں؟ کافر؟ اَلْعِيَاذُ بِاللّٰہ، سیاقِ کلام کہہ رہا ہے ان عُبّاد سے مراد کیا ہے؟ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ، اِن کا محل کیا ہے؟ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ وہ محل جنت ہے، وہ میں نے تمہارے لئے تیار کر رکھا ہے، اس میں جاؤ۔ یہ ہے استقامت نفسِ ایمان پر لفظِ مشتق استقامت پر دال ہے اللہ تعالیٰ ہمارا ایمان آخر دم تک آخر سانس تک بعزت و عافیت رکھے۔

☆

اٹھارہویں مجلس

آثارِ توحید و معرفت

مورخہ ۳۰ رجب ۱۴۱۱ھ بمطابق ۱۶ فروری ۱۹۹۱ء بروزِ شنبہ بوقتِ صبح

ذاتِ معصوم کے ساتھ لپٹنے سے پُر از معاصی معصوم بن گیا، معصوم کے چمٹنے سے جو دوزخ میں پُر از معاصی جا رہا تھا، یہ معصومیت سے مبدل ہو گیا، اپنی طرف کھینچ لیا، لپیٹ لیا۔

ملبوسِ موسوی کی مشابہت کا ثمرہ :

اور جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لپٹے بھی نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ کا جو لباس تھا اُس لباس کی نقل اپنے جسم پر کر لی تو ذات باری تعالیٰ کو غیرت آ گئی کہ میرے محبوب کا لباس اختیار کرے اور پھر اسے دوزخ میں بھیجوں، تو تمام عمر کے گناہوں کو اس لباسِ مشابہ ملبوسِ موسیٰ کے ساتھ ہونے سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایمان کی توفیق دیدی۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لباس ان کے جسم پر نہیں آیا، وہ صرف لباس کی شکل اختیار کر کے اپنے جسم پر کر لی تھی، مثل ملبوسِ موسیٰ ہو گیا، تو ان کے کفر کو مسل کر

رکھ دیا، اس لئے پُر از معاصی معصوم ہو گیا، لہٰذا جب جنت میں جائے گا، تو معصوم بن کر جائے گا عاصی ہو کر نہیں جائے گا۔ اس لئے کہ مؤمن ہو کر اس کو آس تھی اگر چہ عاصی تھا مگر آس تھی حسنِ ظن لے کر آیا ہے اس لئے اِس کی وجہ سے مبدل بعصمت کر کے جنت میں داخل ہو کہ جیسے تم یہاں سے گئے تھے معصوم بنا کر داخل جنت کیا جاتا ہے۔

کینہ کی بو بھی دخولِ جنت سے مانع ہے :

ہاں اگر کسی میں کچھ کھجلی سی عصیان کی رہ گئی جیسے کہ حسد یعنی کینہ تو جنتی روک دیا جائے گا کہ جنت لڑائی کا گھر نہیں ہے، تمہارے اندر تو حسد کی بو آرہی ہے پھر ذاتِ باری تعالیٰ اس سے کینہ کی بو کو دور فرمادیں گے اور عصمت کی خوشبو آجائے گی۔ اب فرمائیں گے کہ جاؤ جنت میں، اور ایسے خوش ہو گئے ہیں اللہ تعالیٰ باوجود اس کے بو ہونے کے کہ خود اس کو دھو رہے ہیں جیسے بچے کو ماں دھوتی ہے۔ تو ذاتِ باری تعالیٰ بھی اس کو دھو رہے ہیں اور یاد دلا رہے ہیں کہ بچہ! تو یہیں سے گیا تھا، جاؤ اب چلا جا دنیا میں اس لئے بھیجا تا کہ دیکھو ہر وقت کیسے یاد رکھتے ہو، ہمارا کیا سنتے ہو؟

عرفانِ حق کے بعض آثار :

عابد ہونا تو بہت آسان ہے مگر عارف بننا بہت مشکل ہے۔ یہ ہیں عرفان کی باتیں کہ آدمی اپنے گناہ کو بھول جاتا ہے، بیماری کو بھی بھول جاتا ہے، کمزوری کو بھی بھول جاتا ہے، جوانی آتی ہے اور عرفانِ حق کا حظ حاصل ہو جاتا ہے۔

معرفت کی فطری مثالیں :

یہی تو غلطی ہے کہ بیٹے نے یہ تو جان لیا کہ ہاں یہ میرا باپ ہے لیکن ابھی

بیٹے کو باپ کی معرفت نہیں ہوئی اس لئے جس طرح بیٹے کو پیش آنا چاہئے تھا پیش نہیں آیا۔ اور جس دن بیٹے کو معرفت ہوگئی بس اب اس کی نظر میں کوئی نہیں اگر مار بھی لے تو خوش، پیٹ بھی لے تو خوش کہ میرا باپ ہے کیا بات ہے، کوئی ڈر نہیں۔ میرا باپ ہے محبت سے مار رہا ہے خاموشی سے پٹ رہا ہے کہ مجھے آگے بڑھانا چاہ رہا ہے میرے فائدے کے لئے مار رہا ہے گھر سے تھوڑی دیر کے لئے نکال رہا ہے، زیادہ دیر کے لئے بالکل ہی نہیں نکالا ہے۔ ایسے بھی سعادت مند ہوتے ہیں کہ باپ نے نکال دیا وہ کہہ رہا ہے کہ یہ تو مجھے اور مہذب بنانے کے لئے ہے تو ایسے باپ کی مار سونے پر سہاگہ، پیار کی مار کے پیاری پیار کرنے سے اچھی ہے۔ جس دن یہ سمجھ لے گا تو اُس دن مار پر پیار آئے گا، دیکھئے ماں مارتی ہے اور دوسری عورت اس کو گود میں سے لینا چاہ رہی ہے لیکن اس کے باوجود بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹنا چاہ رہا ہے۔

جب مخلوق کا مخلوق کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو خالق کے ساتھ معاملے کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا پھر وہ بات یاد کرلو شریعت طبیعت ہوجاوے، طبیعت شریعت بن جائے۔

یحبھم و یحبونہ کا مصداقِ حقیقی:

جب شریعت طبیعت بن جاوے اور طبیعت شریعت، پھر تو اللہ تعالیٰ نے بچہ مؤمن کو گود میں لے لیا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا (الحدیث) کہ اللہ تعالیٰ نے اس بچہ مومن کو گود میں اُٹھالیا۔ چونکہ بچہ میں فریب نہیں ہوتا اس کے باطن میں خلوص ہی خلوص ہوتا ہے تو اماں طمانچہ مار رہی ہے اور بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹ رہا ہے۔

عارفانہ انداز میں اظہارِ حقیقت :

جن کو شہید کرانا تھا شہید کرادیا اور جن کو بچانا تھا غازی بنا کر بچا دیا اور مارلو تم تھوڑا ہی مار رہے ہو اور مضبوطی آ گئی۔ تم تھوڑا ہی مار رہے ہو ہاں ہمیں یقین ہے قرآن شریف میں ہے وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہ اور تم نہیں چاہتے کسی چیز کو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔

مشرک اور مؤمن کے یقین میں فرق :

تو مؤمن کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ ضرر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش آیا ہے کیونکہ ہر مؤمن کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نافع اور ضار ہے۔ اور ضرر یقینی طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ اسی کی طرف سے آیا ہے پھر بھی وہ نہیں چھوڑتا توحید کو اور اگر مشرک و کافر کو یقین ہو گیا کہ جس کی میں پوجا کر رہا ہوں اُس کی طرف سے ضرر آیا ہے تو اُس کو اُٹھا کر پھینک دیا کہ میں تیری عبادت کرتے کرتے مر گیا اور تیری طرف سے یہ ضرر۔ اور اسی کا بیان سورۂ مدثر میں ہے :

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝

اے کپڑے میں لپٹنے والے اٹھو (یعنی اپنی جگہ سے اُٹھو یا یہ کہ مستعد رہو) پھر (کافروں) کو ڈراؤ اور اپنے رب کی بڑائیاں بیان کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور بتوں سے الگ رہو۔ (جس طرح اب تک الگ رہا)

تو مؤمن کی توحید ایسی چیز ہے، تو رسولِ پاک ﷺ کی توحید تو بطریقِ اولیٰ، بھلا آپ سے اونچا اور کون ہوگا اور پھر ایسی ذات کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں :

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۔۔۔۔۔۔الخ

عظمتِ توحید :

توحید اتنی پاک کہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ کہ جو کپڑا بدن پر ہے جب شریفُ الطّبع، نظیف الطّبع میلے کپڑے کو ذرا بھی کہیں اگر کچھ لگ جائے تو گوارہ نہیں کرتا تو موحد کی توحید میں شرک کا نقطہ کیسا؟ یہ اشارہ ہے اہتمامِ شانِ توحید کی طرف کہ یہ ایسی ضروری چیز ہے کہ معصوم کو بھی جو شروع ہی سے مجتنب ہے، اس کو بھی شرک سے بچنے کا حکم ہے۔ تو معلوم ہوا کہ توحید اتنی اعلیٰ وافضل اور پاکیزگی کی چیز ہے کہ معصوم کو بھی کہا جارہا ہے کہ اس کی بو بھی نہ آنے پائے جیسے میلے کپڑے کی بو کہ سفید کپڑے پر نقطہ لگ گیا فی الفور دھو رہا ہے تو یہ ہے معرفت، رہی عبادت 'عبادت تو ایک طریق بن جاتی ہے معرفت کی زیادتی کے لئے بخلوص عبادت ہی سبب، ذریعہ اور وسیلہ بن جاتا ہے معرفت کا۔

محبت و معرفت کے تقاضے :

قرآنِ پاک میں دو ہی چیزیں ہیں ذکر اور فکر، ذکر سے محبت اور فکر سے معرفت، اور جس دن معرفت آگئی تو ذاتِ باری تعالیٰ کو وہ یقین کرتا ہے کہ جیسے وہ نافع ہیں وہ ضار بھی ہیں اور حقیقتاً جو یہ ضرر مجھ کو آیا ہے اس کی طرف سے آیا ہے۔ لہٰذا نافع ہونے کے درجہ میں ہے نافعیّت ہے میرے لئے۔ اس ضار کی طرف سے ضرر بھی اس کی نافعیّت سے زیادہ نافع ہے میرے لئے۔

معرفتِ الٰہی کا اثر :

مگر معرفتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ ضرر ضار کی طرف سے آئے تو سمجھے کہ یقیناً

یہ تو نافع کی نافعیت سے زیادہ نافع ہے۔ اس لئے کہ عروج ہے ترقی ہے اس میں چھٹائی ہے کسر کو نکالا جارہا ہے، سطح کو صاف کیا جارہا ہے، مہذب بنایا جارہا ہے، مرزا جانِ جاناںؒ کو دعوت پیش کی کھانا سامنے ہے مگر کھاتے نہیں، حضور نوشِ جان فرمایئے یہ فرش ذرا سا کچھ اوپر کو اُٹھا ہوا ہے، خلجان ہے کیسے کھاؤں، دیکھا تو فرش کے نیچے ایک کنکری ہے اس کو نکالا، صفیں ٹھیک ہوگئیں، کھانا شروع کردیا۔

مخلوق سے قطع اور ذات حق پر نظر :

اللہ تعالیٰ اسی لئے مومن سے وسائط کو ہٹاتے ہیں، قلباً تم کس جھگڑے میں پڑے ہو، تم کدھر متوجہ ہوئے، کدھر التفات کیا تم نے محبوب کی گود میں بیٹھ کر خلوت میں کس غم میں پڑ گئے، کس خیال میں پڑ گئے۔

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کا شان نزول :

دارالندوہ میں مشورہ کے لئے مشرکین وغیرہ جمع ہوگئے اس محمد ﷺ کے لئے کوئی خطاب تجویز کرو۔ کسی نے کہا کہ کاہن کہو کسی نے کہا شاعر کہو کسی نے کہا مجنوں کہو کسی نے کہا ساحر کہو۔ اس لئے کہ سحر میں دوست کو دوست سے جدا کرنا ہوتا ہے، ہماری آپس کی دوستی تھی ان کے کلام سے جدائی پڑگئی۔ یہ بات حضورِ اکرم ﷺ کو پہنچ گئی بتقاضۂ بشری ملال آگیا چادر لپیٹ کر لیٹ گئے تو جس صفت میں تھے اسی صفت سے اشتقاق فرما کرتا کہ تانیس وملاطفت ہوجائے، یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّل فرمایا جیسے حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کی کچھ بات ہوگئی ذرا رنجیدہ ہوکر مسجد نبوی کے فرش پر لیٹ گئے، مٹی تھی، آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ابُوتُراب فرمایا تھا۔ غرض آپ ﷺ کو خطاب ہے

کہ اِن باتوں کا رنج نہ کرو بلکہ حق تعالیٰ کی طرف دوام وزیادت کے ساتھ توجہ رکھو، یہ کیا ہوا؟ واسطہ سے نظر ہٹاؤ جو خیال آ جائے ان کی ملامت سے ملالیت، ملولیت کا اس سے بے التفات ہو جاؤ۔

وساوس وخیالات غیر اختیاری کے دو قرآنی علاج :

جتنے خیالات غیر اختیاری اور جتنے وساوس غیر اختیاری اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہے ہیں جہاں بے خیالی اور بے التفاتی سے کام نہیں چلتا تو اس کا علاج بتلا دیا کہ دوسرے کام میں لگ جاؤ، گویا تعاون ہو گیا، ایک تو وہ اعانت بے التفاتی اور اس اعانت کے ساتھ کام کی مشغولی تو وہ تعاون میں معاوِن ہو گیا اور وہ بے التفاف و بے خیال ہو گیا، رنج وملال ختم ہو گیا، یہ تمامی وساوس کا اور تمام غیر اختیاری خیالات کا علاج ہو گیا، لوگ خیالات کو پالتے رہتے ہیں، وساوس کو پالتے رہتے ہیں، علاج نکل آیا، اس سُورَۃ مُزمل کے رموز سے، آواز دی یاَیُّھا المُزمل، اپنی طرف متوجہ کر لیا اور پھر فرمایا: قُمْ۔

کہ اے نبی ! رات کا وقت ہے اُٹھ جاؤ، اللہ کی یاد میں لگ جاؤ۔

مدثر اور مزمل کا فرق :

وہاں کہہ دینا یاَیُّھا المُزمل اور یہاں یاَیھا المُدَثّر کوئی چیز اندر نہیں ہے اوپر سے کپڑا لپیٹ لیا (یہ مزمّل ہے) اور کوئی چیز اندر ہے اس پر لپیٹ لیا، یہ مُدثّر ہے یہ فرق ہے مزمّل کا اور مدثّر کا یہ دثار سے ہے جیسے چادر شیروانی جبہ وغیرہ۔

قرآن شریف کی آیت یاَیھا المزمل نازل ہوئی، اس وقت تو آپ نے یوں کہا تھا کہ میری عبادت میں لگ جاؤ میری طرف متوجہ ہو کر ذکر میں لگ جاؤ، اب یہاں کیا کروں؟ جب بھی کہا تھا یاَیھا المزمل، اور اب یہ کہہ رہے ہے یاَیھا المُدثر

،کیا کروں؟ جب بھی آپ نے کہا تھا، کیا کہا تھا؟ قسم ،اب بھی کیا کہہ رہے؟قسم، جب آپ نے قسم کہا تھا تو کہا تھا میری عبادت کرو، ہاں اب دوسرا موقع ہے جب تم کو اپنے کام میں لگایا تھا،اب دوسرے کے کام میں لگانا چاہتا ہوں۔

نفعِ متعدی کے لئے شرطِ اوّل قوتِ علم :

اب دوسروں کے کام میں لگانا چاہتا ہوں، وہ کون سا کام ہے؟ اب تم میں قوّت آگئی عبادت کرتے کرتے، اِدھر میری طرف توجہ کرتے کرتے عجائب وغرائب دیکھنے سے تمہارے اندر قوّت آگئی، اب دوسروں کو میری طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

خدمتِ خلق کے لئے ذاتی کام میں تخفیف :

اب آپ کا جو ذاتی کام تھا وہ ہلکا ہو گیا تمہارا ذاتی جو کام عبادت کا تھا تصفیہ اور تزکیہ کا ریاضت ومجاہدات کے ساتھ، عبادتِ جسمانی وغیرہ کے ساتھ، وہ تو اب تمہارے لئے ہلکا ہو گیا۔ اس لئے کہ دوسرے کی خدمت اپنے کام میں لگے ہوئے کیسے کرو گے تو آپ کی ذات سے جو کام تھا وہ ہلکا ہو گیا، تم کو تو دوسروں کے کام کے لئے میں نے بنایا ہے، پس اس طرح سے کہ اپنے کام کو بھولو نہیں اور ہلکے ہو جانے سے گھبراؤ نہیں۔

اب ایک شخص دو کام کیسے جمع کرے گا کہ یہ بھی کرے، وہ بھی کرے اب وہ کام تمہارے لئے ہلکا، دوسرا کام جو تم کرتے تھے ہلکا تو ہو جائے گا مگر گھبرانا مت کہ تم تو میری بہت عبادت کرتا تھا، تمام رات جاگتا تھا، میری عبادت میں لگتا تھا۔

وہ ثواب اب بھی مل رہا ہے کثرتِ عبادت اور تکثیرِ ذکر کہیں نہیں گیا۔ وہ تو

موجود ہے، کیونکہ حُکم کے تحت ہی تو تم کو کہا تھا تو مجھے تخفیف کرنا ہوگی۔ جب حُکم ہوا، اب کیا کروں وہ تو عبادتی کام تھا اب کیا کروں؟، اُٹھو دوسروں کو دعوت دو۔

اَمر بالاِنْذار کی وجہ :

یہاں تبشیر کو اس لئے نہیں فرمایا کہ یہ آیت ابتداء زمانۂ نبوت کی ہے، اس وقت ان کے دل بڑے پتھر کے تھے بتوں کی عبادت کرتے کرتے ان کے دل پتھر ہوگئے ہیں۔ ابھی ان کے لئے اِنذار کی ضرورت ہے، ابھی ان کے لئے ترہیب کی، تحذیر کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے دلائلِ ہیبت، قیامت کے احوال کی اور میدانِ محشر کی بڑی بڑی ہولناکیوں کی شدید ضرورت ہے۔ ان کو ڈرایئے انکے دل زیادہ نرم ہوں پھر آوے گا تبشیر کا کام۔

برنگِ عارِفانہ فقیرانہ باتیں :

یہ کام ہے اس کام میں لگ جاؤ' بس اب تمہارے اندر باطن کے اعتبار سے بڑی پختگی آ گئی ہے، اب یہ کچھ ہی کرتے رہیں ملامت کی باتیں اور کچھ بھی آتی رہیں آپ کی خدمت کی باتیں، تو تاثر ختم ہوگیا، تمہارا غم ختم ہوگیا، پختگی آ گئی۔ ربِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ۔

سورۂ مدثر کی اوّل آیتوں کی تفسیر :

اب انتظار نہ کیجئے گا، اِنذار کیجئے، یہ تفسیر تعبیری ہے۔ یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ ، آگے فَاَنْذِرْ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ ۔ اپنے ربّ اپنے پالنے والے کے بڑائیوں پر بڑائیاں بیان کیجئے، تاکہ ان کو معلوم ہوجائے کہ وہ کتنا بڑا ہے، مِن حیث الذات من حیث

الصفات وہ کیسا بڑا ہے۔اور جو ایسا ہے وہ قابلِ خشیت ہے هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ وہی ہے، ڈرنے کے قابل جو ایسا ہے تو اس کی بڑائیاں اس کی ذات اس کی صفات کے ساتھ بیان کیجئے، تاکہ ان کے اندر انذاریت آجائے۔ان میں تقویت آجائے گی، جب تقویت آجائے گی تو پھر بشارت کی بات ہو جائے گی، اس وقت تو اِن کے پتھر دلوں کو اِنذار کی ضرورت ہے۔

اثباتِ توحید کا طریق :

اور اس کا طریق یہ ہے کہ اپنے ربّ کی عظمتِ شان بلا نشان بڑے عظیم الشان ہونے کو من حیث الذات' من حیث الصفات ان کے سامنے پیش کیجئے اور پھر پوچھ لیجئے گا کہ کوئی ایسی ذات ہے ایسی کوئی صفات والا ہے؟ پھر وہی اگر مرجع الخلائق نہیں تو اور کون دوسری ذات ہے؟ یہ ترتیب ہے ترتیب دیکھئے، ربط وضبط ملاحظہ فرمایئے، لہٰذا ہم آپ کو مُنذِر بنا چکے اور مُنذِر بنا کر بھیج رہے ہیں، دلوں کے اندر اِنذار پیدا کرنے کے لئے استعداد پیدا کرنے کے لئے۔لیکن اس کے باوجود اور باتوں کی طرف گو توجہ دلانے کی ضرورت نہ ہو مگر توجہ دلا دی ایک توجہ ظاہر کی طرف اور ایک توجہ باطن کی طرف شفقت کے ساتھ۔

قرآن پاک کا ترجمۃ الباب :

چونکہ قرآن پاک کا ترجمۃ الباب ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' ہے، تو سارا قرآن رحمت وشفقت سے مملو ہے جس کا ظہور ہر ہر آیت سے ظاہر باہر ہے، لہٰذا توجہ دلا دی کہ اپنے کو بیدار رکھنا، اپنے کو بیدار سے بھی بیدار رکھیئے۔اس میں کئی باتیں ہیں ظاہر کو بھی ذرا کچھ بچایا کاموں سے' ذرا غور کرو، کیونکہ وہاں تو کیا ہو چکا ہے؟ سارا

تزکیہ ہوگیا ہے۔اب اچھا پہنانا چاہ رہے ہیں،اچھا کھلانا تو کبھی کبھی اور اچھا پہنانا تو ہر وقت کا ہے،تو اس مضمون کا ارشاد ہوتا ہے وثیابک فطھر۔پورا جوڑا،سر سے لے کر پاؤں تک پاکیزہ ہی پاکیزہ۔

مہمان اور میزبان کے لئے طریقِ سُنّت :

مسئلہ نکل آیا کہ جب مہمان بن کر کہیں جاتا ہے اگر چہ کل کپڑے پہنے ہیں، اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں تو آج دوسرے کپڑے پہن کر جاؤ اور مہمان آ رہا ہے تو کل کے کپڑے پہنے ہوئے اُتار کر دوسرے کپڑے پہنو،اس مہمان کی خاطر کہ آ رہا ہے یہ ہے طریقِ سنت، و یُرَقِّعُ ثوبَہ ویخصف نعلہ۔حضور ﷺ اپنے کپڑے میں پیوند خود لگا لیتے،سب کے پیوند لگوادو۔

صدر مدرس کا وصف خاص :

مدارس عربیہ دینیہ میں صدر مدرس بڑی شان کا ہونا چاہئے،اندر فقیری لئے ہوئے ہو،اور باہر سے شاہی میں ہے۔جب صدر مدرس کو اس طرح ہونا چاہئے تو مہتمم کو تو بطریق اولیٰ ایسا ہونا چاہئے،ورنہ مانگتے پھرو! کرتے پھرو چندہ۔

اہلِ مدارس کو خطاب :

یا اہل المدارس! اندر سے مٹایا نہیں اپنے آپ کو اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنے آپ کو مٹا دیا۔بس یہی وہ طور و طریق ہے جن کو دیکھ کر اہلِ دنیا عالمِ دین سے متنفر ہو گئے بہر حال علماء کا طرز وہ ہونا چاہئے جو رسول اللہ ﷺ کا طرز تھا اور حضور ﷺ کو تو سورۂ مدثر میں یہ حُکم ہے، وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ پورا جوڑا یعنی اوپر سے لے کر نیچے صاف

شفاف ہوگئے، صاحب الوجاہت بھی، تو منتظم کو ایسا ہونا چاہئے اور سپہ سالار کو بھی کہ جسم کا بھی حق ہے، قرآن شریف میں سورۂ مدثر میں اپنے نبی عربی ﷺ کو ملاحظہ فرمایا ہے، لہٰذا تم کو جس کام پر لگایا ہے، اس کام کو کرنا ہے، اور اپنے ظاہرِ جسم کے اندر بھی ظاہری وجاہت لئے دھوتے رہو کہ دیکھنے والے بھی اچھا سبق لیں۔

دین کا علم جس کو علم الٰہی کہتے ہیں وہ شاہی سکھاتا ہے فقیری نہیں سکھاتا، ظاہر میں تو شاہیت سکھاتا ہے اور باطن میں مسکنت سکھاتا ہے کہ حضور پُرنور ﷺ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا بادشاہ ہوکر یہ دعا۔ آپ بادشاہ تھے مگر دعاء کیا کر رہے ہیں کہ زندگی بھر طبیعت میں مسکنت رہے بڑائی کی بو بھی نہ آنے پائے۔

دُعا کا مفہوم:

اللہ زندہ رکھ مجھ مسکین کو اس دُعا کے معنی خاکساری (اور طبیعت کی عاجزی) کے ہیں، فقیر، غریب اور محتاج اور بھیک مانگنا نہیں، دل میں خاکساری، اور شریعت پر عبور اور پوا عمل ہو، تو اس دعا کے معنی ہیں دل میں خاکساری ہو۔

کپڑے تو ہر وقت کی بات ہے کہ صرف دعوت یا مہمانی ہی کے لئے اچھے کپڑے ہوں یہ نہیں بلکہ کہیں بھی رہے یا جائے لباس اچھا عمدہ ہی رہے، تو جسم کپڑوں کے ساتھ پاک صاف ہوکر عمدہ طریقہ سے سر سے لے کر پیروں تک نہایت پاک و صاف عمدہ ملبوس ہوکر جاؤ۔

شیخ سعدیؒ کی حکایت سے عمدہ سبق:

شیخ سعدیؒ بڑے چلبلے تھے، کہیں تھی دعوت، شیخ بھی پہنچ گئے منزل پر، اب سب روشن اور اچھے اچھے کپڑے گویا وَ ثِیَابَکَ فَطَھِّرْ پر عامل، اچھے اچھے کپڑے

پہنے ہوئے بڑی خاطر ہو رہی ہے ان کی۔ اور شیخ سعدی کو کوئی پوچھتا ہی نہیں چھوٹی موٹی اچکن وغیرہ پہنے ہوئے تھے، اور جو اچھے اچھے معطر لباس میں تھے، ان کے ساتھ یہ خاطر داری کہ یہ کھایئے گا وہ کھایئے گا، یہ رکھ دیا وہ رکھ دیا، شیخ سعدی دیکھتے رہے۔

پھر اور کہیں ہوئی دعوت، تو اس دن چلے گئے بڑے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ، بڑے اچھے کپڑے پہن کر چلے گئے، اب جہاں اوروں کی پوچھ ہو رہی ہے، ان کی بھی پوچھ ہو رہی ہے، اور ذرا تفریحِ طبع کے تھے، ظریف الطبع تھے، اب جو لقمہ اُٹھائیں تو آستینوں کی طرف بھرنے لگے، لوگ سوال کرنے لگے کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں تو حضرت شیخ نے فرمایا؛ بھئی اُس دن بھی میں ہی تھا اِس دن بھی میں ہی ہوں، تو میری سمجھ میں آ گیا کہ خاطر کپڑوں کی ہے آدمی کی نہیں، اس لئے میں کپڑوں کو کھلا رہا ہوں، اس پر لوگ شرما گئے، شیخ نے انہیں شرما دیا۔

اِنتباہ :

لوگوں کی زبانوں پر بھی آتا ہے کہ دیکھو فلاں صاحب کو جیسے بھشتا میلا کچیلا ہوتا ہے، سمجھ لو کہ کہاں جا رہے ہو، اسی اعتبار سے اپنے کپڑوں کو تم خوب عمدہ پاکیزہ ستھرا رکھو، جب اللہ تعالیٰ نے دیا ہے پہن کر جاؤ، اور آپ ﷺ کو تو خوب دیا تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ آپ پہلے یتیم تھے اور اب تم کو مالا مال کر دیا، لہٰذا وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ، ہاں تحدیث بالنعمة کے طور اپنے ظاہرِ حال کی عمدگی کے ساتھ رہنا، سہنا، چلنا، پھرنا ہو، سکون و وقار کے ساتھ، وجاہت و انسانیت کا جامہ پہن کر جاؤ، یہ ہے طریقِ سنتِ رسول اللہ ﷺ۔

حضور ﷺ کے امیرانہ اور غریبانہ لباس میں حکمت کا پہلو :

آپ ﷺ نے باوجود امیر ہونے کے بھی پیوند لگایا اس کی وجہ ہے، اور آپ ﷺ نے کم قیمت کی چیز کو پہنا، آپ ﷺ نے ہلکی چیز کھائی، بڑھیا بھی پہنا مگر عادت نہ ہو اور اچھا بھی کھایا مگر اس کی وجہ ہے۔ تاکہ امیر غریب کو طعنہ نہ دے سکے اور غریب ایسے لباس والے کو تکبر اور حقارت سے نظر نہ کرے، غریب کی دلداری کی کہ وہ اپنے حال پر رنجیدہ نہ ہو، سوچ لے کہ میرے رسولِ پاکؐ ایسا پہنتے تھے، میرے رسول ﷺ پہنتے تھے اسی طرح قیمتی لباس پہننا تو امیر کی حوصلہ افزائی فرمائی، غریب کی بھی اصلاح، ادھر امیر کی بھی اصلاح، کیا حضور ﷺ نے مرغی نہیں کھائی؟ کیا یمن کا کپڑا نہیں پہنا جو غیر ملکی تھا؟ اچھا بھی کھا کر دکھلا دیا، اچھا پہن کر بھی دکھا دیا، اور پیوند شدہ جوتہ اور پیوند شدہ کپڑا بھی پہن کر دکھلا دیا، دونوں کی اصلاح ہوگئی۔

غوثِ پاکؒ کا ایسا قیمتی لباس کہ بادشاہ بھی خرید نہ سکا :

حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی ایسا کپڑا پہن رہے ہیں کہ جس کو بادشاہ بھی نہ خرید سکا۔ روز مرغ پلاؤ کھا رہے ہیں مشہور ہے کہ حضرت غوث پاک نے جیسا اچھا کھایا ایسا اچھا کسی نے نہیں کھایا اور جیسا اچھا انہوں نے پہنا ہے اور کسی نے نہیں پہنا۔

ظاہر کی عمدگی :

اسی لئے ضروری ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ کہ ایسے کپڑے پہنو، تو اپنے ظاہر کو سنوار کر رکھیئے۔ ظاہر کی صفائی کو بھی نہ بھول جاویں، اور باطن کی طرف سے بھی اِغماض اور اس میں اِضمحلال نہ آنے پاوے۔ آگے فرمایا وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ بتوں

کو چھوڑے رہو، شرک کے پاس نہ جانا، فاھجر پوری ہجرت شرک سے پوری ہجرت۔

فاھجر اور فاترک میں فرق :

یوں نہیں کہا کہ وَالرُّجْزَ فَاتْرُکْ، پس شرک چھوڑ دو نہیں فرمایا بلکہ فرمایا: فَاهْجُر کہ بتوں سے الگ رہو، بدستور سابق توحید پر دوام رکھو، والرُّجزَ فاتْرُکْ، تب ہی بڑے بڑے عقلاء، فصحاء، بلغاء نے ہتھیار ڈال دیئے کہ آج یہ عجیب بات فرمائی، بتوں کے چھوڑنے اور شرک کو چھوڑنے کے لئے بجائے لفظ فـاتـرك کے فاھجر فرمایا گیا ہے۔

ہجرت بڑی مصیبت ہے مثلاً آپ ایک گھر میں رہتے ہیں، اب دوسرا گھر برابر میں آپ لے رہے ہیں بفضلہ تعالیٰ ابھی ذہن منتقل ہوا۔ تو پہلے اس کو ٹھیک کرو، پہلی مصیبت، پھر سامان کو یہاں سے وہاں منتقل کرو، پھر سامان کو اس کے قرینہ پر رکھو، ایک اچھی خاصی مصیبت ہوگئی، تو باہر سے بھی ہجرت اور اندر سے بھی ہجرت۔

غیروں کی مشابہت سے بچنا چاہئے :

تو پہلے تم جیسا پہنتے تھے اب وہ پہننا چھوڑ دو، تم مسلمان ہو مؤمن ہو کسی دوسرے کی بو نہ آنے پاوے تمہارے پہناوے میں۔ دور سے ہی ظاہر ہو جاوے کہ مؤمن آرہا ہے مسلم آرہا ہے۔ وہ سب چھوڑ دو ہجرت کرو، اس ظاہرِ حال سے بھی ہجرت کرو اور دوسری چیز استعمال کرو ایسے ہی باطن کہ آپ کا باطن چونکہ آپ نبی ہیں رسول ہیں شروع ہی سے پیدائش ہی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نورِ ہدایت پر ہیں، شرک سے آپ کو کیا کام اور شرک کا آپ کے کیا مناسبت۔ آپ تو شروع ہی سے معصوم ہیں اور معصوم ہی رہیں گے، لیکن پھر بھی کہہ رہا ہوں، دیکھئے جہاں احتمال ہی نہیں وہاں بھی

ایسی ممانعت ہے، گویا فرما رہے ہیں کہ اگرچہ آپ پہلے ہی سے بچے ہوئے ہیں، پھر بھی کہہ رہا ہوں کہ دوسری طرف شغل ہونے سے اپنی طرف سے کچھ اضمحلال آجاتا ہے، کچھ غفلت سی آجاتی ہے کہ دوسری طرف توجہ ہوگئی ایک ساتھ دوسری طرف پوری توجہ میں خلل آجاتا ہے، لیکن آپ ایسے نہیں ہیں اور پھر میں تو معصوم سے کہہ رہا ہوں تاکہ میرے بندے ایمان لاوے تاکہ اس بات پر تنبیہ ہوجائے کہ جب معصوم کو آپ یوں فرما رہے ہیں، تو غیر معصوم تو بطریق اولیٰ اس کا مامور ہے، اس پر تو اس کی پابندی بطریقِ اولیٰ عائد ہے۔

تو شرک کی بو سے بچنے کی کتنی اہمیت اور کتنا اہتمام ہونا چاہئے یہ ہے بلاغت کہ بڑے معصوم کو اس طرح کہا جا رہا ہے جہاں احتمال ہی نہیں ہے۔ تو جہاں احتمال اور اندیشہ لگا ہوا ہے وہاں بطریقِ اولیٰ بیدار ہوکر توحید کی طرف اہتمام کے ساتھ متوجہ رہے، ایسا کہ شرک کی بو نہ آنے پاوے اور یہ شرک کی بو کب نہیں آئے گی، جب مخلوق سے نظر اندازی ہوجائے اور آپ تو پہلے ہی سے قطع نظر کئے ہوئے ہیں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن پھر میں آپ کو اس کا خطاب کر رہا ہوں، ان بچوں کو سمجھانے کے لئے جو آپ کی اُمت ہے میرے بندے ان کو سمجھانے کے لئے۔

توحید کا کامل اثر :

یہ ہے توحید، ظاہر کا بھی خیال رکھو اس میں بھی اضمحال نہ آنے پائے، شرک کی بو نہ آنے پائے اور باطن کا بھی خیال رکھو کہ اس میں بھی شرک کی بو نہ آنے پائے۔

بچو شرک سے اور رنگو توحید میں، باطن بھی کہے کہ یہ مؤمن ہے اور ظاہر بھی کہے کہ یہ مسلم ہے۔ صاحبِ توحید ہے تو ایسا موحد کہاں ڈرتا ہے، اس لئے کہ اس میں تو

اس کا ذرا آ گیا وہ سمجھ گیا کہ یہ توحید ذاتی وصفاتی ہے اور یہ مسائل توحید وجودی وغیرہ کے ہیں، وہی محل ہے تقویٰ کا جو اس طرح اعتقاد اور تحقیق کرے گا کہ خلافِ قاعدۂ شرعیہ نہ ہونے پائے بلکہ اس سے معرفت وقوتِ ایمانی کی تکمیل ہوگی۔ وہی محل ہے تقویٰ کا اور جو اپنے اندر مسکینیت لے لے وہی محل ہے مغفرت کا تو اس توحید کے باوجود اس موحد میں اپنے پر سے نظر انداز ہو کر اس پر نظر کرے کہ وہی ہے، وہی کیا ہے؟ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰی، اور وہی ہے، کیا ہے؟ اَهْلُ الْمَغْفِرَۃ، اپنے پر سے نظر ہٹ گئی اِس پر نظر جم گئی۔

☆ ☆ ☆

اُنیسویں مجلس

جوہرِ تصوّف

مورخہ ۴؍شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۰؍فروری ۱۹۹۱ء بروز چہار شنبہ

اہلُ اللہ کو محبت پہلے ہوتی ہے، مُریدین کو بعد میں :

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ میں یوں کہوں گا تو یہ تو سب یوں کہیں گے کیونکہ اُن کی فطرت سلیم ہے۔ رہا بعد میں سو وہ جو کہیں یہ تو ان کی بعد کی بات ہے لیکن اِس وقت جو میں کہوں گا تو وہ سب یوں کہیں گے، چنانچہ عالمِ میثاق میں جب فرمایا : اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؟ تو قَالُوْا سب نے متفق علیہ بالاجماع جو قطعیت کا حکم رکھتا ہے کہا : بلٰی سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں (واقعی آپ ہمارے رب ہیں) (بیان القرآن)

سو بلٰی کہہ کر بلا سر پر لے لی، اب دیکھوں گا کیسے نبھاؤ گے۔ میں تمہیں وہاں بھیجوں گا جہاں بڑی رنگ رلیاں ہیں بڑی خوش نمائیاں ہیں فریب کاریاں ہیں اور وہ دل کُشا اور فریب کی جگہ ہے وہاں بھیجوں گا اور دیکھوں گا کہ یہ جو تم نے میرے سامنے ظاہر کی ہے بلٰی کہہ کر، یہ مجھ پر میرے ساتھ ہی وابستگی و دل بستگی رہے گی

یا نہیں رہے گی؟ مجھے تو معلوم ہے یہی تم کہہ کر آئے تھے؟ کہنا آسان ہے نبھانا مشکل ہے۔

نظیر :

مثلاً لڑکا، مرد جوان ہو کر بیاہ کرتا ہے، شادی کیوں کرتا ہے؟ کیا اس نے شادی سے پہلے اپنا بیٹا ہوا دیکھ لیا تھا؟ نہیں بلکہ معدوم پسر کی محبت، وہی معدوم پسر کی، ولد کی محبت پہلے دل میں آئی پھر اس کا طریق اس نے استعمال کیا جو کہ خارج میں تھا۔

خالق کو بھی مخلوق سے محبت پہلے ہوئی :

تو ایسے ہی پہلے اللہ تعالیٰ کو اس معدوم انسان مخلوق سے محبت ہوئی۔ ذاتِ باری تعالیٰ کا اِس معدوم کے ساتھ اوّلِ نوال ہے، کیونکہ وہ جواد ہے، دوم ظہورِ کمال ہوا، پھر جو نظر گئی تو سوم ظہورِ جمال ہوا، یہ میرے اور آپ کے لفظ ہیں، جب تجلّی ہوئی تو جمال ہوا کہ جس کا نام ظہور ہے، اور ایسی ہستی سے زیادہ فریفتگی اور کس پر ہو۔ خدا کرے کہ وہ آنکھیں پھر ہماری لوٹ کر آجائیں کہ جن آنکھوں سے وہ جمال ظاہر ہوا۔

بادشاہ اور لیلیٰ :

مولانا رومؒ نے ایک دوسرے پیرائے میں اس کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ بادشاہِ وقت کو معلوم ہوا کہ کوئی مجنون ہے، اور مجنون کی فریفتگی لیلیٰ کے ساتھ انتہائی درجہ کو پہنچی ہوئی ہے، تو وہ بڑی باحُسن و جمال ہوگی، حورانِ بہشت کے مثل ہوگی، میں بھی دیکھوں ذرا، حُکم جاری ہوگیا، حُکمِ سلطانی ہو کر حاضر ہوگئی، جب بادشاہ نے دیکھا تو دیکھا یہ تو کچھ زیادہ حسینان میں سے نہیں ہے، مجنوں کو کیا ہوگیا کہ عقل کھودی۔ اسی کو مولانا روم

فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے کہنا شروع کیا ....

گفت لیلیٰ را خلیفہ کائن توئی　　　کز تو شد مجنوں پریشان وغوی

بادشاہ نے لیلیٰ سے کہا تو وہی ہے کہ تجھے دیکھ کر مجنون پریشان و بے عقل ہوگیا غوی بے عقل پریشان اپنی شان کھو بیٹھا اور کہا ......

ع　　از دِگراں خوباں تو افزوں نیستی

تو دوسرے اور بہترین از بہترین خوبصورتوں سے زیادہ نہیں ہے۔

مگر لیلیٰ کے دل میں جو بات تھی پُرجوش برملا کہہ بیٹھی

ع　　گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

اسے بھی اک ناز ہے بادشاہ سے کہہ رہی ہے کہ چپ رہو۔ تو مجنوں جیسا نہیں ہے تو کیسی باتیں کرتا ہے یاد رکھ ....

دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا　　　ہر دو عالم بےقدر بودے ترا

اگر مجنون جیسی تیزی آنکھیں ہوتیں، دُنیا تو کیا بلکہ دُنیا و آخرت کو بھی خطرے میں نہ لاتا۔

ابنِ فارض پر ذاتِ حق کی تجلّی :

اسی لئے حضرت والا (حضرت مجدد الملت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ) نے فرمایا کہ ابنِ فارض ایک بزرگ گزرے ہیں، نزع کا عالم ہے موت کے وقت آٹھوں بہشتیں ان کے سامنے کردی گئیں تو انہوں نے رُخ پھیر لیا اور کہا......

اِنْ کَانَ مَنْزِلِی فِی الْحُبِّ عِنْدَکُمْ　　　مَا قَدْ رَأَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِی

اگر یہی میری منزل ہے؟ آپ کے نزدیک میری محبت کا یہی منتہا ہے جو

کچھ میں دیکھ رہا ہوں تو میرا زمانہ عمر بیکار گیا، میں نے اپنی عمر برباد کردی۔

فی الفور آٹھوں بہشت بہشتی کی نظروں سے غائب ہوکر اور تجلّی حق ہوکر روح نکل گئی، ذاتِ حق کی تجلّی وظہور، معلوم ہوا کہ اصل مقصود اور مطمحِ نظر ذاتِ باری تعالیٰ کا منظورِ نظر ہونا ہے لیکن اس کا محل وہ جنت ہے اس لئے طلب جَنَّت فِی نَفۡسِہٖ نہیں بلکہ جنت واسطہ ہے اس نعمتِ عظیمہ دیدارِ الٰہی کا، اسی لئے کہہ دیا کہ جنت الفردوس کا سوال کرو، جنتوں میں ایک جنت الفردوس ہے، ان جنتوں میں ہر جنت کا نام الگ الگ ہے۔

حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ کی عجیب حکایت :

ایک دفعہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب بخاری شریف پڑھا رہے تھے، سردی کا موسم ہے، کچھ اوڑھے بیٹھے ہیں، برابر میں آکر کوئی بیٹھ گیا، اس نے اپنی چادر میں سے ہاتھ اندر کرکے اور مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ران میں چٹکی خوب زور سے، جتنی لی جاسکتی تھی لی، مولانا اسی طرح پڑھاتے رہے، جب فارغ ہوگئے تو وہ شخص سامنے آکر کہنے لگا کہ حضور میں نے آپ کو ستایا معاف کردیجئے گا۔ کیا ستایا؟ مجھے تو کچھ ستایا نہیں۔ نہیں حضرت میں نے آپ کی ران میں چٹکی لی اور ایسی زور سے لی کہ بلا آہ کئے ہوئے کوئی نہیں رہ سکتا تھا، مجھے معاف کرو، اوہو ہو! میں تو یہ خیال کر رہا تھا کہ بے چارے کو مجھ سے محبت ہے اور محبت میں چٹکی لی ہی جاتی ہے۔

ایک محبِ صادق کی لُطف آمیز محبت کا بیان :

حضرت والا (حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا تھانوی قدس سرّہٗ)

نے اپنے وعظ میں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی کسی کی محبت میں پھر رہا تھا۔ پیچھے سے محبوب آ گیا اس نے ایسا دبوچا کہ ہڈی پسلی سب آپس میں مل کر ایک ہو جا رہی تھی۔ پوچھا او ہو آپ کو تکلیف ہے جلدی بتلا اگر تکلیف ہو رہی ہو، تو دوسرا رقیب ہے میں اس کو دبوچ لوں؟ وہ کیا کہتا ہے ....

دم نکل جائے تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

کیسی بات کہہ رہا ہے، میں کیسے گوارہ کرلوں گا کہ تو دوسرے کو دبوچے۔ یہ واقعہ حضرت والا کے وعظ میں ہے مگر ہو محبت جس کو محبت کہتے ہیں۔

شیخ کی ذاتِ گرامی سے محبت :

اسی لئے سلوک کا مسئلہ ہے کہ شیخ پر سے اس کے کمال و اوصاف سے قطعِ نظر ہو اس کی ذاتِ ترابی سے محبت ہو۔ کیونکہ کمالات تو یہ خیالی چیزیں ہیں نہ معلوم کس وقت خیال کمال سے ہٹ جائے تو محبت بھی گئی۔

شیخ کے اُمورِ خانگی سے نظراندازی :

اس لئے دوسرا مسئلہ ہے کہ شیخ کے خانگی معاملات سے اور خانگی حالات سے نظراندازی ہو، منافق ہٹ جاتا ہے مخلِص و مخلَص نہیں ہٹتا۔ شیطان کو بھی اِقرار کرنا اور کہنا پڑا کہ اِلَّا عِبَادَكَ مِنهُمُ المُخلَصون اسے بھی کہنا پڑا وہ بھی لاچار ہو گیا یہاں آ کر مخلِص کے سامنے اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور استثناء کرنا پڑا، اِلَّا عبادك، کہ جو آپ کے مخلِص بندے ہوں گے ان پر میرا قابو نہیں چلے گا، اسی لئے مستثنیٰ کر دیا۔

ذِکر کی اَقسام :

اِلَّا اللّٰہ کا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے ساتھ شمول ہوتے ہوئے لَآ اِلٰہ سے ہٹ کر اِلَّا اللّٰہ کا ذکر، اس سے بھی لفظ اِلَّا ہٹ کر اَللّٰہُ اَللّٰہُ کا ذکر رہ گیا، تکرار تکرار ہوتے ہوئے اوقع فی القلب ہوکر اَللّٰہُ رہ گیا، پہلے ذِکر ناسوتی ہوا پھر ذِکرِ ملکوتی ہوا، پھر ذِکرِ جبروتی ہوا، اور ذِکرِ لاہوتی ہوا، پھر وہ ھُوْ رہ گیا، پھر ھُوَ اسی کا ظہور ہے، الا اللّٰہ اوقع فی القلب ، پہلے ناسوت ہوگیا تو ذات وجودِ وجوبی ہوتے ہوئے اوصاف سے بھی قطع نظر ہوگیا، بس اب دُعا کرتے ہوئے چلئے: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ○ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَاالضَّآلِّیْنَ ○ بس اب سیدھے سیدھے صراطِ مستقیم پر چلتے رہو۔

تو ایسے شخص سے ہر چیز کی طلب نکل کر رضائے دوست ہی کی طلب رہ گئی، اسی کو یوں کہا ہے .... ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از وغیر ازیں تمنائے

فراق ووصل یعنی قبض اور بسط کیا ہوتا ہے، محض رضائے دوست کی طلب وفکر ہو، اس کے سوا کسی اور کی طلب بڑے افسوس کی بات ہے۔

ذِکر بلا ترتیب کافی نہیں :

بس اب سیدھے سیدھے چلتے رہو، احوال کا طریان ختم ہوگیا، وہ ذات دل میں سرایت کرگئی، ذِکر جاری ہوا، حالات طاری ہوئے اور وہ ذات ساری ہوگئی، یہ سب ترتیب [illegible]، بلا ترتیب ذکر [illegible] ذکر جاری حالات طاری وہ ذات

ساری، بلا اس کے ساری نہیں، بلا اس کے سرایت نہیں، ذکرِ بلاترتیب کافی نہیں، یہ ہے سلوک کا باترتیب طے کرنا۔

سلوک کو باترتیب طے کرنا چاہئے:

ایک طالبِ اِصلاح جوان لڑکے نے مستفتیًا حضرتِ والا کو لکھا کہ میرے والدین میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت والا نے لکھا کہ تم سلوک کو ترتیب سے طے کرنا چاہتے ہو یا بلاترتیب؟ انہوں نے لکھا کہ ترتیب سے، جواباً فرمایا تو ابھی شادی نہیں، پہلے ایسے ہوتے تھے تابع، شادی کی خوشی کو چھوڑ کر ترتیب سلوک کی شادی منظور یہ ہے ترتیب' تو معلوم ہوا کہ اصل تو ذِکر ہے۔

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔

ذِکر کی انواعِ مختلفہ کا نام ہی طاعتِ کاملہ ہے:

معلوم ہوا کہ اصل تو ذِکر ہے اس کی صورتیں اس کے انواع مختلف ہیں اصل ذِکر ہے اور صُوَرِ مُختلِفہ بانواعٖ انہیں کا نام ہے طاعتِ کاملہ، سب طاعات ذِکر اِفراد ہیں، اس لئے کُلُّ مُطِیعِ اللّٰه فھُو ذَاکرٌ کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے جو احکام طاعت ہیں جن جن موقعوں پر جس جس طرح سے اللہ ہی کے لئے ان پر چلتے رہنے والا مطیع ہے، پس وہ ذاکر ہے۔

اگر دل میں وہ ذات ساری ہوگئی ہوتی تو کیا باغوں کو ابھی پھل کا نام ہی نہیں پھول آنے پر خرید وفروخت کرنا حالانکہ اس موقع پر منع کا حکم تھا۔ اس ساری ہونے کا تقاضا تو یہ تھا وہ ایسی صورتِ بیع سے بچتا جب موقع پر اطاعت نہیں ہے تو وہ حقیقتاً ذاکر

نہیں ہے۔ وہ ذات دل میں ساری بھی نہیں نہ ذکر جاری، ذِکر کے معنی دھیان یاد اللہ تعالیٰ کی، دل میں یہ کیسا دھیان ہے کہ اس موقع پر دھیان سے کام نہ لیا وہ کیسا ذاکر ہے ہر وقت میں ذات باری تعالیٰ کی یاد دھیان دل میں سرایت کر گئی، ہر وقت ذِکر اور ذِکر کی حقیقت احکام وطاعت ہیں تو بغیر طاعت کیا حیات؟

آیات وعلامات سے صحیح پہچان ہوا کرتی ہے تو دل میں سرایت ہونے سے معلوم ہو جائے گا۔ اب ایسے مطیع کا طیران کس درجہ ہوگا، حیران ساری کی طرف اڑا جا رہا ہے پیچھے سے کوئی دھکا نہیں دے رہا ہے بلکہ آگے سے کوئی کھینچے لے جا رہا ہے۔

سالِک کی چار قسمیں ہیں :

اسی لئے سلوک میں سالک کی چار قسمیں ہیں سالکِ محض، مجذوبِ محض، سالکِ مجذوب، مجذوبِ سالک، یہاں وہ مجذوب مراد نہیں جو کہ مجذوب ہو ان (محض مجذوبوں) میں سے کسی کو تکوینی خدمت سپرد کر دی جایا کرتی ہے، وہ نرا مجذوب مراد نہیں ہے، یہ سلوک میں سالک کی قسمیں ہیں، جو نرا مجذوب ہو کہ اس کو ٹھیرا دیا اس کو ٹھیرالیا خدمت گار بنا کر تکوینی طور وہ آسمانی سماوی، یہ ارضی، جیسے حضرت خِضر علیہ السلام تکوینی خدمات پر مقرر ہیں، (قرآن پاک میں ہے و آتیناهُ من لَّدُنَّا عِلمًا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے پاس جانے کا حکم ہوا تھا، لیکن اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کا افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا) بھلا کہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام، کہاں خِضر علیہ السلام، کہاں تشریع اور کہاں تکوین۔

یہ سالکِ مجذوب، منجذب ہے، انجذاب ہوتا چلا رہا ہے، پہلے طلب ہو کر، فہمِ دین آ کر ہدایت ہو کر قرب و رضا حاصل ہو کر انتہاء تو پہلی سفر کی چیز عملی یہ ہے کہ چلو

چلنا شروع کر دیا ابھی یہ سالکِ محض ہے چلو چلو، چلتے رہو چلتے رہو۔ طلب واخلاص کے ساتھ چلتے رہو چلتے چلتے جذب آ گیا کھنچاوٹ ہوگئی۔ اب جذب کے ساتھ چلو اب یہ سالکِ مجذوب ہو گیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے ہی کوئی بات پیش آ گئی تھی خوشی احسان وانعام اور نعمت کی یا کوئی رنجِ دُنیا سے بیزاری کی۔ تو اللہ تعالیٰ کے احکام وطاعت کے عمل کرنے کی طرف جذب ہو گیا اور جب عمل کرتے کرتے چلا تو عمل میں اس کو کچھ مزا آ گیا اور پچھلی زندگی کو بھول گیا تو پہلے وہ مجذوب ہوا' اور پھر سالک ہوا' اور چلتے چلتے مقناطیسی انداز پر کہ اب کوئی رواں (یعنی معمولی رفتار) کی بات نہیں ہے، اب تو دواں (یعنی تیز رفتاوی) کی بات ہے لیکن محاورہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ وہ تو فلاں کام میں رواں دواں ہے (یعنی پوری توجہ اور تیزی کے ساتھ چل رہا ہے) جب اس طرح چلتا رہا تو جذب غالب آ گیا کہ جذب ہو کر سالک ہوا' اور سالک ہو کر پھر جذب ہوا' اب اس کو یا تو وہیں اس سے خدمتِ خلق لینے کے لئے روک دیا یا وہیں پر اس کو چھوڑ دیا جیسا کہ رات کو سو گیا تو گویا حق تعالیٰ سے فرشتہ پوچھ رہا ہے کہ حضور اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فرمادیا کہ ابھی اس کی زندگی ہے، واپس کر دو ابھی اس سے کام لینا ہے ہدایتی۔ مثال کے طور پر قلم سے لکھا تو روشنائی زیادہ معلوم ہوئی تو کہا ارے بھائی! تمہارے پاس جذب ہے پہلے لکھے ہوئے پر لگا دیا کرتے تھے وہ اس روشنائی کو اپنے اندر کھینچ لیتا تھا۔ تو لکھے ہوئے پر جاذب لگا دیا، اس نے اس کو چوس لیا، غرض جب سلوک میں داخل ہو گیا اور پہلے کام شروع کر دیا تو سالک ہو گیا اور چلتے چلتے پھر وہ جذب آ گیا تو وہ سالک مجذوب ہو گیا، بیچ میں رو کا نہیں۔ تو یا تو پہلے جذب ہو کر

مجذوب اور پھر سالک، یا پہلے سالک ہو کر پھر مجذوب محض، مجذوب سالک، سالک مجذوب، پہلے سالک ہوا، پھر مجذوب، آگے چلا سالک، پھر اس کے بعد دوسرا جذب طاری ہوا، سالک مجذوب، تو پہلے جذب کا زیادہ اعتبار نہیں اور بیچ کے جذب کا بھی زیادہ اعتبار نہیں ہے۔ چونکہ وہ مجاہدۂ اولیٰ ہے جب تک مجاہدۂ ثانیہ نہ آجائے اس وقت تک تسلیم نہیں اس سے جب نکل گیا تو اب قابلِ اعتبار و تسلیم ہوگا تو سلوک میں ایک مجاہدۂ اولیٰ ہوتا ہے پھر دوسرا مجاہدۂ ثانیہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اعتماد اپنے اوپر کہیں نہیں ہے مجاہدۂ ثانیہ ہونے پر بھی کیونکہ وہ پہلے ہو چکا ہے طریان سریان۔

سلوک کا مسئلہ ہے کہ شیخ کی ذاتِ تُرابی سے محبت ہو اور اس کے اوصاف و کمالات سے قطع نظر ہو قطع نظر فیضان ہو۔ ایسے ہی ذاتِ وجود وجوبی سے محبت ہو قطع النظر عن الصفات ہو۔

سلوک وتصوّف کا لُبِّ لباب :

لہٰذا ذاتِ وجود وجوبی کے گھر پر نظر نہیں خانگی معاملات پر نظر نہیں کہ کس کے ساتھ کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے؟ اس کے ساتھ اس طرح کیوں کیا ہے؟ اس کے ساتھ اس طرح کیوں نہیں کیا ہے؟ خلق اللّٰہ، اطفال اللّٰہ، جب شیخ کے خانگی معاملات پر نظر نہیں تو ذاتِ باری تعالیٰ کے کاموں پر گھر پر کہ سارا عالم ان کا گھر ہ، اس پر کیا نظر کہ اس کو مالدار بنایا اس کو غریب بنایا اس کو تندرست بنایا اس کو بیمار بنایا اس کو بادشاہت دیدی اس کو غریبی دیدی۔

☆

بیسویں مجلس

تصحیحِ عقائد ہی اعمال واَخلاق کی بنیاد ہے

مورخہ ۲۶؍ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ مطابق ۷؍دسمبر ۱۹۸۸ء بروزِ چہار شنبہ

عقائد واَخلاق، اعمالِ صحیحہ کا عالمِ ارواح میں عہد :

تصحیح عقائد اور تصحیح اخلاق اور تصحیح اعمال یہ تین چیزیں اہم ترین اور خلاصۂ دین ہیں، تصحیح یعنی صحیح صحیح، ٹھیک ٹھیک کرنا، اسی کے لئے عالمِ میثاق میں انسان کو حاملِ امانت بنایا تھا دعویٰ الوہیت میں یہی مقصود تھا۔

خطاب بہ طلبہ :

بعض دفعہ کلام میں ایک مقدمہ تو صراحتاً بیان کیا جاتا ہے اور دوسرا مقدمہ اس میں ضمناً موجود ہوتا ہے اس کو منطق کی اصطلاح میں مطوی کہتے ہیں، تو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یہ ایک مقدمہ ہوا اور اس کے اندر دوسرا مقدمہ لپٹا ہوا ہے مقدمہ مطویہ ہے۔ دونوں مقدموں کے ملانے کے بعد نتیجہ صحیح نکل آتا ہے بشکل اول، جیسے آپ کھانا کھاتے ہوں اور کوئی صاحب تشریف لا دیں آپ مدارات کے طور پر فرما رہے ہیں

آیئے تشریف لایئے کھانا کھایئے۔ اس نے کہا کہ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے ابھی کھا کر آیا ہوں۔ یوں نہیں کہا کہ کھاؤں گا نہیں، تو یہ ایک مقدمہ ہے صغریٰ، میرا پیٹ بھرا ہوا ہے، اسی میں دوسرا مقدمہ مطویہ لپٹا ہوا ہے، اس نے جب یہ کہا کہ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے تو گویا وہ یوں کہہ رہا ہے کہ جس کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے وہ نہیں کھاتا، نتیجہ کیا نکلا لہٰذا میں نہیں کھاتا، منطق کو پڑھایا جاتا ہے مگر اس کی تمثیل نہیں دی جاتی، سہل طریقہ سے مثالیں دے کر نہیں سمجھایا جاتا، اس لئے ہمارے طلبہ کو منطق مشکل معلوم ہوتی ہے ورنہ منطق تو گھر کی چیز ہے۔

منطق نہ پڑھنا بڑی بھاری غلطی ہے :

منطق نہ پڑھنا بہت بھاری غلطی ہے۔ پڑھانے والوں نے یہ کہہ کر چھٹی پالی کہ یہ سمجھتے تو ہیں نہیں، انہیں کیا پڑھایا جائے، چھوڑو قصہ، حالانکہ اس زمانہ میں منطق اور زیادہ پڑھانے کی چیز ہے، کیونکہ سائنس اور فلسفہ کا دور ہے، سائنس اور فلسفہ کا بہت زور ہے اس لئے منطق اور زیادہ پڑھانی چاہیئے تھی مگر وہی صاف کر دی' ہمارے بعض بزرگوں نے تو یوں کہا ہے کہ منطق تو گھر کی لونڈی ہے ہمارے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے۔

وہم کا نفع ونقصان :

آج طلبہ نے منطق کو مشکل بنا دیا، خواہ مخواہ خیال اور وہم کر لیا کہ منطق مشکل ہے۔ وہم جب یہ بڑھ جاتا ہے تو عقل ماؤف ہوجاتی ہے پریشانی ہوجاتی ہے جب یہ وہم بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جس کا وہم اکثر صحیح نکلے وہ احتیاط ہے تو وہم ہونا بھی اگرچہ فی نفسہ ضروری ہے لیکن ضروری ہونے کے باوجود مضر بھی بہت ہے، جیسے کھانا

ضروری ہے لیکن ضروری ہونے کے باوجود شکم پُری سے بھی آگے خوری ہورہی ہے تو مضر ہے۔ ہر چیز جب اپنی حد سے آگے نکل جاوے گی تو مضر ہے۔

نفع کی چیز بھی حد سے نکل جانے پر مضر ہے :

تو ہر چیز جو نفع کی ہے، ضروری بھی ہے، حد سے آگے بڑھ جائے گی تو وہ مضر ہے چاہے عینِ دین ہی کا کام کیوں نہ ہو۔ راتوں راتوں جاگ رہا ہے نفیس تلاوت اور ذِکر کر رہا ہے اور سونے کا نام نہیں۔ دیکھئے یہ دین ہے لیکن مضر اِس کا انجام اچھا نہیں اس طرح نبھا نہیں سکتا اور مطلوب ہے نبھانا۔ اگر اس نے نبھانے کی کوشش کی تو بہہ جائے گا مالیخولیا ہو جائے گا۔

شیخ کی تعلیم کی ناقدری اور خودرائی کا انجام :

اور بعض ایسے ہوئے ہیں بالخصوص وہ جنہوں نے اپنے شیخ کا حکم نہیں مانا۔ تعلیم سے زیادہ اپنے شوق وذوق میں کچھ چمک دَمک سی معلوم ہونے لگی۔ کچھ اچھی اچھی آوازیں بھی آنے لگیں سامنے کچھ روشنی سی بھی معلوم ہونے لگی طبیعت کچھ کھنچنے لگی کچھ ہنسنا بھی شروع ہونے لگا کچھ رونے کی طرف بھی ترقی ہونے لگی اب جاگا جاگا چلا جا رہا ہے کھانا چھوڑتا چلا جا رہا ہے۔

شیخ کی تعلیم کے خلاف کرنا گویا اس سے دشمنی کرنا ہے :

تو شیخ کی تعلیم سے تجاوز کر گیا شیخ کو معلوم ہو کر شیخ منع بھی کر رہا ہے مگر نہیں مانا تو ایسے لوگ پاگل ہو گئے، یہ شیخ کے دُشمن ہیں دوست نہیں۔ ایسا شخص شیخ کو بدنام کرتا ہے بگاڑتا ہے اس کا کچھ نہیں بگاڑا ہے مگر لوگ کہیں گے فلاں شیخ بزرگ کا مرید

پاگل ہوگیا۔ اب دوسروں کو کیا معلوم کہ شیخ نے تو منع کیا تھا تنبیہ کی تھی نہیں مانا۔

رُجُوع اِلیٰ المَقصُود :

مقصود تو تصحیح عقائد تصحیح اخلاق تصحیح اعمال ہے، مطلوب تو یہ ہے الستُ بربکم کیا میں تمہارا رب پرورش کرنے والا نہیں ہوں، سب نے کہا بیشک ہمیں پورا وثوق ہے اس پر جو آپ فرمارہے ہیں اور وثوق کے ساتھ ہم کہہ رہے ہیں، کیونکہ وہاں پر تو عالمِ ارواح میں مخلوق انسان سامنے ہے ہر چیز بدیہی ہے نظری نہیں، یعنی علمِ ضروری کے طور پر اسی کا نام علمِ بدیہی بھی ہے، اور اسی کا نام علمِ ضروری بھی ہے، منطق کی اصطلاح میں اس میں نظر کی فکر کی سوچنے کی صحیح نتیجہ نکالنے کی صورت جاننے کی، سمجھنے کی، عقل دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے عالمِ ارواح میں ذاتِ باری تعالیٰ مخاطب ہیں سامنے ہیں ان مخاطبوں کے دل میں ذاتِ باری تعالیٰ کا خلق ہونا یقینی ہے، خالق ہونا یقیناً ہے بداہتاً ہے، اور جو خالق ہوگا اس کے سوا اور رب کون ہوگا؟

عالم ارواح میں علمِ ربوبیت کی اس عالَم دنیا میں نظیر :

اس کی مثال اس کی نظری دُنیا میں باپ کا ہونا ہے، ربِّ مجازی کہ یہاں پیدائش کا سبب قریب باپ ہے، اس کے علاوہ اب کوئی اور پرورش کرنے والا بنے گا؟ پھر امّاں ہے، امّاں ابّا کے علاوہ اور کوئی پرورش کرنے والا بنے گا؟ پیدا تو ہوا اس سے اور دودھ چھاتی میں آرہا ہو، دوسرے کے بچہ کے پینے کے لئے یا اسی ربِّ مجازی کی چھاتی میں نظر آتا ہے۔ یہ نظیر ہے اس عالم میں۔ اور جو چیز بدیہی ہے، ظاہر بات ہے اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے بدیہی یہی ہے۔ ماں بچے کو مارتی ہے رورہا ہے ایک اور ماردیا ماں ماررہی ہے لیکن بچہ ماں پکار رہا ہے، اس کی گود میں سے اگر کوئی دوسرا لینا

چاہے تو نہیں جاسکتا ہے، ماں بیٹھی ہوئی ہے، غیر شعوری ہیولانی عقل ہونے کے باوجود جب لپکتا ہے بلا دلائل کے معلوم ہونا جب اِس عالم میں یہ حال ہے تو اُس عالم میں بلیٰ کیسے نہ کہتے؟ حق تعالیٰ کے رب ہونے کا کیسے اقرار نہ کرتے۔

اِقرارِ ربوبیت میں پوری شریعت داخل ہے:

جب جبرائیلؑ حاضر ہوئے اور سامنے آ کر بشکل انسانی بیٹھ کر سوال کیا: ماالایمان! ماالاسلام، ماالاحسان تو ماالایمان کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد بیان فرماتے ہوئے وضاحت وتفصیل سے اس کے اجزاء بیان فرمائے، یہ ہے تصحیحِ عقائد اور ما الاسلام کے جواب میں فرمایا بیانِ اعمال، تو یہ متعلق بالفقہ ہے ماالاحسان متعلق بالباطن ہے اس کا جو جواب دیا حضورِ اکرم علیہ ﷺ نے وہ تصحیح اخلاق قرار ہے، متعلق بالسلوک، متعلق بالتصوف جو کچھ بھی سمجھئے؟ مقصود مطلوب، مطمحِ نظر، منظورِ نظر بالاصل وبالذات تصحیحِ عقائد ہیں تصحیحِ اعمال ہیں اور تصحیحِ اخلاق ہیں، تصحیحِ عقائد کا نام ایمان ہے، اور تصحیحِ اعمال کا اور تصحیحِ اخلاق کا موقوف علیہ ہے، وہ اصل ہے، بالذات ہے اب آگے تصحیحِ اخلاق میں تصحیحِ سلوک میں، تصحیحِ تصوف میں وہ ہے جو ماالاحسان کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس کا ذِکر اوپر پہلے ہو چکا ہے، کہ تصحیحِ عقائد من حیث العبادت القلبیہ ہے اور تصحیحِ اعمال من حیث اعمال الجوارح ہے۔

سوالاتِ جبرئیلؑ کے جوابات کی تشریح:

تو ماالاسلام کے جواب میں جو فرمایا وہ بھی عبادت ہے، اور ما الایمان

کے جواب میں جو فرمایا وہ بھی عبادت ہے، ان دونوں عبادتوں کے بعد جب ما الاحسان کا ذکر آیا تو وہ بھی جواب میں عبادت ہی کا بیان ہے۔ اس کی خالص تصحیح ہے اسی عبادت کے اخلاص کا بیان ہے کہ تم نے جو سوال کیا ہے ایمان و اسلام کے بارے میں جو کہ وہ دونوں عبادات رب العلمین ہیں جیسا کہ عالمِ میثاق میں تھا اور جو ثابت کیا گیا تھا علمِ ضروری بدیہی کے طور پر کہ جو رب ہوتا ہے وہی عبادت کا مستحق ہوتا ہے کہ ربوبیّت مستلزم ہے الوہیّت و خالقیّت کو اور ربوبیّت خالق کے ساتھ جب آ گئی تو پھر عبادت اسی رب و خالق کی ہے دوسرے کی نہیں ہے۔ جب اسی کی ہے دوسرے کی نہیں ہے تو پورا اخلاص اسی کی عبادت کے لئے اس میں شریک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے حضورِ اکرم ﷺ نے ما الاحسان کے جواب میں پہلے یوں فرمایا: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ، احسان یہ ہے کہ عبادت کرے۔ تو ایمان میں بھی اخلاص ہونا چاہئے اور اسلام میں بھی اخلاص ہو اور اعمال میں بھی اخلاص ہونا چاہئے، وہی عبادت کا مستحق ہے دوسرا نہیں۔

حصولِ اخلاص کا طریق:

لیکن یہ عبادتِ عقیدہ اور پھر عبادتِ اعمال و اخلاص کے ساتھ ہو جب تک کہ تمہارے قلب میں استحضارِ کامل اس بات کا جو اس اعتقاد میں سے حاضر و ناظر ہونے کا خیال ہے، یہ جما ہوا نہ ہو جائے اور ایسا جما ہوا گویا دیکھ رہا ہے گویا کہ تو اس ربِّ خالق کو دیکھ رہا ہے جب تک یہ جماؤ نہ ہو جائے اس درجہ کہ کانك تراه کا مصداق نہ بنایا جائے، اس وقت صحیح درجہ کمال میں اخلاص جس میں بوئے شرک اور ریاء کی بو نہ ہووے یہ عادۃً مشکل ہے۔

فَاِن لَم تکُن تَرَاہ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ کی توجیہ :

لیکن تم یوں کہو گے کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ یہ حالت ہو جاوے کہ اس ربّ و خالق کو میں دیکھ رہا ہوں ہاں عادۃً مشکل ہے اس لئے میں نے کانک کہا ہے لیکن ابھی کلام کا کچھ تتمہ باقی ہے۔ گویا حضور یہ فرما رہے ہیں کہ اوّل وہلہ ہی میں تمہارا یہ حال ہو جائے، نہیں بلکہ یوں ہے ترتیب کہ تمہیں اعتقاد تو ہے اللہ تعالیٰ رب و خالق کے حاضر و ناظر ہونے کا جب یہ ہے کہ اس کی طرف سے حاضر ہونا بھی ہے، اس کی طرف سے ناظر ہونا بھی ہے، لہٰذا اس کا تتمہ یہ ہے: فان لم تکن تراہ فانہ یراك، یعنی کانك تراہ ، یہ بات اگر نہیں ہے تو بتلا رہا ہے کہ یہ تو ہے ہی کہ وہ دیکھ رہا ہے، تو تمہارے رب اور خالق ہونے کے اعتقاد میں یہ حاضر و ناظر ہونے کا اعتقاد بھی داخل ہے، بطور علم ضروری اور بطور علم بدیہی۔

حصولِ معائنہ کا طریقہ کار :

تمہارے اس اعتقاد میں جو ناظر و حاضر ہونے کا اعتقاد رکھا ہو، اس کو سوچتے رہئے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، لیٹے بیٹھے، خلوت میں جلوت میں، بیت الخلاء میں رفتار میں، گفتار میں، سوچتے رہو، ذہول ہو جائے تو چونکہ اعتقاد میں داخل ہے حاضر ناظر وہ حاضر ہو گیا پھر سوچنا شروع کرو سوچنے لگو جب تم برابر سوچتے رہو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ گویا کی بات پیدا نہ ہو جائے بلکہ پیدا ہو جائے گی اور تو کانك تراہ کے مصداق ہو جائے اور یہ صادق آ جائے گا گویا کہ تو دیکھ رہا ہے اور حالت ہو جائے گی۔

معائنہ کا اثر :

تو اے مؤمن مسلمان تو پورے کا پورا اپنی زندگی میں ہر موقع میں مہذب و مؤدّب ہوگیا، اب تجھے بحکم باِمتثالِ امر کپڑوں کا اتارنا ہوگیا، زبان کا ہلانا بھی ہوگیا، بضرورت چلانا ہوگیا، کان کا لگانا دل کا جمانا۔ آپ کے اطوار میں آپ کے اخلاق میں آپس کے برتاؤ وسلوک میں کیا رنگ آتا ہے۔

طالبِ علم کی درستگی :

طالبِ علم درسگاہ میں حاضر تو ہے لیکن لاپرواہی سے سُن رہا ہے، مطالعہ کر کے نہیں آیا کہ کچھ آدھا سمجھ کر آجاتا باقی جو رہ گیا تھا اس کو اُستاد کی تقریر سے سمجھ لیتا، مطالعہ ہی نہیں کیا کیوں نہیں کیا اس لئے کہ حاضر ناظر کا عقیدہ علم کے درجہ میں ہے حال کے درجہ میں نہیں اور مقصود یہی حال کا درجہ ہے۔ عبادت تو پہلے علم کے درجہ ہی میں ہے علمِ دین کی عبادت اوّل ہے عملی عبادت بعد میں ہے تو علم کے حاصل کرنے کے لئے وہ آیا تھا بدرجۂ کمال لیکن یہ لاپرواہی...........! حجرہ میں بیٹھا ہوا، لیٹا ہوا، درسگاہ سے ایسا غافل ہوگیا دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کرتا ہوا، اِدھر اُدھر گھومتا ہوا، اِدھر اُدھر کمروں میں جاتا ہوا اور درسگاہ میں نہ پہنچتا ہوا دارالافتاء میں نہ پہنچتا ہوا، اوقات گزار رہا ہے، یہ خیانت نہیں تو اور کیا ہے۔

طلبہ کی خیانت پر تنبیہ :

یہ خاص سالکین کے لئے ہی نہیں بلکہ سب ہی کے لئے ہے خواہ طالبِ علم ہو یا طالب تربیت سب ہی کے لئے ہے۔ طالبِ علم سوچے کہ علم کس طرح حاصل کرنا

چاہیئے کتاب کو کس طرح پڑھنا چاہیے حاضر باشی کس طرح مطالعہ اسباق کے اوقات کی پابندی غور سے سننے کے ساتھ کس طرح ہونا چاہیئے؟ کیا حصولِ علم ذِکر نہیں ہے؟ علم کا حاصل کرنا یہ منجملہ اذکار میں سے نہیں؟ ابا جان خرچ بھیج رہے ہیں آسانی کے اسباب مہیا کر رہے ہیں سکون کے اسباب مہیا کر رہے ہیں، پھر اس طرح علم حاصل نہ کرے تو خیانت نہیں ہے؟ کیا حُسن کے ساتھ حصولِ علم ہے؟

مقیمینِ خانقاہ کے لئے لمحۂ فکریہ :

ایسے ہی تربیت کے لئے بھیجنا کہ جاؤ خانقاہ جاؤ وہاں رہو، ماں باپ نے بھیج دیا خرچ برداشت کئے، اپنے کلیجے کے پالے ہوئے کو اپنے کلیجے کو دور بھیجا یہ خیانت نہیں ہے کہ اس طریقے سے قیام نہیں ہے، اس طرح سکون سے خلوت گزینی محبت کے ساتھ اور پورے پکے طریقے سے تربیت واصلاحِ نفس میں لگا رہنا چاہیئے، میں نے کہا تھا سکون وسکوت کے ساتھ رہنا شرط ہے، اختلاط نہ ہونے پائے۔

حضور اکرم ﷺ کا اِرشاد سہولت کو بتلا رہا ہے کہ میں اُمتِ مسلمہ کو اس درجہ حضور پر مکلّف کس طرح بنا دوں کہ ہر وقت اس طرح حضوری رہے مشاہدہ معائنہ رہے۔ پہلا معائنہ ہے گویا کہ دوسرا مشاہدہ ہے کیونکہ اس عالمِ تکلیف کے اندر بہت سی آفتوں کا سامنا ہوگا بہت آلام کا سامنا ہوگا بہت سے کاروبار کا سامنا ہوگا، بہت سے حقوق کا سامنا ہوگا، تو وہ حضور ایسی حالت میں دائمی طور پر کس طرح ہوگا تو مسئلہ عمومی اس طرح مکلّف بنانے کا کس طرح کردوں، ہاں جن کو کچھ ایسی حالتِ محبت وعشق ہوگی کہ ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے معاملات پھیلے ہوئے نہیں ہوں گے، ان کی معاشرتی زندگی پھیلی ہوئی نہیں ہوگی، ان کا معاشرہ پھیلا ہوا نہیں ہوگا۔

خطاب بطلبہ :

ایسے کہ تمامی اُمتِ مسلمہ بقدرِ ضرورت صحیح صحیح علم حاصل کرنے کے مکلف ہے، لیکن انہیں میں ملّتِ مسلمہ کی ایک جماعت پوری پوری حاملِ علمِ شریعتِ کامل کی مکلف ہے اگر مسلمان اُمتِ مسلمہ کی ایک جماعت بھی ایسی نہ ہوئی تو سارے کے سارے مسلمان گنہگار ہوں گے ایسے ہی ادھر بھی جو ایسے ہوں گے کہ ان کا معاشرہ پھیلا ہوا نہیں کچھ بعض بندے ایسے ہوں گے کہ جو پورے کے پورے علمِ کامل کے جو شریعت کے شعبے ہیں نہیں حاصل کر سکتے ہیں، لیکن ایسے بھی ہیں جو پورا علمِ کامل حاصل کر سکتے ہیں ایسے ہی معاشرۂ ایسے بھی ہوں گے کہ ان کا معاشرہ پھیلا ہوا نہیں ہے۔ معاملات ان کے پھیلے ہوئے نہیں ہیں ازدواجی اُمور حقوق ازدواجی سے مستغنی ہوں گے بےفکر ہوں گے خواہ کسی وجہ سے ہوں تو وہ اپنے کو اس درجہ کا مکلف بنانے میں سائی ہوں گے۔ تو اس کا مکلف تو ہر انسان ہے کہ عقائد من حیث الاخلاص اعمال من حیث الاخلاص پورے حُسن سے بجالاتا رہے۔

اضاعتِ مال کی طرح تضیعِ اوقات بھی حرام ہے :

جس طرح اضاعتِ مال حرام ہے ایسے ہی اسی طرح اضاعتِ وقت، تضیعِ اوقات بھی حرام ہے۔ محرمات کے ساتھ تو حرام ہے ہی لیکن ان مباحات کے ساتھ بھی کہ جو منجر الی المحرمات ہیں وہ بھی حرام ہیں۔ یہ تضیعِ اوقات ہے ہی لیکن وہ مباحات جو محرمات کی طرف منجر کھینچ کر لے جا رہے ہیں وہ بھی اس تضیعِ اوقات محرمات سے ہیں۔

طلبہ واساتذہ کو خاص خطاب :

خواص کی بات تھی تو عام مؤمنین میں سے طلبہ خواص ہیں، ان کو کیسا ہونا چاہئے، اتباعِ سُنّت کی زندگی ہونی چاہیئے، منجملہ اس کے ایک یہ ہے کہ اپنا کام خود کرنا چاہئے، چائے خود ہی بنانا چاہئے، نہ کہ اللہ نے پیسہ دیا ہے تو کہیں سقہ کا بچہ نوکر رکھ لیا، کہیں دھوبی کا نوکر رکھ لیا، تو خود نہیں بنائی جاتی، اور پھر طالبِ علم ہوکر، یہ وقت ایسا ہے کہ اُستاد کو بھی اپنے شاگرد سے کام نہیں لینا چاہئے۔ خصوصیت کا اظہار کسی پر نہ ہوجائے اس کو بھی خیال نہ ہو وہ سمجھے گا نہیں اور بگڑ جائے گا، ناز کرے گا اور خدانخواستہ کبھی کسی بھی ادا کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اس کو چھاتی سے لگالیا، اس کی پیشانی یا منہ چوم لیا، بدگمان ہوگیا، دوسروں سے کہہ دیا، یہ زمانہ ہے، یادرکھو یہ وہ زمانہ ہے، مدرّس کو بھی شاگرد سے خدمت لینا نہیں چاہئے۔

اپنا کام خود کرنا چاہئے :

تو اپنا کام اپنے ہاتھ سے خود کرنا چاہئے بڑے بڑے صاحبِ کمال عارف باللہ کے یہاں بھی حاسدین رہے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ ہوجاتا ہے۔ خصوصی تعلق ہوگیا ہو لیکن ایسے طرز سے بچتے رہنا کہ دوسرے کو اس قسم کے تعلق کا ظہور نہ ہونے پائے۔

بیوی سے بھی خدمت لینے کے محتاج نہ رہے :

بیوی کے بھی محتاجِ کام نہ رہو، لوٹے میں پانی لانا ذرا سمجھے؟ لوٹے میں پانی لانا، اتنا بھی نہ ہوا کہ کھانے کے وقت تو کم ازکم خود لوٹے میں پانی بھر کر۔ یا جگ وغیرہ

کہ خود ہی بھر کر رکھ لیتا وہ بھی بیوی ہی بھر کر لا کر رکھے گی۔ یہ جزئیات ہیں زندگی کے۔

حضرت والا کی عادتِ شریفہ :

حضرتِ والا فرماتے ہیں کہ "بڑھاپا آ گیا ہے، اعصاب کمزور ہو گئے ہیں، اس لئے ذرا مشکل سی ہوگئی ہے ورنہ ہمیشہ کام ہم نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے دیکھا ہوگا جنہوں نے وہ زمانہ دیکھا ہوگا پُرانے زمانے میں بڑی چستی تھی تعمیر کا کام مدرسہ میں ہوتا تھا اینٹیں ٹوکرے میں بھر کر چھت پر پہنچاتا تھا راجوں کو دیتا بعض دفعہ جیسے نیچے سے مزدور پھینکتے ہیں، اس طرح بھی اینٹیں پھینکیں ہیں اوپر کہ جب مدرسہ کا کام تعمیر والا ہوتا تھا۔ یہ مدرّس ہے یہ متدرّس طالبِ علم ہے یہ کہ اپنی چائے بنوار ہے دوسرے سے کیا قوم کی خدمت کریں گے، اپنی خدمت تو ہوتی نہیں ہے، آپ مقتدائے قوم بن رہے ہیں، آپ خادم القوم بن رہے ہیں،

احسان کے بیان سے مقصود :

احسان کے معنی اعمال، عقائد، اخلاق میں ہر چیز کو حُسنِ ترتیب کے ساتھ انجام دیتا رہنا، یہ ہے مطلوب، صراحۃً اگر چہ فانہ یراک کا مصداق اس وقت نہیں ہے لیکن مصداق ہے، خیال غیر سے خالی خیال غیر کی طرف اپنے کو نہیں لگایا اِخلاص ہے۔ جیسے رُوح نکلتے وقت زبان پر کلمۂ طیبہ نہیں ہے، دل میں بھی اس وقت حضور نہیں ہے، لیکن با ہوش حواس غیر کا خیال نہیں، تصورِ غیر نہیں یعنی تصحیحِ عقیدہ کے خلاف قلب میں خیال نہیں لایا تو ایمان ہی پر خاتمہ ہے، اگر چہ دِل میں بھی تصدیق کا استحضار نہیں ہے نہ قلب میں تصدیق کا استحضار ہے نہ زُبان پر اقرار ہے، لیکن اس کے

خلاف کا تصوّر اور خیال کا لانا نہیں تو ایمان ہی پر خاتمہ ہے۔ یہ نظیر ہے جیسے ایک شخص پانی میں گھس گیا، اتفاق سے آگے جا کر پانی اتنا آ گیا کہ ڈوبنے لگا اور وہ چلاّ رہا ہے بچاؤ بچاؤ میں ڈوب گیا، اسی میں ڈوب گیا اور زُبان پر کلمہ کا نام نہیں اور نہ قلب میں تصدیقِ ایمانی کا نام ہے اس کو تو اپنے بچاؤ کی فکر ہے۔ خاتمہ ایمان پر ہے تو وہ مصداقِ مؤمن ہے۔

بیعت وتعلیمات کیلئے اسلام شرط ہے :

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی خدمت میں ایک غیر مسلم آیا۔ اس نے کہا کہ آپ کے یہاں ایک کلمہ ہے مجھے اس کی تعلیم دیجئے، فرمایا تم سے کس نے کہا؟ اس نے کہا میرے پیر نے کہا میرے گرو نے کہا ہے کہ ان کے یہاں جو کلمہ ہے اس کی اجازت لے کر اس کا ورد کرے تو مولانا نے فرمایا کہ بھائی بغیر اسلام لائے ہوئے اور بغیر تصحیحِ ایمان وعقیدہ کئے ہوئے اس کے ورد کی تو اجازت نہیں ہوتی، پہلے آپ مسلمان ہو جائے۔ حضرت اسلام میں داخل نہیں ہوں گا، فرمایا کہ بدون اس کے تجھے اجازت دے دوں ایسا نہیں ہو سکتا۔

دیکھئے ! غیر اسلامی حالت میں وہ کلمہ طیبہ کے ورد کو چاہ رہا ہے اور یوں کہہ رہا ہے وہ بھی سمجھتا ہے کہ اس میں بھی کچھ خاصیت ہے، اس کا کچھ اثر ہے۔ غرض حضرت گنگوہیؒ نے غیر مسلم کو نہیں بتلایا چلا گیا، مولوی صاحبوں ہی میں سے کسی مولوی صاحب نے کہا حضرت اجازت دیدیتے تعلیم فرما دیتے تا کہ وہ اسلام کے قریب اور ایمان کے قریب اور قبولِ ایمان کے قریب ہو جاتا، معلوم ہو جانے پر۔

فرمایا: مولویوں یہ کیسی بات کہہ رہے ہو وہ تو اور بعید الاسلام ہو جاتا سمجھ لیتا

کہ جو مقصد تھا اس کا وہ حاصل ہے مسلمان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو اور بعید الاسلام ہو جاتا۔ حضرت گنگوہیؒ نے اسی خیال واعتراض کو رد فرمایا، تو دیکھئے غیر اسلامی حالت میں کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ کوئی چیز ہے جس سے کچھ اور بات پیدا ہوتی ہے مقبول یا غیر مقبول؟ چنانچہ وہ (یعنی غیر مسلم) کہتے ہیں وہ تو ہمارے ہر دَے (دِل) میں سمایا ہوا ہے، قلب کو کہا ہر دہ وہ پیدا کرنے والا ہے، اس کا قائل ہے وہ مشرک تو ہے لیکن اس کو مانتا ہے لیکن شرک وہ تو ہمارے ہر دہ میں سمایا ہوا ہے یہ الگ بات ہے کہ وہاں شرک ہے یہاں ایمان ہے، تو مومن ہونے کے ساتھ مشق کے طور پر قلب میں یاد لیکن اُس یاد کا جو تقاضا ہے کہ کس طرح ہو وہ نہیں ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ ”میں اپنے وطن میں عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے اپنے گھر جا رہا تھا، تو مسجد سے نکل کر جس راستہ پر گیا اور ادھر کو اپنا گھر جانے کا راستہ ہے، جب میں مسجد سے نکل کر یوں جا رہا تھا کنارہ پر، پہنچا ادھر کو جانے کے لئے، ایک باریش بوڑھے قسم کا، سفید ریش وہ سامنے سے گزرا، وہ ایک قدم آگے چل کر پھر لوٹا، آتے ہوئے سامنے سے اس نے سلام کیا، میں نے جواب دیا: وعلیکم السلام، وہ ایک قدم آگے بڑھا، پھر لوٹا اور کہا کیا آپ کا کسی بزرگ سے تعلق ہے؟ ہاں بھئی ہے تو کس سے ہے؟ میں نے حضرت والا سے تعلق بتا دیا، میں نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ اس نے کہا جب میں گزرنے لگا تو میرے دل نے گواہی دی کہ ان کا کسی بزرگ سے تعلق ہے، اس لئے پوچھا، میں نے کہا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں، ہماری بستی کے قریب ایک بستی ہے بالکل ملی ہوئی اس کا نام لیا کہ وہاں جا رہا ہوں، میں نے کہا خوب آپ کا نام کیا ہے؟ نام جو بتلایا وہ ہندو کا، یہ نام آپ کا مسلمانی نام تو ہے

نہیں بھئی، جی ہاں میں ہندو ہوں اور طرز سے مسلمان معلوم ہو رہا تھا، داڑھی بھی تھی، میں نے کہا آپ نے سلام کیا تھا، اس سے مجھے خیال ہوا تھا، کہا کہ ہاں میں نماز بھی پڑھتا ہوں، میں نے کہا آپ جو جا رہے ہیں تو کہا ٹھہریں گے، رشتہ داری ہے میں وہاں ٹھہروں گا اور نماز؟ اس نے کہا مسجد میں پڑھوں گا، وہ جانتے ہیں، کبھی اتفاق سے آجاتا ہوں، میں نے کہا نماز پڑھتے ہو؟ کہا ہاں نماز پڑھتا ہوں، میں نے کہا نام آپ کا ہندو کا سا ہے اور نماز آپ پڑھتے ہیں جو اسلام کے اندر ہے، پھر آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ میں ہندو ہوں تو یہ نماز پڑھنا کیسا؟ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اسلام میں داخل ہو کر نماز پڑھوں۔

تو دیکھئے وہ نماز کا فریضہ کیسے ادا کر رہا ہے اور پھر اس نے کیا کہا کہ مجھے آپ کو دیکھ کر خیال ہوا کہ آپ کا کسی بزرگ سے تعلق ہے، دل میں ہے، کچھ صفائی سی بھی ہے ذِکر تو کرتا ہوگا، کلمہ شریف کا وہ ورد کرتا ہوگا مگر تصدیق حاصل نہیں، تو مجھے ہوا وہم، میں نے کہا آپ کا نام یہ اور اس طرح آپ فرما رہے ہیں؟ جیسے آپ کا تعلق ہے، اس نے کہا کہ میں مُرید ہوں، او ہو خانقا میں بھی گیا ہوں، میں بھی مُرید ہوں، آپ کس کے مُرید ہیں؟ میں مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کا مُرید ہوں، اور وہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے خلیفہ تھے، اور کیا کہہ رہا ہے کہ میں ان کا مُرید ہوں، اکثر ان پر جذب طاری ہوتا تھا حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحبؒ، حضرت والا فرماتے تھے کہ جذب بھی ہوتا تھا، بیعت کر لیا ہوگا، کر لیا لیکن اپنے مذہب ہندوانی پر ہے۔

اس سے اندازہ کیجئے کہ مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا تھا، ہوگئی اس کی تائید اس واقعہ سے کہ اور بُعد ہو جائے گا۔

لیکن سالک میں جو بے چینی ہو جاتی ہے اس کی کہ اتنی دیر کے لئے غفلت رہی سو یہ غفلت میں داخل نہیں ہے جب کہ زندگی مطابق بحدود ہو رہی ہے کہ کھانا بھی حدودِ شرع کے اندر بیٹھ کر کھا رہا ہے، گو اس وقت ذہول تھا کسی وجہ سے کہ کہیں خیال چلا گیا لیکن جب عمل کر رہا ہے باتباعِ سنت کر رہا ہے، کھانا کھا رہا ہے تو باتباعِ سنت، اور اگر ذہول نہیں ہے اور کھانا باتباعِ سُنت نہیں ہے تو وہ یاد کیسی؟ وہ گویا غفلت ہے باوجود ذکر کے غفلت ہے اور باتباعِ سُنّت باجود غفلت کے ذکر ہے، مقصود، مطلوب، مطمحِ نظر اپنی اپنی جگہ پر باخلاص تصحیحِ عقائد اور تصحیحِ اعمال تصحیحِ اخلاق ہے۔

مُردہ شیر کو زندہ کر دیا :

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ ایک شخص عیسیٰؑ کی خدمت میں چلا گیا، نیتیں مختلف ہوتی ہیں، عجیب عجیب ہوتی ہیں، ایک دن کہا آپ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں، ہاں باذن اللہ کر دیتا ہوں۔ مجھے سکھا دیجئے مُردوں کو زندہ کرنا، منع فرماتے رہے، فرماتے رہے، وہ مُصِر ہوتا رہا۔

منع کے بعد بڑوں پر اِصرار کا ضرر :

تو عیسیٰ علیہ السلام کے وہاں تو معجزہ تھا وہاں تو کسی سبب وطریقہ کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن کچھ پڑھ کر دم کرنا مردے پر بتا دیا اور اُس نے سیکھ لیا، عیسیٰ علیہ السلام اکثر سفر میں رہتے تھے، کہیں سفر میں تشریف لے گئے وہ شخص اپنے گھر کی طرف سفر کر رہا ہے راستہ میں اس کو خیال آیا کہ اگر مجھ سے کسی نے پوچھا کیا سیکھ کر آیا ہے اور میں نے اس کی مشق تو کی نہیں ذرا کہیں کوئی مُردہ مل جاوے تو میں دیکھ

لوں تو اتفاق سے شیر کے کچھ ٹکڑے پڑے ہوئے تھے، اس نے اِدھر اُدھر سے جوڑ جاڑ دیا وہ شیر تھا، اس نے پڑھ کر چھو کر دم کردیا وہ شیر بن کر کھڑا ہوا۔ اس کی جان نکل گئی گھبرا گیا ادھر یہ کھڑا ہے ادھر وہ کھڑا ہے جب کچھ تھوڑا سا وقت گزر گیا تو شیر نے حملہ کیا، حملہ کرکے اس کو جو کچھ کھانا تھا کھالیا، عیسیٰ علیہ السلام سفر کرتے ہوئے ادھر سے گزرے دیکھا کہ شیر بیٹھا ہوا ہے اور جس کو عیسیٰ علیہ السلام نے سکھایا تھا وہ مُرا پڑا ہے۔

اس سے اندازہ کرلیجئے کہ اصرار نہیں کرنا چاہئے، چونکہ بڑے کی نظر انجام پر ہوتی ہے، تو شیر سے کہا ارے تو نے اس پر حملہ کرکے اسے کھالیا، شیر نے کہا، جانور کہہ رہا ہے جانور! علمِ بدیہی ضروری کے طور پر شیر کہہ رہا ہے، جناب اللہ کے مسیح مجھے معاف کرنا یہ میرا خالق بنا تھا، میں تو مُردہ پڑا تھا لیکن یہ میرا خالق بنا تھا کہ مجھ کو زندہ کیا، اب جب زندہ ہوکر میں بیٹھ گیا تو بھوک لگی، جب بھوک لگی تو میں نے روزی طلب کی، اس لئے کہ جو خالق ہے وہی رازق ہے، میں نے روزی طلب کی جب اس نے روزی نہیں دی تو میں نے اپنے اس خالق کو کھالیا میرا کیا قصور۔ وجودِ انسانی بالبداہۃ، بالضرورت خالق کا اعتقاد رکھتا ہے۔ جو خالق ہے وہ رازق ہے اور جو رازق ہے وہ ہی پرورش کرنے والا ہے۔ تو الست بربکم ایک مقدمہ ہے اور دوسرا مقدمہ اس میں مطوی ہے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا تھا کہ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں، تو کیا کہا سب نے کہ آپ ہمارے رب ہیں یہ کس طرح خیال کیا تم نے کہا کہ علمِ بدیہی علمِ ضروری کے طور پر ہمیں آپ کے خالق ہونے کا اعتقاد ہے اور جو خالق ہے وہ رب ہے اور جب وہ رب بھی ہے خالق ہوکر رب بھی ہے تو اس کے سوا کسی دوسرے کے

اندر یہ جز پائی نہیں جاتی، تو دوسرا مستحقِ عبادت کا کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا آپ ہی مستحق عبادت کے ہیں اس طرح بربکم اپنے اندر الٰهکم لئے ہوئے ہے، ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں یہ ہے عالم میثاق کا عہد۔

تخلیقِ انسان کا اصل مقصد :

مقصودِ تخلیقِ انسانی معلوم ہو گیا فرمایا: وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ حضرت کے ساتھ کہ اپنی عبادت ہی کے لئے میں نے پیدا کیا ہے اس کی توضیح تشریح نصِ قطعی کے ساتھ ہو گئی، تو جتنا بھی عمل جس وقت میں یہ انسان مؤمن مسلمان کرتا ہے وہ سب کا سب عبادت ہی میں شمار ہوتا ہے چاہے زراعت کرے چاہے تجارت چاہے صنعت و حرفت کریں کچھ بھی کام کرے، نکاح کرے، بیع شراء کرے خرید و فروخت کرے جو بھی کام کرے خواہ کھانا پینا ہو، صرف نماز ہی نہیں بلکہ دُنیاوی جتنی زندگی کی چیزیں اس سے متعلق ہیں وہ سب کی سب عبادت ہیں۔

معمولی اُمور بھی حُکمِ شریعت کے تحت عبادت ہیں :

اور عبادت کب کی جاتی ہیں جب کہ حق تعالیٰ کے حُکم کے قاعدہ و قانون کے حدود میں کی جاتی ہیں اس لئے اس کی زندگی پوری کی پوری عبادت ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، مجھے عالمِ میثاق میں تم نے کہا تھا، میری عبادت کا اقرار کیا تھا، دعویٰ و دلیل کے ساتھ بعلمِ ضروری بدیہی میں یہاں آپ کو وہ یاد دلاتا ہوں کہ وہ خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن تو پوری زندگی میں حق تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنے کے ساتھ متعلق ہے، حصولِ علم ہو چاہے حصولِ اخلاق ہو یا معاشرہ ہو، پس معاملات کی

زندگی معاشرے کی زندگی، اخلاق کی زندگی یا عبادت کی زندگی جس کو عرف میں عبادت کہتے ہیں، یہ سب عبادت ہی ہیں، اصل تصحیحِ عقائد ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی عبادت کے لئے ہی محصور فرمادیں، استحضارِ خلوص کے ساتھ قانونِ الٰہی پر قائم رہتے ہوئے ہر ہر موقع پر عبادت کرتے رہنے کا اللہ تعالیٰ ہمیں توفیقِ ارزانی عطا فرمائے۔

آمین یا رب العالمین۔

☆

اکیسویں مجلس

بلا جہادِ اکبر کے جہاد اصغر نہیں ہو سکتا

مورخہ ۴ اربیع الآخر ۱۴۱۱ھ بمطابق ۴ نومبر ۱۹۹۰ء بروز یکشنبہ بوقتِ صبح ۱۰ بجے

اسباب اختیار کرے لیکن نظر مسبّب پر ہو:

اسباب کو اختیار کرنا اور ان کا استعمال کرنا، اس کا انکار نہیں ہے بلکہ اختیار کرے استعمال کرے لیکن مؤمن کے ایمان کی شانِ انابت الی اللہ رجوع الی اللہ کی شان یہ نہیں ہے کہ اسباب پر نظر ہو۔ وہ چونکہ رب العالمین کا حکم ہے کہ اسباب پیدا فرمائے ہیں اور استعمال کے لئے پیدا فرمائے ہیں تو رُکاوٹ کیسی جب کہ اسباب حاصل ہوں اور جب کہ حاصل کئے جا سکتے ہوں تو ان میں سُستی کیسی؟ اور اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو اس کی دُعا و درخواست تو پہلے ہی سے چلی آ رہی تھی اب یہ نہ حاصل ہیں اور نہ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

دُعا مؤمن کا ہتھیار اور تقاضائے ایمان ہے:

پہلا ہتھیار جو ایمانِ مؤمن کے تقاضا سے ہے وہ تو ہے ہی۔ دُعا اللّٰھم انا

نجعلك في نحورهم ونعوذ بك من شرورهم اے اللہ ان کی گردنوں کو ہم آپ کے حوالہ کرتے ہیں اور ان کے شرور سے طلبِ پناہ اور استعاذہ کرتے ہیں ہم تو مجبور و معذور ہیں، نہ ہمارے پاس یہ مادی سامان ہے، نہ مادی سامان ہم حاصل کر سکتے ہیں اس لئے کہ ہمارے پاس مادی سامان حاصل کرنے کا طریقہ نہیں ہے، اگر ہے تو قانون منع کرتا ہے کہاں چھپاتے پھریں گے، اگر چھاپا ڈالا اور مل گیا تو ہماری جان خطرہ میں، ہماری عزت خطرہ میں ہو گی، تو حاصل کیسے کریں۔ یوں حاصل کر سکتے ہیں کہ آپ نے دیا ہے مال و دولت مگر حاصل نہیں کر سکتے یہ بزبانِ قال بھی کہہ رہا ہے بزبانِ حال بھی کہہ رہا ہے، لہٰذا اللّٰھم انا نجعلك في نحورهم ونعوذبك من شرورهم دُعا کرتے ہیں۔

اور جو دُعا بنی اسرائیل نے کی تھی اللہ تعالیٰ نے وحی میں اس کو نقل فرمایا کہ یوں کہو: ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمين ونجنا برحمتك من القوم الكافرين ۔

بعض مواقع میں صبر ہی ضروری ہے:

بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ بدونِ صبر کے کوئی چارہ نہیں ہوتا، ہاتھا پائی بھی نہیں کر سکتے اوزار بھی استعمال نہیں کر سکتے ایسی حالت میں سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں، اگر نکل کھڑے ہوئے اور خواہ مخواہ بھڑک کر زور آوری کرنے لگے تو خواہ مخواہ پھنس جائیں گے۔ دُشمن کو کچھ قوّت حاصل ہے اور کچھ پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ اور مسلمان مؤمن میں خود تو طاقت نہیں اور پشت پناہی بھی نہیں اور کچھ ہے تو کمزور، مضبوط نہیں، اب کیوں خواہ مخواہ باہر نکلے کیوں ہاتھا پائی شروع کرے، پہلے

سوچ لیا ہوتا کہ نتیجہ کیا نکلے گا، کیا ہر چیز یعنی ہر لڑائی کی صورت میں جہاد تھوڑا ہی ہے۔

کمزوری کی حالت میں دُشمن کے مقابلہ میں پہل کرنا حرام ہے :

اس لئے ایسی حالت میں پہل کرنا حرام ہے، یہ تحقیقی بات ہے۔ ہاں اپنی جگہ پر ہم خاموش ہیں اور دُشمن سر پر چڑھا آ رہا ہے اور چڑھ گیا، اب اس کا مقابلہ ہو، اگر مارا گیا تو شہید، نہ مارا گیا تو اپنی جگہ پر غازی ہے، ہاں پہل کرنا منع ہے، کمزوری کی حالت۔

کمزوری میں عباداتِ مقصودہ میں بھی حدِ ضرورت سے آگے بڑھنا منع ہے :

عباداتِ مقصودہ میں بھی کمزوری کی حالت میں ضروریات سے آگے بڑھنا منع ہے گویا فرمایا جاتا ہے کہ اپنی کمزوری جسمانی، دماغی اعصابی معلوم ہے تو ضروریاتِ دینیہ فرض و واجب اور سُنتِ مؤکدہ سے آگے تجاوز نہ ہو، تو نے نفل روزے کی اور نفلی نماز کی کثرت کیوں قائم کی؟ اپنے بڑھاپے کو دیکھ لینا اور اپنی جوانی میں بھی اپنے اعصاب کو، قوتِ جسمانی کو دیکھ لیتا، تو نے نفلیں کیوں شروع کیں؟

تیرے اعضاءِ اعصاب تیرا مرض اور کمزوری سب اُمور ایسے تھے تو نے اپنی اس وسعت کے ناموافق عباداتِ نافلہ کیوں شروع کی کہ جس کو سنوار نہیں سکتا تھا، تو گویا حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیری نیت تو مجھے معلوم تھی کہ اخلاص سے صدق سے تو یہ چاہتا ہے تو میں تو تجھے بلا عمل کے ثواب دیتا رہتا۔ لہٰذا و لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ تم نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر ہلاکت میں کیوں ڈالا۔

اسی طرح زمانۂ تحریک میں جس قوم کا ساتھ دیا پہلے سوچ لیا ہوتا کہ نتیجہ کیا ہو گا اور سوچ لیا ہوتا کہ کیسی قوم ہے اس میں لحاظ، مروّت بھی ہے یا نہیں دونوں آنکھ بند کر کے ایک کی حمایت کی اور آنکھ بند کر کے ایک سے عداوت کی، اس طرح یک طرفہ نظر کر کے ایک کی موافقت وحمایت میں کیوں قدم بڑھایا، اب اس کے نتائج بھگتے رہو۔

تو اسی طرح یہاں عبادتِ اصلیہ نماز میں جو کہ بڑی بہترین چیز ہے اس میں تو نے قدم کیوں اُٹھایا، ضروریاتِ دینیہ سے آگے اپنے نبھاوے کو پہلے دیکھ لیتا، اب جو نبھانا پڑ گیا اس سے اور کمزوری آ گئی۔ اور شریعت نے ضروریاتِ شرعیہ کے علاوہ دوسری چیزیں گو فرمائی ہیں ان کو جب کرو جب کہ ان کے کرنے کی اپنے میں وسعت ہو، تعداد مقرر مت کرو، جتنی جس وقت سہولت اور ذوق وذائقہ کے ساتھ ہوا، اتنا کر لو یہ نہ کر خیال کہ میں تو ذکر تین ہزار ہی کروں گا، میں تو پانچ ہزار ہی کروں گا، میں تو دو ہزار ہی کروں گا۔

اصل چیز ذوق ہے :

شوق تو ہے مگر ذوق نہیں ہے پھر کیوں کرے تو جس میں ذوق دل کا لگاؤ ہو وہ کرو۔ اس میں جو فرحت ہے راحت ہے اثر ہے وہ تعداد کی مقدار کے پورا کرنے میں نہیں، خانہ پُری ہو گئی اپنا جی خوش ہو گیا کہ ہم نے چھ ہزار کی تعداد پوری کر لی، لیکن قلب میں کچھ سوز پیدا ہوا؟ دل میں کچھ گداز پیدا ہوا؟ دل میں کچھ رقت آئی؟ کوئی ملائمت آئی کچھ نرمی آئی آنکھوں میں قلب میں نور برسا کہ وہ تو کچھ نہیں، تو بڑھتا ہے کیسے؟ تعداد پوری کر لی، گنتی پوری کر لی۔ گنتی پوری کرو جب کہ شوق کے ساتھ ذوق ہو۔

ذکر میں عبادت، تلاوت، تسبیح اور نفل روزے بھی داخل ہیں :

اسی لئے حکم ہے کہ جب یہ دیکھو ذکر کرتے ہوئے عبادت کرتے ہوئے اس میں تلاوت بھی داخل ہے تسبیح بھی داخل ہے، ذکر بھی داخل ہے نفلیں بھی داخل ہیں روزے بھی داخل ہیں۔ اس طرح کرو کہ ذوق باقی رہے تاکہ دوسرے وقت میں طبیعت تڑپے اس کام کے کرنے کو کہ رات کب آئیگی رات کے اُٹھنے کا وقت کب آئے گا ذوق دعوت دے رہا ہے تو شوق پورا کر کے نہیں جی بھر کر ختم کرنا نہیں بلکہ جی کچھ رہے تو دوسرے وقت کھانے کا مزہ آجائے گا جیسے غذائے جسمانی میں مزہ آتا ہے ایسے ہی غذائے روحانی کا مزہ آجائے گا کہ پہلے سے انتظار کر رہا تھا کب رات آئے کہ آخر رات میں نیت باندھ لوں گویا بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ ......

ع آرزو ہے تو مجھے اور میں تجھے دیکھا کروں

اس کو ذوق کہتے ہیں، اب دیکھو کہ اس شوق کے پورا کرنے میں کیسا مزہ آرہا ہے، آنکھوں میں نور دل میں نور جسم میں بہار تو جب دین کے کام کہ ضروری تو ضروری ہیں وہ تو حقوق وحدود میں داخل ہیں، اس میں جب یہ کہا گیا ہے تو ایسے ہی دنیوی نقطۂ نظر اپنے ایمان کی حفاظت جان ومال اور عزت کی حفاظت کا طریقہ کون سا اختیار کرنا چاہئے؟ کیا بلاء میں ڈال دو؟ کیا اتنا کھانا چاہیئے کہ پیٹ میں ثقل ہو جائے اور دست لگ جائیں؟ تو جب جسمانی غذا میں اس طرح نہیں ہے بلکہ ایک آدھ لقمہ بھوک کا چھوڑ کر ہو تو بھلا روحانی چیز تو بہت اونچی چیز ہے۔

میدان میں آنا بہت سوچ سمجھ کر ہو نظر انجام پر ہو :

میدان میں آنا تو اور بات ہے، تو تم نے ایسی حالت میں پہل کیوں کی؟

شریعت کہتی ہے کہ تم نے ایسی حالت میں پہل یعنی جرأتِ مقابلہ کی کیوں کی۔ تو اب بھگتتے رہو، میں نے تو منع کر دیا تھا، میں نے قانون جاری کر دیئے تھے قانون کا خیال کیا ہوتا، پھر ہماری امداد آجاتی امداد تو اب بھی آئے گی لیکن مر بھر کر، تم نے صبر کیا ہوتا ہاں چڑھ کر ہی آجائیں تو اپنی حفاظت ضروری تھی، پھر تو یہ ہوتا کہ یا مریں گے یا بچیں گے، اگر مریں گے تو شہادت جیسے گھر میں چور آجائے اور اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے اس سے ہاتھا پائی ہو جائے اور یہ مال کی حفاظت کرنے والا مر گیا تو یہ شہید ہو گا، شہادت کا مرتبہ پائے گا، ہاں مقابلہ نہ کرے نہ سہی کہ گھر سے نکل کر بھاگ جائے اور چور کے سپرد کر جائے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

جان کی حفاظت مال کی حفاظت پر مقدم ہے:

کیونکہ جان کی حفاظت زیادہ اہم ہے اور پہلے ہے اور مال کی بعد میں ہے، عزت کی حفاظت مال کی حفاظت سے پہلے ہے مال کی حفاظت بعد میں ہے، مال جائے جائے لیکن جان و عزت بچی رہے گھر سے نکل گیا وہ اپنے کو ایسا سمجھا اور اگر وہ گھر میں رہنے والا یہ سمجھا کہ یہ ایک چور ہے جیسے یہ ہے ویسے ہی میں بھی ہوں، یہ کچھ ہاتھا پائی کرے گا تو میں بھی کروں گا، اگر وہ مر گیا بس مقصود حاصل اور میں مر گیا تو شہید ہے تو یہ جان کو ہلاک نہیں کر رہا، وہ تو جان کی حفاظت کے لئے کر رہا ہے کہ گھر میں گھس آیا، وہ اس لئے کہ اگر دشمن زور آور ہو، گالی دے رہا ہے تو بہرے بن جاؤ، گالی دے رہا ہے، بُرے بُرے سخت الفاظ کہہ رہا ہے اور ہے ایسا تو بہرے بن جاؤ جب بہرے بن گئے تو زبان سے بھی کچھ نہیں تو آگے سلسلہ بڑھنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے، ہاں کوئی بالکل شیطان ہی ہو گیا ہو تو اس کا تو بغیر مقابلہ کے چارہ نہیں، کہ ہم نے گویا بات سُنی اور ہم نے کچھ کہا بھی نہیں اور پھر بھی گالی دینے سے باز نہیں آرہا ہے اور گالی بڑھ بڑھ

کر دیتا چلا جا رہا ہے، بلکہ وہ تو آگے بڑھ کر ہاتھ چلا رہا ہے، یہ بات ضمناً آ گئی۔

جہاد کی شرطِ اوّل تقویٰ ہے :

جہاد کی پہلی شرط تقویٰ حاصل کر لینا ہے، بغیر اس کے جہادِ حقیقی واقعی نہیں ہو گا، قاعدہ مشہور و مسلّم ہے اذا فات الشرط فات المشروط ،نماز پڑھنے کے لئے طہارت شرط ہے پانی نہ ہو تو تیمم شرط ہے اور اگر طہارت نہ ہو تو نماز نہیں ہو گی۔

شرط باہر کی چیز ہوتی ہے :

اور شرط الشئی شے کا موقوف علیہ ہے کہ اس پر موقوف ہے شے کا ہونا۔ لیکن وہ شے سے باہر ہے اس میں داخل نہیں، اس میں اس کی ذات داخل نہیں، وضوء نماز سے پہلے ہے نماز بھی پڑھ رہا ہے اور وضوء بھی کر رہا ہے، کیا ایسا ہے ظاہر ہے کہ ایسا نہیں۔ اسی طرح جہاد کے لئے تقویٰ شرط ہے، تقویٰ باطنی بھی ہو اور ظاہری بھی ہو، ظاہری اعمال جو تقویٰ کے لئے مثلِ جسم ہے وہ اچھے سے اچھا ہو اور اعمال کا جو جسم و ظاہر بُرا ہو اس سے الگ رہے یہ شرط ہوگئی تقویٰ کی۔

تقویٰ کا حُسنِ خلق :

تقویٰ میں دو جزء ہیں ایک تو حُسنِ خَلق اور ایک حُسنِ خُلق۔ حسنِ خَلق ظاہری اعمال کے اجزاء ہیں۔ حُسن خلق یعنی جسمانی و ظاہری اعضاء اچھے اچھے ہوں تو عملِ صالح بھی ایک جسم ہے وہ بھی حُسن کے ساتھ ہو۔

نماز کے اعضاء کا بیان :

مثلاً نماز میں کھڑا کس طرح ہونا ہے، نیت ہاتھ کس طرح باندھنا ہے کہاں

باندھنا ہے نگاہ جو خلاف اُٹھتی ہے اس کو کس طرح کرنا ہے، ان پر جمعیت خاطرِ نگاہ کا جمانا دل رکھنا کس طرح ہے ارکانِ رُکوع، سجدہ قومہ، قرأت، سجدہ، جلسہ یہ سب چیزیں اجسام میں داخل ہیں۔ کیا یہ چیزیں نظر نہیں آ رہیں؟ تو جب نظر آتا ہے تو یہ جسم ہے، تو عملِ صالح اور عبادت کا یہ حُسنِ خَلق ہو گیا۔

تقویٰ کے حُسنِ خُلق کی حقیقت :

اب اعمال کا حُسنِ خَلق سمجھئے! حُسنِ خُلق یعنی باطن کا بھی ٹھیک ہونا دُرست ہونا حسنِ خلق آنکھ (نگاہ) کا ٹھیک ہونا، کان کا ٹھیک ہونا، حُسنِ خُلق زُبان کا ٹھیک ہونا، دل کا ٹھیک ہونا اب یہ تو اندر کی چیز ہے وہ تو نظر نہیں آ رہی ہیں مگر کان نظر آ رہا ہے آنکھ، زُبان نظر آ رہی ہیں لیکن دل نظر نہیں آ رہا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ نظر آ رہا ہے۔ (یعنی جب کہ ظاہر سے اہتمام اور خضوع معلوم ہو رہا ہے) اب کسی کو کیا معلوم کہ کان کہاں لگے ہوئے ہیں۔ تو وہ عبادت جو نظر آتی ہے وہ بھی حُسنِ خَلق کے ساتھ حُسنِ خُلق لئے ہوئے ہے، اب چاہے اعضاء سے متعلق ہو یا باطن سے متعلق ہو، اگر اعضاء سے متعلق ہے تو اعضائی حُسن کے ساتھ ہو۔

رُکوع کا حُسن یہ ہے کہ سر وسُرین برابر ہو اگر کمزور ہے کوئی تو خیر! اب قیام ہے ایک پیر جھکا ہوا اور ایک پیر سیدھا، گھوڑے کی طرح کھڑا ہو گیا، بلکہ دونوں پیر جب کہ بوڑھا نہیں، موٹا نہیں کمر میں درد نہیں ہے پورا قیام ہو یعنی دونوں پیر بالکل سیدھے ہوں۔ ہتھیلی کے اوپر ہتھیلی یہ حُسنِ خَلق ہے۔

ظاہری اعضاء کا حُسنِ خَلق سے رکھنا حُسنِ خُلق پیدا کرتا ہے :

تو اُمید ہے کہ حُسنِ خَلق سے حُسنِ خُلق بھی ہو جائے گا، یعنی اندر کی دُرستی بھی

ہو جائے گی جب اس طرح الفاظ حُسنِ خلق کو لے رہا ہے تو دل ہی تو اِدھر ہے اگر دل میں آزادی ہوتی اور بے فکری ہوتی اور ادھر جی لگا ہوا نہ ہوتا تو اس طرح بھلا الفاظ و قرأت اجسام و اعضاء عبادت کیسے درُست ہو سکتے تھے، یہ استحضار و خیال اور دھیان کہ وہ تو دیکھ رہا ہے، یہ حُسنِ خُلق ہے اس دیکھنے کا یہ حُسنِ خَلق ہے۔

حُسنِ خَلق دلیلِ اِنّی ہے :

حُسنِ خَلق اندر کے حُسنِ خُلق کی دلیلِ اِنّی ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہو گیا بحسنِ ظن کہ اس میں اندر کا حُسنِ خُلق ہے اس لئے یہ اس کی عبادت کا حسنِ خَلق ہے۔

حُسنِ خَلق اور حُسن خُلق کی پیدائش :

اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کا احساس حاضر و ناظر ہونے کا نہ ہوتا تو اس طرح ٹھیک ٹھیک اعضاء نہ ہوتے۔ کیونکہ ہم تو دیکھ رہے ہیں ساری مخلوق آزادی سے نماز پڑھتی ہے، جب چاہے کھانس لیا جب چاہے ڈکار لے لی، آزادی ہے اور یہ شخص جمائی کو روک رہا ہے، ڈکار کو مجبور ہو کر آہستہ لانے کی کوشش کر رہا ہے معمولی سی کھجلی پر ہاتھ نہیں جاتا ہے، یہ کچھ نہیں کر رہا ہے، کیونکہ حُسنِ خُلق منع کر رہا ہے، اندر کی جو عادت اچھائی کی ہے وہ منع کر رہا ہے۔ یہ آنکھوں کے اِدھر اُدھر ڈالنے کو منع کر رہی ہے۔ وہ تو جما ہوا ہے تو وضوء شرط ہے طہارت شرط ہے، اور وضوء طہارت نماز سے باہر کی چیز ہے یہ شرط کی خاصیت و کیفیت ہوتی ہے کہ وہ مشروط سے باہر ہوتی ہے۔

شرط اور شطر میں فرق :

ہاں رُکوع و سجدہ، قیام اور قومہ، قرأت یہ ارکان نماز کے اندر ہیں جزوِ صلوٰۃ

ہیں اور وہ شطر ہیں بطورِ علت ہیں۔ تو تقویٰ یہ باہر کی چیز ہے یہ شرطِ جہاد ہے اور جب شرط نہیں ہے تو جہاد کا تحقق نہیں۔ قاعدہ ہے اذا فات الشرط فات المشروط، تو پہلے جہاد کی شرط قائم کرو جیسے عبادت نماز کے لئے پہلے طہارت قائم کرو پھر نماز پڑھنا اور بلا طہارت نماز قائم کرنا، نماز نہیں ہوتی؟

جہاد کی علّت اور اس کا رُکن و شطر :

دوسری چیز جہاد کے لئے شطر اور رُکن مرکز ہے۔ تو جب تک یہ دو چیزیں (تقویٰ اور مرکز قوتِ اجتماعیہ) نہ پائی جائیں اس وقت تک جہاد کا حکم نہیں ہے۔

مکہ معظمہ میں کیا صحابی رضی اللہ عنہ نہیں تھے، کیا تیرہ سال تک کوئی مؤمن تھا ہی نہیں؟ کیا صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تھے؟ ایسا نہ تھا بلکہ برابر باہر سے آ کر ایمان لاتے رہے اور مؤمن ہوتے چلے گئے، وہاں کے بھی ہوتے رہے، تو مؤمنوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

جو بھی ایمان لاتا وہ متقی بن جاتا :

وہاں تو یہ حال تھا کہ ایمان لاتے ہی متقی ہو گئے، بڑے بڑے کافر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت وصحبت سے متقی ہو گئے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے حبب الیکم الایمان وزیّنہٗ فی قلوبکم و کرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان اولئک ھم الراشدون۔ پس کسی کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اُنگلی اُٹھانے کی گنجائش نہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کسی کے غلام ہو گئے۔ ان پر وہ آقا ظلم پر ظلم، ستم پر ستم کیسے کیسے، ظلم کے پہاڑ تھوڑ دیئے، اس وقت تو وہ ہیں بھی نہیں، رات کو آگ میں پتھر تپا دو، دن کو نکال دو اور بھاری پتھر گرم سینہ پر رکھ دو، کیا یہ سخت ظلم نہیں تھا؟ لیکن زُبان پر احد احد بزبانِ

حال گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ظالم تجھے جو کچھ کرنا ہے کر لے مگر میں ایمان نہیں چھوڑوں گا، تو ایمان کیسا مضبوط جتنے تھے ایمان لاتے ہی پورے متقی ہوتے تھے۔

فرعون کی بیوی آسیہ کا ایمان لانا :

آسیہ فرعون کی بیوی تھیں اور چھپ کر ایمان لے آئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ہے، اس شوہر فرعون نے کیا کچھ نہ کیا سینہ پر پتھر رکھوا دیا سل رکھوا دی سپاہیوں سے لیکن ایمان پر قائم رہی، کیا وہ متقیہ نہیں تھیں؟ اسی حال میں حق تعالیٰ سے درخواست کی، رب ابن لی عندك بیتاً فی الجنة، جنت حاضر ہو گئی لیکن ایمان نہیں گیا تو متقیہ نہیں تھی وہ؟ متقیہ ہیں چار ہاتھ پیر بھی ہیں تو کیا فرعون کو مکا نہیں مار سکتی تھیں؟ لپٹنے سے بھی انکار نہیں کر سکتی تھیں، سوچئے؟

باوجود حصولِ تقویٰ جہاد کی اجازت نہیں دی گئی :

کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہاتھ پیر نہیں لگا سکتے تھے اور جب دق ہو گئے تو طبعی طور پر حضور ﷺ سے عرض کیا تھا کہ ہمیں تھوڑی اجازت دیجئے گا ہم بھی ہاتھ پاؤں نکالیں؟ تو فرمایا ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، صبر صبر مالوں کا بھی نقصان ہو رہا ہے اور دل کے رنج و غم کا بھی دخل ہو رہا ہے۔ تو تیرہ سال میں کیا حکمِ جہاد آ گیا؟ حالانکہ تقویٰ حاصل ہے کیونکہ سب متقی تھے اب جب مدینہ طیبہ ہجرت کر کے چلے گئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ابھی تو ایک سال ہی گذرا، متقی تو مکہ میں ہوئے اور مرکز وہاں مدینہ بنا۔ ادھر اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گیا۔ تقویٰ ظاہراً و باطناً حسنِ خَلق اور حُسنِ خُلق کہ اعمال میں بھی حسن خُلق درجہ احسان کے ساتھ۔

احسانِ عبادت :

اور احسان کیا ہے، احسان کا مادہ حُسن ہے معلوم ہوا کہ وہ عبادتیں جو کی جاتی

ہیں اس کا طریقہ جس حُسن کے ساتھ ہے اس حُسن کے ساتھ کیا جائے، وہ یہ تمہارے دل میں میری یا دوہ اعمال اس حُسن کے ساتھ جیسے کہ میرے سامنے ہونے پر ہوتے تو اگر چہ وہ یاد تمہارے اندر نہیں ہے لیکن اس کا اثر ہے جو کہ درجۂ احسان ہے۔ تو اعمال واخلاق میں حُسنِ خُلق مطلوب ہے چاہے اس وقت دل میں ذاتِ باری تعالیٰ کی یاد دھیان سے ہے یا نہیں ہے لیکن اس طرح قرأت کر رہا ہے اس طرح رُکوع کر رہا ہے جیسا کہ دھیان ادھر جانے پر ہوتا ہے۔ اب دوسرا دھیان جس طرح ہونا چاہئے اس طرح کیسے ہوگا؟ تو دونوں چیز ہوسکتی ہیں ورنہ ایک میں کمی ہوگی اور ایک میں کمال ہوگا، اور ذاتِ باری تعالیٰ کو کمالِ عمل مطلوب ہے اپنا اس وقت دھیان مطلوب نہیں۔

حضور ﷺ کا سجدہ سہو :

حضور ﷺ کو سہو ہو گیا کہیں دوسری چیز کی طرف دھیان چلا گیا۔ اب وہ حضور ﷺ کا دھیان جو گیا وہ اعلیٰ کی طرف گیا، مگر وہ اعلیٰ اس نماز میں نقص کا سبب بن گیا کہ بھول ہوگئی، لہٰذا حکم ہوا کہ اس کی تلافی کرو، سجدہ سہو کے ساتھ چونکہ جس عمل کو میں نے کہا تھا اس عمل میں جو تم اس وقت لگے تھے وہ حسن خلق کے ساتھ ہوتا رہتا، حسن خلق یعنی اس کو اس خوبی کے ساتھ ادا کرتے جس میں سجدہ سہو نہ ہوتا تو اس میں کمی آگئی، اگر چہ آپ ﷺ کے دل میں میرا خیال ایسا جم گیا کہ سہو ہو گیا۔ مگر مجھے تو اس وقت ان اعمال کا حُسن مطلوب ہے، چاہے اس وقت میرا ذکر دل میں ہو یا نہ ہو۔ تو حضور ﷺ کی توجہ التفات اور قلب تو اعلیٰ کی طرف تھا مگر اس کے باوجود بھی چونکہ حق تعالیٰ کے حُکم کے مطابق اعمال میں فرق آ گیا ہے اس لئے حُکم سجدہ سہو کا ہوا۔ معلوم ہوا حُسنِ خُلق مطلوب ہے چاہے اس وقت قلب میں حسن یا دھیان ہو یا نہ ہو لیکن گاہے اتفاق پر ہوگا ورنہ کوئی وجہ نہیں۔ میں نے شروع میں کہا تھا توفیق الٰہی سے جبکہ حسن خَلق ہوگا حسنِ

خُلق بھی ہوگا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اتفاقاً اس کے خلاف ہو جائے۔ یہ روز روز سجدہ سہو کیسا؟ تو اتفاقاً ایسا ہوسکتا ہے لیکن ہماری جو توجہ ہوگی وہ ادنی کی طرف ہوگی نہ معلوم کہاں چلا گیا خیال، لیکن اولیاء اللہ کا ذہن استغراقی ہو گیا، نماز میں بھی سہو کی نوبت آ گئی تو ان اکابر اولیاء اللہ کا سہو اور نوعیت کا ہے اور ہمارا سہو اور نوعیت کا ہے۔

صبر ہی کا دوسرا عنوان تقویٰ ہے :

اعمالِ ظاہرہ اور اعمالِ باطنہ کے ساتھ رہنا، اعمالِ ظاہرہ بھی پابندی دائمی کے ساتھ رہنا یہ حصول وتحصیلِ مجاہدہ ہے تو انسان کی طبیعت میں حُریتِ آزادی ہے اس کو روکا اور تقویٰ کی طرف اس نفس کو لایا، اس کا پہلا درجہ پنج وقتہ، وقت کے اندر جب تک کہ شرعی مانع نہ ہو وقت کے اندر مسجد میں جا کر خاموشی، سکون بآداب مسجد میں بیٹھ کر جماعت کے ساتھ تکبیرِ تحریمہ میں شریک ہو کر بدرجۂ احسان نماز کا اہتمام کرنا کئی قیدیں ہو گئیں۔ روزہ میں یہ شرط نہیں ہے اس لئے اکثر فرض روزہ رکھتے ہیں، اور نماز نہیں پڑھتے، اور عورتیں تو کچھ نہ پوچھو، نماز کے معاملہ میں بہت سُست ہیں روزہ میں یہ قید نہیں ہے وہ تو یہ ہے کہ سحری کھالی اور صبحِ صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک اب منہ بند ہے کھانے پینے سے، اگر بیوی والا ہے بیوی کے پاس جانے سے روک دیا، باقی تو آزاد ہے، دُکان کھولو جنگل جاؤ کھیتی کرو، تجارت کرو لوگوں سے ملو پڑھاؤ لکھواؤ سارا دن آزاد رہے۔

تقویٰ ہی جہادِ اکبر ہے :

تو تقویٰ ظاہری اور باطنی کا پہلے سے تخیل ہو جانا اب اندر کے اور باہر کے اعضاء کا تقویٰ ہو، وہ کیا اور کس طرح؟ مجاہدہ آنکھ کا بھی مجاہدہ کان کا بھی مجاہدہ زُبان کا

بھی ہاتھ کا بھی، پیروں کا بھی، مجاہدہ جو جسم کا خاصہ ہے، تو جسم کو بھی اور پورا باطن کو بھی اور پورے ظاہر و باطن کو تقویٰ کے زیور سے آراستہ کرو جو اپنی ہوائے نفسانی ہے اس کے خلاف کرو، یہ جہاد ہے۔ اس جہاد کا نام ہے جہادِ اکبر اور وہ جہاد جو انسانوں کافروں کے ساتھ ہوتا جہادِ اصغر ہے تو پہلے جہادِ اکبر سے فارغ ہو جاؤ جس کا نام ہے تقویٰ اعمالِ ظاہرہ و باطنہ بحکمِ ذاتِ باری تعالیٰ وہ جہاد جہادِ اکبر ہے، اور اپنے جیسے انسانوں سے یہ جہادِ اصغر ہے تو گویا حق تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے تم جہادِ اکبر سے فارغ ہو جاؤ ورنہ تم جہادِ اصغر تحت حکمِ الٰہی نہیں کر سکتے۔

جہادِ اکبر کے بغیر جہادِ اصغر نہیں ہو سکتا :

جہادِ اکبر بملکہ حاصل نہیں ہے تو جہادِ اصغر نہیں کر سکتے، آنکھیں بھی غلطی کرے گی، زبان بھی غلطی کرے گی اور کان بھی حکم کے خلاف کہاں کہاں سنتا پھرے گا اور جب حضراتِ صحابہ ﷺ جہادِ اکبر بملکہ کر چکے تھے تو اب موقعہ جہاد میں جب مخالفین نے نصرانی عورتیں ان کے سامنے کر دیں تو اب آنکھیں غلطی نہیں کر رہی ہیں، سونے چاندی اور ہیرے جواہرات بکھیر دیئے مگر دل غلطی نہیں کر رہا، حرص، طمع اور لالچ میں آکر ادھر مائل نہیں ہو رہے، پوری فوج خاموشی سے گذر گئی، اور اب حال یہ ہے کہ ہماری آنکھ بھی غلطی کر رہی ہے اور زبان بھی غلطی کر رہی ہے کہ خلافِ طبع بات پر ایسے ایسے الفاظ نکال رہا ہے کچھ ٹھیک نہیں جو نہیں نکالنے چاہئیں۔

محض خبر پر بلا تحقیق عمل جائز نہیں :

ادھر کسی نے خبر آکر دے دی اور تحقیق نہیں کی اور خبر سنی ہوئی پر ہی چلنے لگا تو یہ حکمِ قرآنی کے خلاف ہو گیا قرآن پاک میں ہے۔ یاَیھا الذین آمنوا ان جائکم

ق بنباءٍ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین ۔
ب کہ تم کو آ کر کوئی خبر دے کسی فریق کی تو تم اس کے اوپر ہی یقین کر کے عمل درآمد نہ
و، بلکہ جو زیادہ سمجھدار ہیں ان کی طرف رُجوع کرو۔ تو دیکھئے اعضائے انسانی
ے ماتحت ہیں۔ جہادِ اکبر سے فراغت ہوگئی بملکہ ورنہ جہادِ اصغر میں غلطیاں ہوں
اس میں للّٰہیت کے اندر فرق آجائے گا۔ حُبِ جان ہوجائے گی حُب مال ہوجائے
حُبِ نفس ہوجائے گی ہوائے نفس، خواہشاتِ نفس آجائے گی۔

ادِ اکبر سے ہر وقت سابقہ پڑتا ہے :

اور خواہشاتِ نفس ہی کے یہ سب جزئیات ہیں آنکھ کی غلطی، زُبان کی غلطی،
ر کی غلطی، پیر کی غلطی جہاں نہیں چلنا چاہئے ادھر جا رہے ہو، ہاتھ ادھر نہیں اُٹھنا
ہئے اُٹھا رہے ہوں، جہاں آنکھ کو استعمال نہیں کرنا' استعمال کر رہے ہو جہاں زبان
س چلانی چاہیئے تھی زبان چلا رہے ہو، جہاں کان نہیں لگانا چاہئے تھا لگا رہے ہو۔ تو
ہادِ اکبر ہوا یا نہیں؟ اور ہر وقت کا ہے یا ایک دو گھنٹہ کا؟ ہر وقت کا ہے اور وہ جہاد
ی انسان کا انسان سے مؤمن کا غیرِ مؤمن سے وہ وقتی ہے یا ہر وقت؟ دوسرے
جود وقتی ہونے کے اس کو صحیح کرنا ذاتِ باری تعالیٰ کی رضا پر چلنا بہت مشکل ہے۔
چہ وقتی ہے اس لئے اس ہیئتِ حسنِ خَلق، حسنِ خُلق کے ساتھ تقویٰ بمجاہدہ اس کو
دِ اکبر کہتے ہیں اس سے فارغ ہو کر جہادِ اصغر ہے، حدیث شریف میں ہے جب
د سے واپس آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف واپس
ئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا جہادِ اکبر کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا نفس کا مقابلہ
نفس کا مقابلہ کیا ہے ... نهی النفس عن الهویٰ ہے۔

خواہشِ نفس کی بہت صورتیں ہیں :

اور ہویٰ کی بہت صورتیں ہیں قوتِ شہوانیہ کا مٹ جانا، قوتِ غضبیہ، غصہ کا مٹ جانا قوتِ عقلیہ کا وحی کے مقابلہ میں ختم ہو جانا۔

قوتِ غضبیہ، قوتِ شہوانیہ، قوتِ عقلیہ ہر ایک کی تین تین قسمیں ہیں :

ان تمام کی تین قسمیں ہیں افراط، تفریط اور اعتدال۔ عدل مطلوب ہے اور افراط تفریط کچھ نہیں، قوتِ غضبیہ کے اندر تہور آ گیا، قوتِ غضبیہ کے اندر اجنبیت آ گئی دونوں ممنوع ہیں تہور کا مطلب ہے اپنے سے کئی گنا طاقت والے کے سامنے آ جانا اگر اپنے سے کئی گنا طاقت والے کے سامنے آ گیا نا جائز ہے اب تو آپ سمجھے جہادِ اکبر اور جہادِ اصغر کو تو جہادِ اصغر کے لئے جہادِ اکبر کا ہونا پہلے ضروری ہے۔

ظاہری تقویٰ کو حُسنِ خَلق، باطنی تقویٰ کو حُسنِ خُلق کہتے ہیں :

عرض یہ کیا تھا احقر نے تقویٰ بحسنِ خَلق حسن خُلق ہے، تو تقویٰ میں حسنِ خَلق بھی ہونا چاہیے اور حسن خُلق بھی ہونا چاہیے تب کہا جائے گا تقویٰ، مثلاً نماز کا جو نماز میں اجسام ہیں اعضاء ہیں وہ بھی پورے حسن کے ساتھ اور نماز کا جو باطن ہے وہ بھی بہت ہی حسن کے ساتھ، تو ظاہر کو حسنِ خَلق کہتے ہیں اور باطن کو حسن خُلق کہتے ہیں۔

تقویٰ ممنوعاتِ ظاہرہ اور باطنہ کا جامع ہے :

تقویٰ تو جامع ہے ممنوعاتِ ظاہرہ اور ممنوعاتِ باطنہ کے چھوڑنے کا نہ کہ ممنوع شراب، تو تو نے چھوڑ دی ممنوع جو تکبر تھا اپنے اندر وہ نہیں چھوڑا، سود پر تو نظر ڈالی نہیں، تقویٰ آ گیا نظرِ بد نہیں چھوڑی تقویٰ آ گیا؟ ھلُمَّ جراً علی ھذا القیاس،

تقویٰ کو کھیل بنالیا، اور اگر صحیح معنی میں دیکھا جائے بتعلقِ حق تعالیٰ تو شراب تو تو نے چھوڑ دی جو ظاہراً ممنوع ہے وہ بھی خدا کے حکم سے نہیں چھوڑی، وہ بھی خدا کے خوف سے نہیں چھوڑی، کیسے معلوم ہوا، اگر خدا کے خوف سے وہ چھوڑی ہوتی تو تکبر بھی خدا کے خوف سے چھوڑ دیتا اور وہ نہیں چھوڑا تو یہ بھی خدا کے خوف سے نہیں چھوڑی، ایک عالَم (دنیا) کا طریقہ نہیں قوم کا طریقہ نہیں ہے۔ اس پر طعن و تشنیع اور کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں، مسلمان قوم وغیرہ وغیرہ کوئی پیتا ہوا گر خدا نہ کرے اس کا بھی ایک عام رواج ہو جائے تو اس وقت دیکھیں کہ چھوڑنے والے نے اگر خدا کے خوف سے نہیں چھوڑا وہ بھی پینے لگے گا، جیسے کہ آج پی رہے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ میرا بچہ بڑا آزاد ہو گیا، یہاں تک کہ شراب پینے لگا ہے، ادھر اُدھر بیٹھنے لگا غیروں کے پاس ہمارا بچہ سینما و شراب جانتا بھی نہ تھا اور چودہ پندرہ برس کا ہے شراب پی رہا ہے کیونکہ اس کی صحبت غیر کے ساتھ ہے، تو تقویٰ کوئی کھیل نہیں ہے یوں تو تقویٰ اس میں بھی ہے جو ایمان لے آیا جو بتصدیقِ قلبی ایمان لے آیا، تقویٰ اس میں بھی ہے لیکن کیا کوئی شخص اس کو بوصفِ خاص متقی کہے گا۔

خدا تعالیٰ نے مؤمن کو متقی فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی ہے:

ذاتِ باری تعالیٰ نے اس مؤمن کو جو صاحبِ تقویٰ کہا ہے یہ اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ مؤمن کے ایمان کا تقاضا حیاء ہے، مؤمن کے ایمان کا تقاضا غیرت ہے، تو حق تعالیٰ نے اس کو نفسِ ایمان پر متقی کہا ہے کہ ایمان کے ساتھ اس میں غیرت ہے اس میں حیاء ہوتی ہے تا کہ وہ ایمان کے تقاضے پر ممنوع چیزوں سے بچتا چلا جائے منکر چیزوں سے بچتا چلا جائے اور معروف چیزوں پر بچتا چلا جائے۔ ایمان

پر قناعت کر کے بیٹھ جائے کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو متقی کہا ہے، درست ہے؟ اگر درست ہے تو پھر چراغ جلا کر بیٹھ جاؤ کمرے میں بجلی کو لینے کی کیا ضرورت ہے روشنی بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ تو نفسِ روشنی نفسِ نور کمرے کے چراغ سے بھی ہے پھر یہ کیا قصہ ہے کیوں زیادہ روشنی کی طلب اور چاہت ہوتی ہے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ اللّٰہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰتِ الی النور کہ اللہ تعالیٰ دوست ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لاتے ہیں اندھیریوں سے روشنی کی طرف لاتے ہیں۔ لہٰذا اسی روشنی پر قناعت کر کے تم بیٹھ گئے ہو تو چراغ کی روشنی پر بھی قناعت کر کے بیٹھ جاؤ۔

آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمن کو ولایت کے خطاب سے نوازا ہے :

یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ خطاب ولایت کا دیدیا، یہ ولایت کا خطاب جب دیدیا تو اس کو قائم رکھنا جس بادشاہ نے خطاب دیا ہے اس بادشاہ کے حکم کے خلاف نہ ہونے پائے کسی چیز میں تب تو خطاب رہے گا ورنہ خطاب چھن جائے گا، سلب ہو جائے گا۔ آپ کو کہاں کا خطاب، ڈرنے کی چیز ہے یا نہیں؟ میں نے تم کو خطاب دیا تھا تم نے اس خطاب کی وقعت کیا کی؟ اس کا جواب دو۔ اس نور سے تم نے کیا کام لیا پس روشنی کو بڑھاتا رہے یا وہیں کا وہیں رہے؟ یا اس کو بھی بجھا دیا۔ یہ ذاتِ باری تعالیٰ نے جو فرمایا ہے یہ مؤمن کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں جہادِ اکبر کی صحیح اخلاص کے ساتھ توفیق ارزانی سے نوازیں (آمین)

☆

بائیسویں مجلس

اَلَستُ بِرَبِّکُم دعویٰ بدلیل ہے

مورخہ ۱۷ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ بمطابق ۷ نومبر ۱۹۹۰ء بروزِ چہارشنبہ بوقت صبح ۱۰ بجے

بیعت کے لئے سفر نہیں :

ایک صاحب نے سلسلے میں داخل ہونے کے لئے حاضری کی اجازت چاہی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ محض سلسلے میں داخل ہونے کے لئے سفر کی حاجت نہیں بلکہ خود داخلِ سلسلہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں، یعنی بیعت ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔

اصل چیز کام ہے بیعت نہیں :

اصل مقصود کام ہے سفر کی ضرورت نہیں جو کام گھر بیٹھے ہو جائے تو پھر بلا کسی ضروری کام کے سفر ضروری نہیں۔ گھر رہیئے اور اپنے کو گھیر لیجئے۔ صحیح صحیح حالات کی اطلاع دینے کا اہتمام اور اخلاص کے ساتھ تعلیمات پر اتباع کرتے رہنے کا التزام

کیجیئے اس سے۔گر و نہیں؟ گر گئے اب بلا حالت کی اطلاع کے اور بلا تعلیم کے اتباع کے کام کرنا کیسا۔گھر رہیئے اور گر ے رہیئے، سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر آج کل کا سفر سقر ہے جہنم سے کم نہیں۔تشریف نہ لائے کوئی ضرورت نہیں جیسے جسمانی بیمار اپنے کو مریض سمجھ کر اور صحت کی فکر رکھتے ہوئے ڈاکٹر کو اطلاع کرے گا اور اپنی حالت کا اور حکیم جی کے نسخوں کے ساتھ اور پرہیز کے ساتھ اتباع کرے گا، وہی یہاں پر ہے کہ حالاتِ باطنی ونفسانی کی اسی طرح اطلاع کرتا رہے، صحیح صحیح وہم میں نہ پڑے اور جو تعلیم ہوتی رہے علاج و معالجہ تعلیم اس پر چلتا رہے بس گھر میں بیٹھیے، گھر گیا، آزادی سلب ہوگئی رہی ہمت جب کسی چیز کو ضروری سمجھ رہا ہے نفع کی اور نقصان سے ہٹنے کی اور بچنے کی تو اس میں ہمت ہوگئی۔

عہد الستُ کا ذکر :

اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے انسان یہاں عالمِ میثاق میں تم نے عہد کیا ایمان لائے ،اس عالمِ میثاق میں ارواح نے عہد کیا، الست بربکم میں نے تم سے کہا تھا اور تم سے پہلے میں نے آسمانوں سے کہا تھا پہاڑوں سے کہا تھا، میں نے ان سے کہا تھا تو انہوں نے تو انکار کر دیا تھا معذرت پیش کر دی تھی ادب کے ساتھ، میں نے ان کو کچھ نہیں کہا کہ تم نے کیوں قبول نہیں کیا؟ میں نے کچھ نہیں کہا ان کو غیر مکلف چھوڑ دیا۔اور جب اے انسان میں نے تمہارے سامنے امانتِ احکام ادا کرنے کی پیشکش کی تو تو نے بڑھ کر ہاتھ مارا، حالانکہ تجھ سے پہلے وہ سبھی قوی تر تھے، آسمان پہاڑ تجھ سے پہلے ان سب پر پیش کر چکا تھا، اور اے انسان مٹی کے پُتلے پتھروں کے پُتلے ،وہ آیت کیا ہے.........؟

انسان کی امانت احکام کو لے لینا :

انا عرضنا الامانة علیٰ السمٰوٰت والارض والجبال ہاں یہ ساری کی ساری چیزیں ان کو پیش کی تھیں مگر سب نے کہا تھا ہمارے بس کا کام نہیں تو تمھیں تو معلوم ہے کہ میں پہلے ان کو پیش کر چکا اور انہوں نے کہ وہ تم سے قوی تر تھے تو پہاڑ کیا مٹی کا ہوتا ہے وہ تو پتھر کا ہوتا ہے اور تُو تو مٹی کا پُتلا ہے، ان پتھروں نے تو منع کر دیا۔ اور تو مٹی والے نے یہ دیکھ بھی لیا اور سن بھی لیا کہ انہوں نے انکار کیا اور پھر بھی تو نے قبول کر لیا تو بھی انکار کر دیتا تو میں نے جیسے ان سے کچھ نہیں کہا تھا تجھ سے بھی کچھ نہ کہتا۔ لیکن جب تو نے قبول کیا ٹھیک ہے۔

رب ہونے کا اقرار تمام احکام کو قبول کرنا ہے :

تم نے جب میرا رب ہونا قبول کر لیا اب تمام احکام کے ساتھ قبول کر لئے اب تم کو کچھ کہنے کی مجال نہیں۔ اب جو جو میں احکام بھیجتا رہوں سناتا رہوں تعلیم دیتا رہوں وہ سب تعلیم قبول کرنی پڑے گی اسی پر چلنا پڑے گا اسی پر عمل کرنا ہوگا۔ جب تو نے بلیٰ کہا تھا نہ اور جب تو نے قبول کر لیا ہے تو اس کے ساتھ ہی میری سب چیزیں تیرے ذمہ لازم ہو گئیں۔ ناقص العقل ہو کر عورت کا نقصانِ عقل شریعت میں آیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ھن ناقصات العقل، تم سب کم عقل ہو بے عقل نہیں کہا، عورتوں کو بتلا دیا کہ ساری کی ساری عورتیں کم ہیں، یہ وزارت چاہ رہی ہیں کم عقل، یہ ضمناً بات آجاتی ہیں۔ اس کے لواحقات میں سے ہے عورت کم عقل ہے یا عقلمند؟ حدیث شریف میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔

جب عورت کم عقل ہے تو حکومت کا عہدہ کیسے انجام دے سکتی ہے؟

جب کم عقل ہے بھلا حکومت کا کام کر سکے گی وہ؟ ریاست کا کام کر سکے گی؟ جیسا کہ کرنا چاہیئے وہ عقل کہاں سے لائے گی، جز ئیاتی وہ ہمت دلیری جرأت کہاں سے لائے گی۔ مولانا روم نے بھی ایسی بہت باتیں لکھی ہیں جو شرم کی سی ہیں، شادی ہو گئی جوان بیوی ہے اور میاں بھی جوان ہے بس کچھ نہ پوچھو، نہ دن کو دیکھے نہ رات کو دیکھے، بیوی صاحبہ کے تو دو چار بچے ہو گئے، اس کی شبابیت کی جو خواہش تھی وہ ٹھنڈی پڑ گئی، اب وہ بات اس میں نہیں تو بہادری اس کی اور جرأت اس کی کہاں ہے؟ لیکن میاں صاحب تو ساٹھ برس کے بھی ہو گئے لیکن وہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اب دیکھو مرد کی جرأت، مرد کی ہمت ساٹھ برس کے بھی اور وہاں اس کے دو تین بچے ہو گئے ہیں کہ اس کی جرأت وہ ہمت اور کہیں ذرا کچھ کھانے پینے کو اچھا مل جائے تو کیا پوچھو پھر بھلا یہ عورت ناقصات العقل اور اعضاء اس کے کمزور، بھلا اس میں جرأت کہاں اس میں وہ ہمت کہاں وہ بادشاہ بننا چاہے، وہ تو وزیر اعظم کا کام کرے گی جو کرے گی وہ تو کرنے سے رہی، وہ تو سوچنے سے رہی ان کا ذہن چلے گا جو کچھ چلے گا اس کا تو ذہن چلنے سے رہا۔ تو یہ کم عقل عورت مرد کو زور دے رہی ہے کہ جب تم نے قبول کیا تھا تو کیسی بات کہہ رہے ہو، باہر سمجھدار مردوں سے پوچھو کہ اس قبول کرنے کے ساتھ میرا کھانا میرا پہننا میرا رہنا سہنا سب آپ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ قرآن پاک میں مثالیں آئی ہیں تو اس پر میرے حکم کو خوب سمجھ لو کہ تم نے قبول نہ کیا ہوتا جب میں نے کہا کہ کیا میں

تمہارا پروردگار نہیں ہوں تو تم نے کیا کہا تھا کہ ہو جب تم نے مجھ کو اپنا پروردگار مان لیا تو اب تمہارے ذمہ ساری باتیں میری طرف سے آ گئی، اب چون و چرا کیسا؟ چوں کے معنی کیوں چرا کے معنی کس واسطے۔

حقوق العباد حقوق اللہ ہی ہیں :

حالانکہ وہ حقوق حق تعالیٰ ہی کے ہیں بندوں کے نہیں ہیں چونکہ بندوں کی طرف نسبت ہے اس لئے بندوں کے کہے جاتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ بندوں کے حقوق نہ رکھتے تو کیا بندوں کے حقوق ہمارے ذمہ ہوتے؟ تو آزاد رہتے، وہ تو انھیں کے حقوق ہیں نسبت ہے اس لئے حقوق اللہ حقوق العباد کہہ دیئے ہیں۔ پس وہ حقوق اللہ ہی ہیں اور اپنے حقوق کی جو حدود کے درجے میں ہیں ان کا تو کچھ مطالبہ ہے اور جو حقوق کے درجہ میں نہیں ہیں اپنی طرف سے اپنے لئے ان کا کچھ مطالبہ بھی نہیں ذرا اس پر غور کیجئے گا

شریعت میں دو چیزیں ہیں :

ایک نئی بات اللہ تعالیٰ نے ذہن میں ڈالی ہے منہی عنہا اور مامور بہا دو ہی چیزیں ہیں۔ کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ کاموں سے بچنے کا حکم دیا ہے تو جن کاموں کے کرنے کا حکم ہے وہ تو مامور بہا ہیں اور جن کاموں سے بچنے کا حکم ہے وہ منہی عنہا ہیں، منہی عنہا میں بعض چیزیں وہ ہیں کہ جن کو حدود سے متعلق کیا گیا ہے اور وہاں معافی نہیں ہے، اگر بندہ بھی معاف کر دے تو معاف نہیں کی چوری اور چوری ثابت ہو گئی، کیا حکم ہے؟ بھائی میری چوری کی تھی میں نے معاف کر دیا۔ سارے حوصلہ والے ایسے مل گئے تو وہاں حکم کیا ہے کہ ہاتھ مت کاٹو، یا فاقطعوا ایدیھما ہے تو یہ حدود ہیں اگر زنا ثابت ہو جائے تو شادی کا اور طرح اور غیر شادی

شدہ کا اور طرح، شادی شدہ کا تو رجم اور غیر شادی شدہ پر کچھ معذوری سی ہے بیچ میں کہنے کو کچھ بات آجاتی ہے، تو چار کوڑے ماردو، دس کوڑے ماردو اور؟ سو کوڑے ماردو، اور شراب پی لی اور ثابت ہوگئی تو اسی کوڑے ماردو یہ منہی عنہا پر بات چلی تو یہ حدود ہوئیں۔ ایسے ہی مامور بہا میں بعض چیزیں حدود کی ہیں۔

مامور بہا میں حدود کی صورت :

بالغ ہونے کے بعد مکلف ہونے کے بعد وقتِ نماز آیا نہیں پڑھی، پھر وقت آیا نہیں پڑھی اسی طرح ایک عرصہ گذر گیا، اب آگیا شعور کچھ آخرت کا خیال آگیا اسی دن سے پڑھنا شروع کردی، اب جو چھوٹ گئی تھیں پھر کیا یہ کہہ دے گا کہ پہلے چھوٹ گئی تھیں مگر اب تو میں نے پڑھنا شروع کردی، غلطی سے چھوٹ گئی۔ اس لئے اب مجھ پر کوئی الزام نہیں، تو اس کو کیا کہا جائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ کہا جائے گا کیا بات کہہ رہا ہے تو کہ چھوٹ گئی۔ بلوغ کے بعد جو نمازیں چھوٹ گئی ہیں اور نہیں پڑھی، کبھی سفر میں نماز نہیں پڑھی اور ابھی لاپرواہی میں نہیں پڑھی، اس کا حساب لگاؤ۔ تو ذہن میں زیادہ سے زیادہ سوچ کر جس کو تحری کہتے ہیں شریعت میں تو زیادہ سے زیادہ جو چھوٹ گئی دو سال کی چار سال کی اس کو ادا کر یہ حدود میں سے ہے، اس کو ادا کر و ادا کرو اسی طرح جو روزے چھوٹ گئے ہیں حساب لگا کر ان کو بھی ادا کرو۔

مامور بہا میں بھی حدود ہیں :

بعض چیزیں حدود میں سے ہیں ان کی معافی نہیں جیسے حدود منہی عنہا میں معافی نہیں ہے چاہے کوئی سفارش بھی کرے کہ فاطمہ صحابیہ رضی اللہ عنہا کی چوری ثابت ہوگئی حضور ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیدیا۔ بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم جو حضور ﷺ کے مقرب تھے

انہوں نے سفارش کی کہ ایسی اور ایسی ہیں خاندان کی ایسی ایسی ہیں حضور ﷺ نے غضب ناک ہو کر فرمایا کہ اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے اور ثابت ہو جائے اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا، یہ حد ہے؟ تم سفارش کرتے ہو پہلی امتیں اسی وجہ سے برباد ہو گئیں۔ بعض لوگ بیعت ہو جاتے ہیں یا سلسلہ اصلاح کا شروع کر دیتے ہیں بلا بیعت ہی کے مگر پچھلی جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی و تدارک نہیں۔ فرائض، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ۔

آیت اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ سے استدلال :

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ تم نے عہد کیا میرے ساتھ اس کو پورا کرو، میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے میں اس کو پورا کر دوں گا۔ اب انسان بزبانِ حال گویا یہ کہتا ہے، شریعت کی پابندی سے کتراتا ہے بہانہ خوری کرتا ہے کہ اجی وہاں کہہ تو دیا تھا ہم نے لیکن اب اس عالم میں آکر تو اوروں سے ڈر لگے ہیں۔

ایک عجیب بلاغتی نکتہ :

یہی تو وہ بلاغت ہے جو سارے بُلغأ وفُصحأ عرب نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے الستُ بالٰھکم کہا تھا، یا کہا تھا الستُ بربکم ، یوں نہیں کہا تھا کہ میں تمہارا معبود ہوں اللہ کے معنی معبود کے ہوتے ہیں۔

الستُ بربکم میں دعویٰ مع دلیل ہے :

بلکہ اپنے معبود ہونے کا جو دعویٰ تھا حق تعالیٰ کا معبود ہونے کا اس کی دلیل بیان کی ہے، بربکم کہ جو ایسا ہوتا ہے وہی معبود ہوتا ہے۔ یہاں دعویٰ مع دلیل

ہے بالکھم صرف دعویٰ ہوتا اور بربکم میں دعویٰ معبودیت مع دلیل ہے اس کو علماء ہی جانتے ہیں یا مطالعہ والا جان لے گا جب بربکم کہا اس میں حق تعالیٰ کا دلیل کے ساتھ اپنے معبود ہونے کا دعویٰ ہے اور اسی کو اس نے کہا ہے کہ میں نے قبول کیا اسی لئے تو باپ کا دعویٰ ہے اپنے حقوق کا کہ پرورش کرتا ہے۔

ایک نظیر :

ربّ مجازی جس کو کہا جاتا ہے تو میرے مقابلہ میں تیرا اور کون سا باپ ہے، پرورش کس نے کی تھی جو اندر سے باہر آیا، اندر تو اللہ میاں پرورش کرتے رہے اور جب اندر سے باہر آیا ہماری ذمہ داری پوری ہوگئی ۔ ابا کہہ رہا ہے کہ میں نے کی تھی یا تمہارے پڑوسی نے کی تھی، یا پڑوسن نے کی تھی، جس عورت سے تو نے تعلق کیا اس نے کی تھی؟ جس مرد لڑکے سے تعلق کیا اس نے کی تھی، پال پال کر آج تو ایسا سیانا ہوگیا تن من کا، تو جو دوسروں کا کہنا مانتا ہے میرا کہنا نہیں مانتا تو کیا ایک بیٹے کے کئی باپ ہوا کرتے ہیں کیا وہ کہہ سکتا ہے کہ ہاں کئی ہوا کرتے ہیں؟ جب نہیں ہوئے تو میرے حقوق کے مقابلے باپ کے حقوق زیادہ سمجھتا ہے جو میرے انعامات کے خلاف ہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں کہ تو ادھر مت جا، اور تیرا دوست کہہ رہا ہے کہ اسی جگہ اسی طرف جا تو میرا کہنا مانے گا یا اس کا کہنا مانے گا، ربّ مجازی میں ہوں یا ربّ مجازی وہ ہے۔ باپ کو ربّ مجازی کہتے ہیں ربّ حقیقی تو وہ ہے جس نے اپنے کچھ حقوق ربّ مجازی باپ کی طرف منتقل کر دیئے ۔ یہ جملہ باریک ہے یعنی ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنے حقوق بعض بندوں کی طرف منتقل کر دیئے اور ان کا راز رب میں پوشیدہ فرمایا یا: منجملہ ان کے باپ میں پوشیدہ فرمایا ہے پہلا، تو اپنے باپ کے حقوق کے مقابلہ میں

دوسرے کا کہنا ماننا کیسا؟ یہ موٹی سی باتیں ہیں۔

حق تعالیٰ نے مثالوں سے اپنے ربِّ حقیقی ہونے کو بتلایا ہے :

حق تعالیٰ متوجہ فرما رہے ہیں کبھی کھیتی کی مثال دیتے ہیں اپنے اپنے مرنے کے بعد زندہ کرنے پر تکوینیات کی مثالیں دیتے ہیں، کہیں نطفہ کی مثال کہیں مٹی سے پیدا کرنے کی مثال، کبھی بیج ڈالنے کی مثال، کبھی کھیتی کے پیدا ہونے سے پہلے کی مثال ،کہیں کھیتی کے کٹنے کی مثال، کبھی سرد زمین کے ہونے کی بات کبھی زمین کے خشک ہونے کی بات کہ زمین مرگئی تھی میں نے زندہ کردی ہر ایک کا مرنا جداگانہ عمل ہے یہ نظیریں ہیں یہ دلائل ہیں تو ذاتِ باری تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ انسان جب تو نے کہا تھا کہ آپ کو میں نے اپنا پروردگار مان لیا کہ الست بربکم کہا کہ کیا میں تمہارا پالنے والا پروردگار نہیں ہوں۔

تصوّر و تصدیق کی تقسیم :

تصوّر و تصدیق کی دو قسمیں ہیں نظری اور بدیہی اور بدیہی کو ضروری بھی کہتے ہیں اور نظری کو فکری بھی کہتے ہیں۔ ایک علم علمِ ضروری ہوتا ہے جس کو بدیہی کہتے ہیں ایک علمِ نظری ہوتا ہے جو کہ استدلال و دلائل سے ہوتا ہے، اور علمِ ضروری میں دلائل اور استدلال کی ضرورت نہیں۔

اولیاء اللہ کے سب علوم ضروری ہوتے ہیں :

اہل اللہ اولیاء کرام علم صحیح معنی میں باتقویٰ صحیح باتباعِ سُنّت بذکر کثیر بدوامِ طاعت اخلاص وصدق سے ہوجاتا ہے وہ نائبِ رسول ﷺ ہے ولی ہے تو اس کی ابتداء

اعرابی علمی جو ہوئی ہے وہ بطورِ علمِ نظری علمِ نظر وفکر کے ہوئی ہے، علمِ نظر وفکر کے ساتھ ہوئی ہے۔ لیکن جب اس طرح چلتا رہا اور صحیح معنوں میں ولی ہوگیا تو وہ علوم جو کہ نظری تھے اب ضرورت فکر ونظر کی نہیں رہی، ہم کتابی علم حاصل کر کے ابھی علمِ ضروری میں نہیں آئے، ابھی نظری فکری ہے، کبھی عمل کرلیا کبھی چھوٹ گیا اگرچہ مولوی صاحب ہی کیوں نہ ہوں۔ ابھی علم ان کا ضروری نہیں بنا، غیر اختیاری نہیں بنا۔ اب چاہے اس کو طبیعت کہہ لیجئے اس کو فتویٰ اضطراری کہہ لیجئے۔ ذاتِ باری تعالیٰ نے جب الست بربکم کہا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کو تعلیم دی تھی جب میں یوں کہوں تو تم یوں کہنا یہ کہا تھا اللہ تعالیٰ کا یوں کہنا پہلے سے معلوم ہوگیا پہلے سے علم ہوگیا تھا، یا کچھ دلائل تفصیلیہ بیان کئے تھے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کل پرسوں کا بچہ اگرچہ اس عالم میں بچہ پیدا ہوتے ہی ہوگیا بالغ ارے دُنیا میں اُونٹنی پیدا کی اور اونٹنی سے پیدا ہوگیا اُونٹ تو اس کے برابر کی بچی تھی؟ جبھی کھانے پینے لگی۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اُونٹنی مشہور ہے۔ تو وہ عالم اور ہے وہاں پیدا ہوتے ہی وہ بچہ تھا، تھوڑا سا دودھ پی رہا وہاں پیدا ہوتے ہی وہ عالم دوسرا ہے، بلوغ ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو آہستہ آہستہ لہجے میں ایسی بات تو ایسی ہی لہجے میں چپکے چپکے میں تم کو سکھلا رہا ہوں تم یوں کہہ دو۔ تو پہلے سے سکھا دیا کہ میں یوں کہوں گا تم یوں کہنا، ایسے ہی تو کہے گا چپکے چپکے کہا تو کیا اللہ میاں نے پہلے اس طرح سکھا دیا تھا یا نہیں؟ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس کہنے پر الست بربکم سب بول اُٹھے ہاں آپ ہمارے پروردگار ہیں۔ یہ بطورِ علم ضروری تھا کیونکہ وہاں عقل پوری پوری صحیح سلامتی کے ساتھ دوسری چیز کا وہاں عقل میں استدلال نہیں ہے تو سب بول اُٹھے تو وہ علم غیر استدلالی ضروری تھا۔

لفظ رب فرمانا دلیل ہے دعوئ معبودیت کی :

لفظ رب فرمانا یہ دلیل ہے دعوئ معبودیت کی کہ اب بس سوائے میرے تمہارے لئے اور کوئی معبود نہیں بن سکتا، کسی کو معبود مت بنانا، کسی دوسرے کی طرف دل میں اس کی معبودیت کے حقوق مت لانا اور جہاں میں نے کچھ اجازت دی ہے وہ میری ہی عبادت میں لگنا ہے اس کی عبادت میں لگنا نہیں۔

و ایای فرھبُون : دیکھو! اس معاملہ میں مجھ سے ڈرتے رہنا، اگر تم نے ایفائے عہد نہ کیا تو میری طرف سے بھی اُمید مت رکھنا ایفائے عہد کا۔

تکوینی اُمور اللہ تعالیٰ ضرور انجام فرمائیں گے :

یعنی کہ تکوینی بات میں تمہاری سب پہنچاتا رہوں گا کھانے کو دیتا رہوں گا پینے کو دیتا رہوں گا ہوا بھی بھیجتا رہوں گا، کیونکہ میں نے پیدا کیا ہے پیدا کئے ہوئے کی بات تو ہوا ہی کرتی ہے تو میں حفاظت کے لئے حفظہ دیتا رہوں گا۔

کافر کے لئے بھی حفاظت کے فرشتے ہوتے ہیں :

حفظہ فرشتے کافر کے ساتھ بھی ہوتے ہیں، حالانکہ کافر ہے انکار کر رہا ہے مگر ذاتِ باری تعالیٰ نے اس کے باوجود کافر کے ساتھ بھی فرشتے حفاظت کے لئے لگا رکھے ہیں۔ تکوینی بات تو الگ ہے لیکن اُمورِ تشریعیہ میں تم اپنا عہد پورا کرتے رہو میرا تمہارے ساتھ جو عہد ہے وہ میں پورا کرتا رہوں گا کیونکہ تکوینیات میں تو عہد ہوا نہیں تمہاری طرف سے وہ تو میری ہی طرف سے ہے وہ تو میں پورا کرتا رہوں گا اور الوہیت کے اعتبار سے جس کو تم نے رب مان کر عہد کیا ہے وہ تمہارے ذمہ ہے تو اس کے جو آثار ہیں اس کے جو خواص ہیں وہ میری طرف سے پورے ہوتے رہیں گے۔ یہ

قالوا بلی کے اجمال کا نقشہ ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اگر میں تمہاری حرکتوں پر ہوا نہ بھیجوں تو کیا ہوگا تمہارے میرے حکم کے خلاف کرتے رہنے پر اگر میں تم کو سزا نہ دوں تو کیا ہوگا۔ میرے حکم کی تعمیل کے خلاف کرتے رہنے پر اگر دشمنوں کا تسلط کروں تو کیا ہوگا۔ کیونکہ تم نے کہا تھا کہ رب آپ ہی ہیں تو ربوبیت و پرورش کا پورا کام ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔

تو جس کے ساتھ ہماری پوری زندگی' اپنی ضروریات کی' فرحت کی راحت کی لگی ہوئی ہیں اگر وہ رب ہماری تربیت اس قسم کی چیزوں میں بند کردے تو کیا اور دوسرا کوئی اس قسم کی چیزوں میں تربیت کرسکتا ہے؟ دیکھ لو کسی زمانہ میں اگر ہوا نہ ہو تو پریشان کیوں نہیں ہوتے۔ یہ جو پنکھا ہے یہ ہوا پیدا نہیں کرتا ہوا میں تیزی پیدا کرتا ہے اگر ہوا نہ ہو تو کیا پنکھے سے ہوا پیدا ہو جائے گی؟ نہیں! پیدا کی ہوئی ہوا میں جو ہلکا پن آ گیا جو ہم کو نہیں لگ رہی ہے اس میں یہ پنکھا تیزی کر دیتا ہے۔

لہٰذا اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ تم نے جو عہد کیا اس کو تم پورا کرتے رہو جو میں نے عہد کیا ہے وہ میں پورا کرتا رہوں گا تو اللہ تعالیٰ کا عہد پورا کرتے رہنا وہ موقوف ہے ہمارے عہد کے پورا کرتے رہنے پر اور پھر یہ بھی کہہ دیا وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ مجھ ہی سے ڈرتے رہو، مگر پھر بھی خلاف کیا تو گویا یہ فرمادیا۔ اچھا کیا تمہاری طبیعتوں سے میرا ڈر نکل گیا جو تم عہد پورا نہیں کر رہے ہو۔ تمہارے عہد کے پورا نہ کرنے پر تم کو ڈر نہیں معلوم ہوا کہ ساری پرورش میرے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں ڈر نہیں معلوم ہوا تمہاری ہمت کیسے پڑی میرے حکم کے خلاف کرنے پر خیال فرمایا؟ تم نے سوچنا چھوڑ دیا، تو تم نے اپنا بھی سوچنا چھوڑ دیا۔ میرے رب ہونے کا جو تم نے اقرار کیا تھا اس کا سوچنا تم نے چھوڑ دیا۔ تو تم نے اپنا بھی سوچنا چھوڑ دیا میرا سوچنا بھی چھوڑ دیا۔ اگر تم

نے اپنے کو پہچانا ہوتا تو مجھ کو بھی پہچانا ہوتا۔ اس سے وہ چیز ثابت ہوگئی۔

جس نے اپنے کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا :

من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ یہاں بھی رب کا لفظ ہے تو تم نے میرے رب ہونے کے سوچنے کو چھوڑ دیا اس لئے میرے احکام کی تعمیل کرنے کو تم نے چھوڑ دیا، اگر تمہارے ذہن تمہاری عقلِ سلیم اور فہمِ سلیم میں میرا رب ہونا جاگزیں اور بیٹھ گیا ہوتا تو میرے حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہ کرتا۔ یہ مراقبات ہیں یہ سوچتے رہنے کی باتیں ہیں۔

مراقبہ کی حقیقت :

مراقبہ اسی کو کہتے ہیں، کسی خیر بات کا اس طرح پر سوچتے رہنا کہ خیر کی طرف قدم اُٹھتا رہے اور شر کی طرف قدم جانے سے رُکتا رہے اس کو کہتے ہیں مراقبہ۔ سیدھے سادے لفظ کو اُلجھا دیا اس میں سارا سلوک آ گیا، تو بات یہ تھی کہ بعض منہی عنہا درجۂ حدود میں جیسے تھے اور بعض مامور بہا بھی درجۂ حدود میں ہوتے ہیں جیسے منہی عنہا جو حدود میں ہوتے ہیں اس کی سزا ہے، ایسے ہی مامور بہا جو درجہ حدود میں ہوتے ہیں ان کی سزا ہے۔

مامورات میں حدود کی دوسری مثال :

اب ایک دوسری دلیل کہ فضل الٰہی کیا ہے............؟ مؤمن نے جان کر نماز چھوڑ دی اور رہتا ہے حکومتِ اسلامیہ میں۔ اس عاقل بالغ نے بیداری کی حالت میں جان بوجھ کر نماز نہیں پڑھی ایک وقت کی محتسب نے احتساب پیش کر دیا۔ قاضی صاحب کے یہاں ثابت ہوگیا، امام شافعی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قتل کر دو۔ تو جیسے ہاتھ کاٹا، جیسے رجم کیا، جیسے کوڑے لگائے ایسے ہی تارکِ صلوٰۃ کو قتل کر دو۔ حدود کا

معاملہ جاری ہو گیا۔

امام صاحبؒ نے فرمایا کہ انسان ہے بھول کا بھی احتمال ہے اس لئے قتل کا حکم جاری نہیں ہوگا اب یہ قتل سے تو چھوٹ گیا لیکن یہ فرمادیا کہ اس کو جیل خانہ بھیج دو، جیل خانہ بھیج دینا بھی ایک ہلکی تقتیل ہے گویا تعزیر ہو گئی، اب اس کو تنبیہ ہو گئی چھوڑ دو، توبہ کر لی اس نے اقرار وعہد کر لیا کہ اب نہیں چھوڑوں گا، لہٰذا اس کو رہا کر دیا۔ پھر دوبارہ ثابت ہو گیا کہ نہیں پڑھی امام صاحب فرماتے ہیں کہ پھر جیل خانہ بھیج دو پھر توبہ کر لی پھر چھوڑ دو، تیسری دفعہ اس کا نماز ترک کرنا پھر ثابت ہو گیا اب امام صاحب فرماتے ہیں کہ قتل کردو اس مؤمن کو۔ توبہ کا ایک مذاق اُڑا لیا یہ توبہ کیسی ہے، اس کو توبۃ النصوح کہتے نہیں۔

توبہ سے توبۃ النصوح مراد ہے :

اور مراد توبۃ النصوح ہے، تو ہم نے رعایت کی تھی، مان لینا چاہئے تھا تجھے پہلے ہی لیکن تجھے قدر کرنی نہیں آتی اس درگذری کی۔ تو شریعت کہتی ہے کہ تین مرتبہ کے بعد اس مؤمن کو قتل کردو، تو یہ قتل کر دینا حدود کی حیثیت سے ہے، تو معلوم ہوا کہ جیسے منہی عنہا میں بعض چیزیں حدود میں سے ہیں، ایسے ہی مامور بہا میں بھی بعض چیزیں حدود میں داخل ہیں۔ دلائل سے ثابت ہو گیا بفضلہٖ تعالیٰ بحکمہٖ تعالیٰ تو نماز ترک کرنا یوں ہی معمولی بات نہیں بلکہ اہم مسئلہ ہے۔

بات یہ چل رہی تھی کہ اپنے گھر رہو، سفر مت کرو کہ السّفر کالسقر اگر واقعی تمہارے اخلاص وصدق کے ساتھ یومِ آخرت کی فکر ہونے کیساتھ ہے تو حضر میں رہو یعنی گھر رہو، گھر رہ کر یہ بعد کی بات ہے۔

مجاہد اور مہاجر کون ہیں ؟

ایسے ہی صحابہ ؓ نے سوال کیا : من المھاجر کہ مہاجر کون ہیں آپ ﷺ نے فرمایا : المھاجر من ھجر نفسہ جس نے اپنے نفس سے ہجرت کرلی تو گھر رہ کر ہجرت ہوئی گھر بیٹھے اللہ نے جیسے تیرہ برس تک جہاد نفس سے کرایا تھا ایسے ہی ہجرت نفس سے کرائی تھی تب وہ جہاد ظاہری کفار کے ساتھ حکم آیا، تب وہ جہاد ظاہری جسم کا جسم سے اور مکہ معظمہ سے نکل کر مدینہ طیبہ میں حکم آیا تھا۔ دونوں طریقوں سے جہادِ نفس سے بھی فارغ ہوچکے اور ہجرتِ نفس بھی کرچکے تب حکم ہوا جہاد کا تب حکم ہوا ہجرت کا۔

نفس خدائے تعالیٰ کے حکم کے خلاف شہوات، لذّت، خواہشات، تعلقاتِ غیر انسانی، میں لگا ہوا ہے اس سے ہجرت کرلو، گھر رہو یعنی نفس سے ہجرت کرتے رہو، اس کی خواہشات پر اس کی لذات پر اس کی شہوات پر اس کے تعلقات پر اور غیر کی تعلیم پر مت چلتے رہو، ہجرت کرتے رہو، ابھی نہیں ۔ تو خواہ مخواہ سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہجرتِ صوری وطن سے بے وطنی ہونا ہے مشقتوں کو لئے ہوئے ہے مگر جو طالبِ حق بخوفِ آخرت بلحاظِ آخرت کوئی چیز اس کے ذہن میں آئی ہے جس کی وجہ سے اس خیالِ ہجرت میں قوت آگئی ۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ اس ہجرت میں میری اصلاح و تربیت میں تقویت آئے گی اس ہجرت میں مجھے تمکیت آئے گی تلوینیت بالکل چلی جائے گی۔

شیخ کے پاس جانا بھی ہجرت ہے :

اس لئے بے چین ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے سامان دے دیتے ایسے ایسے ہجرت کے تو میں اپنے شیخ کے پاس چلا جاتا۔ وہاں جا کر ذرا اِن باتوں کو بھی لے لیتا

حاصل کر لیتا تو اس میں تکمیلیت اور تمکینیت ہو جاتی ۔اب سامان دے دیا اللہ تعالیٰ نے، اب وہ ہجرت کر رہا ہے وہ شیخ کے پاس جانے کی سعی میں اس لئے لگ گیا ہے بطورِ ضرورت جو اصلاحی چیز تھی وہ الحمدللہ حاصل ہے، ہجرتِ نفسانی حاصل ہوگئی لیکن اس میں کچھ اور نمکینی پن آ گئی، تمکین کے لئے وہ ہجرت کر رہا ہے، آ رہا ہے پوچھ رہا ہے۔اب شیخؒ دیکھ رہا ہے کہ جو پوچھ رہا ہے وہ کون ہے کیسا ہے؟ کس حالت کا ہے؟ بیوی بچے والا ہے کچھ ذمّہ داریاں حقوق العباد کی ہیں۔اپنے متعلقین کی یا اس کے ذمّہ اُمور متعلقہ نہیں ہیں اب یہ سوچ رہا ہے۔اب شیخ اس فکر میں پڑ گیا کہ آنے کی اجازت چاہ رہا ہے تو میں اس کو ہجرت کی اجازت دوں یا نہ دوں۔

کیا سارے کے سارے صحابہ ؓ ہجرت کر گئے تھے یا نہیں؟ سب گئے لیکن جنھوں نے اوّل ہجرت کی پہلے پہل ان کا درجہ اُونچا ہے ہاں اگر چہ اور صحابہ ؓ نے بھی بعد میں ہجرت کی لیکن پہلے جو ہجرت نہیں کی تو کیا وہ مؤمن نہیں تھے؟ احقر آپ کے سامنے طالب علمانہ حیثیت سے دلائل پیش کر رہا ہے تو کیا وہ صحابہ ؓ جنہوں نے ہجرت نہیں کی تھی وہ ولی نہیں تھے؟ تو بعض نے اوّل دہلہ میں ہی ہجرت کر لی اور بعض نے بعد کو ہجرت کی مگر کی تو تھی، تو کیا وہ ولی نہیں تھے؟ تھے اور ضرور تھے لیکن اس کے باوجود بھی جو کچھ باریکی تھی اندرونی طور پر رُکاوٹوں کی دین پر صاف طریقت سے چلنے کی تمکینی طور پر تقویت کے ساتھ انہوں نے بھی اپنے آپ کو مجبور پایا کہ ہجرت کرنی چاہیئے ۔اس ایمان وولایتِ کاملہ میں انہوں نے کچھ نمکینی پائی، تو اس میں نمکینیت کے لئے ہجرت کی۔

ایسے ہی شیخ کے پاس جانے کے لئے بعض ایسے ہیں کہ جن کو ہجرت کی

صورت حاصل ہے کوئی قریب میں ہے کوئی بعید میں ہے کہ جا کر پاس رہوں، ایک آدھ مہینہ اگرچہ میں قریب میں رہتا ہوں، قریب جانے میں مجھے کیا دیر لگتی ہے کرایہ موجود ہے اپنے پاس سے وہاں جا کر کھانا کھاؤں گا ان پر کیوں بوجھ ڈالوں گا۔

شیخ کے پاس اپنے کو مریض سمجھ کر جائے :

میں مریض ہو کر جا رہا ہوں، میں رشتہ دار بن کر جا رہا ہوں، صرف ملاقاتی ہو کر نہیں جا رہا ہوں، اپنے پاس سے کھاؤں گا۔ تو قریب کا رہنے والا ہے مظفر نگر، سہارن پور کا رہنے والا ہے کوئی دور ہے لندن کا، افریقہ کا یا دور دراز کے ہیں۔ اگر گنجائش نہیں ہے تو کیسے سفر کرے، لیکن جب گنجائش ہے اور سفر کے بدون گھر رہ کر بھی رگرا ہوا ہے حالات کی صحیح اطلاع دیتے ہوئے اور تعلیمات پر صحیح بخوفِ آخرت ذاتِ باری تعالیٰ کے پیشِ نظر اتباع کرتے ہوئے، تو اس کی اصلاح ہو جاتی ہے ولی ہو گیا حقوق اللہ بھی ادا کر رہا ہے حقوق العباد بھی ادا کر رہا ہے اور زُبان پر بھی اس کا ذکر جاری ہو رہا ہے اور دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد بیٹھی ہوئی ہے تو ولی ہو گیا۔ لیکن اس ولایت میں نمکینیت چاہتا ہے اس ولایت میں جو صباحت آ گئی اس میں ملاحت بھی آ جائے تو اور ترقی ہو جائے۔ اس ولایت کا ذائقہ کچھ عجیب سا لگ گیا، کوئی چیز تلاش کر رہا ہے اب وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ تلاش کی چیز تو بدونِ شیخ کے پاس جاتے ہوئے ہو گی نہیں۔

میاں جی نور محمدؒ کا واقعہ :

ہمارے دادا پیر نور محمد صاحب قدس اللہ سرہ۔ بعض نام رکھتے ہیں اپنا نور محمد مگر بزرگ بننا نہیں چاہتے مستقل ہو گئے، اب خیال کر لیا کہ اب تو مجھے کسی شیخ کی

ضرورت نہیں۔ اور کہا کتابیں دیکھ لوں گا، نور محمد بن جاؤں گا میں اور دادا پیر کی طرح بن جاؤں گا میں تو۔ اس طرح تو بن چکا؟ یہ انڈا خاکی ہے یہ ایسا انڈا ہے کہ مرغی کے نیچے رکھ کر تو بچہ ہوا نہیں یوں گرمی پہنچادی، خیر یہ ضمناً محبت کی باتیں ہیں۔

تو میاں نور محمد صاحبؒ بیمار ہو گئے اور بیماری نے طول پکڑلیا، بالآخر آدمی بے گھر کو گھر یاد آتا ہی ہے۔ جھنجھانہ کچھ دور نہیں، لوہاری کچھ دور نہیں تو میاں جی صاحب تشریف لے چلے اپنے گھر، بیماری کی حالت میں اس وقت پالکیاں چلتی تھیں تو میاں صاحب پالکی میں بیٹھ کر جھنجھانہ شریف تشریف لے گئے۔ جھنجھانہ جاتے ہوئے تھانہ بھون راستہ میں آتا تھا تو راستہ وہ اختیار کیا جو کہ خانقاہ کے پاس سے گذرتا تھا، حاجی امداد اللہ صاحبؒ اس میں رہتے تھے،، ہمارے دادا پیر نے پالکی روک دی اور پالکی والے سے کہا دیکھو اندر حاجی امداد اللہ صاحبؒ ہوں گے اُن کو بُلا لاؤ، تو حاجی صاحب آئے تو پالکی رکھی ہوئی ہے اور میاں نور محمد صاحب لیٹے ہوئے ہیں تو اندر سے حاجی صاحب نے آکر سلام کیا ہلکا سا مصافحہ بھی ہوگیا۔ میاں جی صاحب نے فرمایا کہ میری طبیعت کچھ ایسی ایسی خراب ہوگئی ہے وطن جھنجھانہ جارہا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب خلافت مل چکی تھی اور دو جگہ سے مل چکی تھی پہلے سلسلہ نقشبندیہ سے ملی، حضرت شاہ محمد آفاق صاحبؒ کے خلیفہ صاحب سے اور پھر یہاں سے بھی ملی سلسلہ چشتیہ میں اور غالب رنگ بعد کا ہوتا ہے تو غلبہ چشتیہ کا ہوگیا۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ میں وطن جارہا ہوں اور مرض میں کچھ طول ہوگیا ہے اور جی یوں چاہ رہا تھا کہ میں ابھی آپ سے کچھ کام لیتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی اُمید نہیں حاجی صاحب کو رونا آگیا اور آنا ہی چاہئے تھا۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ بہت مستقل المزاج تھے :

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ عجیب مستقل المزاج تھے لیکن جب حاجی صاحبؒ کی وفات کی اطلاع گنگوہی کو پہنچی تو دست ہو گئے اور دست بھی خونی ہو گئے شیخ کے رنج پر اس لئے نہیں کہ جُدائی ہو گئی نہیں بلکہ اب اگر کوئی بات پیش آئے تو کس سے پوچھوں گا، آگے اپنے حال کو کس پر پیش کروں گا اور اپنے حال کی ترقی کس طرح ہو گی کیا ہو گا اور یہاں تک اثر ہوا کہ کوئی نیا آدمی آتا تھا تو شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے والد ماجد مولانا یحیٰی صاحب خادمِ خاص تھے شاگرد بھی اور خاص خادم بھی تھے جب کوئی نیا آدمی آتا تو اس سے کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو حاجی صاحب کا ذکر مت کرنا مولانا صاحب کے سامنے اس لئے حاجی صاحب کا ذکر کوئی نہیں کر سکتا تھا، جہاں حاجی صاحب کا ذکر آیا اور مولانا گنگوہیؒ کی آنکھوں سے آنسو برستے تھے۔ کیا عجیب تعلق تھا ایک آدمی نیا آیا، مولانا یحیٰی صاحبؒ اس وقت نہیں ملے تھے۔ اس نے حاجی صاحب کا تذکرہ کر دیا، بس حاجی کا تذکرہ تھا مولانا گنگوہیؒ کی طبیعت بدل گئی اور وہاں سے اُٹھ کر کمرہ میں تشریف لے گئے اور وہاں جا کر رونے لگے اب رونے کی آواز باہر آنے لگی تو اس لئے نہیں روئے کہ جدائی ہو گئی ہے بلکہ دین کی خاطر وصول الی اللہ کی ترقی کی خاطر، انابت الی اللہ طلبی کی زیادت کی خاطر۔

مولانا گنگوہیؒ علومِ ظاہرہ باطنہ میں اور حالاتِ باطنیہ میں کچھ کم نہیں تھے۔ تمکین تو ہے لیکن اس تمکین کو نمکین بنانا چاہتا ہے وہ کچھ ایسی چیز اندر سے اُبھار دے رہی ہے کہ اس کے لئے جب میرا شیخ زندہ ہے اور میں اس کے پاس جا سکتا ہوں تو کیوں نہ جاؤں لہٰذا چلا آیا۔ اب یہ دوسری ہجرت ہے، پہلی نفس کے ساتھ گھر بیٹھ کر تھی، جب

جہاد بکفار ظاہر کا حکم ہے تو بکافر باطنی یعنی نفس کے ساتھ جہاد بطریق اولیٰ ہوگا۔اسی طرح ہجرت باطنی ہے، نفس سے اس کے شہوات وخواہشات لذات وتعلقات سے نکل کر پھر ہجرت کی صحابہ ؓ نے۔

صحابہ ؓ سب صوفی اور ولی تھے :

کیا وہ صحابہ ؓ صوفی نہیں تھے ولی نہیں تھے؟ پھر مکہ معظمہ کے چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مت چھوڑو؟ تو پہلی ہجرت کس نے کی دو شخصوں نے وہ دو شخص کون تھے؟ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہجرت کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ کیا تائیدِ الٰہی مکہ معظمہ میں رہ کر نہیں ہوسکتی تھی؟ نعوذ باللہ نقلِ کفر کفر نباشد کچھ احکام و مسائل تھے قانون قائم کرنے تھے قیامت تک کے لئے وہاں بھی ہوسکتا تھا، وحی اوّل قیامت تک کے لئے ہے جیسا موقع ہو ویسا ہی حکم اس میں موجود ہے، تو ہجرت کی وہ رسول ﷺ تھے ان کی رسالت تو ولایت سے بھی بہت اُونچی ہے اور پھر جو صحابہ ؓ تھے وہ سارے کے سارے ولی تھے ! پھر ہجرت کی کیا ضرورت تھی؟ تو ان سے پہلے ہجرتِ نفسانی کرائی پھر ہجرت کی کیا ضرورت تھی؟ تو ان سے پہلے ہجرتِ نفسانی کرائی پھر ہجرت ظاہری۔

گھر میں رہیئے ،گرے رہیئے کہ جب یہ طلب فکرِ آخرت بصدق ہے تو اطلاع حالات کرتے رہیئے اور توفیق الٰہی سے جو تعلیم ہوتی رہے اس پر چلتے رہیئے ،سفر کی ضرورت نہیں۔اصل مقصودی کام میں لگنا ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق بخوف وخشیت عطاء فرمائیں۔(آمین)

☆

تیئیسویں مجلس

امیر اور شوریٰ

۲۰ ربیع الاوّل ۱۴۰۹ھ بمطابق ۲ نومبر ۱۹۸۸ء بروز چہار شنبہ بوقت صبح

مسئلہ بیعت :

بیعت کا مسئلہ کھیل ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ سلوک کا یہ ایک مستقل مسئلہ ہے کہ اپنے سلسلے کے بھی متعدد حضرات سے زیادہ ملنا جلنا نہیں چاہئے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شہر میں کوئی صاحب تشریف لائے اب نہ یہ علم ہے کہ وہ کس سلسلے کے ہیں، کیسے ہیں، کون ہیں؟ نہ ان کا طریق معلوم ہے۔ ایسے حضرات کی مجلس یا حلقے میں جا کر بیٹھنا نہیں چاہئے۔

مُعالِجِ روحانی مثلِ طبیبِ جسمانی کے ہے :

جیسے معالجاتِ جسمانی میں اطباء کا اپنا اپنا طریقہ الگ الگ رہا ہے اسی طرح معالجِ روحانی کی بھی مثال ہے یہاں بھی اپنے اپنے طریقے جدا جدا ہیں۔

طریقِ بیعت :

اسی لئے بہت سوچ سمجھ کر جو علامات ہیں شیخ کی اُن پر جانچ کر پرکھ کر اور ہو سکتا ہو تو کچھ دن پاس رہ کر اور اگر پاس رہنا نہ ہو سکے تو مختلف حالات کی اطلاع کرتے ہوئے بیعت ہونا چاہیئے ۔ اور اس کے بعد بس ” یک دیگر محکم گیر“ ایک دروازے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیجیئے ۔ اب ایک شیخ سے اصلاح کا تعلق ہونے کے بعد نہ کسی دوسرے کے سامنے حال بیان کرے نہ کسی دوسرے سے تعلیم لے ۔ ہاں اپنے ہی سلسلے کے کوئی بزرگ ہیں اُن سے واقفیت ہے کچھ بے تکلفی سی ہے اُن سے دعا کی درخواست کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر تعلیم اور اصلاح کا تعلق تو بس ایک ہی سے ہونا چاہیئے ۔

مریض کا معالج طبیب تو ایک ہی ہوگا دو حکیم یا ڈاکٹروں کے درمیان مریض کا علاج کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک حکیم کچھ کہے گا دوسرا کچھ کہے گا اب کس کی بات مانی جائے؟ بعینہٖ اسی طرح ایک بیوی کے کئی میاں نہیں ہو سکتے میاں صرف ایک ہوگا ۔ ہاں ایک میاں کی کئی بیویاں ہو سکتی ہیں ۔ اگر ایک بیوی کے کئی میاں ہوئے تو ظاہر ہے کہ جھگڑا پڑ جائے گا ۔

اِسی طرح اولاد کا باپ بھی ایک ہوتا ہے نہ کہ کئی باپ ۔ ہاں ایک باپ کے کئی بچے ہو سکتے ہیں ۔ ایک مریض ایک معالج ، ہاں ایک معالج کے زیرِ علاج کئی مریض ہو سکتے ہیں ۔ ایک مؤکل کا اصلی وکیل ایک ہی ہوتا ہے اسکی اعانت اور تقویت کے لئے کسی اہم مقدمہ میں کبھی دوسرا وکیل بھی ہوتا ہے ، مگر وہ تابع ہوتا ہے ۔ اصل پیروی کرنے والا مقدمہ کا ایک ہی وکیل ہوتا ہے ۔

اُمّت کا رسول ایک :

اسی طرح اُمّت کی ہدایت کے لئے بھی ایک ہی رسول ہوتا ہے اسی کے ساتھ اگر دوسرا نبی ہے تو وہ تابعیت کے ساتھ ہے۔ جیسے موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ تابعیت کے طور پر ہیں۔ اسی طرح موسیٰؑ کے ساتھ سفر میں یوشعؑ تابعیت کے طور پر ہیں۔ چنانچہ موسیٰؑ جب کوہِ طور پر تشریف لے گئے تھے تو حضرت ہارونؑ کو اپنے بعد تابعیت کے طور پر چھوڑ گئے۔ الحاصل ایک نبی کے ساتھ اگر دوسرا نبی ہوتا بھی ہے تو وہ تابعیت کے طور پر ہوتا ہے، تائید اور تقویّت کے طور پر ہوتا ہے اصل کے طور پر نہیں ہوتا، اصل تو ایک ہی ہوتا ہے گویا وہ مُشیر کی حیثیت سے ہے تائید و تقویّت کے لئے۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی کہ ''یا اللہ مجھ سے سَلاست اور روانگی کے ساتھ نہیں بولا جاتا میرے بھائی ہارونؑ کو میرے لئے قوتِ بازو کر دیجئے''۔

حق تعالیٰ نے اُن کو بھی نبوّت دے دی تو حضرت ہارونؑ کی تابعیت مشیر کی حیثیت سے ہیں اصل کی حیثیت سے موسیٰؑ ہی ہیں۔

اصل تو ایک ہی ہوتا ہے :

اصل تو ایک ہی ہوتا ہے اس کی تائید اور تقویّت کے لئے اہلِ مشورہ ہوتے ہیں۔ اِس سے معلوم یہ ہوا کہ شوریٰ اصل نہیں ہے امیر اصل ہے۔ کوئی اہم قابلِ مشورہ مسئلہ پیش آنے پر اہلِ مشورہ سے مشورہ کرنے کے بعد امیر جو اصل ہے وہی فیصلہ کرے گا ورنہ اگر سب کو برابر ایک درجہ میں اصل تسلیم کر لیا جائے تو کشمکش ہو جائے گی کشیدگی ہو جائے گی، جتنے اَفراد ہوں گے اتنی ہی رائیں ہونگی اور ہر شخص اصل ہوگا تو

اب فیصلہ کون کرے گا؟ فیصلہ کرنے والا تو ایک ہی ہوگا وہ اپنی صوابدید پر فیصلہ کرے گا جو اصل ذمّہ دار ہوتا ہے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر اس کی نظر ہوتی ہے پورے واقعات بھی اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ جو ہر وقت جہاں رہتا ہے جس کی ذمّہ داری ہوتی ہے اُسی کو آئندہ کا بھی ہر طرح خیال اور فکر ہوتا ہے۔

مشورے کا فائدہ :

وہ کسی اہم مسئلہ کے پیش آنے والے پر اہل الرائے سے مشورہ کرتا ہے تاکہ اس مسئلہ کے مضرت و منفعت کے مختلف پہلو سامنے آجائیں۔ ممکن ہے مشورہ میں کوئی ایسا پہلو نکل آئے کہ ذمّہ دار کا ذہن بھی ادھر نہیں گیا تھا۔

حضرت تھانویؒ کا جواب :

چنانچہ حضرت تھانویؒ کے زمانہ سرپرستی میں تھانہ بھون میں اہلِ شوریٰ آئے ہوئے تھے۔ تھانہ بھون میں ہی مشورہ ہو رہا تھا، حضرتِ والا کی سرپرستی کا مسئلہ تھا اس وقت ایک صاحب نے جنکا نام بتلانا نہیں چاہتا صاحبزادگی کی وجہ سے کہنے لگا کہ اگر سرپرست ہی کی رائے پر فیصلہ ہو تو پھر شوریٰ بیکار ہے۔ اس پر حضرت نے جواب دیا کہ نہیں شوریٰ بیکار نہیں ہے ایک شخص کسی امرِ اہم میں مشورہ کر رہا ہے اور اُس کے مختلف پہلو ہیں تو ممکن ہے اہلِ مشورہ میں سے کسی کا ذہن کسی پہلو کی جانب پہنچ جائے اور مشورہ لینے والا بھی اسی کو بہتر سمجھ کر اختیار کرلے تو اس طرح شوریٰ بیکار کہاں باکار ہوگی۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ فیصلے کا مدار شرعاً کثرتِ رائے پر نہیں ہے امیر کی صوابدید پر ہے۔ امیر کے لئے شوریٰ ہے اور ضرور ہونا چاہئے اس کا انکار نہیں لیکن فیصلے کا مرجع وہ ایک ہی ہے۔

مشورہ کا حکم :

قرآنِ پاک میں حکم ہے: وَ شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ۔ (سُورَۃ آلِ عِمرَان، پ۴)''
یعنی آپ اہم اُمور میں اہلِ رائے صحابہ سے مشورہ کرلیا کریں شَاوِرْ واحد حاضر کا صیغہ ہے یعنی آپ ﷺ مشورہ کیجئے !

یہاں خطاب اہلِ مشورہ کو نہیں ہے کہ آپ حضرات مشورہ دیجئے۔ حضورِ اکرم ﷺ کو حکم ہے کہ آپ اہم اُمور میں مشورہ کرلیا کریں۔ حالانکہ حضورِ اکرم ﷺ پر تو وحی آتی تھی اس کے باوجود اُمت کی تعلیم کے لئے آپ ﷺ کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔

اہلُ الرّائے سے مشورہ :

اور مشورہ لینے کا حکم انہیں سے ہے جو اہلُ الرّائے ہوں، معاملہ فہم حضرات ہوں، خیر خواہ ہوں، متقی پرہیزگار ہوں، ضِدّی قسم کے نہ ہوں، اپنی بات کے پیچ کرنے والے نہ ہوں، امیر کا مقابلہ کرنے والے اور اپنا حکم منوانے والے نہ ہوں۔

اہم اُمور میں مشورہ :

اور مشورہ اُن اہم امور میں ہوتا ہے جو منصوص نہ ہوں مثلاً نماز پڑھنا فرض ہے اب اس کے مشورہ کی ضرورت نہیں کہ نماز پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ اسی طرح جو چیزیں اہم نہیں اور عادتاً ضروری ہیں مثلاً کھانا کھانا ہے اب اِس کے مشورے کی ضرورت نہیں کہ بھائی مجھے بھوک لگ رہی ہے کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں۔

سب سے مشورہ لینا ضرُوری نہیں :

اور پھر مشورہ کے لئے ضروری نہیں کہ سبھی کو بلایا جائے۔ جیسا مسئلہ ہو اسکی

مناسبت سے وقتی طور پر جو اہل الرائے موجود ہوں اُن سے مشورہ کرنا کافی ہے۔

فیصلہ اَمیر کی رائے پر ہے :

پھر مشورہ میں اختلافِ رائے کی صورت میں فیصلہ کا مدار نہ کثرت پر ہے نہ قلت پر بلکہ اصل ذمہ دار کی صوابدید پر ہے' چونکہ قرآنِ پاک میں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشاورت ہونی چاہئے۔

شوریٰ ہونا چاہئے چونکہ قرآن میں فَاِذَا عَزَمْتَ فرمایا ہے: فَاِذَا عَزَمْتُمْ یا فَاِذَا عَزَمُوْا یا فَاِذَا عَزَمَ اَكْثَرُكُمْ اِذَا عَزَمَ اَقَلُّكُمْ نہیں فرمایا ہے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب مشورہ کے بعد آپ اپنی صوابدید سے ایک رائے قائم کرلیں چاہے وہ سب کی رائیوں کے خلاف ہو خواہ اکثریت کے خلاف ہو خواہ اقلیت کی رائے کے خلاف ہو پس پھر آپ اللہ پر بھروسہ کر کے جم جائیے اور اسی پر فیصلہ کر کے عمل کیجئے۔ اور اسکی بالکل پرواہ نہ کیجئے جن کی رائے کے خلاف فیصلہ ہے وہ کیا کہیں گے۔

آگے ارشاد فرمایا ہے : فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ توکّل باب تَفَعُّلْ سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کارساز تو میں ہی ہوں اور بلکلیہ مَحْمُوْدُ الصِّفَات ہوں اور اَكْمَلُ الذَّات ہوں اس لئے میرے اوپر بھروسہ کرنے کے بعد اس کی پرواہ مت کرنا کہ اکثر کیا کہہ رہے ہیں، کہیں برا نہ مان جائیں اس کا خیال مت کرنا۔

مقامِ صبر :

چونکہ نافع میں ہوں، ضار میں ہوں دافعِ مشکلات میں ہوں اس لئے صحابہ کرام کو مشکلات' دشواریوں اور پریشانیوں کی صورتوں میں جگہ جگہ فرمایا گیا ہے

فَاصْبِرُوْا جمے رہو ڈٹے رہو سہارا والے ہوتے رہو اِن مشکلات میں سے مشکل آپ ﷺ کے لئے ہجرت کی بھی کہ گھر چھوڑنا پڑا اور اسی گھر چھوڑنے میں دوسری مشکل اور دشواری تنگیٔ رزق بھی اب بھی اور بعد میں بھی تو ذاتِ باری تعالیٰ نے مسلمانوں کو قرآنِ پاک میں جگہ جگہ صبر و توکّل کی تعلیم دی ہے، تو توکّل میں جو مسئلہ آتا ہے وہ تنگیٔ رزق میں زیادہ آتا ہے اور ہجرت میں مکان چھوڑنے میں مقامِ صبر تو اپنی پوری عبادت اور اطاعت کے لئے کوئی مقام تلاش کرلو جہاں رُکاوٹ نہ ہو۔ اگر رکاوٹیں مانع ہوں تو ہجرت کا حُکم ہے اس جگہ کو چھوڑ دو۔ لیکن جب رُکاوٹ نہ ہو پھر حُکم نہیں مثلاً، بغیر ویزا کے باہر ملک نہیں جا سکتے۔ اگر نکل بھی گیا بلا ویزا کے تو طبعیت سکون میں نہیں ہے اطمینان نہیں ہے وہ کیا زندگی جو تشویش میں ہو سکون و اطمینان نہ ہو اسی لئے قرآنِ پاک میں جگہ جگہ صبر و توکّل کا بہت کچھ خطاب ہے۔

اُمورِ مشورہ طلب میں نفع و ضرر کے پہلو :

اُمورِ مشورہ میں نفع بھی ہے اور ضرر بھی۔ نفع غالب ہے اور ضرر مغلوب ہے ترجیح نفع کو ہے ضرر غالب ہے نفع مغلوب ہے ترجیح ہے ضرر کو۔ تو یہ بانی مبانی دیکھے گا منفعت مضرت کہ اسکی شکل کیا ہو، تو شوریٰ بیکار نہیں حُکم ہے وَشَاوِرْ حالانکہ آپ کو ضرورت نہیں ہے۔

نبی کو بھی مشورہ کا حُکم ہے :

جب حُکم ہے تو معلوم ہوا کہ بانی مبانی صرف اپنی ہی رائے پر نہ رہ جاوے کہ حضورِ اکرم ﷺ کو وَشَاوِرْ کہا گیا ہے تو اس کو بھی چاہئے ''کہ اُمورِ مشورہ طلب میں'' اہل الرائے سے مشورہ ضرور لیا کریں۔

اہل الرّائے ہم مشروب ہوں :

اہل شوریٰ مختلف الخیال نہ ہوں ہم مشرب ہوں۔کوئی ایک خیال کا اور کوئی دوسرے خیال کا، کوئی تیسرے خیال کا اس طرح کشمکش ہو جاتی ہے جس کام کے متعلق مشورہ ہے اس کام کے جاننے والے پہچاننے والے ہوں نہ یہ کہ فلاں شخص دولت مند ہے اس کے ساتھ بہت سے لوگ ہیں اس کو مقرر کرلو اگر چہ وہ اُس کام کو جانتا تک بھی نہیں۔

اہلِ مشورہ ہونے کے لئے صاحبِ مال یا صاحبِ ریاست ہونا کافی نہیں :

وہ اپنی جگہ پر قابل ہوگا مگر جس کام کے لئے شوریٰ مقرر کرنا چاہتے ہیں اس کام کے لئے وہ قابل نہیں ہے اپنی جگہ وہ قابل نہیں ہے جو صاحبِ ریاست ہے صاحبِ دولت ہے صاحبِ ثروت ہے چنانچہ جب حضور اکرم ﷺ سے رؤسائے مکہ نے کہا کہ ہم حاضر ہونا چاہتے ہیں مگر یہ غریب غرباء نہ ہوں وہ اُٹھ جایا کریں۔آپ ﷺ نے خیال فرمایا کہ یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں اور اگر رئیسوں سے اگر کوئی ایمان قبول کر لیں تو اہلِ ایمان میں ایک رونق آجائے گی۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے رونق نہیں بلکہ کمالِ ایمان اور اطاعتِ کاملہ سے رونق ہے۔قرآن میں ہے:

''اُن کو نہ ہٹا دیجئے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں صبح وشام''

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ .... الخ (سُورَةُ الكهف،۱۵)

آپ اُن میں جم کر بیٹھیے اُن کو ہٹا کر نہیں۔اِس سے رونق نہیں کہ صاحبِ

دولت وثروت ہے، لوگوں کے اِس کی طرف رجوعات ہیں عوام کا طبقہ اِس کی طرف زیادہ لگا ہوا ہے اور اثر دار ہے لہٰذا شریک کرلو اِس سے بہت امداد ملے گی چندوں میں آسانی ہوگی دوسروں پر اثرات ہوں گے اس کے ساتھ بہت سے لگے ہوئے ہیں ایک جماعت اس کے ساتھ ہے حالانکہ جن معاملات میں شوریٰ کی ضرورت ہے وہ اُس کا اہل نہیں ہے وہ جانتا بھی نہیں ہے۔ اسی لئے دیوبند میں ایک شیخ زادے رئیس نے دارالعلومِ دیوبند میں ممبر ہونا چاہا۔ بعض دوسرے حضرات نے بھی چاہا کہ ان کو ممبرِ شوریٰ بنالیا جائے مگر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ آپ سرپرست تھے مانے ہوئے تھے مسلّم تھے اس پر شور ہوگیا۔ اس وقت رئیسوں کی بہت چلتی تھی بڑا اقتدار حاصل تھا لہٰذا شور مچ گیا ان کو مقرر نہ کرنے پر اب پھر بار بار کہا جارہا ہے مولانا صاحب سے لیکن وہ ایسے مستقل مزاج ہیں کہ فرمایا ہرگز نہیں! وہ کیا جانیں اُن چیزوں کو جن میں مشورہ لیا جائے گا۔ وہ کیا مشورہ دیں گے۔ یہ علمی ادارہ ہے پڑھنے والے اہلِ علم پڑھانے والے اہلِ علم بانی مبانی مہتمم وغیرہ سب اہلِ علم۔ اِس ادارے کے بارے میں وہ کیا رائے دیں گے۔

بعض نے عرض کیا کہ حضرت ہم سب تو ہم مسلک ہیں ہم مشرب ہیں ہم مشورہ ہیں۔ اگر رکھنے کے بعد اس نے اختلاف کر بھی لیا تو اس کے اختلاف سے ہم سب کے متفق ہونے کی صورت میں کیا ہوسکتا ہے، فرمایا کہ وہ نااہل ہے اس کام کو جاننے والا نہیں اہل کو لینا ہے اور وہ اہل نہیں ہے اگرچہ وہ دنیوی جاہ میں بڑا اہل ہے، فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم سے پوچھا کہ نااہل کو کیوں مقرّر کیا تو کیا جواب دوں گا اور گر ان کو نہ لینے سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے مدرسہ کے اندر فساد آتا ہے مدرسہ بند ہو جاتا ہے تو ان سے سوال ہوگا ہم سے سوال نہیں ہوگا بگاڑ انہوں نے کیا ہم نے نہیں۔

بجائے شوریٰ کے سرپرست کی صوابدید پر فیصلہ ہو :

اس سے معلوم ہوا کہ اصل مرجع وہ ایک ہے بانی مبانی سرپرست وہ ایک ہے اصل شوریٰ نہیں ہے۔ ورنہ شوریٰ کہہ دیتی کہ بہت اچھا ہم آپ کو سرپرست نہیں رکھتے کیونکہ ہم سارے کے سارے ایک طرف ہیں اور آپ دوسری طرف لیکن شوریٰ نے آپ کو یہ نہیں کہا اور آپ کو الگ بھی نہیں کیا۔

ایک مرتبہ مظاہر العلوم کے معاملہ میں ایسا ہوا کہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ وہاں کے بھی سرپرست تھے وہاں آپ نے فرمایا کہ اب تم میری یہ بات نہیں مانتے تو میں الگ ہوتا ہوں پھر لگے خوشامد کرنے آپ نے فرمایا کہ جیسا میں کہوں ویسا کرو گے سب نے اقرار کیا تو اصل کون ثابت ہوا؟ شوریٰ یا بانی مبانی۔

ایک عمومی اشکال :

اگر بانی مبانی ایسا نہیں ہے تو شوریٰ تو ایک جماعت کا نام ہے ان میں کتنے ایسے ہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کشمکش کشیدگی زیادہ ہے۔ تقویٰ پر اگر جانچا جائے تو پورا اُترنا بہت مشکل ہے۔ تو جس طرح صاحبِ تقویٰ نہ ہونے کا اشکال امیر کے بارے میں کیا جاتا ہے اسی طرح بعینہٖ یہی اشکال اہلِ شوریٰ کے بارے میں بھی موجود ہے بلکہ یہاں زیادہ ہے اس لئے یہ اشکال کرنا کہ اب ایسے متقی پرہیزگار، دیانتدار کہاں ہیں صحیح نہیں ہے۔

اہلِ شوریٰ کے اتفاق کی صورت میں بھی فیصلہ امیر کی رائے پر :

اور اسی سے معلوم ہو گیا کہ بالاتفاق سب حضرات اس شیخ زادہ صاحب کے

موافق تھے اور سب نے عرض کیا تھا کہ رکھ لیا جائے۔ لیکن ایک واحد سرپرست حضرت گنگوہیؒ ہی خلاف تھے۔ معلوم ہوا کہ اکثریت کی بات تو کیا بلکہ شوریٰ کسی بات پر متفق بھی ہو جائے اور بانی و سرپرست نے باوجود اس اتفاق ہونے کے تسلیم نہیں کیا اس سے معلوم ہوا کہ شوریٰ متفق ہو کر کسی بات پر تب بھی فیصلہ امیر ہی کی رائے پر ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی موقع پر سب متفق ہو جائیں اور امیر بھی اسی کو صحیح اور دُرست سمجھے اور سب ہی کی رائے کے مطابق ہی فیصلہ کردے۔

لیکن اگر امیر تمام اہلِ شوریٰ کی رائے کے خلاف ہی فیصلہ کردے تب بھی اہلِ شوریٰ کو ناراض ہونے کا حق نہیں ہے۔ خلاف میں کھڑے ہونے کا حق نہیں ہے۔ انتشار پیدا کرنے کا حق نہیں ہے۔ مگر افسوس کہ آجکل حال اس کے بالکل خلاف ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب :

ابتدائی زمانہ ہے رسول، پاک ﷺ کی وفات شریف ہوگئی، ابھی آپ دفن نہیں ہوئے فکر ہوئی کہ کوئی امیر ہونا چاہیئے جس کی نگرانی میں سارے کام ہوں۔ وہ خلافت کے کام کو سنبھالے کوئی قائم مقام ہو جانا چاہیئے، کوئی خلیفہ ہونا چاہیئے۔ دیر لگی دفن میں نہیں لگی؟ مشورے ہو رہے ہیں مختلف رائیں آرہی ہیں اس حال میں حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ آپ سے زیادہ حقدار کون ہے؟ اِذْ هُمَا فِي الْغَار آپ ہی اس منصب کے لائق ہیں۔ لہٰذا ہاتھ لایئے حضرت عمرؓ نے بیعت کرلی، سب حضراتِ صحابہ کرامؓ نے بیعت کرلی۔ سب اصلاح شدہ تھے کوئی کشمکش کی بات نہیں ہوئی، اب وہ خلیفہ ہوگئے تو تمام کام آپ کی صوابدید پر انجام پائے اور سب حضراتِ صحابہ کرامؓ نے اپنی رائے پیش کرنے کے بعد ہمیشہ آپ کے فیصلہ کو تسلیم کیا۔

عزلِ امام کا حکم :

فقہ کا مستقل مسئلہ ہے کہ امام منتخب ہونے کے بعد جب تک اس سے کھلے طور پر کبائر کا مسلسل ارتکاب نہ دیکھو اس کو الگ مت کرو ورنہ شور ہو جائے گا فساد مچ جائے گا فتنہ ہو جائے گا اور مسئلہ امامت کا کھیل بن جائے گا۔ فتنہ وشور ہو جائے گا۔ امام ہی کا حق ہے کہ نماز پڑھائے۔ اب وہ تاخیر سے آتا ہے کراہیتِ وقت کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔ اسی کا انتظار کرو۔ تم میں سے کوئی امام بن کر نہ کھڑا ہو جاوے۔ وہ امام ہے امیر ہے کہیں فتنہ کھڑا نہ ہو جائے۔

شریعت فتنہ کو گوارا نہیں کرتی :

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (سورۃ البقرہ۔پ۲) شریعت قتل کو تو گوارہ کر رہی ہے فتنہ کو گوارہ نہیں کرتی۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو بڑی جماعتیں نکلیں تو کچھ لوگ مُرتد بھی ہو گئے کچھ مانعینِ زکوٰۃ بھی ہو گئے۔ اُدھر ایک جماعت حضرت اُسامہؓ کی جہاد کے لئے جا رہی ہے۔ حضرت اُسامہؓ کو حضور اکرم ﷺ نے اپنی حیات میں ہی جھنڈا دیکر روانہ کیا تھا۔ کشمکش پڑ گئی حضرت ابوبکر صدیقؓ فرما رہے ہیں کہ اگر ایک رسّی بھی زکوٰۃ کی نہ دے گا تو میں اُن سے بھی جہاد کروں گا۔

حضراتِ صحابہ کرامؓ کی رائے مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کی نہیں تھی۔ جیشِ اُسامہؓ کو بھی روک لینے کا مشورہ تھا مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی کی رائے نہیں مانی اور تمام اہلِ شوریٰ کی رائے کے خلاف مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح جیشِ اُسامہؓ کی روانگی کا فیصلہ کیا اور اسی پر مظبوطی سے جمے رہے اور سب حضراتِ صحابہ کرامؓ نے آپؓ کا فیصلہ تسلیم کر لیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آج کل اکثریت کی چلتی ہے اِس پر حضرتِ والا فرمایا کرتے تھے کہ اکثریت کی رائے پر فیصلہ کیا جائے یہ تو یہ غیر مسلموں کا شیوہ ہے، یہ شریعت کا اُصول نہیں ہے اور شریعت کے احکام دائمی ہیں قیامت تک کے لئے ہیں کسی محدود زمانہ تک کے لئے نہیں ہیں۔ اور جب قرآنِ پاک، احادیث اور صحابہ کرامؓ سے یہ ثابت ہے کہ فیصلہ امیر کی رائے پر ہے تو پھر آج کل کے زمانہ والوں کی وجہ سے شرعی اصول کو جو دائمی ہیں کس طرح بدلا جاسکتا ہے.............؟

احکامِ شرعیہ دائمی ہیں :

ہمارے اکابر کا یہ عمل رہا ہے کہ فیصلہ ایک کی رائے پر رہا ہے اور اگر اس ایک امیر، سرپرست کی رائے کو نہیں مانا گیا اختلاف کیا گیا تو ایسے حال میں وہ خود الگ ہو گئے یکسوئی اختیار کر لی کسی قسم کا فتنہ نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ حضرتِ والا نے اپنی سرپرستی کے بارے میں.........

حضرت حکیم الاُمّتؒ کی سرپرستی سے معذرت :

فرمایا کہ جب تم ہماری بات مانتے نہیں تو پھر اس سرپرستی سے کیا فائدہ ہے ہم الگ ہوتے ہیں۔ تم کرو جو کچھ کرنا چاہتے ہو۔ اس لئے نہیں کہ میں تم کو الگ نہیں کر سکتا مگر فتنہ سمجھتا ہوں۔

حالاتِ شوریٰ کا اندازہ ہو گیا تھا کہ شوریٰ کے حالات ایسے ہیں۔ جب ان کے ایسے ہیں تو اور جو نئی شوریٰ رکھی جائے گی ان کے حالات تو اور کہیں زیادہ شورش کے ہونگے نہ ماننے کے ہوں گے، اپنی رائے کو چلانے کے ہوں گے چونکہ ان کا زمانہ تو پھر بھی بزرگوں کے زمانے سے قریب ہے انھوں نے بزرگوں کا زمانہ پالیا ہے اور

جن کو اب اہلِ شوریٰ مقرّر کیا جائے گا وہ تو اور بھی بعد کے ہیں۔ ان کا زمانہ تو حضور ﷺ سے اور بعد کا ہے اور جتنا زمانہ رسول اللہؐ کے زمانے سے بعد کا ہوتا چلا جائے گا برکت اُٹھتی چلی جائے گی۔

باسی روٹی کی قیمت زیادہ :

ایک نان بھائی یعنی بھٹیارہ تھا جب کوئی شخص اس کے پاس روٹی لینے آتا کھانا لینے آتا تو وہ پوچھتا تھا کہ آپ باسی کھانہ لینا چاہتے ہیں یا تازہ کھانہ۔ اگر تازہ کھانا لینا چاہو تو اسکی قیمت کم ہے اور باسی کھانا رات کا کھانہ لینا چاہو تو اس کی قیمت زیادہ ہے۔

لوگوں نے کہا کہ بھائی یہ کیسی بات ہے کہ آپ تازہ کھانے کی قیمت کم اور باسی کھانے کی قیمت زیادہ لیتے ہیں؟ یہ تو عقل کے بالکل خلاف ہے!

اس پر نان بھائی کہتا کہ رات کے کھانے کے زمانے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے زیادہ قرب حاصل ہے اور یہ تازہ کھانا رسول اللہؐ کے زمانے سے ایک رات بعد کا ہے۔ جو برکت اس باسی کھانے میں ہے تازہ کھانے میں نہیں۔ لہٰذا باسی کھانے کے دام زیادہ اور تازہ کے کم ہیں۔

فِی الامر سے مرادامرِ مہم ہے :

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ بتلا رہا ہے کہ جو امرمہم ہے اس میں مشورہ کیا جاتا ہے اور مشورہ کرنے کا حکم امیر کو ہے۔ لفظ شاور بتلا رہا ہے کہ اہل الرائے سے مشورہ کیا جائے نہ کہ ہر کس و ناکس سے۔ لفظ ھم بتلا رہا ہے کہ وہ حضرات جن سے مشورہ لیا جائے دیندار ہوں، خیر خواہ ہوں، معاملہ فہم ہوں، مخلص ہوں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ :

حضرت سُلیمانؑ نے دیکھا کہ ہُد ہُد غائب ہے تلاش کرائی کہ کہاں چلا گیا؟ اگر اس نے صحیح صحیح غیر حاضری کی وجہ نہ بتلائی تو اس کو میں سزا دوں گا ذِبح کر دوں گا۔ خیر ہُد ہُد آ گیا اس نے بتلایا کہ میں ایسی معلومات لے کر آیا ہوں، ایسی حکومت دیکھ کر آیا ہوں جس کی آپ کو خبر بھی نہیں۔ ایک عورت ہے اس کا نام بلقیس ہے مشرکہ ہے حکومت کر رہی ہے اسکی خبر لے کر آیا ہوں۔ معلوم کیا تو واقعی ایسی ہی حکومت ہے۔ ہُد ہُد کو چھوڑ دیا گیا یعنی اس نے زرّہ زرّہ جو کچھ کہا تھا ٹھیک ہے۔ اب سُلیمانؑ نے اطلاع کر دی ہدایت و تبلیغ قبول کرو شرک کو چھوڑ دو ورنہ پھر جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ۔

بلقیس کی شوریٰ کا واقعہ :

بلقیس نے شوریٰ جمع کر لی ارکانِ سلطنت جمع کر لئے کہ یہ اطلاع آئی ہے تم کیا کہتے ہو؟ شوریٰ نے کہا ہم قوت والے ہیں زور آور ہیں پُرانے جنگ آزماء ہیں ہم تیار ہیں۔ قرآنِ شریف میں ہے : قَالُوْا نَحْنُ اُولُوا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ○ (سُورۃ النمل۔پ۔۱۹)

لیکن معاملہ آپ ہی کی رائے پر ہے۔ معلوم ہوا کہ حاکمانہ اختیار یہ شوریٰ کو نہیں بلکہ امیر کو ہے، اصل حاکم کو ہے۔

سلوک کا مسئلہ :

اگر شیخ کو ضرورت پڑے گی مشورہ کر لے گا اپنے کسی مرید کے بارے میں

اپنے بارے میں۔ مسئلہ یہ ہے کہ شیخ کو بھی اگر ضرورت ہو اور اپنا شیخ نہ ہو تو اپنے خلفاء میں سے جس سے بے تکلفی ہے اس سے مشورہ کر لے۔ جب اس سے مشورہ کیا تو یہ نہیں کہ صاحب آپ نے تو مجھ سے مشورہ کیا تھا اور پھر بات ہی نہیں مانی۔

حضرت بریرہؓ کا واقعہ :

حضرت بریرہؓ کا نکاح ہوا وہ کسی کی باندھی تھی آزاد ہوگئی تھی۔ آزاد ہونے کے بعد اختیارِ نکاح میں رہنے کا یا نہ رہنے کا ہوتا ہے۔ اپنے اختیار کو اپنے کام میں لائی اور الگ ہوگئی۔ حضرت مغیثؓ کو رنج ہوا محبت تھی۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا حضرت بریرہؓ کو بلایا، فرمایا دیکھو وہ بہت رنجیدہ ہیں لہٰذا رجوع کر لو !

حضرت بریرہؓ نے فرمایا کہ یہ امر ہے یا مشورہ؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مشورہ ہے! حضرت بریرہؓ نے عرض کیا کہ حضور اگر یہ حُکم نہیں ہے مشورہ ہے تو مجھے منظور نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مشورہ کا قبول کرنا ضروری نہیں۔ اگر ضروری ہوتا تو صحابہ کرامؓ کے لئے نبی اکرم ﷺ کے مشورہ سے زیادہ کس کا مشورہ اہم ہوگا۔

طالب علمی کا واقعہ :

جب میں دار العلوم میں پڑھتا تھا۔ چار سال حاضری رہی وہاں، تو حضرت والا کو میری محنت کے متعلق معلوم ہو گیا تو حضرت والا نے فرمایا کہ اس وقت آپ اس قدر محنت کرتے ہیں کیا صرف یہی زمانہ طالبِ علمی کا ہے اصل زمانہ طالبعلمی کا تو فارغ ہونے کے بعد شروع ہوگا۔ جب ایسا جملہ فرمایا کہ طالبِ علمی کیا یہی ہے تو مزاج طالبِ علمانہ ہو گیا۔ حضرت والا کے بعض خلفاء یہاں تشریف لائے انہوں نے بندہ کا

یہ طریقہ دیکھا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ تو بہت ہی بے تکلفی سے رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں کیا کروں میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے اب اسمیں کیا تبدیلی آئے گی۔

حضرت والاؒ کو بھی بندہ کی نرم مزاجی کا طریقہ معلوم تھا چنانچہ بعض حضرات نے عرض کیا کہ حضرت مسیح اللہؒ کا طریقہ تو بہت ہی نرم ہے اور مولانا عیسیٰ صاحبؒ جن کا انتقال ہو چکا ہے ان کے لئے عرض کیا کہ ان کا طریق گرم ہے۔ تو اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ارے بھائی کوئی گرم ہے کوئی نرم ہے کسی کا مزاج گرمی سے ٹھیک ہوتا ہے کسی کا نرمی سے۔

سلوک نہایت لطیف ہے :

بیعت ایک کھیل ہو کر رہ گئی ہے۔ حضرت والاؒ فرمایا کرتے تھے اتنے عرصہ کے بعد تو سلوک کی حقیقت واضح ہو گئی اور کُھلی کہ سلوک کیا چیز ہے اس کو پھر لوگ بگاڑنا چاہتے ہیں۔ اور فرمایا کہ سلوک نہایت لطیف چیز ہے کیسی لطیف خود ہی فرمایا جیسا کہ روح لطیف ہے۔ پھر فرمایا کہ کس کی روح؟ فرشتے کی روح ایسی لطیف ہے۔

حضرت حکیم الاُمّت کی نرم مزاجی :

نرم مزاجی اور رفق اس درجہ کی تھی کہ اظہارِ ناراضگی طالبِ تربیّت سے تھی جبکہ پریشان کر رہا ہے اور بار بار سمجھانے پر فرمائش پر نہیں مان رہا ہے تو اظہارِ گرانی ہوتی تھی ورنہ حضرت تو بچوں کی سی باتیں کرتے تھے اور بہت نرم طریقہ سے باتیں کرتے تھے۔

حکیم الاُمّتؒ کا رات کو اُٹھ کر تعویذ دینے کا واقعہ :

حضرت والاؒ کو کسی پڑوسی کے کراہنے کی آواز آرہی تھی اپنے مُلازم سے فرمایا

کہ دیکھو کہ کراہنے کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ وہ گئے اور کہا کہ حضرت بڑی بی بی آئیں تھیں اُنہوں نے کہا کہ میرے بیٹے کی بیوی کا دردزہ ہو رہا ہے۔ ادھر آپ کو تو نہانے کی بھی ضرورت تھی۔ اسی وقت غُسل کیا اور تعویذ دردزہ لکھا اور مُلازم کو کہہ دیا کہ جا کر دیدو۔ بڑی بی بی سے کہہ دینا کہ بائیں ران پر باندہ دیں اور جب بچّہ پیدا ہو جائے تو فوراً کھول دینا۔ فضلِ الٰہی سے حضرت والا کی برکت سے بچّہ پیدا ہو گیا۔ کتنی نرمی تھی حضرت والا کے مزاج میں.........۔

سلوک کا موضوع :

اصلاح، سلوک صرف وظیفوں کا اور نفلوں کا نام نہیں ہے۔ اخلاقِ رذیلہ جو کہ امالہ ہے دور کرنا اور اخلاقِ محمودہ کا پیوست ہو جانا راسخ ہو جانا ملکہ ہو جانا جنکا تعلق قلب سے ہے۔ اخلاقِ ذمیمہ کا تعلق ہے نفس سے۔ یہ موضوع ہے سلوک کا' وظیفے موضوع نہیں ہیں اخلاق موضوع ہے۔ تو اخلاق مؤمن کے لئے پہلی چیز ہے۔

لوٹا گرنے کا واقعہ :

گھر کا دیکھئے کہ بیمار ہیں۔ اسہال یعنی دستوں کا مرض ہے۔ بیاسی برس کی عمر ہوگئی ہے۔ کتنی مدتوں سے بیمار ہیں، صاحبِ فراش ہو رہے ہیں، اسہال کا مرض کمزوری رات کو کچھ قراقر سا ہوا دست کی حاجت ہوئی بیت الخلاء چلے گئے دست ہو گیا۔ استنجے کے بعد باہر صحن تشریف لائے غشی آ کے صحن میں گر پڑے ہوش آیا اُٹھ گئے چارپائی پر جا کر لیٹ گئے۔ لیٹے لیٹے یاد آیا کہ میرے ہاتھ میں لوٹا تھا جو صحن میں گر گیا اگر گھر میں کسی کی آنکھ کُھلی۔ بیت الخلاء وغیرہ جانا ہوا تو لوٹا کہاں تلاش کرتا پھرے گا۔

پریشانی ہوئی، چارپائی سے اُٹھے اور لوٹے کو اُٹھا کر اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

جہادِ نفس :

تو پہلے نفس سے جہاد ہے۔ اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ یہ بڑا جہاد ہے مَامُور بِهَا ومَنھِی عَنھَا ظَاھِرَہ کا تعلق شریعت سے ہے اور مَامُور بِهَا ومَنھِی عنھَا بَاطِنَہ کا تعلق اخلاق سے ہے۔ مَامُور بِهَا اخلاقِ محمودہ میں اور مَنھِی عَنھَا اخلاقِ ذمیمہ میں ہیں۔

مرید کا اوّل قدم فناء کا ہے :

اوّل قدم فناء کا ہے۔ مولانا عبدالباری صاحبؒ فرنگی محلہ کے صاحبزادے نے کہا، حضرت ہم نے تو اب تک یہ سُنا تھا کہ آخری قدم فناء کا ہے......؟ فرمایا ہاں! لیکن میرے یہاں تو اوّل قدم فناء کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک فناء نہیں تو آگے کیا قدم بڑھے گا۔ اس لئے فرمایا کہ اوّل قدم میرے یہاں فنا کا ہے۔ یہ چیز ہے خارج کے مؤثرات سے۔ متأثر ہونے سے طبیعت کو روکنا۔ جس طرح مدرّس طالبِ علم کا امتحان لیتا رہتا ہے اسی طرح شیخ کو بھی حق ہوتا ہے وہ بھی اندازہ کرتا رہتا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کا واقعہ :

چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت حاجی صاحب کے پاس تھانہ بھون تشریف لائے۔ کُرتا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں ایک تہبند لئے ہوئے ہیں۔ آئے تو تھے مولانا شیخ محمد صاحبؒ سے ایک مسئلہ میں گفتگو کے لئے مگر پہلے پہنچے حاجی صاحب کی خدمت میں خانقاہ۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے دریافت کیا کہ صاحبزادہ کیسے آنا ہوا تو

مولانا نے عرض کیا' مولانا شیخ محمد صاحب سے ایک مسئلہ میں گفتگو کے لئے آیا ہوں۔ اِس پر حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ مولانا شیخ محمد صاحب ہمارے بڑے ہیں اس طرح اُن سے گفتگو کرنا خلافِ ادب ہے۔

عرض کیا بہت اچھا اب نہیں کروں گا۔ خانقاہ میں رہ گئے جب جمعہ آیا کپڑے دھو کر صاف پہن لئے۔ خانقاہ میں قیام ہو رہا ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ ''بھائی اتنے دن ہو گئے کب جاؤ گے.........؟''

''جی حضرت جاؤں گا !'' ایک دن مکان سے کھانہ آیا۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ مولوی صاحب آج ہمارے ساتھ کھانا کھالو۔ آپ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ دو سالن تھے ایک دال اور ایک گوشت۔ گوشت کا برتن تو حاجی صاحب نے رکھا اپنی طرف اور دال کا برتن رکھا مولانا گنگوہی کی طرف۔ کھانا کھا رہے ہیں۔ حافظ ضامن صاحب اپنے حجرہ سے باہر نکل آئے دیکھا کہ آج تو صاحبزادے کو اپنے ساتھ حاجی صاحب کھانا کھلا رہے ہیں لیکن حاجی صاحب یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اپنی طرف گوشت اور اِن کی طرف دال کا برتن رکھا ہوا ہے۔ تو حاجی صاحب نے فرمایا ''یہ غنیمت ہے کہ میں اپنے ساتھ اِن کو کھانا کھلا رہا ہوں ورنہ یہ تو اس قابل تھے کہ بھنگی کی طرح سے ان کی ہاتھ میں یہ کھانا رکھ دیتا اور کہتا کہ جا کھاتا پھر''۔

مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ جب حضرت حاجی صاحبؒ یہ فرما رہے تھے تو میرا دل اندر سے یہی کہہ رہا تھا کہ بالکل صحیح فرما رہے ہیں کہ میں تو اسی قابل تھا، یہ تو حضرت والاؒ کا کرم ہے اور حاجی صاحب یوں.........کنکھیوں سے آپ کا چہرہ دیکھ رہے ہیں کہ چہرہ پر کوئی اثر تو نہیں آیا۔ یہ امتحان ہے حضرت گنگوہیؒ کے چہرہ پر

الحمدُ لِلّٰہ کوئی اثر نہ تھا اور ان کا دل کہہ رہا تھا کہ واقعی تو تو اسی قابل تھا جیسا کہ حضرت حاجی صاحب فرما رہے ہیں۔ یہ تو اِن کا کرم ہے کہ اپنے ساتھ کھانے پینے بٹھا لیتے ہیں۔ بس امتحان ہو گیا فنائیت کا۔

اگر شیخ کی بات پر بھی اثر لیتا ہے تو باہر دوسرے کی بات کا کتنا اثر لے گا۔ چونکہ جب شیخ کی بات کا بھی اثر لیتا ہے گرانی ہوتی ہے طبیعت میں جا کر چہرہ سے ظاہر ہو رہا ہے تو معلوم ہوا کہ ابھی اصلاح نہیں ہوئی، اصلاح ہونا کھیل نہیں ہے۔

حضرت مرزا جانِ جاناںؒ کا واقعہ :

حضرت مرزا جانِ جاناںؒ کا واقعہ ہے کہ ان کے خادمِ خاص غلام علی شاہؒ حضرت مرزا صاحب کو پنکھا جھل رہے تھے ہلکا ہلکا تو اس پر فرمایا ارے کیا تیر ہاتھ میں جان نہیں ہے اس پر انہوں نے زرا زور سے جھلنا شروع کیا تو فرمایا کہ کیا مجھے اُڑا ہی دے گا۔ اس پر غلام علی شاہ نے نہایت دبے ہوئے لہجے میں آہستہ سے کہا "نہ یوں بن پڑے نہ یوں بن پڑے.........."۔

حضرت مرزا صاحب کے کانوں میں آواز آئی، مرزا صاحب نے فرمایا کہ "پنکھا یہاں رکھ دو اور خانقاہ سے باہر نکل جاؤ"۔

حضرت غلام علی روتے ہوئے پھر رہے ہیں اور خوشامدیں ہو رہی ہیں۔ بالآخر بلوا لیا حقیقت کُھل گئی۔ ایسا کیوں ہوا.........؟

ایسا اِس لئے ہوا کہ جب یوں کہا کہ کیا تیرے ہاتھ میں جان نہیں، اور اب زور سے کہا کہ کیا مجھے اُڑا ہی دے گا تو تبیعت میں اس کہنے کا ایک اثر ہوا ایک چنگاری آ گئی تیزی کی گرانی کی بار بوجھ پڑنے کی۔ زُبان ترجمان ہے دل کی۔ زُبان نہ رُک سکی

اور زبان پر لے آئے معلوم ہوا کہ گرانی ہوگئی تھی کچھ کراہیت سی ہوگئی تھی۔ شیخ سمجھ گئے کہ میرے اس کہنے پر ان کی طبیعت میں ایک انگارہ آگ کا تیزی سے بھڑک کر شعلہ نہیں آیا تو چنگاری تو آگئی۔ جب شیخ کی اس بات پر گرانی آئی تو باہر نکل کر کسی دوسرے کی طرف سے طبیعت کے خلاف کوئی بات اس کے سامنے آئے گی تو لڑمرے گا۔

حضور بحق :

اللہ کے حاضر وناظر ہونے کا اعتقاد ہے۔ اس کے مطابق معاں تو حضور بحق ہے۔ ہر وقت اِس فنائے تام کے آثار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنی میں اخلاص کے ساتھ فنائے تام کی توفیق عطاء فرمائے۔ (آمین)

☆

چوبیسویں مجلس

اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثار

۱۴ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ۔ بروزِ بدھ

اِتفاقی اَمر اُصول نہیں :

خلافِ اُصول اور خلافِ طریقہ کسی کام کے کرنے سے اس کام میں کامیابی ہو جائے تو وہ ایک وقتی چیز ہے اُصول نہیں وہ مسئلہ نہیں ہے۔

حکمتِ الٰہی :

اللہ تعالیٰ حکیم وقدیر اور علیم ہے اسلئے اتفاقاً ایسا ہوسکتا ہے کہ طریقہ تو اختیار کیا تھا غلط مگر اُس سے نقصان نہیں ہوا، یہ اتفاقی بات ہے ظاہری اسباب پر نظر رکھنے والا تو اس سے حیرت زدہ ہو جائے گا مگر جو حکمت اور مصلحت کا قائل ہے اس کے لئے کوئی استیعاب نہیں۔ چونکہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ بندوق چلے اور نہ مرے، ایسا ہوتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بندوق کا نام بھی نہیں ہے اور مر گیا کہ بس ذرا سی بات

سُنی اور برداشت نہیں ہوئی اور حرکتِ قلب بند ہوگئی اور مرگیا۔ اب وہ قوی قلب والا تعجب کر رہا ہے کہ بھلا ایسی کیا بات ہوئی تھی۔

ایک کو دوسرے پر قیاس نہ کرو:

اس لئے ایک عمل کو دوسرے پر قیاس نہیں کر سکتے کہ جُداگانہ طبیعت اور جُداگانہ عادت اور جُداگانہ دماغ ہوتے ہیں۔ پھر یہ قیاس کیسا جس کو قِیَاس مَعَ الفَارِق کہتے ہیں۔ چنانچہ اگر حضرت امام ابوحنیفہؒ اخیر عمر میں تمام رات جاگتے رہے تو اِس کے معنی یہ نہیں کہ میں بھی اِس عمر میں تمام رات جاگتا رہوں میں بھی شوقین بن جاؤں۔

قِیَامُ الَّیل:

حق تعالیٰ نے خود اختیار دے دیا ہے سُورَۃُ المُزَمِّل میں یَا اَیُّها المُزَمِّل قُمِ الَّیل اب قُمِ الَّیل کے معنی یہ کہ "تم رات بھر کھڑے رہو اے چادر کے اوڑھنے والے" یہ محبانہ انداز ہے کہ آپ ﷺ لیٹے ہوئے تھے چادر اوڑھ کر۔

قُمِ الَّیل کھڑے رہو رات بھر، اور آگے فرمایا: اِلَّا قَلِیْلاً "مگر تھوڑی سی رات" اگر آگے کچھ نہ ہوتا تو آپ ﷺ تمام رات کھڑے رہتے۔ آگے فرمادیا: اِلَّا قَلِیْلاً مگر تھوڑا۔ اب تھوڑا کتنا کہ ہر ایک کا اندازہ الگ الگ ہے۔ تو فرمادیا کہ نِصْفَهٗ "آدھی رات تک"۔ اب اگر کسی شخص میں نہیں ہے آدھی رات کھڑے رہنے کی عادت تو آگے ارشاد ہوتا ہے۔ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلاً "آدھی رات یا اس سے بھی کم" اب کوئی کہہ دے کہ میں تو زیادہ جاگنا چاہتا ہوں تو فرمایا کہ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ "یا اس سے زیادہ"۔ تو اختیار دے دیا اور تعیّن اُٹھ گیا۔ تو کتنا کرم ہے اس کا اگر پوری رات کے

لئے فرمادیتے تو فرماسکتے تھے اور آدھی رات کے لئے فرماتے تو فرماسکتے تھے۔ مگر ایسا نہیں فرمایا چونکہ وہ جانتے ہیں کہ عمل کرنے والوں کی قوتیں اور فرصتیں جُدا جُدا ہیں۔

اِس لئے اِس بارے میں اختیار دے دیا گیا لہٰذا اب پوری رات جاگنے والا دوسرے شخص کو یوں نہیں کہہ سکتا کہ آپ پوری رات کیوں نہ جاگتے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آزادی دی ہے تو اس کو کون مقید کرسکتا ہے۔

اب آگے فرمایا ! وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلًا ''یعنی قرآنِ پاک کی آیات سنبھل سنبھل کر پڑھو'' ٹھر ٹھر کے ایک ایک حرف پورا پورا موتی سا ٹلا ہوا صاف صاف ادا کرتے ہوئے تلاوت کریں۔

تہجّد سنّتِ مؤکدہ ہے :

علاّمہ شامی نے لکھا ہے کہ تہجد سُنتِ مؤکدہ ہے اور فقہائے محققین کی بات تسلیم کرنی پڑتی ہے اور حضرت والا مولانا تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ..........!

فقہاء وصوفیاءِ محققین :

دو ہی تو جماعتیں ہیں اسلام میں ایک فقہائے محققین اور دوسرے صوفیائے محققین۔ تو بعض فقہاء نے تہجّد کو سُنتِ مؤکّد لکھا ہے۔ شامی میں یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مشائخ نے فرمایا ہے کہ عشاء کے وقت ہی وتر کے بعد چار رکعت تہجّد کی نیّت سے پڑھ لیا کرو اور ارادہ رکھو آخر میں پڑھنے کا۔ مگر عشاء کے وقت تو احتیاطاً پڑھ لیا کرو کہ بعض نے سُنتِ مؤکدہ لکھا ہے اور جو ایسی چیز ہے اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ارادہ رکھو آخر شب میں پڑھنے کا وتر سے پہلے کیونکہ حضور اکرم ﷺ تو ہمیشہ وتر سے پہلے پڑھتے اور عشاء کے وتر اخیر میں پڑھا کرتے تھے۔

تہجّد کے لئے آنکھ نہ کھلنے کا واقعہ :

ایک دن عشاء کے وقت خیال ہوا کہ میں تو روزانہ توفیقِ الٰہی سے اُٹھتا ہوں تہجد کے لئے۔ اور یہ میں نے اپنی جوانی سے اختیار کر رکھا ہے اور اب تو بڑھاپا بھی ہے اور کمزوری بھی آ گئی ہے اور تہجد کے لئے بفضلہٖ تعالیٰ اُٹھتا ہی ہوں تو عشاء کے وقت تہجد نہ پڑھا کروں یہ خیال میں نے کیا لیکن پڑھ لی۔ رات کو آنکھ لگ گئی اور تہجد کا وقت نکل گیا۔ تو اللہ نے سمجھا دیا کہ بعضوں کو جلدی سمجھاتے ہیں، وہ تو تعلّق کی بات ہے کیونکہ اپنوں ہی سے کہا جاتا ہے اور اپنوں ہی سے اظہارِ گرانی کی جاتی ہے اور یہی سُنتِ الٰہی ہے۔ حضرت معاویہؓ کی ایک مرتبہ تہجد کے لئے آنکھ نہ کھلی تو آپ تمام دن روتے رہے۔ وہاں رونے کی کیا بات تھی؟ کوئی فرض چھوٹ گیا تھا..............؟

لیلیٰ کا واقعہ :

چنانچہ مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ لیلیٰ نے سب بھکاریوں کو بھیک دے دی اور جب مجنون کی باری آئی تو مجنوں کا پیالہ چھین لیا اور زمین پر دے مارا۔ پیالہ ٹوٹ گیا اور مجنون ناچنے لگا پوچھنے پر مجنون بولا کہ تمہیں کیا پتہ اپنے پر قیاس کر لینا دوسرے کو، یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ محبت اور اس کے آداب الگ الگ ہیں۔

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۔ کہ مؤمن کی شان تو حق تعالیٰ کے ساتھ اشد محبت کی ہے اُس کے آثار الگ الگ ہیں۔

بستی کے پلٹنے کا واقعہ :

اور اسی لئے جس بستی کو اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ کو پلٹ دینے کا حکم دیا وہ

جبرئیلؑ بھی کہہ رہے ہیں کہ اس میں تو ایک بندہ ایسا عابد ہے کہ جس سے کوئی گناہ بھی نہیں ہوا۔ کم سے کم وہ تو نکل جائے اس بستی سے ورنہ وہ بھی پھنس جائے گا اسی بستی والوں کے ساتھ۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ عالمُ الغیب تو میں ہی ہوں اور اندر کی بات کو جاننے والا ہوں اس عابد سمیت ہی اِس بستی کو پلٹ دو تو وہ بزرگ مارے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بستی کے رہنے والے گناہ کا کام کرتے تھے اور بزرگ اِن لوگوں کو گناہ کرتے ہوئے دیکھ کر ہاتھ سے نہیں روکا تھا۔ اس لئے نہیں روکا تھا کہ خوف کھاتا تھا کہ میرا کیا حشر کر دیں گے یہ تو بہت سخت لوگ ہیں۔ اور زبان سے بھی نہیں روکا تھا کہ اگر زُبان سے روکوں گا تو نہ معلوم میرا کیا حشر کریں گے مگر دل کے حال سے تو کوئی واقف نہیں ہوتا اس سے تو میں ہی واقف ہوں پھر یہ کیا بات ہے کہ بستی کے لوگ گناہ پر گناہ کرتے رہتے ہیں اور اس کے دل پر کوئی صدمہ نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ حُکم ہے کہ اس کے سمیت بستی کو پلٹ دو۔ چونکہ دل میں احکام کی جو عظمت ہونی چاہیئے تھی وہ اس میں نہیں تھی۔

قلب میں احکامِ الٰہیہ کی عظمت :

اِسی لئے چہرے پر بُرائیوں کو دیکھ کر کسی قسم کا تغیر نہیں ہوتا تھا۔ جو عبادت یہ کرتا تھا احکامَ الٰہیہ کی عظمت کے ساتھ نہیں تھی یہ تو محض عادت تھی اسکی۔ اگر احکامِ الٰہیہ کی عظمت دل میں ہوتی تو خلاف دیکھنے پر اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتا تھا' زُبان سے نہیں کہہ سکتا تھا' تو غم اور ناراضگی کے آثار چہرے پر ضرور نمایاں ہو جاتے۔ اور جب ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ سب عبادات صرف عادت کے طور پر تھیں، محبت و عظمت احکامِ الٰہی کے ساتھ نہ تھی۔

شیطان کی خیر خواہی میں بھی شر ہے :

تو شیطان بھی خیر خواہ بن گیا۔لیکن یہاں بھی خیر خواہی نہیں ہے۔ جیسا کہ وہ سُلا دینا خیر خواہی نہیں تھی۔ جب شیطان جگانے کے لئے آیا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ تیرا کام تو سُلانے کا ہے جیسا کہ کل سُلایا تھا تو جگانے کے لئے کیوں آیا ہے؟ اس پر شیطان نے کہا کہ وہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی کہ میں نے آپ کو سُلا دیا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ آپ کو اپنے خالق سے ایسی محبت ہوگی کہ تمام دن روئیں گے آپ اور ایک ایک آنسو آپ کا اتنا قیمتی ہوگا اور رو رو کر آپ اور قربِ الٰہی حاصل کر لیں گے اس لئے آپ کو جگا رہا ہوں تا کہ آپ اپنے وقت پر تہجد پڑھ لیں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ قضاء ہو جائے تو اور بھی آپ کے رونے سے ترقیٔ درجات ہو۔شیطان فضائل سے اور ترقیٔ درجات کے سبب ہونے والے اعمال سے تو بخوبی واقف ہے اور حضرت آدمؑ کی فضیلت کو جو اس نے نہیں مانا تھا وہ عناد کی وجہ سے تھا۔

عناد کے خواص :

جب کسی سے عناد آ جاتا ہے تو سارے علوم سارے فضائل اور سارے کمالات اسکی جس کے ساتھ عناد ہے، عناد کی نظر ہو جاتے ہیں۔تو شیطان کہتا ہے کہ اسی لئے میں نے آپ کو اُٹھا دیا ہے کہ آپ تہجد پڑھ لیا کریں۔ اب میں کبھی نہیں سُلاؤں گا آپ کو۔

رونے کا فائدہ :

تو حضرت معاویہؓ کا رونا سبب بن گیا شیطان سے دوری کا۔حالانکہ صرف

تہجد چھوٹا تھا' فرض نماز قضاء نہیں ہوئی تھی نہ کوئی گناہ ہوا تھا اور یہاں گناہ ہونے پر بھی رونا نہیں آتا۔ جان جان کر کر رہا ہے اور جانتا ہے کہ گناہ ہ اور بار بار کر رہا ہے مگر رونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آنکھوں سے رونا صرف ضروری نہیں بلکہ اصل تو دل کا رونا ہے آنکھوں سے بعضوں کے آنسو نہیں آتے۔

ایسا ہی ایک واقعہ معین الدّین چشتیؒ کی اُنگلیوں کے خِلال چھوٹنے کا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدّین چشتیؒ کا واقعہ :

حضرت خواجہ معین الدّین چشتیؒ نے نمازِ عشاء کے لئے وضوء کیا اور نماز پڑھ کر سو گئے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ معین الدّین ہم سے محبت کا دعویٰ اور وضوء میں اُنگلیوں کا خِلال چھوڑنا یہ کیسی محبت ہے.........؟

دیکھئے ! اُنگلیوں کا خِلال صرف مستحب تھا فرض یا واجب نہیں۔ مگر اس پر بھی نبی اکرم ﷺ نے خواب میں تشریف لا کر محبت بھرے انداز میں تنبیہ فرمائی۔ آپ کی آنکھ کھلی تو بے چین ہو گئے، اُٹھے اور وضوء کیا اور عشاء کی نماز دُھرائی۔ کیا پہلے نماز نہیں ہوئی تھی؟ ہو گئی تھی ! اور یہ جو نماز دوبارہ پڑھی ہے یہ نفل ہے۔ فرض تو ادا کر چکا تھا لیکن وہ تو جانتے ہیں کہ کسی چیز کے چھوٹ جانے پر بھی اس کا کفّارہ ادا کرنا چاہئے تا کہ تلافی اور تدارک ہو جاوے کہ اس میں جو نُقص آ گیا ہے اسکی تکمیل ہو جائے۔

رنگ میں فرق نہ آئے :

اور اس کے رنگ میں جو فرق آ گیا ہے وہ فرق دور ہو جائے اور وہی رنگ چڑھ جائے ورنہ آہستہ آہستہ رنگ چھوٹ جائے گا۔ پہلا رنگ باقی نہ رہے گا۔

دیوار کی مثال :

مثلاً اگر دیوار سے ایک اینٹ نکل جائے۔ اب اگر یہ خیال کر لیا جائے ک
ایک اینٹ ہی تو نکلی ہے ذراسی بات ہے لگ جائے گی اور اس پر نظر نہیں کہ وہ ایک
اینٹ کیا نکلی پوری دیوار کمزور ہونا شروع ہوگئی ہے اور آخرکار نتیجہ یہ ہوا کہ ساری دیوا
ہی گر گئی اور سارا گھر گر گیا۔ تو ایک اینٹ نکلنے پر غفلت و لاپرواہی برتی جائے ت
پورے مکان تک کے گرنے کی نوبت آسکتی ہے۔ پس اسی طرح اگر یہاں غفلت برتی
جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آج ایک حُکم چھوٹا کل کو دوسرا حُکم چھوٹا اور پھر رفتہ رفتہ نوبت
یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ دین ہی زندگی سے نکل جاتا ہے۔

دِل کی کھٹک مہمان ہے :

یہ کھٹک مہمانِ خداوندی ہے اور جس مہمان کا اِکرام نہ کیا جائے وہ دوبار
نہیں آتا۔ خاص کر جو سلوک طے کرتے ہیں اور تقویٰ کے ساتھ ذکر میں مشغول ہیں اُن
کے لئے تو یہ بڑی نعمت ہے بڑی دعوت ہے یہ منجانب اللہ بڑا مہمان ہے۔ اگر اِن کی
خاطر تواضع نہیں کی گئی تو یہ کھٹکیں بند ہو جائیں گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آگے چل کر دین میں
اضمحلال آتا چلا جائے گا اور کمزوری پر کمزوری اس کے اسلام اور اعمال میں ہوتی چلی
جائیگی' یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ بعض اوقات ان واردات پر عمل نہ کرنے سے آخرت کا چاہے
نقصان نہو۔ کیونکہ آخرت کا نقصان تو معصیت پر ہے لیکن دُنیاوی نقصان ضرور ہوگا۔

ایک بزرگ کا واقعہ :

چنانچہ ایک بستی میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ اسی بستی میں ایک اور بزرگ

کہیں باہر سے تشریف لائے تو اِس مقامی بزرگ کے جی میں آیا کہ ہم بھی مل لیں اُن بزرگ سے۔ تو جیسے اُٹھے فوراً کھٹک آگئی کہ مت جاؤ تو اس کھٹک پر بیٹھ گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ یہ میرا وہم تھا۔ تین دفعہ اسی طرح ہوتا رہا، اب چوتھی مرتبہ جب کھڑے ہوئے اور کھٹک آئی اور چلنے کے لئے ایک پاؤں رکھا اور جب دوسرا پاؤں رکھا تو پاؤں میں چوٹ آگئی اور بیٹھ گئے۔ بعد میں اُن بزرگ کے پاس سے کوئی شخص آئے تو اِنہوں نے معلوم کیا کہ بھئی وہ بزرگ تشریف لائے تھے وہ موجود ہیں یا چلے گئے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ حضرت وہ تشریف لے گئے ہیں؛ اچھا ہم نے خیال کیا تھا کہ اُن سے مُلاقات کریں گے مگر پیر میں چوٹ آگئی۔ تو اُس شخص نے کہا کہ حضرت وہ بزرگ تو اخیر میں بدعتی ثابت ہوئے۔

خواجہ صاحبؒ کے بارے میں ہم یہ کہہ دیں گے کہ یہ حضرت کی محبت ہے۔ چونکہ حضور اکرم ﷺ نے خواب میں متنبہ کیا تھا تو خواجہ صاحب اُٹھے اور اُٹھ کر وضوء کیا اور نماز کا اعادہ کیا۔ اس میں حضور ﷺ نے اس بات کی طرف تنبیہ دی جو کہ ابھی عرض کیا جارہا تھا تو حضور ﷺ نے بتلایا کہ آپ وضوء کر رہے تھے اس میں خِلال کرنا چھوٹ گیا ہے۔

کام کرتے وقت کام ہی کی طرف توجّہ ہو :

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے جو کام بتلایا ہے تم کو، اس وقت میں اس کام کی طرف جس طریقے سے میں نے کرنے کو کہا تھا تو اسی طریقے سے کرنے کا اہتمام رکھو۔ میں یہ نہیں جانتا کہ اس وقت میری یاد تمہارے قلب میں اس درجہ ہو کہ اس کی وجہ سے جس طریقے سے میں نے کام کے لئے کہا ہے اس طریقے سے چُوک

ہو جائے۔

میں یہ نہیں جانتا..............؛ باریک بات ہے۔ٹھیک ہے کہ تمہیں محبت ہے اور محبت میں تو جی چاہتا ہے لیکن میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جس وقت میں نے جس طریقے سے جس کام کے کرنے کے لئے حکم دیا ہے اُس وقت میں اُس کام کو اُسی طریقہ سے انجام دینا مطلوب ہے۔میری یاد تمہارے دل میں بسی ہوئی ہے لیکن اگر اس وقت میری یاد ہو کر اس میں فرق آجائے گا تو میں تم کو حکم دوں گا کہ اس کی تلافی کرو،اس طریقے سے کرو کہ پوری نماز کو دُہراؤ یا اس طرح کہوں گا کہ اس کی تلافی سجدۂ سہو سے کرلو۔اگر نبی سے بھی ایسا ہوگا تو اُس کو بھی حکم دوں گا۔حالانکہ نبی کا حضور اعلیٰ کی طرف تھا۔وہ تو معبود کی طرف تھا اور اس درجے کا معبود کی طرف انتساب ہوا کہ اس عبادتِ عملی میں فرق آگیا تو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو بھی حکم دیا کہ سجدۂ سہو کرو۔اسی لئے جب کسی اعلیٰ سے اعلیٰ مقرّب سے مقرّب کہ جس کی اگلی اور پچھلی ساری چیزوں کو اُٹھالیا گیا ہے۔تو جب اس سے بھی کہہ دیا جائے کہ..............؛

نبی اکرم ﷺ کو بھی ڈرنے کا حکم :

يَآ اَيُّهَا النَّبِىُّ اتَّقِ اللّٰه (پ۲۱۔سورۃُ الاحزاب) اے نبی ﷺ یعنی اے محمد ﷺ اللہ سے ڈرتے رہو۔خیال فرمایا کہ کیسے چہیتے حبیب کو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میری ذات سے ڈرتے رہو۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ کہ کافروں کی بات نہ مانو اور منافقین کی بات نہ مانو اور ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ دو۔اِلتفات مت رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔اور آگے فرمایا :

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے جو تم کو وحی کی جاتی ہے اُس پر چلتے رہو اور انہیں کہنے دو جو کچھ کہتے ہیں جو مَیں کہوں اُس پر چلتے رہو۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا وہ خوب جانتے ہیں بڑی حکمت والے ہیں۔

تو نبی کو کہا کہ ڈرتے رہو حالانکہ آپ ﷺ میں ساری چیزیں امر و نہی کی موجود ہیں اور ڈرتے رہنا وہاں موضوع ہے ہی اور کفار اور منافقین کی باتوں کو ماننے کا اور اِن کی باتوں کی اتباعیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو وحی آپ ﷺ پر آتی رہتی ہے اُس پر چلتے رہنے کا دوام ہے ہی۔

درحقیقت ہم کو ڈرانا ہے :

درحقیقت حضور اکرم ﷺ کو فرمانا ہمیں سُنانا ہے۔ جہاں اِس کا ابہام نہیں اور جہاں اِس کا اندیشہ نہیں وہاں یہ حُکم ہے اور نہی کے صیغہ کے ساتھ ہے جو کہ درجہ وجوب کا رکھتا ہے تو آپ ﷺ کی اُمتِ مُسلمہ کے لئے بطریقِ اولیٰ ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ تو نبی ﷺ کے لئے حُکم ہے حالانکہ یہ تو کلام کی بلاغت ہے کہ جہاں اندیشہ نہیں وہاں کہا جا رہا ہے تو جہاں ہر وقت اندیشہ لگا رہے گا صرف احتمال ہی نہیں اُس کو تو بطریقِ اولیٰ ڈرتے رہنا ہے جس پر شیطان کا صبح سے شام تک نہ معلوم کتنا اثر ہوتا رہتا ہے اس کو تو بطریقِ اولیٰ تعلیم دی گئی ہے۔

عملی صفائی اور لسانی صفائی :

ایک عملی صفائی ہے اور ایک لسانی صفائی۔ عملی صفائی یہ ہے کہ عملی کوتاہی ہوئی

کہ مستحب چھوٹ گیا خِلال، اس کی تلافی ہو رہی ہے اور آئندہ کا اہتمام کہ وضوء کر لیا نہیں چین کیسے آئے' نماز دُہرالی۔

تلافی کے لئے سو ۱۰۰ نفلیں روزانہ :

اب اِس طرح نہیں ہو گا جو ہو گیا وہ ہو گیا اور سو ۱۰۰ نفلیں روزانہ چھ مہینے تک پڑھتے رہے۔ اب تو وقت کی نماز کی نفلیں بھی نہیں پڑھی جاتیں۔

عباداتِ نافِلہ میں آزادی ہے :

اور عباداتِ نافِلہ میں آزادی دی گئی ہے، عباداتِ مفروضہ میں آزادی نہیں وہ تو اپنے وقت میں جس تعداد کے ساتھ فرض ہیں اسکی ادائیگی ضروری ہے۔ اُس میں نہ کمی ہے نہ بیشی نہ تبدیلیٔ وقت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے نوافِل میں مستحبات میں اختیار دیا ہے آزادی دی ہے لیکن کس درجہ کی، یہ نہیں کہ چھوڑ دینے کی۔ اتنی نہ سہی تو اتنی کر لو اب دوسرے کو حق نہیں حاصل کہ وہ مقیّد کر لے۔ تو وہ رسولِ پاک ﷺ کو یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کہہ کر کہ وہ محبت کا ایک عنوان ہے فرمایا تو اسکے معنی یہ نہیں کہ اُمّت کے لئے حُکم نہیں ہے تو پہلے تو یہ تہجد کا پڑھنا فرض تھا ابتدائے اسلام میں۔ اب فرض اُٹھ گیا ہے اور سُنّیتِ تہجّد باقی رہ گئی۔

ادب کی تعلیم :

اب یہ کہہ کر چھوڑ دینا کہ سُنّت ہی تو ہے یہ ایک درجے میں خلافِ ادب ہے۔ نہ پڑھنا اور بات ہے لیکن زبان سے یہ کہنا کہ چھوٹ گئی تو کیا ہوا یہ لہجہ اچھا نہیں ہے۔

ایک صحابیؓ کا واقعہ :

چنانچہ ایک صحابیؓ بیمار ہو گئے اور بعض صحابہؓ جہاد میں شریک نہ ہو سکے اور تبوک کا جہاد بہت سخت ترین تھا اور شریک نہ ہونے والوں پر عتاب ہوا۔ وہ صحابی جو کہ بیمار تھے وہ کہہ رہے ہیں، اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اِس موقع پر بیمار کر ڈالا۔ اگر میں بھی تندرست ہوتا اور ہو سکتا ہے میں بھی کوئی طریقہ ایسا اختیار کرتا کہ میں اجازت لے لیتا اور جہاد میں شریک نہ ہوتا تو مجھ پر بھی یہی عتاب ہوتا۔

حِکمت سمجھ میں آ گئی اُن کے بیمار ہونے کی۔ تو مختلف زرائع اور طُرق سے معلوم ہوا کہ مؤمن کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ کا جو بھی معاملہ ہو خواہ اس کے چاہنے کے موافق ہو خواہ خلاف ہو ہر حال میں اس کے لئے اس میں خیر ہے۔

باپ کی مثال :

بچہ باپ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو اگر بچّے کے لئے وہ چیز مفید ہے تو دیتا ہے اگر مفید نہیں ہے تو نہیں دیتا۔ اب بچہ رُوٹھ گیا کہ میں نے باپ سے روپیہ مانگا اُنھوں نے نہیں دیا۔ بظاہر تو مخالفت ہوئی لیکن یہ اس کے ساتھ عینِ ہمدردی ہے موٹی سی بات ہے۔ یہ معاملہ بڑے کا چھوٹے کے ساتھ باپ کا بیٹے کے ساتھ ہے۔ اور اگر اللہ میاں بھی یہ معاملہ کرے تو کیا اشکال ہے اور کیا کلام ہے۔ خیال ہی نہیں آنا چاہئے کہ یہ اشدیت محبت کے خلاف ہے۔

راضی برضائے الٰہی :

مؤمن بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی پیش

آئے یہ بندہ اِس سے محبت رکھنے والا اِس پر راضی ہے۔ خواہ مؤمن بندے کی حاجت کے موافق ہو جائے یا اِس کی حاجت کے خلاف، دونوں صورتوں میں اِس کے لئے خیر ہے۔

ادب کی تعلیم :

خیر اور شر دونوں کا خالق اللہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب شر کی نسبت کرنا ادب کے خلاف ہے۔ قرآنِ پاک میں اس کی تعلیم دی گئی ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے؛

وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْر۔ (سورۃ آلِ عِمران)

یہاں بِيَدِكَ الْخَيْر فرمایا بِيَدِكَ الْخَيرِ وَ الشَّر نہیں فرمایا اِس میں ادب کی تعلیم ہے اس لئے کہ شر کا لفظ خالق کی طرف منسوب کرنا بے ادبی ہے۔ خالق ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ شر کا بھی خالق ہے اور خیر کا بھی۔ لیکن مؤمن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف شر کی نسبت کرے۔

گویا کہ تعلیم ہوگئی کہ تیری چاہت کے خلاف جو کچھ پیش آیا ہے وہ تو (اے بندۂ مؤمن) میری طرف سے پیش آیا ہے اور جب میری طرف سے پیش آیا ہے تو اس کو خیر سمجھ اپنے لئے۔

اَنصار کی محبت عینِ ایمان ہے :

حضور ﷺ نے فرمایا کہ حُبُّ الْاَنصَارِ مِنَ الْاِيْمَانِ (بُخاری) کہ انصار کی محبت یہ ایمان میں سے ہے۔ یہاں ایک شُبہ ہوتا ہے کہ انصار کی محبت تو ایمان میں سے ہے تو مہاجرین کہاں چلے گئے تو اِس کے جواب میں کہا جائے گا کہ مہاجرین کا

مقام تو بہت اُونچا ہے اور جب انصار کی محبت کو ایمان کی دلیل بتلایا ہے تو مہاجرین سے محبت تو بدرجۂ اولیٰ ایمان میں داخل ہوگئی۔

یہ کلام کی بلاغت کہلائی جاتی ہے تو ایسے ہی یہاں پر ہے کہ جب نبی ﷺ کو کہا گیا ہے کہ جہاں احتمال ہی نہیں ہے خلاف کا تو نبی کی جو اُمّت ہے اسکو تو بطریقِ اولیٰ یہ حکم ہے۔

یہ غذائے روحانی کہ بات ہورہی ہے اسکو غذائے جسمانی کی مثال سمجھ لیجئے۔

ارشادِ ربانی ہے : یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ ۔

(سورۃ مؤمن۔ پ ۱۸)

کہ اے رسولو! کھاؤ پاکیزہ اور لذیذ پُر ضائقہ چیزیں۔ یہاں بھی اُمر کا صیغہ ہے اور خطاب رسولوں کو ہے اُمتیوں کو نہیں لیکن چونکہ نبی ﷺ کو فرمایا گیا ہے تو اُمّتی بھی بطریقِ اولیٰ شامل ہیں۔

طاہر وطیّب میں فرق :

آیتِ کریمہ میں طیّبات فرمایا گیا ہے طاہرات نہیں فرمایا کہ پاک چیزیں کھاؤ۔ اور طیّبات کے معنی لذیذ کے ہیں اور لذیذ حلال ہی کو کہتے ہیں حرام کو لذیذ نہیں کہتے۔

لذیذ کھانے سے محبتِ الٰہی میں ترقی :

اور ایک شریف الطبع فہمِ سلیم اور عقلِ مستقیم والا شخص جب کھائے اسطرح تو دِل میں حق تعالیٰ کی محبت اور بڑھے گی اور اس کی عبادات میں اور اضافہ ہوگا۔ یہ کلام کی بلاغت ہے۔

سُنن ونوافِل :

سُنتِ غیر مؤکدہ اور نوافِل کو بھی ترک نہیں کرنا چاہئے۔ جیسا کہ فرض نمازوں کے بعد سُنن ونوافِل ہیں اُن کو نہایت اہتمام کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ اور فرض نمازوں کا تو اپنے وقتِ مقرّرہ پر ادا کرنا فرض ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَاباً مَّوْقُوْتاً۔ کہ وقتِ مقرّر کے ساتھ مؤمنین پر پانچ وقت کی نمازیں فرض کردی گئی ہیں۔ اب حق تعالیٰ کچھ اور فرمارہے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز ادا کرنے کے بعد تم یہ سمجھے کہ فارغ ہو بیٹھے، ایسا نہیں ہے بلکہ ایک دوسری چیز بھی ہے اگرچہ وہ بدرجۂ فرض نہ سہی لیکن میرا مطالبہ ہے۔

''فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ'' کہ جب تم پانچوں وقت کی نماز ادا کرلیا کرو، تو یہ مت سمجھو کہ بس حق ادا ہوگیا بلکہ اِس کے بعد ہی ذکر کا حُکم ہے۔

اَلَّذِینَ یَذْکُرُونَ اللّٰهَ قِیَاماً وَّ قُعُوداً وَّ علیٰ جُنُوبِهِمْ ۔ یہ مطالبہ ہے اسکا کہ اللہ کا ذکر کرتے رہو قلبًا و لسانًا.......... اللہ کا ذکر کرتے رہو کھڑے ہوکر بیٹھ کر لیٹے ہوئے یعنی ہمہ وقت ہر حالت میں ذکر کرتے رہو۔

ذِکر کے حُکم میں تخفیف نہیں ہے :

نماز میں تو تخفیف ہے۔ سفر میں چار کی جگہ دو۔ سُنت کا اختیار ہے ادا کرنا چاہے یا نہ چاہے۔ فرض کھڑے ہوکر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو اور بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر، تخفیف ہوگئی۔ لیکن ذکر میں تخفیف نہیں ہے ہر وقت ذکر میں مشغول رہنا ہے کوئی لمحہ غفلت میں نہیں گزارنا۔

عینِ جہاد کے وقت ذکر :

بلکہ عینِ جہاد کے موقع پر بھی دل کو ذکر۔ دھیان، یاد، اور خیال اللہ تعالیٰ کا رکھنا پڑے گا ورنہ تو کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے گا جہاد میں کہ جو حق تعالیٰ کے حُکم کے خِلاف ہو گا اس موقع پر حالانکہ چاہئے کہ جہاد کے موقع پر بھی حُکم کے خلاف کوئی معاملہ نہ اختیار کیا جائے اور جب حق تعالیٰ کے حُکم کے خلاف کوئی معاملہ کیا جائے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تو اللہ کا ذکر بھول گیا ہے یا اُس کی یاد بھول گیا ہے۔ تغافُل تھا دل میں اللہ کی یاد سے۔

مجنون کی محبت :

کہ گلی کوچوں میں بھی اور جنگل میں بھی مجنون لیلیٰ لیلیٰ لکھ رہا ہے اور جب کوئی پوچھتا ہے کہ کیا لکھ رہے ہو کیا کسی کو خط لکھ رہے ہو؟ تو کہتا ہے کہ خط کیا لکھ رہا ہوں لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں کہ اِس سے جی خوش کر رہا ہوں۔ لیلیٰ کا نام تو اتنا پیارا ہے کہ کسی وقت بھی دِل و زُبان سے نہ نکلے اور اللہ کا نام کسی وقت بھی نہیں لیتا۔ مؤمن کے لئے سبق ہے اس مجنون سے جو ایک انسان لیلیٰ کی محبت کی وجہ سے ہر وقت اس کا ذکر کرتا ہے اور یہ اپنے مولائے حقیقی محبوبِ حقیقی کے ذکر سے غافل ہے۔

اِستحباب کا مادہ حُبّ ہے :

مُستحب اِستِحبَاب سے ہے۔ مُستحَبّ ب پر تشدید ہے اِستِحبَاب باب اِستِفعَال کا مصدر ہے اور اس کا مادّہ ح ب ب حَبَبَ اور دونوں کو جمع کرو، ب ب کو تو حُبّ ہو گیا اور حُبّ کہتے ہیں محبت کو۔ لہٰذا مستحب ادا کرتے رہنے کے لئے حق تعالیٰ

کی محبت چاہیئے ۔ اور مستحب کا ادا کرتے رہنا دلیل ہوگی اس بات کی کہ اس کے اندر اس درجے کی محبت ہے اور مستحبات کا ادا نہ کرنا دلیل ہوگی اس بات کی کہ اس کے اندر حق تعالیٰ کی کم سے کم محبت ہے۔

فرائض کی کمی کا تدارک نوافل سے :

عذر تو اپنی جگہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ہاں جب بھی نماز کی فہرستیں کھلیں گی اور اُن کا تلنا ہوگا اور اُس میں کمیاں ہوں گی تو حق تعالیٰ کریم ہے اگر کچھ کمی ہو تو اپنے پاس سے ادا کردے گا تا کہ ظہورِ کرم ہو جائے ۔ تو حق تعالیٰ فرمائیں گے : دیکھو اِس کے نامۂ اعمال میں کہیں مستحبات بھی ہیں جنکو نفل بھی کہتے ہیں ، اگر ہوں تو فرشتہ کہے گا کہ ہیں تو حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ فرائض میں جو کمی ہے اس کا تدارک اسکے نفلوں سے پورا کرلو ۔ لیکن اگر نفلیں نہ نکلیں تو کیا ہوگا ....؟ اس سے مستحبات کا درجہ معلوم ہوتا ہے۔

جس وقت جس عمل کا مطالبہ ہو وہی عمل کرو :

گویا اللہ تعالیٰ اپنا ذکر اور اپنی یاد کا مطالبہ فرما رہے ہیں کہ جس عمل کے لئے جس وقت بھی میں نے تمہیں حکم دیا ہے اُس وقت میں تم اُس کام کو اِس طریقہ سے کرنا کہ اس میں فرق نہ آئے کہ میں اپنی یاد اس درجے کی اس وقت میں نہیں چاہتا کہ اس عمل میں فرق آجائے اگر فرق آ گیا تو تم کو حکم دوں گا کہ نماز لوٹاؤ تم کو یہ بھی حکم دوں گا کہ تم سجدۂ سہو کرو ۔ اور تم تو کیا میں تو اپنے نبی ﷺ کو بھی حکم دوں گا کہ تمہاری نظر اس عبادت میں زیادہ اعلیٰ کی طرف چلی گئی تھی اس لئے اس وقت اس نماز میں فرق آ

گیا ہے لہٰذا اس کا تدارک کرو۔

دل وزُبان صرف خدا کے لئے ہے :

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زُبان میں نے اپنے لئے دی ہے اور دل میں نے اپنے لئے دیا ہے تو یہ زُبان کا اور دل کا بلا وجہ خرچ کرتے رہنا اور فضولیات ولغویات اور لایعنی میں خرچ کرنا یہ کیسی بات ہے اور دوسرے اعضاء میں نے تمہیں تمہارے کام کے لئے دیئے ہیں کہ سب دو دو لیکن زُبان ایک ہی دی ہے اور دل ایک ہی دیا ہے تو دل اور یہ زبان اصلاً اپنے ذکر کے لئے دیئے ہیں، اپنی یاد کے لئے دیئے ہیں تو دل اور زُبان کو اس کے موافق استعمال کرنا چاہئے۔

☆

پچیسویں مجلس

کلمہ طیبہ کا کیا تقاضا ہے......؟

۲ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بمطابق 11 جنوری ۱۹۸۹ء۔ بروزِ چہار شنبہ بوقتِ صبح

مجلس میں ذہن کا حاضر ہونا ضروری ہے :

ذہن کا حاضر ہونا، دل کا پوری طرح سے اِدھر لگا رہنا، کانوں کا لگا رہنا پوری توجہ کے ساتھ ضروری ہے۔ کہ نہ دوسری طرف کان لگائیں اور نہ ہی دوسری طرف دل و دماغ لگیں۔ اور اگر مجلس میں آ کر تو بیٹھ گئے مگر مجلس میں بیٹھنے کے جو آداب ہیں، باتوں کے دل میں جمانے کا جو طریقہ ہے اسکی رعایت نہیں تو نفع کیسے ہوگا؟

اپنی اِصلاح کی فکر :

مجلس میں اپنی اِصلاح کی فکر کے ساتھ بیٹھنا چاہیئے! جو کچھ کہا جائے یوں سمجھے کہ مجھے ہی کہا جا رہا ہے۔ اگر اپنی طرف سے غفلت برتی اور دوسروں کے عیوب کو دیکھتا رہا تو اِصلاح ناممکن ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ اپنی ناک پر بھڑ بیٹھی ہوئی ہے اِس کی

تو فکر نہیں اور دوسرے کی ناک پر مکھی بیٹھی ہوئی ہے اس کے اُڑانے کی فکر ہے۔ بعض دفع ایسے زور سے ایسے جلدی سے اُڑاتا ہے کہ مکھی پر تو لگا نہیں ناک پر ہاتھ لگ گیا۔

رئیس کے ریچھ کا قصّہ :

ایک رئیس نے کسی ریچھ کو تربیّت دی پنکھا جھلتا تھا مکھی اُڑاتا تھا۔ تو وہ رئیس صاحب تو سو جائیں اور ریچھ مکھی اُڑائے۔ ایک دن کوئی ایسی مکھی آ گئی بڑی تیز ضدّی ناک پہ آ کر بیٹھ جائے، ریچھ اُڑا دے مکھی پھر آ جائے، ریچھ اُڑا دے مکھی پھر آ جائے مکھی نے تو تانتنا باندھ لیا ریچھ گھبرا گیا، آخر ریچھ ہے ایک پتھر اُٹھایا کہ اب کے آ کر بیٹھی اور اسے میں نے قلع بازیاں نہ کھلائیں، پیس کر رکھ دوں گا اسے، اب کے ذرا آئے۔ تو وہ آ گئی اور جوں ہی آ کر بیٹھی ریچھ نے پتھر اُٹھایا اور مارا۔ مکھی تو اُڑ گئی لیکن بچارے آقا صاحب کا بھیجا نکل گیا ناک ٹوٹ گئی بیچارے کی۔

بہر حال جب تک خود اصلاح کی فکر نہ ہو اس وقت تک اصلاح کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ اصلاح کے لئے پہلے اپنے آپ کو مٹانا پڑتا ہے۔

اوّل قدم فنا ہے :

اوّل قدم فنا ہے۔ نفس سے جب تک تکبّر نہ نکل جائے اس وقت تک صلاحیت فلاحیت پیدا ہونے کا صرف نام ہے۔ وہ وقتی نام فلاح و اصلاح کا ہے حقیقی اصلاح فلاح نہیں ہے جب تک تکبّر اندر سے نہ نکل جائے۔ اس لئے نئی چیز پُرانی چیز کو کہتی ہے کہ تو پُرانی ہے۔ لیکن اسے پُرانی کہنا جب تک کہ اس کے اندر سے تکبّر نہیں نکلا ہے جس کو وہ خود بھی پہچان سکتا ہے ایسے حالات و واقعات سے جیسا خود انسان

واقف ہوسکتا ہے۔ دوسرے کا صحیح حقیقی طریقہ سے واقف ہونا بظاہر عادتاً مشکل ہوتا ہے مگر محال نہیں ہے مستبعد ہے۔

جب تک عمل نہ ہو پُرانی بات نئی ہے:

پس پہلی باتیں اگر کہو تو خیال کرتا ہے کہ یہ پُرانی باتیں ہیں اور وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ پُرانی ابھی میرے لئے نئی ہیں تو اُس پُرانی بات کے سُننے سے جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ اثر تو پیدا ہوا نہیں نفسانی جو بیماری تھی وہ تو گئی نہیں وہ تو اپنی جگہ پر ہے۔ گو چھوٹی بات کے خلافِ طبع پیش آجانے پر تو غُصّہ نہیں کیا، رواداری کی وجہ سے ٹال دیا اور جب کوئی بھاری سی بات آگئی تو وہ جو اندر چور رکھا ہوا تھا وہ ظاہر ہوگیا، طیش آگیا غصّہ آگیا معلوم ہوا کہ ابھی تک اسی سے غصّے کی آگ نہیں نکلی، تکبّر نہیں نکلا، فنائیت نہیں آئی۔ بس اس لئے تو وہ پہلی باتیں گو نئی ہیں پُرانی تو جب ہوتی جب ان پر عمل ہو چُکا ہوتا۔ تب آگے کی باتوں کو اگلی کہا جائے گا۔ اس کی مثال کھانے کی جیسی ہے کہ اگر کسی کو پہلا ہی کھانا ہضم نہ ہوا ہو اور نیا کھانا اس کو دیا جائے۔ اس نئے کھانے کو کوئی شخص رغبت کے ساتھ کس طرح کھا سکتا ہے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ پہلا کھانا ہی ہضم نہیں ہوا اور نیا کھانا کھانے سے تو قبض ہو جائے گی۔ اسی طرح مجلس میں جو باتیں پہلے سُنائی جا چکی ہیں، پہلے ان پر عمل ہو جائے تو تب آگے جو باتیں سُنی جائیں گی وہ نئی ہوں گی مفید بھی ہوں گی۔ ورنہ اگر ابھی تک ان پر عمل ہی نہیں ہوا تو نئی بات سُننا ایسا ہی ہے جیسے بغیر پہلا کھانا ہضم ہوئے دوسرا کھانا کھانا غیرِ مفید ہوتا ہے۔ مجلس میں آنا عمل کی نیّت سے ہونا چاہیئے تب ہی مجلس میں آنا مفید ہوگا اس کے بغیر تو صرف بھیڑ جمع ہو جائے گی اور بھیڑ لگانا مقصود نہیں ہے۔ اور کون اپنی اصلاح کی نیّت سے آتا

ہے، کس میں فنائیت آتی ہے، اس کا شیخ کبھی کبھی امتحان بھی لیتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ اس میں ابھی تک غصّے کی چنگاری ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کتنی باقی ہے اور پھر اس کی اصلاح کی فکر کرتا ہے۔

شیخ کی جانب سے مُرید کا امتحان :

شیخ دیکھتا ہے کہ مُرید میں آدمیّت کہاں تک آئی ہے۔ چونکہ اصل تو آدمیّت ہے اسی کو کہا گیا ہے .... ؎

آدمی را آدمیّت لازِم است　　عودراگر بُو نہ باشد ہیزم است

یعنی انسان میں آدمیّت کا ہونا لازمی ہے۔ جیسا کہ عود میں اگر خوشبو نہ ہو تو محض ایک لکڑی ہے۔ ہیزم کہتے ہیں لکڑی کو اس میں خوشبو کا ہونا لازم ہے اگر نہیں تو اس عود کی لکڑی میں اور دوسری لکڑی میں فرق کیا ہوا۔

علّتِ غائی :

مثلاً چاقو کسی (بنانے والے) نے بنایا تو اس چاقو کے لئے جو لازم ہے یعنی کا نشاوہ اس کے لئے بنانے کے وقت لازم ہے کہ وہ رکھا جائے اور جب اپنے چاقو کی شکل دیکھ کر اور چاقو سمجھ کر کہ کاٹنے کے کام آتا ہے، لے لیا اور جب کاٹتے وقت بیٹھے تو چیز کٹتی نہیں اُس سے، تو چاقو کے لئے جو لازم تھا جب وہ نہیں پایا گیا تو چاقو کہاں پایا گیا اُسے چاقو کہاں کہتے ہیں شکل میں داخل ہے لیکن واقع میں وہ چاقو کہ اس کے لئے جو لازم چیز تھی وہ تو پائی نہیں جا رہی۔

اِذَا ثَبَتَ الشَّيْئُ ثَبَتَ بِلَوَازِمِہٖ کہ جب کوئی شے ثابت ہوتی ہے تو اس کے لئے جو چیزیں لازم ہوا کرتی ہیں وہ اُسکے ساتھ ضروری ہیں۔

عالمِ دُنیا و عالمِ آخرت :

اللہ عالیٰ نے دو عالم ایجاد فرمائے ہیں ایک عالمِ دنیا اور دوسرا عالمِ آخرت۔ دو عالِم ہیں اصل مقاصد میں سے۔لیکن اس عالمِ دنیا کے لئے جو اس کے لوازم تھے اِن لوازم کو بھی اس عالمِ دنیا میں ساتھ ساتھ پیدا فرمایا ہے اور عالمِ آخرت کے لئے جو اُسکے لوازم تھے وہ اُسکے لئے پیدا فرمایا کہ اِسکے لوازم اور ہیں اور اُس عالَم کے لوازم اور ہیں۔

عالمِ آخرت کے لوازِم :

اُس عالمِ آخرت کے لوازم انجام کے طور پر ہیں کام کے طور پر نہیں ہیں نتیجہ کے طور پر ہیں ثمر کے طور پر ہیں اور بدلے کے طور پر ہیں۔

عالمِ دُنیا کے لوازِم :

اس عالم کے لوازم انجام کے طور پر نہیں کام کے طور پر ہیں استعال اور اِکتساب کے طور پر ہیں اسی لئے اس عالم کا نام دارُ العمل ہے۔تو اِس عالم کے لوازم میں سے اعمال ہیں کام ہیں مختلف قسم کے جس کی تقسیم بہت لمبی ہے اور تفصیل ہوتی رہتی ہے، مگر بتانا یہ ہے کہ جب کوئی شے وجود میں آتی ہے تو وہ اپنے لوازم کے ساتھ آتی ہے اور جب یہ عالَم عالمِ دُنیا ظہور میں آیا تو اس کے لوازم میں سے کیا ہے اور عالمِ آخرت جب وجود میں آئے گا تو اُس کے لوازم کیا تھے؟ یہ ہے پہلی شرط! عالَم کے لوازم میں سے تو اعمال ہیں اور اُس عالم کے لوازم میں سے جزاء، صلہ اور بدلہ۔ کیونکہ وہ دارلجزاء ہے اور یہ دار العمل ہے۔

یہ دُنیا دارالعمل ہے :

سب سے پہلے تو اس عالمِ دنیا میں اِس کے پیدا کرنے والے بصفاتِ کمالیہ وجوبیہ ازلیہ وابدیہ بذاتِ قدیمہ یہ ہے کہ اُس ذات کا ماننا اب اس طرح ماننا ہوگا۔ تو یہ ماننا ایک چیز کو اپنے اندر وجود میں لانا اور اپنے اندر موجود کرنا ہے۔ اور ہر موجود کے کچھ لوازم ہوتے ہیں تو اس ماننے کے بھی کچھ لوازم ہیں۔ وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى جو کلمہ اندر موجود ہے وہ کلمہ اپنے لوازم کے ساتھ ہوکر ہوگا اِذَا ثَبَتَ الشَّیْءُ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهٖ لہٰذا وہ کلمہ جما اپنے ساتھ تقویٰ کو لیکر آیا جو کہ اس کلمہ کے لئے لازم ہے۔

لازم مُنفک ولازم غیر مُنفک :

ایک لازم شی کا غیر مُنفک ہوتا ہے اور ایک لازم شی کا مُنفک ہوتا ہے۔ جب آنکھ کھولی جائے تو اس کے لوازم میں سے دیکھنا بینائی، یہ لازم غیر مُنفک ہے کہ وہ لازم اُس سے الگ نہیں ہوسکتا۔

دوسری قسم لازم کی وہ ہے کہ وہ جدا بھی ہوسکتی ہے اس کو لازم مُنفک بھی کہتے ہیں۔ کلمہ کے ساتھ تقویٰ کا لزوم یہ دوسری نوعیت کا ہے چونکہ كَلِمَةُ التَّقْوٰى فرمایا ہے یہاں کلمہ کی اضافت تقویٰ کی جانب سے اور مضاف اور مضاف الیہ میں وجودِ خارجی میں اتحاد نہیں ہوا کرتا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ جَاءَ غُلَامُ زَیْدٍ تو غُلَامُ اور چیز ہے اور زَیْدٍ اور چیز، اپنے وجودِ خارجی میں دونوں الگ الگ ہیں۔

پس اسی طرح یہاں کلمۂ مضاف ہے تقویٰ مضاف الیہ ہے یہاں بھی کلمۂ اور تقویٰ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اپنے وجودِ ذاتی کے اعتبار سے، اور وجودِ صفاتی کے اعتبار سے متحد ہیں تو گویہ دونوں مغایر الذات ہیں اور متحد الصفات ہیں

اسی لئے تو کلمۂ حقیقی واقعی کمالی تب سمجھا جائے گا کہ جب اس کے ساتھ تقویٰ بھی ہو۔ جو بلا اس کے ہے وہ بلا تقویٰ کے ہے لیکن کمالِ کلمہ کا دل میں ہونا تب خیال کیا جا سکتا ہے، تب ثمرات قائم ہو سکتے ہیں جب کہ اس کے لئے جو لازمِ تقویٰ ہے کلمہ کے لئے بھی وہ تقویٰ پایا جائے۔

مالدار کی مثال :

مثلاً کسی شخص کے بارے میں کہیں کہ فلاں مالدار ہے تو ذہن کہاں جائے گا؟ کیا جس کے پاس ایک ہی روپیہ ہے تو اس کی طرف ذہن جائے گا، حالانکہ ایک روپیہ بھی مال ہے لیکن عُرف میں ایک روپیہ والے کو مالدار نہیں کہا جا سکتا۔ اِس کی مثال یہ ہے کہ جس کو کمالِ تقویٰ حاصل نہیں اسکو متقی نہیں کہا جا سکتا۔ گو وہ بھی مسلمان کہلائے گا، مؤمن کہلائے گا مگر کمالِ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اُس کو متقی نہیں کہیں گے۔

چونکہ جب متقی بولا جاتا ہے تو ذہن صرف کلمہ گو مسلمان کی طرف جائے گا؟ چونکہ کلمۂ کے لئے جو لوازم ہیں وہ اس شخص میں نہیں پائے جاتے۔ کلمہ کے لوازم ہی سے تو یہ شخص مؤمن ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائے ہوئے تمام کاموں کو کرنے والا ہوتا ہے اور منع کی ہوئی تمام چیزوں سے رُکنے والا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو متقی کامل نہیں کہیں گے اور یہ بھی خیال رہے کہ کلمہ اور تقویٰ دونوں کا محل ایک ہے اور وہ دل ہے۔

کلمہ اور تقویٰ دونوں کا محل دل ہے :

چنانچہ حدیث شریف سے ثابت ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضغَةً اِذَا صَلحَت صَلحَ سَائِرُ الجَسَد۔ بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے وہ

جب سنور جاتا ہے تو تمام جسم سنور جاتا ہے۔ اور دوسری حدیث میں ہے اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَت صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔

اَلَا حروفِ تنبیہات میں سے ہے۔ یعنی وہ دل ہی ہے۔ اور تیسری حدیث میں فرمایا۔ اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا وَاَشَارَ اِلَی الْقَلْب۔ تقویٰ یہاں ہے اور اپنے دل کی طرف اشارہ فرمایا اور ایمان کا محل اور کلمہ کا محل وہ دل ہے تو کلمے کا محل بھی دل اور تقویٰ کا محل بھی دل۔ تو جس طرح کلمہ کی تصدیق دل میں ہے ایسے ہی ایمان کی تصدیق بھی دل میں ہے اور تقویٰ کی تصدیق بھی دل میں ہے۔ تو دیکھئے یوں تو دونوں خارجی طور پر جاءنی غُلامُ زید۔ الگ الگ ہیں لیکن یہاں اپنے آثار کے طور پر صفاتِ لوازم کے طور پر دونوں سے ایک ایک کلمہ ثابت ہوا تو اس کا لازم تقویٰ بھی ثابت ہوا۔ اِذَا ثَبَتَ الشَّیُٔ ثَبَتَ بِلَوَازِمِہٖ اس لئے اَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی فرمایا کہ جب کلمہ آیا اپنے لازمی طور پر تقویٰ کو بھی لایا وہ تقویٰ کہ جو کلمے کو مقتضی ہے اُسی تقویٰ کو کہا گیا ہے اَلتَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْر اس تقویٰ کو کہا گیا ہے جس میں شر کی آمیزش نہ ہو۔ نماز پڑھی، خدا کے حکموں کو مان کر طبیعت میں ڈر رکھتا ہو تقویٰ ہے۔ یہ خیر ہے اب جب مسجد سے نکلا تو لڑکے اور لڑکی کو نگاہِ بد سے دیکھ رہا ہے۔

بدنگاہی کا مرض :

بدنگاہی ایک عام مرض بن گیا ہے تو نماز کا پڑھنا خیر تھا اور بدنگاہی یہ شر ہے تو اس خیر کو اُس وقت خیر کہا جائے گا جبکہ شر ملا ہوا نہ ہو تو اُس تقویٰ کو تقویٰ کہا جائے گا جس میں شر ملا ہوا نہ ہو۔ تو ذاتِ باری تعالیٰ کے حکم کے خلاف کرنا شر ہے جو ہم

موضوع بنائے ہوئے ہیں ہمیں اسی طریقہ سے تو چلنا چاہئے جو ہمارے ساتھ پیدا کر کے چیزیں لازم فرمائی ہیں اب اُس کے خلاف اگر کیا تو لازم سے ہٹ کر شر کیا۔

تقویٰ کی تشریح :

جس کو گناہِ کبیرہ کہتے ہیں اِن کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہاں بات جب ہے کہ گناہِ صغیرہ پر بھی استمرار نہ ہو تو گناہِ کبیرہ تو بالکل ہی ترک ہو جائے گا یہ کلمۂ تقویٰ ہے اور صغیرہ اتفاقاً ہوا ہو لیکن اس پر استمرار نہیں۔ یعنی دائمی دوام نہیں ورنہ پھر شر آ گیا۔

چنگاری کی مثال :

اگرچہ آگ کا انگارہ نہ آیا مگر چنگاری تو آئی اور کیا چنگاری اپنے چھپّر میں ڈالنا گوارہ کرتے ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ انگارہ جلدی کام تمام کر دے گا اور چنگاری دیر میں لیکن جب بڑھ گئی چھپّر میں تو وہ انگارہ سے بھی آگے ہو گئی کہیں ایسا نہ ہو کہ محلّے کے چھپّروں کو بھی جلا دے۔ جب محلّہ میں ایک شر آ گیا تو محلّے والوں کو فکر ہو گئی۔ محلّے میں ایک چور پیدا ہو گیا تو محلّے والوں کو اس کی بھی فکر ہو گئی کہ خدا خیر کرے کہیں ہمارے گھر میں نہ گھس آئے تو گناہِ کبیرہ تو ظاہرہ و باطنہ بشمولِ اخلاقِ رزیلہ بالکلیہ ترک اور صغیرہ ترک۔ گو بتدریج صحیح مگر اصل کیوں اس لئے کہ تقویٰ کو خیر فرمایا ہے اور خیر وہ ہے جس میں شر کی آمیزش نہ ہو اس لئے وہ تقویٰ کہلایا جائے گا۔

☆

چھبیسویں مجلس

استقامت کی حقیقت واہمیت

یکم جمادی اوّل ۱۴۰۱ھ بمطابق ۲۰ نومبر ۱۹۹۰ء۔ بروز سہ شنبہ بوقت صبح

جزئیاتِ ایمان :

ایمان کی تکمیل کے بہت جزئیات ہیں :

مِن حَیثُ العِبَادَات، مِن حَیثُ المُعَاملاَت، مِن حَیثُ المُعَاشرَت، مِن حَیثُ الاَخلاَق ، جوکہ اَصل الاصول ہیں تمام عبادات ومعاملات اور معاشرت کے۔

مثال کے طور پر اگر ریاء کی گئی جس کا تعلق قصد سے ہے۔ اور ارادہ سے ہے اختیار سے ہے تو سارے کے سارے افعال غیر مقبول اور تمام افعال جو عباداتی کر رہا ہے غیر مقبول ہیں۔ ریاء قصدی ہے وسوسی یا وہمی نہیں۔ جب ریاء کی گئی تو عبادت تو کر رہا ہے لیکن غیر مقبول، ممکن ہے کہ صحیح ہو جائے مِن حَیثُ العِبَادَات لیکن مِن حَیثُ الرِّیَاء اختیاری اور قصدی مقبول نہیں۔

نماز میں ریاء :

جو نماز میں پڑھا جاتا ہے وہی پڑھ رہا ہے نماز کو فرض سمجھتا ہے اور فرض سمجھ کر ادا کر رہا ہے۔لیکن اس میں ریاء بھی ہو گئی وہ اِس طرح کہ لوگ دیکھیں گے، ذرا اچھا ہے اس وقت تو کوئی تھا نہیں میری اس عبادت کے وقت کوئی آ گیا اب مجھے دیکھیں گے بہت اچھا ہے، اس کی نگاہ میں ذرا بزرگ و نیک شمار ہوں گا ذرا اچھی نگاہ سے دیکھے گا ذرا عزت کی نگاہ سے دیکھے گا یہ ریاء ہو گئی مگر ایک دوسرا پہلو اور ہے، اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ مجھے کسی بدی میں نہیں دیکھا جس کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں میں ذلت ہوتی ہے رسوائی ہوتی ہے۔ اللہ تیرا شکر ہے کہ اس حالت سے مجھے محفوظ رکھا اے اللہ تیرا شکر ہے یہ نوعیت اور ہے اور وہ نوعیت دوسری ہے نیت کی، یہ ریاء نہیں ہے۔

وقت کی قدر :

وہ بھی کوئی آدمی ہے جس کو وقت کی قدر نہیں، وقت ضائع کر رہا ہے اُلجھن میں پڑ کر اس کے دل و دماغ میں انتشار ہو گا۔اس کا لگاؤ جو اللہ کے ساتھ تھا اس میں نسیان اور پریشانی آئے گی اس میں ایمان کا تعلق تو ہے لیکن جس کو تعلق کہتے ہیں ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ اس مؤمن کا تعلق اس طرح نہیں تو اسے کیا اُلجھن اور گھبراہٹ؟ اور اللہ والے کو گھبراہٹ ہے کہ اتنی دیر کے لئے خواہ مخواہ انتشار دماغ میں پیدا ہو گیا، سکون میں بے سکونی پیدا ہو گئی بلکہ یاداشت میں فرق آ گیا اللہ جان لیں گے کہ معذور ہے۔

اس وقت دھیان کیسے رہے گا دوسرے نے اس کا دھیان اپنی طرف موڑ دیا اس لئے اس کو گرانی ہو گئی، ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق تھا اس میں کمی آ گئی ادھر

کام میں کمی آئی ادھر دھیان میں کمی آئی، اس سے پوچھو کہ اگر تمہارے پیشے میں کمی آجائے تو کیسا رنج ہوتا ہے اور تندرستی جسمانی میں کمی آجائے تو کتنا رنج وغم ہوتا ہے۔

آدمی بننا چاہئے:

چونکہ بے آدمیت سے اپنے کو بھی تکلیف پہنچتی ہے گو اُس وقت محسوس نہ کرے مگر بعد میں احساس ہو جاتا ہے اور دوسرے کو بھی اس کی بے آدمیت سے سخت تکلیف پہنچتی ہے آدمی بے آدمی کا طریقہ اختیار کر رہا ہے اس وقت تو اس کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی لیکن بعد میں اس کو بھی تکلیف محسوس ہوگی اور بالخصوص جب اس کو سمجھا دیا گیا ہو تو اُس وقت اس کو اور بھی احساس ہوگا پھر کہے گا او ہو بہت بھاری غلطی ہوئی۔

اور آدمیت کی بات یہ ہے کہ پہلے سے اہتمام کرے اس بات کا کہ مجھے جو کہنا ہے کس طرح کہوں، جب یہ اہتمام رکھے گا تو غلطی کم ہوگی اور ہلکی ہوگی۔ اور جب یہ اہتمام نہیں ہوگا تو غلطی زیادہ ہوگی اور بھاری ہوگی۔ لیکن ہم بے فکر ہیں اسلئے حضرت سے جب کوئی کہتا تھا کہ میں نے جان کر آپ کو تکلیف نہیں دی تو حضرت والا فرماتے توبہ، توبہ، کسی کی نیت پر حملہ کرنا کہاں دُرست ہے کہ میں یہ کہوں تم نے جان کر تکلیف دی میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ "آپ نے اہتمام کیوں نہیں کیا کہ میرے اس طریقِ عمل سے، طرزِ کلام سے کسی کو تکلیف نہ پہونچے" اہتمام نہ کرنا یہی خلافِ آدمیت اور خلافِ انسانیت ہے اُلٹا کام کر لیا، لٹھ ماری بات کر لی لیکن جب ٹوک رہے ہیں تو ناگواری ہے، جب مریض کو طبیب بد پرہیزی کرتے ہوئے دیکھے گا تو ٹوکے گا یا پھر کرنے دے گا؟ تو ایسے ہی یہ حضرات جو اصلاح کے لئے بیٹھے ہیں آنے والے اپنے بھائی سے کوئی بے آدمیت کی بات دیکھیں گے تو وہ ٹوکیں گے اور یوں سمجھیں

گے کہ ہمارا کوئی رشتہ دار تو ہیں نہیں عزیز داری یا دوستانہ تعلقات بھی نہیں جو ملنے کے لئے آیا ہے وہ کوئی مریض ہی ہوگا اور اس کا مرض سامنے آ بھی گیا تو اب وہ طبیبِ باطنی ٹوکے گا یا نہیں ٹوکے گا.........؟ پھر ٹوکنے پر ناگواری کیوں ہوتی ہے بلکہ خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے مرض کو دفع کرنے کا طریق علاج بتایا جارہا ہے۔

استقامت مطلوب ہے :

یہ استقامت کی فرع ہیں اور استقامت مطلوب ہے اگر استقامت مطلوب اور مقصود نہ ہوتی تو سُورَۃُ الفَاتِحَہ میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ کا ذکر نہ ہوتا۔

نماز سے کیا فتح ہوتی ہے ؟

سُورَۃُ الفَاتِحَہ نماز میں پڑھی جاتی ہے۔ جب کبھی چل کر فتح ہوگی جس کا نام سُورَۃُ الفَاتِحَہ ہے۔ فتح چاہتے ہیں اور نماز کا نام نہیں۔ اچھا صاحب نماز سے کیا فتح ہو گی؟ یہ مؤمن ہے جو ایسی بات کہے کہ نماز سے کیا فتح ہوگی؟ ارے نماز ہی کی فتح ہے ساری، ہیبتیں پیدا ہوں گی ہیبتیں بیٹھیں گی۔ اگر نماز بستی میں وقت پر مسجد میں جا کر پڑھی جائے پرے کے پرے جارہے ہیں تو کیا کفار کے دلوں میں ہیبت نہیں بیٹھے گی؟ رُعب نہیں آئے گا ضرور آئے گا! یہ تو معراج ہے اور معراج کے معنی ہیں صَعود، ترقی لیکن مؤمن مؤمن ہو کر یہ کہتا ہے کہ نماز سے کیا ملے گا نمازیوں سے محلّے کے محلّے خالی ہیں۔ یہ معراج ہے حدیث میں ہے۔ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِن (نماز معراجِ مؤمن ہے)۔

فَاتِحَہْ کے رَموز :

اللہ تعالیٰ کو استقامت مطلوب ہے اِس لئے پوری فَاتِحَہْ میں اوّل تو ذاتِ

باری تعالیٰ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن o الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم o (سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں) مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْن o (جو مالک ہیں روز جزا کے) کہہ کر اپنا درجہ بتلا دیا، القاب و آداب بتلا دیئے۔ جب کوئی آدمی کسی حاکم کے سامنے اپنی ضرورت پیش کرے گا تو کیا اس کے القاب و آداب نہیں ہوتے اور جیسا حاکم ہوگا ویسے ہی القاب و آداب زبان پر لائے گا اور درخواست میں لکھے گا تو اللہ تعالیٰ نے وہ القاب از خود بتلا دیئے ہیں کہ مجھے یوں کہو اور کیوں نہ کہو جبکہ کلامِ باری تعالیٰ کا ترجمۃ الباب بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ہے اب آگے پورا کلام اس دعویٰ کی دلیلیں ہیں۔ یہ ترجمۃ الباب ہے بِسْمِ اللّٰہ ...... الخ پورے قرآن کا۔ پھر آگے وہ دلائل ہیں۔ اور جب شروع کیا دعویٰ کے دلائل کو تو لفظِ اللہ کے ساتھ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔

تربیت کی مثالیں :

حمد کیوں ہے.........؟ اس لئے کہ وہ رب العالمین ہے اور کس کی حمد ہوگی جبکہ زمین و آسمان کی وہ تربیت کرے سورج و چاند تاروں کی وہ تربیت کرے، بارشوں اور کھیتوں کی تربیت کرے۔ یہ نہیں کہ بس انسان ہی کی تربیت کرتا ہے کیا سورج اور زمین کی وہ تربیت نہیں کرتا؟ زمین پر جو بھی رہتا ہے اُس کی تربیت وہ کرتا ہے زمین کے اندر جو کچھ رہتے ہیں اُس کی تربیت بھی وہ کرتا ہے پانی اور جو اس میں رہتے ہیں ان سب کی تربیت وہ کرتا ہے پتھر کی تربیت کرتا ہے اور پتھر کے اندر جو کیڑا رہتا ہے اُس کی تربیت بھی وہی کرتا ہے۔

گھر میں داخل ہونے کے آداب :

جنتی ہونا آسان ہے لیکن آدمی بننا بہت مشکل ہے، بکری یا کتا گھر میں گھستا ہے تو کیا اجازت بھی لیتا ہے۔ سلام بھی کرتا ہے؟ خواہ گھر کا کتا ہو یا باہر کا۔ اب یہ گھر کا آدمی باہر گیا اور باہر سے گھر واپس آرہا ہے اور گھسا ہوا چلا گیا، اب بتائیں اس آدمی میں اور جانور میں کیا فرق ہے....؟ شکل میں آدمی مگر جانوروں والی صفت۔

اٹھارا ہزار عالم :

عالَم کی دو قسمیں ہیں عالمِ دُنیا اور عالمِ آخرت، اور عالمِ دُنیا کی بہت جزئیات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارا ہزار عالَم ہیں تو اِن کی پرورش کون کرے، وہ کتنا قادر و طاقتور ہے۔ جو اتنی قدرت والا ہے جس کے ہاں کُن فیکون والی قدرت ہے سب یہ تربیتاً الہامی چیزیں ہیں دیکھو جب بچہ پیدا ہوا اِس کو کس نے سبق سکھایا تھا کہ یہ لتاں میں اور غیرِ لتاں میں فرق کر رہا ہے، جب جائے گا تو لتاں ہی کی گود میں اگر ماں ہٹ جائے تو رونے لگے گا۔ جب دودھ پیئے گا اگر ناک میں لگا دیا تو کیا ناک سے دودھ پیئے گا؟ یہ دودھ پینا پہلے ہی اس بچے کو کس نے سکھایا، یہ چوسنا کس نے سکھایا۔ یہ سب الہامی چیزیں ہیں، چھوٹا بچہ ابھی دو چار یا چھ مہینے کا یا سات مہینے کا اس سے ذرا چٹکی بجا دو تو یہ ہنسنا کس نے سکھایا۔ یہ سب فضلِ الٰہی کی مثالیں ہیں ابھی بول تو نہیں سکتا اور بولنا چاہتا ہے تو الفاظ و حروف ابھی نکل نہیں سکتے، یہ اس کی تربیت جو ہو رہی ہے جو اپنی ضرورت کی چیزوں کو پورا کر رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون سکھلا سکتا ہے۔

اِلہام مقامِ فخر نہیں ہے :

وحی کی بات اپنی جگہ لیکن اگر کسی کو الہام ہو جائے تو کیا کمال ہے وہ تو بچے کو بھی ہوتا ہے۔ اگر کسی کو الہام ہونے لگا تو فخر کی کیا بات ہے، کیا بچے کو فخر ہوتا ہے؟ جو چیز عاقل بالغ مؤمن میں ہے وہی چیز غیر بالغ میں قدرتی طور پر بھی موجود ہے، اُس سے بھی وہ بات صادر ہو رہی ہے اور اس عاقل بالغ مؤمن سے بھی وہ بات صادر ہو رہی ہے تو مُساوات ہوگئی لہٰذا اس پر ناز کرنے کی کیا بات فخر کرنے کی کیا بات ہے، وہ تو بچے میں بھی ہے۔

پہاڑ پر بھی اللہ تعالیٰ کی خشیت آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اس پر بھی ہوتا ہے پتھر نیچے گر جاتا ہے، درخت پر بھی ایک رقّت سی آ جاتی ہے وہ بھی رونے لگتا ہے اس کے بھی آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ حضور ﷺ کا اُستوانہ تھا آپ ﷺ اس پر سہارا لے کر خطبہ پڑھتے تھے جب آپ ﷺ نے اس پر سہارا لگا کر خطبہ دینا چھوڑ دیا کہ منبر شریف بن گیا تو وہ اُستوانہ رویا۔ تو یہ باتیں شجر و حجر میں بھی ہیں اگر یہی باتیں انسان عاقل بالغ مؤمن میں بھی آ جائیں تو کیا کمال ہوا، ہاں اس کے اثرات دائمی ہونے چاہئے وہ اگر نہیں آئے تو بتلاؤ اس آدمی مؤمن، عاقل اور شجر و حجر میں کیا فرق ہے۔ اگر رویا تھوڑی دیر کے لئے تو کیا ہوا، اگر ڈر کے مارے جھجک وقتی طور پر ہوگئی تو کیا ہوا؟ اس کا اثر کیا آنا چاہئے، اس رقّت کا، اس سوز کا، اس خشیت کا، اس خوف کا کیا اثر آنا چاہئے، جب وہ نہیں تو ایسا تو شجر میں بھی اور حجر میں بھی اضطرار ہوا اور جو شے اضطراری قسم کی ہو اس میں کیا فخر اور کیا ناز کی باتیں ہیں۔

مجنون کو بھی کشف ہوتا ہے :

اطباء نے لکھا ہے کہ واقعی جو مجنون ہوتا ہے اس کو بھی کشف ہوتا ہے۔ تو مُشترک چیز ایک انسان عاقل بالغ مؤمن میں بھی اور دوسرے میں بھی ہوئی اس میں کیا ناز ہے وہ صاحبِ کشف ہے یا صاحبِ الہام ہے اس حقیقت کو ہمارے حضرات اکابر نے پہچان کر، کبھی اپنے لئے الہام و کشف پر ناز نہیں کیا۔

ہر عمل سے مقصود رضائے الٰہی ہونی چاہیئے :

ہمارے اکابر نے اس حقیقت کو جان کر بھی اس کی قدر نہیں کی قدر تو اس چیز کی ہے جس میں رضائے الٰہی حاصل ہو، قربِ الٰہی حاصل ہو اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَ حُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَ حُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُ اِلیٰ حُبِّکَ کہ اے اللہ میں آپ سے آپ کی محبت کا سوال کرتا ہوں اور ایسے عمل کا سوال کرتا ہوں جو آپ کی طرف قرب بڑھانے والا ہو اور جو آپ کی محبت کی طرف بڑھادے۔

جب تک کہ اِس رونے کا اثر اعمالِ صالحہ اور اجتنابِ معاصی پر نہیں پڑا، اس رونے سے کیا ہوا، وہ تو درخت بھی رویا، اے انسان جس عمل کا تجھے مکلف کیا گیا ہے اس پر کیا اثر پڑا اس عمل سے کہ حضور ﷺ خود فرماتے ہیں کہ اے اللہ میں تیری محبت چاہتا ہوں اور محبتِ عمل چاہتا ہوں لیکن اس عمل کی جو عمل تیرے قرب میں معین بنے۔ یہاں سے یہ باتیں معلوم ہوئیں کہ اصل مطلوب ذاتِ باری تعالیٰ کی محبت ہے ہاں نمکینی کے طور پر اس محبت میں کچھ خشیت بھی مل جائے صرف نمکینی کے طور پر، یہ نہیں کہ ہانڈی نمک ہی نمک کردیا پھر تو اس کا کھانا مشکل، وہ تو تھوکنا پڑے گا۔ مثال کے

طور پر ایک شخص کا ایک لڑکا ہے چہرہ سفید ہے سُرخی لئے ہوئے ہے لیکن جو نقشہ ہے چہرے کا وہ متناسب نہیں کیا کشش ہوگی؟ اور کچھ سانولا ہے لیکن نقش ایسا ہے کہ طبیعت ادھر کھینچتی ہے یہ چہرے کی نمکینی ہے۔ کیا حضورِ اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کی تشبیہات شمائل میں مذکور نہیں ہیں۔

حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ میں اَخوفُ الاَشیاء کا طالب ہوں لیکن وہ آپ ﷺ کے ساتھ ایسا ہو جو میرے اور آپ کے درمیان آپ کے خلاف کرنے سے حائل ہو جائے۔

اہلُ اللہ کی محبت مطلوب ہے:

محبت حضور ﷺ کو کتنی تھی لیکن اس کے باوجود بھی درخواست کر رہے ہیں میں یوں چاہتا ہوں کہ کوئی بندہ ایسا ہو مؤمن کہ جس کو تجھ سے محبت ہو اور مجھے بھی اِس سے محبت ہو لیکن اِس کی محبت تیرے نزدیک تیری محبت میں نفع دے تو اس کی محبت چاہتا ہوں، کیا کم محبت تھی حضور پرنور ﷺ کو حق تعالیٰ سے اور پھر اس کے باوجود ذاتِ باری تعالیٰ کے محبوب کی محبت چاہ رہے ہیں کہ اِس کی محبت سے مجھے تیری محبت میں زیادتی کا نفع ہو، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب کی صحبت فراوانیٔ محبتِ الٰہی ہے اور اس عمل میں جس میں تقربِ الٰہی بڑھتا رہتا ہے خاص اثر رکھتا ہے۔ یہاں تو یہ فرمایا اور دوسری جگہ کچھ اور فرمایا، یہ قید ہی نہیں اس میں، فرمایا: اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یَنْفَعُنِیْ حُبُّہٗ عِنْدَکَ ۔ یہاں یہ فرمایا کہ نفع دے اور دوسری جگہ یہ فرمایا: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُحِبُّکَ اور اس شخص کی محبت کا تجھ سے سوال کرتا ہوں جس کو تجھ سے محبت ہے۔

معلوم ہوا کہ جس کو واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت ہو اُس کے پاس بیٹھنے سے بھی محبتِ باری تعالیٰ کو جو اس کے دل میں ہے اس کا اثر اس بیٹھنے والے پر ہوتا ہے۔ بلا بولے وہ کچھ نہیں کہہ رہا ہے پھر بھی نفع پہنچ رہا ہے۔

اہلِ محبت کی پہچان :

اب یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ مؤمن، عاقل، بالغ ذاتِ باری تعالیٰ کی محبت واقعی اپنے دل میں لئے ہوئے ہے وہ معلوم ہوگا کثرتِ عبادت اور اجتنابِ مشتبہات مع تکثیرِ ذکرِ لسانی وقلبی سے، یہ دلیل ہے۔ تو یہ دلالتِ مطابقی بھی ہے اور دلالتِ تضمّنی و التزامی بھی، ساری دلالتیں اس میں موجود ہیں۔ یہ اشارات ہیں اس بات کے کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے۔ اب یوں وہ انسان ہے کبھی فروگذاشت ہو سکتی ہے تو اس وقتی فروگذاشت کا کیا اعتبار، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ وہ اپنے دل میں محبتِ حق تعالیٰ رکھتا ہے، جب بھی موقع ملتا ہے اس کو تو ذاتِ باری تعالیٰ کی عبات کے لئے خالی رہنا نہیں چاہتا ہے جب بھی موقع مل جاتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لئے اپنے اُوپر مشقت، تعب بھیجتا ہے چھوڑتا نہیں۔

خدمتِ خلق اور تبلیغِ دین بھی ذِکر وعبادت ہے :

خدمتِ خلق میں لگا ہوا ہے صحیح صحیح احکامِ اسلام پہنچانے کے لئے خدمتِ خلق میں لگا ہوا ہے، نیت حق تعالیٰ جانتے ہیں اخلاص کے ساتھ لگا ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت میں لگا ہوا ہے ان ہی کے ارشادات کی تعمیل میں لگا ہوا ہے۔ لیکن جونہی خلقِ خدا کی خدمت کرنے سے فُرصت ہوئی تو وہ اپنے لئے ذاتی عبادات کے واسطے اپنے اس وقت کو ضائع کرنا نہیں چاہتا بلکہ عبادت میں کھڑا ہو گیا، بشرطیکہ طلوعِ شمس نہ

ہو، غروبِ شمس نہ ہوا گر نفلی طور پر ہے تو بعد الفجر اور بعد العصر نہ ہو۔ یہ صحیح معنی میں نائب رسول ہے اور رسول اللہ کو ذاتِ باری تعالیٰ نے حُکم دیا تھا فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ جب آپ ﷺ دعوتِ اسلام مخلوق کی طرف سے فارغ ہو جائیں تو اپنی ذاتی عبادت کے لئے اپنے اُوپر مشقّت اُٹھایئے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ میں تعمیم :

اب عبادات میں کسی قدر تعمیم ہے جو فَاِذَا فَرَغْتَ کے لفظ سے ظاہر ہے اسی لئے صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم رات کے آخر میں اُٹھ کر عبادت میں قربِ الٰہی اور ثواب سمجھتے ہیں اسی طرح اپنی نوم و نیند کو بھی عبادت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ سونا اللہ تعالیٰ کے حُکم کے تحت ہے کہ رات اللہ تعالیٰ نے اس لئے بنائی اسی۔ لئے نیند بنائی ہے۔ وَ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًاo وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًاo جہاں لِباس کہا ہے وہاں سُباتاً بھی کہا ہے :

وَ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًاo وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًاo وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًاo

اور ہم نے ہی دن کو معاش کا وقت بنایا اور ہم ہی نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنائی۔

لباساً (پردہ) اور چیز ہے اور سُباتاً (راحت) اور چیز ہے تو معلوم ہوا کہ صحابہؓ کیا کہتے ہیں کہ ہم رات کے سونے کو بھی عبادت سمجھتے ہیں اس لئے کہ بحت حُکمِ الٰہی ہے۔ اب جب فَاِذَا فَرَغْتَ آ گیا کہ فارغ ہو گئے تو تمام رات چار پائی پر لیٹے رہوں، مطالعہ تو آخری رات میں بھی ہو سکتا ہے ضروری نہیں کہ شروع رات میں کر سو کر اُٹھ کر کرو اور نیند چھوڑ کر اب دو چار رکعت نماز بھی پڑھ لی جائے۔

عِلم پرعَمل کا فائدہ :

حدیث شریف میں آیا ہے: مَن عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللهُ عِلْماً مَالَمْ یَعلَمْ کہ جو صحیح علم پڑھے ہوئے پر عمل کرتا چلا گیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے علم کا وارث بنائیں گے علمِ نافع بخشیں گے کہ جو اس نے کبھی پڑھا ہی نہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ :

جاہل لوگ امتحان لیتے پھرتے ہیں بزرگوں کا، ایک شخص پہنچ گیا ایک بزرگ کے پاس کہا مجھے آپ سے مسئلہ معلوم کرنا ہے کہ حضرت؟ وضوء میں تو چند چیزیں فرض ہیں اور فرض کا درجہ بہت اعلیٰ ہوتا ہے، ہاتھ کہنیوں تک دھونا، چہرہ دھونا، سر کا مسح کرنا، ٹخنوں تک پیروں کو دھونا، بس یہ چار چیزیں ہوئیں تو پھر یہ کیا قصہ ہے کہ پہلے کلائی تک ہاتھ دھوؤ پھر کلی کرو پھر ناک میں یوں کرو تو یہ چیزیں فرض تو ہیں نہیں واجب بھی نہیں ہیں تو فرض کا نمبر بعد میں آرہا ہے اور اس سے پہلے یہ فروعات جن کا درجہ کم ہے یہ کیا بات ہوئی؟۔

یہ بزرگ سُنتے رہے اور پھر فرمایا کہ بجائے مجھ سے پوچھنے کے میرے اُس مُرید سے پوچھ لے خادمِ خاص جو ہر وقت پاس رہتا ہے مولوی نہیں ہے وہ، پاس رہتا ہے اُس سے پوچھ لے اُنہوں نے کہا کہ اس سے کیا پوچھوں جاہل آدمی سے۔

فرمایا آپ اس سے پوچھ لیجئے گا نہیں بتائے گا تو بعد میں میں بتلا دونگا آپ کو۔ اس نے کہا دیکھئے وضوء میں چہرہ جو دھویا جائے گا وہ فرض ہے جو آپ بھی فرما رہے ہیں تو کس چیز سے دھویا جائے گا پانی سے یا کس سے؟ فرمایا پانی سے، تو پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ پانی اس قابل بھی ہے کہ اس سے فرض ادا کیا جا سکے۔ اس کے بعد ہاتھ

کو دیکھا جائے گا کہ ہاتھ بھی اس قابل ہیں کہ فرض ادا کر سکیں تو پہلے ہاتھوں کو دھویا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ :

حضرت امام احمد بن حنبلؒ ایک بزرگ کی زیارت کے لئے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جا رہے تھے امام صاحب نے اِس ساتھی سے کہا کہ دیکھو تم چل تو رہے ہو میرے ساتھ لیکن اُن سے تم بحث و مباحثہ کچھ سوال مت کرنا بس اُن کے ساتھ بیٹھ کر اُن کی باتیں سُنتے رہنا اور اُٹھ کر چلے آنا۔ لیکن وہ تھے مولوی صاحب، بھلا مولوی صاحب کہاں چُپ رہ سکتا ہے اس ساتھی نے زکوٰۃ کا مسئلہ چھیڑ دیا اُن بزرگ کے سامنے۔ بزرگ نے کہا کہ اِس کو تو آپ جانیں کہ اتنے اتنے نصاب پر اتنا اتنا زکوٰۃ ہے اور اِس کو بھی تو آپ جانیں کہ کون سا غریب لائق زکوٰۃ ہے اور بتا بھی رہے ہیں لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ایسے شخص پر سزا ہونی چاہئے کہ اس نے اتنا مال جمع کیوں ہونے دیا کہ زکوٰۃ واجب ہوگئی اور اب ادا کرنی پڑ رہی ہے، وہ سزا کے قابل ہے کہ جتنا مال ہے اس کا اتنا اور خیرات کرنا چاہئے سزا کے طور پر۔ چُپ ہو کر مولوی صاحب بیٹھ گئے، امام احمد بن حنبلؒ نے باہر آ کر کہا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ اُن سے بات مت کرنا یہ سب کچھ جانتے ہیں (بندائے کشف) اُن سے بات کر کے کیا ہوا، اپنے منہ کی کھائی۔

بزرگوں کے پاس خاموش ہو کر بیٹھنا چاہئے :

تو بزرگوں کے پاس جا کر بس خاموش بیٹھ کر سُنتے رہو خاموشی کے ساتھ۔

اُن سے بحث و مباحثہ، سوال و جواب مت کرو۔ اگر اُن سے فیض لینا چاہتے ہو تو سُنتے رہو بس، وہ بات اُن کی کہیں نہ کہیں نکل ہی آئے گی کتاب میں تم اِن تک نہیں پہنچ سکتے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم والی نعمت کہ جو ہماری زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہیں سب میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے توفیق ارزانی عطاء فرمائیں۔

(آمین یا ربّ العالمین)

☆

ستائیسویں مجلس

عِلم وحِلم توامین ہیں

مورخہ ۶ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ ۲۳ مارچ ۱۹۹۱ء

بروز شنبہ بوقت صبح بمقام جلال آباد مظفر نگر

عالمِ صغیر عالمِ ابتلاء ہے :

یہ عالمِ صغیر عالمِ ابتلاء ہے تکوینی حیثیت سے نہ کہ تشریعی حیثیت سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا تو یہ عالم، عالمِ ابتلاء تشریعی کہاں ہوا۔ یہ عالم عالمِ تکلیف مِن حَیْثُ التَّکْوِین ہے۔

تشریعًا اِس عالم میں سہولت ہے :

تشریعًا تو بڑی سہولتیں ہیں بڑی آسانیاں ہیں اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا کرم فرمایا ہے ایمانی حیثیت سے بڑی تسہیل ہے اور معاملاتی حیثیت سے بھی بڑی تسہیل ہے۔

نکاح میں مشکلات ہم نے خود پیدا کی ہیں :

مثلاً نکاح کرنا اس میں کتنی تسہیل کی ہے، ہمارے نبی ﷺ جو کہ نبی آخر الزماں ﷺ ہیں جن پر تمام احکامات قیامت تک کے لئے مقرّر کر کے بھیجے گئے ہیں اُنہوں نے شادیاں کر کے دکھلائی۔ حضور ﷺ کو اُمت کے لئے مذکر بنا کر بھیجا گیا آپ ﷺ لساناً بھی مذکر ہیں اور تعمیلاً بھی مذکر ہیں کہ آپ نے عبادات بھی کر کے دکھلائیں اور معاملات بھی، نکاح شادی وغیرہ بھی کر کے دکھلائی۔ اپنی صاحبزادی کی شادی کر کے دکھلائی اور اپنی ازواج سے بھی شادیاں کر کے دکھلائی جن میں ہر طرح کی سادگی تھی۔ اب بتلائیں کہ اس طرح شادیاں کرنے میں کونسی تکالیف ہیں ...... ۔

مگر ہم نے اس عملِ شرعی میں اپنے اختیار سے اتنی تکالیف پیدا کر لیں کہ الامان الحفیظ۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم لوگ ایک مکان بناؤ اور اس کے نیچے چار پائے لگاؤ اور اس میں بیٹی کو بٹھا دو اور اس میں سامان بھی پورا پورا ہر قسم کا رکھ دو اور پھر لڑکے والے کو کہنا کہ بھائی یہ مکان ہماری طرف سے تمہارے لئے ہے تو اگر پھر بھی لڑکے والے خوش ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ تو پورا گھر دے دیا بیچارے نے اُٹھانے کی تکلیف سے بچنے کے لئے نیچے پائے بھی لگا دیئے لیکن لڑکے والے پھر بھی راضی نہیں ہوتے۔ تو یہ تکلیف اس تشریعی امر میں ہم نے پیدا کی ہے شریعت میں تو بہت آسانی ہے۔

احکامِ خداوندی مشکل کیسے ہو سکتے ہیں :

بھلا جب باپ بیٹے کو جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو اس کا حکم نہیں دے سکتا تو اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْن اپنے بندے کیلئے کوئی ایسا کام تجویز کرے گا جو بندے سے نہ اُٹھ سکے..........؟ تو تکلیفیں خود ہم نے پیدا کی ہیں۔

نکاح کا ایک عجیب واقعہ :

ایک جگہ عجیب واقعہ ہوا کہ ایک باپ نے اپنی بیٹی کے لئے بہت سامانِ جہیز تیار کیا اور لڑکے والوں کو دکھلایا۔ ہر قسم کا سامان تھا لیکن لڑکے والوں کو اسے دیکھ کر بھی گرانی ہوئی۔ جب قاضی نکاح کرانے بیٹھے اور مہر کا نمبر آیا تو لڑکی والے نے بہت اُونچا مہر بتلایا۔ لڑکے والے نے کہا کہ یہ تو بہت زیادہ ہے تو لڑکی والے نے کہا کہ اگر یہ بہت ہے تو میں نکاح نہیں کرتا، جب میں نے اتنا مال جہیز میں دیا اور تمہاری نظر میں نہیں آیا تو میں اس سے کم پر نکاح کیسے کروں، کیا میں اپنی لڑکی کو تمہارے ہاں بھیج کر ذلیل کراؤں، چنانچہ نکاح نہیں ہوا۔

ایک بنئے کی حکایت :

میرے پاس ''چرتھاول'' کا ایک بنیا دعاء کرانے کے لئے آیا تھا تو اس نے باتوں باتوں میں کہا کہ اجی حضرت جی! ہمارے ہاں تو یہ پہلے ہی سے تھا کہ لڑکی والے سے سودا ہوتا تھا کہ کیا دو گے اب تو آپ کے یہاں لوگ ہم سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ میں سُن کر شرما گیا، تو یہ عالم اِبتلاء تکوینی ہے تشریعی نہیں کوئی حکم بھی ہو چاہے نماز کا ہو چاہے روزے کا ہو، چاہے زکوٰۃ کا ہو، چاہے حج کا ہو، یا معاملاتی حیثیت سے ہو، معاشرتی حیثیت سے ہو، ان میں کوئی ایسی اِبتلاء کی بات نہیں۔ ہاں فقرو اَفلاس کا ہونا، تنگدستی کا ہونا، بیماری کا ہونا، دُشمنوں کے ڈر سے کسی کا غلبہ ہونا، یہ تکوینی حیثیت ہے۔ اسی کو قرآن میں فرمایا گیا ہے، ممکن ہے یہ دلیل بھی بنتی ہو، وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرَاتِ O یعنی ہم

تمہارا امتحان لیں گے کسی قدر خوف سے اور فاقہ سے اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے۔ تو یہ آزمائش تکوینی ہے۔ ایک اور آیت ہے تکوین سے متعلق انتیسویں پارہ میں ہے: تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ O الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا O یعنی وہ بڑا عالیشان ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے۔

موت سے آزمائش اس طرح ہے کہ موت کے اعتقاد سے حشر کا اعتقاد ہوگا اور حشر کے اعتقاد سے حیات میں گناہوں سے بچنا اور خلاف کرنے سے ڈرتا رہے گا اور حیات اگر نہ ہو تو پھر وہ احکام کس لئے ہیں؟ احکام تو اسی لئے ہیں کہ دُنیا کو میں نے زیبائش کے ساتھ پیدا کیا کہ اس دنیا میں زینت و رونق کی ایسی چیزیں ہیں جو نظروں کو اپنی طرف کھینچنے والی ہیں۔ تو دیکھوں کہ اس پر فریفتہ ہو کر مجھ سے اعراض کرتے ہیں... اور جو نظروں کو اپنی طرف سے اعراض کر کے اعمال میں فریفتہ ہوتے ہیں اسی کی دوسری آیت میں تنبیہ کر دی۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ یعنی طرح طرح کی رونق کی چیزیں بڑی زیبائش اور زینت کی چیزیں یہ دنیوی زندگی کی چہل پہل ہے ان کو دیکھ کر اپنی آنکھوں میں بت بسانا.. یہ ان کفار کے لئے امتحان ہے، یہ ان کے لئے دھوکہ ہے اسی لئے تو کفار کہتے تھے کہ ہم سے اگر خدا تعالیٰ ناراض ہوتے تو یہ چیزیں ہمارے لئے کیوں پیدا کرتے، اے مسلمانو! تم سے ہوں گے ناراض نہ تمہارے پاس وہ جائیداد ہے نہ جاگیر ہے نہ غلام ہیں نہ باندھی ہیں نہ یہ ہے نہ وہ ہے تو یہ دھوکہ ہو گیا کفار کو اس لئے مسلمانوں کو

تنبیہ کردی کہ خبردار! ہرگز ایسا مت سوچنا، یہ عالم ابتلاء تکوینی حیثیت سے ہے۔

تکوینی اِبتلاء کا فائدہ :

دو ہی مقام ہیں ایک صبر کا دوسرا شکر کا۔ اگر یہ آزمائش کی چیزیں پیش نہ آئیں تو پھر صبر کہاں ہوگا، یہ چیزیں پیش آئیں تو صبر سے کام لیا جائے، تحمل سے کام لیا جائے، اگر تمہارے مزاج کے مطابق پیش آئیں تو شکر سے کام لیں اگر طبیعت کے موافق ہیں تو اِترانا مت اور خلافِ طبیعت پیش آئیں تو گھبرانا مت، پریشان مت ہو جانا، دونوں حالتوں میں مجھے یاد رکھنا طبیعت کے خلاف پیش آتے رہنے پر تو یہ خیال کر لینا کہ میری معیت تمہارے ساتھ ہے اس کو سوچو! اس سے زیادہ اور کیا بات ہوگی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، جب تم اس کو سوچ لو گے تو تم برداشت کر جاؤ گے۔ تمہارا یہ حال ہوگا کہ اندر تمہارا دل خوش ہو رہا ہوگا جسم البتہ تکلیف محسوس کرے گا۔ مصیبت کے وقت اس کا مُراقبہ کرنا ذرا سوچنا، اِنَّ اللّٰہَ مَعِی اللہ میرے ساتھ ہے، غارِ ثور میں جب ہجرت کی رات رسول اللہ ﷺ چھپے تھے اور ابوبکرؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ حضور ﷺ کفار تو سر پر آگئے تو حضور ﷺ نے فرمایا تھا، لَا تَحزَن اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے، بس غم دور ہو گیا خوشی حاصل ہو گئی۔ جب معیّت کو سوچے گا تو دل میں اسے شادمانی ہوگی، بادشاہ ہوگا اگرچہ جسم کرب و بے چینی میں ہو۔ اس لئے حدیث شریف میں آیا ہے۔

چار چیزوں کا حصول مثلِ دُنیا کا حصول ہے :

کہ زُبان ذَاکر ہو، دِل شاد ہو، جسم صابر ہو، زوجہ ناظرہ ہو، انتظام و نگرانی

کرنے والی ہو، یعنی اپنی بھی نگرانی کرے کہ عفت وعزت سے رہے اور شوہر کے گھر کی چیز کی بھی نگرانی کرے اور انتظام کرے۔ تو اگر یہ چاروں چیزیں مسلمان کو مل گئیں تو حدیث میں ہے کہ اُسے دُنیا مل گئی، اُسے جنت کا لُطف وفیض حاصل ہوا۔ تو صبر میں معیت ہے اور شُکر میں زیادتِ نعمت ہے لَئِن شَكَرتُم لَأَزِيدَنَّكُم اگر تم شُکر کرو گے تو میں اور زیادہ دوں گا اسی لئے کھانے کے بعد یہ دعاء ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

اِسلام پرشُکر کرنا بقائے اسلام پر مُہر ہے :

اسی میں و جعلنا من المسلمین بڑھا دیا تو یہ شکر کرنے سے مُہر لگ گئی اپنے مسلمان ہونے پر۔ کیونکہ جب اسلام پر شکر کرتا رہے گا تو حسب وعدہ اسلام زیادہ ہوتا رہے گا اور آخر دم تک مسلمان بنا رہے گا یہی مُہر لگنا ہے تو اس اسلام پر شکر کرنے کا خیال رکھنا اور کیسی رحمت ہے کہ کھانے پر شکر کرنے کے ساتھ مسلمان ہونے کو ملا دیا کیونکہ کھانا کھانے کے بعد طبعی طور پر شکر کیا ہی جاتا ہے تو اسی کے ساتھ اسلام پر بھی شکر ہو جائے گا۔

تو حق تعالیٰ نے فرمایا: زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ خبردار! اس دنیوی زینت، زیبائش اور بہار کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی مت دیکھنا، یہ آزمائش کی چیزیں ہیں اور ان سے بچنے کے لئے ایک چھوٹا سا مُراقبہ بھی تعلیم فرما دیا کہ : وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰكُمْ ○ جب باہر نکلو تو یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں تمہارے باہر کے چلنے پھرنے کو، اُٹھنے بیٹھنے کو، ملنے جُلنے، کو بازاروں میں سیر و تفریح کو، بازاروں

میں، پہاڑوں میں، دریاؤں میں، جہازوں میں سفر کرنے کو اللہ جانتے ہیں تمہارے چلنے پھرنے کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کیا مطلب؟ ہوشیار..........! آنکھوں کی حفاظت، زبان کی رُکاوٹ، کانوں کا بہرہ پن، قدم کا سوچ کر اُٹھانا، غافل ہو کر نہیں، مجھ کو یاد رکھ کر قدم اُٹھانا باہر، اور گھر میں بھی یوں مت سمجھنا کہ میں اپنے گھر میں ہوں جس طرح چاہوں رہوں سہوں، نہیں! بلکہ گھر میں بھی سوچو کہ بیوی کے ساتھ بات کس طرح سے ہو رہی ہے، اولاد کے ساتھ کس طرح سے ہو رہی ہے۔

میاں اور اُستاد کے اَوصاف :

میاں بننے کا شوق ہے میاں بننا آتا نہیں، باپ بننے کا شوق ہے باپ بننا آتا نہیں، اُستاد مدرّس بنا بیٹھا ہے بننا آتا نہیں۔ درس پڑھانے جائے تو ذرا سوچ کر جائے کہ اس زمانے میں طالبِ علم کس قسم کے ہیں میں ان کا اُستاد مدرّس ہوں مجھے کتنا تحمل چاہئے، مجھے کتنا حِلم چاہئے، کتنی برداشت چاہئے۔

ایک مرتبہ حضرت والا کے ہاں ظہر کی مجلس تھی، مولانا اسعد اللہ صاحبؒ بھی تھے الحمد للہ ثم الحمد للہ ظہر کے بعد کی مجلسِ عام میں حاضری ہوتی تھی اور جب کچھ مخصوص صاحبان آجاتے تھے تو خاص مجلس ہوتی تھی اس میں بھی حاضری ہوتی تھی تو ظہر کی مجلس میں مولانا اسعد اللہ صاحبؒ نے فرمایا! آج طلباء کا حال تو بہت عجیب قسم کا ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ حضرت والا نے فرمایا عجیب قسم کا ہے تو کیا بات ہے؟ اگر شاگرد اُستاد کو مار بھی لے، لیکن پڑھ لے تو اُستاد کا کیا بگڑا، بہت بھاری بات ہے اگر شاگرد نے اُستاد کو مار بھی لیا لیکن پڑھ لیا تو اُستاد کا کیا بگڑا؟

یہ حضرت کی آخیر زمانہ کی بات ہے، ہاں مدرّس تو بن بیٹھے لیکن مدرّس بننا

آتا نہیں، اب کچھ بوجھ اس مدرّس کو بھی اُٹھانا چاہئے۔اب تو سارا بوجھ اس شاگرد طالبِ علم پر ڈال رکھا ہے۔مدرّس کا اپنی جگہ پر ہو کر حاکمانہ طریق رکھ کر گذارہ نہیں ہو سکتا، حکیمانہ طریقہ اختیار کر کے ہی کچھ ہو سکتا ہے۔

اِبتدائی اور اِنتہائی باتوں میں فرق :

کچھ اِبتدائی باتیں ہوتی ہیں پھر آخری حالات آتے ہیں اِن کے اعتبار سے احکام بھی دوسرے ہو جاتے ہیں۔ابتداء میں بڑا جوش ہوتا ہے، ذرا سی طالبِ علم سے غلطی ہو جائے بس خارج کر دو، آخری حالات میں کہتا ہے ذرا سوچ لو، ذرا سوچ لو۔

تبدیلی حالات تبدیلی اَحکام کے موجب ہیں :

بعض صاحبان اس سے اِستدلال کرتے ہیں کہ جب حضرت والاؒ کانپور میں تھے تو تقریباً دس محنتی طلبہ کو خارج کر دیا تھا اور کسی کی بات نہیں مانی تھی۔لیکن وہ ابتدائی حالات تھے بعد میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے خیالات میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔

تعزیرات میں تبدیلی ہو سکتی ہے :

پھر جو حدودی چیزیں ہوتی ہیں جیسے حدِّ زِنا، سرقہ، اس میں تو تبدیلی نہیں ہو سکتی اور جو تعزیری چیزیں ہیں اس میں حیثیات بدل جانے سے تعزیر بدل جاتی ہے، تو مدارس میں جو کچھ قوانینی چیزیں ہیں وہ تعزیری چیزیں ہیں، تو ہر طالبِ علم کے ساتھ یکساں معاملہ کیسا؟ وقت کو پہچانو، طلباء کا مزاج و شوق کو پہچانو۔

پہلے اور اَب کے طلبہ میں فرق :

پہلے متقدمین کے زمانہ میں پڑھنے والے اور تھے، بڑے ذہین و ذکی ہوتے

تھے۔ بڑے بڑے اُونچے اور شریف گھرانوں کے ہوتے تھے اور اب پڑھنے والے گھر گالیاں سیکھ کر آتے ہیں اس لئے اندر بیٹھ کر حجرہ میں آپس میں گالیاں دیتے رہتے ہیں ایسے آئے ہیں پڑھنے والے نہ معلوم آج کل پڑھانے والوں کو خبر ہے کہ نہیں؟

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ دورۂ شریف پڑھاتے تھے جب سال پورا ہو گیا اور سند دینے کا وقت آیا تو تمام طلبہ کو سند دی۔ ایک بنگالی طالب تھے اُن کو بھی سند دے دی۔ گنگوہ میں ایک مولوی صاحب تھے بڑے ظریف الطبع قسم کے انہوں نے اس بنگالی طالب علم سے کہا ارے میاں! سُنا ہے آپ سند لے کر گھر جا رہے ہیں' ہمیں بھی دکھاؤ چنانچہ انہوں نے خوشی خوشی سند دکھا دی۔ سند دیکھ کر کہنے لگے اوہو! دیکھو یہ تمھارے نام کے آگے بنجالی لکھا ہے تم سمجھے اس کا مطلب کیا ہے؟ وہ خاموش ہو گیا، مولوی صاحب نے کہا مطلب اس کا یہ ہے کہ تمہاری استعدادِ علمی اتنی کمزور ہے کہ کھرپا اور جالی لیکر بن میں چلے جاؤ وہاں سے لکڑیاں اور گھاس کاٹو اور جال میں رکھ کر لاؤ اور بازار میں بیچو اور اس سے کچھ پیسے آ جائیں گے اس سے اپنا کام چلاؤ تم ایسے ہو یہ مطلب ہے بنجالی کا۔ وہ طالب علم ناراض ہو گئے اور ناراضگی کی حالت میں سند لئے ہوئے حضرت مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند آگے ڈال دی "یہ دیکھئے ادب" کہ سند آگے ڈال دی اور کہا مجھے تمہاری سند نہیں چاہئے میں سند نہیں لیتا ہوں، آپ نے میری توہین کی ہے کیا میں ایسا ہوں کہ "بن" میں جاؤں گا ،گھاس کاٹوں گا اور جال میں رکھ کر بیچوں گا، مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا: ارے بھائی! بیٹھو تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ تم ایسے ہو؟ اُس طالب علم نے کہا کہ فلاں مولوی صاحب نے کہا ہے۔

مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا وہ ذرا ظریف الطبع ہیں اس لئے تمہارے ساتھ انہوں نے تفریح کی ہے، تم نے ھدایۃ النحو پڑھی ہوگی اس میں معرّب کے بیان میں پڑھا ہوگا کہ کوئی لفظ عربی میں نہ ہو اس کی عربی بنائی جائے تو جو حرف عربی میں نہیں آتا اس کو عربی کے دوسرے حرف سے بدل لیتے ہیں جیسے :لگام سے لجام تو بھائی یہ عربی کی سند ہے اب تمہارے نام کے ساتھ بنگالی لکھنا تھا اور گاف عربی میں آتا نہیں لہٰذا بنگالی کی جگہ بنجالی لکھ دیا گاف کو جیم سے بدل دیا۔ یہ سن کر وہ شرمندہ ہوا اور کہا او ہو حضرت! معاف فرمائے، حضرت گنگوہیؒ نے معاف فرمادیا اور سند اٹھا کر پھر دے دی، یہ ہمارے اکابر تھے اور آج کل کے مولوی صاحبان ناراض ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

کم اِستعداد طلبہ کو سند دینے کا فائدہ :

ہمارے اکابر سمجھتے تھے کہ یہ پڑھا تو نہیں سکتا، لیکن سند کی لاج رکھتے ہوئے خیال کرے گا کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مولوی ہیں سند لئے ہوئے ہیں تو اس کی لاج سے ضروری ضروری باتوں کا لحاظ کرے گا موٹے موٹے گناہوں سے بچ جائے گا امامت ہی کرلیگا۔ کچھ نہ کچھ گذارہ ہو ہی جائے گا بیچارے کا، تو سند کی لاج سے معصیت کے قریب جائے گا؟ سینما دیکھنے جائے گا؟ ہرگز نہیں اور پڑھا نہیں سکتا۔ تو سند جو دی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پڑھا ہی نہیں سکتا ہو بلکہ ہمارے حضرات اکابر میں بڑی دور بینی، دور اندیشی ہے، ہماری کھوپڑی تو چھوٹی سی ہے، اس میں دور اندیشیاں کہاں ہیں؟

مفتی سعید احمد صاحبؒ کا تفقّہ :

مفتی سعید احمد صاحب لکھنویؒ بہت اُونچے درجے کے مفتی تھے۔ عربی ایسے

بولتے تھے جیسے عرب بولتے ہیں ادب، لغت اور منطق و فلسفہ تو اُن کے گھر کی لونڈی تھی اور فقہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب حضرت والا کی خدمت میں تھانہ بھون تشریف لائے تھے رمضان شریف کا زمانہ تھا بڑے بڑے حضرات مفتیان و علماء تشریف فرما تھے۔ ایک فتویٰ آگیا' حضرت والا نے مجلس میں اِستفتاء سُنایا پھر فرمایا بھائی یہ لکھا ہے جواب دو۔ کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ، حضرتِ والا نے فرمایا کہ جی کو نہیں لگا۔ ہمارے مفتی صاحب خاموش بہت رہتے تھے عصر کی آذان ہوگئی سب مفتیان اُٹھ کر چلے گئے مفتی صاحب بیٹھے رہے، میں بھی بیٹھا فرشی پنکھا جھلا رہا تھا، مفتی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اجازت ہو تو ایک بات میں بھی عرض کروں۔ حضرت والا نے فرمایا ''ضرور!'' مفتی صاحب نے عرض کیا کہ ''یہ جواب سمجھ میں آتا ہے'' حضرت والا نے فرمایا قوائد سے اُصولی طور پر تو میرے جی کو بھی آپ کا جواب لگ رہا ہے لیکن میں کیا کروں فتویٰ کے لئے میرا جی چاہتا ہے کہ فقہاؒ کی نقل ہو کہیں لِکھا ہوا مل جائے۔ مفتی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جزئیاتی حیثیت سے کتاب میں ملتی نہیں تو اُصول سے اِس کا جواب دیا جاتا ہے۔

فقہی جزئیات تلاش سے مل ہی جاتے ہیں:

حضرت والا نے فرمایا یہ آپ نے صحیح فرمایا مگر مفتیان صاحبان میں ذرا کچھ سُستی سی آگئی ہے۔ وہ مختلف کتابوں میں تلاش نہیں کرتے، جب متعدد کتابوں میں تلاش کیا جاتا ہے تو کہیں نہ کہیں مل ہی جاتا ہے۔ میرا یوں جی چاہتا ہے کہ عصر کی نماز کے بعد آپ کُتب خانہ میں تشریف لے آئیں وہاں اس مسئلہ کا جو جواب ہے اس میں دیکھ لیا جائے ذرا سی تکلیف فرمائے۔ چنانچہ وہ نماز کے بعد کُتب خانہ میں تشریف لے

گئے جو حضرت والا کی نشست گاہ کے متصل ہی تھا۔ ایک کتاب نکالی دوسری کتاب نکالی، ایک کتاب کھول کر صفحہ جو پلٹ کر دیکھا تو بالکل وہی سوال اور بالکل وہی جواب جو مفتی صاحب نے دیا تھا اس کتاب میں موجود ہے۔ مفتی صاحب کو بڑی خوشی ہوئی اور حضرت والا کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت والا نے فرمایا ماشاء اللہ دیکھیے نکل آیا، کوشش کی تو مل گیا۔

حضرت حکیم الامتؒ کا لحاظ :

پھر فرمایا مفتی صاحب! مسئلہ چونکہ آپ نے حل کیا ہے اس لئے اپنے قلم سے آپ ہی اس کا جواب اس کی پشت پر لکھ دیجئے۔

خیال فرمائیے اسے کہتے ہیں لحاظ کہ چونکہ سوال آپ نے حل کیا ہے لہٰذا آپ ہی اس کی پشت پر اپنے قلم سے جواب لکھ دیجئے اور میں تصویبی دستخط کر دوں گا، تو مفتی صاحب نے لکھ دیا اور حضرت والا نے تصویبی دستخط کر دیئے۔ یہی مفتی صاحب جلال آباد مدرسہ مفتاح العلوم میں مفتی اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ مغرب کے بعد غریب خانہ میں تشریف لے آتے تھے کھانا ساتھ لے آتے۔ ایک دن فرمایا کہ میں ایک مرتبہ کئی دن دار العلوم دیوبند میں ٹھہرا اور تمام جگہ گھوما پھرا، کبھی کتب خانہ اور کبھی کسی اور جگہ، بیت الخلاء بھی گیا۔ میں نے ایک دن مہتمم صاحب مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سے کہا کہ حضرت طلباء کا تو بہت ہی عجیب حال ہے، فرمایا کیا دیکھا؟ مفتی صاحب نے کہا کہ حضرت حد ہے جگہ ایسی ایسی واہیات باتیں پنسل سے لکھی ہوئی ہیں کہ دیکھ کر طبیعت شرما جاتی ہے اور بعض جگہ تو نام بھی لکھا ہوا ہوتا ہے اس پر نظر پڑی تو بہت افسوس ہوا۔

مہتمم صاحب نے فرمایا ''ہاں مجھے معلوم ہے اور بعض کا نام بھی معلوم ہے''

مفتی صاحب نے فرمایا تو حضرت! خارج کر دیا ہوتا، فرمایا اِخراج کا معاملہ دوسرا ہے اخراج کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے اس پر غور کرنا پڑتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ علماء میں بہت مدبّر مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے خود فرمایا: ''یہ جو ادارے ہیں یہ چھوٹی سی حکومت ہیں ان میں سیاست کا استعمال کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ حکومت کے لئے سیاست لازم ہے۔ اس لئے ہر ایک کو خارج نہیں کیا جاتا'' اب دیکھئے یہ قوانین مدرسہ کی تعزیرات ہیں''۔

نظام وانتظام کا تعلّق اہتمام سے ہے :

اِن ارشاداتِ اکابر سے معلوم ہو رہا ہے کہ جس زمانہ میں حیثیات بدل جایا کرتی ہیں یہ چیزیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جا سکتا، اس لئے یہ اعتراض حقیقت سے ناشناسی کی بات ہے کہ فلاں کو خارج کر دیا اور فلاں کو خارج نہیں کیا گیا۔ طالبِ علم کو تو کوئی مطلب ہے نہیں مگر مدرّس کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اِہتمام کے سامنے نظامی وانتظامی اُمور میں مدرّس کو بھی ہرگز حق نہیں پہنچتا اگر اس کے مزاج کے موافق وہاں کوئی خدمت نہیں ہے تو استعفاً دے دو کہیں اور چلے جاؤ، مدرّس کا انتظام میں دخل کیسا؟ اگر کچھ کہنا ہو تو مشورہ دے کر فارغ ہو جائے کیونکہ نظامی اُمور کا حکم الگ ہے، کوئی نص نہیں ہے، نظام ہے وہ اور نوعیّت وحیثیت رکھتا ہے اور مدرّس کے سامنے وہ نوعیّت نہیں۔

مُدرّس کا کام صرف تدریس ہے :

مدرّس جو آیا تھا مدرسہ میں اور اس نے جو درخواست دی تھی۔ تدریس کے

لئے دی تھی یا تنظیم ونظام کے لئے؟ ظاہر ہے کہ تدریس کے لئے دی تھی بس اس میں لگ جاؤ، وقت کی پابندی کے ساتھ صحیح طور پر حلِ کتاب کے ساتھ، طلباء کے ساتھ مزاج شناسی کے ساتھ پہلے سے حواشی شرح وغیرہ دیکھ کر، تقریر میں ترتیب وربط رکھ کر اور درسگاہ میں آکر تقریر کرو کیونکہ تم اسی لئے رکھے گئے تھے، تم نے اسی کے لئے درخواست دی تھی ہاں اگر کوئی ایسی بات کھلی ہوئی معلوم ہورہی ہے تو تنہائی میں، خلوت میں مہتمم صاحب سے جاکر کہہ دو نہ کہ دوسروں کے سامنے کہتے پھرو یا آپس میں کمروں میں بیٹھ کر غیبتیں، تہمتیں، چغلیاں تمامی کرتے پھرو، کیا اس کا حق ہے............؟

مدارِس میں فساد کی وجہ :

مدارِس میں فساد اس لئے پھیل رہا ہے کہ جس کو استحقاق نہیں ہے وہ اپنا استحقاق ظاہر کررہا ہے، حضرت والا تو اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ مدرّس اضافۂ تنخواہ کے لئے درخواست دے۔ اگر موافقت نہیں ہے استعفیٰ دے دو مہتمم صاحب پر تو اعتماد ہونا چاہیئے۔

مہتمم صاحب کے اَوصاف :

اور مہتمم صاحب بھی ایسے ہی عادل ہونے چاہئیں کہ نہ کسی سے عداوت رکھیں نہ کسی کی طرف جُھکیں۔ جب کسی سے عداوت ہوگی، طبیعت میں رعایت نہ ہوگی تو عدل اُٹھ جائے گا مہتمم کو ایسا نہیں ہونا چاہیئے، عدل کا حُکم قرآنِ شریف میں موجود ہے، اِعْدِلُوْ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى عدل کا تو شریعتِ اسلام میں عینِ قتال کے وقت بھی

حکم ہے جس کو جہاد کہتے ہیں کہ تم اہلِ اسلام سے حربی کافر کے ساتھ کوئی بات اس طرح سے نہ ہو جائے جو خلافِ عدل ہو، اب بتائیگا کہ وہ جہاد کرنے والے جو اپنے اندر صفتِ حلم لئے ہوئے ہوں گے کس قدر قابو یافتہ ہوں گے۔ تو مدرس کو، مہتمم کو، ناظم کو نفس پر کتنا قابو یافتہ ہونا چاہیے، نفس کو کتنا کچلے ہوئے ہونا چاہیے، اور نفس پر تھوڑا نہیں بہت قابو ہونا چاہیے ورنہ ....

منسوف تریٰ اذا نکشف الغبار　　　أفرس تحت رجلك ام حمار

قریب ہی جب غبار چھٹے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیری ران کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا؟ تو دعویٰ تو بہت آسان ہے لیکن امتحان کے وقت حال کھل جائیگا۔

اب سوچا جائے کہ مُدرّسین کا کیا حال ہے، کتنے صحیح اخلاق والے ہیں اسی طرح تدریس ہے اسی طرح اہتمام ہے اگر کسی کی طرف سے دل آزاری آ جائے تو عدل ہوگا؟ اگر کسی طرف سے طبیعت میں کچھ چھبن ہو جائے تو عدل ہوگا؟ ہرگز نہیں، عدل گیا تو عینِ قتال کے وقت عدل کا قائم رکھنا ضروری ہے اس سے الگ ہونے کی ذرّہ برابر بھی گنجائش نہیں، عدل کوئی معمولی چیز نہیں، افراط و تفریط کے بیچ میں ہے۔ تو مدرّس نے تو تدریس کے لئے درخواست دی تھی اور بس، انتظام و نظام کا کام مہتمم جانے۔

تجربہ بہت دیر سے حاصل ہوتا ہے:

زمانۂ ابتدائی ایسا ہی نا تجربہ کاری کا ہوتا ہے پھر تجربہ ہو جاتا ہے اچھی طرح سے، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ او ہو! یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو اظہارِ محبت کر کے اپنا کام نکالتے ہیں تو تجربہ کار ہو کر مضبوط ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: و اللّٰہ یَعلَمُ

مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَاكُمْ ۔

ہے تو چھوٹی سی آیت مگر بڑی عجیب ہے۔ کہ گھر میں بھی رہنا ہو تو عدل و انصاف کے ساتھ رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں مگر آج کل تو عجیب گڑبڑ ہو رہی ہے، کبھی بیوی کی سرداری ہو رہی ہے، کبھی بیوی کے بھائی کی سرداری ہو رہی ہے کبھی بھائی صاحب پر گرم ہو رہا ہے، تم اتنے آدمی ہو وہ فلاں کام کیوں نہیں ہوا، رشتہ داری میں یہ سب ہوتا ہے۔ عدل وانصاف والا سب طرف نگاہ رکھتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی تنبیہ کا واقعہ :

مہتمم صاحب نے اپنے خدمتگار جو خدمت کے لئے ہر وقت پاس رہتے تھے اُن سے کہا ''مولانا مرتضٰی حسن صاحبؒ کے پاس جاؤ اُنھوں نے یہاں سے ایک کتاب لی تھی وہ کتاب اُن کے پاس سے لے آؤ'' وہ گئے مولانا صاحب کے پاس وہ اُس وقت ناظمِ تعلیمات تھے، اُنھوں نے کہا کہ میں نے جہاں سے لی تھی وہیں رکھ دی ہے، اِنھوں نے آکر مہتمم صاحب سے نقل کر دیا کہ وہ یوں کہتے ہیں، فرمایا کہ وہاں دیکھ لو......... خدمتگار نے دیکھا نا معلوم کس طرح دیکھا آکر کہہ دیا، حضرت وہ تو نہیں ہے فرمایا مولانا صاحب سے پھر جا کر کہو۔ پھر جا کر کہہ دیا اور مولانا مرتضٰی صاحبؒ خود شریف لائے اور عرض کیا کہ حضرت جہاں سے لی تھی وہیں رکھ دی تھی، گئے اور وہاں سے اُٹھا کر دیدی۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اس وقت کچھ نہ بولے جب مولانا مرتضٰی صاحب چلے گئے تو ان خادم سے کہا'' تم نے خواہ مخواہ ایک عالم کو تکلیف دی تم نے غور سے نہیں دیکھا، دیکھو کتاب جہاں بتائی تھی وہیں رکھ دی تھی، اس طرح تنبیہ کی یعنی تیز نہیں ہوئے نرم عنوانات کے ساتھ تنبیہ فرمائی اور اس طرح کیوں نہ ہو، جتنا

زیادہ سے زیادہ علمِ صحیح واقعی بڑھتا چلا جائے گا حِلم بڑھتا چلا جائے گا۔

حِلم میں ایک لطیفہ :

حِلم میں تین حروف ہیں ح،ل، م ،میم کو بیچ میں لے آئیں حَمل ہو گیا یعنی بوجھ اُٹھانا دیکھو حَمل والی عورت کو کیسی تکلیف ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں :وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡهِ اِحۡسَانًا حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰی وَهۡنٍ ،ارے انسان تجھے تیری ماں نے پیٹ میں رکھ کر کتنا بوجھ اُٹھایا ہے کتنی تکلیف اُٹھائی ہے تو ادائے حق کے لئے سوچ! تو حِلم حرف ''میم'' بدل کر حَمل ہو گیا اور حامل پر محمول کے اُٹھانے میں کتنی زور پڑتی ہے تو حِلم میں کتنی زور پڑے گی۔

مدرسہ اِمدادیہ خانقاہ کا اِبتدائی اور اِنتہائی زمانہ :

خانقاہ اِمدادیہ تھانہ بھون میں مدرسہ میں ابتداءً پٹائی ہوتی تھی،مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کی بہت پٹائی ہوتی تھی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھی تھیں تھانہ بھون میں، آخر میں تجربات کے بعد قانون بدل گیا کہ کسی مدرّس کو پیٹنے کی اجازت نہیں کیونکہ حالات بدل گئے اس لئے حُکم بھی بدل گیا۔ایک اُستاد نے خانقاہ میں ایک طالبِ علم کو پیٹا تو تھا نہیں مگر کان پکڑوا دیئے تھے۔ایک تو کھڑا کر کے کان پکڑوانا ہوتا ہے اور ایک مُرغہ بنانا تو انہوں نے مُرغہ بنا دیا تھا۔یہ بات حضرت والا کو پہنچ گئی۔حضرت والا کے ہاں تحقیق ہوتی تھی ان مُدرّس کو بُلایا اور پوچھا کہ میں نے سُنا ہے کہ لڑکے سبق کو یاد نہ ہونے پر آپ نے مُرغہ بنا دیا تھا،انہوں نے کہا کہ جی ہاں! پھر فرمایا یہ سُنا ہے کچھ دیر تک بنایا تھا فرمایا ہاں حضرت ایسا ہی ہوا تھا،فرمایا اچھا! حوض پر جاؤ اور مُرغہ بن

جاؤ۔ مُرغہ بنا دیا اِن کے شاگر کے سامنے مُرغہ بنا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کچھ ٹانگوں میں درد تو نہیں ہوا عرض کیا ہوا حضرت غلطی ہوگئی، ہاں غلطی ہوگئی اب کہتے ہو۔ بچے کو تکلیف نہیں ہوتی یہ بے رحم دلی۔ فرمایا اچھا جاؤ، اب کوئی نہیں پکڑوا سکے گا کان؟ یہ واقعہ اس پر سُنایا کہ ابتداء میں خانقاہ میں پٹائی ہوتی تھی مگر بعد تجربہ کے منع کر دیا گیا۔ یاد رکھو کسی چیز کا ابتدائی زمانہ اور ہوتا ہے اور انتہائی زمانہ اور ہوتا ہے۔ نماز جو کہ ایک رُکن ہے کیا ابتداء میں اسی طرح تھی، انہی قیود کے ساتھ تھی؟ نہیں بلکہ باندھ کر کھڑا ہو گیا کسی نے سلام کیا اس کا جواب دے دیا، بھوک لگی کھانا کھا لیا پھر آ کر نیت باندھ لی پھر حکم ہو گیا: ما الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک ایسی عبادت کیا کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ دیکھئے قید لگ گئی نہ سلام کا جواب دے سکتا ہے نہ بول سکتا ہے معلوم ہوا کہ زمانے کے حالات سے احکام بدل جاتے ہیں۔

عِلم وحِلم دونوں میں شرحِ صدر مطلوب ہے :

حق تعالیٰ رسول اللہؐ سے فرماتے ہیں: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ، کیا ہم نے تمہارے سینے کو نہیں کھولا آپ ﷺ کا شرحِ صدر نہیں فرمایا، جانتے ہو شرحِ صدر کیا ہے ؟ تم کہتے ہو یہ مسئلہ تو حل ہو گیا مگر شرحِ صدر نہیں ہوا بشاشت کے ساتھ سمجھ میں نہیں آیا تو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں رسول اللہ کو کیا ہم نے آپ ﷺ کا شرحِ صدر نہیں کیا استفہامِ انکاری ہے یعنی ضرور کر دیا، اب یہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کا فلاں چیز میں شرحِ صدر فرمایا تو مفسّرین نے لکھا ہے کہ عِلم وحِلم میں شرحِ صدر مُراد ہے۔ یعنی ہم نے آپ ﷺ کے سینے میں بطریقِ شرحِ صدر عِلم بھی رکھا اور حِلم بھی

رکھا۔ جب عِلم نہیں ہوگا تو عِلم کا مقام حاصل کرنا اور دوسروں تک عِلم پہنچانا مشکل ہے جیسے عِلم میں شرحِ صدر ہو اسی طرح حِلم میں بھی شرحِ صدر ہو۔

غلطی پر سزا دینے کا طریق :

حضرت والا نے فرمایا کہ اگر کسی سے غلطی ہو گئی تو سوچو کہ اس کا قصور کس درجے کا ہے، پھر سوچو کہ اس غلطی کرنے والے شخص کا درجہ کیا ہے تو اس درجہ پر کیا سزا ہونی چاہیئے، اس سوچنے کے بعد جب طبیعت یک رُخ ہو جائے (یعنی شرحِ صدر ہو جائے)، تو اتنی دیر میں سوچتے رہنے سے تو غصہ چلا جائے گا اور اس کو نہ سوچا اور غصہ آ گیا تو غصہ میں رہے گا عدل پر حِلم میں ہرگز نہیں رہے گا ایک کے عوض میں دو طمانچے مارے گا۔ اسی لئے حضرت والا نے فرمایا: یہ میاں جی، حافظ جیؒ مولوی صاحبان جو بچوں کو مارتے ہیں اور بُری طرح مارتے ہیں اِن کی کھال کھینچی جائے گی۔

بزرگوں کے حِلم کا واقعہ :

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے کسی نے کہا حضرت! صوفیاء دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیسے ہوتے ہیں۔ فرمایا کیا کرو گے اپنے کام سے کام رکھو۔ دو چار دن بعد پھر دوبارہ پوچھا، شاہ صاحب نے فرمایا اچھا فلاں مسجد میں چلے جاؤ وہاں تین بزرگ بیٹھے ہیں ذکر میں مشغول ہیں ہر ایک کی کمر پر ایک مُکا مار دینا، یہ چلے گئے ایک کے جا کر مُکا مارا وہ اُٹھے اور اُنہوں نے بھی کمر پر ویسا ہی ہلکا سا مُکا مار دیا اور بیٹھ گئے۔ پھر دوسرے کو ایک مُکا مارا وہ بھی اسی طرح ذکر میں لگے رہے اپنی جگہ سے اُٹھے بھی نہیں پھر تیسرے کو ایک مُکا مارا، وہ اُٹھے اور اُٹھ کر ان کے ہاتھ کو سہلانے لگے کہ تمہارا ہاتھ دُکھ

گیا ہوگا اسی طرح ہاتھ کو سہلا کر بیٹھ گئے یہ ماجرا دیکھ کر شاہ صاحب کی خدمت میں آئے، پوچھا دیکھ آئے۔ عرض کیا جی ہاں! تماشہ دیکھا، فرمایا کیا دیکھا؟ اُنہوں نے پوری تفصیل عرض کر دی، فرمایا پہلے بزرگ ابھی شریعت پر ہیں اس طرح کہ تم نے مُکا مارنے سے پہلے کچھ کہا تھا کچھ بولے تھے؟ کہا نہیں، تو وہ بھی نہیں بولا اور انہوں نے جو مُکا مارا تھا تو انہوں نے بھی کچھ کہا تھا جس طرح تم نے آہستہ سے مارا تھا اسی طرح اُنھوں نے بھی بہت نرمی سے اسی کے قریب مارا تو یہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، جزاء سیئۃ سیئۃ یہ ہے عدل اور شریعت کہ اگر تمہیں کسی نے طبیعت کے خلاف کوئی بات کہی ہے تو اسی بات کو تم بھی کہہ دو، تم نے کسی کو مارا ہے تو تم بھی اسی طرح مارو، تمہارے اندر ابھی حوصلہ پیدا نہیں ہوا۔ دُنیا میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں لہٰذا ایسے بھی ہوں گے کہ ضبط نہ کر سکیں گے لیکن رہیں وہ عدل پر۔ دیکھو! وہ بزرگ عدل پر رہے کیونکہ وہ مجاہدہ کئے ہوئے تھے تو بلا تصوف بلا مجاہدہ ایسا ہو سکتا ہے کیا وہ عدل پر رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلا مجاہدہ کئے ہوئے اگر کوئی مار دے تو پہلے تو وہ اُٹھ کر دس باتیں کہے گا کہ آپ کو کیا حق تھا آپ نے پیچھے کیوں مارا۔ اور پھر اس کے بعد اگر دیکھا کہ وہ کمزور سا ہے برابر کا سا ہے تو اُس کی خوب پٹائی کر دے گا اور اگر قوی ہے تو کہے گا ارے میاں جو ہو گیا سو ہو گیا مصلحت سامنے آجائے گی کہ یہ تو بڑا پہلوان سا ہے ایسا نہ ہو کہ اگر میں ایک ماروں تو یہ دس مارنا شروع کر دے گا تو مصلحتِ زماں کو دیکھ کر رُکا ہے رضائے الٰہی یا سلوک کا جو طریق ہے اس کی وجہ سے نہیں رُکا، اس لئے مصلحت کے خیال سے باہر تو رُک گیا اور جب بیوی نے کچھ مزاج کے خلاف کہا تو غصہ ہو گیا اور ایسا غصہ کہ خدا کی پناہ کہ پہلی ہی رات میں طلاق ہو گئی۔

تو اُن بزرگوں کا واقعہ بیان ہو رہا تھا کہ اب رہے دوسرے بزرگ تو حضرت والا نے فرمایا کہ وہ تو اپنے ذکر کے کام میں لگے ہوئے تھے اُنھوں نے دل میں کہا کہ مار لیا تو مار لیا، میں اپنا وقت کیوں خراب کروں یہ ہے طریقت۔ اب رہ گئے تیسرے بزرگ تو وہ حقیقت کو پہنچے ہوئے تھے کہ نافع وضار اللہ تعالیٰ ہیں کوئی بھلا کسی کو کیا مار سکتا ہے اگر وہ نہ چاہیں، یہ ہے حقیقت۔

ایمان اور شرک کا فرق:

مؤمن اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتا ہے کہ نافع بھی وہی ہے اور ضار بھی وہی ہے اور یہ یقین ہے لیکن ضرر پہنچنے پر اس کے اعتقاد وایمان میں فرق نہیں آیا، چھوٹنے کا تو کیا مطلب؟ اور اگر اس کو یہ یقین ہو جائے کہ جس کی میں نے پوجا کی ہے یہ ضرر اُس کی طرف سے آیا ہے اس کو چھوڑ بیٹھا، تو وہ تو ہے ایمان اور یہ ہے شرک تو اپنے کو مٹادو' دیکھئے یہ تیسرے بزرگ اپنے آپ کو مٹائے ہوئے تھے تب ہی تو اس کا ہاتھ سہلانے لگے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ بلا مجاہدہ کے شریعت پر عمل نہیں ہوسکتا وہ مجاہدہ کئے ہوئے تھے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ تو مجاہدہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ الہام فرمادیتے ہیں۔

راستہ اللہ تعالیٰ طے کراتے ہیں:

بیچ میں ایک بات یاد آگئی کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں لام تاکید با نون تاکیدِ ثقیلہ ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں اے مؤمن تم ڈرنے لگے کہ یہ راستہ کس طرح طے ہوگا تو تم اس کی فکر مت کرو اور تم مجاہدہ کرو چلانا اور راستہ طے کرانا ہمارا کام ہے۔ بخاری شریف میں پہلا باب ہے بَدْءِ الْوَحْيِ وحی کی

کیفیت اور پہلی حدیث ہے: اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّیَّات پھر شبہ ہوتا ہے کہ بھلا اِس حدیث کو اِس باب کے ترجمہ کے ساتھ کیا جوڑ ہے، کیا مناسبت ہے؟ تو یہاں تقریر کی جاتی ہے کہ بہت لمبی مناسبت ہے۔ اس میں اخلاص کی ترغیب دی گئی ہے کہ طالبِ علمِ وحی میں اخلاص ہونا چاہئے تو دیکھو! جب قدم باہر نکالا تو حق تعالیٰ نے فرمادیا : اللّٰہُ یَعلَمُ مُتَقَلَّبَکُم جب قدم نکالو تو استحضار کے ساتھ نکالو اور استحضار کا نام نیت ہے یہ نہیں کہ بس ایک دفع خیال کرلیا کہ ہاں میں اس نیت سے جا رہا ہوں اور پھر نیت کا کچھ استحضار نہیں۔ ہمیشہ اس استحضار کی طرف متوجہ رہے یہاں تک کہ جو حروفِ زائدہ تھے وہ سب ختم ہوگئے اور ''حضور'' رِہ گیا۔ اور یہ استحضار بابِ استِفعَال سے ہے جس کی خاصیت طلب ہے تو برابر طلب رہے یہاں تک کہ مطلوب مِل جائے۔

خانقاہ بے فائدہ نہیں ہے :

بعض لوگ خانقاہ کو بے فائدہ سمجھتے ہیں ارے ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ بلا خانقاہ کے کام نہیں چلتا اور اپنے شیخ کو نفع رسانی میں بالکل یکتا سمجھے اگر یہ عقیدہ نہیں ہے تو اپنے گھر جاؤ، یہاں کیوں آئے تھے۔

شیخ سے عقیدت :

حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے اگر کسی مجلس میں حضرت جنیدؒ و شبلیؒ ہوں اور حضرت حاجی صاحبؒ بھی ہوں تو ہم حضرت جنیدؒ کی طرف رُخ بھی نہ کریں گے، حضرت حاجی صاحبؒ کو ہی دیکھیں گے۔ ہاں حضرت حاجی صاحب حضرت جنیدؒ سے کچھ حاصل کریں تو حاصل کریں کیونکہ ہمارے شیخ تو حضرت حاجی صاحب ہیں

''لا الٰــہ الا اللّٰــہ'' یہ ہے اعتقادِ شیخ کے ساتھ، تو بے فائدہ نہیں ہے، یہاں رہ کر اِستحضار برابر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ حروفِ زوائد نکل گئے اور حضور آ گیا اب جو عمل ہو گا ذِکر کیساتھ، تلاوت کے ساتھ، نوافل کے ساتھ اور رمضان شریف کے روزے کے ساتھ، کان کی حفاظت کے ساتھ، دل کی خلوت کے ساتھ حجرہ سے باہر قدم اُٹھانے کے ساتھ، ان تمام اعمال میں حضور رہے گا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : یٰاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُونُوا مَعَ الصَّادِقِین یعنی اے مسلمانو! اللہ سے ڈرتے رہو اور صادقین کے ساتھ رہو۔ شیوخ جو صادقین میں سے ہیں وہ مذکِّر ہوتے ہیں۔

رمضان المبارک کے خاص حقوق :

رمضان شریف کے دو حق خاص ہیں ویسے وہ دونوں حقوق ہمیشہ ہیں لیکن رمضان المبارک کے ساتھ ان کو خصوصیّت حاصل ہے۔ ایک ہے تقویٰ اور اگر کبھی غلطی بھی ہو گئی اور معافی مانگ لی تو یہ بھی تقویٰ ہی ہے اگر اِصرار نہیں ہے تو یہ بھی تقویٰ ہی ہے۔ تو ایک حق رمضان شریف کا تقویٰ ہے اور دوسرا حق کثرتِ تلاوت بلحاظِ فُرصت، صحت وسہولت کہ کسی ضروری کام میں حرج نہ ہو کیونکہ قرآنِ پاک رمضان شریف میں نازل ہوا تو رمضان کے ساتھ قرآن کو خاص مناسبت ہے۔ تقویٰ کی خصوصیت پر یہ آیت دلیل ہے: یَا اَیُّھَا الَّذِینَ اٰمنُوا کُتِبَ عَلَیکُم الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِینَ مِن قَبلِکُم لَعَلَّکُم تَتَّقُون یعنی اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم متّقی بن جاؤ اور شَھرُ رَمَضَانَ الَّذِی اُنزِلَ فِیہِ القُرآن سے اس ماہ کو قرآنِ پاک کے ساتھ خاص مناسبت

معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقویٰ اور کثرتِ ذکر و تلاوت کیساتھ زبان، آنکھ، کان اور دل کی حفاظت کرتے ہوئے بعلم و حِلم برکاتِ رمضان المبارک حاصل کرنے کی توفیقِ ارزانی سے نوازیں۔ (آمین)

☆

اٹھائیسویں مجلس

خانقاہ میں قیام کا طریقہ اور اغراض و مقاصد

۱۳ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق ۳۰ مارچ ۱۹۹۱ء بروز شنبہ بوقتِ صبح

ہمارے اکابر کی تواضع :

حضرت حکیم الأمت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہ نے بار بار فرمایا :

"ارے بھائی ! جنتی ہونا تو بڑی چیز ہے اللہ تعالیٰ مجھے جنتیوں کی جوتیوں کی جگہ پر بیٹھنے کے لئے اگر فرمائیں۔ تو یہ اُن کی رحمت ہے"۔

یہ محاورہ ہے اب خبر نہیں کہ جنت میں جوتیاں بھی ہونگی یا نہیں بظاہر تو جنت جوتیاں ہونے کی جگہ ہے نہیں، جوتی تو پیروں کی حفاظت کے لئے نجاست سے گندگی سے بچنے کے لئے ہوتی ہے وہاں یہ چیزیں کہاں؟ تو جوتی کا کیا سوال مگر محاورہ ہے کہ کم درجہ جگہ کو جوتیوں کے مقام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ تھے ہمارے حضرات کبھی ذہن میں بھی نہیں لاتے تھے کہ ہمیں جنت میں جگہ مل جائے اور آپ تو ماشاء اللہ مشاہدین میں سے ہیں ذاکرین میں سے ہیں صائمین میں سے ہیں نائمین میں

سے نہیں۔ بھلا ایسے حضرات نائمین میں سے کہاں، حدیث شریف میں ہے اِن کا نوم بھی صوم ہے۔

حالتِ صوم میں کس طرح رہنا چاہیئے :

حالتِ صوم میں صُمٌ بُکمٌ عُمیٌ ہو کر رہنا ہے اور ایسا صُمٌ بُکمٌ عُمیٌ کہ لَایَرجِعُون کا مصداق بن جائے۔ اس طرح کہ اَللّٰہُ نَاظِرِی کے تصور سے مشاہدہ کی حالت ایسی ہو کہ نہ بلاضرورت کسی کی بات سُنتے ہیں، نہ کسی سے بولتے ہیں نہ کسی کو دیکھتے ہیں اور اس حالت میں ایسے مستغرق ہیں کہ لوٹتے نہیں ہیں! تو اِن کا نوم بھی صوم بن گیا۔ کیونکہ بیچارے گھر سے بے گھر ہو گئے گھر میں جو راحت ہے، سکون ہے، آزادی ہے کھانے کے اعتبار سے، سونے کے اعتبار سے، رہنے کے اعتبار سے سہنے کے اعتبار سے، ہر اعتبار سے اس آرام کے گھر کو چھوڑا تو بے گھر ہو گئے اور پھر اَلسَّفرُ کالسَّقَر (سفر دوزخ ہے) اس سفر کو اختیار کیا جب اُن سے پوچھا جائے کہ آپ اپنے گھر کو چھوڑ کر بے گھر کیوں ہوئے اور اَلسَّفرُ کالسَّقَر کیوں اختیار کیا۔ بخاری شریف کی حدیث ہے: اَلسَّفر قِطعَۃ مِنَ النَّار سفر دوزخ کا ایک ٹکڑا ہے، ہم بچپن میں اپنے بوڑھوں سے سُنا کرتے تھے سَفر کالسَّقر یہ اسی حدیث کا ترجمہ ہے۔

خانقاہ کی طرف کیوں سفر کیا جاتا ہے :

تو جب اُن سے کہا جائے کہ آپ نے اَلسَّفر کالسَّقر کیوں اختیار کیا تو تشریف لانے والے بزبانِ حال یوں کہہ رہے ہیں تو یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے سفر کیا لیکن ہمارا گھر بھی سقر بنا ہوا تھا۔ بظاہر تو گھر میں تھے لیکن وہ گھر سقر بنا ہوا تھا۔ ہمارا گھر تو

فجور سے بھرا ہوا تھا اس فجور کے گھر کو فجر بنانے کے لئے آئے ہیں۔ذاتِ باری تعالیٰ نے قسم کھائی ہے(والفجر) تاکہ پھر لوٹ کر ہمارا با فجور گھر فجر ہو جائے اس لئے آئے ہیں۔ بزبانِ حال یوں کہہ رہے ہیں کہ یہ طلب لے کر آئے ہیں اس کے سوا اور کوئی طلب نہیں۔تو معنوی طور پر جو ایمان رکھا ہوا ہے جس کا تقاضا مشاہدہ کا تھا تو یہ بیچارے معنوی طور پر مشاہدین میں سے مجاہدین میں سے ذاکرین میں سے اور صائمین میں سے ہو گئے بے حسی جاتی رہی اب حسّی طور پر اس کا اثر یہ ہوا کہ احساسِ خیر پیدا ہو گیا یعنی احساسِ فجر بترکِ فجور۔

خانقاہی زندگی کے ضوابط :

بس تو پھر دل اُڑا اُڑا نہ رہے زُبان چلی چلی نہ رہے آنکھ کھلی کھلی نہ رہے بس فجور گیا اور فجر آ گیا۔مولانا روم نے اسی کو کہہ دیا ....

چشم بند و گوش بند و لب بند گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

اسی کو اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔یعنی ہوشیار! آنکھ بند، زُبان بند، کان بند دل بند کہ یہ خلافِ حُکم نہ چلیں سب سے سوال کیا جائے گا اسی لئے حضور ﷺ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِي اِلٰى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ۔اللہ اکبر! حضور ﷺ جو کہ نورِ مجسّم ہیں ......

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کیا فرما رہے ہیں: لَا تَكِلْنِي اِلٰى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ پلک جھپکنے کے برابر بھی مجھ کو میرے نفس کے حوالہ نہ کیجئے اور آنکھ کان زُبان دل اس مجموعہ کا نام نفس ہے۔اسی لئے متقدمین کے ہاں انگلیوں سے ہونٹوں کو کان و آنکھ کو بند کرا کے ذِکر کرایا

جاتا تھا۔ تو نفس نام ہے آنکھ کان دل زبان کے مجموعے کا تو اس سفر کالسَّقر میں اس طرح رہنا چاہیئے کہ آنکھ بند رہے کان بند رہے تاکہ گھر فجر ہو جائے، جب ہم جائیں تو ہمارا گھر کھلا ہوا فجر ہو فجور سے ہٹا ہوا ہو، بچا ہوا ہو۔

مقصودِ اصلی آخرت کے گھر کی درستی ہے :

اور جب اس عارضی گھر کو اس طرح بنانے کے لئے بے گھر ہوا ہے تو اصل آخرت کو چھوڑ کر اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے تو یہ پوری عمر کا لمبا سفر بھی کالسَّقر ہے تا دمِ آخر تو یہ سالک بزبانِ حال یوں کہہ رہا ہے کہ اپنے گھر سے بے گھر اس لئے ہوئے کہ حقیقی اور اصلی گھر صحیح معنی میں مل جائے۔ اصلی گھر جہاں ہم دُنیا میں آنے سے پہلے تھے مل جائے، بس جاتے ہی گھر میں گر جائیں اِدھر گئے اُدھر گئے وہ گھر مل گیا جس گھر کا نام اللہ تعالیٰ نے جنت رکھا ہے۔

مقصودِ اصلی رضائے الٰہی ہے :

بس معلوم ہو گیا کہ حقیقتاً یہ مؤمن بندہ اس عارضی گھر سے بے گھر اصلِ گھر کے لئے ہوا ہے اس کی نیت معلوم ہو گئی کہ اس کی طلب سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ انہوں نے وہاں (آخرت میں) اوّل وہلہ میں اپنی رضاء کے ساتھ رکھا تھا۔ ہم رضا کے ساتھ رہے یہاں دنیا میں بھی اُنہوں نے اپنی رضاء کے لئے بھیجا ہے ہم راضی راضی چلے آئے کہ مقصود تو اُس کی رضاً ہے اب ہم کو چاہیئے کہ یہاں رضاً کے ساتھ رہیں اور رضاً کے ساتھ چلے جائیں اور اِرْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کے مصداق بن جائیں کہ وہ ہم سے راضی اور ہم اُس سے راضی۔

رضاء کی پہچان :

اب رہا یہ سوال کہ ہماری رضاء کس طرح معلوم ہو گی اور پھر اس کی رضاً کیسے معلوم ہو گی تو اس طرح معلوم ہو گی کہ ہم سمجھ گئے کہ یہاں پر اس ذات نے اس خالق نے ہمیں صرف طاعت کے لئے نہیں بھیجا بلکہ عبدیّت کے لئے بھیجا ہے غُلامیت کے لئے بھیجا ہے اور فارسی زُبان میں بندگی کے لئے بھیجا ہے بس اسی تحصیلِ عبدیّت میں لگا رہے یہی علامتِ رضاً ہے اور غُلامیت کے لئے اس لئے بھیجا ہے کہ طاعت میں تو ایک کام مقرّر ہوا کرتا ہے، غُلامیت کے لئے ایک کام نہیں ہوا کرتا۔

انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے طاعت کے لئے تو فرشتے بہت ہیں۔ اس لئے کہ ہر ایک فرشتے کو ایک کام میں لگا دیا بس لگا ہوا ہے یہ ہے طاعت۔ اور طوعاً خوشی خوشی لگے ہوئے ہیں کرھاً زبردستی نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک جماعت فرشتوں کی ایسی پیدا کی گئی ہے کہ روزانہ بیتُ المَعمُور کا طواف کرتے ہیں اور روزانہ ستر ہزار فرشتے طواف کرتے ہیں اور جن کی باری ایک مرتبہ آگئی پھر دوبارہ نہیں آتی۔ تو کس قدر فرشتے ہوں گے تو ایک کام پر لگا دیا یا کئی کاموں پر لگا دیئے۔ بس لگے ہوئے ہیں اسے کہتے ہیں طاعت،، تو وہ فرشتے اجیر کی حیثیت سے ہیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں ....

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کُنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کُنم

(یعنی)

ملنے اور نہ ملنے کا وہ مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہیئے کہ تگ و دو لگی رہے

تگ ودو یعنی کام میں لگا رہے یہ تصوّر کے ساتھ کیا ملے گا تو رضاء پر چلتا رہے میری طرف سے مرضیہ ہے ہی، اور اگر اسی کا جواب چاہتا ہے کہ کیا ملے گا؟ تو فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ میں ملوں گا بس ہوگئی انتہاء تمام اغراض سے خالی الذّہن ہوگیا اور قَطعِ نَظر عنِ الْخَلق ہوگئی، معیتِ خالق حاصل ہوگئی تو معلوم ہوا کہ عارضی گھر جو چھوڑا ہے اصلی گھر کے لئے تو اصلی گھر کا بھی ایک نام ہے بلکہ تو نے گھر کو چھوڑا ہے" معیتِ خالق کے لئے" اصلی گھر کا بھی ایک نام ہے جسکو جنّت کہا جاتا ہے بلکہ گھر سے جو بے گھر ہوگئے ہیں درحقیقت معیتِ حق کے لئے ہوئے ہیں لہٰذا جو درد بھی آتے ہیں اے عبد وہ کیا درد؟ اسکی کچھ پروانہیں تجھ کو پیدا ہی درد کے لئے کیا گیا ہے۔ تو اصل معیتِ خالق ہے مگر اس معیتِ خالق اور معیتِ محبوبِ حقیقی کا محل جنّت ہے۔

جنّت معیتِ حق کی وجہ سے مطلوب ہے :

تو جنّت اس مؤمن بندہ کا مطلوبِ حقیقی نہیں ہے مطلوبِ حقیقی تو معیتِ حق ہے مگر چونکہ اس معیت کا ایک محل ہے اسی کا نام جنّت ہے تو جنّت بھی مطلوب ہے۔

ابنِ فارضؒ کی حکایت :

ابنِ فارض بڑے اکابر اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں ان کے نزع کا عالم ہے روح نکلنے والی ہے اسی حال میں آٹھوں جنّتیں پیش کردی گئیں۔ ان جنّتوں کو دیکھتے ہی بول اُٹھے ....

اِنْ کَانَ مَنزِلَتِی فِی الحُبِّ عِندَکُم مَا قَد رَأَیتُ فَقَد ضَیَّعتُ اَیَّامِی

یعنی کیا آپ کی محبت میں میری یہی منزلت ہے کہ آٹھوں جنّتیں میرے

سامنے کر دی گئیں تو پھر میں نے اپنا تمام زمانۂ عمر ضائع کر دیا برباد کر دیا۔ یہ کہتے ہی آٹھوں جنتیں سامنے سے ہٹ گئیں، ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلّی ہوئی۔ بس اسی حال میں روح نکل گئی اس سے ثابت ہوا کہ مقصودِ اصلی مسلمان کا معیتِ حق ہے۔

فسادِ نیّت باعثِ پریشانی ہے :

یہ عبد اور غُلام ہے پھر یہ نوکری کیوں چاہتا ہے اُجرت کیوں طلب کرتا ہے کہ میں نماز بھی پڑھتا رہوں، روزہ بھی رکھتا رہوں، تلاوت بھی کرتا رہوں، ذِکر بھی کرتا رہوں، تسبیح بھی پڑھتا رہوں، حرام بھی چھوڑتا رہوں، حلال کماتا رہوں، لیکن میرے گھر کی بیماری وہیں کی وہیں ہے، میری غریبی وہیں کی وہی ہے، میری قرضداری وہیں کی وہیں ہے۔ اس کی عبادت پر تو لگا ہوا ہوں مگر افسوس میرا حال وہیں کا وہیں ہے۔ اچھا معلوم ہو گیا کہ یہ تمام عبادت اس کے لئے تھی، یہ نیّت تھی تیری عبادت کی۔ تو یہ عبدیّت اور غُلامیت کے خلاف ہے جب ہی تو دل میں درد اُٹھ رہا ہے اگر یہ نیّت نہ ہوتی اور وہ نیّت ہوتی تو یہ تیرے دل میں درد نہ اُٹھتا۔ وہ درد نہیں رہا اس لئے یہ درد اُٹھا پس معلوم ہو گیا تو غُلام نہیں ہے اجیر ہے معلوم ہو گیا کہ یہ شانِ عبدیّت عبادت نہیں ہے بلکہ بلحاظِ اُجرت عبادت ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام کی حکایت :

قرآنِ پاک میں حضرت لُقمان علیہ السلام کا ذکر آیا ہے : وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمَانَ الْحِکْمَۃَ حق تعالیٰ نے یوں فرمایا تھا: ''لقمان علیہ السلام نبوّت دی جائے یا حِکمت؟ لقمان علیہ السلام نے عرض کیا ''حِکمت'' چنانچہ حِکمت دے دی گئی۔ پند نامہ

کے آخر میں لقمان علیہ السلام کی وعظ و نصیحت مذکور ہیں۔ حضرت لقمان علیہ السلام کسی امیر کے قبضہ میں آگئے اور غُلام بن گئے۔ آقا نے اپنے باغ میں نگرانی کے لئے مقرر کر دیا۔ آقا ایک دن باغ آیا ٹہلتا رہا، لقمان علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے باغ میں جو ککڑی ہیں ان میں سے ایک ککڑی توڑ کر لاؤ، عرض کیا بہت اچھا! گئے اور ایک ککڑی لے آئے، لاکر آقا کو دے دی آقا نے توڑی کچھ خود رکھی کھانے کیلئے اور کچھ لقمان علیہ السلام کو دے دی۔ آقا نے جو ہونٹ پر رکھی تو ککڑی بڑی کڑوی، فوراً منہ سے نکال دی اور لقمان علیہ السلام اس کو کھا رہے ہیں آقا دیکھ رہا ہے زبان پر تو کیا ذکر آتا چہرہ پر بھی اس کا اثر نہیں آیا آقا نے تعجب سے کہا لقمان! یہ ککڑی اتنی کڑوی اور تم زبان پر تو کیا اس کا ذکر لاتے پیشانی اور چہرہ سے بھی کوئی کڑواہٹ ظاہر نہیں کر رہے ہو اور شیرین سمجھ کر کھا رہے ہو؟ لقمان علیہ السلام نے جواب دیا ''میرے آقا جس ہاتھ سے ہمیشہ میٹھا کھایا ہو آج اگر اس کے ہاتھ سے کڑوا پہنچ گیا تو زبان پر لاؤں.........؟''

یہ واقعہ بیان کر کے حضرت والا نے فرمایا دیکھا غلامِ انسان کیا کہہ رہا ہے اور انسان، غُلامِ حق تعالیٰ، اسکی زبان پر شکایت ہی شکایت آئے۔

غُلام کا کام متعیّن نہیں :

غُلام کا کام متعیّن نہیں۔ غُلام سے کبھی کہا جاتا ہے لوٹے میں پانی بھر کر لاؤ، پیروں کو دباؤ، کھانا پکاؤ برتن دھوؤ، فلاں سامان لاؤ اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ آقا کہتا ہے ''مجھ کو بادشاہ نے بُلایا ہے میں نہیں جاؤں گا تمہارے سر پر میں اپنا تاجِ شاہی رکھ دیتا ہوں بادشاہ کے ہاں دعوت میں بجائے میرے تم جاؤ'' اپنا خلیفہ بنا کر بھیجتا ہے۔ قرآن شریف کی آیت ہے: ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ

کَیْفَ تَعْلَمُوْن ٥ خلائف جمع خلیفہ کی ہے ذرا سوچو خلیفہ کس کو بنایا جاتا ہے؟ اس کو بنایا جاتا ہے جس میں اصل کے صفات پائے جا رہے ہوں۔

انسان کو بااختیار بنا کر بھیجا گیا ہے :

تو ذاتِ باری تعالیٰ نے اس انسان کو زمین میں بااختیار بنا کر بھیجا ہے یعنی اختیارات کی شان اس میں رکھ کر بھیجا ہے کہ جس طرح چاہے جس وقت چاہے اپنے کو موڑ سکتا ہے پتھر بنا کر نہیں بھیجا، نباتات میں سے نہیں جمادات میں سے نہیں جو بے اختیار ہیں بلکہ اس کو اختیار ہے، جب چاہے کھڑا رہے، جب چاہے چلے، جہاں چاہے چلے۔ بخلاف پانی کے کہ وہ نشیب کو جائے گا اس میں اُوپر کو جانے کا اِرادہ ہی نہیں ہے۔

ایک ضدّی بیوی کا قصہ :

ایک شخص کی بیوی تھی بڑی ضدّی جو کام کرے اُلٹا میاں کے خلاف، وہ شخص تھا کاشتکار کبھی کہہ جاتا کہ ارے بھلی مانس! آج میں تھکا ہوا بھوکا آؤں گا ذرا روٹی پکی پکائی ملے۔ تو اور دن تو پکا بھی دیتی تھی لیکن جب اس دن لوٹ کر آیا تو کیا دیکھتا ہے روٹی ہی نہیں۔ روٹی پکتی تو کیا چولہے میں پانی پڑا ہوا ہوتا؟ آگ کا نام ہی نہیں، ایک دن کہہ کر گیا میں بہت تھکا تھکا آؤں گا چارپائی پر بستر لگا لگایا ملے۔ جب آیا تو بستر کیا لگتا چارپائی کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہے۔ یہ شخص پریشان ہو گیا اس کا کوئی سمجھدار دوست تھا، اس سے کہا کہ میں اپنی بیوی سے پریشان ہوں جو کام کرتی ہے خود جو چاہے کرے لیکن میرے کہنے کے ہمیشہ خلاف ہی کرے، جان مصیبت میں آگئی ہے کوئی رائے دو کہ میری جان چھوٹ جائے۔

دوست نے کہا اچھا بھائی! ترکیب تو میں بتلا دوں گا کرنا تمہیں پڑے گا۔

اس نے کہا ضرور کروں گا۔ دوست نے کہا وہ تمہارے یہاں دو بیل ہیں ایک بیل پانی میں بیٹھ جاتا ہے، تو اس سے یہ کہنا کہ بہت دن ہو گئے ہیں تم اپنے میکہ نہیں گئی ہاں جانا بھی نہیں چاہیئے وہ کہے گی میں تو جاؤں گی تم کہنا دیکھو ندی چڑھ رہی ہے اس بیل پر مت جانا جو پانی میں بیٹھ جاتا ہے وہ کہے گی میں اسی پر جاؤں گی بس تم خاموش ہو جانا۔ چنانچہ جب وہ گھر گیا تو بیوی سے کہا او ہو! بہت دن ہو گئے تم میکہ نہیں گئی اور جانا بھی نہیں چاہیے تمہارا اپنا گھر تو یہی ہے نا۔ اس نے کہا میں تو جاؤں گی۔ اس نے کہا اچھا! تو ندی چڑھ رہی ہے اس بیل پر مت جانا جو پانی میں بیٹھ جاتا ہے دوسرے پر جانا۔ اس نے کہا میں تو اسی پر بیٹھ کر جاؤں گی۔ بس کپڑے باندھ کر بیل پر سوار ہو کر چلدی...... آگے آئی ندی یہ بیل پر سوار، بیل گھس گیا پانی میں جب بیل پانی میں گھستا چلا گیا تو آگے چل کر پانی میں بیٹھ گیا، بیل کا تو بیٹھنا تھا اور پانی گہرا تھا ڈوب گئی۔ یہ شخص اس کو تلاش کرنے نکلا تو بجائے پانی کے نشیب کی طرف ڈھونڈنے کے اُوپر کی طرف ڈھونڈنے جا رہا تھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے وہ سمجھ گئے کہ کسی چیز کی تلاش میں ہے کسی نے پوچھا کیا تلاش کر رہے ہو تو اُس نے کہا میری بیوی اس بیل پر بیٹھ کر جا رہی تھی وہ بیل پانی میں بیٹھ گیا اور وہ ڈوب گئی، اس کو تلاش کر رہا ہوں۔ اُس نے کہا تو بڑا بے وقوف ہے اگر تلاش کرنا ہے تو پانی کے بہاؤ کی طرف جاؤ وہاں ڈھونڈ اوپر کی طرف کیوں ڈھونڈ رہا ہے اس نے کہا کہ میری بیوی کا ہر کام اُلٹا تھا اگر بہے گی تو اُلٹی طرف ہی بہے گی۔

بیوی نے اپنے میاں کے ساتھ اُلٹی رفتار اختیار کی اس لئے ڈوبی تو یہ بشر اللہ تعالیٰ کے ساتھ جب اُلٹی رفتار اختیار کرے گا تو ڈوبے گا۔ اسی سے سمجھیئے کہ جب

آقائے حقیقی کے ساتھ اس کا کام خلاف مرضی اُلٹا ہوگا تو تیرے گا یا ڈوبے گا؟ انسان اور بالخصوص مسلمان غلام ہے اور غلام کا کوئی کام مقرر نہیں اسی لئے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ O لِيُصَلُّوْن لِيَصُوْمُوْن نہیں فرمایا: لِيَطُوفُوْن نہیں فرمایا۔ اے عبد! تیرا کوئی کام مقرر نہیں ہے اجارہ کا کیا سوال، اُجرت کا کیا سوال ....

ملنے اور نہ ملنے کا وہ مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہیئے کہ تگ و دو لگی رہے

عبدیّت پر وہ ملے گا جو بتایا نہیں جاسکتا:

کام میں لگا رہے بس اور کیا ملے گا؟ اس دُنیا میں اِس کو بتایا بھی نہیں جا سکتا اِسی کو حدیث میں فرمایا ''ارے تجھ کو وہ ملے گا جو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا حتیٰ کہ دل میں بھی کبھی اس کا خیال نہیں گزرا۔

تمام مخلوق سے قطعِ نظر وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا تب اللہ کی معیّت حاصل ہوگی اور سکون حاصل ہوگا۔

☆

اُنتیسویں مجلس

مجعولیّتِ معنوی اور اس کے آثار

۱۴ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق ۳۱ مارچ ۱۹۹۱ء بروز یکشنبہ بوقتِ صبح

ذاتی کام لینے کے لئے غایتِ بے تکلّفی ضروری ہے :

یہ الگ بات ہے کہ کسی وقتی اظہارِ محبت پر کچھ بے تکلفانہ تعلق پر طبیعت کے کُھلی ہوئی ہونے کے طور پر کسی دوسرے کام کو جو وقتی طور پر پیش آ گیا ہے کہہ دیا جائے تو وہ دوسری بات ہے۔ اس میں اُجرت نہیں ہوتی چونکہ وہ بے تکلّف ہے اس لئے اسے کہہ دیا گیا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اس سے اپنے ذاتی کام کے لئے کہنا نہیں چاہیئے اور اُسے بھی ایسے کام کے لئے کہا جائے گا جس کو وہ کر سکے، اس میں اِستعداد اس کام کرنے کی ہو اگرچہ اُس وقت کچھ صعوبت ہو لیکن ایسا تعلق والا ہے تو اس کی مصلحت سے اس کی طبیعت میں کسی حِکمت سے کام لینا آ گیا۔

اِستعداد کھولنے کے لئے بھی کام سپُرد کیا جاتا ہے :

اِستعداد ہے اس میں اور اس قسم کا بے تکلفانہ اس سے تعلق ہے تو اس کام

لینے والے کو چاہیئے کہ اس میں جو استعداد ہے اس کا ظہورِ عملی ہو جائے اس لئے کام لیتا ہے کہ اس میں جو استعدادِ معنوی رکھی ہوئی ہے وہ استعدادِ معنوی ظہور میں آجائے اگر منع کرتا ہے اور اس کام کو زبان سے انکار نہ کرنے کے ساتھ عملاً نہیں کرتا ہے تو اس کا امتحان ہو گیا اس لئے آئندہ اس سے کام لینے میں احتیاط کرے گا اور چونکہ وہ عالمُ الغیب نہیں ہے اس لئے آئندہ کے لئے بھی اس کی طبیعت احوطی ہو گئی اس لئے اب کسی کی طرف سے اظہارِ محبت اور بے تکلفی کے باوجود کام لینے میں احتیاط پیدا ہو جائے گی ہر ایک مظہرِ محبت سے، بے تکلفانہ طبیعت ظاہر کرنے والے سے آزادانہ خدمت لینے کی طبیعت نہیں ہو گی۔ وہ تو اس کو کچھ بتانا تھا اس میں استعداد کا کچھ ظہور ہونا تھا مثال کے طور پر مدارس میں طلباء طلبِ علم کے لئے آتے ہیں ان کو تلامذہ کہتے ہیں اور جو تعلیم دیتے ہیں ان کو اساتذہ کہتے ہیں تو اُستاد صاحب نے پانی کی ضرورت اپنے لئے سمجھی اب نظر ڈال رہے ہیں کہ کوئی بے تکلف طالبِ علم آئے اور اس سے پانی منگواؤں۔

اُستاد کو حتی المقدور اپنا کام خود کرنا چاہیے:

حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اُستاد صاحب کو جب کوئی معذوری لاحق نہیں ہے تو خود ہی پانی کا برتن مثلاً لوٹا لے کر درسگاہ سے کمرہ تک نلکے پر جا کر اس سے پانی لے کر جس جگہ سے اُٹھایا تھا اس جگہ پر رکھ دے اور اس لوٹے کو بھی دیکھے کہ اپنا ذاتی ہے یا غیر کا؟ اب غیر کا ہے تو بلا اجازت استعمال میں نہ لایا جائے اگر مدرسہ و مسجد میں رکھے ہوئے ہوں تو خیر اس کی اجازت ہے ہی، اور اجازت کے بعد جہاں سے اُٹھایا تھا وہیں پر جا کر رکھے کہ جس کا لوٹا ہے جہاں رکھا ہوا تھا وہیں تلاش کرے گا۔ اس کو

ضرورت ہو تو تلاش کرنے کی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے بارِ خاطر نہ ہو۔

اُستاد کی طبیعت میں شانِ مجعولیّت ہونی چاہیے :

اُستاد کی طبیعت تحصیلِ علم، بحصولِ علم با حتسابِ طبیعت بن گئی تو پہلے مجعولیت اُستاد کی اس طرح ہونی چاہیے کہ درمیان جاعل ومجعول کے جعل میں تخلف نہ ہو تو پہلے اُستاد میں اس شان کی مجعولیٔت ہونی چاہیے تب جال خدمت کا پھیلانا ناجائز نہیں ہے۔

خدمت کیوں لیجاتی ہے ؟

تو اُستاد جس میں مجعولیت کی شان آ گئی ہے وہ اپنی راحت کے لئے خدمت نہیں لینا چاہتا ہے خود ہی اپنی ضرورت کو لوٹا لے کر پانی لے کر پورا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کوئی شاگرد تلمیذ ایسا ہے جس کی طرف سے اظہارِ محبت میں بے تکلفی ہے خدمت بے لوث، بے غرض کا جذبہ ہے تو اس میں جو استعداد نظر آ رہی ہے اس کے عملی ظہور کے لئے لوٹا دیدیا اپنی راحت کے لئے نہیں اس میں جو اِستعداد رکھی ہوئی ہے اس استعداد کے ظہورِ عملی کے نلئے اور ترقی اِستعداد کے لئے، طبیعتِ جعلی بنانے کے لئے اس کی ترقی استعداد قائم ہونے کے لئے نہ کہ اپنی راحت کے لئے اُستاد کو اپنی راحت کے لئے خدمت لینا جائز نہیں ہے۔

خدمت لینے کے لئے اِستعداد کی پہچان :

اور اس اِستعداد کی پہچان یہ ہے کہ وہ خدمت کے لئے شوق سے جا رہا ہے سکراہٹ کے ساتھ جا رہا ہے اس کی تو عید آ گئی۔ اُستاد صاحب نے جس ضرورت

کے لئے چاہا تھا اس کو فوراً پورا کر دیا۔ اور اگر وہ مخاطب ہوتے ہوئے مخاطب نہیں ہوتا متحرک نہیں بنتا، اُستاد پر ظاہر ہوگئی اسکی اِستعداد بس سکوت اختیار کر لیا۔ الغرض تلمیذ سے خدمت لینا اس کی منفعت کے لئے، ترقیٔ استعداد کے لئے اور طبیعت کی مجعولیت کے لئے ہونی چاہیے محض اپنی راحت کے لئے نہیں ہونا چاہیے۔

طالبِ حقیقی کے ساتھ روک ٹوک کی وجہ :

اس لئے حضراتِ مشائخ جو طالبِ واقعی طلب و صدق کے ساتھ اندرونی اِستعدادِ جَعل کے لئے حاضر ہوا ہے اس کے ساتھ اسی طرح سے تعلقِ طریق اَتالیقی اختیار کرتے ہیں وہ شانِ جعلی مجعولیت ذاتِ باری تعالیٰ نے جو اس میں رکھی ہے وہ اس درجہ کی آجائے کہ عمل میں کوتاہی نہ ہو اسی لئے وہ اعمال کی حیثیت سے جو ظہورِ عملی جسمانی ہے ٹوکتے ہیں اِستعدادِ معنوی اخلاقی مِن حَیثُ التَّزکِیَه مِن حَیثُ الجَعَل جو رکھی ہوئی ہے اس پر بھی اس کو ٹوکتے ہیں تاکہ اس میں جو کمالِ جعلی معنوی رکھا ہوا ہے اس کا ظہور عملی احساسی میں نہایت پاکیزہ طریقہ سے ظہور میں آئے۔ اسی لئے اِن اولیاء اللہ کے طالبین کے ساتھ بظاہر ایسے سلوک ہوتے ہیں جو دوسروں کے عقل وفہم اور ذہن میں نہیں آسکتے بلکہ دیکھنے والا ان کو ظالم کہہ سکتا ہے ظالم کہہ دیتا ہے۔ حالانکہ اُس شیخ نے اِس کے ساتھ عجیب عدل کا معاملہ کیا ہے اور بلا اس کے تزکیہ اور اصلاح کے سوال کے خود ہی طالب میں بکرمِ مجعولیت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

شیخ کلام میں بھی سکون کے لئے اِصلاح کرتا ہے :

کلام میں جو کہ بظاہر احساسی چیز ہے لیکن درحقیقت وہ معنوی ہے اس میں بھی شیخ اِستعدادِ خاص قائم کرنا چاہتا ہے اس کو اپنی ذات میں بھی سکون سے رہنے کے

لئے اور دوسروں کو مخاطب بناتے ہوئے ان میں بے سکونی پیدا کرنے سے بچنے کے لئے محرک بھی ہے متحرک بھی ہے حرکت بھی ہے مگر باوجود اس کے سکوت مِن حیث الجعل و المجعول بعلب بھی اور دونوں مجرّد ہیں اسی لئے شیخ کہتا ہے تم نے ایسے الفاظ منہ سے کیوں نکالے اس طرح تم نے کیوں کلام کیا؟

ایک بزرگ کا عجیب طریقِ تربیّت :

ایک بزرگ تھے اُن کے یہاں جب کوئی بیعت و تزکیہ کے لئے آتا تو فرماتے، اچھا اچھا بہت اچھا' اُس کے لئے شیخ کے گھر سے کھانا آتا تھا، جب کھانے کے برتن واپس جاتے تو خود دیکھتے تھے کہ روٹی بچی ہے کتنا سالن ہے یا روٹی ہے یا سالن نہیں ہے یا سالن اتنا بچا ہوا ہے کہ اس کے مطابق روٹی نہیں ہے۔ الغرض اگر روٹی اور سالن میں مطابقت نہ ہوتی تو تشریف لاتے اور فرماتے ''ہمارا اور آپ کا نباہ نہیں ہوگا سالن اور روٹی میں تناسب نہیں ہے تو جس چیز کے لئے آپ تشریف لائے ہیں اس کے حصول میں دیر ہوگی وہ ایک معنوی چیز ہے۔ لہٰذا پہلے محسوسات میں تناسب فرمایئے۔

اب تو اِنحطاط کا زمانہ ہے چل رہا ہے معاملہ جیسا چل رہا ہے غور فرمایئے وہ حصولِ معنویات کے لئے طالب ہو کر آیا تھا اصلاح شروع ہوگئی یا ظلم کیا؟ ظاہرِ حال کو دیکھ کر مفتی صاحب یا مولوی صاحب تو نہ معلوم کیا کہہ دیں گے، اسی لئے اُن حضرات کے افعال واقوال پر اعتراض ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔

سُلطان نظام الدینؒ کا اصلاحی کلام :

دو اشخاص بڑا لمبا سفر کر کے سُلطان نظام الدّین صاحبؒ کی خدمت میں

حاضر ہوئے اظہارِ بیعت کیا، فرمایا بہت اچھا! ٹھہرو نماز کا وقت ہے نماز کو چلیں دونوں شخص حوض پر بیٹھے ہوئے وضوء کر رہے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں سُلطان صاحب نے دیکھ کر فرمایا وضوء کرتے ہوئے باتیں کرتے ہو حالانکہ وضوء کے وقت دُنیاوی باتیں نہیں کرنی چاہیے، وضوء نماز جیسی چیز کے لئے طہارت حاصل کرنا ہے جو کہ بظاہر حسّی ہے لیکن اندر قلبی اثر کی حیثیت سے معنوی ہے۔

وضوء میں نورانی چادر :

حدیث شریف میں ہے جب آدمی وضوء کرنے بیٹھ جاتا ہے تو چار فرشتے نورانی چادر اس وضوء کرنے والے کے اُوپر تان لیتے ہیں جب وضوء کرنے والا دُنیاوی بات کرتا ہے تو ایک فرشتہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے، دوسری مرتبہ بات کی تو دوسرا چھوڑ کر چلا جاتا ہے تیسری مرتبہ بات کی تو تیسرا اور چوتھی مرتبہ بات کی تو چوتھا فرشتہ اُس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور وہ نورانی چادر چلی جاتی ہے۔ وضوءِ حسّی کا تعلق معنوی کہ اگر بات نہ ہوگی تو وضوء نورانی ہوگا اور جب وضوء نورانی ہوگا تو نماز کچھ کم نورانی ہو گی؟ کیونکہ جیسا واسطہ ہوگا ویسا ہی ذی واسطہ بھی ہوگا۔ جب وضوء میں ضیاءِ نور ہوگا تو اندازہ کرو کہ نماز کیسی نورانی ہوگی۔ تو سُلطان جی نے فرمایا کیا باتیں کر رہے ہو؟ عرض کیا حضور! ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے ہاں کا حوض یہاں کے حوض سے بہت بڑا ہے فرمایا! اچھا وضوء کر کے نماز پڑھو اور نماز پڑھ کر گھر واپس چلے جاؤ اور اپنے ہاں کا حوض ناپ کر آؤ، وہ دونوں شخص طالب۔ تھے گئے اور ناپ کر آئے۔ پہلے ایسا اعتقاد ہوتا تھا آجکل کا سا اعتقاد نہ تھا آجکل کے ہوتے تو کہتے اتنی دور سے آئے ہیں مرمٹے اور یہ یوں کہہ رہے ہیں چلو جی کہیں اور جا کر بیٹھ جائیں گے مگر وہ ایسے نہ تھے گئے۔

آجکل کی طرح سفر کی آسانی بھی نہ تھی اور ناپ کر آ گئے سُلطان جی نے پوچھا کتنا فرق ہے؟ عرض کیا ہمارے ہاں کا حوض یہاں کے حوض سے ایک بالشت بڑا ہے فرمایا کہ آپ صاحبوں نے تو یہ کہا تھا کہ بہت بڑا ہے ایک بالشت کو بڑا تو کہتے ہیں لیکن بہت بڑا نہیں کہتے۔ معلوم ہو گیا کہ تمہاری طبیعت میں جھوٹ سے بچنے کی احتیاط نہیں، لہٰذا ہم تم کو بیعت نہیں کرتے اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔

سُلطان جیؒ کے طریقِ اصلاح میں حکمت :

ہم تو عام طور پر بس کہہ دیں گے کہ کتنا بڑا ظلم ہے، نہیں یہ ظلم نہیں! بڑا عدل ہے شیخ کا بڑا کرم ہے جو اس موسمِ انحطاط میں طالبین کے ساتھ استعمال نہیں کیا جا رہا ہے اس میں یہ تھا کہ جس چیز کے لئے تم آئے ہو یہاں وہ ذرا کچھ ایسی ہی باریک چیزیں ہیں تو پہلے جو جھوٹ سے احتیاط وغیرہ کی حسّی چیزیں ہیں وہ نکلیں تب یہ باریک چیزیں جس کے لئے تم آئے ہو وہ توفیقِ الٰہی سے جلدی حاصل ہو جائے گی ورنہ ان چیزوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے عمل میں لاتے ہوئے کتنا زمانہ گذر جائے گا پھر ان باریک باتوں کی نوبت کب آئے گی۔ تو گھر سے بے گھر ہو کر اہل وعیال کی نگرانی سے دور ذمہ داری اور ادائے حقوق سے کمالِ نگرانی سے بُعد کب تک ہو گا اور معلوم ہو گیا کہ تم طالب صادق ہو لہٰذا جاؤ اور ایسی ایسی چیزیں جو مِن حیثُ العقل بطلب صِدق محسوس چیزیں ہیں ان موٹی موٹی چیزوں کو جو تم کرتے رہو اور موٹی موٹی چیزیں ترک کرنے کی ہیں ان کو چھوڑتے رہو جب ان میں تمہاری طبیعت سلامتی کی ہو جائے تب آنا بس پھر انشاء اللہ کافی ہوں گے کہ آئے اور لگ گئے اور کام بن گیا، یہ وجہ تھی واپس کرنے کی کہ ان میں مجعولیت پیدا کرنی تھی کہ اپنے لئے بھی پُر سکون ہو اور

دوسروں کے لئے بھی پُر سکون رہے خانگی زندگی میں بھی اور بیرونی زندگی میں بھی اپنوں کی زندگی میں بھی اور غیروں کی زندگی میں بھی۔

مرزا جانِ جاناںؒ کا طریقِ تربیت :

مرزا جانِ جاناں کے ایک خادمِ خاص طالبِ صادق غُلام علی تھے اگر چہ وہ بعد کو ہو گئے غُلام علی شاہ' بادشاہوں کو شاہ کہتے ہیں مگر اِن اہل اللہ کو شاہ صاحب کہتے ہیں تو غُلام علی شاہ بے تکلّف محبِّ صادق تھے حضرت والا واقعہ بیان فرمارہے ہیں کہ دہلی میں لوز کے نام سے بشکلِ بادام بہترین مٹھائی ہوتی تھی) ایک شخص نے بے تکلّف محبت میں لوز لایا اور مرزا صاحب کی خدمت میں پیش کئے، قبول فرمالئے وہ شخص چلا گیا مرزا صاحب نے فرمایا غُلام علی!...... جی حضور!...... لوز کھائے گا؟ عرض کیا جی حضور! کھاؤں گا۔ فرمایا لو جھٹ غُلام علی شاہ نے ہاتھ آگے کرلیا' اوہو! تو مجھے کیا چارپائی ہی پڑا لے گا' ہاتھ کرلیا آگے ارے کوئی کاغذ وغیرہ لا...... کاغذ لائے دیدئے کاغذ میں اُلٹا سیدھا لپیٹنے لگے، دیکھ کر فرمایا تو مجھے مار ہی دے گا اِدھر لا کاغذ لے کر باقاعدہ اسکے کنارے یکساں کر کے پُڑیا باندھ کر دے دیئے۔ حسیّات کی مرزا صاحب نے تعلیم فرمائی کہ کاغذ کو لوز کے اُلٹا سیدھا لپیٹنے سے منع کر دیا بلکہ بلکل یکساں لپیٹ کر دیئے۔ ایک دن پوچھا غُلام علی وہ لوز کھائے تھے؟ عرض کیا جی حضور کھائے تھے۔ ابھی باقی ہیں؟ حضور وہ تو میں نے اُسی دن سب ایک ہی وقت کھا لئے تھے۔ افوہ ارے......! وہ کھانے کے لئے تھوڑے ہی ہوتے ہیں؟ وہ تو ذائقہ کے لئے ہوتے ہیں تو کہہ رہا ہے کھا لیئے، کھانا کھایا بطورِ ذائقہ اس میں سے کچھ چکھ لیا...... یہ حسیّات کی تعلیم ہو رہی تھی۔

بعض آداب کی باتیں :

یہ نہیں کہ کتاب اُٹھائی بائیں ہاتھ میں، جوتے ہیں دائیں ہاتھ میں اور چلے جارہے ہیں۔ اللہ اکبر ارے خوب ادب کیا کتاب کا کھانا لینے گئے مطبخ میں روٹی نیچے رکھ لی پیالہ اس کے اُوپر رکھ لیا اور لئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ روٹی کا درجہ سالن سے اونچا ہے اور سالن کا پیالہ سے اور جس کا درجہ نیچا ہے اوپر رکھ دیا۔ یہ خلافِ ادب ہے اسی طرح چارپائی اُلٹی سیدھی پڑی ہے اس سے اندر کا حال معلوم ہوتا ہے۔ یہی غُلام علی شاہ ایک دن مرزا صاحب کو پنکھا جھل رہے تھے لیکن بہت آہستہ آہستہ جھل رہے تھے۔ مرزا صاحبؒ نے فرمایا ''کیا تیرے ہاتھ میں جان نہیں ہے؟'' غُلام علی صاحب نے پنکھا ذرا تیز کر دیا کچھ توقف کے بعد فرمایا ''کیا مجھے اُڑا ہی دے گا'' غُلام علی شاہ صاحب کی زُبان سے نکل گیا بہت آہستہ ''نہ یوں بن پڑے نہ یوں بن پڑے'' مرزا صاحب کے کانوں میں آواز پہنچ گئی فرمایا ''پنکھا یہاں رکھ دو اور خانقاہ سے نکل جاؤ۔ ممکن ہے عام آدمی دیکھ کر، سُنکر کہنے لگے دیکھو! کتنا غصّہ کر رہے ہیں، ہم تو سُنا کرتے تھے کہ بزرگ حلیم، متحمل المزاج ہوتے ہیں یہاں تو حِلم کا نام ہی نہیں ہے۔ اعتراض کرنا آسان ہے مگر حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔

شیخ نے اُن کا چور پکڑ لیا کہ ان کے اندر ابھی غصّہ کی چنگاری موجود ہے یہی شُعلہ بن سکتی ہے لہٰذا اس کو نکالو اور اس کے نکالنے کی یہ تدبیر کی گئی ہے۔ جانتے ہیں کہ محبِ صادق ہے، کہیں جائے گا نہیں اور طبیعت پر بوجھ پڑے گا جس سے وہ اندر کے غصّہ کی چنگاری نکل جائے گا۔ چنانچہ خانقاہ سے نکل گئے، اب لگے رونے خوب اچھی طرح سے آہ وبکا ہو رہی ہے۔

محبتِ شیخ کیوں ضروری ہے؟

ظاہر میں محبت تمی شیخ سے اِس کا ظہور ہے اور حقیقت میں محبتِ الٰہی ہے لیکن بلا محبتِ شیخ کے محبتِ الٰہی دائمی حاصل نہیں ہو سکتی جبکہ حضور ﷺ ذاتِ باری تعالیٰ سے درخواست کر رہے ہیں: اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی حُبَّکَ وَ حُبَّ مَنْ یَّنْفَعُنِی حُبُّہٗ عِنْدَکَ اے اللہ رزق عطاء فرما دیجیئے مجھکو محبت کا محبت نام ہے تعلّقِ لطیف کا قلب مجرّد کے ساتھ تو فرما رہے ہیں اے اللہ محبت کا مجھے رزق عطاء فرما دیجیئے اور اس شخص کی بھی محبت عطاء فرمایئے جسکی محبت آپ کے نزدیک آپ کی محبت میں نفع دے۔ غلام علی صاحب اس بات کو سمجھے ہوئے ہیں کہاں چھوڑ سکتے ہیں شیخ کی معیت کو کہیں وہ (اللہ رب العالمین) نہ روٹ جائیں اس لئے رو رہے ہیں اور معافی کی درخواست ہو رہی ہے چنانچہ درگزر کیا گیا معاف کیا ہو گیا۔ دراصل نکالا نہیں گیا تھا بلکہ وہ نکالنا نکھارنا تھا کسی اور چیز کے آنے کے لئے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔

شیخ نے سمجھ لیا کہ ابھی مادیّت کی چنگاری موجود ہے میرے اس کہنے پر کہ کیا تیرے ہاتھ میں جان نہیں ہے اور کیا تو مجھے اُڑا ہی دے گا۔ دو متضاد چیزیں سامنے آ گئیں جس سے گرانی آ گئی خار آ گیا بوجھ پڑ گیا شعلہ نہ سہی چنگاری تو آ گئی چنگاری بھی کسی کپڑے پر رکھ دو تو کپڑا خاکستر ہو جائے گا اور جب میرے اس کہنے پر چنگاری آ گئی تو باہر کے خلافِ طبیعت سے کوئی کچھ کہہ بیٹھے گا تو کہیں شعلہ نہ بن جائے۔ ابھی کسر ہے اس کو نکالنا چاہیئے اس لئے ایسا کیا تھا تو دیکھیئے بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ بڑا ظلم کیا ہے کہ خانقاہ سے نکال دیا مگر اس تفصیل کے بعد معلوم ہوا کہ بڑا رحم و کرم تھا کہ بلا درخواستِ معالجہ کے شیخ ان کا معالجہ فرما رہے ہیں اِسی کو کرم کہتے ہیں۔

جُودوکرم میں فرق :

جُودوکرم میں فرق ہے۔جُود کے معنی سخاوت کے ہیں اور سخاوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص واقعی صاحب حاجت نہ کہ پیشہ ور، آپ کے پاس آئے اور خالی ہاتھ نہ جائے اس کی ضرورت اپنی حیثیت دیکھ کر پوری کردی جائے، اس کو جودوسخاوت کہتے ہیں اور کرم یہ ہے کہ کسی شخص کا واقعی صاحب حاجت ہونا معلوم ہوا یہ شخص اسکی حاجت کو معلوم کرکے اپنے گھر سے کچھ لے کر اس کے مکان پر پہنچا اور جاکر اس کو دے دیا اسکو کرم کہتے ہیں۔تو اللہ تعالیٰ کریم بھی ہیں اور جوّاد بھی ہیں زیادہ تر ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے کرم ہی ہے اسی طرح اہل اللہ کی طرف سے بھی زیادہ تر کرم ہی ہوتا ہے تو مرزا صاحب کا یہ کرم تھا کہ اصلاح فرمائی یہ بھی تو محبت ہی ہے کہ باپ بیٹے کو انجکشن لگوا رہا ہے بلکہ آپریشن کررہا ہے تاکہ پورا جسم محفوظ ہوجائے۔

مشائخ بھی کبھی آپریشن کرتے ہیں :

اسی طرح مشائخ بھی کبھی انجکشن لگاتے ہیں آپریشن کرتے ہیں اسکی مجعولیت کے لئے جسکا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔دوخادم ایک شیخ کے پاس رہتے تھے شیخ نے ایک دفع ذکر کیا ارے بھائی، کھیر کھانے کو جی چاہ رہا ہے لیکن کھیر کہاں سے ملے نہ دودھ ہے نہ چاول ہیں نہ میٹھا ہے۔ایک دن ہدیہ میں دودھ' چاول اور میٹھا آگیا، شیخ نے قبول کرلیا۔مُریدوں نے کہا حضرت اب تو کھیر کا سامان آگیا ہے آپ کئی مرتبہ فرما چکے ہیں اب تو کھیر پکالیں، فرمایا ہاں پکالو۔چنانچہ کھیر پکائی پک کر تیار ہوگئی رکابی میں نکالی جب کچھ ٹھنڈی ہوئی پیشِ خدمت کرکے عرض کیا کہ حضور کھیر حاضر ہے فرمایا

اچھا! اور کھیر چمچہ سے لے کر منہ تک لے آئے لیکن کھاتے نہیں کہ ہونٹ کے اوپر ناک ہے اور پھر ناک کے آگے دل کی ناک ہے۔ اس دل کی ناک سے کچھ بُو آئی خادموں نے کہا حضور آپ کی تو کھیر کھانے کی تمنا تھی پک کر پیشِ خدمت ہے، نوشِ جان نہیں فرماتے کھاتے نہیں؟ فرمایا کھاؤں کس طرح اس میں سے تو چوری کی بو آرہی ہے، عرض کیا حضرت! پکتے وقت ہم دونوں موجود تھے اور شروع سے آخر تک رہے کوئی اور تھا نہیں پھر چوری کیسے ہوگئی؟ فرمایا میں کیا کروں مجھے تو اس میں سے چوری کی بو آرہی ہے"۔

مادیات اور مجرّدات کا فرق :

فرمایا چوری کی بو آرہی ہے، ہمارے اندر تو مادیات ہیں مجرّدات سے تو ہم خالی ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو گرمی کا موسم تھا پیاس لگی پانی پینے کو جی چاہ رہا تھا ایک طالب علم اُٹھے اور مٹی کے کٹورے میں پانی لائے جب پیا تو فرمایا، اس میں تو مُردے کی بو ہے سب حیران ہوگئے کہ مُردے کی بُو کہاں سے آرہی ہے۔ بعض طلبہ شوخِ چشم اور طباع ہوتے ہیں ایک طالبِ علم کمہار کے پاس گیا جو مٹی کے برتن بناتا تھا اور کہا ارے بھائی! تم نے ابکے جو برتن بنائے تھے اس کی مٹی کہاں سے لائے تھے۔ کمہار نے کہا تم کیوں پوچھتے ہو، طالبِ علم نے قصہ سُنایا۔ کمہار نے کہا کہ کچھ برسات ہورہی تھی مٹی ملتی نہیں تھی تو میں قبرستان چلا گیا رات کو وہاں سے مٹی لایا تھا اب کے اس مٹی کے برتن بنائے تھے۔ جب برتن بنائے تو دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھے اور دھوپ میں سوکھا کر پھر میں آ گیا، آگ میں پکے تھے، سب کچھ ہوا تھا مگر پھر بھی حضرت کو اس برتن میں مُردے کی بُو آرہی تھی۔ یہ ہیں معنویات و مجرّدات اسی طرح شیخ فرمارہے ہیں کہ اس میں چوری کی بُو آرہی ہے خدّام نے کہا حضرت ہم

وہیں تھے پھر چوری کیسے ہوگئی؟

فرمایا جاؤ سوچو، دونوں بیٹھ کر سوچنے لگے سوچتے سوچتے ایک نے کہا بھائی ایسا تو ہوا تھا کہ جب ہم پکا رہے تھے تو دودھ کچھ اُبل کر اوپر آ رہا تھا تو میں نے اور تم نے اُس اُبلتے ہوئے دودھ کو چمچے میں لیکر پی لیا تھا، چلو عرض کر دیں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضرت! پکاتے ہوئے ایسا ایسا ہوا تھا۔ فرمایا یہی تو کہہ رہا ہوں کہ چوری کی بُو آ رہی ہے یہ تصرّف بلا اجازت پیر کو بھی نہ چھوڑا؟ اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا تھا......؟ عرض کیا حضور غلطی ہوگئی درگذر فرما دیجیے۔ فرمایا اچھا یہ درگذر فرمائے جانے کی بات نہیں ہے جاؤ، دھوپ میں کھڑے ہو جاؤ، دھوپ میں کھڑے ہوگئے اب گرمی کا موسم تھا پسینہ آ کر ٹپک گیا، تو شیخ میں فطری ترحّم ہے، لہٰذا شیخ کی جانب سے تلقین شروع ہو گئی بجائے تعلیم کے تلقین شروع ہوگئی۔

تعلیم و تلقین میں فرق :

نزع کے وقت مرنے والے کے پاس اتنے زور سے کلمہ پڑھنا شروع کر دے کہ اس کے کان میں آواز پہنچ جائے اور وہ بھی کلمہ پڑھنے لگے یا زُبان حرکت نہ کر سکے تو دل میں کلمہ کا استحضار ہو جائے اسے کلمہ پڑھنے کو نہ کہا جائے یہ تلقین ہے اور اس سے کلمہ پڑھنے کو کہا جائے یہ تعلیم ہے۔

اِسی طرح وہاں شیخ نے دیکھا کہ پسینہ ٹپک رہا ہے تو تلقین کی کیا کہنا چاہتے ہو، کیا کہتے ہو؟ عرض کیا حضور غلطی ہوگئی آئندہ ایسا نہیں ہوگا انشاءاللہ تعالیٰ۔ فرمایا اچھا جاؤ آگے۔ اس کے بعد شیخ نے ایک مُرید خادم سے کہا دیکھو بستی میں فلاں شخص فصد کھولنے والا ہے اُس کو بُلا لاؤ۔ خادم گیا اور بُلا کر لے آیا، شیخ نے فرمایا ارے بھائی!

آپ تو بڑے پرانے تجربہ کار ہیں دیکھو یہ زمین پر کچھ پانی سا گرا ہوا ہے تری سی ہو رہی ہے یہ تری سی کتنے پانی میں ہو سکتی ہے اس نے کہا حضور! پانی تو پھیل جاتا ہے گرِا اور پھیل گیا تو یہ تری اتنے تولہ پانی میں ہو سکتی ہے فرمایا "دیکھو یہ پانی نہیں ہے یہ میرے دو دوستوں کا پسینہ ہے جہاں ان کا یہ پسینہ گرِا ہے میں اپنے جسم کا اتنا خون نکلوانا چاہتا ہوں مُرید نے عرض کیا حضور آپ نے ہماری اصلاح کے لئے جس کے لئے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہیں ایسا کیا ہے فرمایا، ایسا نہیں ہو سکتا جہاں تمہارا پسینہ گرِا ہے میں اپنا خون گراؤں گا"۔

آج کل دوست کہتا ہے ارے یار! خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آئے تو پھر تم مجھے دیکھنا جہاں تیرا پسینہ گرے گا وہاں میں اپنا خون گرِاؤں گا اور جب وقت آیا تو بھاگ گیا۔

دنیوی محبت کا واقعہ :

ایک شخص کا بیٹا تھا اس کی کسی سے دوستی ہو گئی رات کو دیر سے آنے لگا کافی روز اسی طرح ہو گئے تو باپ نے کہا بیٹا تم بہت دیر کر کے آتے ہو ایک دو دن کی بات ہو پانچ دس دن کی بات ہو تو خیر، کافی روز ہو گئے اتنی دیر سے کیوں آتے ہو؟ بیٹے نے کہا کہ میرا ایک دوست ہے ایسا ویسا میں وہاں چلا جاتا ہوں اس لئے دیر ہو جاتی ہے۔ باپ نے کہا: اوہو...... ! میں تو سمجھا تھا کہ آج کل وہ دوست کہاں جو ہوا کرتے تھے معلوم ہوا کہ اب بھی ہیں۔ اچھا کل جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے چلنا، بیٹے نے کہا بہت اچھا۔ جب جانے کا وقت آیا تو باپ نے جاتے جاتے کافی دیر کر دی بیٹا تقاضا کر رہا ہے باپ ٹال رہا ہے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو دونوں چلے، دوست کے دروازے پر پہنچے

کافی دیر ہو چکی تھی کُنڈی لگائی جا چکی تھی بیٹے نے دستک دی آواز دی اندر سے آواز آئی کون ہے؟ اس نے کہا ارے یار! کیا کہتے ہو میں ہوں تمہارا دوست، وہ بولا اتنی دیر کے بعد آپ آئے ہیں میں سونے جا چکا تھا خیر کُنڈی کھولی، بیٹے کو باپ نے کچھ سکھایا تھا کہ اس طرح کہنا۔ اس نے زبان کچھ کہنے کے لئے کھولی ہی تھی کہ دوست کہنے لگا میری آنکھوں میں نیند کا خُمار ہے اچھا پھر دیکھا جائے گا اور کُنڈی لگا کر چلا گیا۔ بیٹے کو بڑی حیرانی ہوئی باپ نے کہا میں نے کہا تھا نا کہ اس زمانہ میں ویسے دوست کہاں ہیں جو ہوا کرتے تھے۔ ہماری بھی کسی زمانہ میں دوستی تھی ہمارا بھی بڑھاپا آ گیا اُن کا بھی بڑھاپا آ گیا بہت سالوں کا عرصہ ہو گیا اُن سے ملے ہوئے انہیں یوں جی چاہتا ہے کہ ذرا وہاں چلیں، بیٹے نے کہا بہت اچھا۔ چلے گئے دستک دی پھر نام لے کر آواز دی تو بولا آہا یار! بہت دنوں بعد تشریف لائے ہو بڑا جی خوش ہوا ابھی آتا ہوں۔

آواز سُنتے ہی پہچان گیا اور وہاں پوچھا جا رہا تھا کون ہے؟ پہلا فرق تو یہی ہوا پھر آیا تو اس ہیئت سے آیا کہ سر پر کھانے کی سینی رکھی ہوئی ہے سیدھے ہاتھ میں لاٹھی ہے، بائیں ہاتھ میں تھیلی لٹکی ہوئی ہے۔ بوڑھے باپ نے اپنے دوست سے پوچھا یہ کیا، اس ہیئت سے کیوں آئے ہو؟ بوڑھے دوست نے جواب دیا اس غیر مناسب وقت میں آئے ہو میں گھبرا گیا کہ میرے دوست پر کوئی مشکل پیش آئی ہے یا تو خدانخواستہ کچھ فاقہ ہو گیا ہے تو یہ کھانا سر پر رکھا ہوا ہے پہنچا دوں گا اور یا کسی دُشمن سے جھگڑا ہو گیا ہے یار تو ہو گئے ہیں ہم بوڑھے مگر ایسی بھی کیا دوستی، دو ایک لاٹھی تو ہم بھی مار دیں گے یہ لاٹھی اس لئے لایا ہوں اور یا کوئی عزت یا ذلّت کی بات پیش آئی کہ کسی کا قرضہ ہو گیا ہے تو یہ تھیلی روپوں کی حاضر ہے۔ میرے خیال میں یہ احتمال آیا،

اس لئے اس طرف آیا ہوں۔ بڈھے باپ نے کہا ارے میاں! خدائے تعالیٰ کا شکر ہے نہ فاقہ ہے نہ کہیں لڑائی ہے نہ کسی کا قرضہ ہے۔ سب اللہ تعالیٰ کا شکر ہے آپ کی محبت کا شکریہ، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائیں۔

اپنے بیٹے کو کچھ دکھانا تھا کہ آج کل دوستی اور پرانے زمانے کی دوستی میں کیا امتیاز ہے؟ سلام ومصافحہ کر کے واپس آ گیا۔

واقعہ سُنایا جا رہا تھا کہ شیخ نے کہا: ''جہاں تمہارا پسینہ گرا ہے میں اپنا خون گراؤں گا''۔

ترکیبِ مادّی جسمانی میں غیر مادی مجرّد جعل مجعول کے درمیان جو جعلِ معنوی ہے اس مجعولیت کے حالات بتائے جا رہے ہیں کہ حرکت میں سکون کہ محرک بھی موجود، تحریک بھی موجود لیکن ''سکون'' کہ ہاتھ پاؤں ہلتے ہی نہیں زبان ہلتی ہی نہیں، دل اور روح اپنی جگہ جو کہ مجرّدات میں سے ہیں انھیں بھی سکون ہے اور مجعولیتِ معنوی میں سکون ہے تو اثرِ مادی میں بھی سکون ہے کہ نہ اشتعال ہے نہ شعلہ ہے بلکہ سکون ہے دل وروح میں وقار ہے وقر سے توقیر ہے اور توقیر کا اثر تسکین ہے جب یہ مجعولیتِ باطنی حاصل ہوتی ہے تو جسم میں بھی جسم کے حالات میں بھی بجائے اشتعال کے سکون آ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صدق وسچائی کے ساتھ حقیقت شناسی کے لئے حقائق کی معرفت کی طلب کی توفیقِ ارزانی سے نوازے۔ آمین۔

☆

تیسوی مجلس

حقیقتِ مجاہدہ وہجرت

۱۶ ارمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق ۲ اپریل ۱۹۹۱ء بروز سہ شنبہ بوقت صبح
مقام جلال آباد ضلع مظفر نگر

جلوت وخلوت کے احساسات :

جلوت کے احساسات کچھ اور ہوتے ہیں اور خلوت کے احساسات کچھ اور ہوتے ہیں۔ اگر یہ بشر، بشر ہو کر توفیقِ الٰہی سے بے شر ہو گیا تو اس کے احساسات اور ہیں اور اگر یہ بشر با شر ہو گیا تو اس کے احساسات کچھ اور ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی فرمایا: انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ۔

بشر کا بے شر ہونا کمال ہے :

تو ملائکہ کا بے شر ہونا کوئی ایسی کمال کی بات نہیں۔ کمال کی بات بشر ہو کر بے شر ہونا ہے جو کہ وہ اس بشر میں وجودِ حیوانی کے ساتھ باامتیازِ عقلِ مستقیم وفہمِ سلیم رکھا ہے۔

انسان اور جانور احساساتِ حیوانی میں شریک ہیں :

ورنہ پھر اس بشرِ حیوانی میں اور غیر بشرِ حیوانی میں جس کو جانور کہتے ہیں کیا فرق ہے جو احساسات حیوانِ مطلق (جانور) میں رکھے ہوئے ہیں اس حیوانِ بشر میں بھی رکھے ہوئے ہیں۔ کھانے کا احساس، پینے کا احساس، سونے کا احساس، رنج کا احساس، خوشی کا احساس مختلف چیزوں کی طرف مختلف میلانات کا احساس، قوّتِ غضبیہ کا احساس، قوّتِ شہوانیہ کا احساس، نر و مادہ ہونے کا احساس، اولادیّت کا احساس، پھر اولادیّت کے ساتھ طبعی حیوانی کا احساس، محبت کا احساس، جُدائی کا احساس، اسی طرح سوچتے چلے جاؤ۔

جیسے حیوانِ مطلق میں یہ احساسات ہیں کیا حیوانِ ناطق میں نہیں ہیں؟ وہاں حیوانِ مطلق ہے یہاں حیوانِ ناطق ہے۔

اِنسان اور حیوان میں وجہ امتیاز عقلِ مستقیم ہے :

اگر کوئی شخص پوچھے: مَا الاِنسَان (انسان کی حقیقت کیا ہے) تو اس سوال کے جواب میں جو پوری حقیقت وہیئتِ کاملہ پوری ہے، حیوانِ ناطق کہا جائے گا اب اس میں امتیاز حیوانِ مطلق کے مقابلہ میں آگیا کہ جو احساسات حیوانِ مطلق کے تھے وہ اس میں ہیں مگر زیادتِ الفاظ پر دلالت کرتے ہیں زیادتِ معانی پر نہیں۔ وہاں حیوان مطلقاً ہے اور یہ حیوان مقیّد بقید ہے۔ لہٰذا احساس بھی مقیّد بقیدِ امتیاز ہوں گے کہ جو احساسات اس حیوانِ مطلق میں ہیں وہ سارے احساسات اس حیوانِ ناطق بمعنی بشر میں ہیں لیکن اُن احساسات اور ان احساسات میں امتیاز لازمی ہے۔

وساوِس پر پریشانی حیوانیت کا اثر ہے :

سُنا ہے تجربہ کاروں سے کہ گھوڑا اپنے سایہ سے بھی بدکتا ہے تو ایسے ہی
انسان بھی اپنے متخیلاتِ غیر اختیاریہ، اوہامِ غیرِ اختیاریہ اور وساوسِ غیرِ اختیاریہ سے
بدکنے لگے تو حیوان ہے، جو چیزیں اپنے اختیار سے بالکل باہر ہیں ان باہر کی چیزوں
سے جن کا نام وساوس واوہام وتخیلات ہے (انسان بھی) بدکنے لگے پریشان ہونے
لگے تو اس بشرِ حیوانِ ناطق میں اور حیوانِ مطلق میں کیا فرق ہے؟ سُننے اور سمجھنے کے بعد
بھی، پھر بے سمجھی، علمِ امتیازی کے بعد سمجھنا کہ ناطق ہے پھر بھی وساوس، خیالات، اوہام
خطرات کا ابتلاء، تو اس حیوانِ ناطق نے کیا سُنا اور کیا سمجھا؟ جب وہیں کا وہیں رہا
مثلاً بھینس کا بچہ جو ماں کے پاس بندھا ہوا تھا جس نے پال رکھا ہے وہ وہاں سے کھول
کر پانی پلانے کے لئے نل کے پاس لایا گیا، ماں سے جُدا ہو گیا اب بھینس چیخ رہی
ہے احساس اس کو جُدائی کا ہوا اسی طرح آدمی بھی ایسی جُدائی پر چیخنے لگے تو پھر اس
بھینس اور انسان میں کیا امتیاز ہوا، یہ ناطقیت سے تفریط نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ اس
حیوانِ ناطق کے کچھ حدود ہیں حیوانِ مطلق کے احساسات حدود سے باہر ہیں، حدود
سے خارج ہیں!

یہ علمِ امتیازی ساری عمر کا علاج ہے جو وساوس دوڑتے رہتے ہیں اوہام چلتے
رہتے ہیں خیالات اُبلتے رہتے ہیں۔ خطرات میں ڈالنے والے آتے رہتے ہیں یہ اُن
کی ساری عُمر کا علاج ہے تو کیا اب بھی اوہام، خیالات و وساوس اور خطرات کے ساتھ
خلط ہونا چاہیے، یہ بات بتوفیقِ الٰہی متعدد بار عرض کی جاچکی ہے اور جب کہ یہ بھی
معلوم ہے کہ یہ چیزیں جو اُمورِ غیر اختیاریہ سے متعلق ہیں وہ بھی ایک قسم کی مخلوق ہیں تو

اس بشرِ مخلوق کو جو حیوانِ ناطق ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ الست بربکم قالو بلیٰ میں ہوا ہے تو پھر اس کو تعلق مع الخالق ہونا چاہیے، علاقہ اُس خالق کے ساتھ ہونا چاہیے۔ تو معلوم ہوا کہ بالخصوص ایسی مخلوق جو اپنے اُمورِ اختیاریہ سے باہر ہے اس سے انقطاع اور اس خالق کے ساتھ تعلقِ قطعی ضروری ہے، وہاں انقطاع ہے اور یہاں تعلق قطعیت کے ساتھ ہے۔

وساوِس کا علاج کلیّۃً بے اِلتفاتی ہے :

کیا پھر بھی وساوس وخیالات کی طرف اور خطرات کی طرف سے جو خطرہ ہے سلوک کے لئے التفات ہرگز نہیں ہونا چاہئے، بس علاج ہوگیا کلیّۃً یکسوئی آگئی، اور اگر نہیں ہوا تو جیسے کہ پہلے ان چیزوں سے سوئیاں چبھ رہی تھیں اب بھی سوئیاں چُبھتی رہیں گی۔

وساوسِ باطنی سوئیاں ہیں :

جیسے پہلے ان اوہام میں سوئیاں چُبھتی رہیں اب بھی سوئیاں چبھتی رہیں گی تو یکسوئی کہاں ہے پھر ایک تو سوئی کا چُبھنا کسی دوسرے کی طرف سے ہو اور ایک خود اپنے اندر سوئی چُبھوانا کہ اِن وساوِس کی سوئیوں کو التفات کر کے خود اپنے اندر چبھوانا کہ اِن وساوس کی سوئیوں کو التفات کر کے خود اپنے اندر چبھا رہا ہے تو یہ حیوانِ ناطق ہوا یا حیوانِ مطلق کہ خود سوئی اپنے اندر چبھوا رہا ہے، خدا کرے کہ ہماری سمجھ میں آجائے۔

پریشانی کا سبب خود رائی ہے :

سالک خود سوئی چبھوا رہا ہے اس لئے کہ اس میں ابھی خود رائی ہے، اعتقاد

اپنے پر ہونہ کہ مصلح پر۔

خودرائی شرک فی الطریق ہے :

اور یہ خودرائی خودی ہے بلکہ ایسی خودرائی گویا خدائی ہے اور خدائی شرک ہے لٰہذا خودرائی، خودی میں مبتلاء ہونا شرک ہے ترتیب مقدمات سے نتیجہ نکال لیجئے ابھی ہم شرک کو بھی نہیں سمجھے، یہ بھی گویا کہ شرک ہے سالک میں۔ تو ایسی چیزیں جو متعلق بأمورِ غیر اختیاریہ ہیں ان سب سے یکسو ہو جاؤ جس کو انقطاع اور جمعیّتِ خاطر کہتے ہیں تو تمام خطرات سے خالی الخاطر ہو کر رہے خاطر جس کے معنی دل ہیں اس دل کی جمعیّت ذاتِ حق کے ساتھ رہے جس نے اُمورِ غیر اختیاریہ کو ہر طرف سے اُٹھالیا ہے یعنی اس پر مواخذہ نہ ہوگا، تو آدھا سلوک تو طے ہوگیا۔ اب آدھا سلوک باقی رہ گیا کہ جن تھوڑے سے اُمورِ غیر اختیاریہ کا مکلّف تھا تو وہ رہ گئے وہ احساسات جو حیوانی قسم کے تھے وہ سب ختم ہو گئے خطرات سے نکل گیا اور جو اُمورِ غیر اختیاریہ ہیں وہ خطرہ سے صاف ہیں ان میں جو مأمور بہا ہیں اُن کو بجالائے اور جو منہی عنہا ہیں اُن سے اجتناب کرے تو بامتثالِ مأمور بہا اور اجتنابِ منہی عنہا یہ بشر باشر بے شر ہو گیا۔

یہ ہے امتیازِ بشر اور ملائکہ کے درمیان کہ باشر ہو کر بے شر ہو گیا اور یہی ہے اس بشر کا کمال۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی تو یہی فرمایا ہے: اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ لیکن اس کے ساتھ قید لگادی، یُوحٰی اِلَیَّ ہاں میرا ایک امتیاز ہے اور وہ یہ کہ مجھ پر وحی آجاتی ہے جو کہ علمِ حقیقی ہے بشر ہونے کی حیثیت سے تو جیسے آپ لوگ بشر ہیں میں بھی ایک بشر ہوں ''انّما'' حصر کے لئے آتا ہے میں بشر ہی تو ہوں اور آپ ﷺ سے کوئی بشر کی نفی کرے تو قطعیّت کا انکار ہو گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالمِ اَجسام میں بشر اور اِبتدائے خلق میں نور ہیں:

یہ الگ بات ہے کہ اس عالمِ اجسام جس کو دُنیا کہتے ہیں آپ اپنے کو بایں جسمِ بشر فرما رہے ہیں لیکن ابتدائے خلق میں آپ ﷺ کیا تھے اس کو آپ ﷺ نے ایک دوسری حدیث میں بیان فرمایا کہ اوّلِ خلق میں اُس خالق کی طرف سے میں ''نور'' تھا سیَر کی روایت بالمعنی ہے۔ اوّل ما خلق اللّٰہ نوری پھر وہ نور تقسیم ہوا، حضرت والا نے بھی نشر الطیب میں رسول پاک ﷺ کے لئے نور کا لفظ استعمال کیا ہے، تو کیا ہماری طرف سے انکارِ نور ہوا............؟ نہیں بلکہ اقرارِ نور رہا باعتقادِ صحیح، پھر اُس نور کا نام نورِ ذاتِ باری تعالیٰ نے اس عالم میں ''بلباس جسم'' بشر رکھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بشر ہونے کی نقلی و عقلی دلیل:

وہ جو اوّلِ خلق میں نور تھا جب اس جسم میں بجسمِ بشر ظاہر ہوا تو انہوں نے خود فرمایا: اِنَّمَا اَنَا بَشَر میں تو بشر ہی ہوں۔ ہم آپ ﷺ ہی کے فرمانے پر آپ ﷺ کو بشر کہہ رہے ہیں کیا اس سے نور کا انکار ہوا؟ ہرگز نہیں۔ یہ ہے حقیقی ایمان کہ آپ ﷺ نور بھی ہیں اور بشر بھی، کیونکہ بشر میں جو احساسات ہوتے ہیں حیوانی اطلاق سے الگ ہو کر تو کیا حضور ﷺ میں وہ احساسات نہیں تھے؟ بھوک کا احساس نہیں تھا، مرض کا احساس نہیں تھا صحت کا احساس نہیں تھا، رنج کا احساس نہیں تھا، میلانی احساس نہیں تھا کیا اولاد نہیں تھی؟ یہ تمام احساسات تھے تو یہ احساسات جسم کے ساتھ ہیں ملائکہ میں یہ احساسات نہیں ہیں اس لئے کہ ملائکہ کے لئے ایسا جسم نہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کو جسم دیا گیا تو یہ احساسات بھی دئے گئے جو خاصۂ بشر ہیں اور امتیازی ہیں۔

رنج وتکلیف کا احساس بھی بحدِّ شرع سُنّت ہے :

یہ احساسات بھی مشابہ احساساتِ رسولِ پاک ﷺ ہیں یہ احساسات بھی مشابہ یَاأَیُّهَا الْمُدَّثِّرُo قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْo وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْo کے ہیں۔ تو سالک کو یہ احساسات بھی باُسوۂ حسنۂ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں اور جب کوئی کام باُسوۂ رسول اللہ ﷺ ہوگا تو عبادت ہوگی، تو یہ احساسات بھی عبادت ہو گئے اور ہر عبادت پر ذاتِ باری تعالیٰ کی رضاء ہوتی ہے تو ایسے احساسات پر بھی ذاتِ باری تعالیٰ کی رضاء۔ ہے اور اس لئے بھی کہ یہ احساسات خلاف طبع بمشابہ اُسوۂ حسنہ متعلق بالصّبر ہیں اور جو متعلق بالصّبر ہیں اس کے موصوف کو اللہ تعالیٰ کیساتھ معیّتِ حال ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ اس صابر سے خوش ہیں ''یہ رَاضِیَةً بھی ہے مَرضِیَّةً بھی ہے''۔

بشر وہ ہے جو باسوۂ رسول اللہ ﷺ اور باسوۂ ذاتِ باری تعالیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا نام بھی صَبُور ہے، صبر وضبط سے کام لے۔ ایسا بشر حیوانیّت سے جس کی تعبیر نفسانیّت کیساتھ ہے اس سے نکل گیا اس میں روحانیت آ گئی وہ خلافِ طبع پر کیا قدم بڑھائے گا، یہ بشر ہے صحیح معنی میں۔

شَر کی بات پیش آنے پر حضور ﷺ کی دُعا :

اگر کبھی شر کی بات خلاف طبع پر آ جائے تو یوں کہہ دے جیسے حضور ﷺ نے فرمایا تھا : إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ فَأَيُّمَا مُؤْمِنٍ اٰذَيْتُهٗ أَوْ شَتَمْتُهٗ أَوْ جَلَدْتُّهٗ أَوْ لَعَنْتُهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ صَلٰوةً وَّ زَكٰوةً وَّ قُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ إِلَيْكَ۔ (مناجاتِ مقبول۔ ص ۴۲)

کہ میں بھی ایک بشر ہوں، ہوسکتا ہے خلافِ طبع پر کوئی شر کی بات پیش آ جائے تو اس شر کو مبدل بخیر فرما دینا اس شر کو اس کے لئے صَلٰوۃ (رحمت) بنا دینا

اور پاکی بنادینا اور ذریعہ قُرب بنادینا کہ اِس سے اُس کو تقرب حاصل ہو جائے، اس پر آپ کی طرف سے رحمت نازل ہو جائے۔ حضور ﷺ فرمارہے ہیں کہ بشر میں خلافِ طبع پر اثر آسکتا ہے لیکن وہ اثر اس درجہ مغلوب ہو کہ بشر میں خلافِ طبع بات پر شر کی طرف اِقدام نہ ہو بلکہ شر کو مبدل بخیر کردے، اب چاہے وہ خلافِ طبع بات بیوی کی طرف سے پیش آجائے جو آتی رہتی ہے اولاد کی طرف سے پیش آجائے۔ نوکر کی طرف سے پیش آجائے وغیرہ وغیرہ تو اے اللہ مجھ بشر کو بھی اسی طرح رکھنا جس طرح حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں بھی بتقاضائے بشر کچھ کہہ دوں تو اس کے لئے وہ نافع بن جائے یعنی مبدل بخیر ہو جائے اور جب اپنوں کی طرف سے خلافِ طبع پیش آنے پر یہ دعاء ہے تو جو اپنائیت نہیں رکھتے، غیر ہیں ان کی طرف سے کوئی خلافِ طبع بات پیش آجائے تو بطریقِ اُولیٰ یہ دعاء ہے کہ نفس ہماری سواری ہے اس پر قابو ہو۔

جہادِ اکبر جہاد بالنفس ہے:

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ جہادِ کفار سے لوٹے تو آپ ﷺ نے حوصلہ افزائی فرمائی اور ہماری طرف متوجہ ہو کر انتقالِ ذہنی کے لئے فرمایا کہ ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

اب یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب جہادِ کفار جہادِ اصغر ہے تو جہادِ اکبر کیا ہے؟ تو اس کا جواب رسول اللہ ﷺ نے دوسری حدیث میں ارشاد ہے فرمایا: آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ۔ حضور ﷺ جہادِ نفسی فرمارہے ہیں جسکا ترجمہ یہ ہے کہ حقیقی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے یعنی جس نفس میں خیر کے مقابل شر رکھا ہوا ہے اس کو زیر کرنے کے لئے اس پر قابو پانے کے لئے پورا ماتحت بنانے

کے لئے اس کا پورا مقابلہ کر رہا ہے، یہ ہے جہادِ اکبر۔

ہجرتِ حقیقی منہیات کو چھوڑنا ہے :

ظاہر میں تو ہجرت اسے سمجھا جاتا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر اللہ کے لئے ترکِ وطن کیا جائے جیسا کہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی گئی تھی۔ ظاہری ہجرت تو یہی ہے اور صحابہؓ اس ہجرت کے ساتھ موصوف بھی تھے کہ اُنھوں نے مکہ معظمہ میں اپنا تمام مال گھر بار چھوڑ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تھی مگر اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَاجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ حقیقی مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے۔

ہجرت صورۃً وحقیقتاً :

ایک ہجرت صورۃً ہے اور ایک حقیقتاً اگر حقیقتِ ہجرت کسی میں نہیں تو وہ صورۃً بھی ہجرت نہیں کرسکتا۔ تیرہ سالہ مکی زندگی میں نفس کی مخالفت کرتے کرتے صحابہؓ سے شر کی چیزیں نکل گئیں تھیں نفس کی بیماریوں کو چھوڑتے رہنے میں حقیقتاً مجاہدہ بھی کرتے رہے اور مہاجر بھی بنتے رہے۔ تو اب یہ صوری ہجرت اس معنوی ہجرت پر متفرع ہوگئی۔ تو پہلے صحابہؓ مہاجر اور مجاہد معنوی طور پر بنے تب ہجرت و جہادِ صوری ظہور میں آیا۔

نفس کی مثال مرعوب اژدھے جیسی ہے :

مولانا رومؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے؛ فرمایا ایک سپیرا تھا ''سانپوں کے تماشے والا'' وہ بڑا صاحبِ فن تھا سانپوں کے رہنے کی جگہ چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک

سانپ بڑا لمبا چوڑا جسکو اَجدھا کہتے ہیں مرا ہوا پڑا ہے اس نے اُٹھالیا اور جھولی میں ڈال لیا بڑا خوش ہوا، بستی میں آیا جھولی سے اَجدھا نکال کر زمین پر ڈال دیا لوگ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے کہ ایسا سانپ تو کبھی نہیں دیکھا، اَجدھا لمبا چوڑا موٹا زمین پر پڑا ہوا ہے سپیرا بین بجا رہا ہے لوگ بھی بے فکر تماشہ دیکھ رہے ہیں، مخلوق جمع ہو گئی۔ سورج نکل کر اپنی توانائی پر آکر میدان میں پھیل گیا اس اَجدھا پر بھی دھوپ پڑنے لگی جو اَجدھا مرا ہوا معلوم ہو رہا تھا دھوپ کی تمازت سے وہ حرکت کرنے لگا کیونکہ وہ سردی سے مرا سا ہو گیا تھا، دھوپ کی تمازت اس کے لئے محرک بنی اس لئے اس میں حرکت آگئی اب جوں جوں حرکت آتی گئی لوگ خوفزدہ ہونے لگے اس نے دیکھا کہ چاروں طرف میرے دُشمن مجھے گرفتار کرنے کے لئے کھڑے ہیں بس اَجدھا ایک حرکت سے کھڑا ہوا اور جھومنے لگا۔ یہ حال دیکھ کر تمام مخلوق بھاگی، یہ صاحب فن بھی گھبرا گیا کہ جھولی اُٹھانا مشکل پڑ گئی یہ بھی بھاگا اور مخلوق ایک دوسرے پر گرتی پڑتی منتشر ہو گئی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ مولانا روم نے اس حکایت کو بیان کر کے فرمایا کہ نفس کی مثال اَجدھا کی طرح ہے وہ معدوم اور مُردہ نہیں ہے دباؤ میں آگیا ہے مرعُوب ہو گیا ہے مغلوب ہو گیا ہے کیونکہ اِس کی فطرت شر کی ہے داؤ لگائے ہوئے ہے جب کبھی غافل دیکھے گا فوراً ڈنک مارنے کی کوشش کرے گا۔

سالک کو ہمیشہ فکرمند رہنا چاہئے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا۔ اِصْبِرُوْا اور صَابِرُوْا کے بعد رَابِطُوْا فرمایا کہ اے مجاہدین! اگر جہاد کا موقع نہیں رہا تو دیکھو اپنی سرحد کی حفاظت کو مت بھولنا اس کو چاروں طرف سے

مضبوط رکھنا کہ فوج سے سرحد خالی نہ رہے نہ معلوم تمہاری اس غفلت کو دیکھ کر دشمن سرحد کے کس کنارے سے اندر پہنچنے کی کوشش کرے۔ لہٰذا اے مہاجرینِ حقیقی ہجرتِ نفس اور اے مجاہدینِ حقیقی بجہادِ نفس تم بھی مرابطہ یعنی اپنی سرحد کو قوی رکھنا بے فکر مت ہونا ہجرت اور مجاہدہ سے نفس، دشمنِ سرّی اگر مبدل بخیر ہو جائے تو بھی اس کے شر سے مأمون مت ہونا ہمیشہ بافکر رہنا گو اس درجہ کی فکر نہیں جیسی ہجرت اور مجاہدہ سے پہلے تھی کیونکہ فضلِ الٰہی سے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ کی رو سے تم حوصلہ اور ہمت کی وجہ سے اس کا سَر دبا دو گے۔

نفس کو سرزنش کرنے کا واقعہ:

حضرت شبلیؒ حضرت جنید بغدادیؒ کے مُرید و خلیفہ جن کا نفس مغلوب و مرعوب ہو گیا تھا دب گیا تھا ایک مرتبہ سر اُٹھانے لگا کہ میں تو حلوہ کھاؤں گا۔ نفس اپنے داؤ پر ہے میٹھے کا تقاضا کیا۔ حضرت شبلی نے یہ نہیں کہا کہ حلوہ کھلاؤ، نفس سے کہا ارے کہاں سے حلوہ کھلاؤں۔ مؤمن کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے تو سالِک اپنے آپ کو ذلیل کرے یہ کہاں دُرست ہے؟ سوال کرے تو ذلت ہے قرض مانگے تو ذلت ہے۔ اِن سب سے ہٹ کر جسمانی محنت سے حاصل کرے یہ عزت ہے۔

الغرض حضرت شبلی کے نفس نے پھر تقاضا کیا اُنھوں نے سوچا او ہو! یہ تو سَر اُٹھانے لگا مجھ پر قابض نہ ہو جائے، اس کو سزا دینی چاہئے۔ تھے بیچارے سفر میں دیکھا کہ ایک کاشتکار کا ہرٹ چل رہا ہے اس میں اُونٹ جتا ہوا ہے۔ حضرت شبلی نے کاشتکار سے کہا ارے بھائی! یہ اُونٹ بیچارہ تھک گیا ہوگا مجھے رحم سا آرہا ہے لہٰذا اس اُونٹ کو تم کھول دو اور اس کی جگہ مجھے لگا دو۔

اب سے غروبِ آفتاب تک کی مزدوری مجھے دے دینا یہ بیچارہ آرام کر لے گا، مالک نے اُونٹ کھول دیا اور یہ لگ گئے۔ پہلے لوگ ایسے ہی قوی تھے جب غروبِ آفتاب ہوا تو کاشتکار نے ان کو چھوڑ دیا اور پیسے دیدئے۔ پیسے لے کر بستی میں گئے اور وہاں جا کر حلوہ خریدہ، حلوہ لے کر بستی سے باہر کنارہ پر پوشیدہ جگہ پر گئے کہ کھانا پینا کسی کے سامنے مناسب نہیں۔ راستہ میں کھاتا ہوا نہیں جانا چاہئے کیونکہ یہ انسان ہے جانور نہیں راستہ میں کھانا پینا جانور کا کام ہے الغرض حضرت شبلی کسی کونہ میں گئے اور نفس صاحب کے سامنے حلوہ رکھ کر کہنے لگے لو میری جان حلوہ آ گیا حلوہ کھالو۔

تو نفس نے کہا! حضور مجھ سے غلطی ہوگئی میں سمجھا تھا کہ مجاہدہ کو کافی عرصہ ہو گیا کچھ غفلت سی آگئی ہوگی۔ اس لئے میں اُچھل پڑا اپنا داوٗ چلایا مگر آپ تو بڑے بیدار ہیں بے فکر نہیں نکلے، میری چال اور چالاکی کو معاف کریں۔ اب تو میں نے کچھ عرض کر دیا، کر دیا میں ہاتھ جوڑتا ہوں آئندہ پھر اپنی عرضداشت پیش نہیں کروں گا۔ اس دُشمنِ نفس سے مجاہدہ اور جہاد کے بعد بیداری.................ضروری ہے، تو جو نفس کے مقابل شر اور اس کے مبدل بخیر ہونے کے لئے کھڑا ہے وہ مہاجر ہے، مجاہد ہے؛۔

☆

اکتیسویں مجلس

مجلسِ شیخ سے تعجیل اِستفادہ کا طریقہ

۱۷ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق ۳ اپریل ۱۹۹۱ء بروز چہارشنبہ بوقت صبح
مقام جلال آباد مظفر نگر

وضوء طہارت کی ضیافت ہے:

طالبِ علم کو ہر وقت باوضوء رہنا چاہیے جو طالبِ علم باوضوء رہتا ہے وہ طہارت کی ضیافت کر رہا ہے اور ضیف مہمان کی جتنی اچھی ضیافت ہو وہ اتنا ہی خوش ہوتا ہے تو وضوء بھی خوش اور وضوء کرنے والا بھی خوش۔

رسول اللہ ﷺ کا استحضارِ موت:

ایک مرتبہ حضور رسولِ پاک ﷺ فراغ البول کے بعد تیمم فرمانے لگے۔ بعض صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ یہاں قریب ہی سامنے پانی ہے وہاں وضوء ہو جائے گا اللہ اکبر آپ ﷺ نے کیا فرمایا کہ وہاں تک نہ پہنچوں اور روح بلا طہارت نکل جائے۔ رسول اللہ ﷺ طہارت کا کس قدر اہتمام فرما رہے ہیں پانی پر پہنچنے سے پہلے ہی تیمم فرما

رہے ہیں حالانکہ نبی و رسول کی روح بلا اجازت نہیں نکالی جاسکتی، فرشتہ آکر پہلے اجازت لیتا ہے کہ حضور! اللہ نے بھیجا ہے اگر اجازت ہو تو روح نکال لوں؟ مگر اس کے باوجود آپ ﷺ فرمارہے ہیں کہ کیا عجب ہے کہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی روح نکل جائے۔ یہ ہے عمل کا اہتمام اور شریعت کی پاسداری حالانکہ آپ ﷺ کی ہر چیز باوضو ضیائی روشنی سے پُر اور نور علیٰ نور ہے۔ چنانچہ آپ دعاء فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوراً وَ فِیْ بَصَرِیْ نُورًا وَفِیْ سَمْعِیْ نُورًا وَجْعَلْ فِیْ عَصْبِیْ نُورًا وَ فِیْ لَحمِیْ نُورًا وَ فِیْ دَمِیْ نُورًا وَ فِیْ شَعرِیْ نُورًا وَ فِیْ بَشَرِیْ نُورًا وَ فِیْ لِسَانِیْ نُورًا۔ (مُناجاتِ مقبول۔ ص۔۲۷)

اے اللہ! میرے دل میں نور فرمادیجئے اور میری آنکھ میں نور فرمادیجئے اور میرے کان میں نور فرمادیجئے اور میرے پٹھے میں نور فرمادیجئے اور میرے گوشت میں نور فرمادیجئے اور خون میں نور فرمادیجئے، میرے بال میں نور فرمادیجئے میری کھا میں نور فرمادیجئے اور میری زُبان میں نور فرمادیجئے۔

لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ باطہارت رہا کرتے تھے تو کوئی وجہ ہے کہ آپ ﷺ باوضوء رہتے تھے۔

ایک طالبعلمانہ شُبہ اور اس کا جواب :

یہاں ایک طالبعلمانہ شُبہ ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ نور ہیں تو پھر اپنے اعضاً میں نور ہونے کی دعاء کیوں فرماتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ طلب زیادت کے لئے فرماتے تھے تاکہ دعاء سے نور میں اور زیادتی ہو۔

فضائل بِلا عِلم وعَمل حاصل نہیں ہوتے :

فضائل تو پڑھ لئے مگر کیا فضیلت بِلا عِلم مسائل اور عَمل حاصل ہو جائے گی؟ فضیلت حاصل ہونے کے لئے عِلم مسائل اور عمل ضروری ہے۔ایک صاحب ملنے کے لئے آئے تو انکے متعلق معلوم ہوا کہ آج ان کا روزہ ہے،عید کا دن اور روزہ۔اِس کا سبب پوچھا تو کہا کہ روزہ رکھنے کی بڑی فضیلت ہے۔اُن سے کہا گیا کہ عید کے دن روزہ حرام ہے یہ سُن کران کی آنکھ کُھل گئی اور پھر پانی منگواکر پہلے خوداُن کے سامنے پانی پیا گیا اور پھر اُن کو پلایا گیا،اس طرح روزہ ختم ہوا۔تو بِلا مسائل جانے فضیلت حاصل کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ حرام کا ارتکاب کر بیٹھے۔اس لئے فضائل کے ساتھ مسائل کا جاننا ضروری ہے تا کہ عِلمِ مسائل سے عَمل صحیح ہو اور عملِ صحیح سے فضیلت حاصل ہو۔

مِشکوٰۃ شریف سے پہلے ھِدایَہ، شَرحِ وِقَایَہ، کنز وغیرہ میں عباداتی اور معاملاتی مسائل آتے ہیں۔لیکن جب مِشکوٰۃ شَریف ہاتھ میں آئی تو فضائل کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔تو اِن فضائل کو حاصل کرنے کے لئے اعمال کی ضرورت ہے اگر عمل کی فضیلت پڑھ لینے کے باوجود بھی عمل کا جزبہ پیدا نہیں ہوا تو عِلم برائے معلومات ہے۔عِلمِ حقیقی وہ ہے جو مقارِن بالعمل ہو یہی معنی ہیں عِلم کے نافع ہونے کے کہ وہ مقارِن بالعمل ہے اصل تو بتقاضائے ایمان یہ ہے کہ مؤمن باوضوء رہے۔

مُراقبہ، مشاہدہ، معائنہ کی حقیقت :

شیخ کا ادب یہ ہے کہ اس کے چہرہ پر بلا وضوء نظر نہ پڑے تو مشاہدۂ ربّ میں بِلا وضوء نظر کیسی؟ بمراقبہ، مشاہدہ کالمعائنہ ہو جاتا ہے۔ مِشکوٰۃ شَریف میں یعنی سوال

جبرائیلؑ میں ہے: مَا الاِحسَان، احسان کیا ہے جواب دیا گیا: اَنْ تَعبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ اس طرح اللہ کی عبادت کر گویا تو دیکھ رہا ہے یہ کالمعائنہ ہے۔ اور اگر ابھی ایسا نہیں فَاِن لَمْ تَکُن تَرَاہُ تو فَاِنَّہٗ یَرَاکَ تو ضرور ہے یعنی یقیناً وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے، یہ مُراقبہ ہے، مُراقبہ کرتے کرتے مشاہدہ ہو جاتا ہے اور مشاہدہ ترقی کر کے معائنہ بن جاتا ہے۔

تو مُراقبہ بمشاہدہ معائنہ بن جاتا ہے اور معائنہ عین سے ہے گویا کہ عین (آنکھ) سے دیکھ رہا ہے پھر بلا وضوء کیسے رہے؟

نیز قرآن پاک میں ہے: وَاللّٰہُ یَعلَمُ مُتَقَلَّبَکُمْ وَ مَثوٰکُمْ اللہ تعالیٰ تمہارے باہر چلنے پھرنے اور گھر میں رہنے سہنے کو جانتا ہے۔ جب اللہ ہمارے چلنے پھرنے اور گھر میں رہنے سہنے کو دیکھ رہے ہیں تو یہ چلنا پھرنا عبادت ہونا چاہئے اور عبادت بلا وضوء کیسی؟ لہٰذا جب گھر میں رہو یا گھر سے باہر نکلو تو باوضوء رہو۔

سفر کرنے سے پہلے نوافلِ سفر پڑھ لینا چاہئے:

اور اگر لمبا سفر ہو تو دو رکعت نفل پڑھ کر نکلو، کیا خبر ہے باہر جا کر لوٹ کر بھی آؤ گے یا نہیں بالخصوص آجکل کے دور میں کہ ریل، بس، ہوائی جہاز کے حوادث کثرت سے ہو رہے ہیں گھر والے بھی دعاء کر رہے ہیں کہ خیریت سے لوٹ کر آئے۔ تو جب انسان خطرات سے گھرا ہوا ہے تو باوضوء رہنا چاہیے رفتار بھی باوضو اور گفتار بھی باوضو۔

یاد دہانی کرتے رہنا شیخ کے فرائض سے ہے:

اَلدِّینُ النَّصِیحَہ کہ دین نام ہے نصیحت کا اور مبتدا خبر دونوں معرفہ ہیں

اور جب دونوں معرفہ ہوں تو ہر ایک کا دوسرے پر حمل صحیح ہوتا ہے تو دین ہوا نصیحت اور نصیحت ہوئی دین۔ اور حدیث کی رو سے نصیحت بھی دین ہے اور دین عبادت ہے تو نصیحت بھی عبادت ہے تو جہاں تک ہو سکے نصیحت جو لسانی عمل ہے وہ بھی باوضو ہو تو یاد دھانی نصیحت ہے یہ بھی ایک قسم کی ذمہ داری ہے۔

خیر خواہی پہلے اپنے لئے ہے :

نصیحت کے معنی فارسی زبان میں خیر خواہی، اُردو میں معنی کسی کے لئے خیر چاہنا جب کسی کے لئے خیر چاہنا دین ہے تو اپنی ذات کے لئے خیر کا نہ چاہنا یہ کیسے صحیح ہوگا؟ ارشادِ نبوی ہے۔ اِنَّ النَّفسَ عَلَیْکَ حَقاً کہ تمہارے نفس کے لئے تم پر حق ہے ۔ اپنے لئے خیر کا چاہنا پہلے ہے عباداتِ متعدیہ یعنی جن میں دوسروں کو نفع پہنچایا جائے کی اُس وقت اجازت ہے جبکہ اپنی عباداتِ ذاتیہ سے غفلت نہ ہو۔ اوّلاً ذاتی عبادت ہے تو پہلے اپنے کو نصیحت کرو پھر دوسروں کو، جب کوئی اپنے لئے خیر خواہ نہیں ہے تو بھلا دوسروں کے لئے کیا خیر خواہ ہوگا اگر ہوگا تو وقتی خیر خواہی ہوگی اور وہ بھی کسی مصلحتِ ذاتی کی وجہ سے ہوگی۔

سلوک میں اوّل مقام فنا ہے :

سلوک میں اوّل مقام فنا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت والا علاج کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ حضرت والا جہاں تشریف رکھتے تھے چاہے ریل کے ڈبے میں کیوں نہ ہو مجلس شروع ہو جاتی تھی۔ کچھ ساتھی ہمراہ ہوتے تھے۔ حضرت کے پاس آ کر بیٹھ جاتے تھے بس ملفوظات شروع ہو جاتے تھے اسی دستور کے موافق لکھنؤ میں بھی مجلس ہوتی تھی مولانا عبدالباری صاحبؒ فرنگی محلی لکھنوی جو بڑے عالم تھے فلسفی

تھے۔ان کے صاحبزادے بھی مجلس میں موجود تھے وہ بھی صاحب علم تھے۔حضرت والا ارشاد فرمارہے تھے کہ میرے ہاں سلوک کا اوّل قدم فنا ہے: انہوں نے کہا کہ ہم نے تو سُنا ہےاور لکھا ہوا بھی دیکھا ہے کہ آخری قدم فنا ہے۔فرمایاہاں! ٹھیک ہےلیکن میرے ہاں تو اوّل قدم فنا ہےاس پر بات ختم ہوگئی۔

احقر کہتا ہے کہ حضرت کا یہ ارشاد برحق ہے۔اوّل قدم تھا اور آگے بھی قدم ہوگا تو دونوں قدموں کے درمیان فنا ہی ہوگا۔ہاں اوّل فنا کے بعد کچھ موجود ہےلیکن یہ وجود، وجودِ باری تعالیٰ کے سامنے فنا ہے۔مثلاً جگنو، شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ کسی نے جگنو سے پوچھا تم دن میں نظر نہیں آتے اور جہاں رات ہوئی چمکنے لگتے ہو، دن میں کہاں رہتے ہو۔جگنو نے کہا ....

من روز وشب جز بہ صحرا نیم　　　ولے پیش خورشید پیدا نیم

جگنو نے کہا میں یہیں رہتا ہوں لیکن جب خورشید (سورج) تشریف لاتے ہیں تو میں غیر موجودہ ہوجاتا ہوں۔جگنو سے سبق لےلو، جگنو کہہ رہا ہے کہ یہیں رہتا ہوں لیکن سورج کے سامنے ناپید، فنا ہوجاتا ہوں۔جگنو کی سورج کے سامنے اپنے وجود پر نظر نہیں تو ''وجودِ ذاتِ وجوبی'' کے سامنے بمشاہدہ ومعائنہ سالک کا وجود کہاں ہے؟ سالک بھی باری تعالیٰ کے وجود کے سامنے معدوم ہوجاتا ہے۔کسی نے کہا ہے''وَحدَۃُ الوُجُود''اور کسی نے کہا''وَحدَۃُ الشُّھُود''معنی ایک ہیں وَحدَۃُ الوَجُود کے قائل شیخ ابنِ عربیؒ اور وَحدَۃُ الشُّھُود کے قائل مجدد الف ثانیؒ ہیں۔حقیقت اس کی یہ ہے کہ حقیقی وجود ذاتِ باری تعالیٰ ایک ہی ہے لیکن اس کے عطا کرنے سے ممکن کو بھی وجود عطا ہوگیا مگر اس عطا پر نظر اور اپنے کو موجود سمجھنا یہ خطا ہےاور باستحضارِ فنا عطا ہے۔

یہ سلوک کے باریک مسائل ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ باریک نہیں موٹے موٹے مسائل ہیں۔ باریک میں تو بار ہو جائے گا۔ جب یہ علم توفیقِ الٰہی سے بار بار حاصل ہو جائے گا کہ اپنے کو موجود سمجھنا خطا ہے باریک کا بار آ گیا بلکہ اپنے وجود پر نظر کا ہونا بار پڑ گیا۔ کم از کم وَحۡدَۃُ الۡوُجُوۡد کا اجمالی علم تو ہو جائے ہر قسم کی طبیعتوں کے طالبین صادقین ہوتے ہیں کیا عجب ہے کہ بعض ایسے بھی ہوں کہ ابھی ابھی ان میں فنائیت آ گئی ہو۔ حقیقتاً بقاء تو وہاں ہے جہاں پھر فنا نہ ہو اور جو دو فناؤں کے درمیان ہے وہ باقی کہاں ہے، وہ تو فانی ہے۔

سلوک جو کہ جزِ اعظم ہے شریعت کا بلا اس کے شریعت کامل نہیں۔ ایک نفسِ شریعت ہے اور ایک شریعتِ کاملہ ہے، تو شریعت کے کامل ہونے کی سعی کرنا ضروری ہے۔ جب سلوک میں آیا ہے تو مجاہد ہو گیا ہے مہاجر ہو گیا ہے تو پھر وہ شریعت کا جزِ اعظم ''سلوک'' کہاں چلا گیا جب ہجرت بھی ہو گئی اور بمساعی جہاد بھی ہو گیا پھر سہل الحصول کہاں رہا بلکہ حصول رہ گیا کہ شریعت کو حاصل کرتے رہو اور شریعت کا حاصل کرتے رہنا عبادت ہے تو سالک تو ہمہ وقت عبادت میں ہے اور عبادت بطہارت ہے، لہٰذا سالک کو ہمہ وقت بطہارت ہونا چاہیے کہ شیخ کے مبارک چہرہ پر بھی بلا ضو نظر نہ پڑے، فنافی الشیخ ہو گیا جب فنافی الشیخ ہو گیا تو پھر آگے فنا سے کون مانع ہے اَللّٰھُمَّ زِدۡ فَزِد پھر فنافی الرّسول ﷺ ہے اَللّٰھُمَّ زِدۡ فَزِدۡ پھر فنافی اللہ ہے جو اصل مقصود ہے۔ جب فنا ہی فنا ہے تو پھر بقا پر نظر کیسی؟ بلکہ اپنی نظر فنا کی ہو اور اللہ پر نظر بقا کی ہو۔

حضرت والا اور متقدمین کے کلام میں تطبیق :

حاصل یہ کہ حضرت والا نے جو فرمایا کہ ''میرے یہاں تو اوّل قدم فنا ہے''

اس سے فنا فی الشیخ مراد ہے اس کے ساتھ سلوک پر اقدام کرنے سے سلوک سہل ہو جائے گا طبیعت فنائیت کی بنتی چلی جائے گی تو شریعت کے سارے احکام طبیعت بن جائیں گے۔ جب شریعت طبیعت بن جائے تو باوضوء رہنا بھی طبیعت بن جائے گا۔ پھر بلا وضوء کہاں رہ سکے گا۔

اِزالۂ اخلاقِ رزیلہ کا علاجِ کُلّی :

اور جب ایسا ہے تو ایک ایک اخلاقِ رزیلہ ذمیمہ کا کہاں تک علاج کرتے رہو گے۔ جب فضلِ الٰہی سے اپنے حضرت شیخ مُرشد کی برکت سے فنائیت آ گئی تو اخلاقِ ذمیمہ ایک ساتھ نکل گئے۔ کیا پھر بھی تکبّر رہا کیا پھر بھی حسد، لمبے منصوبے، ریاء غضب کینہ ہے؟ فنائے حقیقی آئی تو اخلاقِ ذمیمہ کا بھی فنا ہو گیا۔ ایک ایک خلقِ ذمیم کا علاج کب تک کرتے رہو گے، اس کے لئے تو عمرِ حضر علیہ السلام بھی کافی نہیں۔ یہ سب یکلخت ویکمُشت چلے جائیں، کب تک کاپیوں میں لکھ لکھ کر علاج پوچھو گے۔

بہت سی چیزیں خیالی ہوتی ہیں بس خیال سے خالی ہو جاؤ تو اُن چیزوں سے خالی ہو گئے، کہاں حسد کہاں ریاء، کہاں تکبّر یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ تو خیالات سے یکسو ہو کر ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ .... ؎

یک چشم زدن غافل از ان شاہ نباشی
شاید کہ نگہ نکند و آگاہ نباشی

آنکھ جھپکنے کی مقدار بھی اس شاہ سے غافل مت ہو کہ شاید نگاہِ رحمت فرمائیں اور تو باخبر نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ اپنے واسطے دعاء فرما رہے ہیں جو درحقیقت ہمارے واسطے

سبق ہے کہ اَللّٰھُمَّ لَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ (اے اللہ مجھے آنکھ جھپکنے کی مقدار مجھے میرے نفس کے سپرد نہ فرما) یہ فنا ہی تو ہے۔

شیخ کی تسلّی طالبِ صادق کی تسلّی کا باعث ہے :

شیخ کی تسلّی طالبِ صادق کی تسلّی کا باعث ہے۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ جو حضرت شیخ مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ کے مُریداور خلیفہ ہیں، مولانا بڑے درجہ کے عالم، مورّخ، مصنّف ومؤلف اور بڑے صاحبِ فصاحت و بلاغت شخص ہیں اُن کو کوئی حال سلوک میں پیش آیا۔ اپنے شیخ کو لکھا شیخ نے جواب دے دیا۔ مولانا نے لکھا جواب سمجھ میں نہیں آیا، حضرت شیخ نے لکھا ''اپنا یہ حال تھانہ بھون مولانا تھانویؒ کے پاس لکھ بھیجو'' چنانچہ تعمیلِ اِرشاد کی اور اپنا وہ حال حضرت والا کی خدمت میں تھانہ بھون لکھا، حضرت نے جواب ارشاد فرمایا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ نے لکھا کہ جواب سمجھ میں تو آ گیا مگر تسلّی نہیں ہوئی۔ حضرت نے جواب میں لکھا کہ ہمیں تمہاری تسلّی کی ضرورت نہیں تمہارے اس حال سے ہمیں تسلّی ہے۔ اس کا جواب مولانا کے پاس سے آیا کہ اب تسلّی ہوگئی۔ دیکھیئے مصلح کی تسلّی سے طالب کی تسلّی ہوگئی۔

شیخ کا اِرشاد محض طِفلانہ تسلّی نہیں ہوتا :

یادرکھو! شیخِ مصلح محض طفلانہ تسلّی کی بات نہیں لکھتا حقیقت لکھتا ہے۔ میں یہ کہتا تھا کہ طالب کی تسلّی اس کی تسلیم وانقیاد اور اعتماد واعتقاد پر موقوف ہے جیسا اعتماد و اعتقاد ہوگا ویسی ہی تسلّی ہوگئی تو کاپیاں لکھ کر احقر کو تسلّی ہوگئی اس لئے بھی کہ جب

لقہ کام سے فراغت ہو جاتی ہے تو تسلی ہو جاتی ہے کہ فریضہ اداء ہو گیا۔

اُن سے فارغ ہو کر آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جب چار پائی پر آیا تو
ت یہ تھی کہ مجلسی تفصیل کے بعد ضرورت تو ہے نہیں نہ کاپیوں کے لکھنے کی اور نہ زُبانی
ہنے کی۔ اسلئے کہ دور رہتے ہوئے تو اور بات ہے لیکن پاس رہ کر تو مجلس میں شرکت
ر مجلس میں کلام سُننا ہوتا ہے اور اپنے اوپر جانچ پڑتال کرنا پڑتا ہے اس کا دل کہہ رہا
ہے کہ یہ بات کی مجھ میں کی تھی کم ہوئی یا نہیں بلکہ گم ہوئی یا نہیں اور یہ بات مجھ میں خیر
ی تھی خیر میں خار کیسا؟ تو یہ خیر کی بات جم گئی یا نہیں اور جب اس طرح سے مجلس کا
لوس یعنی بیٹھنا ہو رہا ہے تو اس وقت ہی ایک ایک خلق کا علاج کر کے عمر خضر علیہ
سلام سے بچتے ہوئے تعمیر مضبوط ہو گئی تو پھر لکھنے اور زُبانی پوچھنے کی ضرورت تو ہے
یں ہاں! اس خُلق کی اور مضبوطی اور زیادت کے لئے نہ کہ بطریقِ معالجہ بلکہ مزید
سلی کے لئے اطلاع کی ضرورت ہوتی ہے۔

غائبانہ مکاتبت کی ضرورت :

اور جب حاضرانہ مزید تسلی کے لئے مکاتبت یا مخاطبت کی ضرورت ہے تو
غائبانہ وطن میں رہتے ہوئے مکاتبت کی ضرورت کیوں نہ ہوگی؟

طالبِ صادق کی شیخ سے محبت :

مکاتبت سے خالی اور محروم کیوں رہے گا کہ مکاتبت بھی ایک نوع کی
مجالست ہے اور سالک یوں چاہتا ہے کہ مکاتبت بھی رہے اور مجالست بھی رہے کیونکہ
طالب صادق کو دُنیا بھر میں شیخ سے زیادہ کسی سے محبت نہیں، اس بات کا تقاضہ ہمہ
وقت مجالست ہمہ وقت مخاطبت و مکاتبت کا ہے، تو وطن پہنچ کر مکاتبت سے غافل کیسے

ہوگا جبکہ مکاتبت مثلِ مخاطبت ہے۔ جب خط پہنچا کھولا تو مجلس شروع ہوگئی اور جب
پڑھنا شروع کیا تو مخاطبت شروع ہوگئی بھلا کہاں چین محبت میں، اسی لئے حدیث
شریف میں آیا ہے۔

اِنْتِظَارُ الصَّلوٰۃِ صَلوٰۃ یعنی نماز کا انتظار بھی نماز ہی ہے۔ فجر کی نماز پڑھ
ظہر کا انتظار ظہر کی پڑھ لی عصر کا انتظار عشاء کی پڑھ لی اور رات کو سویا کہ بایں تمنا کہ
کی نماز با جماعت مل جائے تو اس کا سونا بھی نماز ہوگیا تو ہمہ وقت نماز میں ہے۔

اس انتظار کو حدیث شریف میں رِباط فرمایا گیا ہے کیونکہ مرابطت اور رِبا
کے ایک معنی مُوَاظَبَتْ عَلَی الْاَمْر "حکم کی پابندی کرنا" ہیں اور جب نماز کے انت
میں ہے تو مُوَاظَبَت عَلَی الْاَمْر آگیا اس لئے اس کو رِباط کہا گیا ہے رِباط
دوسرے معنی کفار کے مقابلہ میں سرحد کی حفاظت کرنا، اس معنی کے اعتبار سے
انتظارِ صلوٰۃ کو رِباط کہنا تشبیہاً صحیح ہے کیونکہ جو انتظار صلوٰۃ میں ہے تو وہ نفس و شیطا
کے مقابلہ میں اپنی سرحدِ دین کی حفاظت میں مستعد ہے۔ اسی مرابطت کو قرآن پاک
میں بھی بیان فرمایا گیا ہے

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْ۔

اے مسلمانو! خود بھی صبر کرو اور دشمن کے مقابلہ میں بھی صبر کرو۔

اس کے بعد ہے وَرَابِطُوْا یہاں بھی مفسرین نے وہی دو معنی بیان کے
ہیں جو اوپر ذکر کئے گئے۔ اور رِباط کی تفسیر میں نماز کو خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا گ
کہ نماز آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو حضور ﷺ نے ایک حدیث میں بیان کیا ہے۔
جعلت قُرَّۃُ عینِی فِی الصَّلوٰۃِ یعنی میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے ۔ اسی ل

ازی اللہ تعالیٰ کی مجلس میں ہے۔

ﷺیخ سے زیادتِ محبت کا مطلب :

اور یہ جو کہا ہے کہ مُرید کو اپنے شیخ سے زیادہ دُنیا بھر میں کسی سے محبت نہیں تو مطلب یہ ہے کہ اپنی اصلاح میں واسطہ ہونے کی حیثیت سے دُنیا بھر میں شیخ سے زیادہ کسی سے محبت نہیں ۔ یہ مطلب نہیں کہ ماں باپ سے محبت نہیں ، اِن کی محبت کی وعیت اور ہے اور شیخ کی محبت کی نوعیت اور ہے تو مکاتبت بھی مجالست ہے۔اس کی لیل انا جَلِیسُ مَن ذَکَرَنِی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یاد کرنے والے کا میں جلیس ہوں اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی یاد بھی مجالست ہے اسی طرح مکاتبت بھی یاد ہے۔ ہٰذا یہ بھی مجالست ہے۔

حضرت والا کے ہاں یہ قانون تھا کہ ظہر سے عصر تک مجلس ہوتی تھی ، حضرت والا ڈاک لکھتے تھے ، اگر کوئی تعویذ کے لئے آتا اور اس نے پوری بات کہہ دی تو لکھ دیدیا اور اگر پوری بات نہیں کہی تو اس کے کلام کی اصلاح ہو رہی ہے ۔ چونکہ ان حضراتِ مشائخ کے ہاں جس طرح کلام وعمل کی اصلاح ہوتی ہے۔ظاہری عمل کی بھی اور باطنی عمل کی بھی اسی طرح کلام کی بھی ہوتی ہے کہ آ کر پوری بات کیوں نہیں کہی۔

ایک مرتبہ ایک صاحب تعویز لینے آئے اور کہا تعویذ دو۔حضرت نے فرمایا بھائی میں سمجھا نہیں ! اُس نے پھر زور سے کہا اجی تعویذ دیدو! حضرت نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا بھائی میں نے کب کہا ہے کہ سُنا نہیں ، میں نے یہ کہا کہ سمجھا نہیں ۔ الفاظ دیکھئے آپ صاحبان کہ اسے کہتے ہیں علم ! ذوقِ علم والا ہمہ وقت علم حاصل کر رہا ہے۔ہم درسگاہ میں بیٹھے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہاں صاحبِ علم ہیں اور جب درسگاہ

سے باہر گئے تو پتہ نہیں چلتا کہ صاحب علم ہیں۔ علم کا تقاضہ عالمانہ طریق کا ہے۔

تو حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے کب کہا کہ میں نے سُنا نہیں کہ تم ز
سے بول رہے ہو میں کہہ رہا ہوں کہ سمجھا نہیں، سُننے میں اور سمجھنے میں فرق ہے اُس
پھر کہا اجی کہہ تو رہا ہوں کہ تعویذ دے دو، حضرت نے فرمایا اچھا باہر جاؤ کسی سے پو
کر آؤ حالانکہ خود بتلا سکتے تھے لیکن بتلایا نہیں۔ ان صاحبان کے ہاں مطالعہ کرایا جا
ہے جیسے اُستاد صاحب کو حق ہے کہ شاگرد کو مطالعہ کرائیں شیخ کو بھی حق حاصل ہوتا
کہ مطالعہ کرائے کہ آئندہ کے لئے دل میں خوب بیٹھ جائے اس لئے حضرت والا
تعویذ کے طالب سے فرمایا کہ جاؤ باہر کسی سے پوچھ آؤ۔ وہ گیا اور پوچھ کر آیا آ کر
اجی! بخار آتا ہے جاڑے کے ساتھ اس کا تعویذ دے دو، فرمایا اب پوری بات کہی فر
کچھ سمجھے بھی کہ کیا کمی تھی؟ عرض کیا بڑی کمی تھی بھلا آپ کس چیز کی تعویذ دیتے، میر
غلطی تھی، حضرت نے فوراً تعویذ لکھ کر دے دی اور مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا یہ دیر میر
طرف سے ہوئی تھی یا آپ کی طرف سے؟ یہ سب اصلاحی باتیں ہیں۔

مکاتبت کی کمی سے مناسبت میں کمی آجاتی ہے :

خواجہ صاحبؒ نے ایک خلیفہ صاحب کا نام لے کر عرض کیا کہ ان کی
مکاتبت جاری ہے؟ ان کے خطوط آتے رہتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کافی عرصہ ہو
گیا ہے کہ خط نہیں آیا، پھر فرمایا کہ "اس طرح تاخیرِ مکاتبت سے مناسبت میں کمی
جاتی ہے" حالانکہ وہ خلیفہ تھے اور کچھ پُرانے خلیفہ تھے اس کے باوجود فرمایا کہ مکاتبت
کی کمی سے مُناسبت میں کمی آجاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خلیفہ ہو کر بھی
خط و کتابت ضروری ہے تو غیر خلیفہ کے لئے کس قدر ضروری ہوگا۔ اگر خط و کتابت

میں دیر کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھ رہا ہے کہ تاخیر پر تاخیر ہو رہی ہے۔

مکاتبت کی اہمیت :

حالانکہ خط و کتابت اس قدر ضروری ہے کہ حضرت والا کو ایک صاحب نے لکھا میرے پاس لفافے کے لئے پیسے نہیں ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے حالات کی اطلاع دیتا رہوں۔ حضرت والا نے تحریر فرمایا بالترتیب اصلاح کے لئے مکاتبت ضروری ہے۔ آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو میں ہر مہینہ ایک روپیہ بھیج دیا کرروں گا۔ اس وقت سستے کا زمانہ تھا ایک روپیہ کافی دنوں کو کافی ہو جایا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ حالات کی اطلاع دیتے رہے جب روپیہ ختم ہو جاتا وہ ختم کی اطلاع دیتے حضرت والا دوسرا روپیہ منی آرڈر کروا دیتے۔ الغرض اصلاح کے لئے مکاتبت لازم ہے۔

گفتگو ہر وقت باوضو رہنے کی ہو رہی تھی۔ پھر اس کا ذکر آیا کہ شیخ کے چہرہ پر باوضو نظر کرنا بھی سلوک کا ادب ہے اور مجلس میں شرکت کرنا بھی باوضو کرنا ادب ہے البتہ غلو سے ممانعت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں طلبِ صادق بصدق و خلوص سے رہنے کی توفیق ارزانی سے نوازیں۔ (آمین یارب العالمین)

علاوہ ازیں فقہ کی طرح حدیثِ نبوی ﷺ میں اجتہاد کا دروازہ ابھی تک کھلا ہے او کھلا رہے گا۔ اس لئے جو شخص حدیث کی روایت و درایت میں ماہرانہ بصیرت رکھتا ہو اور متقدمین کی طرح اس میں اجتہاد کے شرائط پائے جاتے ہوں تو وہ

کسی حدیث پر ضعف کا حکم لگا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس نے اس حدیث کے جمیع طرق
اسانید کا بغور مطالعہ کرلیا ہو اور اس کا ظنِ غالب یہ ہو کہ اس حدیث کا متن دوسری کسی
صحیح سند سے ثابت نہیں۔

علمِ حدیث کا جو طالبِ علم اس فن میں ناآشنا اور مبتدی ہو۔ جب وہ ایسی
روایت نقل کرے جس کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہ ہو کہ آیا صحیح ہے یا ضعیف تو
اسے بڑے محتاط انداز میں یوں کہنا چاہیئے ''کہ آپ سے یوں روایت کیا گیا' یا فلاں
بات ہمیں اس طرح پہنچی'' اور یہ بات جائز نہیں کہ مشکوک الفاظ کے ساتھ کہے کہ یہ صحیح
حدیث ہے اور اس کی سند بھی بیان نہ کرے۔ اس لئے کہ اس سے اس حدیث کے
ضعیف ہونے کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ پورے جزم و وثوق کے ساتھ کہے کہ '' آپ
ﷺ نے یوں فرمایا ہے''۔

☆

بتیسویں مجلس

ایفائے عہدِ میثاق

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق ۱۶ اپریل ۱۹۹۱ء بروزِ شنبہ بوقتِ صبح

وقت کی قدر :

وقت کی قدر وہی سمجھے گا جو والعصر میں ذاتِ باری تعالیٰ کے وقت کی قسم کھانے کو سمجھے گا ..... حق تعالیٰ وقت کی قسم کھا رہے ہیں۔ والعصر واوٗ قسمیہ ہے، عصر عربی میں وقتِ عصر کو کہتے ہیں تو ترجمہ ہوا عصر کے وقت کی قسم۔ وقت کی قدر اہلُ اللہ نے کی ہے۔

حضرت تھانویؒ کے مصافحہ کا واقعہ :

حضرت والا کے ہاں عید الاضحیٰ کو خانقاہ شریف میں بہت مجمع ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ عید کے دن بہت بڑا مجمع تھا باہر کے بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے خطبہ سے فارغ ہو کر باہر والے لوگ حضرت سے مصافحہ کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ بستی والے بھی مصافحہ کر لیتے تھے۔ کیونکہ اگر روز بستی والے آ کر مصافحہ کرنے لگیں تو تضیعِ

اوقات ہے وہ تو ہر وقت آتے جاتے ہیں اگر ہر مرتبہ میں مصافحہ کریں تو کتنا وقت ضائع ہوگا اور باہر والے وہ تو کبھی کبھی آتے ہیں اس لئے اِن کے ساتھ حضرت مصافحہ کرتے ہوئے اپنی نشستگاہ کی طرف آہستہ آہستہ تشریف لا رہے تھے لوگ اشتیاق سے دوڑ رہے تھے جس سے ایک دوسرے پر گرتے جا رہے تھے تو فرمایا کہ بھائی ایک دوسرے کے اُوپر گرنے نہ پڑو مجھے تو مصافحہ سے انکار نہیں سب سے ہو جائے گا ذرا سکون سے مصافحہ کرلیا جائے۔ مصافحہ کرتے کرتے اپنی نشتگاہ پر تشریف لائے۔ وہاں ایک گدّہ اور تکیہ بچھا رہتا تھا اس کے سامنے ایک چھوٹی سی صندوقچی جس کو آجکل ڈیکس کہا جاتا ہے وہ رکھا رہتا تھا، عید میں بھیڑ کی وجہ سے وہ ہٹا دیا جاتا تھا کیونکہ وہاں بھی لوگ نماز پڑھتے تھے۔ حضرت کی نشستگاہ سہ دری میں تھی جو مسجد سے جنوبی جانب تھی۔

امرِ مقرّر سے تغافُل پر تنبیہ :

ایک صاحب اس کام پر مقرّر تھے کہ حضرت کی نشستگاہ پر پہنچنے سے پہلے اس کو بچھا دیا کریں لیکن اس دن حضرت والا مصافحہ کرتے کرتے مجلس میں پہنچے لیکن وہاں نہ گدّہ ہے نہ تکیہ ہے نہ ڈیکس ہے تینوں چیزیں غائب ہیں جب اُن صاحب نے دیکھا کہ حضرت پہنچ گئے ہیں تو وہ لپکے ہوئے آئے تا کہ گدّہ بچھا دیں تو حضرت نے فرمایا یہ کیسا نظام ہے نہ گدّہ ہے نہ تکیہ ہے تم کہاں تھے؟ اِن صاحب نے کہا حضرت میں آہی رہا تھا، فرمایا آہی رہا تھا..............؟ میں مصافحہ کرتے کرتے کچھ دیر میں پہنچا ہوں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آہی رہا تھا، یہ تغافُل یہ تکاسُل؟

دوسرے سے اذان کہلوانے پر تنبیہ:

خانقاہ میں ایک صاحب آذان دینے پر مقرّر تھے ایک دن صبح کی اذان کسی اور نے دی۔ حضرت نے آواز پہچان لی، حضرت دولت خانہ پر سوتے تھے اور فجر کی اذان کے بعد خانقاہ میں تشریف لاتے تھے اسطرح کہ دائیں ہاتھ میں لکڑی (بید) ہوتی تھی اور بائیں ہاتھ میں لالٹین، خانقاہ میں داخل ہوتے ہی فرمایا کہ یہ اذان کس صاحب نے دی تھی۔ جو صاحب متعیّن تھے حاضر ہوئے ان سے مکرّر فرمایا کہ یہ اذان کس نے دی تھی آج آواز آپ کی تو معلوم ہوئی نہیں۔ عرض کیا دوسرے صاحب نے دی تھی۔ فرمایا آپ سے اجازت لی تھی؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا آپ نے اجازت کیوں دی؟ دوسری مسجدوں میں آپ کی آذان کا انتظار رہتا ہے سب کو آپ کی آواز کی پہچان ہے جب دوسرے نے اذان دی تو لوگ کیا سمجھیں گے کہ ابھی خانقاہ میں اذان نہیں ہوئی حالانکہ یہاں آذان ہوچکی ہے۔ عرض کیا غلطی ہوگئی، فرمایا خیر پہلی بار ہے آئندہ کے لئے سبق ہوگیا۔ یہاں کی طرح نہیں کہ آذان دینے والا متعیّن بھی ہے پھر بھی کبھی کس نے دے دی کبھی کس نے دے دی یہ بدنظمی ہے نظم نہیں ہے۔ اور یہاں کی آذان پر دوسری آذانیں موقوف بھی نہیں مگر پھر بھی اپنے کارِ مفوضہ سے تکاسل تو ہوا، بے فکری تو ہوئی۔

اسی طرح اُن گدہ بچھانے والے صاحب سے حضرت نے فرمایا کہ میں مصافحہ کرتے کرتے آہستہ آہستہ اتنی دیر میں پہنچا ہوں اور آپ اب پہنچے ہیں اور اس پر فرمارہے ہیں کہ آہی رہا تھا۔ یہ تاویل! غلطی ہوئی آپ سے اس کا اقرار تو ہے نہیں اُلٹی تاویل۔ اسے کہتے ہیں علم کیسے جچے تُلے الفاظ سے کلام ہورہا ہے، عامیانہ کلام نہیں اور

حضرت نے ان صاحب کی اس تاویل پر ایک دھول مارا اور وہیں سب کے سامنے مارا کیونکہ وہاں تو دونوں جانب معتمد علیہ شخصیتیں ہیں ان صاحب کو حضرت والا پر پورا اعتماد ہے کہ حضرت جو کچھ تصرّف فرماتے ہیں میری اِصلاح کے لئے فرماتے ہیں ان کا یہ حال ہے ....

ان کو آتا ہے پیار پر غصّہ　　ہم کو غصّے پہ پیار آتا ہے

اور حضرت کو بھی پورا اعتماد ہے کہ اگر میں سب کے سامنے ماردوں گا نہ اس کو شکایت ہوگی نہ فرار ہوگا دونوں جانب اعتماد ہے اس لئے سب کیسامنے مارا، اب اصلاح کے لئے تاخیر کی کیا بات ہے؟

مقصودِ تنبیہ غفلت کو دور کرنا اور دِل میں جما دینا ہے :

چونکہ معاملہ اہم ہے کہ اُنکی طبیعت میں تساہل ہے پھر اُوپر سے بات بھی بناتے ہیں تو اس اہم کا اوقع فی النفس کرنا ضروری ہے اور اہم کے اوقع فی النفس کرنے کے لئے اہتمام ضروری ہے اور اہتمام اہم سے ہے جس کے معنی فکر کے ہیں اور اس اہم کے اوقع فی النفس ہونے کے لئے ایسا طریق ضروری ہے کہ فکر پیدا ہو جائے اس لئے ہلکی سی دھول ماردی کہ آئندہ ماریاد آکر فکر رہے تغافل اور تساہل ختم ہو۔ دیکھئے اگر مرض زیادہ ہوتو زود اثری کے لئے ڈاکٹر انجکشن لگاتا ہے اور اگر شدید مرض ہوتو آپریشن ہوتا ہے جس ڈاکٹر کو آپریشن نہیں آتا ہے اور ہر جگہ مرہم رکھ دیتا ہے تو کیا آپ اس ڈاکٹر کو کامل کہیں گے؟ اسی طرح اگر مصلح بھی ہر غلطی پر یہی کہہ دیتا ہے کہ آئندہ خیال رکھنا کوئی بات نہیں تو یاد رکھیے! اس غلطی کا خیال رکھا نہیں جائے گا تو یہ دھول مارنا اوقع فی النفس کرنے کے لئے تھا۔

یہ طریقِ نظام ہے کہ ہر موقع پر ہر شئی کی جیسی وقعت ہوتی ہے اسی انداز کے ساتھ اہمیت بھی ہوتی ہے، اسی لئے اسی انداز کے ساتھ حضرت اہم طریقِ اہتمام اختیار فرماتے تھے تاکہ اوقع فی النفس ہو یہ کلیہ ہے۔

حصولِ علم میں غفلت :

جب یہ ترتیب سمجھ میں آ گئی پھر اس کی تحصیل کیوں نہیں؟ خواہ پڑھا کر ہو خواہ سنکر ہو خواہ پوچھ کر ہو۔ جب تجاہل ہوگا تو تغافل ہوگا، جب تغافل ہوگا تو تساہل ہوگا اور جب تساہل ہوگا تو اُمورِ متعلقہ ذات بھی اور اُمورِ متعلقین بھی گویا معناً نہی ہونگی بجائے مأمور بہا ہونے کے منہی عنہا ہونگے۔

درس کی ابتداء عالمِ میثاق میں :

اس ذاتِ عالم الغیب والشہادۃ نے اس عالمِ شہود سے پہلے اسی عالمِ غیب میں طریق درس شروع فرمایا اور اِس درس کی ابتداء ''میثاقِ اَلست'' سے ہوئی اور یہ درس اُن سے شروع کیا جن میں اس عالمِ غیب والے شہود میں قدرتِ کاملہ کے ساتھ صحیح ادراک تک ابلاغ کے لئے عقلِ مستقیم قائم فرمائی، ان سے بطورِ درس خطاب فرمایا تھا ''الستُ بربّکم'' یہ ایک ابہامی باصطلاحِ مختصر المعانی ایجازی درس تھا۔ اطنابی نہ تھا، مخاطبین صحیح اِدراک اور صحیح عقلِ مستقیم کے ساتھ تھے۔ وہ اس کلامِ ایجازی کی حقیقت کو فوراً پہنچ گئے اور تصدیقِ قلبی کے ساتھ اقرارِ لسانی کیا ''بلٰی'' کیوں نہیں ضرور آپ ہمارے رب ہیں گویا کہ اقرار کرنے والے یوں کہہ رہے ہیں کہ آپ نے لفظ ربّ کہا اس میں آپ کے کمالِ ذاتی اور کمالِ صفاتی دونوں رکھے ہوئے ہیں اور جو ایسا ہوتا ہے وہی معبود ہوتا ہے اور اسی سے طلبِ حاجت کیجاتی ہے، نہ کسی اور سے

حاجت طلب کرنا روا ہے اور نہ کوئی دوسرا عبادت کے لائق ہے۔ بالکلیہ آپ ہی کی طرف ہماری حاجت کا رُخ ہے کسی دوسرے کی طرف نہیں۔ لہٰذا عبادت آپ ہی کے لئے ہے اور توکل آپ ہی پر ہے۔

جب اقرارِ ربوبیّت ہو گیا تو حکم ہوا کہ بس بس! چونکہ تم نے بلا چوں وچرا یہ تصدیق اس طرح باقرارِ لسان کی ہے تو اب اس عالمِ غیب سے عالمِ شہود میں اس تصدیق واقرار کے امتحان کے لئے جاؤ ہم دیکھیں گے کہ اس تصدیق واقرار کو اپنے عمل میں دواماً، بطورِ رسوخ، بطورِ ملکہ کہاں تک نبھاتے ہو اس لئے انسان کو اس عالمِ میثاق سے جس میں وثوق رکھا ہوا ہے اس عالمِ شہادت میں بھیج دیا کہ اس وثوق کی شہادت عمل دے گی جاؤ روا نہ ہو جاؤ...... اور اب ذاتِ باری تعالیٰ کا کرم دیکھیے کہ اسی عہد و پیمان پر قناعت و کفایت نہیں کیونکہ وہ عالمِ شہود ایسا ہے (کہ اس عالم کی خاصیت تغافل، تکاہل، تکاسل اور تباعد عن العبادت، تقارب الی المعاصی ہے) کہیں تغافل نہ ہو تو اس ذاتِ عالم الغیب والشہادۃ نے رحم فرماتے ہوئے اپنے نائب پیغمبر و نبی و رسول کو مذکر یاد دلانے والے بنا کر یکے بعد دیگرے بھیجنا شروع کر دئے۔

تکمیلِ نبوّت:

جسکی تکمیل و اِکمال اُس ذات کے ذریعہ سے کردی جن کا نام محمد اور جن کا نام بزبانِ عیسیٰؑ احمد ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اسی نام کے ساتھ بشارت دی تھی وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئیں گے جنکا نام احمد ﷺ ہو گا۔ جو کچھ کمی رہ گئی ہے اس کا اکمال واتمام ان کے ذریعے سے ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام معنیً تمام انبیا علیہم السلام کی طرف سے فرما رہے ہیں کہ ہم سب تو احمدؐ کے لئے بطورِ مزکّر ہوتے ہیں اوّل و آخر آپ ہی ہیں اُس عالم میں باطن اِس عالم میں ظاہر، اُس عالم میں اوّل اِس عالم میں آخر۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ تمام رسولوں کی یاددہانی کرتے کرتے آخر میں احمد ﷺ نام کے آئیں گے وہ اس کی یاددہانی کردیں گے اسی کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

تکمیلِ دین:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت کو متمم کردیا ہے اور اس اکمال و اتمام کے بعد فرمایا کہ اسی پر میری رضا ہے وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا وردین مکمل اور متمّم کا نام اسلام ہے تو حاصل یہ ہوا کہ جو مذہب اسلام پر ہے اسی لے لئے میری رضاء ہے اور جو مذہبِ اسلام کے خلاف اختیار کرے گا نہ وہ قبول ہوگا نہ اس پر میری رضاء ہوگی۔

چنانچہ دوسری جگہ صاف اعلان فرمایا: وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ اور جو شخص اسلام کے خلاف کسی دوسرے دین کو طلب کریگا وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور جب قبول نہیں تو مقبول نہیں تو مردود، اس لئے کہ اس نے بغاوت کی ہے اور باغی مردود نہیں تو اور کیا ہے؟

تو انبیاء علیہم السلام یاددہانی کرتے رہے، آخری نبی ﷺ نے یاددہانی کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی اس آخری دین کے مقابلے میں کوئی دین اختیار کرے گا تو وہ باغی ہے اور باغی مردود ہے مقبول ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں اور باغی اس لئے ہے

کہ غیرِ اسلام کو دین سمجھنا یہ خلافِ عقلِ سلیم اور خلافِ عہدِ عالمِ میثاق ہے۔ تم نے تو بلا چوں و چرا کاوش یہ تصدیق کی تھی کہ اے اللہ آپ کے سوا کوئی ربّ نہیں اور کسی سے بھی اپنی کوئی حاجت طلب کرنا نہیں۔ ہمیں شرک سے، توحید کے خلاف سے انتہائی درجہ کی نفرت ہے ہمیں اس سے بیقراری ہے کہ کسی غیر کی طرف جھکاؤ ہو۔ ہمارا تو عالمِ میثاق میں آپ کی ذات پر قرار یعنی جماؤ ہو گیا ہے۔

عہدِ میثاق کی یاد دہانی :

اسی عہدِ میثاق کی یاد دہانی کے لئے پیغمبر آتے رہے۔ پھر آخری پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر تکمیل کردی جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔

تو اِس تکمیل و تفصیل یاد دہانی کے بعد اب کسی یاد دہانی کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ ذاتِ کریم ورحیم ہے اس نے بسم اللّٰہ میں اسم اللہ کے ساتھ رحمٰن و رحیم سے ابتداء کی ہے تو اس رحمت کا تقاضا ہوا کہ اصل یاد دہانی کرنے والا آخری رسول تو مکمل یاد دہانی کر کے چلا گیا مگر اس کے نائب علماء حقانی، حکماء ربانی، قیامت تک آتے رہیں گے جو اُسوۂ رسول میں رنگے ہوئے ہوں گے اور اسی اُسوۂ رسول اور اعمالِ رسول کی تعلیم دیتے رہیں گے کوئی زمانہ ان سے خالی نہ ہوگا۔ ان کی اتباع لازِم ہے ان کی عدمِ اتباع پناہ کی چیز ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ لَایُدْرِکْنِیْ زَمَانٌ وَلَایُدْرِکُوا زَمَانًا لَا یُتَّبَعُ فِیْہِ الْعَلِیْمُ وَلَا یُسْتَحْیٰی فِیْہِ مِنَ الْحَلِیْمِ اے اللہ (میں درخواست کرتا ہوں کہ) مجھے ایسا زمانہ نہ پائے اور نہ میرے صحابہ کو ایسا زمانہ پائے جس میں عالم کا اتباع نہ کیا جائے اور بُردبار شخص سے شرم نہ کیا جائے۔

نائبانِ رسول ﷺ کی اِتباع رسول ﷺ ہی کی اتباع ہے :

رسول اللہ ﷺ دُعا فرما رہے ہیں حالانکہ آپ ﷺ کو اس دُعاء کی ضرورت نہ تھی مگر کلام میں بلاغت ہے کہ میں جارہا ہوں لیکن میرے بعد میرے نائب ہوں گے اور نائب ہونے کی پہچان بتلائے جارہا ہوں کہ وہ لوگ میرے اور میرے اصحابؓ کے طریقہ پر ہوں گے۔ جب ایسے نائب تمہیں ملیں تو ان کی اِتباع کرنا میری ہی اِتباع ہے اور میری اِتباع اللہ تعالیٰ ہی کی اِتباع ہے اور لازم کا لازِم لازِم ہوتا ہے، رسالت اور نبوت تو ختم ہوگئی ہے مگر نیابت کا کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت تک جاری رہے گا، ان نائبینِ انبیاءؑ کی برابر اتباع کرتے رہنا۔

جس نے عہد کرلیا وہ بِک گیا :

عالمِ میثاق میں جو وثوق کے ساتھ تم نے عہد و پیان کیا ہے اس کا ظہور اتباع عمل میں برابر ان کے ساتھ اعتقاد و اعتماد کے ساتھ رکھنا۔ کیونکہ عالمِ میثاق میں قَالُوْا بَلٰی تم نے برزخ میں کہا تھا تو تم نے بلا چوں و چرا اپنے کو میرے سپرد کردیا تھا تو ایسا ہوا تھا جیسے کہ تم نے اپنے کو میرے لئے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کہنے کے بعد تمہارے قَالُوا بَلٰی کہنے پر گویا تم نے اپنے آپ کو میرے ہاتھ بیچ دیا اور جب بیچ دیا تو اب بلا چوں و چرا بلا دلیل میرے احکامِ ظاہرہ و باطنہ پر بتقویٰ کامل بایمانِ کامل اخیر وقت تک ثبوت پیش کرتے رہو کیونکہ تم نے اپنے آپ کو بلا چوں و چرا اس طرح میرے ہاتھ بیچ دیا تھا یہ محاورہ ہے کہ میرے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اب اس کے بعد اس عالمِ شہود میں تمہاری یاد دِھانی کے لئے روانہ کرتے ہوئے اس عالمِ غیب میں جو بیع کی تھی اب اس عالمِ شہود میں بطریقِ ظاہر و ظہور پھر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بیع۔

اور جب تم ان کے ہاتھ بک ہو گئے یہ بیع میرے ہی ساتھ ہو گئی چونکہ یہ عالم عالمِ واسطہ ہے لہٰذا وہ عالمِ میثاق کی بیع، اس عالمِ شہود میں بواسطۂ پیغمبر ﷺ ظاہراً تو ان کے ساتھ بیع مگر دراصل وہ میرے ساتھ بیع کا ظہور ہے۔

لہٰذا اے نبی آخر الزماں پیغمبر ﷺ! میں کہہ دیتا ہوں کہ: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ، اِنَّمَا حصر کے ساتھ، اسی کمالِ ذاتی، کمالِ صفاتی کو ان میں رکھتے ہوئے اس عالمِ شہود میں ظاہراً تو کہتا ہوں اے پیغمبر و رسول و نائب! کہ آپ ﷺ کے ساتھ جو بیع کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ بیع ہے یہاں اس لئے آگے یہ بھی کہہ دیتا ہوں یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡهِمۡ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ یہ ہاتھ عالمِ ظہور شہود میں اس طرح ظاہر ہو رہا ہے لیکن وہ ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور تمہارے سب ہاتھوں کے اُوپر اُس کا ہاتھ ہے۔

اصحابِ کہف کی مثال:

اس طرح جو ماننے والے تھے بیزارِ شرک و کُفر بایں ماننے والے ذاتِ باری تعالیٰ کے کمالِ ذاتی و کمالِ صفاتی، انہوں نے اللہ ہی کے لئے ہجرت کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَقِّ اِنَّهُمۡ فِتۡیَةٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّهِمۡ وَزِدۡنٰهُمۡ هُدًی کہ چند جوان تھے جو شرک و کفر سے بیزار تھے اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنا چاہا تو ان کا جو یہ ایمان کہ میرے لئے ہی بک ہو چکے اس طرح تو میں نے ان میں ھدایت کی زیادتی قائم کر دی۔

وَرَبَطۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلٰـهًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا اس زیادتِ ہدایت میں سے یہ تھا کہ ان

کے دلوں میں اس میثاق کی اور مضبوطی قائم کردی ۔ جبکہ وہ پختہ ہوکر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا ربّ ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔

ان میں جو ایسے تھے میری طرف پہنچنے کی سعی و ہجرت کی تو میں پہنچ گیا اور ان میں جو چیز رکھی تھی اس میں اور زیادتی کردی اور اس زیادتی کا محل جو کہ دل ہے اس کو اور ترقی دی ۔ یعنی ان کے قلوب میں اور مضبوطی قائم کی کہ ساری عمر نکل نہیں سکتی ۔ تو جو ایسے ہوتے ہیں میں ان کے ساتھ ہوتا ہوں اور زیادتِ ہدایت اور قوتِ قلب بزیادت قائم کرتا ہوں ان بیچاروں نے بڑی جد و جہد کی میرے لئے میری خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا، حتیٰ کہ کہنے لگے۔

فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ یعنی اپنے محبوب کے ساتھ خلوت کرو ۔ اور انتہائی درجہ تو مجاہدہ اور ہجرت کر کے میری خاطر لگ گئے بایں تمنا يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا ۔ (پ ۔ ۱۵ ۔ ع ۱۴)

کہ تم پر تمہارا ربّ اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لئے اس کام میں کامیابی کا سامان درست کردیگا تو میں نے سامان ان کی رہائش و آسائش کا مضبوطی کے ساتھ اس عالمِ شہود میں میسّر فرمایا ۔ جب انہوں نے عُسر اُٹھایا جو کہ مجاہدہ ہے تو میری طرف سے یُسر آ گیا جو کہ ہدایتِ دائمی ہے اسی لئے میں کہہ دیتا ہوں یاد دلاتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے اس ایمانِ میثاق کا حُسن دکھایا اجمالاً قبول عملاً، احکاماً و دواماً حسن اس ایمان کا دکھادیا ان اعمال کے ساتھ مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ میں عالم الغیب

ہوں کہ وہ محسنین تھے اور محسنین کے ساتھ میری معیت ہوتی ہے اس لئے کہتا ہوں: اِنَّ اللّٰہ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

بس جو اس طرح ہوں گے بایں اسلام بایں ایمان جو ایسے مؤمن ہوں گے تو ذاتِ ایمان ان مؤمنین کے ساتھ ہو گی تو یہ بیع آپ کے ساتھ نہیں ہے یہ بیع درحقیقت میرے ساتھ ہے۔ لہٰذا کہتا ہوں یہ ان تک پہنچا دو: ان اَلَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہ اور یہ بھی پہنا دو، یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ کہ بظاہر ہاتھ آپ ﷺ کا لیکن ان سب کے ہاتھوں کے اوپر میرا ہاتھ ہے تو ایسوں کے ساتھ میری سرپرستی ہے۔ وہ مجھ تک پہنچے اور میں اُن تک پہنچا جس کا نام بلسانِ عرب تقرب ہے اور تقرب پہنچا دیا گیا ہے مَن تَقَرَّبَ مِنِّی شِبْراً تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا یعنی ایک بالشت میری طرف چل کر جو دکھلائے، یعنی مؤمنِ کامل ایک مرتبہ توجہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں اس کے پاس پہنچ گیا یعنی اس کی طرف میرا قرب دُوگنے سے دُگنا ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ میں نے اس کو اپنی گود میں بٹھالیا۔

بس یہ سلسلہ رسولوں کے ساتھ اور آخری رسول نبی آخر الزماں احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ اور نائبین کے ساتھ چلتا رہا اور قیامت تک چلتا رہے گا۔

بیعت کا ثبوت:

جس کو بیعت کے نام کے ساتھ اور باصطلاحِ قرآنِ کریم یُبَایِعُوْنَکَ کے لفظ کے ساتھ اور آج کل کے محاورہ میں باصطلاح ''بیعت'' کہا جاتا ہے اسی لئے ان دونوں آیتوں کو بیعت کے وقت تلاوت کیا جاتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ پھر اِنَّ الَّذِیْنَ

يُبَايِعُونَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ۔ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهِ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ ان دونوں کو بیعت کے وقت پڑھا جاتا ہے پڑھنے کے بعد کچھ ایجاز تفصیل کردی جاتی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ کیا ہوگا اس کے لئے وَجَاهِدُوْا فِي سَبِيْلِهٖ اس کے بعد کہا جاتا ہے لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اور لَعَلَّ بمعنی اُمید، یہ شاہی محاورہ ہے۔ بادشاہ کسی کے ساتھ عہد لفظِ یقین کے ساتھ نہیں کیا کرتا بلکہ یوں کہہ دیا کرتا ہے کہ اُمید رکھو۔

اسی لئے حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جو محاوراتِ عرب اور اصطلاحِ قرآن کو اچھی طرح سمجھے گا وہ قرآنِ پاک کو اچھی طرح سمجھے گا۔

عہدِ میثاق کا تقاضا ہے کہ تقویٰ ہو :

اس ابہام واجمال کی بایں عنوان بخطابِ مؤمنین يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے مؤمنو! اتَّقُوا اللّٰهَ جو تم نے عالمِ میثاق میں کہا تھا اس کی یاددہانی رکھنا ہے پس اس کا لحاظ رکھنا، اس معاہدے کا خیال رکھنا اور اس کے نبھانے کا خیال رکھنا شرعاً ضروری ہے۔

اُمیدوارِ مغفرت رہنا چاہیئے :

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ڈرتے رہنا اور جب ڈرتے رہنا اس عالم میثاق میں اور ڈرتے رہنا اس عالمِ شہود میں تو پھر نا اُمیدی کیسی؟ وہ تو کفر ہے پھر اُمید کیوں نہیں رکھنا چاہیے۔ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید بھی رکھتے رہو۔

چونکہ تمہارا ایمان بَيْنَ الْخَوْفِ وَ الرَّجَاءِ ہے ادھر یہ ایمان جس کی تفصیل ہو

چھپی ہے۔ یہ ایمان مع تقاضۂ ایمان باعمالِ ظاہرہ و باطنہ اور اجتناب خلافِ اعمالِ ظاہرہ و باطنہ چل رہا ہے، جو کہ وہ عالمِ میثاق کی یاد پر خوب چمک رہا ہے تو پھر بایں ایمان بتقاضۂ ایمان ان اعمالِ صالحہ ظاہرہ و باطنہ کے ساتھ چل رہا ہے تو پھر نا اُمیدی کیسی؟ اِدھر خوف رکھا تم نے اُدھر اُمید۔ نا اُمیدی خلافِ ایمان اور جو خلافِ ایمان ہے وہ کفر ہے لہٰذا نا اُمیدی کفر ہے۔ لہٰذا اپنے اس ایمان پر نا اُمیدی کا کیا سوال؟ تو اس خوف کے ساتھ رحمت غالب اور جب رحمت غالب تو پھر فلاح کیوں نہ ہو۔ لہٰذا کہتا ہوں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کمالِ فلاح پر پہنچ گیا بایں کمالِ ایمان بتقاضۂ ایمان بعہدِ میثاق تو نتیجہ انجامِ خیر، فلاح کے ساتھ خلاف کیسا؟ بلکہ فلاح و کامیابی کامل فلاح من حیث الدنیا بھی اور من حیث الآخرۃ بھی یہ ہے بیع و بیعت!۔

اس لئے اخیر میں پڑھا جاتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ مومن، مومن کے ہاتھ میں ہاتھ، اور یہ ہاتھ اِس مومن کا اُس مومن کے ہاتھ، اُس مومن کا ہاتھ اِس مومن کے ہاتھ لہٰذا اِتَّقُوا اللّٰهَ دائی جس کا طریقہ اِبتغاء وسیلہ ہے۔ ابتغاء وسیلہ بدلالتِ مطابقی والتزامی، كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ اے مومنو! بوسیلۂ اعمالِ تقویٰ، اسی اعمالِ تقویٰ دائی کے واسطے وسیلہ اصل نائبوں کا پیغمبر کے پھر نائبوں کا نائب ہوگا باُسوۂ حسنہ ظاہرہ و باطنہ وسیلہ کہ بیعت ہو رہی ہے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مجھ سے وسیلہ تو اصل وسیلہ وہ اعمالِ تقویٰ اس اعمالِ تقویٰ کے وسیلہ کے لئے یہ وسیلہ وہ دلالتِ مطابقی ہے۔ اعمال بتقاضۂ ایمان و بکمالِ ایمان اور یہ وسیلۂ بیع بصورتِ بیعت بدلالتِ التزامی و تضمنی تو اصل وسیلہ ہے اس کو اختیار کرو، اس کے اختیار کرنے کے لئے یہ وسیلہ اختیار کرو تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس طرح سے بیعت

ہو کر بیع ہوگئی اس عالمِ میثاق والا تو فلاح کو نہ پہنچا بلکہ فلاحِ کامل تک پہنچنا۔ ادھر میثاقِ کامل بایمانِ کامل ادھر فلاح بھی فلاحِ کامل اس عالمِ شہود میں بھی اور اُس عالم میں بھی۔ اس فلاحِ کامل کا نام اُس عالمِ غیب آخرت میں جنّت ہے جہاں تم تھے اس محل کا نام ہے لہٰذا اگر تم اس عالمِ میثاق کے عہد کے ساتھ اس عالمِ شہود میں ہے تو اس عالمِ غیب میں آنے پر وہی تمہارا محل جنّت ہے۔

دُنیا بھی جنّت کا نمونہ اور آخرت میں بھی جنّت :

تو یہاں پر بھی جنّت کی نشانیاں، راحت کی، فرحت کی، اگرچہ جسم کسی تکوینی یا تشریعی کرب و مجاہد . میں ہو لیکن اس عالمِ شہود میں بھی نمونۂ جنّت بناؤ اور بکامل فلاح وہ جنّت تو دونوں عالموں میں عالمِ غیب اور عالمِ شہود میں جنّت تو تمہارے لئے دونوں عالموں میں جنّت'' اس کو لَعَلَّ کے ساتھ تعبیر کیا ہے اس میں شُبہ مت کرنا یہ عنوانِ شاہی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اُمید ہے کہ تم پورے کامیاب ہو جاؤ گے۔

☆

تینتیسویں مجلس

تاریخِ بیعت ومبایعت

مورخہ ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق اپریل ۱۹۹۱ء یکشنبہ بوقتِ صبح

عالمِ غیب کا ذِکر :

چونکہ آخرت کا عالَم عالَم الغیب ہے اور یہ عالم عالمِ شہود ہے اور اس میں بتقاضائے عقل تصدیقِ قلبی اور اقرار باللسان ضروری ہے کیونکہ اقرارِ لسانی ایک عمل ہے اور تصدیقِ قلبی ایک عقیدہ ہے۔ بالفاظِ دیگر تصحیحِ عقائد اجمالاً باقرارِ لسان یعنی عقیدہ کا اظہار لسان کے ساتھ ہو یہ بھی ایک عمل ہے۔

عالمِ شہود میں آمد :

اسی وجہ سے اس عالمِ غیب و میثاق سے اس عالمِ شہود میں ذاتِ باری تعالیٰ نے ہمیں بھیجا کہ جب تم نے مغیبات کا اقرار بتصدیقِ قلب ظاہر کیا یعنی میری ذاتِ وجوبی کا کمال ذاتی اور کمالِ صفاتی ذاتی کی تصدیق کا اقرار کیا اور کہہ دیا کہ یہ کمالِ ذاتی آپ ہی کے لئے من حیث الذّات و الصِّفات ہے لہٰذا کوئی بھی کسی قسم کا بھی کبھی

بھی آپ کی ذاتِ عالی کے سوا مستحقِ عبادت نہیں۔

اس وجہ سے ہماری عبادت آپ ہی معبود کے لئے ہے کہ تیرا نام اللہ ہے اور اللہ کے معنی معبود کے ہیں۔ لہٰذا تیرے سوا کوئی معبود نہیں، ہم سب کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں۔

حاجت روائی :

اسی طرح ہماری حاجت میں سوائے اللہ کے حاجت روائی کے کسی کی طرف سے بھی حاجت روائی نہیں اسی وجہ سے حاجت روائی کے لئے کسی اور کی طرف جانا روا نہیں ہے۔

سب سے گری ہوئی چیز جو سمجھی جاتی ہے وہ گرنے ہی کے لئے ہوتی ہے وہ چیز نہ گرے تو خود گر جائے گی۔ ''براز'' جس کو لوگ پاخانہ کہتے ہیں وہ اگر جسم میں بتکلف برقرار رکھا جائے تو آدمی گر جائے گا اور خود ہی نہیں جائے گا۔ لہٰذا گرنے کی جو چیز ہے وہ گرنی ہی چاہیے اور سب سے گری ہوئی چیز کا ذکر ابھی کیا، حاجت روائی اور روائی کے معنی ہیں گرنا لیکن روائی گرنا جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہوتا روائی نہیں ہو سکتی۔ بیت الخلاء گیا' روائی کے لئے جس کی اس نے ضرورت سمجھی، اس کا بھی ایک وقت ہے لیکن روائی ہے نہیں بلکہ جمائی ہے یعنی جمی ہوئی ہے۔ روائی کی دوسری مثال جیسے دوا بھی کھا رہے ہیں مگر حاجت روائی نہیں ہوتی چونکہ حکم نہیں ہوا اور جب حکم نہیں ہوا تو روائی کیسے ہو۔

ایک جزئیہ :

اسی سے سمجھیے کہ ایک انسان اپنی حاجت میں کتنا محتاج ہے حاجت روائی کے

لئے اور اس ذاتِ وجوبی کے سوا کوئی دوسرا حاجت روا نہیں ہے جیسے انسان علاج کے لئے ایسے ایسے اسباب اختیار کرتا ہے اور ان پر یقین بھی کرتا ہے مثلاً انجکشن لگائے جا رہے ہیں آپریشن بھی ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو لاکھوں روپیہ دے چکا لیکن وہاں سے جب تک صحت کا حکم نہیں حاجت روائی نہیں ہوئی۔

حقیقتِ تصدیق:

اُمورِ مغیبات کا عالمِ غیب میں تصدیق واقرار تھا چونکہ تصدیق کہتے ہیں کہ اس کے خلاف کا دل میں احتمال ہی نہ ہو، بلکہ تصدیق ہو پھر تکذیب کیسی؟ اس کا نام ایمان بمغیبات ہے کہ اجمالی طور پر ذاتِ باری تعالیٰ کے وجوبِ ذاتی کی تصدیق کے بعد فراستِ ایمانی پیدا ہوگئی انکشافِ حقائق ہوگیا ایمان بمغیبات ہوگیا۔

ایک نظیر:

جب فرعون کا زمانہ آیا قادرِ مطلق نے عجیب طریق سے اپنی قدرتِ کاملہ کا ظہور فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون ظالم کے زمانہ میں پیدا فرمایا جو کہ اپنی قوم ہی کے لئے نہیں بلکہ غیر قوم کے لئے بھی ظالم تھا۔ اس کا حکم تھا کہ عورتوں کو زندہ رہنے دو اور لڑکوں کو مارتے رہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وِلادت بھی ایسے ہی زمانہ میں ہوئی جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والدِ بزرگوار فرعون کے خصوصی خدمت گار تھے رات کو سونا نہیں ہوتا تھا ایک مرتبہ جب فرعون سو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد صاحب چپکے سے گھر آئے اور اپنی بیوی سے مل کر چلے گئے، اسی رات استقرارِ حمل ہوا اور موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے ہوئے اور ان کو فرعون کے گھر پرورش کرائی اس دوران واقعات بھی بیچ میں آتے رہے نکل کر مدائن پہنچ گئے۔ حضرت

شعیب علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ وہاں ان کی صاحبزادی سے نکاح ہو کر مدین واپس آتے ہوئے ایک رات میں کہ اس میں کچھ سردی بھی تھی اور راستہ بھی بھول گئے تھے کچھ آگ کی ضرورت ہوئی ایک طرف جو نگاہ ڈالی تو کچھ روشنی سی نظر آئی وہاں پہنچ گئے۔

وہاں تو کچھ اور ہی بات تھی...... گئے تھے آگ لینے اور مل گئی نبوّت۔

جب نبوّت ملی تو فرعون ملعون کی طرف بھیج دیا گیا اور حکم دیا کہ وہ بڑا سرکش ہے خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا ہے اس کی طرف جاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تنہائی کو دیکھتے ہوئے عرض کیا کہ میری ہمّت کے لئے تائید کے طور پر تقویّت کے لئے یوں جی چاہتا ہے کہ آپ میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو میرا ساتھی بنا دیجئے گا۔ یہ درخواست تو کر دی لیکن ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آیا وہ تو اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى کا ہے اور کلام کی بلاغت کا یہ حال ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دوسری جانب کا احتمال ہی نہ ہوا، تصدیق کرنا پڑی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین آ گیا کہ یہ آواز مِن جَانِبِ اللّٰهِ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی درخواست جو کہ اپنے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ کے سلسلہ میں تھی قبول فرمالی۔ فرمایا بہت اچھا ہم نے تمہارے بھائی ہارون کو بھی نبوّت دیدی قَالَ قَدۡ اُوۡتِيۡتَ سُؤۡلَكَ يٰمُوۡسٰى اور درخواست یہ تھی۔

وَاجۡعَلۡ لِّىۡ وَزِيۡرًا مِّنۡ اَهۡلِىۡ هٰرُوۡنَ اَخِى اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِىۡ وَاَشۡرِكۡهُ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ۔ (پ۱۶۔ ع۱۱) سورۃ طٰہٰ

یعنی میرے واسطے میرے کنبہ میں سے ایک معاوِن مقرّر کر دیجئے یعنی ہارون جو کہ میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوّت کو مستحکم کیجئے اور انکو میرے کام میں شریک کر دیجیے۔

اب گویا حق تعالیٰ فرما رہے ہیں مگر تمہارے بھائی ہارون کو ہم نے نبوّت تو دیدی لیکن رہیں گے تمہارے ہی ماتحت۔

مُعین اور مُعاوِن ایسا ہونا چاہیے :

اس واقعہ موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام سے معلوم ہوا کہ ساتھی اُسی کو بنانا چاہیے جو ہم مشرب اور ہم مسلک ہو، ہم خیال ہو۔ اور دوسرا یہ معلوم ہوا کہ اگر ایسا آدمی مِل جائے جو اپنا ہم مسلک وہم خیال ہو تو پہلے اپنے خاندان سے ساتھی بنانا چاہیے۔

اس آیت میں نفی ہوگئی اُن لوگوں کی جو یوں کہا کرتے ہیں کہ آپ نے خاندان والوں کو مشیر نہیں رکھے۔ نہ معلوم انہوں نے کیسا قرآنِ شریف پڑھا ہوا ہے۔ احقر اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ غیر تو پھر بھی غیر ہے تو پھر خیر کہاں ہے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰؑ بھی نبی ہونے کے باوجود مُشیر ومعاوِن طلب کر رہے ہیں۔ اپنے خاندان ہی میں سے نہیں بلکہ اپنے گھر کے حضرت ہارونؑ کو گویا ان کو اپنا معاوِن بنا رہے ہیں۔

حضرت حوا علیہا السلام کی تخلیق من حیث المُعین :

اور یہ معاوِن وساتھی کا ہونا تو پہلے ہی سے چلا آرہا ہے'' کچھ نکتے ہوتے ہیں'' پہلے سے کیسا چلا آرہا ہے ذاتِ باری تعالیٰ نے جنّت میں آدمی ''بشر'' پیدا کیا ان کا نام آدم رکھا۔ صرف ایک ہی بشر پیدا کیا اور جنت کیسی جگہ ہے سب کو معلوم ہے مگر اس کے باوجود چونکہ بشر ہیں اُس ذات میں کچھ چیزیں رکھی ہیں کہنے لگے: اے اللہ اے خالقِ برتر! آپ سب باتوں پر قدرت رکھتے ہیں، میں تنہا ہوں ذرا جی بہلانے کے لئے دوسرا آدمی ہو جائے زیادہ اچھا ہوگا۔ چونکہ جنت میں تھے ایک خیال سا آیا

بس خیال آتے ہی کچھ غنودگی سی ہوتے ہی دیکھا کہ کوئی اور بشر بیٹھا ہے "بشریٰ" وہ بشر تو تھے یعنی آدم علیہ السلام اور جو پیدا ہوا وہ بھی بشر تو ہے مگر بجائے بشر کے بشریٰ بروزنِ فعلیٰ یعنی عورت بنام حوا علیہا السلام اب یہ الگ بات ہے کہ اس مرد بشر کے لئے دوسرا مرد بشر کیوں نہ پیدا کیا گیا اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔

اس واقعۂ آدم سے معلوم ہوا کہ بشر کی طبیعت میں تنہائی رکھی ہوئی نہیں ہے اور یہ طریقہ پہلے سے چلا آ رہا ہے اور جب یہ ہے تو پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس عالمِ شہود میں جبکہ مغیبات میں بھی بتقاضائے بشر دوسرا ساتھی کی طلب کی ہے بتقاضۂ بشرا کیلئے ہونے پر دوسرے ساتھی کی طلب کیوں نہ ہو مگر دوسرا کیسا؟ اس کے متعلق ابھی عرض کیا گیا ورنہ مشرب میں فرق ہو کر کہیں تفریق اور جھگڑا پیدا نہ ہو جائے۔

گھر والوں کا حق دوسروں پر مقدّم ہے:

جب موسیٰ علیہ السلام نے دوسرے رفیق کی چاہت ظاہر کی تو اپنے گھر میں سے بھائی کا نام لیا۔ اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ دوسرا آدمی معین کی حیثیت سے اپنے گھر کا زیادہ اولیٰ ہے اور اس کے خلاف کہنے والوں کی نفی ہوگئی۔ ہاں جب گھر کا کوئی آدمی کوئی ساتھی بننے کے لائق نہ ہو تو پھر اقارِب میں سے کہ وہ عقرب بمعنیٰ بچھو نہ ہو یعنی جو قریبی رشتہ دار عزیز ہو۔ تو پہلے اپنے گھر میں سے پھر اپنے رشتہ داروں میں سے وغیرہ وغیرہ اور جب نہ ہو تو سوچنا پڑے گا کہ غیر وہ ہو جو اپنا ہم خیال ہو ہم مشرب ہو ورنہ اس غیر میں خیر کہاں۔

بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو ساتھ لیا اب بجائے اِذْهَبْ کے اِذْهَبَا تثنیہ ہو گیا یعنی دونوں جاؤ اور حضرت ہارون علیہ السلام کو ساتھ لینے کی اس لئے

بھی ضرورت تھی کہ اُن کی تقریر میں روانگی تھی اور اِن کے کلام میں لُکنت تھی۔ فرمایا کلامی حیثیت سے مجھ میں کچھ نقص ہے لیکن باوجود اس اظہارِ نقص کے بھی ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰؑ ہی کو نبوّت برسالت پر فائز فرمایا۔ یعنی جس کو نبی بنا کر جدید کتاب دیکر بھیجا جائے اسی کو رسول کہتے ہیں اور نبی عام ہے چاہے وہ صاحبِ کتاب ہو یا نہ ہو۔ لیکن نبی رسُول ہو کر صاحبِ کتاب بھی ہوتا ہے تو حضرت ہارون علیہ السلام نبی ہوئے چونکہ ان پر کوئی کتاب نازِل نہیں ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوّت دے کر پھر رسالت بھی دی گئی کیونکہ ان پر کتاب بھی نازِل فرمائی۔

اس واقعۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہ السلام سے معلوم ہوا کہ جس کام کے لئے جس کو مقرّر کیا جائے اس کام کے لئے اس میں کمال ہونا ضروری ہے دوسری بیرونی چیز میں اگر کوئی نقص ہو تو غیر معتبر ہے۔

امرِ مفوّض کے لئے کمال شرط ہے:

حضرت داوٗد علیہ السلام سے کہا گیا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ چاہیے۔ چنانچہ خود حضرت داوٗدؑ نے جو کہ نبی ہیں فرمایا کہ فلاں شخص جو تمہاری قوم میں ہے وہ تمہارا بادشاہ ہوگا۔ قوم نے یوں بھی کہا بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ ہم اس سے بڑھ کر ہیں۔ حضرت داوٗد علیہ السلام نے جواب دیا کہ جس کام کے لئے تم نے چاہا تھا اس کے لئے عند اللہ وہ پوری اہلیّت رکھتا ہے کہ جسامتِ ظاہری کے ساتھ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ بھی ہے اس کا بھی ذکر قرآنِ شریف میں ہے اور باطنی کمال بھی اس میں موجود ہے۔ جیسے شاہی انتظام، لشکری و فوجی نظام اور ظاہری جسم بھی کمالی ہے تا کہ دیکھ کر ظاہری طور پر رُعب طاری ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ کلام کرنے والے میں جس طرح معنوی کمال اُس کام

کے لئے ہونا چاہیے اسی طرح ظاہری کمال بھی ہونا چاہیے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست منظور فرمالی لیکن جس کام کے لئے بھیجا جارہا ہے اس کام میں کمال کی وجہ سے تم کو منتخب کیا جارہا ہے۔ تم اصل ہو وہ ماتحت! گو تم عمر میں چھوٹے ہو اور وہ بڑے ہیں۔

کارِ نبوّت و معجزۂ موسیٰ علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دینی شروع کردی، بھلا وہ کہاں مان سکتا تھا، وہ تو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ اے اللہ اس دعوت دینے کے لئے شہادت جس کا دوسرا نام معجزہ ہے چاہیے تاکہ سب عاجز آجائیں۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوّت دی تو معجزہ کا ظہور وہیں کرادیا تھا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوْسٰى.... یعنی اے موسیٰ علیہ السلام تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے، اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے مگر حسی طور پر معلوم کرانا چاہتا ہے اور اس سوال میں ایک معنوی چیز رکھی ہوئی ہے۔ وہ جو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی صاحبزادی کا نکاح کراتے ہوئے ایک لاٹھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی تھی وہیں سے نبی کی ایک سُنّت نکل آئی کہ جہاں تک ہوسکے لکڑی دائیں ہاتھ میں رکھو۔ تو قلم بھی ایک چھوٹی سی لاٹھی ہے وہ بھی دایں ہاتھ میں ہونی چاہیے یہ بات ضمناً آئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: هِيَ عَصَايَ یہ میری لاٹھی ہے اس سے بات ختم ہوگی تھی لیکن آگے بول رہے ہیں کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ سے کلام کرنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دل کھل گیا، محبت میں ذرا اور کلام کرنے کو جی چاہا لیکن اسی پہلی بات سے متعلق چنانچہ عرض کیا۔ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا

مَآرِبُ اُخْرٰی۔ (پ۱۶۔ ع۱۰) سورۃ طٰہٰ)

یعنی کبھی اس سے ٹیک لگاتا ہوں اور کبھی اس سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں کے پتّے جھاڑتا ہوں اور بھی بہت سی حاجتیں ہیں جو اس سے پوری کرتا ہوں۔

کیا کیا بیان کروں' زیادہ بات کرنا بھی محبوب کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ ادب سیکھ لیا اور خلاصہ کر لیا اس پر جزئیہ متفرّع ہو گیا۔ کہ جب مدرّس کسی کتاب کا درس شروع کرے تو جو باب ہے اور جس چیز کا بیان ہے اس کے متعلق کچھ تفصیل کرے اس سے خارج ہو کر تفصیل نہ کرے تضیعِ اوقات ہو گا اور پھر ذہن میں کہاں محفوظ رہے گا۔ ایسے ہی امتحان کے سوالات کے جوابات میں بھی سوال کے متعلق ہی کچھ لکھنا چاہیے۔ جب یہ فوائد بیان ہو گئے تو ذاتِ باری تعالیٰ نے حکم دیا قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی اے موسیٰ علیہ السلام اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو بس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعمیلِ حکم میں اس کو زمین پر ڈال دیا۔

تابع کو اِتّباع و اعتِقاد لازِم ہے:

جس کسی کو اُستاد بناؤ، تابعیّت کے ساتھ، محبت کے ساتھ تو محبت کا ظہور اور اتّباع ہو، اور چون وچرا دلیل وشہادت ہے محبت صحیح واقع نہ ہونے کی۔ بلکہ خود غرضی کی محبت ہے یہ علامت ہے کہ اگر کام بن گیا تو محبت ہے اور کام نہ بنا تو عداوت۔

اسی طرح کسی بُزرگ کے پاس جائے گا تو یہی معلوم ومفہوم ہو گا کہ محبت سے آیا ہے عقیدت سے آیا ہے۔ اب جب بزرگ کوئی نقص دیکھے گا تو اس کو بھی کہا جائے گا اس کے کہے جانے پر بُرا ماننا یہاں تک کہ عداوت کا آنا اور بے ادبی کا دِل میں آنا اور پھر کسی وقت اس کا اظہار بھی ہو جانا یہ کونسی عقیدت تھی کونسی محبت تھی۔

ایک صاحب خانقاہ شریف تھانہ بھون حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے، اُن سے کوئی نامناسب بات ہوگئی شیخ تو طالبِ اصلاح کو صرف معصیت اور گناہوں پر ہی نہیں ٹوکے گا بلکہ جو بھی نامناسب بات ہوگی اگر چہ وہ معصیت نہیں ہے ٹوکے گا تاکہ معصیت تک نہ پہنچ جائے۔ جیسے طبیب مریض کو ٹوکتا ہے کہ گوشت مت کھانا حالانکہ گوشت کھانا جائز ہے مگر روک رہا ہے چونکہ مریض کے لئے مناسب نہیں تو حضرت والا نے اُن کو ٹوکا بلا ملے اور بلا مصافحہ کئے چلے گئے اور پھر اپنی جگہ سے خط بھیجا کہ مجھے آپ کے زُہد و علم کا لحاظ ہو گیا تھا اس لئے خاموش رہا تھا۔ یہ عقیدت تھی! اور آگے یوں بھی لکھا کہ الحمدللہ فضلِ الٰہی سے آپ کی دُعا کی برکت سے میری بینائی اچھی ہوگئی، حضرت والا نے فرمایا کہ یہ بھی وہم ہے۔

خدا کے حکم میں لِم اور حِکمت کی گنجائش نہیں :

الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حُکم دیا کہ لاٹھی ڈالو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ڈال دی اس میں بھی کچھ حِکمت ہوگی۔ چونکہ نبی قبلِ نبوّت بھی معصیّت سے پاک ہوتا ہے تو پھر بھلا وہاں شرک کا کیا کام، اور نبوّت کے بعد تو معصیّت ہے ہی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ کوئی حِکمت ہوگی اور سوچا کہ میں یوں سوال کروں کہ آپ کیوں ڈلوا رہے ہیں اس میں کیا مصلحت و حِکمت ہے یہ ہے ایمان۔ مؤمن کو جب عِلم ہو گیا عمل کرنے کے لئے کسی سوال کی گنجائش نہیں ہے۔

مقصود اتّباعیّت ہے شوق پورا کرنا نہیں :

حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ میں چار صحابی بیٹھے ہوئے تھے، حضور

ﷺ نے فرمایا کہ تم چاروں اسی وقت فلاں جگہ کے لئے روانہ ہو جاؤ اور فلاں وقت تک پہنچنے کی کوشش کرو، ضرورت اور کام ہے...... یا رسول اللہ ﷺ بہت اچھا! چاروں اُٹھ گئے تین تو گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے ان میں سے ایک صحابی نہیں گئے۔ جمعہ کا دن تھا اور جمعہ کے فضائل حضور ﷺ سے سُنے ہوئے ہیں۔

حضور ﷺ نے خطبہ پڑھا نماز سے فراغت ہوئی روانگی سے پہلے دربارِ حضوری ﷺ میں حاضر ہو کر سلام و مصافحہ کے لئے پیش ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم تو چار تھے وہ تین کہا گئے؟ اُس نے کہا وہ تین تو اُسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے، اور تم؟ یا رسول اللہ ﷺ میں نے خیال کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے نمازِ جمعہ کی فضیلت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدائیت، تو دو فضیلتوں کو حاصل کرنے کے لئے جی نے چاہا اور آپ کے حکم کی تعمیل اس طرح کہ میرے پاس ایک گھوڑا ہے جو کہ اُن کے گھوڑوں سے زیادہ تیز رَو ہے میں اب سوار ہو کر روانہ ہو جاؤں گا اور راستہ میں ہی اُن کو پالوں گا اور ساتھ ہی ہم چاروں اس مقام پر پہنچ جائیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فرمایا کہ سبقت لے جانے والے سبقت لے گئے ان کو جو تقرّب حاصل ہوا ہے اس اتباعیّت میں اس تقرب سے آپ رہ گئے۔ اُنھوں نے اتباع کی اور تم سے سبقت لے گئے اور تم نے اپنا ذوق وشوق پورا کیا۔

یہ تو معلوم ہو گیا کہ اظہارِ محبت میں وہ گناہ نہیں ہوا عبادت ہی ہوئی لیکن جو حُکم تھا اُس کے موافق نہ کیا اور اُنھوں نے اتباع کی اور یہ دونوں چیزیں نہ کیں۔ لیکن اِس کے باوجود اِس اتباعیّت سے اُن کا درجہ بڑھ گیا۔

اتباعیت اور عقیدت کا ظہور:

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اتباعیت میں لاٹھی ڈال دی، بس لاٹھی کا ڈالنا تھا وہ تو ایک اچھا خاصا سپیلا کا سا اژدھا بن گیا فَاِذَا ھِیَ حَیَّۃٌ تَسۡعٰی باحیات حیوان اپنی ہی تو لاٹھی تھی اپنے ہاتھ میں کبھی اس طرح نہیں دیکھا اور لاٹھی حی بنی بشکلِ حیوان اور وہ بھی لمبا چوڑا اجدھا بن گیا۔ فطرت کے تقاضے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے حالانکہ وہ لاٹھی پہلے سے دیکھی تھی مگر اب شکلِ غیر ہے تو حکم ہوا: قَالَ خُذۡھَا وَلَا تَخَفۡ سَنُعِیۡدُھَا سِیۡرَتَھَا الۡاُوۡلٰی حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: پکڑلو اور ڈرو مت جیسا کہ یہ پہلے تھا ویسا ہی بن جائے گا۔ اور جب پکڑ لیا تو وہ پہلے کی لاٹھی بن گئی اسی کا نام معجزہ ہے۔

جب فرعون نے کہا کہ آپ یوں فرما رہے ہیں توحید کی دعوت دے رہے ہیں ثبوت لاؤ، لاٹھی ڈال دی تو وہ اژدھا بن گیا فرعون نے کہا لوگو! دیکھو یہ کیا جادو دکھا رہا ہے اس طرح دکھا دکھا کر مجھ پر اور تم پر غالب آنا چاہتا ہے تمہاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس آدمی نے سحر اور جادو دکھایا ہے اس میں تو کوئی بات نہیں آپ کے ملک میں بڑے بڑے جادوگر ہیں اس سے بھی بینظیر اور بظاہر علیم ہیں۔ علیم کا لفظ استعمال کیا عالم کا نہیں سَحَّارٍ عَلِیۡمٍ آپ کے ملک میں تو بڑے بڑے باکمال جادوگر موجود ہیں۔

ایک کے مقابلے میں سارے جادوگروں کو بلایا جا رہا ہے ارے بیوقوف! تو یہی سمجھ لے کہ ایک جادوگر کے مقابلہ میں اور تو یوں بھی کہہ رہا ہے کمال والے جادوگر ہیں تو پھر بس ایک کو بلالے دیکھو تیرے مصاحب کتنی کمزوری کی بات کر رہے ہیں یہ تو

اچھے مشیر نہیں یہ بات متفرع ہوگئی۔

حاکم مشورہ کے بعد بھی فکر سے کام لے :

اس مشورہ مصاحبینِ فرعون سے معلوم ہوا کہ باتفاقِ رائے بھی کوئی را
دیجائے تو عقل کو بھی کام میں لانا چاہیے چونکہ ان کے کلام میں خود ضعف تھا ایک
مقابلہ میں کئی کو کہہ رہے ہیں "اے فرعون بادشاہ تیری عقل کہاں چلی گئی" فرعون
کہہ دیا بہت اچھا حالانکہ بادشاہ کی عقل بھی بادشاہ ہوتی ہے ان کی رائے میں دب گ
اس پر دبدبہ آگیا افسر ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ سوچے اور غور کرے۔

ایمان پر بات چلی تھی دربار آئے فرعون نے جادوگروں سے کہا کہ مو
علیہ السلام جادو لائے ہیں ان کا مقابلہ ہے انہوں نے کہا بہت اچھا لیکن ہم اگر غالب
گئے یعنی کامیاب ہو گئے تو ہمیں اونچے سے اونچا صلہ کیا ملے گا؟

قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ○ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُ
اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○ (پ۱۹۔ ع۷)

فرعون سے کہنے لگے کہ اگر ہم غالب آگئے تو کیا ہم کو کوئی بڑا صلہ ملے گا
فرعون نے کہا کہ ہاں اور تم اس صورت میں مقرّب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے۔
جملہ بول کر بتا دیا کہ قرب سے زیادہ کوئی دوسری چیز مانگنے کی نہیں ہے اور تقرب ملنے
پر بھی کوئی چیز اس کے مقابل کی نہیں۔

اسی تقرّب کو ذاتِ باری تعالیٰ نے بندگانِ مومنین متقین کے لئے یوں فر
دیا کہ اس میں میرا تقرّب ہے تم میرے مقرّبین میں سے ہو، من تقرب منی شبر
...... الخ معلوم ہوا کہ تقرّب جس کو حاصل ہو جائے اس سے زیادہ اور کوئی چیز "اعظم

صلہ نہیں'' دُنیاوی مخلوق یہ صلہ بیان کر رہی ہے خالقِ برتر اپنے متبعین کو تقرّب کا صلہ بیان فرما رہا ہیں کہ تم میرے مقرّبین میں سے ہو کتنی حوصلہ افزائی بیان فرمائی ہے'' اس ذاتِ حق کے ساتھ طاعت کی طرف کامل رغبت ہو اور معصیّت سے بالکلیہ کامل نفرت ہو یہی قربت ہے اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہو اور وہ جو کچھ چاہتے ہو اس لئے کہ حُکم کی تعمیل ہے کہ میرے تقرّب کا جو محل ہے وہ جنت ہے ورنہ اصل چیز تقرّب ہی ہے۔

یہیں سے مسئلہ نکل آیا کہ مخلوق مخلوق کی کامیابی پر یوں کہہ رہی ہے کہ تم یقیناً میرے مقربین میں سے ہو گے وہ احکم الحاکمین فرماتا ہے تمہاری طاعتِ کاملہ پر میرا تقرّب حاصل ہے۔

مدّعی نہ بنے :

پھر جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تم ڈالو گے یا ہم ڈالیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیونکہ ایمان فراست ہے حقائق پر نظر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم ہی ڈالو اَلْقُوْا موسیٰ علیہ السلام نے مدّعی بننا نہیں چاہا مقابلہ میں پیش قدمی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ مدّعی کے ذمہ ثبوتِ دعویٰ کے لئے بڑی مضبوطی اور بڑی ذمہ داری ہوتی ہے اور مدّعی علیہ کے لئے اتنی مضبوطی نہیں اس لئے مدّعی بننا نہیں چاہا۔ نبی ہیں اور معجزہ دیا ہوا ساتھ ہے لیکن پھر بھی اپنے عجز کا اظہار فرما رہے ہیں اپنے دعوے کا اظہار نہیں فرما رہے۔

عجز اور تفویض مسئلہ سلوک وتصوّف ہے :

موسیٰ علیہ السلام نبی ہو کر دعویدار نہیں بنے۔ اس لئے کہ نبوّت کے لئے عجز اور

تفویض لازم ہے اپنے تمام کاموں کو سپُردِ خدا بحکمِ تعمیل استعمالِ اسبابِ صحیحہ ہو۔ نبی نے ہر جگہ یہی کہا : اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ مسئلہ سلوک وتصوّف آ گیا جو کہ شریعت کا اعظم جُز ہے عجز کا تعلق اعضاء اور ظاہری جسم سے ہے اور تفویض متعلق بالباطن ہے اور باطن وہ قلب ہے لہٰذا قلب میں انتہائی درجہ کا عجز اور تفویض ہو۔ جب یہ آ جائے تو سارے امراضِ نفسانی ختم ہو جائیں گے۔

انسان کا ذاتی حق عجز اور خدا تعالیٰ کی کبریائی ہے :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَہُ الْکِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اپنے تمام کاموں کی کامیابی میں تفویض یعنی سپُردِ خدا ہوا گر اس پر نظر ہو تو اس کام والے کو تسلّی، سکونِ قلبی کس درجہ کا اور چین کس درجہ کا ہوگا اور یہ ایمان اجمالی حِکمت پر ایمان ہے کہ جو میرے لئے ہو گا اس میں کوئی حِکمت و مصلحت ہو گی اور اس میں مغفرت ہو گی تو سکون و چین قلب کو حاصل ہوگا اور یہی اصل چیز ہے۔

اولیاء اللہ جو بے چین نہیں ہوتے اسی وجہ سے کہ ان کا تعلّق قلب سے ہوتا ہے اور قلب میں انتہائی عجز ہوتا ہے اسی وجہ سے انکا قلب بے چین نہیں ہوتا اگرچہ جسم کو بے چینی ہو جائے کیونکہ قلب مجرّد ہے اور جسم مرکب ہے اگرچہ جسم کو گھبراہٹ و بے چینی ہو جائے۔ یہ آہ آہ کرنا جسمانی بے چینی کا ظہور ہے یہ قلبی بے چینی کا ظہور نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ بیمار ہو گئے، کیا انہوں نے زیادہ کھا لیا تھا پیٹ بھرنے کو بھی کھانا پسند نہیں کرتے تھے اور کیا نبی بیمار نہیں ہوتے؟

حضرت تھانویؒ کا ایک صاحب کو مؤاخذہ کرنا :

گرمی کا موسم ہے نماز حضرت والا خود پڑھاتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد اپنی

جگہ پر لوگ ذکر و تلاوت کے لئے بیٹھ گئے، مسجد کے صحن میں ایک صاحب قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہے تھے ایک صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کر جو کہ عالم بھی تھے ایک تلاوت کرنے والے کے پاس جا کر قریب بیٹھ گئے۔ سہ دری سے حضرت کی نظر پڑ گئی کہ وہ صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کر جو اپنے معمول و تلاوت میں لگے ہوئے تھے جا کر ان کے پاس بیٹھ گئے۔ ان کو بُلایا حاضر ہوئے: فرمایا تم اچھے خاصے بیٹھے ہوئے تھے اپنی جگہ سے کیوں اُٹھے؟ پہلا سوال یہ ہے۔ حضرت میں ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ پشت آپ کی طرف ہو رہی تھی اس لئے اُٹھا۔ ظاہر ہے کہ پیر صاحب اور پشت یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کسی کی طرف بھی کرنا ہے بے ادبی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جگہ تو بہت کُشادہ تھی آپ اس جگہ کو چھوڑ کر ان کاموں میں لگے ہوئے اُن کے پاس جا کر کیوں بیٹھ گئے؟ کوئی جواب نہیں اور عالم ہیں اور ذی اِستعداد ہیں کوئی جواب نہیں۔ اچھا آپ نے سُنا نہیں میں پھر کہتا ہوں تیسری مرتبہ کہنے اور جواب نہ ملنے پر پوچھا اور کہا! انتقالِ ذہنی کرار ہے ہو۔

ایک صحابیؓ کے بِلا استیذان دُخول پر فعلی تعلیمِ نبویؐ:

اس مطالعہ اور روک ٹوک پر حضور ﷺ کا ایک واقعہ پیش کیا تھا آپ ﷺ خیمہ شریف میں ایک صحابیؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے گفتگو فرما رہے تھے، ایک صحابی آئے اور خیمہ سے پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہو گئے نہ سلام کیا اور نہ اجازت لی بیٹھ گئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی کے گھر میں آنے کی ابتک آپ کو آیت معلوم نہیں۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بیوتا غیر بیوتکم حتیٰ تستا نسوا و تسلموا علیٰ اھلھا۔ (پ۱۸۔ ع۱۰)

اے ایمان والوتم اپنے گھروں کے سوادوسروں کے گھروں میں داخل مت ہوجبتک کہ اجازت حاصل نہ کرلواوران کے رہنے والوں کوسلام نہ کرلو۔ بلکہ اپنے گھر میں بھی شاید کوئی پردہ دارعورت آئی ہویااپنی گھروالی ہی نہ معلوم کس طرح بیٹھی ہوئی ہواورشرماجائے اچانک میاں کے آنے پر۔

حضورﷺ نے فرمایاباہرجاؤ مطالعہ کرایاجارہاہے جاؤاورخودتعلیم کردیتے کہ پیغمبرہیں خودطریقہ نہیں بتلایابلکہ جوصحابی بیٹھے ہوئے تھےان سے کہاذراباہرجاکران کو تعلیم دواس سے جاکرکہوکہ کس طرح آناچاہیے۔ حضورﷺ خودبھی فرماسکتے تھے مگر اہتمام دلاناتھاتاکہ اوقع فی النفس ہوجائے دِل میں بیٹھ جائے۔ خیروہ توحضورؐ کی بات ہے کوئی بات کہنی نہیں؛توصحابی سے ایک قسم کاجُرم ثابت ہوگیااب اس کامطالعہ کرایا کہ یہ ذہن کی لاپرواہی اوربےخبری کیسی۔

حضرت تھانویؒ کے روک ٹوک کرنے کی غرض :

اس پرحضرت والافرمایاکرتے تھے کہ میں جواپنے پاس آنے والے سے روک ٹوک کرتاہوں اس لئے کرتاہوں کہ ان میں فکرپیداہوجائے بس اس کے سوامیراؔ کوئی اورمقصودنہیں اوربےفکری انتہائی درجہ کی بلاہے۔اورفرمایاکہ ایک ہزارسال تک ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ہوئی لیکن آخرمیں بےفکرہوگئے نتیجہ یہ ہواکہ سلطنت ہاتھ سے نکل گئی، یہ بےفکری اتنابڑاجرم ہے۔

آدمی بننامشکل ہے :

اسی کوحضرت والافرمایاکرتے تھے کہ جس کوقطب بنناہواورغوث اورکیاکیا کسی دوسری جگہ چلے جاؤاورجس کوآدمی بنناہومیرے پاس آجاؤ بفضلہٖ تعالیٰ آدمی پہلے

بنو تو گویا ایمان پر خاتمہ ہوگیا، اگر ایمان کامل ہونے میں ذرا کمی ہے تو کامل نہ سہی کچھ نقص ہے تو جنت میں جائے گا۔ اب اللہ تعالیٰ چاہے دخولِ نار کے بعد مؤمن کو بھیج دیں تو جنت میں چلا گیا مگر دخولِ اوّل بخلودِ جنت وہ تو مؤمنِ کامل کے لئے ہی ہے۔ بعنوانِ دیگر دخولِ اولیٰ بلا دخولِ النار بخلودِ جنت۔ تو یہ دخولِ جنت مقربین ومخلصین ایمان کے لئے ہے لیکن بلا دخولِ نار یہ کون سا مسئلہ ہے پھر مؤمن کو خطاب کیوں کیا کہ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ کہ دوزخ کو کافروں کے لئے بنایا گیا ہے تمہارے لئے نہیں۔ اگر تمہارے کاموں میں بھی ایسی کوئی شبہ کی چیز آگئی تو پھر دخولِ نار تمہارے لئے بھی ہے۔

فکر واصلاح کی تعلیم :

الغرض وہ عالم صاحب بیٹھ گئے ان کی سمجھ میں نہیں آیا حضرت والا نے فرمایا میں دریافت کرتا ہوں کہ آپ اس طرح معمول میں' تلاوت میں مشغول ہوتے اور جس طرح آپ جا کر بیٹھ گئے آپ کے اس طرح کوئی قریب جا کر بیٹھ جاتا تو آپ کے دل پر بوجھ پڑتا یا نہ پڑتا آپ کے کام میں انتشار ہوتا یا نہ؟ اب انہوں نے کہا سمجھ میں آگیا۔ فرمایا ہاں جب آپ کے دل پر بوجھ پڑا تب سمجھ میں آیا یہ بے فکری...... آپ نے اس عمل سے پہلے کیوں نہ سوچا کہ میں ان کے پاس جا کر بیٹھوں یا نہ بیٹھوں، اور جب جگہ نہ ہو تو معذوری ہے تو کیا ان کے دل پر بوجھ نہ پڑے گا، مطالعہ کرایا یہی اسلام ہے یہی مسلمان ہونا ہے۔

غلطی کا تدارک :

تو پھر جب غلطی دُشمن نفس سے ہوگئی تو اس غلطی کا کچھ تدارک کرنا چاہیے کیا تدارک ہو سوال ہوتا ہے۔ حضرت نے فرمایا غلطی آپ سے ہوئی اور اسکی تلافی کی

صورت آپ خود سوچیے، مطالعہ کرایا جا رہا ہے یعنی طالبِ تزکیہ کو نامناسب اور خلاف بات ہونے پر دُشمن نفس کو سزا دینی چاہیے جُرم کا تدارک خود سوچو مطالعہ ہو رہا ہے آج تو شیخ کے پاس ہو وہ برابر کہتا رہے تو مطالعہ کا مزاج بن جائے گا فکر کا مزا بن جائے گا۔ شیخ سے الگ ہو کر نامناسب حرکتوں پر تدارک کا طریق معلوم ہو جائے گا ایسے ہی کو شیخ کہتے ہیں ورنہ پیر تو دُنیا میں بہت ہیں وظیفہ دو وظیفہ کی رٹ بتا دینا ان کا کام ہے اور شیخ تو تصوف و سلوک کا فن جاننے والے کو کہتے ہیں آخر وہ مولوی صاحب کہنے لگے حضرت لوگ جو مسجد میں نماز پڑھتے ہیں انکے جوتے سیدھے کر دیا کروں گا؛ واہ واہ! نفس بھی بڑا اُستاد ہے اس پر تو آپ کی تعریف وخوبی لوگوں میں سمجھی جائے گی کہ صوفی لوگ کیسے مسکین الطبع ہیں جوتے ٹھیک کر رہے ہیں اس پر تو اور مدح ہوگی نہیں اور سوچو؛ کہنے لگے وضو کرنے کی جگہ اور نالیاں صاف کر دیا کروں گا؛ واہ واہ! یہ تو اس سے بھی زیادہ قابلِ مدح ہوگا کہ یہ صوفی لوگ بہت مسکین دل ہوتے ہیں، دیکھو نالی صاف کر رہے ہیں یہ تو اور مدح کی بات ہے اور مدح میں نفس پر کیا زور پڑتی وہ تو اور خوش ہوگا؟ حضرت خانقاہ سے چلا جاؤں گا؛ ہاں یہ ٹھیک ہے یہ ہے تدارک اور سزا، چلے جاؤ خانقاہ سے۔ اُٹھ کر چلے، اچھا ذرا سنو! کہاں جاؤ گے......؟ لوہاری جاؤں گا۔

خود صاحبِ زیارت بنیئے:

آجکل لوگوں کو مزارات پر جانے کا بہت شوق ہے کہ وہاں جا کر نفلیں پڑھیں گے تبرک و برکت حاصل ہو جائے گی دُعاء کرلوں گا گو یہ یہ ایک سہل نسخہ ہے اپنے نفس کو قابو کرنے میں، اسلام کے اعمال کو اختیار کرنے کا، سرہند شریف مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر جاتے ہیں اس کا انکار نہیں لیکن جو اصل چیز ہے وہ نمازِ پنجگانہ جماعت کے ساتھ

ہے اور دربارِ الٰہی میں دُعاء و درخواست کرتے رہنا یہ چونکہ بوجھ ہے اور زیارت تو ایک شوق ہے، ارے خود صاحب زیارت کیوں نہیں بنتے! ایمان کے ساتھ تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ایمانِ کامل اختیار کرنے کا اہتمام کیوں نہیں کرتے کہ صورت، وضع، قطع، لباس اسلامی تقاضے کے مطابق نہیں اس وقت کافر مسلمان کی پہچان کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ نام پوچھا جائے تو معلوم ہو۔ یہ جزئیاتی چیزیں ہیں جو ضمناً آگئیں۔

بات ان عالم صاحب کی تھی کہ کہاں جاؤ گے؟ لوہاری۔ حضرت والا نے خیال فرمایا کہ وہاں ان کی جان پہچان والا کوئی نہیں! اکیلے ہوں گے اور دُشواری ہو گی۔ فرمایا ''لوہاری مت جاؤ ذرا دور بھی ہے تھانہ بھون سے جلال آباد چلے جاؤ'' میں یہاں تھا تا کہ دوسرا دوست ملے دوسرے دوست کی بات شروع ہوئی تھی زیارت کی ممانعت کردی اور زیادہ سکون کی بات فرمائی کہ جلال آباد چلے جاؤ تھانہ بھون سے قریب ہے سفر بھی قریب ہو گیا اور سکون بھی ملا کہ دوسرا مل جائے گا۔ وہ یہاں آگئے مُلاقات ہوئی، سلام مصافحہ کے بعد پوچھا کہ بھائی کیا بات ہوگئی۔ انہوں نے واقعہ بیان کیا، اچھا دو لفافے منگوالو۔ لفافے منگوائے اور حضرت والا کو پورا واقعہ لکھا کہ یہ اپنے اعترافِ قصور کرتے ہوئے طلبِ معافی کرر ہے ہیں جواب آگیا دل میں صاف، سب معاف تشریف لائیے، چلے گئے یہ مطالعہ کی بات ہو رہی ہے۔

یہ بات اس پر چلی تھی کہ عجز انسان کا ذاتی حق ہے اسی چیز کی سلوک میں پیدا کئے جانے کی کوشش اور سعی تام ہوتی ہے اور جب یہ آجائے تو تکبّر چلا جائے گا اور اسباب کا استعمال صحیح بحدِ جوازِ شرعی لیکن کامیابی پر نظر نہ ہو بلکہ تفویض جو کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ذاتی حق ہے یہ چیز ہے تعلیم حاصل کرنے کی اس پر نظر ہے۔

جادوگروں کا ایمان اور فرعون کی دھمکی :

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نہیں بَلْ اَلْقُوْا یعنی تم ہی ڈالو۔ جادوگروں نے لاٹھیاں رسّیاں وغیرہ ڈال دیں سارے کے سارے سانپ بن گئے اب موسیٰؑ اکیلے ہیں۔

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ۝ وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا۔ (پ۱۶۔ ع۱۲)

یعنی موسیٰؑ کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا ہم نے کہا کہ تم ڈرو نہیں تم ہی غالب آؤ گے اور یہ تمہارے۔ دائیں ہاتھ میں جو ہے اس کو ڈال دو، لوگوں نے جو کچھ بنایا ہے یہ سب کو نگل جائے گا۔

وہ تو دیکھ ہی چکے تھے بس فوراً ڈال دی وہ لاٹھی برکتوں سے بھری ہوئی۔ وہ اژدھا بن گیا اور سب جادوگروں کے سانپ بنے ہوئے کو نگلنے لگا تم تو میرے بچے ہو آ جاؤ پیٹ میں جادوگروں کا جادو حیران ہو کر رہ گیا اور سب بول اُٹھے چونکہ سارے فن سے واقف تھے فوراً سمجھ گئے کہ یہ فنِ جادو نہیں ہے۔ جس چیز کا یہ دعویٰ کر رہے ہیں یعنی نبوّت اور رسالت کا وہ صحیح ہے۔ بصیرت آ گئی بصارت سے دیکھا تھا بول اُٹھے۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ ھٰرُوْنَ وَمُوْسٰی ہم تو ایمان لے آئے۔ ایمان کا لفظ آیا ہے جس کا نام تصدیقِ قلبی ہے جس میں تکذیب کا وہم تک نہ ہو۔ بس فرعون کو غصہ آیا کہ ان جادوگروں نے ہار مان لی، بولا قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ۔ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ۔ وہ سب کے سب اپنی نظر میں ذلیل عاجز ہو کر تکبّر مٹا کر ایمان لا کر کامل ایمان والے ہو گئے فرعون کا غصہ اُتر آیا اور چال چلی رعیت کے

سامنے کہ یہ تو ملی بھگت معلوم ہوتی ہے یہ ان کا اُستاد ہے جس کا نام موسیٰ علیہ السلام ہے یاد رکھو بلا میری اجازت کے اٰمنتما...... باز آجاؤ ورنہ تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر کاٹ کر پھینک دوں گا، فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَکُمْ وَ اَرْجُلَکُمْ مِنْ خِلَافٍ وَّ لَاُصَلِّبَنَّکُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَا اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰی۔ تم کو سولی پر چڑھا دوں گا اور ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا۔ جادوگروں نے جواب دیا، قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ۔ اِنَّمَا تَقْضِیْ ھٰذِہِ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا۔ یہ ہمارا ایمان ایسا نہیں ہے جتنا تم ستا سکتے ہو ستاؤ۔ ہاتھ پاؤں کاٹ دو سولی پر چڑھا دو یہ ہے ہمارا ایمان۔ دیکھو اوّل وہلہ ہی میں ابھی نماز بھی نہیں پڑھی تھی بلکہ نفسِ ایمان ہے۔ اس طرح کی تفویض و جزم کہ خلاف کا احتمال ہی نہیں ہے کتنے ڈٹے ہوئے ہیں۔

استقامت پر خوشخبری:

اور ڈٹے ہوتے ہی ذاتِ باری تعالیٰ کے یہاں مقبول ہیں لہٰذا عامۃً خطاب سب مؤمنوں کو کر دیا بتصدیقِ قلبی و اقرارِ لسانی سے جنہوں نے رَبُّنَا اللّٰہُ کہا اور ثُمَّ اسْتَقَامُوْا پس یہ ہے وہ جو کہا کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے اور اس پر جمے رہے ان کے لئے خوشخبریاں ہیں تو کیا نفسِ ایمان حاصل ہے اس کو کامل کرنے کی ضرورت نہیں ہے ؟ کیا سو روپے والے کو عُرف میں مالدار کہا جائے گا۔ آج کل تو ایک ہزار روپیہ بھی کسی کے پاس ہو تو اس کو لاکھ روپیہ والا کہتا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں۔

پہلے زمانے میں جس کے پاس سو روپے ہوتے تھے لوگ کہتے تھے یہ تو بڑا مالدار ہے اور آج ایک ہزار روپیہ والا بھی گنتی میں نہیں آتا۔ جب دُنیا کی دولت میں یہ

حال ہے تو دولتِ ایمان میں کس طرح نفسِ ایمان پر قناعت ہو رہی ہے کمالِ ایمان کی طرف حرص نہیں۔ بالفاظِ دیگر دُنیا کی دولت پر قناعت نہیں جو کہ فانی ہے اور ایمان کی دولت جو کہ باقی ہے جو یہاں بھی اور وہاں بھی کام آتی ہے اس میں کمالِ ایمان کی ضرورت نہیں وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی۔ حالانکہ آخرت بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے اللہ تعالیٰ ہمیں کمالِ ایمان کی توفیق عنایت فرمائیں۔ جادوگروں کا کمالِ ایمان کہ ابھی نماز بھی نہیں پڑھی اور اس درجہ کا ایمان حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ:

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَلَنَا خَطٰیٰنَا وَمَآ اَکْرَھْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ۔ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی۔ اے اللہ یہ بڑے ظلم کرنے والے ہیں ہماری ہدایت اور ایمان کو کامل رکھیئے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ظلم وستم اور مصائب کی وجہ سے طبیعت میں خلاف ہو کر کوئی چیز ہمارے ایمان کے خلاف ہوجائے ہم چاہتے ہیں کہ جو ہمارا ایمان ہے اور آپ کے علم میں ہے اس ایمان کو آخر وقت تک باقی رکھیئے گا۔

ایسے ایمان ہونے کے باوجود اپنے عجز اور ایمان کی بقاء کو تفویض، سپردِ خدا کررہے ہیں اور زیادہ کمالِ ایمان کی اور تقویت کی درخواست کررہے ہیں۔

حصولِ شئی سے زیادہ حفاظتِ شئی مشکل ہے:

کسی چیز کا حاصل کرنا اتنا مشکل اور دشوار نہیں جتنا کہ حاصل شدہ کا محفوظ رکھنا مشکل ہے اور پھر ہمارا ایمان وہبی یعنی عطا کیا ہوا ہے خاندانی طور سے ملا ہوا ہے تو اس ایمان کا محفوظ رکھنا کیا کھیل ہے؟ اس آئے ہوئے ایمان کو موت کے وقت تک محفوظ رکھنا بہت مشکل ہے۔ ذرا سی دیر میں پلک جھپکنے میں نکل جاتا ہے پتہ بھی نہیں چلتا اس کی حفاظت آخر وقت تک قائم رکھنے کے لئے دوسرے سامان چاہئیں۔ ان کو

استعمال کرتے رہنے سے ایمان محفوظ باذن اللہ اور پھر ڈٹے رہے بتقاضائے ایمان تو فرشتے ساتھ ہولیں گے۔

تفصیلِ ایمان :

لہٰذا اس عالمِ غیب سے جو تم نے بتقاضائے ایمان اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ پر بَلٰی کہہ کر میری ذات اور میری صفات پر بکمالِ اعتقاد ایمان سے بول اُٹھے کہ ہمارا پیدا کرنا فضول نہیں ہے اس مغیبات میں جو بھی غایت ہو وہ ہمارے لئے موجود ہوگی ہم ان پر ایمان لائے ہیں اور ملائکہ کا بھی وجود ہے۔ اس مخلوقِ ملائکہ پر بھی ہمارا ایمان عالمِ شہود میں تھا اور نیز ہمارا ایمان اور ہے اور ان کے سوا آخری نبی ﷺ پر بھی ایمان ہے اور جو کتابیں آئی ہیں ان پر بھی ہمارا ایمان ہے اور ہم سمجھ گئے کہ اس عالمِ شہود میں ان اعمال کا صلہ نہیں ہوگا بلکہ اور کوئی عالم ہوگا جس میں کامل صلہ ہوگا پھر لوٹ کر اعمال سے فارغ ہوکر آپ کے پاس آنا ہوگا اور اس حیات کے بعد ممات ہوگی اس پر بھی ہمارا ایمان ہے اور ایمان واعمال کا جو حساب وکتاب ہونا ہے اس کے لئے عالمِ حشر ہے اس پر بھی ہمارا ایمان ہے حساب وکتاب پر بھی ہمارا ایمان ہے اور حساب وکتاب کے اعتدال پر ہمارا ایمان ہے ترازوئے عدل رکھی جائے گی۔ میزانِ عدل پر ہمارا ایمان ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی ذات وصفات پر اس طرح سے ایمان لانا کہ اوّل ہی وہلہ میں ایسا ایمان ہوگیا جیسا کہ عالمِ شہود میں جادوگروں کا ایمان ہوگیا کہ ہم ایمان لائے اب تم جو چاہو کہہ لو کر لو۔

اب مغیبات پر ایمان کے ساتھ عالمِ شہود میں بھیج دیا اب اسی ایمانِ حاصل شدہ کے لئے جو کہ ایمان کا طریق ہے اس کا استعمال کرنا ضروری ہے کہ وہ احکام جن کو

شریعت کہتے ہیں مؤمن کے لئے شریعت کا طریقت بن جانا اسی لئے مبایعت یعنی بیعت کا ہونا کہ ذاتِ باری تعالیٰ سے اس مغیبات میں بیعت ہوئی تھی تو اس کا شہود اس عالمِ شہود میں بطریقِ نائبینِ نائبِ رسول ﷺ سے بیعت ہوئی، بعثتِ رسول ختم ہوگئی، اب ان کے نائبین بمشابہ رسول ہیں تو قیامت تک کا سلسلہ شیوع یعنی اصلاح بحصولِ کامل طریق کہ شریعت طبیعت بن جائے۔ اب طبیعت شریعت بن کر موجودیّت نے پلٹا کھایا گویا کہ معصیّت سے موصومیّت کی طرف آجائے۔

حق تعالیٰ کا غایتِ لطف وکرم:

ایک شاعر فرماتے ہیں ....

کرم بین ولطفِ خداوندگار　　　گناہ بندہ کردہ است اوشرمسار

اس کا کرم اور اس کا لطف تو دیکھو کہ بندہ ہوکر بندگی سے ہٹ کر معصیت کی طرف جارہا ہے میرا ہوکر مجھے شرم آتی ہے جیسا کہ باپ کہتا ہے کہ بیٹا تیرا کیا بگڑا تو تو کرگزرا لیکن تو نے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا ایسے ہی حق تعالیٰ کا کرم دیکھو۔ اور حق تعالیٰ نے پیچھا نہیں چھوڑا جیسے باپ بیٹے کا پیچھا نہیں چھوڑتا طرح طرح کے طریقے اختیار کرتا ہے اگر بیٹے کو آزاد چھوڑ دے تو وہ تو اور بگڑ جائے۔ چونکہ باپ بھی ربِّ مجازی ہے بیٹے کو طرح طرح سمجھاتا ہے کہ تم کہاں جاکر بیٹھتے ہو اور رات کو کہاں جاتے ہو۔

بھلا ذاتِ باری تعالیٰ اپنی مخلوق کا کیسے پیچھا چھوڑنا چاہے گا، کچھ بھی ہو جائے باپ ہونے کا جو فرائض منصبی میں سے ہے اس کے حق پر امتثالاً عمل ہونا چاہیے کہ بچے کو راہِ ھدایت اور صراطِ مستقیم کی طرف پیار و محبت سے نصیحت کرے شیریں

الفاظ ہوں لہجہ نرم ہو تالیفِ قلب کر کے تربیت کرو۔

انسان صاحبِ اختیار ہے:

جب ذاتِ باری تعالیٰ نے انسان کو وجود بخشا کہ جسے صاحبِ الاختیار بنا کر اس عالمِ شہود میں بھیجا، تو ساری کی ساری ذمہ داری اس پر عائد ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اللہ ایسا ہے جس نے تمھیں زمین میں صاحبِ اختیار بنا کر بھیجا اور تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا تو پھر خلیفہ کچھ کام کرے گا یا نہیں؟ اور جب تم صاحبِ اختیار ہو تو یوں نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے اختیار سے کوئی چیز باہر ہے ۔لہٰذا جو بھی میں کہوں گا تمہاری جان کے بارے میں تمہارے مال کے بارے میں پھر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہمارے اختیار سے باہر ہے اور صاحبِ اختیار جیسا عمل اختیار کرے گا فرمانبرداری یا نافرمانی اس کے ساتھ اسی کے مطابق مناسب معاملہ کیا جائے گا کیونکہ بالیقین آپ کا ربّ جلد سزا دینے والا ہے اور بالیقین وہ واقعی مہربانی کرنے والا ہے بس نافرمانوں کے لئے عقاب ہے اور فرمانبرداروں کے لئے رحمت ہے اور نافرمانی سے فرمانبرداری کی طرف آنے والوں کے لئے مغفرت ہے۔

لہٰذا ذاتِ باری تعالیٰ کے جو احکام ہیں ان کو طبیعت بنالو یعنی شریعت کو طبیعت بنالو پھر آخرت کی کامیابی متقیوں کے لئے ہی ہو گی۔ تو تم اے ایمان والو! ایمان لا کر متقی بنو اور اپنے ایمان کو کامل ایمان بنا کر رہو، عالمِ مغیبات پر ایمان، اُمورِ مغیبات کے ساتھ ساتھ اس عالمِ شہود میں انکا ابتلاء وامتحان ہے تو شریعت کو طبیعت بنانا چاہیے اس کے جو طُرق ہیں اُن کو استعمال میں لانا چاہیے۔ چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ کا مطالبہ ہم سے ایمان کا ہے جو کہ شریعت ہے اسی وجہ سے ابتلاء کا حُکم ہے اس کے

لئے ضرورت ہے مبایعت کی۔

تاریخ بیعت ومبایعت :

لوگ پوچھتے ہیں کہ بیعت کا جواز کہاں سے ہے سو یہ عالمِ میثاق سے نکلی اور اس عالمِ شہود میں عالمِ مغیبات کو بطورِ شہادت عمل میں لانے کے لئے کہ جس کا خلاصہ اس ایمان کو جو کہ شریعت ہے اور اس کی باتوں پر چلنے کے لئے بیع وشرا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ مؤمن ہو گئے تو تقویٰ آ گیا نفسِ شرک وکفر کو چھوڑ کر یہ تقویٰ نہیں مگر اس پر کیا فرمایا؟ کمالِ ایمان چونکہ جہاں سے گئے ہو وہیں پھر تم آ جاؤ گے۔ تمہاری جان اور تمہارا مال جو کہ مختلف قسم کا ہے وہ سب کا سب میرے حکم کی تعمیل میں صرف کرو چونکہ تم نے اپنی جان اور اپنے مال کو میرے سپرد کر دیا ہے اب تمہارا کوئی حق اس میں نہیں رہا۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے، میرے مرنے کے بعد اے اللہ آپ ہی وارث ہیں تو ہمارا مرنے کے بعد بھی وارث باری تعالیٰ ہیں جو کہ الحیُّ القیُّوم ہیں، اس مرنے والے کے بعد وارث ہیں لہٰذا دنیا میں جو ترکہ چھوڑا ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔

لہٰذا اے لوگو ان وارثوں پر جہاں میں کہوں خرچ کرو وراثت تقسیم کرو باپ کا اتنا حصہ، ماں کا اتنا حصہ بیٹی کا اتنا حصہ وغیرہ وغیرہ۔ تو حقیقتاً وارث اللہ تعالیٰ ہے اس لئے تم سے جس کو جب چاہوں بلا لوں اور جو مال چھوڑا جائے وہ میرا ہے۔ اسی واسطے میں نے پہلے ہی شریعت کا جو قانون وحکم قائم کر دیا بس تم اس پر چلو اور اگر تم کو معلوم نہیں تو قانون دان سے پوچھو، اس کے مطابق تقسیم کرو اگر ایسا نہیں کیا تو پھر تم میرے کہاں ہوئے۔ یہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ پر ایمان کی انتہا۔

چونتیسویں مجلس

معیّتِ صادقین کے بغیر حقیقت شناسی کا حصول نہیں ہوتا

۲۴ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق ۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء بروز چہارشنبہ بوقتِ صبح

اِصلاح کے لئے طویل مصاحبت کی ضرورت :

اصلاح کے بہت جزئیات ہیں بڑے عرصے کی طویل مصاحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب بنتا ہے آدمی اور جب آدمی بن جائے تو اس سے ایذاء کا سوال ہی نہیں۔ آزار کہتے ہیں تکلیف کو تو پھر اس سے کیا تکلیف پہنچ سکے؟ چونکہ ایذاء تو جانوروں سے ہوتی ہے آدمی سے نہیں، معلوم ہوا کہ وہ عابد تو بن گیا مگر ابھی آدمی نہیں بنا۔

معمولات میں سہولت اور صحت کی رعایت سے دوام ہونا چاہیے :

بعض صحابہؓ نے حضرت عائشہؓ سے حضورِ اکرم ﷺ کے شب و روز کے

معمولات کے بارے میں پوچھے تھے۔ تو کسی نے کہا کہ میں بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا پوری رات جاگ کر عبادت کروں گا۔ کسی نے کہا کہ میں دن میں کوئی چیز نہیں کھاؤں گا ہمیشہ روزہ رکھوں گا وغیرہ وغیرہ۔ حضورِ اکرم کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور بیبیوں سے بھی ملتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی صحت و سہولت کا لحاظ رکھنا شریعت میں فرض ہے اس کو دیکھو اور اس کو دیکھو کہ کسی ضروری کام ضرورتِ دُنیویہ جو کہ وہ دُنیویہ نہیں ہے اس میں فرق نہ آجائے، نہ اپنی ذات کا، نہ اور کسی کا سہولت و صحت ہمیشہ ملحوظ رکھنا یہ فریضۂ شرعی ہے اپنی سہولت و صحت کو دیکھ کر دوام ہو اور اگر کبھی ناغہ آجائے لیکن یہ ناغہ تکاہل و تساہل کی وجہ سے نہ ہو تو یہ بھی دوام ہے یہ قید لگادی کیونکہ یہ تو عذر ہو گیا۔

اسی سے جواب نکل آیا کہ اگر کوئی عذر پیش آگیا تو عذر سے ناغہ ہونا کوئی ناغہ نہیں جب معمولات دوام کے ساتھ ہیں تو وہ بھی دوام ہی ہیں خلافِ دوام نہیں ہیں۔

بُرا ولیمہ :

دعوتِ ولیمہ کرنا سُنّت ہے اور منجملہ عباداتِ نافلہ میں سے ہے اور ہر عبادت کے کچھ شرائط ہوتے ہیں تو ولیمہ کے بھی کچھ شرائط ہوں گے۔

حدیث شریف میں آیا ہے : شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُدْعٰى اِلَيْهِ الْاَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْمَسَاكِيْنُ ۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ بُرا کھانا ولیمہ کا کھانا ہے کہ اس ولیمہ کی طرف امیروں کو بُلایا جائے اور غریبوں کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ جو اپنے خاص رشتہ دار امیر ہوتے ہیں انکو تو بُلایا جاتا ہے اور جو غریب ہوتے ہیں ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس ولیمہ کا کھانا شر ہے۔

ایک ریاء کار مالدار کی حکایت :

ایک شخص نے جو کہ مالدار تھا شادی کی اور خوب ولیمہ دیا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب بہت سستا تھا اور اس نے خوب کھلایا اور ہر باراتی کو دو دو اشرفی دی بارات رُخصت ہوگئی اب یہ شخص جہاں سے لوگ گزر رہے تھے راستے کے کنارے جھاڑی میں بیٹھ گیا۔ کسی ایک نے بھی تعریف کا کلمہ نہیں کہا ایک باراتی کی گاڑی ابھی کچھ فاصلے سے آرہی تھی صرف دو آدمی ایک گاڑی سوار تھے، سامنے سے جب قریب گزری تو اس نے کان لگائے کہ یہ کچھ تو کہیں گے۔ تو گاڑی چلانے والے نے کہا کہ واہ واہ! ایسی شادی آج تک نہیں دیکھی ارے دیکھو تو سہی ہر باراتی کو دو دو اشرفیاں بھی دے دی..... تو اس بیٹھنے والے نے کہا کچھ بھی نہیں دیا ارے وہ تو اتنا مالدار ہے کہ اگر چار چار اشرفیاں بھی دیتا تو بھی کم تھیں اس نے تو دو ہی دیں۔ سر پٹ کر رہ گیا کہ اس نے کیوں کھلایا۔

حضور ﷺ کا علماء سے خطاب :

حضور ﷺ نے خطاب فرمایا : اَلْعُلَمَاءُ اُمَنَاءُ الدِّیْنِ مَا لَمْ یُخَالِطُوا الْاُمَرَاءَ فَاِذَا خَالَطُوْھُمْ فَھُمْ لُصُوْصُ الدِّیْنِ۔ علماء دین کے امانتدار ہیں جب تک کہ امیروں کے ساتھ خلط ملط نہ کرلیں، اور اگر ان کے ساتھ خلط ملط کرلیں تو یہ دین کے چور ہیں۔

طلبِ صادق کا صحیح طریق :

جب تک طلب صحیح معلوم نہ ہو اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے اس کی دلیل

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ فرما رہے ہیں مشرکین کو دعوت دے رہے ہیں اتنے میں
نابینا صحابی عبداللہ بن اُمّ مکتومؓ حاضر ہوئے اور انہوں نے کچھ پوچھنا چاہا چونکہ نا
ہیں حضور ﷺ نے ان سے اعراض کرلیا کہ یہ تو اپنے ہیں پُرانے ہیں پھر بتادیں گے ا
یہ مسئلہ جو کہ یہ پوچھ رہے ہیں فرعی ہے اور اس وقت میں متوجہ ہو رہا ہوں رُؤسا
مشرکین کی طرف جو کہ مسئلہ فرعی نہیں اُصولی ہے اور فروع اُصول پر مؤخر ہیں تو صحا
پوچھ رہے ہیں حضور ﷺ بولتے نہیں ان کو شبہ ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ عِلم کا حصول صلوٰۃ
مقدّم ہے اور نماز متفرع ہے عقیدہ توحید پر، تو یہ مقدمہ فرعی بدیہی ہے نہ کی نظری۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اعراض کیا اور متوجہ اُن مشرکین ابوجہل وغیرہ کی
طرف رہے، تادیب ہوئی اور یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی۔ اَوْ یَذَّکَّرُ
فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی۔ (سورۃ عَبس۔ پ۳۰)

پیغمبر چیں بجبیں ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ اُن کے پاس
اندھا آیا اور آپ کو کیا خبر کہ شاید وہ سنور جاتا یا نصیحت قبول کرتا اس کو نصیحت کرنا فائدہ
پہنچاتا تو جو شخص بے پرواہی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑے ہیں۔

یوں نہیں کہا: عَبَسْتَ وَتَوَلَّیْتَ کیوں؟ یہ بیٹھنے والے سُنیں گے او ہو! حضور
ﷺ کو تنبیہ کی جس کو ڈانٹ کہتے ہیں اظہارِ گرانی کہتے ہیں اس کی بجائے غائب کا
صیغہ فرمایا کہ سمجھنے والا سمجھ جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تربیت کرنے والا عام صیغوں
سے اور عام عنوان کے ساتھ بات کرتا ہے شخص کے ساتھ خطاب نہیں کرتا۔ سُننے وا

طالبین بیٹھنے والے سمجھ جائیں کہ یہ بات تو مجھ میں بھی ہے یہ ہے بیٹھنے کا طریق۔

طلب کا طریق فکرِ آخرت کو لئے ہوئے دُھن و دھیان۔

طالب میں دُھن اور دھیان ہونا چاہیے :

حضرت شیخ حکیم الاُمّتؒ فرماتے ہیں کہ طالب میں دُھن و دھیان ہو۔ الفاظ یہ ہیں۔ ''روایت جب تک ہو سکے روایت باللفظ ہونی چاہیے اور مدلول کو لے کر اگر روایت کرے تو یہ روایت بالمعنیٰ ہے یہ بھی جائز ہے حدیث میں''۔

تو طالبِ اصلاح میں دو چیزیں ہوں دُھن اور دھیان بس اپنی دُھن ہو اور کوئی دھیان نہیں۔ اسی لئے ذاتِ باری تعالیٰ مربّی حقیقی نے ایسے کچھ کچے پن کا لحاظ نہیں فرمایا چنانچہ ارشاد فرمایا ہے :

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں مگر ہلکے ہلکے گناہ۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تھوڑی بہت باتیں مؤمنوں کی جبکہ وہ اجتناب کر رہے ہیں کبائر سے اور پرہیز کر رہے ہیں منکرات سے تو ان جیسے مؤمنین سے کچھ ایسی غلطی تھوڑی بھی ہو جائے میری اس پر نظر نہیں مگر تو اے مؤمن دوسروں کی تھوڑی بہت بات کرنے پر نظر رکھتا ہے اور اپنے پر کیسے کیسے اختلافات ہو رہے ہیں ان سے صَرفِ نظر، اس طرح پرکھو۔

مخاطب کو پہچان کر کلام ہونا چاہیے :

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مخاطب کو پہچانو۔ مخاطب کو جانچو اور کس عنوان

سے خطاب کرنا چاہیے لوگوں میں اس کے ساتھ کیا اعتقاد ہے کیا رُجوع ہے لوگوں کی نظر میں دینی اور دنیوی اعتبار سے کیسا ہے ادب و احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو خطاب کرنا چاہیے دل سوزی سے بچو دل آزاری سے بچو حاضراً غائباً کلام میں کہیں غیبت نمیمت کی بات نہ ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو خطاب ہو رہا ہے مگر صیغہ غائب کا ہے۔ بالفعل اللہ تعالیٰ نے وحی بھیج دی کہ یہ اُصول اپنی جگہ لیکن ایک دوسرا مقدمہ اور بھی ہے وہ یہ کہ یہ طالب ہو کر آئے ہیں اور وہ تو معاند ہیں تم اس کو پڑھاؤ اگرچہ مسئلہ فرعی ہے یہ مقدمہ اسی میں مطوی ہے۔

اولیاء اللہ کے لئے نظریات بھی بدیہیات ہوتے ہیں:

صاحب مرقاۃ نے شروع میں لکھا ہے کہ یہ مرقاۃ و منطق ہمارے لئے ہے اولیاء اللہ کے لئے نہیں۔ اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ چونکہ ان کے لئے تو نظریات بھی بدیہیات ہیں اور بدیہیات کے لئے نظریات کی ضرورت نہیں اسی لئے اولیاء اللہ کو منطق پڑھنے کی ضرورت نہیں اور جب اولیاء اللہ کے لئے نہیں تو انبیاء علیہم السلام کے لئے بدرجہ اولیٰ نہیں مگر بعض دفعہ انبیاء علیہم السلام میں شفقت غالب ہوتی ہے جیسا کہ حضور ﷺ کے لئے خطاب فرمایا بشفقت اپنے آپ کو چھوڑتے ہوئے حق تعالیٰ نے فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ کیا آپ ان کفار و مشرکین کو سُنانے اور خطاب کرنے میں اپنے آپ کو مار ہی دیں گے۔ گھلا ہی دیں گے؟ ایسا ہرگز نہیں اس سے غلبۂ شفقت معلوم ہو گیا۔ حالانکہ حضور ﷺ کے جو مقدمات تھے وہ مقدمات صحیح ہیں اس میں ایک مقدمہ غلبۂ شفقت کا بھی ہے حالانکہ یہ غلبۂ شفقت بھی یہ نہیں کہ بدیہی نہ تھا بلکہ یاد دہانی فرمائی چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ مربیٔ حقیقی ہیں یاد

دہانی فرمارہے ہیں اسی طرح مربّی وشیخ بھی مذکّر ہوا کرتا ہے یاددہانی کراتا رہتا ہے اب بعض لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اپنے سے تغافل اور جب یہ مغفل بنا تو اسی سے پیدا ہوگا تکاسل وتکاہل اور جب تساہل ہوگا تو ترک ہوگا اور طالب کے لئے تکاہل و تساہل کیسا؟ لہٰذا معمولات کا دوام بلا تساہل ہوگا، ترک و دوام ہی ہے ناغہ نہیں ہے۔

عِلم مذکّر اور حال بن جائے:

عِلم وہ ہے کہ ہر موقع پر مذکّر رہے اور مذکّر ہو کر وہ عِلم قالی حال بنا ہوا ہو ادنیٰ التفات سے مذکّر صاحب کو تلقین کر کے یاد آجائے ورنہ تو کہتے رہیے۔ یہ عِلم درجۂ قال میں ہے، درجۂ حال میں تو ہے نہیں۔ اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

قال را بگذار مردے حال شو

مگر یہ کب بنے گا ....

و پیش مردِ کاملے پامال شو

فرماتے ہیں تم قال قال اللہ تعالیٰ، قال رسول اللہ یہ کب تک کہتے رہو گے ذرا پرکھو تو کہ یہ قال دِل میں حال بنا ہوا ہے یا نہیں؟ یہ قال موقع بموقع مذکر ہوتا رہے بالتفاتِ ادنیٰ یاد ہو جائے مثلاً او ہو میرا دایاں پاؤں بیت الخلاء میں چلا گیا اور حدیث شریف میں ہے کہ دایاں پاؤں نہیں جانا چاہیے۔ جب حال طاری ہوا تو اس نے اپنا دایاں پاؤں جو بیت الخلاء میں رکھا تھا فوراً نکال لیا کہ یہ تو غلط ہو گیا اور پھر اس کے بعد بایاں پاؤں رکھا حال تو بن ہی چکا تھا اتفاقاً ہو گیا فوراً اندر سے عِلم مذکّر ہو گیا۔

اور اگر وہ قال قال ہی تھا حال نہیں بنا تھا اگرچہ یاد ہے مگر بے حال ہو کر حال نہیں ہوا تھا دایاں قدم رکھا گیا تھا دائیں قدم سمیت ہی چلا گیا یاد بھی آگیا، لیکن یاد

آنے کے باوجود اسی طرح چلا گیا رجعتِ قہقری نہیں کی خیر کی طرف۔ اس کو کہتے ہیں حال اسی کو دوسرے معنیٰ میں کہہ دو بطریقِ خشوعِ حال وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ تو صاحبِ خشوع کو نماز بھلا بھاری ہونے کی کیا بات ہے چونکہ حال ہو چکی ہے اگرچہ بظاہر بھاری بات تھی لیکن وہ اس کے لئے ہلکی سے ہلکی ہو گئی شمولِ خاطر ہو گئی۔

نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا ہے: قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ یعنی میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

آدمی کا صاحبِ نسبت ہونا :

اسی کو کہتے ہیں واقعی صاحبِ نسبت ہونا کہ منہیاتِ ظاہرہ و باطنہ سے بایں نفرت جیسے کہ غلاظت و بول و براز سے، اور اصلاح سے بایں رُغبت جیسے کہ بحالتِ رجوع طعام کی رُغبت۔ معصیتِ ظاہرہ و باطنہ سے ایسی نفرت اور عبادت و طاعت سے ایسی رُغبت جیسے کھانے کی اس کو کہتے ہیں صاحبِ نسبت ہونا کیونکہ ایسے بندے کا تعلّق ذاتِ باری تعالیٰ سے ہوگا بایں رضاء بدوام۔

اسی کو بعنوانِ دیگر قرآنِ پاک میں نفسِ مطمئنہ کہہ دیا اور اسی کو خطاب فرمایا: يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً یعنی اے اطمینان والی روح اپنے پروردگار کی طرف چل، اپنی تربیّت کرنے والے مربّیِ حقیقی کی طرف چل، کہ تیری تربیّت کس طرح ہوئی ہے کہ تیرا نام امّارہ تو کیا رہتا لوّامہ بھی نہیں حالانکہ لوّامہ بھی ایک درجہ ہے جس کی قسم کھائی ہے مگر وہ تو آگے آگے اور ترقی کرتا ہوا چلا گیا اپنے آپ کو ملامت کرتا چلا گیا اور خدا کی یاری میں بڑھتا چلا گیا۔ اطمینان وسکون پاتا گیا۔

ارشادِ ربانی ہے: اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ ذِکرِ لسانی اور قلبی جسمانی، مالی پورے اعتبار سے ہوگیا حالی کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ تو تو میرے خاص الخاص بندوں میں سے ہے اور خاص الخاص بندگی اسے ہی کہتے ہیں۔ تلازم ہوگیا کہ تو نے رضاء کی بات کہی راضیۃ بنا اور اس رضاً سے پھر تو میری طرف سے مرضیۃ بنا۔ یہ عنوانات ہیں، عنواناتِ مختلفہ سے معانی ایک ہی رہتے ہیں۔

عنوان پاکیزہ اور مہذّب ہونا چاہیے :

مثلاً کوئی شخص آیا اور آپ کھانا کھارہے ہیں۔ اور کہیں آیئے ٹھونس لیجئے اور اگر یوں کہئے آیئے تشریف لایئے خوب آیئے نوشِ جان فرمالیجئے عنوان ایک ہے۔ حالانکہ جب کھائے گا تو پیٹ بھرے گا ٹھونسے گا مگر عنوان کا فرق۔ وہ گنوارہ لہجہ تھا اور یہ مہذّب لہجہ ہے تو عنوان کے فرق سے معنون بدل نہیں جاتا معنیٰ ایک ہی رہتا ہے۔ ایسے ہی صاحبِ نسبت اور نفسِ مطمئنہ والا ہے۔

ایک اَمیر کا واقعہ :

ایک امیر صاحب جن کے پاس لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہا کہ میں شکار کو گیا تھا۔ ہرن سامنے آگیا میں نے بندوق چلائی وہ اس کے کُھر کو توڑتی ہوئی کنپٹی کو پھوڑتی ہوئی پار ہوگئی۔ کہاں کُھر اور کہاں کنپٹی...... کُھر پیر میں اور کنپٹی سر میں۔ جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے سب ہنسنے لگے کہ کہاں کُھر اور کہاں کنپٹی اور کہاں بندوق کی گولی؟

اس امیر نے اپنے صاحب دوست کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اُس نے کہا حضور آپ نے صحیح فرمایا کہ جس وقت حضور کی گولی چلی تھی وہ اپنے پاؤں کے کُھر سے

کنپٹی کو کجھا رہا تھا تو اس اعتبار سے کھر کو توڑتی ہوئی کنپٹی کو پھوڑتی ہوئی نکل گئی۔ بیچاروں کی ہنسی جاتی رہی اور کھسانی ہنسی ہوگئی شرمندہ ہو گئے۔ دوست نے تاویل کی کہا کہ حضور آپ نے بالکل سچ اور صحیح فرمایا ایسا ہی ہوا تھا۔

خلافِ شرع باتوں کی تاویل نہیں کرنی چاہیے :

ایک پردیسی مسافر عالم نیک طبیعت تھے کسی بستی میں چلے گئے۔ انہیں کچھ معلوم ہوا کہ یہاں لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے ان میں ایک امیر صاحب بھی تھے، ان صاحب سے ملنے کی خواہش ہوئی وہ عالم صاحب وہاں پہنچ گئے، وہاں ایک اور عالم بھی تھے مقامی اسی بستی کے رہنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر صاحب داڑھی منڈوا رہے تھے، ان پردیسی عالم صاحبؒ نے کہا کہ آپ امیر ہو کر داڑھی منڈوا رہے ہیں۔ اس وقت کہنا چاہیے تھا یا نہیں وہ تو الگ بات ہے وہ تو جس کو معرفتِ اُصول ہو وہی پہچان سکتا ہے۔

بڑے لوگ جو کہ واقعی بڑے ہوتے ہیں وہ تو خاموشی میں ٹال دیا کرتے ہیں وہ تو خاموش ہو گئے۔ اور جو مقامی عالم بیٹھے ہوئے تھے ذرا کچھ دل کھلا تھا اس نے کہا حضور آپ کو داڑھی منڈوانا جائز ہے، اس لئے کہ حضور آپ کی داڑھی میں جوئیں ہو جاتی ہیں اور وہاں نر بھی ہیں اور مادہ بھی اور وہاں نکاح ہوتا نہیں اور بلا نکاح کے نر اور مادہ ملتے رہتے ہیں...... اس لئے آپ کو داڑھی منڈوانا جائز ہے۔ وہ بچارے مسافر عالم صاحب خاموش چونکہ بڑے عالم تھے اور مباحثہ میں پڑنا نہیں چاہتے تھے وہ چُپ ہو گئے۔

اُمراء سے اِختلاط کی وجہ سے علماء خائن ہو جاتے ہیں :

جب امیر کے پاس سے چلنے لگے تو راستہ میں مسافر عالم نے ان مقامی عالم سے کہا کہ مولانا یہ آپ نے کیا بات کہہ دی یہ باتیں کہیں خلافِ ایمان اور کفر کی نہ ہوں۔ مقامی عالم صاحب نے کہا دیکھیے آپ نے کہا کہ کہیں خلافِ ایمان نہ ہوں۔

اب سُنیئے یہ نالہ آ رہا ہے جب گھر سے چلتا ہوں تو اپنا ایمان یہاں اس نالہ میں چھوڑ جاتا ہوں اور جب نواب صاحب سے رُخصت ہو کر گھر جاتا ہوں تو یہاں سے اپنا ایمان اُٹھا لیتا ہوں۔ کتنی بھاری بات اس عالم صاحب نے منہ سے نکالی!

اسی وجہ سے حدیث شریف میں فرمایا علماء دین کے امانت دار ہیں جب تک کہ یہ اُمرأ سے اختلاط نہ کریں اور جب اختلاط پیدا ہو جائے تو وہ دین کے خائن ہو جاتے ہیں اور کسی درجہ پر ایمان کے بھی خائن ہو جاتے ہیں۔

قُدسی صاحب کا واقعہ :

ایک جوان سے کچھ زیادہ عمر میں ایک شیخ تھے بھوپال کے بادشاہ نواب صاحب اور صاحبزادگان اور بیگمات ان سے بیعت تھیں۔ ان کا لقب قدسی صاحب تھا ان کو اختلاجِ قلب کا دورہ ہو گیا، علاج ہوتا رہا حضرت والا حکیم الاُمّتؒ کو انہوں نے خط لکھا کہ میں اس وقت اختلاجِ قلب کا مریض ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں کچھ دنوں کے لئے رہوں لیکن میں خانقاہ میں نہیں رہوں گا بلکہ بستی سے باہر میری رہائش گاہ کا انتظام کر دیا جائے تخمینۂ تعمیر مجھے بھیج دیا جائے۔ میرے ساتھ مُلازم بھی ہوں گے امام میرے ساتھ ہوگا طبیب میرے ساتھ ہوگا باورچی میرے ساتھ ہوگا الغرض جو میرے ساتھ آئیں گے ان کے لئے بھی ایک ایک الگ

مکان کی ضرورت ہوگی جو کہ میرے مکان سے الگ قریب جگہ پر ہو۔ مولوی شبیر علی صاحبؒ جو کہ حضرت والا کے بھتیجے تھے ان سے حضرت والا نے فرمایا کہ معمار کو بُلا کر ان سب چیزوں کا تخمینہ بھیج دیا جائے۔ وہ رقم آ گئی تعمیر شروع ہوگئی تیار ہو کر ان کو اطلاع دے دی گئی اور وہ آ گئے اپنے تمام مُلازمین کے ساتھ۔ مُلاقات ہوگئی جگہ دکھا دی گئی وہ وہاں رہنے لگے اور گاہے گاہے مجلس شریف میں بھی تشریف لاتے تھے۔ جب مجلس میں بیٹھے ہوتے تو حضرت والا کسی کو زجر نہیں فرماتے تھے اصلاح کی باتوں پر روک ٹوک نہیں کرتے تھے کیونکہ اختلاجِ قلب کا مریض بیٹھا ہوا ہوتا تھا تو محاظ و رعایت فرماتے کیسے خاندان کے تھے۔

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں خاندان کیا ہوتا ہے؟

خاندان کی ابتداء :

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ہے صحرائے تیہ میں پہنچ گئے قرآن شریف میں ذکر ہے بڑے شریر تھے کیا پوچھو؟ سب قوم کو جمع کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اردگرد قوم کو بحکمِ الٰہی کہ وحی سے باتیں ہوتی تھیں بارہ خاندان میں قطع و برید کر دیا، وَقَطَّعْنَاهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا بارہ خاندان الگ الگ کاٹ دیئے یہ خاندانوں کا سلسلہ وہیں سے چلا۔

بارہ جگہ تقسیم کر دیا ان کے رہنے سہنے کا تو انتظام ہوگیا پانی کی ضرورت ہوئی لیکن پانی کا تو وہاں نام ونشان ہی نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہاں ایک پتھر پر لاٹھی ماردی فَاضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ بس مارنا تھا کہ بارہ چشمے ہوگئے اس ایک پتھر سے اور اُن بارہ خاندانوں میں تقسیم ہوگئے ایک چشمہ ہوتا تو بھی کافی ہوجاتا لیکن ہر ایک کے

لئے الگ الگ چشمہ الگ الگ ایک نئی نہر۔ کھانے کے لئے بھی منّ وسلویٰ ترنجبین آ گئی حکم ہوا کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ کہ مزے سے کھاؤ۔

بلا محقق کی صحبت کے حقیقت منکشف نہیں ہوتی :

طیّب کا لفظ آیا ہے مزے کے ساتھ رچ بچ کے کھاؤ اور وہ بھی لذیذ تو کیا لذیذ کھانے کی ممانعت ہوگئی؟ مزے کی چیز کھانی چاہیے۔ قورمہ آگیا سامنے خوشبودار ہونے کے ساتھ ساتھ خوش رنگ اور خوش ذائقہ بھی ہے لیکن بس صوفی صاحب نے پانی ڈال دیا ایسا کیوں......؟ اپنے نفس کا علاج کر رہا ہوں اس شوربے کی جو تجلّی تھی اب اس پانی میں وہ تجلّی کہاں؟

اس لئے جو کسی محقق کے پاس نہیں بیٹھا ہوگا ذاکر و عابد تو ہوگا لیکن حقیقت سے کورا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اپنے رسولوں کو حکم فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ۔ جو کہ باعث بنتا ہے مزید طاعت کا دل کھلا ہونے کا بھلا جب اللہ دے تو بندہ کیوں نہ لے اور پھر وہ مزے سے کیوں نہ کھائے اور جو ایسا نہ ہو وہ محقق کی صحبت سے محروم ہے۔

بنی اسرائیل کی نافرمانی :

بہرحال منّ وسلویٰ ملی مزے سے کھاتے رہے ایسی حالت میں شاکر ہونا چاہیے تھا مگر ذاتِ باری تعالیٰ نے جو فرمایا تھا وہ اس کے خلاف کرنے لگے اور تبدیلیٔ طعام کی درخواست کرنے لگے تو حق تعالیٰ نے ایک بستی میں جانے کا حکم فرمایا کہ اس بستی میں جا کر آباد ہو جاؤ اور جب بستی کے دروازے سے داخل ہو تو حِطَّۃٌ کہتے جانا مطلب یہ کہ توبہ ہماری توبہ ہے اس میں جو تم سے کوتاہیاں ہوگئیں ہیں وہ ہم معاف کر

دیں گے اور جب دروازے سے داخل ہونے لگو تو نہایت جھکے ہوئے عاجزی کے ساتھ داخل ہونا۔ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّداً وَّ قُوْلُوْ حِطَّةٌ نَّغْفِرْلَكُمْ خَطٰيٰكُمْ، یعنی دروازے سے داخل ہونا جھکے جھکے اور کہتے جانا کہ توبہ ہے، ہم معاف کردیں گے تمہاری خطائیں۔ لیکن انہوں نے لفظ بدل دیا۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلاً غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ ۔ یعنی بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمے سے جو خلاف تھا اس کلمہ کا جس کی طرف ان سے فرمائش کی گئی تھی۔ انہوں نے بجائے حِطَّةٌ کے حِنْطَةٌ کہا یعنی گیہوں گیہوں لفظ حطۃ کو بدل دیا لیکن اپنی حالت کو نہ بدلا کہ عاجزی کے ساتھ داخل ہوتے۔ نہ جسمانی عاجزی، نہ باطنی عاجزی یعنی توبہ حالانکہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس طرح جاؤ گے تو تم محسنین میں سے ہو گے اور سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید بعآں اور دیں گے، اور بڑا بنائیں گے۔

جس کو منجانب اللہ بڑا بنایا جاتا ہے اس کو حوصلہ اور موقع شناسی بھی عطاء ہوتی ہے :

ایک بادشاہ کے انتقال ہونے کا وقت قریب ہے، شہزادہ کوئی ہے نہیں جو ولی عُہد ہو۔ ارکانِ سلطنت نے عرض کیا کہ حضور موت طبعی تو سب کو آتی ہے جان بخشی جائے کہ حضور کی وفات کے بعد قائم مقام کس کو بنایا جائے۔

بادشاہ نے کہا میرے انتقال اور کفن دفن کے بعد صبح سویرے میرے محل کے سامنے کھڑے ہو جاؤ جو بھی سب سے پہلے آئے اس کو میری جگہ بٹھا دینا۔ شاہی حکم ہے وہاں تو شوریٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بہر حال انتقال کے بعد ایک شخص محل کے

سامنے گھاس کی گٹھڑی رکھے ہوئے نکلا اس کو پکڑ کر تختِ شاہی پر بٹھا دیا۔ تو وہ خود نہیں بیٹھا تھا بٹھایا گیا تھا بڑا بنایا گیا۔

بادشاہت عطاء ہونے پر مزاج بدل گیا :

تختِ شاہی پر بیٹھنا تھا کہ مزاج بدل گیا مبارک بادیاں ہو رہی ہیں۔ اب بادشاہ سلامت کھڑے ہو رہے ہیں وزیر بیٹھا ہوا ہے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھے۔ وزیر کو تعجب ہو گیا کہ تو اتنی بڑی گٹھڑی کیسے اُٹھا کر سر پر رکھ کر لاتے اور آج اپنا جسم بھی بلا میرے کندھے کے سہارے نہیں اُٹھایا جاتا...... لطافت آ گئی۔ بنیادی چیز جاہ انتہائی کا اثر آ گیا گویا کہ وزیر غلام ہو گیا۔ وزیر نے کہا جان بخشی جائے کچھ بولنا چاہتا ہوں وہ گٹھڑی جو وزنی ہوتی تھی سر پر آپ نے اکیلے رکھی ہوئی تھی اور اب اس وقت آپ کا جسم بھی بلا سہارے کے نہیں اُٹھتا۔ اس نے کہا وزیر اعظم ہو کر آپ ایسی باتیں کرتے ہیں تعجب کی بات ہے کیا اب مجھے وزیر کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے اور حوصلہ افزائی کی وزیر چپ ہو گیا اور سمجھ گیا اس حالِ قولی کو پہنچ گیا دور اندیش بن گیا۔

جسمِ انسانی میں دل کی عظمت :

دل تمام جسم کا بادشاہ ہے اور جسم کے اور اعضاء رعیّت ہو گئے اور قلب بادشاہ سلامت ہو گیا اور حدیثِ قدسی ہے: لَا یَسَعُنِی اِلَّا قَلْبُ الْمُؤمِنِ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نہیں سما سکتا سوائے مؤمن کے دل کے۔

قدسی صاحب کی بات درمیان میں آئی تھی ان کی رعایت مجلس میں حضرت والا فرماتے اور جب تک بیٹھے رہتے تو اس وقت تک کسی شخص سے کوئی نامناسب بات سی ہوتی ہے تو اس وقت زجر و تنبیہ نہ کرتے چونکہ ان کا قلب مریض تھا۔

حضرت والا کا جہاں مزار ہے وہاں جو کمرے بنے ہوئے ہیں حضرت والا کے ایک مُرید وہاں چلے گئے ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے قدسی صاحب کے پاس بھی پہنچ گئے ،ان کا نام کالے خان تھا۔ سلام ہوا وہاں پھل رکھے تھے کہیں ٹوکری میں سیب ہیں کہیں انگور وغیرہ وغیرہ کیونکہ وہ نوابوں کے شیخ ہیں۔ کالے خان نے پوچھا کہ یہ کہاں سے منگوائے ہیں؟ آپس میں ربط ہو رہا ہے انہوں نے کہا کہ شہر سے منگوا لئے جاتے ہیں۔ قدسی صاحب نے مُلازم سے کچھ پھل نکلوا کر اُن کو پیش کئے۔ کالے خان نے انکار کیا اور انھوں نے اصرار کیا تو انھوں نے لے لئے۔

حضرت والا کو معلوم ہو گیا کہ فلاں صاحب وہاں گئے تھے اس طرح ہوا ہے، تحقیق شروع ہو گئی کالے خان میں نے سُنا ہے کہ تم قدسی صاحب کے پاس گئے تھے۔ وہاں اختلاط یعنی ملنا جلنا بات چیت ہونا، پھل کا دینا پہلے انکار کرنا اصرار سے پھل لینا یہ سب ہوا ہے؛ انھوں نے کہا جی ہاں فرمایا خانقاہ سے نکل جاؤ، آدابِ اصلاح و آدابِ خانقاہ یہ میل جول کیسا؟ کیا وہ تمہارے رشتہ دار تھے، دوستانہ تھا تم وہاں گئے کیوں؟ وغیرہ وغیرہ۔

انھوں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے تو انکار کیا تھا، تم کیا جانو، تمہارے انکار سے کیا ہوتا ہے؟ اُٹھ جاؤ، خانقاہ سے نکل جاؤ اصلاح شروع ہو گئی وہ خانقاہ سے نکل گئے وہ تھے شیخ......!

شیخ کا اعتقاد و اعتماد ضروری ہے :

اب تو پیر رہ گئے شیخ تو چیز ہی کچھ اور ہوتی ہے، شیخ کے ساتھ اعتقاد بھی چاہیے اور اعتماد بھی چاہیے، اعتقاد کیسا' یہ یقین جانے کہ اس معالجۂ باطنی میں جس کو

سلوک کہتے ہیں وہ صاحبِ فن ہے یہ ہمارا اعتقاد ہے اور جس صاحبِ فن پر اعتقاد ہے اس کی بات میں چون و چرا نہیں یہ اعتقاد ہونا چاہیے۔

اور اعتماد اس کا مطلب یہ کہ جو بھی کلام کرے گا جو بھی تعلیم کرے گا جو بھی علاج کرے گا جو بھی اظہارِ خوشی کرے گا یہ لفظی ہی نہیں ہوگی دفع الوقتی نہیں، وقتی جی خوش کرنا نہیں بلکہ وہ جو کہے گا وہ حقیقت ہوگی ہمیں پورا اعتقاد ہے اور جب اعتقاد بھی کامل ہے اور اعتماد بھی جازم ہے تو پھر اس پر بلا چون و چرا کے چلنا ہے عمل کرنا ہے یہ ہے اعتقاد یہ ہے اعتماد۔ اگر یہ خیال کیا کہ یہ تو وقتی جی خوش کرنا ہے تو اعتماد گیا، پھر تعلیم سے کیا اثر لے گا یا یہ سوچے کہ یہ مبارک بادی میرا جی خوش کرنے کے لئے ہے، اس طرح سے کیا علاج ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں، یہ ہے شیخ کو ماننا فرمایا نکل جاؤ، خانقاہ سے نِکل گئے۔ اب بیچارے کالے خان صوفی تھے اور رو رہے ہیں۔ قدسی صاحب کو معلوم ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ سبب میں ہوا ہوں، نہ میں دیتا نہ انکے انکار پر اصرار کرتا نہ وہ لیتے اور نہ یہ ہوتا۔

کرم فرمائی اور تکلیف فرمائی میں فرق :

حضرت والا طعام کے لئے اور نوم کے لئے گھر تشریف لے جاتے باقی خانقاہ ہی میں سہ دری میں تشریف فرما ہوتے۔ قدسی صاحب غیر وقت میں آ گئے اور کوئی نہیں تھا۔ حضرت نے پوچھا کیسے کرم فرمائی! دوسرا عنوان یہ ہوتا ہے کہ کیسے تکلیف فرمائی؛

قدسی صاحب نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک صاحب جو تشریف لائے تھے اور پھر یہ معلوم ہوا کہ ان کو خانقاہ سے نکال دیا گیا، حضرت والا! یہ میرا قصور

ہے میں معافی مانگنے آیا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ تو بطورِ اصلاح کہ عدمِ اختلاط
شرط ہے اس لئے کچھ کہہ دیا تھا آپ کی کوئی بات نہیں انکی بات تھی۔ وہ بُلائے جائیں
،حضرت! یوں جی چاہتا ہے جلدی بُلا لیجئے۔ انشاء اللہ جلد ہی بُلا لیا جائے گا۔ بُلوالی
کالے خان کو وہ ایک طرف کھڑے ہیں۔ ایک صاحب سے فرمایا کہ جا کر دیکھو وہ یہی
ہیں خانقاہ میں رہنے والوں نے بتایا کہ حضرت وہ تو یہیں ہیں جا کر پوچھو کیا کہتے ہو؟
تلقین فرما رہے ہیں کہ معذرت پیش کریں۔ انہوں نے کہا حضرت غلطی ہوگئی آیند
کبھی ایسا نہیں ہوگا جیسی غلطی تھی ویسا ہی سلوک ورنہ تو سرسری طور سے کہہ دیا جاتا ک
دیکھو ایسا نہیں کیا کرتے، آئندہ احتیاط رکھنا چاہیے مگر نہیں چونکہ قوم کی خدمت بلا
اصلاح کے دل میں جمانا مشکل ہے خیر فرمادیا کہ جاؤ خانقاہ میں خوش رہو۔ یہ بات
اختلاط اجتماع پر چلی تھی لمبی ہوگئی یہ طول لا طائل ہے یا احسن وانفع جیسے کہ طول زُلفِ
محبوب۔ شاعر بھی بڑے بے باک ہوتے ہیں ایک کہتا ہے۔

ع طولِ شبِ فُرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

دوسرا کہتا ہے ......

ع وہ زُلف مسلسل جو تیرے رُخ پہ پڑی ہے

جیسے طولِ زُلفِ محبوب ہے جتنی طویل ہوتی ہے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ رسول
اللہ ﷺ نے تسبیحِ ملائکہ کو بیان فرمایا: سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحیٰ وَ سُبْحَانَ
مَنْ زَیَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَائِبِ۔

یعنی چوٹی جو عورتوں نے کٹوانی شروع کی جو بڑی زینت کی چیز ہے مردوں
نے داڑھی منڈوانی شروع کی جو بڑی زینت کی چیز ہے یہ ضمناً گذارشات ہیں۔

سلوک کے لئے اسبابِ معدہ چار چیزیں ہیں :

یاد رکھیے گا سلوک کے لیے اسبابِ معدہ چار چیزیں ہیں بدون ان کے سلوک طے نہیں ہوسکتا، اور جب استعداد نہیں ہے تو ایسے ہی علم میں بھی استعداد نہیں ہو سکتی تو اصلاح بطریقِ اولیٰ نہیں ہوسکتی۔

پہلی چیز تقلیل الکلام جو کہ گویا عدمِ کلام کے درجہ میں ہے تقلیل الکلام یعنی قلتِ کلام ہو۔ دوسری چیز تقلیل المنام یعنی کم سونا تیسری چیز تقلیل الطعام یعنی کم کھانا چوتھی چیز تقلیل الاختلاط مع الانام۔ یہ حضرت والا کے الفاظ ہیں جب تک یہ چار چیزیں نہیں ہوں گی سلوک طے نہیں ہوسکتا۔

چار چیزوں میں تفصیل :

اب اخیر زمانہ میں حضرت حاجی صاحبؒ تھے ان چار چیزوں میں تفصیل ہو گئی۔ حضرت والا نے فرمایا تقلیل الکلام تو ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔ اور اسی طرح تقلیل الاختلاط مع الانام یعنی کم ملنا یہ بھی ہمیشہ کے لئے باقی ہے اور گویہ کہ کم بولنا نہ بولنے کے برابر ہے چونکہ جب ضرورتِ واقعی کلام کی پیش آئے کہ اگر کلام نہ کروں گا تو ضرر ہوگا تو یہ ضروری ہوگیا۔ ایسے ہی کم ملنا جب ضرورت کسی سے ہو کہ اگر نہ ملے تو ضرر، حرج ہوگا یہ ملنا شرعاً ضروری ہوگا تو یہ ملنا بھی نہ ملنے کے برابر، یہ دو چیزیں ہمیشہ کے لئے ہیں۔

اب دو چیزیں رہ گئیں کم کھانا کم سونا۔ اب انحطاط کا زمانہ ہے جسم وقویٰ اعضاء واعصابِ دل ودماغ کمزور ہوگئے ہیں۔ اس لئے کم کھانے اور کم سونے میں اس وقت تفصیل ہے اس وقت کا جو کم کھانا ہے وہ تو اس درجہ کا ہے کہ پیٹ بھر کر نہ ہو،

کیسا چھوٹا سا جملہ فرمایا...... متقد مین کی حرص مت کرنا تبلیغِ دین میں مت دیکھیے گا
اسی وجہ سے جب تبلیغِ دین کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ باب قلتِ طعا
پر عمل مت کرنا۔

شریعت وتصوّف لائقِ مطالعہ کتب ہیں :

تبلیغِ دین کا مطالعہ بہت ضروری ہے خاص کر جو پڑھے لکھے ہیں۔ حضرا
علمائے کرام کے طبقہ کو بھی۔ مولانا عبدالرحمن صاحب کانپوریؒ صدر مدرّس مظاہر العلو
سہارنپور جب انہوں نے رجوع کیا اصلاح کی طرف تو حضرتؒ نے فرمایا کہ تبلیغِ د
کا مطالعہ کیجئے اور یہ کتاب اردو میں ہے جو کہ امام غزالی کی کتاب اربعین کا ترجمہ۔
یوں نہیں لکھا کہ احیاء العلوم کا مطالعہ کیجئے آج کل کہا جاتا ہے تو کہتا ہے کہ احیاء العلو
مطالعہ کروں گا۔ ارے پہلے شریعت وتصوّف کا مطالعہ کرلو انطباق واحتساب کے سا
جائزہ لیتے ہوئے اور فرمایا کہ کم کھانے میں متقد مین کی حرص مت کرنا وہ تو بڑے قو
جسم والے تھے اس وقت آدمی کچھ چھوٹے چھوٹے سے رہ گئے ہیں اور اُس زمانہ
بڑے قد آور ہوتے تھے اور ممکن ہے اس زمانہ کے پھل بھی بادام میوہ ہوتا ہو۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ قدیم زمانہ کے مُرغ گدھے کے برابر ہوتے تھے
قد کیسے ہوتے ہوں گے۔ نیز فرمایا کہ صوفیاء اور متقد مین اصحابِ تزکیہ کا جب کھا
کا وقت ہوتا تھا تو بادام سے ذرا سا توڑ لیا، سحری کا جب وقت آیا ذرا سا کھا لیا اور افطا
کے وقت اسی بادام میں سے جو کچھ تھا کھا لیا تو یہ بادام کھانا سحری ہو کر روزہ بھی ہو گ
اور افطار بھی ہو گیا۔

آج کل جب افطار کرنے بیٹھیں گے تو بھرپور اور طرح طرح کی چیزیں

کھائیں گے اور کھانا جب مغرب کے بعد جو عادت ہے بیٹھے تو بھی بھر پور اور جب سحری کا وقت آیا تو بھی بھر پور۔ تین وقت کھانے کے ہیں، ناشتہ دوپہر اور بعد از مغرب۔ سحری ہوگئی ناشتہ کی جگہ، افطار ہو گیا دوپہر کی جگہ اور رات کا اپنی جگہ ہی ہے بس تقدیم وتاخیر کا فرق ہو گیا۔

دوسری چیز کم سونا، بلا اس کے استعداد ہی نہیں فرمایا کہ بھائی! دیکھو دن رات میں چھ گھنٹے سونا کہ سردی میں چھ سات گھنٹے رات بڑی لمبی ہوتی ہے رات میں پورے ہو جائیں گے، گرمی میں نہیں ہوں گے اور خاص کر سالکین کو اکثر ضرورت پڑتی رہتی ہے کیونکہ رات کو تہجد پڑھنا ہے اس کے بعد ذکر میں مشغول ہونا ہے حسبِ صحت بلحاظِ شریعت جاڑوں میں تو اس طرح ہوگا۔ اور گرمی میں دوپہر کا وقت بہت لمبا ہوتا ہے اگر گرمی میں رات میں چھ سات گھنٹے پورے نہ ہوں تو اس طرح کرے کہ اتفاقاً اس کے خلاف ہو جائے وہ خلافِ عادت نہیں مثلاً کہیں سفر میں گیا وغیرہ۔

اتفاقاً چھ سات گھنٹے سے کم سونا یہ عادت نہیں ہے اور نہ مضر ہے اور اگر عادت ہوئی تو مضر تمام اعضاء پر، دماغ پر، اعصاب میں، کسل پیدا ہو جائے۔ یہ چاروں چیزیں استعدادِ سلوک طے کرنے کے لئے ہیں لیکن ان میں سے جو پہلی ہے اختلاط وہ ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔

مدرّس باوقار ہو :

مدرّس باوقار ہو یعنی اس کی رفتار وگفتار سب باوقار تو اس میں زیادتِ تحصیل علم کے لئے گویہ کہ عدمِ اختلاط ہونا ضروری ہے بحفاظتِ وقار۔ اگر تبسّم ومسکراہٹ کا شوق ہو تو وہ بھی علمی طریق، علمی کلام۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی بات تبسّم ومسکراہٹ کے

خلاف ہو جائے تو یہ وقار کے خلاف نہیں یہ جزئیات ہیں ایسا بھی کبھی ہو جاتا ہے۔
حضور ﷺ کا تبسّم، ضحک دو یا دو سے زیادہ تین مرتبہ اور قہقہہ تو کہیں ثابت نہیں۔

مدارِس تعلیم اور خانقاہیں مشق کے لئے ہیں :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ اس تعلیم کی مشق ہورہی ہے خانقاہ میں، مدارس میں مشق نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ مدرسہ تعلیم کے لئے اور خانقاہ مشق کے لئے اور تربیت کے لئے ہے اور خانقاہ کی تربیت اس علم کے تحت ہے جو وہاں مشق نہیں ہوئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مُسْلِماً وَّ اَمِتْنِیْ مُسْلِمًا اے اللہ مجھے زندہ رکھیے مسلمان بنا کر اور اے اللہ میری موت ہو مسلمان ہو کر یعنی موت تک مسلمان رہوں اور مسلم و مسلمان کون...... مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ ۔ نہ جسمانی تکلیف نہ مالی نقصان نہ قلبی رنج پہنچایا جائے جو کہ زُبان سے ہوتا ہے اور جسمانی تکلیف ہاتھ سے اور نہ مالی نقصان ہو یہ تین چیزیں ہوئیں جسمانی، مالی، قلبی ۔ تو خانقاہی آدمی سے کسی کو نہ جسمانی، نہ مالی، نہ قلبی تکلیف پہنچانے سے دور رکھتا ہے اور اگر ہو جائے تو تضاد ہوگا اس سے جو حضور ﷺ نے فرمایا تھا اسی کو بخاری شریف میں اس حدیث کے بعد بیان فرمایا ہے : اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَ اَفْشُوا السَّلَامَ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اب تو ایذا رسانی سے بچے ہو آگے درجہ ہے راحت رسانی کا مؤمن کی طرف سے خوشدلی ہو، حوصلہ افزائی ہو۔

سالِک میں فنائیت ہونی چاہیے :

مگر یہ ہو سکتا نہیں جب تک کہ اپنے اندر فنائیت نہ ہو اپنی راحت پر دوسروں کی راحت کو ترجیح نہ ہو اور یہ اس وقت ہوگی جب انتہائی درجہ کا عجز و انکسار اور عبدیتِ

کاملہ ہوگی مثلاً کوئی شخص آیا کھانا پیش کیا جارہا ہے۔ چنانچہ جب کوئی مہمان آئے تو اس کا حق پہلے کھانے کا، رہائش کا انتظام آرام دہ ہو راحت رسانی کا سامان مہیا ہو اپنے اُوپر تکلیف برداشت کی جائے پہلے اُسے کھانا کھلایا جائے۔ حضرت والا کے ہاں یہی طریق تھا کہ پہلے رہنے کی جگہ دکھادو، بیت الخلا غسلخانہ کی جگہ آنے والے کو دکھادو۔ بلکہ ایسا ہو کہ اپنی راحت بھول جائے دوسرں کی راحت کا اہتمام ہو کوئی متکبر کیا کرسکتا ہے ایسا۔ اور جب کھانا دیا جائے گا تو ہاتھ سے دیا جائے گا تو یہ عملی راحت رسانی ہوئی اوّلاً پیش کیا گیا کہ ایذاء رسانی سے بچو تو یہ ایذا سے بچ گیا اب ہے راحت رسانی اور اس کا تعلق ہاتھ سے ہے اور یہی حدیث میں لفظ وَیَدِہٖ آیا تو ید کا استعمال ہوا وہاں دلالتِ مطابقی تھی یہاں دلالتِ التزامی ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی فنائیت :

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا واقعہ حضرت والا سُنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ بخاری شریف کو پڑھاتے پڑھاتے (اُس وقت صدر مدرّس تھے) ایک جگہ پر شرح صدر نہیں ہوا تو دوسرے مدرّس کے پاس چلے گئے اُن سے پوچھ لیا آگے انہوں نے حل کردیا۔ پہلے ایسے مدرّس ہوتے تھے کہ پھر درس میں فرماتے تھے کہ میں فلاں مدرّس کے پاس گیا تھا انہوں نے اِس کو اِس طرح حل کیا ہے ماشاء اللہ بہت خوب حل فرمایا ہے؛ اور دو تین دفعہ یہی فرماتے کہ ماشاء اللہ بہت خوب حل فرمایا ہے۔ لیکن آج تو اچھا یہی ہے کہ ایسا نہ ہو اس کی نقل بھی مشکل ہے شاگرد ایسے ہی ہیں اعتماد و اعتقاد کے۔

حدیث شریف میں ہیکہ طعام ہاتھ سے اور افشاء سلام زُبان سے ہوگا یعنی نرا ہاتھ ہو زُبان کا استعمال نہ ہو۔ ہاں اگر دور ہو اور مسلمان مسلمان کو دیکھ رہا ہو تو زُبان

سے بھی سلام کرے کہ آواز پہنچے گی یا نہیں اور اشارہ کر کے بھی تا کہ معلوم ہو جائے کہ جواب ہو چکا تو سلام جو ہوگا وہ زُبان سے ہوگا اور وہاں کہا تھا کہ زُبان اس طرح استعمال نہ ہو کہ سلامتی میں فرق آجائے بلکہ سلامتی باقی رہے ایذاء رسانی سے بچے تو سلام میں راحت رسانی ہوئی۔

خانقاہ میں رہنے سے فنائیّت پیدا ہوتی ہے :

اسی لئے خانقاہ میں حضور ﷺ کا جو فرمان پڑھا پڑھایا جاتا ہے اس کی مشق ہوا کرتی ہے۔ ابھی تو یہ ادنیٰ درجہ ہوا کہ ایذاء رسانی سے احتیاط ہو رہی ہے بلکہ آگے اور ترقی کرو، راحت رسان بنو۔ ایسے بنو مشق کرتے کرتے کہ جیسے فناء پر پہنچ گئے ہوں، سلام وہی کرے گا جو اپنے اندر عاجزی رکھے گا ورنہ کون سلام کرتا ہے کون کھانا اپنے ہاتھ سے ہر کس و ناکس کو کھلاتا ہے۔ تو خانقاہ میں انتہائی درجہ حاصل ہوتا ہے فناء کا۔ مدارسِ دینی تعلیم کے لئے ہیں اور خانقاہ مشق کے لئے ہیں بایں وجہ اپنا احتساب اپنی نگرانی برابر اپنے اعمال واقوال کا جائزہ برابر لیتے رہنا، اور یہ خانقاہ میں ہوگا۔ تو واضح ہو گیا کہ خانقاہ مین ایک اصلاح ہے آدمیّت بکمالِ انسانیّت کی۔ اس طرح خانقاہ میں رہنے کا ارادہ وعزم بالجذم بخلوص وبصدق مع فکرِ آخرت ہونا چاہیے۔

☆

پینتیسویں مجلس

دینِ اسلام مکمل نظام و اِنتظام ہے

۲۸ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بمطابق ۱۴ اپریل ۱۹۹۱ء بروزِ یکشنبہ بوقتِ صبح

سالکین حضرات دور دراز سے سفر کر کے خانقاہ تشریف لاتے ہیں۔ گھر سے جب چلنے کی نیت ہوتی ہے تو تمام آرام کو چھوڑ کر عزیز و اقرباء جن سے محبت ہے ان کو ترک کر کے نیز طبائع میں جو راحت طلبی، رکھی ہوئی ہے اس کو چھوڑ کر اور سفر کی پریشانی کے ساتھ روپے پیسے خرچ کر کے گھر سے بے گھر ہو جاتے ہیں، گھر کی راحت کا ترک اور ساتھ ساتھ سفر کی پریشانی یہ سب مخالفتِ نفس ہے خلافِ نفس کام ہو رہے ہیں گویا نفس کے ساتھ ایک قسم کا جہاد ہے۔

جہاد میں اوّل چیز اتعابِ نفس ہے:

اور جہاد میں سب سے پہلی چیز اتعاب ہے یعنی نفس پر تعب، مشقت، محنت ڈالنا تو گویا کہ پہلے نفس سے جہاد کر رہا ہے، نفس کی مخالفت کر رہا ہے ایسے جہاد کرنے والے کو مجاہد کہتے ہیں یعنی جہاد کرنے والا۔ جب اس نے نفس سے جہاد کو اپنے لئے

طے کیا تو اس کا تقاضہ ہوا گھر سے چلنے کا یہ ہجرتِ مکانی ہوئی، یعنی ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف نکلنا تو ایسا آدمی پہلے مجاہد ہوا اور پھر مہاجر بنا۔ یہ ہجرتِ مکانی ہوئی مکان جسکو گھر کہتے ہیں اس کا ترک ہوا یہ ہجرت بھی نفس ہی سے ہے۔ جس کو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا : اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ۔ صحابہ کرام کے سوال کرنے پر کہ مجاہد کون ہے آپ ﷺ نے فرمایا جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے وہ اصل جاہد ہے۔ جس پر مرتب ہوگا وہ جہاد جو کہ جہادِ شرعی کفار کے ساتھ ہے تو جہاد بطریق صحیح جب ہی ہوگا جبکہ جہادِ نفس سے فارغ ہو جائے چونکہ جہادِ نفس سے فراغت نہیں ہوئی بلکہ نفسانیت موجود ہے تو اس جہاد میں کہ جس میں بڑا تعب اور بڑی مشقت ہے اس میں اشتغال بھی آسکتا ہے غصہ بھی آسکتا ہے، جذبۂ انتقام بھی بھڑک سکتا ہے ایسی حالت میں حدودِ شرعی میں جو کہ جہادِ شرعی مع الکفار ہے صحیح نہیں ہوسکتا۔ بعنوانِ دیگر جو جہاد مع الکفار من حیث الشرع، بقواعدِ شرع ہے ان سے تجاوز ہو جائے گی اور جب حدود سے تجاوز ہو جائے تو وہ جہادِ شرعی نہیں بلکہ اپنے انتقام اور نفس کے اشتغال پر مبنی ہوگا۔ چونکہ جب خلافِ حدود ہوا تو رضائے الٰہی کے لئے کہاں ہوا اور ہر عمل میں رضائے الٰہی مطلوب ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ جو شخص کہ حدود سے نکل گیا تجاوز کر گیا تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ تم تو جہاد میں دفعِ ظلم کے لئے گئے تھے مشرکین کے مقابلہ میں جیسا کہ حق تعالیٰ نے شرک کو ظلمِ عظیم فرمایا: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ تو تم اس دفعِ جرمِ عظیم میں جو کہ شرک ہے خود ہی ظلم کر رہے ہو۔ تو اپنے اوپر سے پہلے دفعِ ظلم کرو۔ اپنے سے غفلت دوسروں کی فکر یہ کون سی عقلمندی کی بات ہے حالانکہ اپنا حق مقدم ہے دوسروں پر۔ حدیث شریف

میں ہے۔ ''اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا'' تم پر تمہاری ذات کا پہلے حق ہے اور وہ حق کیا ہے کہ ظلم سے ہٹو ظلم سے بچو۔

حقیقتِ ظلم :

ظلم کہتے ہیں: وَضْعُ الشَّيْئِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهٖ کو یعنی کسی چیز کو بے محل استعمال کرنا اور اشیاء کے منجملہ بھی تو ایک شی ہے اور شی کو خلافِ وضع، خلافِ محل استعمال کرنا یہی ظلم ہے۔ اور جب یہ استعمال کرنا اس طرح ظلم ہوا تو ظالم تو تو پہلے ہی ہے۔ پہلے خود سوچ لے کہ میں اپنی ذات کے لئے خود ظالم ہوا یا نہیں اور جب ہو تو پہلے اپنے سے ظلم دفع کر چونکہ جب صحیح صحیح اپنے سے ظلم دفعہ ہو جائے گا تو تیری طبیعت میں عدل آجائے گا تو جتنی مخلوق ہیں سب کے ساتھ تیرا سلوک اور برتاؤ عدل کے ساتھ ہو گا عدل مصدر ہے اسی سے عدول ہے۔ تجھ سے جو صدور ہو گا بمصدر عدل وعدول ہو گا تو عدول سے نکل کر عدل میں آ۔ اب جب تیری طبیعت ''عدل'' بن گئی اشتقاق مصدر ہی سے ہوتا ہے تو پھر تیرا مخلوق کے ساتھ عدل ہی عدل رہے گا۔

توضیح وانطباق :

اس لئے ضروری ہوا کہ شرک جو کہ ظلم ہے اور دفعِ ظلم ضروری ہے تو دفعِ شرک اس کا طریق عدل ہے اس لئے پہلے عدل پیدا کرو، ظلم کی چیزوں کو نکالو جن کا نام اخلاقِ ذمیمہ اور اخلاقِ رزیلہ ہے۔ ذم کے معنی بُرائی اور مذمت کے ہیں جب وہ نہیں نکلے گی تو ذمیمہ کے ظہور ہوتے ہی دیکھنے والا تیری بُرائی کرے گا کیا تجھ کو اپنی مذمت پسند ہے؟ اور مذمت اخلاقِ ذمیمہ سے آئی اس لئے جو تیرے اندر اخلاقِ رزیلہ ہیں

ان رزائل میں سے اگر کسی بھی رزیلہ کا ظہور ہوا تو تو دوسروں کی نگاہ میں رزیل ہوا کیا تجھ کو اپنا لقب دوسروں کی جانب سے رزیل کا ملنا پسند ہے تیری کوئی مذمت کرے پسند ہے گوارا ہے؟ غصہ آئے گا تیزی ہوگی اور جب تیزی ہوگی تو لڑائی آئے گی تو تو نے اس ذمیمہ سے اپنے لئے جنگ مول لی۔ تو تو اپنے آپ کو جنگ سے بچا پھر جا کر دوسرے سے جنگ کرنا جس کا نام جہاد ہے۔ اس لئے اپنے سے جنگ کر جس کا نام جہادِ نفس ہے باصطلاحِ شرع جب تو اپنے جہاد سے فارغ ہو جائے پھر دوسروں کے ساتھ جنگ ہے جس کے معنی جہادِ حقیقی کے ہیں۔ وہ تیرے لئے روا اور جائز ہوگا ورنہ دیکھنے میں تو جدّ و جہد ہوگی مگر ہے شریعت کے خلاف۔ تو وہ سعی اور جدّ و جہد یعنی جہاد خلافِ شرع ہوگا ایسی حالت میں اگر مارا گیا تو اس پر شہادت کا ترتب نہیں ہوگا طبعی طور پر اپنا جی خوش کر لیا جو کہ خلافِ عقل کے ساتھ خلافِ شرع بھی ہے۔

ایک اُصول :

عقل جس چیز میں مختلف قسم کے احتمالات قائم کرتی ہے اور شریعت منع نہیں کرتی ہیں، ان احتمالاتِ عقلیہ میں جو کہ احتمالاتِ متعدّدہ ہیں شرعاً ان میں گنجائش ہوتی ہے اگر شریعت منع کر دے گی تو گنجائش ختم ہو جائے گی۔

ذرا غور کیجیے جیسے ذاتِ باری تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر بُلایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور کی طرف روانہ ہوئے تو اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ شریفہ میں فرمایا :

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام جب میدانِ تیہ سے حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے

لئے چلے تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا جو کہ اب نبی ہیں کہ میرے بعد میری قوم میں اِنتظام رکھنا کہیں بدنظمی نہ ہو جائے من حیث المعاشرت یعنی رہن سہن میں بھی، معیشت میں بھی، من حیث الشریعت بھی۔ اور آگے لفظ بڑھا دیا کہ اصلاح کرتے رہنا یعنی اگر کوئی بات شریعت کے خلاف ہونے لگے تو خاموشی اور سکوت مت اختیار کرنا رواداری مت کرنا، برابر روک ٹوک کرتے رہنا مگر دیکھو جو روک ٹوک کرو، اصلاح کرو اعتدال کے ساتھ ہو یہ رمز اصلح کے لفظ سے بدلالتِ مطابقی، التزامی و تضمّنی معلوم ہو رہا ہے۔ انتظام کو برقرار رکھنے میں اس کا خیال رکھنا کہ میں اصلح کہہ رہا ہوں ذرا اصلاحیت اور درستگی لئے ہوئے طرزِ کلام بھی درستگی لئے ہوئے ہو سخت زشت گوئی اور زشت روئی ہرگز نہ ہو ذرا لہجہ میں نرمی ہوئی سب اصلح کے لفظ سے نکل رہا ہے یہ کلام اللہ کی بلاغت اور معجزہ ہے کہ ایک لفظ میں کتنی باتیں ہوئی ہیں۔

اَصْلِحْ کی لفظی تحقیق:

لفظِ اصلح صلاح سے مشتق ہے اور صلاح کے معنی مشورہ کے بھی ہیں رائے دینے کے بھی ہیں صلاح کے معنی صلاحیت کے بھی ہیں اور صلح کے بھی ہیں۔ اس کا مادہ ہے ص، ل، ح۔ ان اجزاء میں سے اگر ایک ایک حرف اور جُز کی تفسیر کی جائے تو بہت لمبی ہے جیسا کہ قرآنِ شریف میں جو حروفِ مقطعات ہیں ان کے معنی حقیقی من حیث التفسیر صحیح تو وہ ہیں جو کہ عند اللہ ہیں لیکن دوسری تفسیر اعتباری جو خلافِ شرع نہ ہو اور انطباق ہو جاتا ہو اعتباراتِ عقلی نکلتے ہوں تو ان میں گنجائش ہوتی ہے اس علم کو علمِ اعتبار کہتے ہیں علمِ تفسیر نہیں کہتے۔

الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے ہارون علیہ السلام جو کہ وہ خود بھی نبی ہیں اور کہنے والے بھی یعنی موسیٰؑ رسول بھی ہیں اور نبی بھی۔ اس وصفِ نبوّت کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے ہوئے انتظام کے لفظ یعنی اُخْلُفْنِی بول کر آگے اَصْلِحْ بھی فرمارہے ہیں حالانکہ یہ بات کہ انتظام کو درست رکھنا خود اَخْلِفْنِی میں رکھی ہے لیکن پھر بھی اصلح فرمانا تاکید در تاکید ہے۔ گویا یوں فرمارہے ہیں کہ اگرچہ تمہیں معلوم بھی ہے لیکن پھر بھی کہہ رہا ہوں اس میں بُرا ماننے کی بات نہیں چونکہ بڑا اگر شفقت و محبت سے کہے اور پھر بُرا مانے تو یہ تکبّر کی علامت ہے اور نبی میں غایتِ تواضع و عجز ہوتا ہے بایں وجہ نبی کے لئے بصفتِ نبوّت عجز اور تفویض لازم نبوّت ہے پھر تکبّر کہاں۔

چنانچہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ یہ ایک نبی کی بات کی حکایت فرمائی ہے اور جب یہ چیزیں لازمِ نبوّت میں سے ہیں تو کیا ہارونؑ میں نہیں؟ ضرور ہیں تو کیا وہ بُرا مانیں گے اگرچہ موسیٰ علیہ السلام عمر میں چھوٹے ہیں مگر مرتبہ میں بڑے ہیں اگر چھوٹا مرتبہ میں بڑا ہو جائے اگرچہ مخاطب بڑا ہو تو اعتبار اس کی اکملیّت و افضلیّت کا ہوگا، چھوٹے کا کہنا ماننا پڑے گا۔

چنانچہ اگر شاگرد کسی وقت اُستاد کی تقریر پر یہ کہے کہ میری سمجھ میں یوں آتا ہے اور اس کی بات صحیح ہو تو اُستاد کو جو کہ بڑا ہے اور شاگرد جو کہ چھوٹا ہے، مان لینا چاہیے یہی حق کا تقاضہ ہے۔

منتظم کے اَوصاف :

بہر حال اِنتظام و نظام کو قائم رکھنے کے لئے جبکہ اپنے اندر کلام کرنے کی صلاحیت اور کام کرنے کی قوّت نہ ہو، نظام و انتظام ایسے کے سپرد کرنا چاہیے جو

باصلاحیت ہو اور صلاحیت کا جامع ہو۔ قولی بھی اور فعلی بھی عملاً بھی اور حالاً بھی تا کہ حدود میں رہتے ہوئے نظام چلائے حدود سے تجاوز نہ ہو۔

نیز اُخْلُفْنِی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص گھر کا ذمہ دار و منتظم کہلایا جائے تو اپنے بعد اُمورِ متعلقہ اور متعلقین کا نظم و بند و بست کر جانا چاہیے یہ معاشرت میں داخل ہے۔ احکام اور فقہ میں اگر چہ اجتہاد ختم ہو گیا کیا معاشرتی زندگی میں بھی بند ہو گیا؟ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے جاتے اور اپنا خلیفہ نہ بناتے، کیا نبی سے زیادہ حق تعالیٰ کی ذات پر توکل دوسرے کا ہو سکتا ہے۔ بس یوں کہہ دیتے سپردِ خدا میں تو جا رہا ہوں، قرآنِ مجید توکل کے مضمون سے بھرا پڑا ہے جگہ جگہ ارشاد ہے کہ اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔ توکل بابِ تفعل سے ہے اس کا مادہ، و، ک، ل ہے اسی سے وکیل ہے اور وکیل جو کہ مادہ ہے مؤکل کا، مؤکل مُدّعی یا مُدّعیٰ علیہ ہوتا ہے تو وکیل مؤکل کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے اور توکیل کے معنی ہیں سپُرد کرنا لہٰذا مؤکل وکیل کو اپنا معاملہ سپُرد کر دیتا ہے کہ چونکہ آپ قانون جانتے ہیں آپ میرے وکیل ہیں اور یہ میرا معاملہ ہے تو گویا وکیل کا بولنا مؤکل کا بولنا ہوا، کوئی ضرورت ہو تو مؤکل بھی مشورہ دے سکتا ہے۔

ذاتِ باری تعالیٰ قانون ساز اور انبیاء قانون دان ہوتے ہیں:

اسی طرح خلیفہ مثلِ وکیل کے ہے اور وکیل قانون دان ہوتا ہے تو یہ خلیفہ انسان بھی قانون دان ہوا، اور ذاتِ باری تعالیٰ قانون ساز ہوئے۔ اور صحیح معنی میں قانون دان تو حضرات انبیائے کرام ؑ تھے اس کے بعد یکے بعد دیگرے تو اب وارثینِ انبیاء جو کہ خلیفہ اور نائب ہیں یعنی علماء وہ قانون دان ہوں گے کیونکہ پیغمبری ختم ہوگئی،

رسالت ختم ہوگئی۔

اپنے بعد خلیفہ بنانا چاہیے :

اور اُخْلُفْنِي سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعد میں جس آدمی سے متعلق اُمور ہوں وہ خلیفہ ہوگا اور اُمورِ متعلقہ سے مراد مثلاً بیوی، بچے، ماں باپ، بیٹا وغیرہ جن کا یہ ذمہ دار تھا اور اپنے اعزّہ اور قریبی رشتہ دار ہیں ان کا انتظام بھی کسی کے سپرد کردینا چاہیے۔ اس کا نام ہے خلیفہ اسی کو تعبیر کیا اُخلفنی کے لفظ سے اور پھر کہا کہ فِيْ قَوْمِي معلوم ہوا کہ گھر والے تو ہیں ہی قوم کی بھی ذمہ داری کچھ آئی ہوئی ہے اُن سے جو اُمورِ متعلقہ ہیں اُن کا انتظام رکھنا اسی سے یہ بات نکل آئی ہے کہ جب گھر سے چلو تو اپنے پیچھے اُمورِ متعلقہ اور متعلقین کے لئے کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر آؤ۔

اسی وجہ سے جب کوئی اُمام وغیرہ آنے کے لئے لکھتا ہے تو احقر جواباً لکھتا ہے کہ اپنے بعد کسی کا انتظام کر کے آؤ تا کہ کسی کو دُشواری اور پریشانی نہ ہو کسی قسم کی بھی رات کو سونے کا انتظام بھی کسی محرم دیانت دار کے سپُرد کرو (آجکل محرم دیانت دار بھی بہت کم ملتے ہیں) یہ جزئیات ہیں معاشرت کی تعلیم ہے۔

نواب مزمل اللہ خان صاحب عجیب قسم کے آدمی تھے اُن کے ہاں بہت ملازم تھے ریاست بھی بہت اُونچی تھی منصبی ریاست تھی مختارِ عام بھی ہوتے تھے اور مختارِ خاص کارندے بھی ہوتے تھے چوکیدار بھی۔ بعض دفعہ کوئی صاحب دوستوں میں سے کہتا، میاں نواب صاحب فلاں صاحب ملازمین میں سے لوگوں کو خوب دے رہے ہیں۔ جس کاشتکار کو چاہا زمین دے دی جس کو چاہا درخت بتلا دیا۔ نواب صاحب نے کہا کہ ایسا بھی ہوجاتا ہے۔ دوست کہتے نواب صاحب ایسے کو الگ کردیں، نواب

صاحب کہتے ٹھیک ہے لیکن مجھے کوئی ایسا لا کر دے دو جو کھاتا پیتا نہ ہو اور ایسا نہ کرے۔ دیکھوا تنے عرصہ اور زمانے میں تو وہ ہمارا مزاج شناس بنا ہم اس کے مزاج شناس بنے ہمارے کاشتکاروں کو جان پہچان والا بنا۔ زمین کو پہچانا اب ہم اس کو الگ کر دیں اب کوئی نیا آئے گا نیا تو پھر بھی نیا ہے ہم اس کو بھیج دیں تو مزاج شناسی کب پیدا ہو گی۔ ہاں اگر کوئی مزاج شناس ملے اور کاشتکاروں اور زمینوں کو بھی پہچانتا ہو تو خیر ورنہ رہنے دو، کھایا پیا ہی کرتے ہیں میں الگ نہیں کرتا۔ ان کے یہاں جو ملازم ہو گیا' ہو گیا، اُن کے یہاں علیحدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ہاں کوئی خود ہی چھوڑ جائے تو خیر۔ یہ ایک مثال ہے مخلوق کی مخلوق کے ساتھ معاملے کا برتاؤ۔

رُجُوعٌ اِلیٰ الْمَقْصُود:

گفتگو اس پر چلی تھی کہ جب گھر سے چلے تو نگراں و منتظم اپنا قائم مقام چھوڑ کر اور بتا کر جانا چاہیے تا کہ امورِ متعلقہ میں خرابی، تخریب نہ ہو جائے نیز متعلقین کی رہائش میں بھی کوئی پریشانی اور اُلجھن نہ ہو۔ جیسے تحصیلدار جب چھٹی پر جائے تو جگہ خالی رہے گی یا قائم مقام پٹواری کو بنا کر جائے گا اگر پٹواری نہ ہو تو نائب تحصیل دار جو کہ تحصیلدار کے عہدے پر آنے والا ہے۔

معاشرت کی چند نظیریں:

بڑا گھر میں ہے نہیں، نہ ہی کہہ کر گیا ہے، اُٹھ کر چلا آیا نہ یہ بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کب تک واپس آنے کا ارادہ ہے۔ بتا کر جانا چاہیے کہ میں فلاں جگہ جا رہا ہوں تا کہ اگر گھر والوں کو بعد میں کوئی پریشانی وقتی طور پر پیش آ جائے کسی کو بھیج سکیں یا خود جا کر بلا لیں اور جب یہ ہی معلوم نہیں کہ کہاں گیا ہے تو پریشانی کتنی ہو گی یہ سوء

معاشرت ہے۔ یا بصورتِ دیگر جلدی نہیں تو خط بھیج دیں اور رجسٹری وغیرہ کریں تا کہ مِل جائے اور ملنے کی اطلاع بھی آ جائے۔ یہ معاشرتی زندگی کی جزئیات ہیں جو الحمد للہ اس آیتِ قرآنی سے ثابت کی جا رہی ہیں۔

جہاں سے چیز اُٹھاؤ استعمال کر کے وہیں اپنی جگہ رکھ دو تا کہ دوسرے کو استعمال کرنے میں پریشانی نہ ہو معاشرت کے اختیار کرنے میں سہولت اور احتیاط ہے اور بد معاشرتی میں تنگی اور پریشانی ہے۔ رسول اللہؐ جب غارِ حرا جاتے تو بتا کر جاتے تھے حدیث میں آتا ہے: حُبِّبَ اِلَیْہِ الْخَلَاءُ، یعنی آپ کے دل میں خلوت کی محبت ڈال دی گئی اور یہ خلوت ہر عالم کے لئے لازم ہی نہیں بلکہ لازمِ علم ہے۔

خلوتِ قلب مطلوب ہے:

تب ہی علوم کا فیض و فائدہ ہوگا اور ایسا آدمی ہی فاعلِ حقیقی سے فیضیاب ہوگا ورنہ معلومات ہوں گی منتہی ہونے سے رہ گیا'' جلوت بضرورتِ خلوت بحقیقت اور خلوت جس طرح مکانی جسمانی ہوتی ہے اسی طرح خلوت بخلائے رسائلِ ذمیمہ مطلوب ہے جس کا نام خلوتِ قلب ہے کہ اب تو اس کے قلب میں خلوت آ گئی اور یوں کہہ رہا ہے کہ ہمارا دل تمام چیزوں کی طرف سے ہٹ کر آپ کی طرف آ گیا اب تو خلوت ہو گئی۔ قلب اصل ہے اور جب یہ اصل ہے تو پھر جلوت بھی خلوت ہے' تو پھر خلوت در جلوت ہے اسی کو صوفیاء کہتے ہیں خلوت در جلوت اس کی تحصیل فرض ہے طلبہ میں، بضرورت درسگاہ میں جا رہے ہیں یہ جلوت ہے مگر قلب میں خلوت ہے آنکھ بھی محفوظ' زبان بھی محفوظ' کان بھی محفوظ' ہاتھ بھی محفوظ' دل بھی محفوظ' اپنی جگہ ہو۔ ایک چیز استعمال ہو رہی ہے۔ ایک دلیل تو یہ ہوئی کہ حضور ﷺ فرما کر جاتے تھے کہ فلاں جگہ جا

رہا ہوں کہیں کوئی ضرورت پیش آجائے تو اطلاع دی جاسکتی ہے۔

دوسری دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے متعلقین اور اُمورِ متعلقہ کا انتظام کر کے جارہے ہیں کہ میں فلاں جگہ جارہا ہوں۔ایک اور بات کہ موسیٰ علیہ السلام یہ کہہ کر جارہے ہیں تیس دن اور کچھ دن مثلاً ہوسکتا ہے کہ تاخیر ہوجائے۔موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچ گئے اور کہہ کر جارہے ہیں کہ میں کسی ایسی جگہ نہیں جارہا ہوں اگر کچھ دیر ہوجائے تو پریشان مت ہونا بلکہ میں ایسی جگہ جارہا ہوں جو تہذیب ہی تہذیب ہے، وہاں غیر مہذب بات نہیں ہوگی اور جب تاخیر ہوجائے تو سمجھ لینا کہ وہ جس کو اللہ کہتے ہیں اُنہوں نے کسی ضرورت سے کسی فائدہ کے لئے زیادہ رکھ لیا ہوگا ورنہ انہیں تو معلوم ہے کہ نائب اور خلیفہ کو کہیں اُلجھن و پریشانی نہ ہوجائے۔ان کے علم میں ہے کہ کہاں گئے ہیں اور کس ذات کے پاس گئے ہیں وہ تو ایسے کے پاس گئے ہیں جو ساری پریشانیوں کو دور کرنے والا عالم الغیب ہے تم پریشان مت ہوجانا بس انتظام کو باقی رکھنا میں تمھیں اپنا قائم مقام بناکر جارہا ہوں لیکن اگر تذبذب کی شکل نہ ہو بلکہ تعین ہو تو اطاعت نہ آنے کی صورت میں کرنا لازمی ہے تاکہ اُلجھن سے حفاظت ہو ڈاک سے اطلاع کردو۔یعنی کوہِ طور پر وہاں ایسی ڈاکی ہے کہ (یہاں جو ڈاک نکلتی ہے ادھر اُدھر بھی ہوسکتی ہے) لیکن اُس ڈاک میں ڈاکیہ کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ ہے ''نبی کی فراست'' نبی کی فراست بتلا رہی ہے کہ تاخیر کسی اچھائی کے لئے ہوئی ہے کوئی فکر نہیں۔اسی فراست کو ہماری اصطلاح میں ڈاک کہتے ہیں تسلی مل رہی ہے گھبراہٹ نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا باری تعالیٰ سے کلام :

بہر حال موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے کلام شروع ہوگیا۔ وَكَلَّمَهُ

رَبُّهٗ یعنی موسیٰ علیہ السلام سے رب نے کلام فرمایا۔ اس کھوج میں مت پڑو کہ کلام کس طرح سے اور کیسا کلام تھا جیسی ذات ویسا ہی کلام، جیسا متکلم ویسا ہی کلام۔ چونکہ جس طرح ذاتِ باری تعالیٰ کی ذات میں کھودکرید میں نہیں لگنا چاہیے اسی طرح ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات میں بھی کھودکُرید نہیں کرنا چاہیے اور کلام بھی منجملہ صفات میں سے ایک صفت ہے تو اس صفت کے اندر کاوُ کاش کیسی؟ اجمالی ایمان ضروی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ مجھے اپنی رؤیت کرا دیجیے ایک نظر دیکھ لوں محبوبِ حقیقی مالکِ حقیقی کو۔ چونکہ رب کے معنی مالک کے ہیں کلام شروع ہوگیا جب کلام ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کا دل تڑپ گیا کہا : رَبِّ اَرِنِیْ، اے میرے رب میرے مربی حقیقی اے مالکِ حقیقی یہ سب لفظ ربّ سے نکل رہے ہیں : "اَرِنِیْ امر" حاضر معروف کا صیغہ ہے یعنی دکھلا دیجیے مجھے ایسی رؤیت جو کہ بنظرِ بچشم ہو جو کہ سر میں ہے نہ کہ بذریعۂ قلب۔

امکانِ عقلی پر شرعاً عمل کی گنجائش ہے :

حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی ہیں اور نبی سے خلافِ عقل بات ہو ہی نہیں سکتی تو ذاتِ باری تعالیٰ کی رؤیت عینی امکانِ عقلی ہونے کی وجہ سے ہے عقل جائز رکھ رہی ہے۔ چنانچہ عقلاً اس دُنیا میں ان آنکھوں سے دیکھنا محالِ عقلی نہیں ہے بلکہ ممکنات میں سے ہے اعتبارِ عقل گو اگر شرع منع کرے تو ان اعتباراتِ عقلیہ پر عمل کی گنجائش ہے یہ نئی بات ہے موسیٰ علیہ السلام تمام عقلمندوں سے زیادہ عاقل تھے ان کی عقل نے تجویز کیا اسی احتمالِ امکانی کے نکلتے ہوئے سوال کر دیا محال کا سوال اور اس کی درخواست تو ناجائز ہے مثلاً کوئی یوں کہے اے اللہ مجھے نبی بنا دو یا اب یوں کہے کہ مجھے صحابی بنا دو یہ

بات مناسب عقل ہے یا خلافِ عقل، فی نفسہ ہوسکتا ہے کہ وہ ذات نبی بنا دیں احتمال تو ہے چونکہ قادرِ مطلق ہے لیکن شرع منع کرتی ہے ذاتِ باری تعالیٰ منع فرماتے ہیں جس میں شرع آ گئی۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس احتمالِ عقلی پر جو گنجائش تھی درخواست کردی لیکن ذاتِ باری تعالیٰ نے فرمایا: لَنْ تَرٰانِیْ اور اس کے بعد فرمایا: وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰانِیْ وہ ذات کہہ رہی ہے کہ ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے اس کے بعد موسیٰ کی طلب بغایتِ شوق بوثوق دب گئی شوقِ موسیٰ علیہ السلام شق ہوگیا، اس سے یہ جزئیہ معلوم ہوا کہ بڑے کے جواب کے بعد اصرار نہیں کرنا چاہیے خلافِ ادب ہے۔ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خلافِ ادب بات ہوسکتی ہے اور جب اعتمادِ کامل، اعتقادِ جازم ہو پھر اصرار کیسا؟ چھوٹے میں تابعیت کی شان غالب ہونی چاہیے چھوٹے کا شوق بڑے کے سامنے شق ہو جائے اسی پر بہت سی جزئیات متفرع ہوسکتی ہیں مثلاً شیخ نے کہا کہ شب میں تہجد کی چار رکعات پڑھ لیا کرو اور یہ شوق میں آٹھ یا بارہ پڑھ رہا ہے۔ کہا یہ تھا کہ ایک ہزار مرتبہ ذکر کرو اور اس طرح اس وقت کرلیا کرو اور جب کچھ لذت سی آئی بڑھا دیا اضافہ کر دیا، تو یہ شوق پورا کرنا ہے اتباعِ شیخ نہیں ہے۔ نفس نے ایسا شوق کا راستہ بتلا دیا جو کہ خلاف بھی ہے اور خراب بھی ہے اور حکم یہ ہے: وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ اور منجملہ مفسدین کے نفس مفسد ہے۔ یعنی جو آدمی میں رکھا ہوا ہے اس کی پیروی کیسی؟ اصرار نہیں کیا اور لَنْ تَرٰانِیْ میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس جواب میں موسیٰ علیہ السلام کو تسلی فرما رہے ہیں کہ ہرگز تم مجھ کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیسے معلوم ہوا کہ نہیں دیکھ سکتے چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ تو عالم الغیب ہیں

کوئی اور احتمال پیدا ہو سکتا ہے وہ ذات قادرِ مطلق ہے کہ دکھانا چاہیں تو دکھا سکتے ہیں۔

لَنْ تَرَانِیْ فرمایا لَنْ اُرِیْکَ نہیں فرمایا :

لیکن تو اے موسیٰ علیہ السلام دیکھ نہیں سکتا یوں نہیں کہا کہ میں دکھا سکتا نہیں بلکہ یوں کہا کہ تو دیکھ سکتا نہیں، چونکہ وہ قوت نہیں، سہارا نہیں تحمل نہیں کہیں یہ کھیل کھیل نہ بن جائے، جان ہی چلی جائے آگے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک تماشا دکھا دیا ذرا پہاڑ کی طرف دیکھو اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک رؤیت کا ظہور دوسری نوعیت کے ساتھ یعنی تجلّی پہاڑ پر ڈال دی۔ ''ظہورِ تجلّہ کے معنی میں'' بس پہاڑ پر ڈالنا تھا پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے برداشت نہیں کر سکا، پہاڑ کا وزن پہاڑ کا جسد، پہاڑ کا طول وعرض اور مضبوطی ظاہر ہے کہ جرم انسانی سے اس کا جرم عمیق ہے اب جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس پر نظر پڑی تو خَرَّ مُوسىٰ صَعِقًا یعنی موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو گئے من حیث النبوّت نہیں گھبرائے بلکہ ایک تجلّی جو سامنے آئی اور پہاڑ پر جو اس کی ہیبت قائم ہوئی یہ جرمِ انسانی بے ہوش ہو کر گر گیا یہ سوچا کہ یہ پہاڑ اور ایک میں، اُن کی نظر اپنی شانِ نبوّت کی اکملیت پر پڑی؟ جن کا جلال مشہور ہے انبیاء علیہم السلام مختلف اوصافِ حمیدہ سے متصف ہوتے ہیں گو شانِ نبوّت تو بہت اُونچی چیز ہے لیکن جسم کیا کرے بتقاضائے بشری حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک ہیبت طاری ہو گئی۔

معلوم ہوا کہ جب نبی کا یہ حال ہے ایسی چیز کے سامنے آنے پر اگر ولی کی یہ حالت ہو جائے، وحشت ہو جائے، گر گرا جائے تو یہ خلافِ ولایت نہیں ہے جبکہ وہ اندر سے سنبھلا ہوا ہے ظاہر پر ایک اثر پڑ گیا من حیث الجسم اور باطن پر کوئی اثر نہیں۔

رجوع الی الابتداء:

حقیقی مجاہد کو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت صحابہ جہاد سے فارغ ہو کر آئے کہ تم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ کر آئے، یا رسول اللہ ہم جہاد اصغر میں گئے تھے......؟ فرمایا ہاں جہادِ اکبر وہ ہے جو مکہ معظمہ میں رہ کر تیرہ سال کرایا یعنی اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ اس کے بعد جہادِ معنوی جسم کے ساتھ آیا جسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔ تیرہ سالہ زندگی گزار دی لیکن نماز پنج وقتہ ہجرت سے ایک سال قبل فرض ہوئی چونکہ جب جہادِ نفسانی اور جہادِ اخلاقی سے بزوال اخلاقِ رزیلہ فارغ ہو گئے اور حسنات پیوست ہو گئے اب اس کو عمل میں دیکھا کہ آیا مجاہد صحیح معنی میں بنے بھی ہیں یا نہیں۔ اور پانچ وقت کی عجیب قسم کی قید لگا دی ایسا نہیں کہ جس طرح جب چاہا ادا کر لیں نہیں نہیں چونکہ جب تمہارے اندر ایک نظام آ گیا تو یہ نظام عملی بھی نظام کے ساتھ ہے بدنظمی کے ساتھ نہیں اس لئے کہ بدنظمی سے فساد ہوتا ہے اور نظم سے فساد ختم صلاح و درستگی آجاتی ہے اخلاق میں بدنظمی کی مثال جیسے ریاء وہ چلی گئی اور نظم یعنی اخلاص آ گیا علی ھذا القیاس تکبر گیا، اس کے مقابل تواضع آ گئی، اسی طرح تمام اخلاقِ ذمیمہ جو کہ فی الحقیقت بدنظمی کی جڑیں ہیں، ان کی جگہ قلب میں نظمِ صحیح یعنی حمیدہ پیوست اور راسخ ہو گئے ظاہر کی بدنظمی بھی ختم اور اندر کی بدنظمی بھی ختم ہو گئی۔

دین پورے نظم کا نام ہے:

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ دین پورے نظم کا نام ہے بدنظمی کو دین گوارا نہیں کرتا اخلاقِ حمیدہ و اخلاقِ حسنہ کمالِ نظم کا نام ہے۔ اس کے مقابل اخلاقِ

رزیلہ پوری بدنظمی کا نام ہے۔ بدنظمی میں فساد اور نظم میں اصلاح، نظم میں امن اور بدنظمی میں بدامنی ہے، اعمال میں پہلی چیز عمل بدرجۂ حال پیوست' بحصولِ ملکہ اخلاقِ حمیدہ' بزوالِ اخلاقِ رزیلہ جسے اللہ تعالیٰ نے پنج وقتہ نماز نظم کے ساتھ مقرر فرمائی مثلاً اوقات کا تعین بقدرِ شرعی تو توسیع وگنجائش ہے وہ تو ایک عارضی چیز ہے اجتماع کے لئے اعلان کہ سب جمع ہو جائیں اس کی بھی ایک جگہ مقرر کر دی گئی یعنی مسجد توسع کو چھوڑو، بیمار ہو گیا گفتگو اصل اس پر ہو رہی ہے، نیز نماز ہر کس و ناکس کے پیچھے نہیں بلکہ امام کے پیچھے جو نماز کی حقیقت اور اس کے آداب کو پہچانتا ہو کیف ما اتفق نہیں بلکہ تسویۂ صفوف یعنی صف بندی کے ساتھ ایسا نہیں کہ جس طرح چاہو کھڑے ہو جاؤ بلکہ اس کا بھی ایک نظام ہے کہ کس طرح کھڑے ہوں صف سیدھی مستقیم ہو تا کہ پُلِ صراط بھی مستقیم ہو۔ اور ایسے کھڑا ہو کہ اِدھر سے کمان میں تیر رکھ کر چلائیں تو وہ تیر سیدھا نکل کر چلا جائے۔

دین نام ہے نظام کا' اگر جزئیات عرض کی جائیں تو مہینوں چاہئیں پوری زندگی دین کے ساتھ رہو جس کا نام ہے نظام، آپ نے نظم سُنی ہو گی، شاعر نے نظم کہی پہلا مصرعہ چھوٹا اور دوسرا مصرعہ بڑا کوئی اس کو نظم کہے گا؟ معلوم ہوا کہ کلام میں بھی نظم، خود نظم سُننے والا کہے گا کہ یہ تو بدنظم ہے اور نماز میں اگر نظم نہیں ہو گی تو قبولیت کہاں ہو گی۔

آیت کی تفسیر اور اَسرار و رموز :

اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو خلیفہ بنا کر بھیجا چنانچہ فرمایا: وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ۔ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

یعنی اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے کہ اس نے تمہارے بلا اختیار تم کو با اختیار خلیفہ

بنایا جہاں جَعَلْ کا لفظ آتا ہے وہاں یہی معنی مراد ہوتے ہیں مثلاً کہا جائے جَعَلَ اللَّیْلَ۔ جَعَل کا استعمال ہوا لیکن لیل آپ کے اختیار کی ہے؟ بلا اختیار با اختیار دیکھو احسان مانو نعمت کو سوچو، اے مٹی کے پُتلے مٹی سے پیدا کیے ہوئے مٹی میں تم کو صاحبِ اختیار بنا دیا اور جو صاحبِ اختیار ہوتا ہے وہی مکلف ہوتا ہے۔ تمہیں اس ذات نے زمین میں صاحبِ اختیار مکلّف بنا کر بھیجا اور خلیفہ کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کو اور کیسا ہونا چاہیے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

لہٰذا تخلقو باخلاق اللہ کے مصداق اوّل وہلہ میں بن جاؤ خلیفہ میں اس کا وصف ہونا چاہیے پھر اس کا ظہور ہو بخلقِ اعمالِ ظاہرہ۔ آگے فرمایا تم میں بعض کا بعض پر درجہ بلند کیا درجہ بدرجہ کیوں بلند کیا اس کی حکمت میں ارشاد فرمایا تا کہ تمہیں آزمالیں تم کو اس چیز میں جو تم کو عطاء کی گئی ہے۔ منعمِ حقیقی نے جو نعمت دی ہے اس میں تم کو آزمائے کہ کون قدر کر کے طاعت فرمانبرداری کرتا ہے اور کون بے قدری کر کے نافرمانی کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کا مطیع کے ساتھ معاملہ کچھ اور ہے تو غیرِ مطیع کے ساتھ معاملہ کچھ اور ہے اسی وجہ سے فرماتے ہیں کہ تیرا ربّ بہت جلدی سزا دینے والا ہے۔ چنانچہ موت کے بعد بہت جلد ہی عقاب ملنے والا ہے اور یہ سزا نافرمانوں کے لئے ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ یقیناً وہ بڑا بخشنے والا ہے بہت رحم کرنے والا ہے یعنی اگر نافرمانی سے فرمانبرداری کی طرف آ گیا تو اس نافرمانی کا خیال نہیں فرمائے گا۔

معاف کرنے کی عادت ہونی چاہیے:

آج کل ہمارے ساتھ کچھ بات خلافِ طبیعت ہو جائے معافی ہی نہیں ہوتی، بیوی معافی مانگ رہی ہے میاں روٹھ رہے ہیں تکبّر آ گیا معاشرت کی زندگی میں ذرا

سا بہانہ اس کے عجز کا مل جائے چاہے دل میں اس کی موافقت نہ ہو حق تعالیٰ فرماتے ہیں معاف کرو ظاہر پر نظر رکھو باطن کی طرف نظر مت کرو تب ہی معاشرت اچھی رہے گی۔ نافرمانی سے فرمانبرداری کا خیال آ گیا نافرمانی پر میری کوئی نظر نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ماضی کا رنج مت کرواے صاحبِ توبہ اور مستقبل کی فکر کرو کہ کہیں پھر ایسا نہ ہو جائے البتہ حال کا اہتمام رکھو سعی اور جدوجہد کے ساتھ تاکہ مجاہدہ ہاتھ سے نہ نکل جائے اس سے بے فکری نہ ہو جائے اگر خیال کرو گے تو ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف انجذاب وکشش نہ ہو گی اور ضرورتِ دنیاوی میں جی نہ لگے گا اور اعمالِ آخرت میں بھی جذبہ نہ رہے گا۔ آگے فرمایا، جو فرمانبردار رہتا چلا گیا نافرمانی سے رُکا ہوا اور فرمانبرداری سے چلتا رہا اس پر رحمت کا ظہور ہو گا۔ نافرمانوں کے ساتھ سریع العقاب ہوں اور نافرمانی سے بچنے والوں کے ساتھ غفور الرحیم ہوں۔ یہ تین لفظ ہوئے، فرمانبردار رہتا چلا گیا اور زندگی گزار دی رحیم ہے نافرمانی سے فرمانبرداری میں آ گیا غفور ہے نافرمانی میں رہتا چلا گیا عقاب ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ جو عقاب سے بچ کر مغفرت ورحمت کا مستحق بن جائے وہ ہے صحیح معنی میں خلیفہ برنگِ توحید صحیح، کامل مطیع بطاعت، بذوقِ حدِ شرع ظلم سے ہٹا اور عدل توفیقِ الٰہی سے آ گیا تو سب کے ساتھ عدل ہوتا چلا گیا اخلاقِ ذمیمہ سے ہٹا جو کہ ظلم تھا اخلاقِ حمیدہ کا پیوست ہو جانا ان کا ملکہ ہو جانا جو کہ عدل ہے۔

لہٰذا تو عدل کا مستحق بن کر اور عادل ہو کر سب کے ساتھ عدل رکھ اور عدل ہی میں امن ہے نظم ہے اور بے عدلی میں بدامنی بدنظمی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اس اسلامی عدل، نظم پر تا حیات قائم رکھیں۔

چھتیسویں مجلس

اہل اللہ شریعت وطریقت کے جامع ہوتے ہیں

مورخہ ۲۰ ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ بمطابق ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۹ء بروز یکشنبہ بوقتِ صبح

وقت کو نبھاتے ہوئے شریعت کو نبھانا چاہیے :

حضرت والا حکیم الاُمتؒ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ میں پیرانِ کلیر شریف چلا گیا مجھے خبر نہیں تھی کہ وہاں عُرس ہو رہا ہے بڑے بڑے موٹے موٹے لٹھیت پھر رہے ہیں۔ میں جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ''او مرغے او مرغے'' یہ لوگ کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں بالکل آزاد۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کہا ''ارے بھائی تجھے ہی تو کہہ رہا ہوں مرغے'' ......! میں چلا گیا، کہا فقیر کا لٹھکا (نکتہ) سُن۔ ہم فقیروں کی روحیں عالمِ ارواح میں جس وقت اللہ تعالیٰ کے قریب کھڑی تھیں اور مولویوں کی روحیں بہت دور تھیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''بھنگ بوزہ'' ہم چونکہ قریب

کھڑے تھے ہم نے صحیح سمجھ لیا۔ اور مولوی چونکہ دور کھڑے تھے وہ ٹھیک طرح سمجھے نہیں اور مطلب اس کا یہ تھا کہ بھنگ گھوٹ گھوٹ کر پیا کرو یعنی بھنگ بوزہ، اور مولوی سمجھے نماز روزہ۔ تو مولویوں نے نماز روزہ کو پکڑ لیا اور کہا کیا تھا؟ بھنگ بوزہ۔ بس جا فقیر کا یہ لٹھ کا یاد رکھنا۔

اس رئیس نے حضرت والا سے کہا کہ حضرت مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے یہ خیال کیا کہ میں یہاں اجنبی ہوں اور یہ موٹے موٹے پھر رہے ہیں لٹھنگ ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے، کسی ایک نے اگر مجھے مار دیا تو میرا کام خراب ہو جائے گا، اب میں وہاں کیسے بولتا مگر غصہ تو بہت آیا۔ وقت کو نبھانا اور اس کے ساتھ شریعت کو نبھانا یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی موقعہ شناسی :

بھنگ پینے کا زمانہ تھا، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر قدس سرہ العزیز کے پاس ایک دوکاندار آیا اور کہا کہ اور دوکانداروں کی بھنگ خوب بکتی ہے میری دوکان سے بھنگ نہیں بکتی، کوئی تعویذ لکھ دو تا کہ میری دوکان سے بھنگ بکنی اچھی ہو۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا بہت اچھا، تعویذ لکھ کر دے دیا اور فرمایا اس کو بھنگ گھونٹنے کے ڈنڈے میں باندھ لینا وہ شخص کچھ روز بعد مٹھائی لے کر حاضر ہوا، اجی آپ نے جو تعویذ دیا تھا تو میری دوکان سے بھنگ بکنی خوب اچھی ہوئی ہے اور خوب نفع ہوا ہے یہ آپ کے واسطے مٹھائی لایا ہوں بہت اچھا رکھ دو، چلا گیا۔ وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا کہ حضرت پہلی بات تو یہ ہے کہ بھنگ حرام ہے اور آپ نے اس کے لئے بھی تعویذ دے دیا کیا یہ جائز تھا؟ اور دوسرے پھر اسی

مال کی کمائی سے مٹھائی لایا آپ نے لیکر رکھ لی۔

آپ نے فرمایا اچھا اچھا، خادم سے کہا کہ بھئی دیکھو جو یہ ابھی آیا تھا اس کی دوکان پر جاؤ اور اس سے کہنا کہ وہ تعویذ دے دوا بھی واپس کردیں گے، تعویذ آ گیا تو مولانا نے وہ تعویذ اس معترض صاحب کو دے دیا کہ کھول کر پڑھ لو۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ ''جن کے لئے بھنگ پینا لکھا ہوا ہے'' بس یہ تھا تعویذ کہ کہیں اور نہ پی لے یہاں۔ معترض دنگ کر رہ گیا کہ یہ کوئی چیز ہے؟ یہ تو حوالہ ہے جاؤ دے کر آ جاؤ، رہی مٹھائی والی بات تو یہاں دہلی میں بہت سے لڑکے ہیں جن بیچاروں کو ضائقہ کبھی نصیب ہی نہیں ہوا اور وہ اس کے مستحق ہیں۔ ایسا زمانہ گزر رہا ہے کچھ مت پوچھئے۔

لہجہ اور انداز سے بھی بڑوں کی بے ادبی نہیں ہونی چاہیے :

برطانوی حکومت ہے بابا فرید الدینؒ اور سلطان جیؒ کا زمانہ ہے، بابا صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایسی پرانی کتاب میں پڑھا اور سمجھا تھوڑا ہی جاتا ہے! یہ کہہ دیا اور مجلس ختم ہوگئی سب اُٹھ کر چلے گئے۔ بابا صاحب کے صاحبزادے نے باہر آ کر نظام الدین صاحب سے کہا کہ کچھ معلوم بھی ہے کہ بابا صاحب نے کیا فرمایا؟ سُلطان جی نے کہا کہ ہاں معلوم ہے اور سُنا ہے۔ صاحبزادے نے کہا اچھا تو آپ اس سے کیا سمجھے؟ بابا صاحب ناراض ہو گئے ہیں۔ سُلطان جی میں نے یہی تو کہا تھا کہ فلاں صاحب کی جو کتاب ہے وہ صاف و شفاف ہے پڑھنے میں بڑی آسانی ہوگی! صاحبزادے نے کہا تو بابا صاحب نے کس لہجہ سے کہا تھا؟ سلطان جی نے کہا جی ہاں یہی فرمایا تھا کہ ایسی پرانی کتاب میں آسانی سے پڑھا اور سمجھا تھوڑا ہی جا سکتا ہے، صاحبزادے نے کہا تو پھر بابا صاحب کے اس لہجہ اور اس طرح سے کہنے کا کیا مطلب۔

ہوا؟ آپ نے فرمایا: بابا صاحب کی استعدادِ علمی پر اعتراض کیا ہے۔ آپ کے اس طرح کہنے سے بابا صاحب کے علم میں کمزوری ظاہر کرنا ہے یہ کہہ کر ادھر اشارہ ہے، سُلطان جی نے کہا او ہو میرے تو وہم وگمان میں بھی یہ نہیں تھا۔

سر سیّد احمد خان کی مولانا رشید احمدؒ کو

دعوتِ جلسہ اور آپ کا جواب:

علی گڑھ کالج کی سر سیّد احمد خان نے بنیاد ڈالی جیسا کہ مشہور ہے اور یہ مولانا قاسمؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ساتھیوں میں سے تھے وہ اس طرف چلے گئے انہوں نے علی گڑھ کالج میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا، ان کو برطانوی حکومت سے سَر کا خطاب ملنا تھا۔

انہوں نے ایک دعوت نامہ مولانا رشید احمدؒ کے نام لکھ کر ایک مولوی صاحب کو دیا کہ یہ دعوت نامہ مولانا کی خدمت میں پہنچا دیجیے۔ ان مولوی صاحب نے لا کر پیش کر دیا، مولانا گنگوہیؒ نے پڑھا اور پڑھ کر فرمایا: (دیکھو ہمارے اکابرین واسلاف اپنے ہم عصر کا ایک دوسرے کا کس درجہ لحاظ کرتے تھے اس کا بھی اندازہ کرتے رہو اور آج کے ہم عصر ایک دوسرے کو دبانا چاہتے ہیں) کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ میں تو ان باتوں سے کچھ ایسا واقف نہیں ہوں، ہمارے بھائی مولانا قاسم صاحبؒ کو دیدیا جائے وہ پڑھ کر اگر شرکت کو منظور فرمالیں تو مجھے بھی منظور ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مولانا قاسمؒ مولانا گنگوہیؒ کے دروازے پر آپہنچے۔ سلام ومصافحہ اور مزاج پرسی کے بعد فرمایا کہ سر سیّد احمد خان کا خط آیا ہے ذرا پڑھ کر دیکھ لیں اور اس کا جواب بھی لکھ کر دے دیں۔

حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کی کمالِ ذہانت :

مولانا قاسمؒ نے فرمایا: دیکھو بھائی! آدمی چار قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ ہوتے ہیں کہ جن کی عقل بھی صحیح اور نیّت بھی صحیح، اور ایک اس کا اُلٹ کہ نہ عقل صحیح اور نہ نیّت صحیح۔ تو بھائی ہم مسلمانوں کو ایسا تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ تو مؤمن ہیں اب آگے چلو عقل تو صحیح ہے لیکن نیت صحیح نہیں اور ایک نیت تو صحیح ہے لیکن عقل صحیح نہیں۔ یہ چار اقسام کے لوگ ہوتے ہیں کسی کی نیّت پر حملہ کرنا تو صحیح نہیں، ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سر سیّد احمد خان کی نیّت صحیح نہیں، ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی عقل دُرست نہیں اور ہمارے خیال میں جس کی عقل صحیح نہیں تو اس کے ساتھ شریک ہونا کہاں دُرست ہوسکتا ہے۔ اس لئے میں تو معذور ہوں، مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ شریک ہوں گے تو میں بھی شریک ہوں گا اور یہ منع کر رہے ہیں تو میں کیسے شریک ہوں۔

کلام کرتے ہوئے بے فکری نہیں ہونی چاہیے :

اسی کو حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی سے تکلیف پہنچی، ارے بھائی تمہاری اس بات سے تکلیف ہوئی، اجی میں نے جان کر تکلیف نہیں دی ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ آپ نے اِس کا اہتمام نہیں فرمایا کہ میرے اس جملے سے کہیں تکلیف نہ ہو جائے۔

اسی طرح سلطان نظام الدینؒ صاجزادے سے فرما رہے ہیں کہ میری تو یہ نیت نہیں تھی، میرے خیال میں بھی نہیں وہ ایک بات تھی میرے منہ سے نکل گئی۔ صاجزادے نے فرمایا ٹھیک ہے کہ نیت نہیں لیکن جملہ تو ایسا ہے جس کے [illegible]

ہیں کہ آپ نے اپنے شیخ کی قلتِ استعداد پر حملہ کیا ہے۔اس کتاب کا نام ''فُصوص الحکم'' ابنِ عربی کی کتاب ہے، تو دیکھئے سُلطان جی کی یہ نیت نہیں تھی، کبھی بے فکری سے ایسا ہو جاتا ہے۔

شیخ مُرید کو کلام کرنا بھی سکھاتا ہے :

اور حضراتِ مشائخ جب اپنے طالبِ اِصلاح کو دیکھتے ہیں کہ یہ چلتا چلا جا رہا ہے لطیف لطیف نقطوں کی طرف اور لطیف لطیف تبرّع کی طرف، یہ دیکھ کر شیخ جہاں اس کے کام کی تصحیح پر تصحیح کرتا چلا جاتا ہے وہیں اس کے کلام کی بھی تصحیح پر تصحیح کرتا چلا جاتا ہے۔اور ہر ایک کے ساتھ ایک معاملہ نہیں، گاؤں والے کے ساتھ کچھ اور شہری کے ساتھ کچھ اور معاملہ ہے۔خاندانوں کا فرق پڑ جاتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو اس کے کلام کی بھی اصلاح اور تصحیح کہ تم سوچ کر کیوں نہیں بولتے ؟ ابھی طبیعت اس نوعیت کی کیوں نہیں بنی اس کو پکڑ کر کھینچو، اس کی کھینچاوٹ کرو۔

دیکھیے سُلطان نظام الدّینؒ جن کا لقب محبوبِ سُبحانی ہے لیکن شیخ کی طرف سے اس وقت اصلاحِ کلام اور اظہارِ گرانی ہو رہی ہے جبکہ ان کی نیت بھی اچھی تھی۔

محبوبِ سُبحانیؒ کا اپنے شیخ سے معافی مانگنا :

حضرت نظام الدّینؒ صاحبزادہ صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ آپ نے تو اِدھر توجہ دلائی ہے، اب میرا منہ سامنے جانے کو نہیں پڑتا۔آج کل کی طرح نہیں کہ میں نے کیا کہہ دیا تھا یہ بھی کوئی ناراضگی کی بات تھی گھر کو چل دیا کہ کل کو کچھ اور بات ہو جائے گی تو اور ناراض ہو جائیں گے۔دیکھو کیسا اچھا اعتقاد لے کر آیا تھا کہ ذرا روک

ٹوک ہوئی گھر کو چل دیا، امتحان ہو گیا۔ امتحان دو طرح کا ہوتا ہے اختیاری اور غیر اختیاری۔

متقدمین مشائخ نے تو اختیاری امتحانات بھی لئے ہیں یہ غیر اختیاری امتحان ہو گیا۔ اب صاحبزادہ گیا ابا جان کے پاس کہ نظام الدین کو بھی رنج ہو رہا ہے جب ان کو یہ بات سمجھائی گئی وہ تو غم میں رو رہے ہیں، ابا جان معاف کر دیجیے، جاؤ جاؤ یہ ایسی بات نہیں جو اس طرح سے معاف کر دی جائے معافی نہیں ہے، اب بھی نہیں بھاگے اور آنسو آ گئے۔ اُس وقت تو دل رو رہا تھا اب آنکھیں بھی رو رہی ہیں۔ پھر صاحبزادہ کی خوشامد کر رہے ہیں۔ صاحبزادہ پھر چلے گئے، ابا جان وہ رو رہے ہیں جاؤ جاؤ ایسے معافی نہیں ہوگی۔ بیچارے نظام الدین آدھے نہ رہے، سوکھ گئے پھر خوشامد کر رہے ہیں ہاتھ جوڑ رہے ہیں تین چار دفع کے بعد جب دیکھا کہ علاج پکا ہو گیا ہے اور صحیح فکر پیدا ہو گئی ہے۔ بظاہر تو کچھ بات نہیں تھی اور میری ناراضگی دیکھ کر جما ہوا ہے، تین چار دفع خوب اچھی طرح کس دیا، پھر فرمایا بُلا لاؤ جا کر بیٹھ گئے۔ بابا فرید الدینؒ گنج شکر بہت بڑے عالم تھے علوم میں تبحر حاصل تھا اور سلطان جی بھی بہت بڑے عالم تھے اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ عالم نہیں تھے جن کے خلیفہ بابا فرید الدین ہوئے اور یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ تھے وہ بھی عالم نہیں تھے مولوی بھی نہیں تھے لیکن مولوی گر تھے۔

حاجی امداد اللہؒ کا عِلم علمائے ظاہر سے زیادہ تھا:

بقول مولانا قاسم صاحب کے کہ جب کسی نے کہا کہ آپ اتنے بڑے عالم ہو کر حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچ گئے جن کا کُل علم کافیہ تک تھا۔ فرمایا تم کیا جانو ہمارا

عِلم اورطرح کا ہےاوراُن کاعِلم اور طرح کا ہے۔ ہماراعِلم تو ایسا ہے کہ کسی مکان کے دروازے کو دیکھا بہت عمدہ اور بہت اچھا ہے ہم سمجھے کہ اندر کے کمرے بھی ایسے ہی خوشنماں ہوں گے، اور حاجی صاحب نے تو اندر جا کر کمرے دیکھے ہیں کہ ایسے ایسے ہیں تو دروازہ سے پتہ نہیں چلایا بلکہ اندر جا کر پتہ چلایا کہ ان کی معرفت اندر جا کر دیکھنے کے مثل ہےاور ہماری معرفت اتنی ہے کہ بس دروازہ دیکھ کر کمروں کو قیاس کرلیا تو کہاں اُن کاعِلم اور کہاں ہماراعِلم ۔حدیث شریف میں آیا ہے: ''مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ اَوْ رَثَہُ اللّٰہُ عِلْماً مَالَمْ یَعْلَمْ'' کہ جس نے صحیح عِلم کے ساتھ صحیح عمل کیااور کرتا چلا گیا تو اُسے وارث بنائیں گے اللہ تعالیٰ ان علوم کا کہ اس نے کبھی وہ علوم حاصل بھی نہیں کیے۔ جو اولیاءَ اللہ مشائخ گذرے ہیں وہ ایسے ہی ہوئے ہیں۔

پہلے زمانہ کی نسبتی اور نسبی اولاد بادب تھی :

اور پہلے زمانہ میں نسبتی اولاد بھی اور نسبی اولاد بھی ایسی ہی ہوتی تھی اب ایسی نہیں رہی اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ ۔ ہمارے ماموں صاحب اولاد ہو گئے تھے لیکن ہماری نانی صاحبہ کبھی کبھی ماردیا کرتی ہیں۔ بیچارے پٹ لیتے تھے لڑکی کہتی نماں یہ اولاد والے ہو گئے ہیں اب بھی آپ ان کو مارتی ہیں۔ امّاں جان کہتی ہیں اولاد والا ہو گیا ہوگا یہ تو ابھی بچہ ہے۔اور آج کل اولاد کو پٹ کر دیکھو صبح کو ملے گی نہیں مجھ پر کوئی ایسا دن مشکل ہے کہ لڑکا اس میں بھاگ گیا نہ ہو دُعا کرو۔ رات کو دیر سے آیا کرتا تھا میں نے رات ڈانٹ دیا صبح کو معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ ماں رو رہی ہے دُعا کرو۔

ایک حافظ صاحب کی حکایت :

ہمارے ایک عزیز تھے ان کا لڑکا ایک پکّے اور بہت پُرانے حافظ کے ساتھ

حفظ کیا کرتا تھا۔ جب ان کا پڑھایا ہوا لڑکا حفظ پورا کرلیا اور رمضان شریف آتا تو پہلے قرآن خود سُنتے تھے۔ ایک روز ہمارے عزیز کا لڑکا پڑھ رہا تھا، سروتا ہاتھ میں چھالی کاٹ رہے تھے اُستاد صاحب نے ایک دو جگہ بتلایا پھر بھول گیا تو استاد نے اُس کو بہت ماردیا اور لگتے ہی خون نکل گیا۔ اب حافظ جی بھی گھبرائے خون صاف کیا وہ بند ہو گیا، گھر آیا ماں باپ اُلٹا اُسی کو ڈانٹ رہے ہیں کہ ہم تجھ سے کہتے تھے کہ اچھی طرح یاد کرلیا کرو۔ کیوں یاد نہیں کرتے بڑا اچھا ہوا۔

اور آج مہتمم صاحب کے پاس آرہے ہیں کہ تم نے یہ حافظ رکھا ہے یا قصائی۔ دیکھو میرے بچے کو کیسے پیٹ رہا ہے تو ایسے میں کیا پڑھ لے گا۔ اس وقت کی نسبتی اور نسبی اولاد میں ادب بالکل نہیں رہا۔

شیخ کی خواہش :

اور وہاں ذرا سی بات کہنے پر ناراض ہورہے ہیں اور آسانی سے معاف بھی نہیں کررہے تاکہ کلام کرنے میں بھی لطافتِ طبع آجائے اور سمجھ جائے کہ مجھے اُستاد سے کس طرح بات کرنی ہے باپ سے کس طرح بات کرنی ہے، شیخ سے کس طرح بات کرنی ہے۔ یہ اصلاحی باتیں پیش کی جارہی ہیں کہ قوتِ فکر یہ اتنی قائم ہوجائے اگر اجنبی بھی بات کرے تو کوئی جملہ لڑائی کا اس منہ سے نہ نکلے۔ رنج کی کوئی بات منہ سے نہ نکلے، یہ شیخ کی خواہش ہوتی ہے۔

سلوک میں قدم رکھنے کی مثال :

اس طرح اس کو مسک اور مسوس رہا ہے اوکھلی میں لاکر موسل مار رہا ہے۔

مشہور ہے کہ جب چاول کا پودا لگاؤ تو اوپر سر تک پانی اور جب تک کاٹنے کے قابل نہ ہو تو سر تک پانی اور جب کاٹ کر گھر آ جائے اور پکانا چاہو تو سر تک پانی میں بھگوؤ اور جب چولہے پر رکھو تو سر تک پانی رکھو اور جب پیٹ میں جائے تو پانی پیو، چاول بہت پانی چاہتا ہے تب جا کر ہضم ہوگا۔

تو ایسے ہی سلوک کی چاہ تصوّف وتزکیہ کی چاہ کہ جب اوکھلی میں دیا سر تو پھر موسل سے کیا ڈر۔ یہ ایک محاورہ ہے کہ جب نفس کو ٹھیک اور عمدگی کے ساتھ سنوارنا چاہا تو پھر شیخ کے موسل سے کیا ڈرنا۔

شیخ کے ڈانٹنے پر طالبِ صادق کو خوشی ہوتی ہے :

کہ اور مار لو تو وہ خانقاہ سے بھاگتا نہیں بلکہ خانقاہ میں پختگی کے ساتھ آتا ہے اس لئے کہتا ہے کہ نکل جاؤ اگر کچا ہے تو نکل جائے گا اور اگر پکا ہے تو اور پکا ہو جائے گا۔ اس لئے شیخ کلام کی بھی، زُبان کی بھی اصلاح کرتا ہے، تاکہ باہر جا کر مخلوق کے ساتھ معاملہ پڑ کر اور خوب سوال وجواب کے باوجود بھی نفس پر قابو پا رہا ہے اور کوئی بات زُبان سے بے جا نہیں نکل رہی یہ چاہتا ہے شیخ۔ اگر مُرید سمجھدار ہے اور سمجھ کر قدم رکھا ہے تو یوں کہتا ہے بہت اچھا اور مار لو اور کہہ لو، اوروں کا پھول برسانا میرے اوپر اور آپ کا ڈنڈا برسانا اوروں کے پھولوں سے بہتر ہے تب بنتا ہے اگر بننا چاہے۔ ورنہ تو قناعت ہو رہی ہے کہ بس نماز کا پابند ہو گیا، جماعت کا لحاظ ہو گیا یہی بہت ہے۔ پہلے گالی دیا کرتا تھا اب گالیوں سے رُک گیا اب تو یہ قناعت ہو رہی ہے اس زمانے کے اعتبار سے یہ قناعت بھی اس جیسی چیز ہے۔ رفتارِ زمانہ سے بچو......

شیخ کا مُرید سے برتاؤ رفتارِ زمانہ کے اعتبار سے ہے :

اس لئے اس وقت مشائخ اسی پر قناعت لئے بیٹھے ہیں انکی نظر بڑی دقیق ہے ہاں اگر کوئی ویسا طالب ہے تو پھر اس کو ویسی تعلیم بھی ہوگی۔ دیکھو اس زمانہ کے رفتار پر تم کو تعجب ہوگا کہ یہ وہی لڑکا ہے جو مسجد میں جھانکتا بھی نہیں تھا بلکہ کہنے پر غصہ ہوتا تھا، کبھی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا اور آج اسے جو بھی کہہ دو خاموشی سے سُن لیتا ہے، ہاں سُلطان جی بننا چاہو تو بابا کی طرح معاملہ کرنا پڑے گا۔

بابا فریدالدّینؒ شکر گنج کا سُلطانُ الاولیاءؒ کو جائے نماز اور ٹوپی عنایت فرمانا :

لیکن جب معاف کر دیا اور کہہ دیا سب معاف، دل صاف اب اُٹھے بابا صاحب اور اُٹھ کر حجرہ میں تشریف لے گئے۔ اندر سے ایک مصلّی اور ایک کُلاہ۔ ٹوپی لائے اس زمانہ میں مشائخ کی ٹوپی کُلاہ نما گول ہوتی تھی اور کہا لڑکے یہ ٹوپی ہے کبھی کبھی پہن لیا کرنا اور یہ مصلّی ہے اس پر کبھی کبھی نماز پڑھ لیا کرنا۔ کیوں دے رہے ہیں ؟ لڑکا ہی ایسا ہے ارے میری بات سمجھے نہیں۔ بظاہر تو چمکانے کے قابل نہیں ہے؟ شیر و شکر ہو لو...... اب حضرت مولانا تھانویؒ فرما رہے ہیں کہ بابا نے کہہ دیا تھا کہ سب معاف دل صاف اس کی کیا ضرورت تھی، فرمایا اپنے پر قیاس مت کرو اس کی بھی ضرورت تھی۔ وہ آج جیسے مُرید نہیں تھے اور پھر کیسے مُرید تھے، بابا صاحب نے خیال فرمایا کہ یہ تو میں نے کہہ دیا کہ سب معاف اور دل صاف لیکن اس لڑکے کی طبیعت میں کہیں یہ وسوسۂ شیطانی نہ آجائے کہ معاف اور دل صاف تو ہو گیا لیکن پہلی جیسی

میرے ساتھ وابستگی دل بستگی اور بے تکلفی نظرِ کرم بھی ہے یا نہیں، شیخ نے اس وہم کو دفع کیا کہ جس طرح تمہارے ساتھ برتاؤ اور سلوک پہلے تھا وہی اب بھی رہے گا۔ لو یہ مصلّی اور ٹوپی، چونکہ اگر مُرید کی طبیعت میں وہم کی بات رہے گی تو طبیعت کھلی کھلی نہ رہے گی، دل بندھا ہوا رہے گا ذکر و عبادت میں تلاوت میں وہ ذوق نہیں رہے گا تو طبیعت کھلی ہو جائے اس لئے دیا۔

اللہ اللہ میں شکر سے بھی زیادہ مٹھاس ہے :

حضرت والا نے فرمایا کہ میں حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کی عمر بہت زیادہ ہو گئی تھی ایک سو دس یا ایک سو آٹھ سال کی عمر ہو گئی۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں تین دفعہ گیا۔ ایک دن کہنے لگے کہ جب میں ذکر کرتا ہوں تو میری زُبان میٹھی ہو جاتی ہے، یوں ہی نہیں سچ مچ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کسی نے گُڑ کا بوریا کھول دیا، یہ وہی حضرات تھے جو مزہ لوٹ کر چلے گئے ہم لوٹتے رہ گئے۔

بابا فریدؒ کی محبت کے ظہور پر بختیار کاکیؒ کا فرمان :

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ دہلی میں کوئی منچلے آ گئے اور لگا دی ایک صدا کہ ''جو شخص مجھ کو فلاں وقت سے فلاں وقت تک دیکھ لے گا وہ جنتی ہے''۔ اُمنڈ آئی مخلوق...... بابا فرید شیخؒ کی خدمت میں دہلی سے باہر کہیں چلے گئے واپس آئے تو قطب صاحب نے فرمایا ارے فرید تم نے کچھ اعلان سُنا ہے۔ جی سُنا ہے، کیا؟ کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور وہ یوں کہہ رہے ہیں کہ جو شخص مجھ کو فلاں وقت سے فلاں وقت تک وقت دے گا وہ جنتی ہے، ہاں تم ان کو دیکھنے گئے سوال ہو گیا۔ حضرت میں تو

ان کو دیکھنے نہیں گیا۔ ارے کیوں؟ اس لئے میں نہیں گیا کہ یہ انکا وارِدِ قلبی ہے جو یہ اعلان کر رہے ہیں اور آپ کا اور ہمارا بقواعدِ شرعیہ جنتی ہونے کا پکا گمان ہے قطعیت نہیں اور وہ ہے وارد اور مجھے ہے آپ سے محبت اور جنتی ہونے کی قطعیت نہیں اور یقینی بات نہیں۔ اور ادھر وارد ہو کر میں ان کی زیارت کے لئے چلا جاتا اور میں جنتی ہو جاتا، اور خدا نہ کرے آپ جنتی نہ ہوں تو میں اس جنت کو لے کر کیا کروں گا کہ جس میں میں ہوں اور آپ نہ ہوں۔ شیخ پر حال طاری ہو گیا اور فرمایا کہ انہوں نے تو یہ کہا کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک جو میری زیارت کرے گا وہ جنتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ جو شخص میری قبر کی زیارت کرے گا وہ جنتی ہے۔ وہاں بھی وارد اور یہاں بھی وارد بقائے ایمان ہونا ضروری ہے یہ نہیں کہ بس قبر کی زیارت کر لی اور جنتی ہو گیا اور اس کے آثار یہ ہوں گے کہ اُمید ہے آخر دم تک اس کا ایمان باقی رہے گا اور ہر مؤمن کا ٹھکانہ جنت ہی ہے۔ اور یہ ایسا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

جب رمضان المبارک کے روزے روزے دار رکھنے کے بعد عیدگاہ پہنچ گئے عید کی نماز پڑھی، حق تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ کہاں تھے اور کیا پوچھتے ہیں کہ مزدور کی مزدوری پوری دی جائے۔

یہ فرشتے عرض کرتے ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں اپنے عزت وجلال کی قسم کھاتا ہوں کہ روزہ دار جو روزے رکھ کر نمازِ عید کے لئے عیدگاہ میں آتے ہیں میں ضرور ان کی دُعا قبول کروں گا اور یہ جو نماز پڑھ کر جا رہے ہیں سب بخشائے جا رہے ہیں تو پھر نماز پڑھنا چھوڑ دو کہ بخشے تو گئے اس لئے حُکم کو پہچاننا چاہیے، اللہ تعالیٰ کے اس فضل فرمانے پر طاعت و رغبت کی طرف آگے بڑھنا چاہیے۔ اللہ اکبر ایسا خدا اور

کہاں ملے گا۔

حضرت جنید بغدادیؒ پر حال طاری ہونا :

جیسے حضرت جنید بغدادیؒ پر حال طاری ہو گیا، ایک عورت آئی اور کہا کہ مجھے ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے، پردے کے پیچھے بیٹھ گئی، کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔ کہا کہ میرا شوہر دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا وہ تو دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے شریعت نے چار تک کی اجازت دی ہے اگر انصاف سے رہے۔ تو اس عورت نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا حضرت اگر شریعت مجھے اجازت دیتی اور میں اپنے چہرے کا نقاب ہٹا کر دکھاتی اور پھر پوچھتی کہ مجھ جیسی جس کے نکاح میں ہو اس کو دوسری طرف نگاہ کرنا روا ہے؟

حضرت جنید بغدادیؒ پر غشی طاری ہو گئی اور گر گئے۔ وہ عورت اُٹھ کر چلی گئی کہ مجھ پر کوئی الزام نہ آجائے کہ کیا کر دیا۔ حضرت کو سکون آنے پر خادمِ خاص نے پوچھا کہ حضرت کیا ہوا؟ فرمایا ارے تم نے سُنا نہیں اس پر مجھے حدیثِ قدسی یاد آ گئی کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے فرمایا اے میرے بندو! یہ جو میرے اور تمہارے درمیان نور کا حجاب پڑا ہوا ہے اگر تم مجھ کو دیکھ سکتے تو میں اس نور کا حجاب اُٹھا کر پوچھتا کہ مجھ جیسا جس کا خدا ہو تو اُس کو دوسری طرف نگاہ کرنا روا ہے؟

مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا اگر ایک مجلس میں جنید بغدادیؒ اور حاجی صاحبؒ بیٹھے ہوں اور ہمیں حاجی صاحب فرمائیں کہ حضرت تشریف فرما ہیں ادھر دیکھو تو ہم عرض کریں گے کہ حضرت وہ آپ کے شیخ ہیں ہمارے شیخ تو آپ ہیں ہم تو آپ کو دیکھیں گے۔

سلوک میں اوّل چیز وحدۃ مطلوب ہے :

اس زمانہ میں اب بھی ایسے ہیں کہ کسی دوسری طرف نگاہ نہیں کرتے، تمام دنیا میں محبت اور عقیدت شیخ سے ہے۔ چونکہ میری جستجو کے بعد میرے نفع کے لئے میرے اس شیخ سے زیادہ دوسرا کوئی نہیں ہے اِسی کا نام سلوک اور میں وحدۃ مطلوب ہے، یہ پہلی چیز ہے جو کہ ہر مُرید میں جو واقعی طالب صادق مخلص ہے اس میں ہوتی ہے اور جب یہ ہے تو اس انحطاط کے زمانہ میں بھی وہ متقدمین کے ایسے حال سے کم نہیں۔ یہ بشارت ہے۔ اس لئے ان کے حالات اور ان حضرات کی یہ باتیں سُن کر رنجیدگی کی کوئی بات نہ لائے اپنے اندر کمزوری کا خیال لانے کی ضرورت نہیں۔ جبکہ تو شنیع باتوں سے ہٹ کر صحیح کاموں کی طرف آ گیا تو بس یہ قناعت متقدمین کے سُنے ہوئے اور دیکھے ہوئے حالات سے کچھ کم نہیں۔ بقدرِ فرصت، بلحاظِ صحت، ذکر اللہ کا اہتمام، تقویٰ ظاہری و باطنی کا التزام یہ متقدمین کے تکثیرِ ذکر اور تبرّع و اولیٰ کے اختیار کرنے سے کم نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں تقویٰ اور طاعتِ کاملہ اپنے ذکرِ دوام کے ساتھ بخلوص، با خلاص، بصدقِ دائم و قائم فرمائیں۔ (آمین)

☆

سینتیسویں مجلس

علم کی زینت حلم ہے

مورخہ ۳۰ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق ۱۶ اپریل ۱۹۹۱ء بروز سہ شنبہ بوقتِ صبح

آدمی میں اخلاقِ ذمیمہ جو کہ متعلقہ بالنفس ہیں ان کا ہونا ایسا ہے جیسے چنگاری کہ شروع میں چنگاری ہوتی ہے اور بڑھتے بڑھتے شعلہ بن جاتی ہے اور اگر چنگاری کو بجھانے کی طرف توجہ نہ دی تو گھر جلا دے گی سامان جلا دے گی سب کچھ خاکستر کر دے گی۔

اسی طرح ان اخلاقِ ذمیمہ متعلقہ بالنفس کا حال ہے کہ اگر شروع ہی میں ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دی اور بے اعتنائی ہوئی تو یہ چنگاری بڑھتے بڑھتے ایک شعلہ بن کر ظاہر ہوگی۔ لہٰذا توجہ خاص ان کی طرف مبذول کرنی چاہیے اور ان کی اصلاح کی فکر میں رہنا بہت ضروری ہے اور یہ ایسے ہی نہیں بلکہ ایک شعلہ اُٹھ رہا ہے اور چنگاری اُبھر رہی ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے یہ برائی کی چنگاری بڑی ہو جائیگی تو پھر کیا ہوگا؟

اصلاحِ نفس کی طرف توجہ خاص :

اگر غفلت کی اور یہ سمجھے کہ ان کا ازالہ اور امالہ تو ہمارے قبضہ میں بطریق علاج آ گیا ہے۔ اس نفس دشمن عدو اللہ عدو المؤمن اور عدو الناس کی قفل میں ڈال دیا اور پھر مغفل ہو گئے انجامِ کار خرابی اور فساد ہوگا۔ چونکہ دشمن کبھی غافل نہیں رہتا گو کسی مصلحت سے دب کر بیٹھ جائے لیکن جب موقع پائے گا اور تیری طرف سے غفلت دیکھے گا جان پر آ جائے گا ایسے ہی نفس جب غفلت دیکھتا ہے، چنگاری مار کر کایا پلٹ دیتا ہے۔

اسی لئے قرآنِ پاک میں حکم ہے :وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ یعنی موت تک مسلمان رہو اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا : اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ۔

حضور ﷺ اُمت کے لئے کامل شفیق ہیں :

حضور ﷺ معصوم تھے پھر بھی درخواست کر رہے ہیں کہ لمحہ بھر کے لئے بھی نفس کے سپرد نہ کیجیے کہ لمحہ بھر بھی غافل نہ ہو جاؤں ۔اور جب حضور ﷺ باوجود معصوم ہونے کے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کر رہے ہیں تو پھر اے اُمتِ مسلمہ ذرا سوچو! حضور ﷺ کے اس کلام میں اُمت کے لئے اِنتباہ ہے اور ساتھ ساتھ کس قدر شفقت فرما رہے ہیں کہ اپنی طرف منسوب فرما کر اُمتِ محمدیہ کو جگا رہے ہیں اور بتلا رہے ہیں بدلالتِ التزامی کہ اے اُمتِ مسلمہ ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف تمہارا تعلق اور لگاؤ اس درجہ ہونا چاہیے کہ لمحہ بھر کے لئے بھی بھول اور غفلت نہ ہو جائے اور یوں درخواست کر رہے

ہیں کہ اے اللہ مجھے بہت بہت ذکر کرنے والا بنادے، کیا وہاں غفلت کا اندیشہ تھا؟ معلوم ہوا کہ دُعاؤں سے کبھی غفلت نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی اپنی سعی پر نظر ہونی چاہیے بحکمِ الٰہی سعی برابر ہونی چاہیے۔ اسی لئے حضور ﷺ درخواست فرماتے ہیں : اللّٰھم ھذا الجھد و علیك التُّکان۔ یعنی اے اللہ میری کوشش ہے پر بھروسہ آپ ہی کی ذات پر ہے۔ اسی لفظِ جہد سے جہاد اور مجاہدہ بھی آگیا، جدوجہد سعی وکوشش بھی آگئی اور یہ سعی بھی اس درجہ سے ہے کہ یہ آپ کا حُکم ہے۔ لیکن میری اس پر نظر نہیں، حُکم کی وجہ سے تعمیلاً عمل کر رہا ہوں نظر آپ ہی کی ذات پر ہے اور بھلا اس ذات سے نظر ہٹا کر دوسری طرف کرنے کے کیا معنی؟

سالِک کو مخلوق سے انقطاع ضروری ہے :

اور چونکہ اپنی سعی کا جو کہ وہ بھی ایک فعل ہے اور وہ ایک قسم کا مخلوق ہے اور سالِک کو بالخصوص انقطاع عن الخلوق ضروری ہے (اور جبکہ سلوک کا قدم طے کرنے کا اقدام کر چکا ہو) تو پھر اپنی سعی جو کہ مخلوق ہے اس کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ اور جب ایسا ہے تو پھر بس نظر خالق پر ہو مخلوق سے انقطاع ہو اور اعمال بھی چونکہ مخلوق ہیں لہٰذا ان سے بھی انقطاع ضروری ہونی چاہیے۔ اعمال کے مخلوق ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمائی ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ یعنی تم کو بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور تمہارے جو اعمال ہیں ان کو بھی پیدا فرمایا۔ تم اور اعمال مخلوق ہو گئے اور وہ سعی الی الاعمال جو کہ وجودِ اعمالِ مخلوق کے لئے ہے مخلوق ہوئی اور حکم انقطاع عن الخلوق کا، تو پھر اپنے اعمال اور مخلوق پر کیا نظر؟ یہ یعنی انقطاع عن الخلق شریعت کے جزءِ اعظم

طریقت و سلوک کا مسئلہ ہے گو یہ شریعت کا مسئلہ ہے، طریقت و سلوک شریعت کا جز ہے۔ اور شریعت کل ہے شئی کے اجزاء ملکر ہی کل بنتا ہے۔ ایک تو جزئیات اور افراد ہوتے ہیں اور ایک اجزاء ہوتے ہیں اجزاء سے کل مرکب ہوتا ہے اگر مرکب کا کوئی جز رہ جائے تو مرکب کا وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح سمجھو کہ شریعت کا جو جزِ اعظم سلوک و طریقت ہے وہ جز ہے اور شریعت کل ہے اگر جز نکل گیا تو پھر کل کا وجود کہاں؟ اور یہ مسئلہ طریقت جو کہ جز ہے اس کو پڑھے لکھے لوگوں نے شریعت سے نکال رکھا ہے۔ اس کو شریعت کا جز تو کیا سمجھتے داخلِ شریعت ہی خیال نہیں کرتے۔ جب حضور ﷺ جیسی ہستی باوجود معصوم ہونے کے ہر وقت ذکر میں مشغول رہتے تھے تو چنانچہ دُعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ لَکَ ذَکَّاراً یعنی اے اللہ مجھ کو خوب یاد رکھنے والا بنا دے کہ کبھی بھی آپ کی یاد میرے دل سے نہ نکل جائے مبالغہ کا صیغہ استعمال فرمایا جس میں ہر عمل کے متعلق ذکر آ گیا تا کہ اعمال ظاہرہ صالحہ باطنہ حمیدہ ایسے پیوست اور ایسے راسخ ہو جائیں کہ پھر ان میں بھول نہ ہو۔

حقیقتِ صبر:

صبر کے معنی مستقل مزاجی، ثابت قدمی کے ہیں۔ مجاہدین نے دُعا کی تھی کہ اے اللہ! اس موقعۂ جہاد میں ہم کو ثابت قدم رکھیے گا مستقل مزاج بنائیے گا۔ یہ ہیں صبر کے معنی ثابت قدم جما ہوا رہنا۔ صاد پر زبر ہے صاد کے نیچے زیر لگا دو "صبر" ایلوے کے معنی ہو جائیں گے اور ایلوا کڑوا ہوتا ہے نیم سے بھی زیادہ کڑوا۔ اصبر زبر کے ساتھ جو صورت، جو کام، جو معاملہ پیش آیا ہے ایسے موقع پر صبر کی تعلیم ہے کہ تمہاری جانب سے ثابت قدمی کا ظہور ہو مستقل مزاجی کا ثبوت ہو، لڑکھڑاہٹ کا نام تک نہ ہو۔ اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں اے اللہ! میری اُمت کی زُبان رہے ذاکر

دل رہے شاکر اور جسم رہے صابر یہ حدیث شریف کے معنی ہیں ایسے اوصافِ حمیدہ والا ہی مستحقِ سلوک ہے ورنہ سلوک سے بدسلوکی ہے۔

ایک حکایت :

حضرت والا یعنی مولانا تھانویؒ نے ایک قصہ سنایا کہ لڑکی والے کی طرف سے لڑکے والوں کو نکاح کی تاریخ کا پیغام بھیجا گیا۔ اور اس میں لکھ دیا کہ کوئی بوڑھا نہ آئے بارات تیار ہوگئی۔ یہ بارات اُردو کا لفظ ہے اصل میں یہ برائت ہے یعنی لڑکے کا باپ اپنے لڑکے کی شادی سے بری ہوگیا اور لڑکی والا اپنی لڑکی کی شادی سے بری ہو گیا۔ بستی والوں نے بوڑھے سے کہا ہم تیار ہو گئے مگر یہ لکھا ہے کہ کوئی بوڑھا نہ آئے اگر چہ ہمارا تو آپ کو پہلے سے لیجانے کا ارادہ تھا لیکن مجبور ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اگر بوڑھا آئے گا تو ہم نکاح نہیں دیں گے۔

بوڑھے نے یہ نہیں کہا کہ اچھا تم لوگ چلے جاؤ میں نہیں جاتا، اصرار کر رہا ہے اس میں بھی سبق ہے پہلے بوڑھے شفیق ہوتے تھے جب غیر بوڑھا آدمی شفیق ہوگا تو باپ بوڑھا کتنا شفیق ہوگا۔ اپنی اولاد کے لئے جان دے گا جیسے یہ بوڑھا جان دے رہا ہے نوجوانوں کو قدر نہیں۔ نکاح نہیں ہوگا نہیں ہوگا میں تو ضرور جاؤں گا اور ایسا کرو ایک بڑا سا صندوق لے آؤ اس میں میں بیٹھ جاؤں گا۔ موت تو وقت پر آئے گی مگر تمہارے لئے جان گئی تو کوئی بات نہیں آخر بوڑھے کو صندوق میں بٹھا دیا گیا اور پہنچ گئے۔ لڑکی والوں نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا کہ کوئی بوڑھا نہیں ہے اب کھانے کا وقت آگیا۔ لڑکی والوں نے کہا نکاح تب ہوگا جب تم پہلے چالیس مینڈھے کھاؤ، بڑے پریشان، دو چار ہوں تو خیر، بوڑھے سے پوچھو۔ کچھ چپکے سے بڑے

میاں کے پاس چلے گئے، دادا ابا یوں کہہ رہے ہیں یہ سب تو کھانے مشکل ہیں۔ بوڑھے نے کہا ارے یوں ہی تو میں نے نہیں کہا تھا بیوقوفو! تم اس طرح کرو کہ ایک ایک ذبح کر کے اس کو پکا کے کھاؤ۔ ہر ایک کی ایک ایک بوٹی آئے گی چالیس کے چالیس کھا جاؤ گے اور کھانے کے بعد یوں کہنا کہ اور لاؤ (یہ یوپی والے بڑے ذہین ہوتے ہیں) اور وہ بوڑھا بھی یوپی کا تھا۔

ایک ایک کر کے سب کھا لیے اور کہا اور لاؤ۔ حیران رہ گئے، بستی والوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ عقل کی بات نہیں تجربہ کی بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے پاس کوئی بوڑھا ضرور ہے لڑکی والے دیکھتے ہیں تو ہے نہیں لیکن عقل کہہ رہی ہے کہ عقلاً تو یہ محالِ عقلی ہے عقل والے کو یہ سوجھ نہیں سکتا۔ "عقلِ مستقیم کہتی ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ یہ عالم ایسا اور ایسا ہو اور اس کا کوئی خالق نہ ہو اور خالق ہو کر رب نہ ہو"۔

حضرت باقی باللہؒ کی حکایت :

حضرت باقی باللہؒ جو کہ مجدد صاحبؒ کے شیخ ہیں اُن کے ہاں ایک مہمان آیا اس وقت باقی باللہؒ کے ہاں کچھ کھانے کو نہیں تھا آپ ادھر سے اُدھر پریشان کسی مٹھائی کی دوکان سامنے تھی وہ سمجھ گیا، آیا اور آ کر عرض کیا حضرت جو مہمان آپ کے پاس آیا ہوا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ کھانا پیش کر دوں، بہت اچھا کھانا پیش کر دیا۔ مہمان نے کھانا کھا لیا جب برتن لینے آیا اور برتن لے کر چلا حضرت باقی باللہؒ بڑے خوش ہوئے موج میں آ گئے اور فرمایا کچھ چاہو ہم تمہیں دے دیں۔ کہا حضور میں چاہتا ہوں کہ میں آپ جیسا بن جاؤں۔ بھائی اس سے رجوع کر لو، یہ درخواست مت کرو بار بار اصرار پر انکار فرماتے ہوئے منظور فرما لیا۔ حجرے میں لے گئے سامنے بٹھا کر توجہ ڈالی بہت

دیر لگ گئی، جب باہر نکلے تو جو وہاں دیکھنے والے تھے وہ دیکھ رہے ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آیا باقی باللہ یہ ہیں یا یہ ہیں۔

توجہ کے متعلق کلام :

توجہ کی کئی قسمیں ہیں ایک توجہ (جو باقی باللہؒ نے کی) یہ تو ختم ہو چکی متقدمین نے کبھی کبھی کر لی تھی اور اس توجہ کا نام "توجہ ذاتی" ہے لیکن نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ باہر نکل کر دو چار قدم چل کر گرا اور مر گیا۔

اس زمانہ کے اولیاء اللہ نے حضرت باقی باللہؒ پر طعن کیا کہ اُس کی موت اِن کی وجہ سے ہوئی ہے جیسے کوئی سنکھیا کھالے اور مر جائے۔ اس کا بعض اولیاء اللہ نے جواب یہ دیا ہے کہ الزام کی کوئی بات نہیں چونکہ شیخ نے تو منع کیا تھا مگر ان میں کچھ شفقت ہی ایسی تھی کہ اُس کے اِصرار کے باوجود پھر اثبات ہو گیا اور چونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ برداشت نہیں کر سکے گا اس لئے انکار اسی وجہ سے تھا۔

ہمارے اکابر میں توجہ دی جایا کرتی تھی وہ بھی ایسی سخت نہیں تھی لیکن وہ بھی چھوڑ دی گئی۔ کیونکہ آج کل کے اعضاء اعصاب پٹھے برداشت نہیں کر سکتے۔

تیسری قسم کی توجہ یہ ہے کہ خواہ وہ کہہ کر توجہ کرے یا بلا کہے ہی توجہ کرے اب جن میں استعدادِ قبولیت ہوگی وہ توجہ سے متاثر ہونگے۔ ایک چوتھی قسم بھی ہے، اس میں بھی یہ قید ہے کہ جس پر توجہ کی جارہی ہے وہ کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو اور یہ شخص جو توجہ دے رہا ہے وہ بھی بیماری سے خالی ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ خیال کے ساتھ بیماری کا خیال چلا جائے اس لئے اکثر یہ توجہ جو کہ بہت مشکل نہیں چھوڑ دی گئی چونکہ اعضاء منع کرتے ہیں۔ جیسے کہ کثرتِ ذکر اور کثرتِ شغل کہ ان کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً اپنی

آنکھ کا بھی شغل ہے اپنے بھوؤں کی طرف کا بھی ایک شغل ہے ان کو بھی برداشت نہیں کرتے اس لئے ان اشغال کو ترک کیا گیا۔

الغرض بات اس پر چلی تھی کہ لڑکی والوں نے کہا کہ کوئی بوڑھا ضرور ہے اسی پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات یاد آگئی کہ جو خالق ہے وہ رب ہے وہ رازق ہے اس پر یہ بھی عرض کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں کوئی پہنچ گیا، اصرار کرتا رہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام انکار کرتے رہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نرم دل تھے ایک افسوں سکھا دیا کہ اس کو اس طرح سے کرنا مُردہ زندہ ہو جائے گا برخلاف حضرت عیسیٰ کے وہاں افسوں کے ساتھ معجزہ بھی تھا اور آج کل بھی ایسی چیزیں ہیں۔ ایک صاحب کو ہم نے دیکھا تھا وقتی طور پر تین دن کے اندر مُردہ پر کچھ ایسا افسوں کیا اور کچھ پڑھا تو وقتی طور پر کچھ حرارت دیکھی گئی پھر ختم ہو گئی۔ ایک قاری صاحب تھے بکرہ کھڑا کر دیا کچھ پڑھ رہے ہیں اور بکرے پر اثر پڑ رہا ہے بیمار کی بیماری بکرے پر آرہی ہے بکرہ مر گیا اور وہ تندرست ہو گیا۔

اپنے مسلک کو چھوڑو مت دوسرے کے مسلک کو چھیڑو مت :

تم نے مسلکِ تحقیقی، حقیقی صحیح اختیار کر لیا بس میں کہتا ہوں کہ مخالفین، معاندین دشمنانِ دین کو خاموش رکھنے کے لئے اس مسلک کو اختیار کر لو۔ اپنے مسلک کو چھوڑو مت اور دوسروں کے مسلک کو چھیڑو مت دشمن کو چھیڑنے سے اُسکی دشمنی اور بڑھ جاتی ہے۔

رجوع الی الابتداء :

حضور اکرم ﷺ اپنی اُمت پر شفقت غالب فرماتے ہوئے اپنی طرف

منسوب فرمارہے ہیں کہ میں معصوم ہوں اور پھر یوں بھی کہہ رہا ہوں کہ لمحہ بھر بھی، آ
جھپکنے کے برابر بھی مجھے میرے نفس کی طرف سپرد نہ کیجیے نفس سے غافل نہ ہو جاؤں
مبالغات ہیں۔ سلوک کا مسئلہ انقطاع عنِ الخلوق ہے۔

سعی کامل :

بس حُکم سعی کامل کا ہے اور وہ بھی خالی سعی کا نہیں بلکہ سعی بلیغ ہونی چاہیے
حق تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا۔ اور سَعْيَهَا مفعو
مطلق ہے۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ترتیب یہ ہوئی کہ پہلے جہادِ نفس بترکِ شرک وکفر ہو
مؤمن ہوا، اس کے بعد طالبِ آخرت ہو کر سعی کا حکم ہوا جو کہ متعلق بافعال واعمال
بجوارح ولسان وقلب ہے اور سعیھا کو بڑھانے میں یہ نکتہ ہے کہ سرسری کوشش کافی نہیں
ہے بلکہ کامل کوشش نقطہ نقطہ کی کوشش بطریق صحیح جو کہ مؤمن کے ایمان کا تقاضا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تم نے پہلے میری قدر کی کہ ایمان لا۔
پھر اس پر اور قدر بڑھی کہ احکام پر تعمیل بسعی کامل کیا پھر میں تمہاری قدر کیوں نہ کرو
جبکہ مجھ کو تمہاری طرف سے اِخلاص بملکہ معلوم ہوا۔ لہٰذا اب میں کہتا ہوں فَاُولٰٓئِكَ
كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔ یعنی یہی ہیں وہ مؤمن جن کی سعی کی میرے ہاں بڑی قد
ہے چونکہ تم نے جسمانی تکلیف کا کچھ احساس نہیں کیا بلکہ میرے حُکم کی تعمیل میں اس ک
چھوڑ دیا۔ تو گویا تمہاری زُبان ذاکر رہی اور دل شاکر رہا۔

شُکر کی حقیقت اور اِس کے درجات :

شُکر یہ نہیں کہ کھانا کھا کر الحمد للہ کہہ دیا ٹھنڈا پانی پی کر الحمد للہ کہہ د
یہ تو زُبانی جمع خرچ ہے۔ چونکہ جب تم نے الحمد للہ کہا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے ک

ہ ذات جو تمام عیوب سے پاک ہے تمام نقائص سے پاک ہے اپنی جان کھپا دی
ور سمجھ کر سعی کامل کی۔ لہٰذا جب تم نے میری خاطر سے یہ قدر کی تو تمہاری قدر کرنے
الا کون ہوگا؟ شکر کے معنی ہیں کہ زبان پر الحمد للہ ہو کہ اُس کو منعمِ حقیقی مانا اور خود کو
غلام ماننا۔ اس لئے طاعتِ کامل میں لگ گیا زبان شکر میں الحمد للہ کہے، حرکتِ
لسان سے دل میں محبت کا کھپانا تیسرے اپنے آپ کو میری طاعت میں لگانا یہ شکر کے
تین درجے ہیں اب یہ شکرِ کامل ہوا۔ بالفاظِ دیگر! زبان پر الحمد للہ ہو اور دل میں
محبت الٰہی اور اعمال و جوارح میں طاعت۔ ان تین چیزوں کے مجموعے کا نام شکر ہے
اسی سے مشکور ہے۔ یہ شاکر بنا وہ مشکور بنا۔

توبۂ نصوح کے آثار :

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا
اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر بشری تقاضے سے تم سے میرے حکم کے
خلاف کوئی معصیت ہو جائے تو اس کی پرواہ مت کرو چونکہ میں تواب ہوں تم بھی
تواب بن جاؤ۔ میں تواب ہوں اور حیثیت سے اور تم تواب بن جاؤ اور حیثیت سے
لہٰذا وہ تواب تجھ تواب کو محبوب بنا لے گا، بشارت سُنا دی، ہمت افزائی کر دی۔ لیکن
جب مخلوق تجھ کو گناہ میں دیکھے تو حقارت کی نظر ڈالے وہاں سے تجھ پر عظمت اور
محبوبیت کی نگاہ، واہ رے انسان مؤمن تو شرماتا نہیں یاد رکھ تیرے اس تکبر پر باز پُرس
ہوگی۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ کا مصداق بن گیا، اس نے توبۂ نصوح کر لی۔ اکثر
اولیاء اللہ ایسے ہی ہیں بشرِ حافی انتہائی درجہ شرابی توبۂ نصوح کے بعد کیسے ہوئے بیان
کرنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت حبیب عجمیؒ کی حکایت :

حضرت حبیب عجمیؒ بڑے سودخور آج کل کی دُنیا میں نہ کوئی ایسا شرابی اور نہ کوئی ایسا سودخور ہے۔ لیکن جب توبۂ نصوح کی تو کیسے بڑے اولیائے کرام میں سے ہوئے، بڑے بڑے علماء کے شیخ ہوئے۔ حضرت حبیب عجمیؒ عجم کے رہنے والے تھے بصرہ میں باپ دادا آ گئے تھے۔ ان کے شیخ حسنِ بصریؒ ہیں اور حسنِ بصریؒ کی شیخ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں آگے پھر رسول اللہ ﷺ ہیں۔ تو حبیب عجمیؒ کا ایک واسطہ ہوا علی رضی اللہ عنہ سے، کیسی توبۂ نصوح کی اس سود لینے والے حبیب عجمیؒ نے۔ جب حسنِ بصریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور توبہ کی، راستہ میں جب جا رہے تھے توبہ کے قصد سے ابھی پہنچے نہیں جا ہی رہے ہیں کھیلنے والوں میں سے ایک بچے نے کہا بچو بچو کہیں حبیب عجمی کا سایہ نہ پڑ جائے ورنہ تم دوزخی ہو جاؤ گے بس یہ اور زیادہ چوٹ لگ گئی۔ حضرت حسنِ بصری کی مجلس میں پہنچ گئے حسنِ بصریؒ وعظ فرما رہے تھے۔ دورانِ وعظ فرمایا بعض لوگ لوگوں کے خون چوس کر آ کر بیٹھتے ہیں، حبیب عجمیؒ سمجھ گئے کہ حسنِ بصریؒ مجھے ہی سے کہہ رہے ہیں۔ جب سب چلے گئے مجلس ختم ہو گئی، تو درخواست کی کہ حضرت مجھے بیعت فرما دیجیے۔ حسنِ بصریؒ نے بوقتِ بیعت نصیحت فرمائی کہ تمہارے ذمہ لوگوں کے جو حقوقِ مالی ہیں وہ ادا کرنے ہوں گے، فرمایا حضرت گھر خالی کر دوں گا۔ اب جب لوٹے گھر کی طرف راستہ میں بچے کھیل رہے ہیں پھر ایک بچے نے کہا بچو آؤ آؤ حبیب صاحب سے لپٹ جاؤ کہ اس کے سایہ سے حق تعالیٰ کے فضل سے جنتی ہو جاؤ گے۔ ابھی ابھی کیا کہا تھا اللہ تعالیٰ نے بچے ہی سے کہلوا دیا، توبۂ نصوح ایسی ہی چیز ہے اور اس کا یہی اثر ہوتا ہے۔ ایسے ہی فضیل ابنِ عیاضؒ بڑے پکے ڈاکو ہی نہیں بلکہ

ڈاکوؤں کے سردار تھے آ گیا توبہ نصوح کا وقت سب چھوڑ دیا پھر تو بڑے اولیائے کرام میں سے ہوئے۔ امام ابو حنیفہؒ نے چوبیس فقہاء مختلف قسم کے اپنے اپنے زمانہ کے عروج و بلندی پر پہنچے ہوئے رکھے۔ کسی کو علمِ معانی کے لئے کسی کو علمِ عربی ادب میں کسی کو صرف ونحو میں وغیرہ وغیرہ، فقہ کی ترتیب کے لئے فضیل ابنِ عیاضؒ کو رکھ لیا امام صاحب نے فرمایا کہ ہاں یہ ایسا شخص ہے کہ اگر ہم میں سے کسی قسم کی کوتاہی دیکھے گا تو ٹوکے گا اس لئے رکھ لیا۔

جدّت پسندوں کا علماء کو قدامت پسند سمجھنا :

اب تو علماء کو دقیانوسی کہہ رہے ہیں کہ یہ تو قدامت پسند ہیں جاہل مسلمان کہتے ہیں کہ انہیں زمانۂ جدید کی کچھ خبر نہیں، خواجہ مجذوب صاحبؒ بڑے آدمی تھے ایسے شعروں پر شعر لکھے تھے۔ قدامت سے کب تک بچو گے تیرا دادا پُرانا تیرا نانا پُرانا تیرا آسمان، تیری زمین پُرانی تیرا سورج تیرے تارے تیری ہوا پُرانی تو سب پُرانوں کو چھوڑ دے کہتا ہے کہ یہ تو پُرانہ ہو گیا ہے قدامت پسند ہے۔ کسی بزرگ کی عبادت، تقویٰ پرہیزگاری اور خلوت میں رہنے کو قدامت پسند کہتے ہو۔ بعض تعلیم یافتہ کہتے ہیں ارے میدان میں آؤ گوشہ میں بیٹھنے کا وقت نہیں رہا اسی وجہ سے حضور ﷺ نے اس زمانہ کے جدّت پسندوں سے پناہ مانگی ہے اے اللہ مجھ کو وہ زمانہ نہ ملے اور نہ میرے صحابہ ؓ کو جس میں علماء کی اتباع نہ کی جائے۔

سالکین کو ہدایت :

اے صوفیائے کرام اگر کسی نے پیچھے سے مکا مارا ارے پہچانو اپنے آپ کو جانچو قوتِ غضبیہ کو۔ مثلاً کہ پیچھے سے کسی نے مکا مارا تم نے پیچھے مڑ کر دیکھا یا نہیں؟

اگر دیکھا تو کیوں دیکھا، تو اب جذبہ کس نوعیت کا آیا انتقام کا یا بلا انتقام کا اگر انتقام کا آیا تو کیوں رُکا، بمرضی فضیحت بحفاظتِ فضیحت یا برضائے الٰہی۔ ارے بھائی یہ تو بڑا موٹا تازہ ہے اور مارے گا اور اگر نہیں مارے گا اور میں نے کچھ کہا تو خواہ مخواہ لوگ کہیں گے، آپ تو مولوی صاحب ہیں وہ تو جاہل تھا اگر ماردیا تو کیا بات تھی فضیحت ہو گئی رُک گئے نہ کہ برضائے الٰہی۔ تو دیکھا جذبہ سا کچھ آیا تھا مگر رُک گیا دب گیا نہ کہ برضائے الٰہی بلکہ بحفاظتِ فضیحت اب یہ جانچ ہے۔ یہ مثال پیش کردی نفس ایسا بنایا نہیں، کچھ کسر باقی ہے شعلہ تو گیا چنگاری ہے اور اگر چنگاری کی طرف سے غفلت ہوئی تو وہ انگارہ بن کر سب کو جلا دے گی پھر لوٹ کر اخلاقِ ذمیمہ آجائیں گے۔

صاحبِ علم کو صاحبِ وقار ہونا چاہیے :

جس شخص میں وقار ہے کیا اس میں چھچھورا پن آئے گا، اوباش اور آوارہ گرد قسم کے لڑکوں کے پاس بیٹھے گا، اور اگر بیٹھے گا تو یہ بھی چھچھورا بن جائے گا اور چھچھورے کی کون عزت کرتا ہے چاہے عالم ہو یا اور کچھ ہو اگر چہ یہ خود اوباش نہیں ہے مگر اوباشوں کے پاس بلا ضرورت بار بار کیوں گیا انکی باتوں کی طرف متوجہ کیوں ہوا وقار گیا، اگر واقعی تو علیم تھا تو تو صاحبِ وقار کیوں نہ رہا۔

وقار کا الف نکال دو تو وَقر بن گیا، بابِ تفعیل میں توقیر ہو گیا۔ اور توقیر کے معنی تعظیم کے ہیں جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا حدیث شریف میں آیا ہے آپ بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں جانتا ہوں اے بیت اللہ تیری عظمت تیرے وقار کو تیرے احترام کو لیکن یاد رکھ مؤمن کے قلب کے برابر تیری کوئی تعظیم نہیں، تیری کوئی توقیر نہیں۔ اس سے اندازہ کرلو کہ مؤمن کا قلب کیا ہے جس کو آج دُکھایا جا رہا ہے بیٹا باپ کے قلب کو تکلیف دے رہا ہے اگر چہ جسمانی آرام کے اسباب بہت

ہے مگر اپنے الفاظ سے دل دُکھا رہا ہے۔ اپنے طرزِ گفتگو سے اپنے چہرے کو بگاڑ رہا ہے حالانکہ باپ سے زیادہ کسی کا کوئی حق نہیں مباحات میں باپ کی ماننی چاہیے۔

قرآن پاک میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اس چہرۂ فاسق پر توجہ مت کرو اس کے باطن کو حق تعالیٰ پر چھوڑ دو جو ہوگا حق تعالیٰ کرے گا تمہیں اس کی سرسری بات مان لینی چاہیے، اس کے دل کی تہہ کو مت پہنچو۔ خطیب صاحب پہنچ گئے خطبہ پر، خطبہ کے معنی کی ہی خبر نہیں کیسے پڑھ گیا۔ پڑھ تو لیا خطیب صاحب نے اس موقع پر تفسیروں میں لکھا ہوا ہے جو میں عرض کر رہا ہوں اس کے سرسری اَعراف کو مان لو اگرچہ وہ جھوٹ بول رہا ہے دل کی تہہ میں مت پڑو ورنہ معاشرت خراب ہو جائے گی۔ عیش و عشرت خراب ہو جائے گی۔ بات وقار و توقیر پر چلی تھی مؤمن کے دل کی قدر معلوم ہو گئی، حضرت والا کی بات یاد آ گئی جمعہ کا دن تھا، خانقاہ میں تشریف لانا اگرچہ بند ہو چکا تھا کچھ ندوی خیالات کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے احقر بھی بیٹھا تھا، ایک راؤ صاحب بولے جناب تو یوں کہتا ہے کہ علماء کی قدر کرو اب وہ صاحب کہتے ہیں کہ میں علماء کا وقار ختم کر کے رہوں گا۔ حضرت والا نے فرمایا کسی نے یہ بات آپ کو کہی ہے یا آپ نے خود سُنی ہے احقر بیٹھا تھا بیچارے کو سکتہ طاری ہو گیا کچھ نہ بولے، حضرت والا نے فرمایا جب علماء نے اپنا وقار کھو دیا اور اس نے کہہ دیا تو کیا بُرا کیا اس نے جو کہا ہے کیا بیجا کہا ہے حضرت کے ہاں بڑے بڑے آئے اور تر ہو کر آئے مگر وہاں سب تری ختم۔

حضرت مدظلہ کی حضرت تھانویؒ سے پہلی ملاقات :

احقر کی تیرا چودہ برس کی عمر تھی حضرت والا کی سب سے پہلی ملاقات اور زیارت علی گڑھ میں ہوئی، اس وقت بہشتی زیور خوب دیکھتا تھا۔ رسالہ النور کا بھی

مطالعہ کرتا تھا یہ رسالہ النور ایک مولوی صاحب کے پاس آتا تھا۔ حضرت سے اعتماد اسی زمانہ میں ہو گیا تھا اور بڑے بڑے مشائخ دیکھے مقرّر دیکھے کہیں بلبلِ ہند کہیں طوطی ہند کہیں امروہے والے شاہ صاحب دیکھے کہیں کسوٹی والے شاہ صاحب۔ ان کی مجلسوں میں بھی بیٹھا ان کے خلقوں میں بھی بیٹھا اور بعض نے مجھ سے خود کہا کہ آپ مجھ سے بیعت ہوں گے صاف کہہ دیا جی نہیں۔ جناب ان حلقوں میں وہ بیٹھتے ہیں جو بیعت ہوں یا بیعت ہونے والے ہوں میں اُٹھ کر چلا آیا۔

جب چودہ برس کی عمر تھی حضرت علی گڑھ تشریف لے گئے تھے ظہر کی نماز مسجد میں پڑھی احقر ساتھ گیا ظہر کے بعد وعظ ہوا جب عصر کی نماز پڑھنے گئے۔ امام صاحب نے کہا حضور آپ نماز پڑھا دیں فرمایا ہم تو مسافر ہیں جب عصر کے بعد تشریف لائے باہر بیٹھ کر مجلس ہو رہی ہے یونیورسٹی کے طلباء آ گئے۔ جو بڑے بولتے شاہ تھے ہمارے قریب وطن "بلونے" کے رہنے والے تھے۔ یونیورسٹی کے سرپرست تھے وہ آئے دعویٰ کر کے کہا کہ میں بند کر دوں گا شرکت کے لئے دعوت دوں گا جانتے ہو شرکت! گفتگو تنہائی میں کرنی ہے بہت اچھا ایک کمرے میں تشریف لے گئے پانچ سات منٹ ہوئے ہوں گے کہ باہر آئے اور ان کو کہنا پڑا یہاں دال نہیں گلتی۔

ایک صاحب کے سوال پر حضرت تھانویؒ کا جواب :

ایک دینیات کے ناظم یونیورسٹی کے مدبّر آئے کہ حضرت کچھ پوچھنا ہے۔ بہت اچھا پوچھو، حدیث شریف میں آیا ہے جہاں زِنا کی کثرت ہوتی ہے، وہاں طاعون ہوتا ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت والا نے فرمایا مفہوم تو ظاہر ہے ترجمہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا یا ربط اگر ربط سمجھ میں نہیں آیا تو کیا حرج ہے، حرج تو کچھ نہیں اطمینان

کیلئے ،اطمینان کی کیا دلیل ہے؟ دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ کہ حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ میں مُردوں کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں ایمان نہیں ؟ایمان تو ہے اطمینان کے لئے دیکھنا چاہتا ہوں ۔حق تعالیٰ نے فرمایا کہ چند جگہ سے پرندے لےلو اور رکھ دو پھر ان کو آواز دو،تو جس طرح سے ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہو گیا تھا تو کیا میرے کہنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا؟ ان کو کہنا پڑا کہ آ گیا سمجھ میں۔

غصہ کے متعلق حضرت والا کا چند اصحاب سے خطاب :

تین حضرات ایک جگہ سے تشریف لائے ۔ان میں ایک عالم صاحب تھے جو تشریف لاتے رہتے تھے دو حضرات اور تھے ایک تو ان میں آتے رہتے ہیں اور ایک نئے سے معلوم ہوئے۔ میں نے کہا میں تو ان سے واقف نہیں ہوں ،عرض کیا کہ حضرت درمیان میں ایک دفعہ اور آئے تھے ہمیں روک دیا گیا تھا مولوی صاحب وغیرہ نے یوں کہا کہ آج تو طبیعت زیادہ خراب ہے۔

مجھے افسوس ہوا کہ مَردم شناسی نہیں ہے۔خیر ان بیچاروں نے میری طبیعت کو دیکھ کر تم سے عرض کر دیا ہو گا اگر مجھے معلوم ہو جاتا تو میں آپ کو ضرور بلاتا ۔دورانِ گفتگو میں نے کہا کہ مجھے غصّے پر بہت غصہ آتا ہے اور بہت دن ہوئے میں نے بعض بچوں سے کہا تھا کہ اگر تم کو کہیں غصہ مل جائے تو پکڑ کر لانا بچوں نے کہا ابا جی غصہ کہاں ملے گا ارے بھائی اگر مل جائے ،اگر شرطیہ ہے تلازم نہیں ہے اگر مل جائے ،اور اگر مل گیا تو آپ کیا کریں گے۔ میں نے کہا اس کو ذبح کر دوں گا اس نے فساد مچا رکھا ہے،فتنہ کر رکھا ہے ایک صاحب نے ان سے کہا کہ حضرت چلا گیا مجھے شبہ ہو گیا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غصہ ہے میں نے بے تکلفی سے کہا۔اتنی بے تکلفی کرتا

ہوں آنے والے کیساتھ تا کہ اس کا جی کھلے اور جو کہنا چاہتا ہے کہہ لے تو کیا خدا نخواستہ آپ میں غصہ تھا۔ حضرت کیا پوچھو بہت غصہ تھا، پھر آپ نے کہا چلا گیا۔ آپ یقین جانیں مجھے تعجب ہوا کہ طالبانِ تزکیہ آتے رہتے ہیں اور تفسیر جلالین شریف وغیرہ کا ترجمہ کرتے ہیں اور یہ بیچارے شائستہ داڑھی والے رنگ روپ اچھا تھا اور اجنبی تھے کیا کہہ رہے ہیں اور طالبانِ تزکیہ مجلسوں میں بیٹھے ہیں کتابیں بھی پڑھیں مگر ان کا غصہ جاتا نہیں۔ اللہ اکبر اور اس شخص کا دو منٹ میں چلا گیا اور یوں کہہ رہا ہے حضرت جی اطمینان رکھو میرا غصہ چلا گیا کیسا دل کا پکا تھا اور پڑھے لکھے جب باتیں کریں گے غصہ کے ساتھ کریں گے۔ پون گھنٹہ کے قریب بات ہوئی آخر میں کہتا ہے کہ حضرت میں سیر ہو کر جا رہا ہوں دیکھو کیسی حوصلہ افزائی کر رہا ہے کسی جزئی کے اندر صحیح نفس کا خلق رذیلہ سے خلا اور قلب کا خلق حسن سے ملا۔

عِلم کے ساتھ حِلم ہونے کی دلیل:

سُورَۃُ الْاِنْشِرَاحْ میں اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کیا ہم نے آپ کے سینے کو یعنی قلب کو (صدر اور قلب کا ربط ہے) نہیں کھول دیا کس بوجھ کے لئے کھوں دیا آپ کی خاطر آپ کے نفع کے لئے یعنی آپ کے سینہ کو علم اور حِلم کے لئے نہیں کھول دیا؟ آپ پیغمبر ہیں پیغام رساں ہیں حق تعالیٰ کے احکام پہنچانے کے لئے عِلم کی ضرورت ہوئی۔ تو پہلے علم کے لئے یعنی جن علوم کی آپ کو قیامت تک کے لئے ضرورت ہے وہ کیا ہم نے آپ کو نہیں دیے۔ لیکن چونکہ آپ پیغمبر ہیں جن کے پاس دین کی بات پہنچاؤ گے آپ کی طبیعت کے خلاف بہت سی باتیں پیش آئیں گی۔ چونکہ مبلغ کو اور صحیح تبلیغ کرنے والے کو طبائع مختلفہ میں اختلاف ہونے کی وجہ سے خلافِ طبع باتیں ضرور سامنے آئیں گی

معاند بھی کوئی مل سکتا ہے، زبان سے بھی تکلیف دہ باتیں ہوسکتی ہیں کبھی عزت وذلت کی بہت سے باتیں پیش آئیں گی تو کیا ہم نے آپ کو شرحِ صدر حِلم کے ساتھ علم نہیں دیا۔ چونکہ صاحبِ علم کو صاحبِ حِلم بھی ہونا لازمی ہے چاہے تبلیغ عام کرتا ہو یا تبلیغ خاص، مدرس بن کر بیٹھ گیا ہو چونکہ یہ بھی تبلیغ ہے اور اس کو تبلیغ خاص کہتے ہیں اور بلا تبلیغ خاص کے تبلیغ عام نہیں ہوسکتی اور نہ ہی بلا علم کے ہوسکتی ہے کچھ رٹ کے کہہ دیا یہ کیا کہنا ہوا۔

عَلم کہتے ہیں جھنڈے کو جب حضور ﷺ کسی کو بھیجتے تھے تو جھنڈا دیتے تھے اب بھی جھنڈے اور نشانیاں ہوتی ہیں یعنی عِلم کے ساتھ حلم ہو اور سند کا جھنڈا ہو۔ خیال فرمایئے، عِلم جس کا نام تعلیم ہے طلبہ بھی مختلف طبائع کے آئیں گے اور خاص کر اِس زمانہ میں۔ لہٰذا تبلیغ خاص وعام کو بحیثیت تبلیغ حلیم ہو کر رہنا چاہیے اور حِلم کے معنی وقار کے ہیں۔ اُستاد صاحب میں چھچھورپن ٹھٹے بازی اوروں کی طرح گشت کرنا شہروں میں جانا یہ سب صاحبِ حلم کے خلاف باتیں ہیں۔

علماء اور اساتذہ کے لئے ہدایت :

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی اللہ سے عالم ہی ڈرتے ہیں معلوم ہوا جس میں خشیت ہوگی اس میں حلم بھی ہوگا اور جو عالم ہو خشیت نہ ہو تو اس میں وقار کہاں ہوگا حِلم کہاں ہوگا؟ تو عزت کہاں ہوگی اپنے ہاتھوں عزت کھوئی، اور جس میں خشیت کے آثار نہیں ایسا آدمی عالمِ اصطلاحی ضرور ہوگا۔ عالمِ اصطلاحی وہ ہے جس نے میزان سے لیکر دورۂ حدیث تک کتابیں پڑھی ہوں مگر عند اللہ عالم نہیں ہے۔ یہ علامات ہیں علامات سے پہچاننا آسان ہوجاتا ہے کلمہ کی قسمیں اسم، فعل، حرف ہیں لیکن اسم کو علامات سے پہچانا جائے گا اسی لئے

علاماتِ اسم بیان کی گئی ہیں۔

بات وقار کی تھی جب حضور ﷺ کو علم اور حلم دیا گیا تو نائب رسول جس نے علم حاصل کیا ہو اور حلم نہ ہو نائب کہلانے کے قابل نہیں۔ اسی لئے جو علماء کی فضیلتیں آئی ہیں وہ باوقار عالم کی ہیں اور شرحِ صدر کے بارے میں آپ حضرات بھی کہتے ہیں کہ بھائی آج مطالعہ تو کیا ہے خیر پڑھا دوں گا، ذمہ داری ہے گھنٹے کی، مگر مجھے شرحِ صدر نہیں۔

یہ محاورہ ہے شرحِ صدر نہیں ہوا، شرحِ صدر مطلوب ہے میزان پڑھانے چلے گئے مگر شرحِ صدر نہیں یوں سمجھتے ہیں میزان ہے اس کو تو ہم پڑھا ہی دیں گے فارغ التحصیل تو ہم ہیں ہی...... نہیں اس کے لئے بھی قابلیت کی ضرورت ہے۔ جب میزان ہی ختم ہو گئی تو ترازو کے پلڑے ڈنڈے اخیر تک کیسے رہیں گے بڑی محنت کی ضرورت ہے اور محنت تب کرے گا جب اس میں حلم ہو گا ورنہ ناراض ہوتا رہے گا۔ کھڑے ہو جاؤ کان پکڑلو، چلے جاؤ دیکھا کیسا اچھا اُستاد ہے شفقت کا نام ہی نہیں طالب علم کا دل سکڑ رہا ہے، اور تنخواہ کے بارے میں کہتا ہے اور بڑھا دو۔

تبلیغ کی شرائط:

احقر نے ایک کتاب لکھی ہے اُصولِ تبلیغ اس میں لکھا ہے کہ تبلیغ کی پانچ شرطیں ہیں (۱) اخلاص (۲) علمِ صحیح (۳) حِلم (۴) ملاطفت (۵) اور خود صاحبِ عمل ہونا۔ یہ پانچ شرطیں مبلّغ کے لئے ضروری ہیں چاہے مبلّغ عام ہو چاہے خاص ہو۔

سورۃ الانشراح کی تشریح:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ یہ اندر سے وزر کا بوجھ کیسا پڑ گیا۔ یعنی آپ سے ہم

نے آپ کے بوجھ کو اُٹھالیا بوجھ یہ پڑا کہ آپ نے کسی وقت کسی عبادت کی حیثیت سے بذوقِ قُرب، انکا ایسا بوجھ پڑ گیا کہ آپ نے اپنی کمر توڑ دی اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔

ظَهَرْ کہتے ہیں کمر کو اس نے آپ کی کمر توڑ دی میں نے عبادت کا کام بتایا اس کا رنج ایسا ہوا اتنا بوجھ پڑا کہ کمر توڑ دی جیسا ایک عام آدمی معصیت سے توبہ کرتا ہے۔ جس چیز نے بوجھ بن کر آپ کی کمر توڑ دی تھی ہم نے اسی کو اُٹھا رکھا ہے آپ کا کتنا خیال فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو سالک صوفی واقعی اخلاص کے ساتھ کمر بستہ ہو کر مشتبہات سے بچتا ہو، مباحات سے قلت رکھتا ہوا کچھ کر گزرتا ہے اور بعد میں اس کے خیال میں آتا ہے تو اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ حضور ﷺ کو تسلی دے رہے ہیں جیسا کہ شیخ بھی تسلی دیتا ہے۔ شیخ نے چونکہ سلوک طے کرتے ہوئے اس کو دیکھا ہے کہ اس میں طبیعت بجھی بجھی سی رہتی ہے اس وجہ سے سالک کی طبیعت بھی معلوم ہے۔ اس کو حکم ہے کہ پوچھ لے اور جب پوچھ لیا تو طبیعت بجھی ہوئی دور ہو گئی وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ جہاں میرا ذکر ہے وہاں تمہارا بھی ذکر ہے قرآن میں اگر توحید کا ذکر آتا ہے تو حضور ﷺ کا بھی ذکر آتا ہے تو حضور ﷺ کا ذکر بلند سے بلند تر ہے اور آپ ﷺ اس میں کمر توڑ رہے ہیں۔ اتنا رنج اُٹھا رہے ہیں آپ کو کوئی ضرورت بھی نہیں فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا یہ جو عُسر آپ کو ہو گیا ہے وہ عُسر یُسر سے ہے اور تعلیم و تبلیغ کے دوران بڑی بڑی باتیں آئیں گی ان کا کچھ خیال نہ کیجیے کہ آپ سجدہ میں ہیں ابوجہل وغیرہ نے اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی۔ ظاہراً عزت میں فرق کی بات ہو گئی لیکن یہ وقتی عُسر ہے اس کے بعد پھر یُسر ہی یُسر ہے۔

لہٰذا جو صحیح معنی میں نائبِ رسول ہیں ان سے کہا جا رہا ہے حضور ﷺ کی حالت

ان کے سامنے رکھی گئی ہے کہ تم کو بھی اسی طرح رہنا اور کرنا چاہیے۔ فَاِذَا فَرَغْتَ، محبت کا تقاضہ تو کچھ اور ہے آپ دوسروں کی خدمتِ خلق میں دین کے لئے لگے ہوئے ہیں بیچ میں ایک مختصر سی بات، ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے بیاناتِ قرآن میں تکوین کے زیادہ ہیں یہ تکوین کے بیان بزیادت دعوتِ توحید ہیں۔ جب آپ کارِ منصبی سے فارغ ہو گئے دعوت سے فارغ ہو گئے تو پھر اپنے لئے رات کو بالخصوص آخری حصہ ذاتی عبادت کے لئے مشقت میں ڈالیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مبلّغ خاص ہو چاہیے عام ہو، میں تو دین کے کام میں لگا ہوا ہوں، مطالعہ کر رہا ہوں میں تو پڑھاتا ہوں میں تو تھکا ہوا ہوں اور اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ذاتِ خاص کے لئے مشقت اُٹھانی چاہیے۔ حضور ﷺ کو تہجد کا حکم ہے مدرّس کو حکم نہیں کہ اپنے لئے کچھ وقت فارغ کر کے عبادتِ خاص میں لگے اگرچہ نافلہ ہیں اگرچہ تہجد کی نماز پہلے فرض تھی اور اب تمام نافلہ سے زیادہ مرتبہ والی ہے۔ اور مبلغ کہتا ہے کہ میں تو دین کے کام میں لگا ہوا ہوں اپنی ذاتِ خاص کے لئے مشقت اُٹھاؤں لفظ ''فانصب'' کہہ رہا ہے۔

وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ، اپنے پروردگار کی طرف رجوع الی اللہ کیجئے ہر معاملہ میں اِنابت الی اللہ اور رجوع الی اللہ ہونی چاہیے۔ حِلم بلا واسطہ متعلق بالقلب ہے عِلم کا دل میں جانا بواسطہ ہے اور حِلم کا قلب میں جانا بلا واسطہ ہے صحیح عِلم جو اعانت کی چیز ہے وہ بوصفِ حلم ہے جو کہ قلبی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کے ساتھ اپنے فضل و کرم سے آراستہ اور مزین فرمائیں۔ (آمین)

☆

اڑتیسویں مجلس

مؤمن کا اوّلین فرض اِجراءِ احکام ہے

مورخہ ۱۱ شوال ۱۴۱۱ھ بمطابق ۲۷ اپریل ۱۹۹۱ء بروز شنبہ بوقتِ صبح

دوست کے اوصاف :

یار دوست کو کہتے ہیں یعنی مددگار، یارستن کے معنی ہیں طاقت رکھنا اور بھلا وہ بھی کوئی یار ہے جس کو یار کی خبر نہ ہو وہ کیا طاقت رکھے بلکہ وہ تو آر ہے، لکڑی میں ایک کیل یا میخ ٹوکے دینے کو آر کہتے ہیں۔ اور ایک ہے عار عین کے ساتھ کہ دوست کی خدمت کرنے سے اس کو عار آ رہی ہے کہ لوگ مجھے چھوٹا سمجھیں گے ان کو بڑا سمجھیں گے اور بن رہا ہے دوست، مُرید شاگرد اور اُستاد کی خدمت کرنے سے عار ہے۔

ہر مؤمن اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے :

جس وقت ذاتِ باری تعالیٰ نے کہا تھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ تو عالمِ میثاق میں کہا گیا تھا قَالُوْا بَلٰى اس کہنے سے ربوبیت کا اقرار ہوا وہ سارے مؤمن تھے۔ اس کے

بعد اللہ تعالیٰ نے وجودِ خارجی میں آدم علیہ السلام کو بھیجا تو پیدا کرنے سے پہلے فرمایا: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَه اور جس وقت کہ ارشاد فرمایا: آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں نائب۔ اور پھر آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور آدم علیہ السلام کی پشت میں سارے انسان تھے تو پھر سارے کے سارے خلیفہ ہوئے۔ ان کی پشت سے جو ایمان والے نکلتے چلے جائیں تو وہ سب خلیفہ ہیں۔

تخلیقِ آدم علیہ السلام پر فرشتوں کی گذارش اور اللہ تعالیٰ کا حاکمانہ جواب:

لیکن فرشتوں نے بفراستِ ایمانی کہا: قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خون ریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے ہیں بحمد اللہ اور تقدیس کرتے رہتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہ جو چیز تم مانع سمجھ رہے ہو اس کی تخلیق سے وہی باعث ہے اس کی تخلیق کا، مجھ سے پوچھو مجھے علم ہے اور جو تم کہہ رہے ہو اس کا بھی مجھے علم ہے چونکہ میں عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَة ہوں جو معدوم ہے اس کا بھی مجھے علم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اعتراضاً نہیں کہہ رہے ہو استحقاقاً نہیں کہہ رہے ہو بلکہ شاید خدمت کے لئے اپنے آپ کو مجھے پیش کرنا چاہتے ہو۔ اس سے سب اعتراضات ختم ہو گئے۔ میں جانتا ہوں تم فرشتے ہوں تمہارے یہاں تو خلافت کی بات ملکوتیت کے علاوہ آ ہی نہیں سکتی لیکن کیا کیا جائے تمام عالم کو پیدا کرنا ہے۔

اللہ آسمان وزمین والوں کے لئے نور ہے :

چنانچہ ارشاد ہے: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہاں مضاف محذوف ہے اَللّٰہُ نُوْرُ اَھْلُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی صرف السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مراد نہیں بلکہ تمام عالَم مراد ہیں۔ اللہ نور ہے آسمانوں اور زمینوں کا اور اس سے مُراد تمام اقالیم ہیں۔ اور نور راستہ دکھاتا ہے تو حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ میں اس کو بھی جان رہا ہوں چونکہ میں ہی ہادی ہوں اور سب مہتدی ہیں۔ مہتدی کہتے ہیں ھدایت قبول کرنے والے کو اور ہادی کہتے ہیں ہدایت عطاء کرنے والے کو۔ ایمان کو بھی آپ نے نور کہا ہے۔

قرآن پاک نورِ ہادی ہے :

قرآن پاک کو بھی اللہ پاک نے نور کہا ہے توراۃ کو بھی ہدایت کہا ہے اور ہدایت کے معنی ہیں ارأۃ الطریق الی المطلوب اور ایصال الی المطلوب۔ اور واصل بحق ہونے کا ذریعہ۔ اخر میں قرآن پاک ہے جو کہ ہادی ہے ھُدًی لِلْمُتَّقِیْنَ اور یہ قرآن ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لئے راستہ دکھاتا ہے اور راستہ دکھانے والے کے لئے نور ہے۔

سو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا، جس کو کسی طرح شکستگی نہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں اور خوب جاننے والے ہیں، اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور کی طرف لاتا ہے۔ قرآن پاک کو بھی نور کہا گیا ہے اور آپ کو بھی نور کہا گیا ہے۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مطلب :

اور چونکہ مؤمن سے عالم والوں کو رہبری ہوتی ہے، روشنی ہوتی ہے، چاند بھی ہے سورج بھی ہے تارے بھی ہیں لیکن چاند کے سامنے اس کا نور کچھ نہیں، یہ ہے وحدۃ الوجود۔ اور وحدۃ الشہود سورج بھی ہے، چاند بھی ہے تارے بھی ہیں لیکن سورج کے سامنے یہ سب گویا ناپید ہیں، یہ ہے وحدۃ الشہود۔ ہمارے دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ پر وحدۃ الوجود کا غلبہ تھا اور مجدد الف ثانی سرہندیؒ پر وحدۃ الشہود کا غلبہ تھا۔

خلیفہ کو پیدا کرنے کی وجہ :

فرشتوں نے کہا کہ یہ تو زمین میں لڑائی فساد خونریزی کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا میں سب کچھ جانتا ہوں، تم تو فراستِ ملکوتی سے سمجھے ہی نہیں، اور جو انسان کی حقیقت تم نے بیان کی ہے اس کو میں بھی جانتا ہوں، ایسا بھی ہوگا لیکن تمہارے خیال میں مطلقاً آ گیا اور میرے خیال میں اور میرے علم وعندیہ میں بھی ہے کہ ایسے بھی ہوں گے۔ اور یہی وجہ ہے تخلیق کی خلیفہ بنانے کی، چونکہ اس مخلوق انسان میں ہر قسم کے ہوں گے جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی ہوں گے اور جو میں جانتا ہوں وہ بھی ہوں گے اور جو صحیح معنی میں ایسے ہوں گے وہی خلیفہ ہوں گے، اور یہی لوگ میری خلافت میں عدل و انصاف کو قائم کرنے والے ہوں گے میرے احکام کو نافذ کرنے والے اور اجراء کرنے والے ہوں گے من حیث العدل۔ اور اگر ایسے نہیں ہوں گے تو پھر تم تو ہو ہی، اور اسی وجہ سے میں نے کہا خلیفہ نائب، یعنی میری صفات اپنے اندر لئے ہوئے تب ہی تو وہ

خلیفہ ہوں گے تب ہی تو وہ نائب ہوں گے، مستحقِ نیابت ہوں گے۔ اسی وجہ سے اس عالم میں ضرورت ہوگی کہ میرے نائب کے نائبین بھی ہوں اور وہ بھی ہوں گے، اے فرشتو! تم نے درجۂ اطلاق میں بات کہہ دی اور میرے علمِ غیب میں درجۂ اطلاق میں نہیں ہے میں تمہاری اصلاح کر رہا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اصلاح :

جیسا کہ آئندہ موسیٰ علیہ السلام کی اصلاح کروں گا، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے تھے کسی نے پوچھا کہ اے موسیٰ علیہ السلام کیا آپ سے زیادہ بڑا کوئی اور عالم ہے؟ فرمایا نہیں۔ حق تعالیٰ نے اصلاح فرمادی کہ آپ نے مطلقاً کیسے کہہ دیا، آپ سے زیادہ جاننے والا ہمارا ایک بندہ ہے جس کا نام حضرت خضر علیہ السلام ہے ان سے ملاقات کرو تو معلوم ہو جائے گا۔

مرشد کا کام ہر چیز کی اصلاح کرنا ہے :

اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کا کام جہاں اعمال کی اصلاح کا ہے وہاں کلام کی بھی اصلاح ہے کہ تم اس طرح کیوں بولے؟ دیکھیے! حضور ﷺ سے سوال کیا تھا اصحابِ کہف کے بارے میں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کل بتادوں گا، پندرہ دن تک وحی نہیں آئی اور جب وحی آئی تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ نے انشاء اللہ کیوں نہ کہا (اس میں کلام کی اصلاح فرمادی)

معلوم ہو گیا کہ مرشد کا، شیخ کا کام ہر چیز میں اصلاح کا ہے خواہ اشارۃً کہے، خواہ کنایۃً کہے خواہ صراحۃً کہے خواہ حکایۃً کہے اب سننے والا غور کرے کہ میری اصلاح

ہو رہی ہے۔

فرشتے خلیفہ کی حقیقت کو نہ پہچان سکے :

تو اے فرشتو! میں تمہاری اصلاح کر رہا ہوں، تم نے درجۂ اطلاق میں سب انسانوں کو اس طرح سمجھا۔ ایسا نہیں بلکہ جس چیز کو تم مانع سمجھ رہے ہو وہی چیز باعث ہے انسان کی تخلیق کا جو کہ میرا نائب ہوگا میں نے لفظ خلیفہ کہا ہے تم پوری حقیقت مالہ وماعلیہ کو نہیں پہنچان سکے۔

کبھی عدل کے خلاف ہونے سے خلافت میں فرق نہیں آتا :

اور خلیفہ مؤمن ہوتا ہے تو بھلا مؤمن بے عدل ہو کر کہاں رہے گا یعنی وہ تو عادل ہوگا جو کہ اس کے ایمان کا تقاضہ ہے۔ چونکہ جو اس میں عدل رکھا ہوا ہے وہ اسے برانگیختہ کرے گا کہ یہ خلافِ عدل کیوں ہوا؟

معلوم ہوا کہ مؤمن سے جو کچھ خلاف ہو جاتا ہے اس کی خلافت من حیث المؤمن ختم نہیں ہوتی، اور ویسے خلافت کے درجے الگ الگ ہیں لیکن باوجود مؤمن سے خلاف ہونے کے بھی خلیفہ ہے، ہر مؤمن اپنی جگہ خلیفہ ہے۔

خلیفہ وہ ہے جو اپنے اوپر احکامِ خداوندی جاری کرے :

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میرے احکام کا اجراٴ اور نفاذ کرے گا وہ میرا خلیفہ ہے لہٰذا ہر مؤمن خلیفہ ہے۔ تو پہلے اپنے اوپر میرے احکام کا اجراٴ اور نفاذ کرنا ہے اور اگر نہیں تو کافر ہے۔ بھلا کون مؤمن ایسا ہوگا کہ جو اپنے اوپر میرے احکام کو نافذ اور جاری نہ کرے گا اور ساتھ ساتھ تواب نہ بنے گا۔

خدا توّاب ہے مؤمن کو تائب بننا چاہیے :

ذاتِ باری تعالیٰ کے اسماء میں سے تائب کا لفظ نہیں ہے، تائب کا لفظ مؤمن کے لئے ہے اور جب ایسا ہو تو توّاب اس کے لئے بھی ہے۔ تو ذاتِ باری تعالیٰ توّاب اور ایسا مؤمن بھی توّاب مؤمن کے لئے تائبیت بھی ہے چنانچہ فرمایا حدیث میں اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ تو خفیفہ رہ گیا شرک سے نکل گیا۔ اور جب نصیحت ہوگئی تو توّاب ہے، جیسا کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ اور زیادتِ الفاظ دلالت کرتے ہیں زیادتِ معنی پر یہ نحو اور لغت کا قاعدہ ہے۔

مؤمن کو توّاب کا لقب کب ملتا ہے :

تائب ہونا اور حیثیت سے اور توّاب ہونا اور حیثیت سے ہے، جب تو یہ بڑی سچی پکی شرعی ندامت کے ساتھ نہ کہ عرفی کے ساتھ اور آئندہ کے لئے عزم بالجزم کے ساتھ توّاب بنا اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء میں ایک لقب دیدیا، اس کا نام توّاب ہوگیا، تو پہلے یہ مؤمن من حیث الایمان مکلفی خلیفہ ہوا، اور خلیفہ ذاتِ باری تعالیٰ کے احکام کو اجراء اور نافذ کرنے والا کہلاتا ہے، تو یہ پہلے مکلف ہے اس بات کا کہ اپنے اوپر احکام کو نافذ اور جاری کرلے اور اسی طرح پہلے ایمان کا اجراء ہے نفاذ ہے خواہ وہبی طور پر ہوگیا ہو یا مؤمن کے یہاں پیدا ہو کر مگر شروع رہا۔ تو ایمانِ اختیاری گو وہ پہلے غیر اختیاری تھا پھر جوں جوں آیتیں آتی رہیں اس کا ایمان بڑھتا گیا۔ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا ۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کردیتی ہیں۔

خلیفہ کا بھی خلیفہ ہونا چاہیے :

نفسِ خلیفہ تو وہ ہے کیونکہ وہ اپنے اوپر احکام کو جاری اور نافذ کردیتا ہے اور جب یہ اپنے اوپر احکام کو جاری کررہا ہے اور یہی معنی ہیں خلیفہ کے تو یہ مؤمن خلیفہ ہوا وہاں خلافت مل چکی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے اوپر بھی کوئی خلیفہ ہونا چاہیے اور وہ انبیاء علیہم السلام ہیں چونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تھا تو من حیث النبوت یا بلا نبوت، تو پہلا جو مستحق ہوگا خلافت کا وہ نبی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علوم کا ماخذ اللہ تعالیٰ ہے :

چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ کے صفات نبی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور تمام دُنیا بھر سے زیادہ نبی کا علم ہوتا ہے اور نبی کا ماخذ اللہ تعالیٰ ہے۔ اب نبی سے جو علم نقلاً بعد نقلٍ چلتا رہے گا اور جو بھی لیتا رہے گا اور عمل ان کے نمونہ کے ساتھ کرتا رہے گا وہ ان کا نائب ہوگا اور پھر وہ نائب اللہ تعالیٰ کا ہوگا اور نائب کا نائب بھی نائب ہوتا ہے۔

نائب کا نائب بھی نائب ہوتا ہے :

اور جب نائب کا نائب، نائب ہوتا ہے کیونکہ لازم کا لازم بھی لازم ہوتا ہے تو ذاتِ باری تعالیٰ کے نائب کا نائب بھی اللہ تعالیٰ ہی کا نائب ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک تحصیلدار جو کہ اپنی جگہ پر مستقل ہے اپنی جگہ پر پوری تحصیل کا مالک ہے اور کلکٹر پورے ضلع کا۔ تو تحصیلدار نائب ہے کلکٹر کا اور کلکٹر کے اوپر گورنر ہے۔ تو کلکٹر نائب ہوا گورنر کا تو کیا تحصیلدار گورنر کا نائب نہیں ہے؟ تو اس اعتبار ہر مؤمن اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ لہٰذا ہر مؤمن مکلّف ہے چونکہ صاحبِ اختیار بنا کر بھیجا گیا۔

خلیفہ کے درجے مختلف ہیں :

اسی لئے فرمایا: هُوَالَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وہ جس نے تم کو زمین میں خلیفہ صاحبِ اختیار بنا کر تم کو نائب بنادیا نہ کہ پتھر نہ اور نہ ہی پانی کو اور پھر کہہ دیا وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ آ گیا درجہ معلوم ہو گیا کہ خلیفہ کے الگ الگ درجے ہیں تا کہ آزمائے تم کو اس چیز میں جو کہ دیا ہے اس نے تمہیں اس لئے درجے مقرر کیے۔

خلیفہ کی آزمائش کا معیار :

دیکھنا یہ ہے کہ منعمِ حقیقی کی نعمت کی کون قدر کرتا ہے اور کون بے قدری؟ یا آ گئے حسد میں آ گئے حرص وطمع میں کھیلنے لگے دنیاوی لہولعب میں بھول گئے منعمِ حقیقی کو نعمت کی کون قدر کرتا ہے اور کون بے قدری کرتا ہے یہ آزمائش ہے۔ اور جو منعمِ حقیقی کی قدر کرتا ہے وہ فرمانبردار اور مطیع کہلائے جانے کے قابل ہے اور جو بے قدری کرتا ہے وہ نافرمان اور غیر مطیع کہلائے جانے کے قابل ہے۔ تو کچھ مطیع ہوں گے اور کچھ غیر مطیع اور جب صاحبِ اختیار بنا کر بھیجا ہے اور پھر یہ آزمائش اس طرح اس نعمت کی قدر اور ناقدری پر مطیع اور غیر مطیع، تو ہر ایک کے ساتھ معاملہ جداگانہ ہوگا۔

لہٰذا مکلفین کو چاہیے کہ حق کی پیروی کرتے رہیں اور باطل وناحق کی پیروی سے باز رہتے رہیں، اس لئے فرماتے ہیں: اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ اور یہ بھی فرماتے ہیں: اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ دو باتیں ہیں ان کو میں سنائے دیتا ہوں کہ آپ کا پروردگار یقیناً جلدی عقاب کرنے والا ہے نافرمانوں کے لئے اور جو اپنی خلافت کو برباد کرنے

والے ہیں وہ اب خلیفہ کہلائے جانے کے قابل نہیں۔

کافر مجرم ہے مؤمن مجرم نہیں ہوسکتا :

معلوم ہوا کہ مؤمن مجرم نہیں ہے، مؤمن باوجود معصیت کر جانے کے مجرم نہیں ہے، اس ذی جرم کا جرم ناپاک نہیں ہوسکتا۔ اس میں پاکی بھی ہے۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ دور رہو ان کے ساتھ کہاں جارہے ہو یہ جنتی ہیں اور تم دوزخی تمہارا ان کے ساتھ کیا واسطہ؟ تو کافر کو مجرم کہا، احتراز ہوگیا اعتراف ہوگیا مرتے مرتے بھی خلیفہ ہی رہا اور اگر اس مؤمن سے کچھ کہہ سن بھی دیا تب بھی خلیفہ ہی رہا۔ یہ ذاتِ باری تعالیٰ کی خصوصی محبت ورحمت ہے۔

مؤمن کی شان اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہے :

ایک روایت میں ہے کہ شیطان نے کہا تھا اللہ تعالیٰ سے کہ محبت تو کرتے ہیں مؤمن آپ سے اور اتباع کرتے ہیں میری۔ حق تعالیٰ نے فرمایا وہ میرے محبوب ہیں کہ محبت کرتے ہیں مجھ سے، تو اس اتباع سے خوش ہے یہ ایک عارضی اور فانی چیز ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں اس لئے کہ مؤمن کی شان تو یہ ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔ تو اے سرکش کیسی بات کرتا ہے وہ سرکش نہیں ہیں، اور جب سرکش نہیں ہیں تو ان سے جو ہوگیا سو ہوگیا لیکن محبت مجھ ہی سے ہے۔ اس لئے میں ان کو چاہتا ہوں اور تو ہے سرکش، سرکش اسمِ فاعل سماعی ہے تو تیرا سر کھینچا جائے گا یہ احقر کے الفاظ ہیں۔ اور وہ سرکش نہیں ہیں تیرا سر بن کر رہے گا تجھ پر سردار رہے گا وہ ہے جانباز اور تو ہے سرکش اگرچہ کسی وقت میں ہار ہوگئی جان کا بازیدن معنی ہے۔ لیکن وہ تو میرے جانباز

ہیں عمل میں کوتاہی ہوگئی تو ہوگئی لیکن اعتقاد تو میرے ساتھ ایسا ہے بس تو آدمی بن۔ اور یہ بات تو ان کے بابا آدم علیہ السلام سے بھی ہوگئی تھی اس شیطان نے ان کو بھی نہیں چھوڑا تھا اور یہ آسمان پر ہوا نہ کہ زمین میں آنے کے بعد۔

توبہ کرنے سے مؤمن کا مرتبہ بڑھ جاتا ہے:

اور زمین پر جانے کے بعد تو نہ معلوم کیا کیا ہوا اور انہوں نے تو کبھی یہ بات دیکھی بھی نہیں۔ بیچارے سیدھے سادھے مسلمان تھے خلافت کی بات کبھی دیکھی نہ تھی اور پھر قسم کھا کر کہہ رہے ہیں اللہ کی محبت محبوبِ حقیقی کی قسمیں کھا کر کہہ رہے ہیں، ارے دیکھ تجھ سے بھی خلاف ہوا چونکہ تو جسکی اولاد ہے آدم علیہ السلام سے بھی یہ بات ہوئی تھی تو اگر آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہوجائے تو کیا بات ہے؟ لیکن وَنَسِيَ آدَمُ اور جب بھول ہوگئی تھی اے سرکش تیرے اس منعمِ حقیقی کی قسمیں کھانے پر لیکن جب یاد دلایا گیا تو بے انتہا نادِم ہوگئے اور ایسا رویا کہ سبزی اُگ آئی اور اس نے اپنے رب کو تضرع اور خیفہ سے یاد کیا وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً۔

جب دل میں یاد آگئی تضرع اور خیفہ کے ساتھ اور اس نے توبہ کی ہے عاجزی وانکساری کے ساتھ تو اس کا درجہ تو بلند تھا ہی اور بڑھ گیا، (شیطان) تیرا منہ ان مؤمنوں کے بارے میں کہنے کا کیا حق رکھتا ہے؟ اے اتنے بڑے بے حیا اور عنادی! اور جب ایسا ہوگیا تو توبہ کے بعد ایسا ہوگیا جیسے کہ آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

انسان صفاتِ خداوندی کے مظہریت کا نام ہے:

اس لئے کہتا ہوں کہ جو نافرمان بندہ ہوتا چلا گیا اس کے لئے سریع العقاب ہے۔ اور جو نافرمان ہونے کے بعد تائب ہوگیا تو اس کے لئے غفاریت کا مظہر بن

گیا اور اسی لئے تو اس کو پیدا کیا گیا فرشتوں نے کہا تھا کہ کیوں پیدا کیا۔ غفاریّت غفر سے مشتق ہے اور غفر کہتے ہیں چھپا دینے کو، اسی لئے کاشتکار کو غافر کہتے ہیں کہ وہ بھی بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ فرشتوں نے تو کہہ دیا کہ اس کو کیوں پیدا کیا ہے؟ یہی چیز باعث ہے اس کو پیدا کرنے کا۔ تم پر میرے اسماء وصفات کا پوری طرح ظہور نہیں ہوتا۔ تم پر قدّوسیّت کا ظہور ہوتا ہے لیکن غفاریّت کا ظہور نہیں ہوگا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ میری صفات کا ظہور اس عالم میں بھی ہو اور اُس عالم میں مؤمن پر ہوگا جب کہ اس سے کوئی امر عمداً یا خلافِ عہد ہو جائے گا تب وہ میری صفات کا مظہر بنے گا اور میں چاہتا ہوں کہ صفات کا ظہور ہوتا رہے۔ اس لئے اس عالم کے اندر اس اپنے خلیفہ کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ تم پر میری ایک صفتِ قدسی کا ظہور ہے اور قہر کا بھی ظہور ہونا چاہیے، غفاریّت کے ظہور کے ساتھ ستاریّت کا بھی ظہور ہونا چاہیے اور اسی مظہریّت کا نام انسان ہے اسی لئے اس کو پیدا کیا۔

کافر فتنہ ہے مؤمن فتنہ نہیں ہے :

اور جتنے غیر مؤمن ہیں وہ سب شیطان اور سب کا بادشاہ خود شیطان ہے چونکہ فتنہ کی ابتداء اسی سے ہوئی اور وہی اس کا بانی ہے اور بانی کا جس پر اثر آئے گا وہ کیسا ہوگا......؟ جتنے کافر ہیں من حیث الازل وہ سارے کے سارے شیطان ہیں۔ اور اسی وجہ سے قرآن پاک میں کفر کو فتنہ کہا گیا ہے" فاقتلوھم "ان کو قتل کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور فتنہ کفر ہے اور اس کے خلاف مؤمن ہے مؤمن فتنہ نہیں ہو سکتا فتنہ پرداز نہیں ہو سکتا اور واقع میں کفر میں فتنہ اور سارے کافر فتنہ پرداز ہیں۔

بحیثیتِ خلیفہ مؤمن کے اوصاف :

ہر مؤمن مؤمن ہونے کی حیثیت سے کس درجہ کا خلیفہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے مؤمن سے کیا چاہا ہے، ہم مؤمن ہو کر اپنے اوپر من حیث الخلیفہ احکاماتِ باری تعالیٰ کا ظاہراً و باطناً اجراء و نفاذ کس درجہ پر کر رہے ہیں اور ہر انسان درجہ کمال کا چاہتا ہے۔ تو پھر یوں دیکھیے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے احکام کا نفاذ اور اجراءِ ظاہری اور باطنی اعمال میں کس درجہ پر کر رہا ہوں۔ من حیث القناعۃ ہے یا من حیث الزیادت، اور وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا کا مصداق ہے۔ لہٰذا ترقی کی اُمنگ ہونی چاہیے، اور جب ہونی چاہیے تو زیادتِ اُمنگ کیوں نہیں! کہ اس میں زیادتِ ترقی ہے اور زیادتِ ترقی کا عقلِ سلیم مطالبہ کرتی ہے۔

خدا کی معیت محسنین کے ساتھ ہے :

جب بعض صحابہ ﷺ معرکہ میں شہید ہو گئے اور بعض صحابی شہید نہ ہوئے اور اس کے بعد کافی مدت تک زندہ رہے تو بعض صحابہ ﷺ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ لوگ جو شہید نہیں ہوئے اور وہ لوگ جو شہید ہو گئے درجہ میں کون سے اچھے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو بعد میں اعمالِ صالحہ کرنے کے ساتھ سیئہ سے بھی اجتناب کرتے رہے ان کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ چونکہ وہ بھی جہاد میں رہے اور یہ بھی جہاد میں رہے لیکن یہاں رہ کر چونکہ وہ محسنین ہیں اور محسن کے معنی ہیں مخلص کے اور میرا وعدہ ہے کہ جنہوں نے میرے راستہ کو اختیار کیا جو کہ جنت کا راستہ ہے اس کو ہدایت دیتا رہوں گا اس لئے کہ محسنین مخلصین میں سے ہے اور وہ شہیدوں میں سے بھی آگے ہیں چونکہ وہ نفس سے جہاد کرتے رہے جگہ جگہ پر اور ہر وقت مجاہدہ میں لگے رہے۔

مؤمن کا اصلی وطن جنت ہے :

تو لہٰذا ہم چاہے چار دن کے لئے یا چار مہینے کے لئے یا چاہے چار سال کے لئے اپنے وطن کو جو کہ عارضی ہے اور اسی کو وطنِ اصلی کہا جاتا ہے اور وطنِ عارضی کو وطنِ اقامت اور وطنِ سفر کہا جاتا ہے تو یہ وطنِ سفر کس لئے کہا؟ مجاہدہ کے لئے تو وطنِ اصلی سے جو ہجرت کی وطنِ اقامت کی طرف جہادِ نفس کے لئے تو وہ مقیمین چاہے اقامتِ سفر میں ہوں مجاہد ہیں اور اسی لئے ہجرت کی تو مہاجر بھی ہوئے۔ تو لہٰذا ان مجاہدین و مہاجرین کی قدر میزبان کے یہاں کتنی ہونی چاہیے اور گو اس اقامت میں اس کا قصور ہو۔ لیکن محبت میں کہہ رہا ہوں چونکہ میزبان کو چاہیے کہ حسنِ ظن رکھے، سوءِ ظن کا کوئی کام نہیں۔ اور مؤمن تو اس عالم میں وطنِ اقامت میں ہے اور اس کا وطنِ اصلی تو جنت ہے اور اس کو چاہیے کہ وطنِ اقامت کہے اور وطنِ اصلی کو چھوڑ کر آیا، اسی وجہ سے اس کی قدر ہے من حیث المہاجر اور من حیث المجاہد تو پھر ذاتِ باری تعالیٰ کے ہاں اس مؤمن کی قدر کیوں نہیں ہوگی۔

مؤمن مہاجر بھی ہے اور مجاہد بھی :

حدیث شریف میں ہے کہ قرآن شریف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ مؤمن جبکہ اس عالم میں نفس کے خلاف مجاہدہ کر رہا ہے اور وہ کفر و شرک کو چھوڑ کر مضبوطی سے ایمان کو اختیار کر رہا ہے اور پھر ایمان کی مضبوطی کو لے کر چلا تو ذاتِ باری تعالیٰ کے ہاں اس مؤمن کی اس عالم میں رہتے ہوئے بھی کس درجہ قدر ہے۔ اور کافر کسی بھی اعتبار سے مجاہد نہیں ہے اور نہ ہی کسی اعتبار سے مہاجر ہے اور یہ ہر اعتبار سے

مجاہد بھی ہے اور مہاجر بھی لہٰذا جو امتیاز مؤمن کو اس عالم میں حاصل ہے وہ کافر کو ہرگز نہیں ہے۔

اے اللہ ہمیں صحیح معنی میں قدر شناس بنا دے کہ منہی عنہا کے ظاہر و باطن سے اجتناب اور ماموربہا کے ظاہر و باطن کے ساتھ امتثال پورا پورا کرتے رہیں یہ ہے اجراور یہ ہے نفاذ من حیث الخلیفہ اور مؤمن کو اپنی ذات میں غیور ہو کر باحیاء ہو کر جائزہ لیتے رہنا، احتساب کرتے رہنا تاکہ کوئی گھڑی بھی اس مؤمن بندہ خلیفہ کا اپنے اوپر جائزہ لینے سے غفلت نہ ہو۔

☆

اُنتالیسویں مجلس

حقیقتِ تجلّی اور اس کے آثار

مورخہ ۱۲ شوال ۱۴۱۱ھ بمطابق ۲۸ اپریل ۱۹۹۱ء بروز یک شنبہ بوقتِ صبح

تجلّی کا تعلق سینہ ہے، اسی کو قرآنِ پاک میں صدر سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ قلب بھی متجلّی ہو بس پھر تو ہمہ وقت تجلّی ہی تجلّی ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی شانِ جلالی :

ترکوں کا زمانہ تھا مکّہ معظمہ میں جیسے اب سعودی حکومت ہے پہلے اِن کی حکومت تھی اس کے بعد قبضہ کیا۔ ترکوں کی طرف سے جو بادشاہ ہوتا تھا اس کا لقب شریف ہوتا تھا جیسے اب بھی لقب ہوا کرتے ہیں کسی کا لقب گورنر ہے کسی کا وزیر اعظم ہے۔ ہمارے دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ مکہ معظمہ میں رہتے تھے۔ شریفِ مکہ نے حضرت حاجی صاحب کے متعلق کچھ کہہ دیا۔ جا کر کسی نے حضرت حاجی صاحبؒ کو بھی کہہ دیا کہ شریفِ مکہ یوں کہہ رہا تھا کہ میں حاجی صاحب

کو یہاں سے شہر بدر کر دوں گا۔

حاجی صاحب نے فرمایا کہ وہ کون ہوتا ہے شہر بدر کرنے والا حالانکہ حضرت حاجی صاحب نہایت متواضع اور صاحبِ جمال تھے مگر اس وقت ایک جلال آ گیا، ہر وقت جدا جدا شان ہوتی ہے۔ یہ سننے کی باتیں ہیں کس قدر شائستہ اور صاف پاکیزہ دل کہ جو بات اندر تھی وہ کہہ دی شہنشاہی کیا ہوتی ہے وہ کون ہوتا ہے؟ وہ کیا جانتا ہے کہ مکہ کسے کہتے ہیں مدینہ کسے کہتے ہیں مکہ نام ہے تجلیٔ جلال کا اور مدینہ نام ہے تجلیٔ جمال کا جہاں بیٹھ گئے وہیں مکہ ہے مدینہ ہے۔ یہ بات کسی نے شریفِ مکہ تک پہنچا دی کہ حاجی صاحب یوں فرما رہے ہیں۔ شریفِ مکہ نے شرافت کی بات کہی اور یوں کہا نہیں نہیں حضرت حاجی صاحبؒ کو خوش رکھوں گا مجھ سے غلطی ہوگئی۔

پھر کسی نے حضرت حاجی صاحبؒ سے کہا کہ شریفِ مکہ یوں کہہ رہا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے۔

امام غزالی کے دل میں ایک ڈاکو کی بات کا اثر :

امام غزالی جب مدرسہ نظامیہ سے فارغ ہو کر چلے، اس زمانہ میں پیدل سفر ہوا کرتا تھا، ڈاکوؤں نے گھیر لیا اور بھی مسافر تھے، سبھی کو لوٹ لیا۔ امام غزالیؒ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس پہنچ گئے کہ تمہارے ماتحت ڈاکوؤں نے ہمیں لوٹ لیا ہے مجھے اس لوٹنے پر کوئی بے چینی نہیں لیکن وہ جو میرے کاغذ ہیں ان کی وجہ سے بے چین ہوں وہ دلوا دیجیے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے کہا کہ ان کاغذوں کی قیمت تمہارے نزدیک اتنی ہے کہ جو آپ کا مال لوٹا گیا ہے اس کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا، جی ہاں......! اس لئے کہ میں فلاں جگہ مدرسہ میں

طالبِ علم تھا میں پڑھ رہا تھا، فضلِ الٰہی سے مجھے فراغت حاصل ہوگئی ہے میں وطن واپس جارہا ہوں ان کاغذات میں میرے اُستادوں کے درس کی تقریریں محفوظ ہیں، اس لئے میں ان کو لینا چاہتا ہوں۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اچھی بات کہی کہ مجھے آپ کی یہ بات سن کر افسوس ہورہا ہے کہ آپ کا علم کاغذوں میں ہے سینہ میں نہیں۔ بس امام غزالیؒ کو چوٹ لگ گئی ڈاکوؤں نے کاغذات دے دئے، گھر پہنچ کر سینہ میں رکھنے شروع کردیئے۔

امکانِ عقلی پر شرعاً عمل کی گنجائش ہے :

کسی شئی میں عقلاً متعدد احتمال نکل سکتے ہیں۔ امکانِ عقلی میں گنجائش ہے کہ کسی بھی احتمال کو اختیار کرلے بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہولیکن جب شرعاً ممنوع ہوجائے گا تو ممنوع ہوجائے گا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچ گئے، باری تعالیٰ سے کلام شروع ہوگیا، ادھر محبت اور عشق کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چونکہ حضور ﷺ کی شریعت میں عشق کا لفظ پسند نہیں ہمارے محاورے میں ہے اس لئے بولا جاتا ہے عاشقِ الٰہی، عاشقِ رسول ﷺ اس ہمارے محاورے کو قرآن میں اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں جو تکلم ہوجانے کے بعد عشق رکھا ہوا تھا اس کی لہر دوڑ گئی اُمنگ پیدا ہوگئی کہہ بیٹھے: ''رَبِّ اَرِنِی اُنْظُرْ اِلَیْكَ''۔ لیکن من حیث الشرع ممنوع ہے تو فرمایا : ''لن ترانی'' کہ ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ یعنی یہ آنکھیں اس عالمِ مادی میں جو کہ مادی عنصری ہے اس میں یہ طاقت نہیں کہ یہ دیکھ سکیں۔

اس وجہ سے کہ اِس عالم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ اقدام برداشت نہیں کر سکے گا اسی برداشت نہ کرنے پر ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے نفی ہوگئی، لیکن یہ نفی اِس

عالم میں اُس عالم کی نفی پر دلالت نہیں کرتی۔ چونکہ وہ عالمِ مادہ سے مرکب نہیں ہے بلکہ وہ عالمِ جوہری غیر مادی ہے میں وہاں دیکھا جا سکتا ہوں، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جنتی سے جہاں ذاتِ باری تعالیٰ کا تکلم ہوگا: ''سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ اور سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ'' وہیں دیدار بھی ہوگا تو وہاں کی نفی نہیں ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کو جنت میں بحالتِ عین دیکھو گے صحابہ کرام نے سوال کیا کہ کس طرح سے؟ فرمایا کہ جس طرح کہ تم مجھ کو دیکھ رہے ہو۔

اہلِ جنت کی آپس میں دعوت :

اسی طرح جنتیوں کی آپس میں دعوت ہوگی، ایک دوسرے کی دعوت کریں گے بلکہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی طرف سے بھی دعوت ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی دعوت ہوگی دعوتِ جسمانی بھی ہوگی کہ طرح طرح کی چیزیں کھلائی جائیں گیں۔ جیسے جب کوئی مہمان آتا ہے تو اوّل وہلہ میں جہاں ٹھرنے کے لئے کمرہ مقرر کیا گیا ہے پہلے اس میں بٹھا دیتے ہیں اور اس وجہ سے بھی بٹھا دیتے ہیں تا کہ آنے والے بھی ملاقات کر لیں اور ذرا پسینہ اُتر جائے اور تھکان ختم ہو جائے بعد میں کہتے ہیں کہ اچھا اچھا آپ تشریف لائیے۔

ایسے ہی ذاتِ باری تعالیٰ کے ہاں بھی یہ سلسلہ جاری ہے حساب کتاب ہو کر کفار دوزخ میں جا رہے ہیں اہلِ جنت کی جنت میں داخل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت ہوگی۔

جنت میں داخل ہونے سے پہلے مٹی کی روٹی کی دعوت :

مٹی کی روٹی کھلائی جائے گی، حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ سے کسی طالب علم نے کہا کہ حضرت وہ تو کرکری ہوگی پھر کیسے کھائی جائے گی ......؟ فرمایا تمہارے ہاں چھلنی بھی تو ہوتی ہے آٹے کو اس میں سے نکالا جاتا ہے پھر وہ میدہ میں جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی چھلنی میں اس کو چھانا جائے گا کرکراہٹ بالکل ختم اس کی روٹی کھلائی جائے گی اور جتنی دُنیا بھر میں غذائی چیزیں ہیں وہ سب اس میں موجود ہوں گی اور جنتیوں کو جنت میں داخلہ سے پہلے کھلائی جائے گی یہاں بھی بعض مرتبہ دوسروں کے طفیل میں مل جاتی ہے تو وہاں بھی کچھ طفیل میں روٹی ملے گی۔

کافروں کا اُس عالم میں کوئی حصہ نہ ہوگا :

مؤمن تو کھاتا ہے ایک آنت سے اور کافر کھاتا ہے سات آنتوں سے تو اس کو زیادہ چاہیے اور وہاں اس کے لئے ہے نہیں اور کھاتا ہے زیادہ تو اس کو زیادہ پہننے کو بھی چاہیے۔ مالی حیثیت سے بھی زیادہ چاہیے، جاہی حیثیت سے بھی زیادہ چاہیے اور وہاں اس کے لئے مال ہے نہ جاہ اور نہ وہاں کھانا اور نہ پانی۔ کافر کے لئے نہ بطنی جسمانی فرحت اور نہ باطنی فرحت و راحت ساری چیزوں سے وہاں محروم۔

تو اے اللہ کے مؤمن بندو یہاں تو دینے دو اور مؤمن کہہ رہا ہے کہ ہم تو مؤمن ہیں اور وہ تو بالکل ہی کفر و شرک کی کھلی کھلی باتیں کرتا ہے ہم اس طرح سے ہیں اور وہ اس طرح سے مالا مال ہے۔ یہ انتظامی طور پر ہے تمہیں خبر نہیں اور وہاں تو یہ ہے لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وہاں کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔ ان کا حصہ جو تھا اپنے کو اس

سے انہوں نے محروم کردیا با اختیار، کہ میرے ہاں کوئی ذمہ نہیں ہے۔ جوان کا حصّہ تھا انہوں نے اپنی میراث حاصل کرلیا، اس وجہ سے اُن کو حصّہ وہاں کامل گیا۔

لیکن آج مسلمان بھی یوں کہتا ہے کہ وہاں کا حصّہ ہمیں وہاں نہیں چاہیے یہاں دے دو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ایسا خیال مت کروان کا وہاں کچھ حصّہ نہیں بلکہ وہاں کا حصّہ تم ہی کو ملے گا۔ لہٰذا تم یہاں تو ان کو زیادہ دینے دو یعنی بادشاہت بھی جو انتہائی درجہ دنیاوی چیز ہے ان کا جی خوش ہوجائے گا۔ مگر خوشی کی بات تو یہ ہے نہیں بلکہ ان کے لئے تو اور مصیبت ہے بلکہ وہ تو طفیلی ہیں کہ اس عالم میں بھی بطفیل مؤمن کھاتے ہیں اور وہاں تو سارے ہی مؤمن جنتی ہوں گے وہاں طفیل کیسا؟

جنت میں داخل ہونے سے پہلے زاہدوں کی خاطر سے مٹی کی روٹی ہوگی :

ہاں کچھ مسلمان بندے ہمارے ایسے عاشقِ رسولؐ ہوتے ہیں کہ دنیا کے مباحات سے بھی بے غرض، انھوں نے لذت کی چیزوں کو گویا طلاق دے دی لذیذ چیزوں کو تناول نہیں کیا تو ان زاہدوں کی خاطر زمین کی روٹی اور زمین میں جو چیزیں میوے، پھلوں کی ہیں ان سب سے مرکب کردی ہے اس میں سب چیزیں ہوں گی۔ اب بتاؤ وہ روٹی کس کس ذائقہ کی ہوگی یہ اہلِ جنت کی پہلی دعوت ہوگی کہ دخول سے پہلے گویا کہ یوں کہا جائے گا کہ ٹھہرو ٹھہرو یہ حکم نہیں بلکہ ایک پروانہ ہے تم بھوکے ہو تو زمین اپنے سب اجزا جمع کردے گی تاکہ میں ان کو دھودوں۔ اس کھانے کے بعد اب جنتی جنت میں داخل ہوں گے۔

جنت میں داخل ہونے کے بعد دوسری دعوت مچھلی کباب :

پھر جنت میں داخل ہونے کے بعد ایک اور دعوت ہوگی مچھلی کے کباب۔ بہت بڑی مچھلی ہوگی یہیں دنیا کے دریا میں پانی کے جہاز کو بچا بچا کر لے جانا پڑتا ہے کہ کہیں پانی میں ٹکر نہ لگ جائے۔ بعض مچھلیاں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ٹکر لگ جائے تو جہاز پلٹ جائے تو جب یہاں سمندر کی مچھلی اتنی بڑی ہوتی ہے تو وہاں کی مچھلی کتنی بڑی ہوگی، اور اس کے بعد تو علی الارائك ینظرون کہ آپس میں آمنے سامنے میسروں پر تکیوں پر ٹیک لگائے ہوئے خوش بیٹھے ہوں گے۔

جنت کی نعمتیں :

قرآن شریف اس طرح پڑھا کرو کہ ولولہ آجائے جو اعمال ذاتِ باری تعالیٰ کی رضاء وقرب کے ہیں جن کا محل جنت ہے اور جنت میں انبیاء علیہم السلام کی طرف سے بھی دعوت ہوگی اور ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے بھی دعوت ہوگی کیا کھلائیں گے؟ یہ ذہن میں نہیں آسکتا۔ چونکہ جنت میں تو بہت سی ایسی نعمتیں ہوں گی کہ نہ آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی اور نہ زبان نے چکھی اور نہ کسی ہاتھ نے چھوئی ایسی دعوت ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے : و لا عین رأت ولا اُذن سَمعت ولا خطر علی قلبِ بشر۔ محبت میں آدمی محبوب کی آواز پر لٹو ہو جاتا ہے تو پھر خدائی دید پر کیا حال ہوگا۔

اسی لئے قرآن شریف میں آیا ہے اے عورتو! نامحرم سے نرم نرم کلام مت کرو کہیں تمہارے نرم کلام سے سننے والے کے دل میں میلان نہ ہو جائے۔

حق تعالیٰ سورۂ رحمٰن سنائیں گے:

معلوم ہوا کہ کلام میں بھی ایک اثر رکھا ہوا ہے اس کے بعد ذاتِ باری تعالیٰ اس جسم جوہری کی دعوت فرمانے کے بعد فرمائیں گے کہ اور کیا چاہتے ہو؟ حق تعالیٰ فرمائیں گے میں تم کو اپنا کلام خود سنانا چاہتا ہوں تو ذاتِ باری تعالیٰ سورۂ رحمٰن سنائیں گے۔

محرم راز ہی اللہ تعالیٰ کا کلام سنیں گے:

میں نے تو پیغام پہنچا دیا تھا: کتب ربکم علی نفسه الرحمة لیکن جنھوں نے اعتبار نہیں کیا اور میرے کلام کو اور میرے پیغمبروں کو جادوگر کہہ دیا اور یوں کہا کہ یہ تو پہلی کہانیاں چلی آ رہی ہیں، تو انھوں نے اپنے آپ کو محروم کر لیا، اور جنھوں نے اپنے کو محروم نہیں کیا بلکہ محرم راز بن کر رہے میرے کلام کے ساتھ بھی اور میرے پیغمبروں کے ساتھ بھی تو وہ میرے حرم میں آ گئے پھر محروم کہاں رہے۔

بیقرار اور فریفتہ کو تسلی دینی چاہیے:

ایک بات لطیفہ کے طور پر یاد رکھو کہ جب یہ دیکھو کہ جس چیز کو طلب کر رہا ہے، اس چیز کی سہارا نہ لے سکے گا اور انکار پر اس کا دل برداشتہ ہو جائے گا۔ اس کے دل میں چُبھن ہو جائے گی، طبیعت بجھی بجھی ہو جائے گی اس نے اپنی فریفتگی کا اظہار کیا تھا آپ اس سے فراری کا کلام فرما رہے ہیں اس کے دل کا کیا حال ہوگا۔

لہٰذا اس کی تلافی کیجیے تا کہ اس کو یقین ہو جائے کہ جو اس نے کہا بالکل ٹھیک ہے معلوم نہیں میرا کیا حال ہوتا۔

سیّد احمد رفائی کبیرؒ کا واقعہ :

غوث پاک سیّد عبد القادر جیلانیؒ کے زمانہ میں سیّد احمد رفائیؒ بہت اونچے اولیائے کرام میں سے ہیں۔ جب حج کرنے گئے اور مدینہ منورہ پہنچے۔ روضۂ مطہرہ پر حاضر ہوئے۔ بخاطر درود و سلام پڑھ کر کہنے لگے حضرت ﷺ میں غائبانہ سلام پہنچاتا تھا اب حاضر خدمت ہوں، مجھ سے لوگ پوچھیں گے کہ تم نے کیا دیکھا تو میں کیا جواب دوں گا؟

میرا جی چاہتا ہے کہ دستِ مبارک سامنے آئے اور میں اس کی تقبیل کروں تو پھر جا کر کہوں گا دستِ مبارک باہر آیا تھا یہ عالمِ برزخ کی باتیں ہیں بوسہ دیا، تقبیل کی، ہاتھ اندر ہو گیا۔

غوثِ پاکؒ کی خدمت میں ایک شخص کا آنا :

غوثِ پاک اور سیّد احمد رفائیؒ کا زمانہ ایک ہی ہے، ایک شخص غوثِ پاک کی خدمت میں آیا حاضر ہو کر سلام کیا، فرمایا تم شقی ہو، میرے پاس سے جاؤ وہ شخص چلا گیا۔

سیّد احمد رفائیؒ کی فنائیت :

اور سیّد احمد رفائیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا سلام کیا، جواب دیا اور فرمایا او ہو! ہمارے بھائی عبد القادرؒ نے تم کو شقی کہہ کر نکال دیا بھائی ہم بھی شقی ہیں تم بھی شقی ہو آجاؤ۔ وہ بات تو عبد القادر جیلانیؒ کی رہی لیکن عبد القادرؒ کو جو کشف ہوا وہ یہ سمجھے کہ یہ شقی ابدی ہے۔ اور سیّد احمد رفائیؒ کو بھی کشف ہوا اور شقی ہونے کا ہوا لیکن ان کے خیال میں ابدی ہونا نہیں آیا اور یہ سوچا کہ جب یہ طلبِ صادق کے ساتھ متوجہ ہوا اگر

پوری توجہ کی جائے گی تو اس کی حقارت مبدل بسعادت ہو جائے گی، شقی سعید ہو جائیگا۔ چنانچہ توجہ کی، توفیقِ الٰہی سے سعید ہو گیا اور پھر فرمایا جاؤ۔ ہمارے بھائی عبد القادر کو سلام کرو، اور پہنچ گیا سلام ہوا اور جواب دیا غوث پاک نے فرمایا ہم میں وہ طاقت کہاں کہ شقی کو سعید بنا دیں وہ تو ہمارے بھائی سیّد احمد رفاعیؒ میں ہے کہ شقی سعید ہو گیا۔

کشف کو شریعت کی روشنی میں پرکھے :

بعض دفعہ اوّل تو کشف ہونا ضروری نہیں، اگر کبھی ہو جاتا ہے تو بعض دفعہ پورا ہو جاتا ہے بعض دفعہ کسر رہ جاتی ہے۔ پھر اس کو ٹٹولنا پڑتا ہے کہ شریعت اس بارے میں کیا کہہ رہی ہے۔ اگر امکانِ عقلی ہے تو پھر یہ دیکھے کہ شرع اس عقل کی نفی کرتی ہے یا نہیں، شرعاً ممنوع ہے کہ نہیں! اگر ممنوعِ شرعی نہیں ہے تو اس کو گوارا کر لیا جائے گا اور اگر ممنوعِ شرعی ہو جائے گا تو اس کو پھینک دیا جائے گا اصولی باتیں ہیں۔

ماتحتوں کی دلجوئی کرنی چاہیے :

اگر کسی شخص کی تمنا کو پوری کرنے میں کوئی مصلحت انکار کر رہی ہو جیسے بچہ ایک روپیہ مانگ رہا ہے اور آپ دے رہے ہیں ایک پیسہ، اور دوسرے وقت میں وہ دس روپے مانگ رہا ہے اور آپ نے 100 روپے دیدیئے۔ تو جس وقت اس نے ایک روپیہ مانگا اور آپ نے دیا ایک پیسہ تو اس کا دل؟ لہٰذا جب آپ نے اس کی دل سوزی کردی ہے مہربانی فرما کر اس کی دلجوئی بھی فرما دیں۔

اسی طرح اُستادو! یہ نہیں کہ شاگرد سے جو چاہے کہہ دیا، پیرو! جو چاہے مُر

یدوں سے کہہ دیا، میاؤں! بیوی سے جو چاہا کہہ دیا جو چاہا نوکر سے کہہ دیا یہ ہرگز درست طریقہ نہیں۔

اساتذہ وطلبہ کو نصیحت بھرا خطاب :

آج کل تو درسگاہ میں بھی دیر سے جاتے ہیں وہاں طلبہ چٹائیاں پھاڑ رہے ہیں اور جب پھٹ جائیں تو پھر تقاضا کہ اس سال چٹائیاں پھٹ گئیں، مدرسہ کے پیسہ پر بھی رحم نہیں آتا۔ گھنٹی بجی ابھی لڑکے اُٹھ کر جانے بھی نہیں پائے اُستاد صاحب پہلے ہی اٹھ کر چلے گئے اب بچے لڑ رہے ہیں کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ یہ بیچ میں بطور جملہ معترضہ کے ہے اسی طرح باپ بننا تو آسان مگر نباہنا مشکل ہے۔

چھوٹوں کی دلجوئی کی جائے :

یہ بڑے قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں چھوٹوں پر غصہ کرتے رہتے ہیں مگر غصہ کرنا آتا نہیں بجائے اصلاح کے فساد ہوتا ہے ایسے ہی اُستاد وہ بات کہہ دیتا ہے جو اس کے دل میں ہے بھی نہیں اور پھر دلجوئی بھی نہیں کرتے، اسکی تلافی وتدارک بھی نہیں کرتے۔ اس کا تدارک کرنا چاہیے تاکہ بیچارے کی شرمندگی ختم ہو جائے اور اس کی سمجھ میں آ جائے کہ ہاں میں غلطی پر تھا میری ہی مصلحت کے لئے ایسا کیا،، اپنے لئے کچھ نہیں کیا دلداری دلجوئی کرنی چاہیے تدارک کرنا چاہیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دلجوئی :

جیسے ذاتِ باری تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے سوال کی نفی کر دی تاکہ خود سمجھ جائیں کہ میں اس قابل نہیں ہوں جو میں نے سوال کیا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

بدل کونہیں کہا تھا لیکن ذاتِ باری تعالیٰ تسلّی فرما رہے ہیں کہ بچہ کا دل دُکھ رہا ہے" یہ میرے الفاظ ہیں" تم خود ہی سمجھ جاؤ گے کہ میں نے تمہاری مصلحت کے لئے کہا ہے وَلٰکِن اُنظُر اِلَی الجَبَلِ ' پہاڑ پر تجلّی ہوئی اور پہاڑ بھی پتھر کا اور پھر اس کی جسامت انسانی جسامت سے طولانی، تو پہاڑ چکنا چور ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے متاثر ہوگئے اور وَخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا اس حالت کو دیکھ کر گر پڑے واہ اللہ میاں واہ! خوب مجھے زندہ رکھا مجھے زندہ رکھنا چاہ رہے تھے۔ آپ نے مجھ پر احسان فرمایا۔

معلوم ہوگیا کہ آپ کا مقصد مجھ کو زندہ رکھنا تھا مجھ سے خدمتِ دین کی دعوت کا کام لینا تھا اور میرا جی بھی خوش کر رہا ہے۔ جب پہاڑ کا ایسا حال ہوگیا جو ایسا سخت ایسا جسیم وجیم ہے تو اِس چمڑا ہڈی کا کیا ہو جاتا، یہ آپ کی میرے حال پر رحمت ہوئی۔ اس کا بدل ذاتِ باری تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کر کے دکھا دیا کہ جب تم اس طرح سے بھی برداشت نہ کر سکے تو بھلا اس کو تم کیا برداشت کر سکتے ہو؟ وہ تو دوسری جگہ ہے جہاں اس دیدار کا محل ہے وہ آنکھیں اور جسم اور ہوگا۔ وہاں تو تم دیکھ سکو گے لیکن یہ عالم ایسا نہیں کہ دیکھ سکے، موسیٰ علیہ السلام کو تسلی ہوئی دلجوئی ہوئی۔

حقیقتِ تجلّی اور اس کے معنی :

باری تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلّی فرمائی اور یہ تجلّی جو صوفیاء کے یہاں ہے یہ ایک اصطلاح ہے ورنہ وہ بھی وہیں سے نکلی ہے تجلّی بمعنی ظہور اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک شئی کی طرف اس طرح توجہ ہوئی کہ غیر کی طرف بالکل ہی نہیں رہی۔ یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی ذات کی طرف اس درجہ توجہ ہوئی کہ غیر کی طرف توجہ نہیں رہی، حتیٰ کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات کی طرف بھی توجہ نہ رہی اب اس کا حال کیا ہوگا، یہ ہیں تجلّی

کے معنی اور جب ایک دفعہ ایسا ہو گیا اور پھر بھی وہ اس کا طالب بنے گا تو کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ اس کی جان چلی جائے خودکشی کر لے۔ لیکن اگر کسی محقق کے پاس بیٹھا ہو اور تحقیق محقق سے سنا ہو تو خودکشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تجلّی کا محل بھی ہونا چاہیے :

اس تجلّی کا محل جلا ہے اور جلا روشن نور کو کہتے ہیں جس کو دوسرے الفاظ میں قلب و روح کہتے ہیں۔ کہیں قلب کو صدر سے بھی تعبیر کر دیا کرتے ہیں: الم نشرح لك صدرك ۔ سینہ سامنے جو کہ دائیں سے بائیں کو گھیرے ہوئے ہے اس میں بائیں جانب دل اور دائیں جانب روح ہے۔ اس طرح پورے دل اور روح کو صدر کہہ دیا اور پھر صدر کہہ کر شرحِ صدر کر دیا یہ شرحِ صدر بھی ایک نوع کی تجلّی ہے۔ بس پھر تو شرحِ صدر ہو گیا یعنی جس شئی کی جس طرح حقیقتِ صحیحہ تھی اس کا انکشاف پورا پورا ہو گیا، چنانچہ پڑھانے والا بھی کہتا ہے کہ میں نے پڑھایا تو سہی لیکن ایک مقام پر کہہ آیا کہ خود مجھے بھی شرحِ صدر نہیں ہوا۔ معلوم ہوا شرحِ صدر کوئی اور چیز ہے تو تجلّی میں جلا رکھا ہوا ہے وہ محل ہے۔

ایمان نور اور کفر ظلمت ہے :

مؤمن میں جو ایمان رکھا ہوا ہے جس کو نور سے تعبیر کیا' یہ جلا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ ایمان کو نور سے تعبیر کیا ہے اور کفر کو تعبیر کیا ہے ظلمت سے، تو کفر ظلمت ہے اور ایمان نور ہے اب نور کو چاہے ایمان کہہ دو اور چاہے ایمان کو نور کہہ دو جب ایمان ہوگا تو نور ہوگا اور جب

نور ہے تو ایمان ہے تو نفسِ نور نفسِ ایمان ہوا بترکِ کفر و شرک بالکلیہ۔ لیکن اس نے تو امنُوا کے بعد اِتَّقُوا اللّٰہ بھی بڑھایا ہے اب تقویٰ میں نورِ ایمان کا تقاضا بترکِ کفر و شرک ہو گیا۔

سالک نور علیٰ نور کیسے بنے :

اب دوسرا نور حاصل کر رہا ہے جس کا نام تقویٰ متعلق باحکامِ ظاہرہ اور متعلق باحکامِ باطنہ ہے تو اس کا نور بڑھتا ہوا بتقویٰ بتقویتِ نورِ ایمانی نور علیٰ نور ہوتا چلا گیا، اب وہ اسی پر کفایت نہیں کرتا، قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جو اس تقویٰ کے لئے عجیب زینت کی چیز ہے اور نورانیت کی چیز ہے اس کو بھی اختیار کر رہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکرِ لسانی و قلبی، دائمی۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا : رَبِّ اجْعَلْنِی لَکَ ذَکَّارًا لَکَ شَکَّارًا لَکَ رَهَّابًا لَکَ مِطْوَاعًا لَکَ مُطِیْعًا اِلَیْکَ مُخْبِتًا اِلَیْکَ اَوَّاهًا مُنِیْبًا ۔ کہ میرے رب مجھے ایسا بنا دیجئے گا کہ ہر وقت آپ کی یاد میرے دل میں رہے میں ہر وقت آپ کو یاد کرتا رہوں اور ہر وقت آپ کا شکر ادا کرتا رہوں، اور ہر وقت آپ کا خوف ہو، اور ہر وقت آپ کی تابعداری کرتا رہوں اور ہر وقت میرا قلب متاثر ہوتا رہے اور ہر وقت میں آپ کی طرف رجوع کرتا رہوں۔

مہتدی اور ہادی بننا چاہیے :

بلکہ وہاں تو اور ترقی چاہتا ہے پہلے مہتدی پھر ہادی پہلے ہدایت پایا ہوا اور پھر ہو گیا ہدایت کرنے والا ہدایت دینے والا۔ حضور ﷺ جن کی ذات اور ہستی ایسی ہو تو پھر مجھ کو کیسا ہونا چاہیے اور جبکہ میں مکلف بنا کر بھیجا گیا ہوں تو مجھ کو مساعی جمیلہ

میں بسعی کامل لگنا چاہیے۔

تجلّی کی دوسری نوعیت :

اور مزید آگے بڑھتا چلا گیا : وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا پایا گیا اب دیکھ لیں کہ آیتیں اِس کے سامنے پڑھی جارہی ہیں اور وہ آیتیں زیادتِ ایمان کا سبب بن رہی ہیں اور زیادتِ ایمان کا تقاضا کیا ہورہا ہے قناعت، کفایت یا کچھ اور؟ نفلیں بھی نہیں پڑھتا وقتی نماز تو کیا پڑھے گا۔ اس تجلّی کے لئے وہ نورِ ایمانی ابتدائی افتتاحی کافی نہیں لیکن اس پر بھی کبھی اس کے درجہ کے اعتبار سے ہوجاتی ہے اگر وہ اس کی قدر کرے تو بڑھتی جاتی ہے لیکن وہ قدر نہیں کرتا جسکو کھٹک کہتے ہیں ایمان کہتا ہے کہ تو نے اس آنکھ کو، اس زبان کو، اِس کان کو، اِس دل کو غیر محل میں کیوں استعمال کیا؟ کھٹک ہوگئی تجلّی آگئی اور وہ کھٹک تجلّی ہوگئی لیکن اس تجلّی کی اس نے قدر کی نہیں جو منجانب اللہ ایک مہمان تھی پھر اب کیوں آئے گی۔ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ اس نفسِ نورِ ایمان پر بترکِ کفر وشرک تجلّی آتی ہے لیکن اگر وہ قدر نہ کرے تو وہ اُٹھ جاتی ہے اور اگر قدر کرے تو نور بڑھتا چلا جائے گا ایسے حضرات ہر وقت تجلّی میں ہیں کہ تقویٰ بھی ہو اور زبان پر ذاتِ باری تعالیٰ کا نام بھی ہو اور دل میں بھی بسا ہوا ہو تجلّی کی حقیقت معلوم ہوگئی۔

سالک کو قناعت نہیں کرنا چاہیے :

اس سے معلوم ہوا کہ سالک کو قناعت کر کے بیٹھنا اچھی بات نہیں ہے جسمانی غذا میں تو قناعت کرتا نہیں اور غذائے رُوحانی میں قناعت کر کے بیٹھ گیا، ایسا شخص جو اس تجلّی کے ساتھ ہے جب اس کے سامنے قورمہ خوش ذائقہ آیا تو شوربے میں بھی تجلّی ہوگئی اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ بیچارا خشک زاہد ہے تو اس کو شوربے میں پانی

ملانے کی سوجھتی ہے تاکہ نفس کی اصلاح ہوجائے۔

احقر جب دیوبند پڑھتا تھا تو حضرت والا کے یہاں اپنا حال لذیذ اشیاء کے استعمال کے بارے میں لکھا، حضرت والا نے لکیر کھینچ دی اور لکھا: التائب الشاکر کالصائم الصابر یعنی ذاکر بھی ہو اور شاکر بھی ہو۔

مؤمن کے ہر وقت تین حال ہونے چاہییں:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن بندہ کی زبان ذاکر رہے اور دل شاکر رہے اور جسم صابر رہے، کبھی اتفاق سے ہوجائے لیکن دائما نہ ہو، اس میں محبت بھی آگئی، عظمت بھی آگئی طاعت بھی آگئی۔

شکر صرف الحمد للہ کہنے کا نام نہیں ہے دل شاکر محبتِ حق بعظمتِ احکام بتائب دوام یہ معنی ہیں شاکر کے اور جسم صابر اگرچہ ابتدا ہو اور آخر تک ہی رہے، کوئی جسمانی تکلیف ہوجاتی ہے، تحمل کر گیا دل کا سکون نہیں گیا جسم میں تکلیف ہے تو لیکن ہے وہ صابر جسما صابر ہے ایسا شخص مجاہد ہے۔ اور جب مجاہد ہے تو ذاتِ باری تعالیٰ کیوں نہ عطاء فرمائیں گے ہدایت۔ حالانکہ قرآن شریف میں ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔

اور اللہ تعالیٰ محسنین مخلصین کے ساتھ رہتے ہیں تو بھلا اس ذات کی معیت کیوں نہ ہوگی؟ اور جب معیت ہوگی تو تجلی کیوں نہ ہوگی: لا تخف اِن اللہ معنا ۔

اگر کسی کو بیعت کی اجازت دیدی جاتی ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ منتہائے سلوک پر پہنچ گیا۔ وہ تو اس وجہ سے کہ ذرا طبیعت کا شرمیلا ہے حیاء دار ہے اس لئے قناعت کر کے نہیں رہے گا بلکہ برابر نورانیت و شاکریت اور ذکاراً شکاراً اس کی

طبیعت بن گئی یا ابھی ذاکر ہے ذکّار ہو جائے گا ابھی شاکر ہے شکّار ہو جائے گا، وہ تو نورعلیٰ نور محلِ تجلّی ہوگا اور جب تجلّی کا محل ہو تو مخلوق کی معیت میں ہے یا خالق کی؟

اس لئے سالک کو قناعت و کفایت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اس کا کوئی وقت بھی ذکر سے لساناً وقلباً خالی نہیں ہوتا تو وہ جلا میں خود ہی متجلّی اور محلِ تجلّی اور ہر وقت ذاتِ حق کی تجلّی مست ومگن رہتا ہے۔

سالک میں صدق اور اخلاص ہر وقت ہونا چاہیے :

اِخلاص کے معنی ہیں رضائے الٰہی کے سوا اور کوئی دوسری نیت نہ ہو سب چیزوں سے خلاصی ہو سب چیزوں سے الگ ہو کر صرف رضائے الٰہی کی نیت ہو اور کوئی نیت دل میں نہ ہو۔ صدق کہتے ہیں کسی شئی کو درجۂ کمال پر پہنچانا۔ صادقین سے صدق ہے اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ اور صدق کے معنی ہیں کہ جس چیز کو حاصل کر رہا ہے اس کو درجۂ کمال پر پہنچانا۔ لہٰذا سالک سلوک کو درجۂ کمال پر پہنچادے جس کی ابھی آپ کے سامنے کچھ تعبیر کی گئی ہے۔ اسی طرح نماز ایک اس کا اخلاص ہے اور ایک اِس کا صدق ہے۔

حضراتِ صحابہ ﷺ سب مخلصین وصادقین تھے :

بھلا صحابی ﷺ نماز پڑھے گا کسی کو دکھلانے کے لئے یا خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے۔ ایک صحابی ﷺ نماز پڑھ رہے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا سلام پھیرنے کے بعد قُمْ، صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ، کھڑے ہو جاؤ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی اسی طرح تین مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ تیسری دفعہ کے بعد صحابی ﷺ نے عرض کیا کہ یا

رسول اللہ ﷺ مجھے تو ایسی ہی پڑھنی آتی ہے آپ ﷺ بتلا دیجیے، حضور ﷺ نے دکھلائی، پیغمبر ﷺ اپنی زندگی کو پیش کر رہا ہے اسی لئے پیغمبر ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے کا مؤمن کو مکلف بنا دیا گیا ہے۔

بعض صحابہ ؓ جو کچھ دور رہتے تھے، حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تھے آپ ﷺ فرماتے کہ ذرا نماز پڑھ کر دکھاؤ، نماز پڑھ کر دکھلا دی آپ ﷺ نے وہاں نہیں فرمایا کہ قم، تو کیا وہاں کمی تھی اخلاص نہیں تھا؟ بلکہ جو نماز کے آداب ہیں جو حسن و جمال کا درجہ رکھتے ہیں وہ نہیں تھے، پہلے اخلاص تو تھا صدق نہیں تھا اور بلا صدق کے کمال نہیں آتا۔

تجلّی کو سلوک میں فناء کہتے ہیں :

لہٰذا سلوک میں بھی جب تک صدق یعنی درجۂ کمال نہ آئے قناعت نہیں ہونی چاہیے۔ وہ تو مخلص بھی ہو صادق بھی ہو جب اِخلاص پیدا ہو گیا تو اخلاص پر قناعت کیسی؟ ہاں جب اِخلاص وصدق دونوں مل جائیں گے اب کہا جائے گا کہ اس شئی کی تکمیل کو پہنچ گئے۔ لیکن یہ سب کچھ توفیقِ الٰہی سے ہوتا ہے جو اخلاص وصدق کا نتیجہ فنائے نفس ہے تجلّی ہو گئی اسی تجلّی اصطلاحی کو سلوک میں فناء سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

اسی کو حضور ﷺ نے اپنے ذاکر ہونے یا اپنے شاکر ہونے کو بیان نہیں کیا بلکہ ذکّار شکّار فرمایا۔ اور چونکہ انسان کو صاحبِ اختیار بنا کر بھیجا گیا ہے وہ صفاتِ الوہیہ بطور تجلّی وجلا کے ہو جائیں ایسے حضرات ہر وقت تجلّیٔ ذاتِ حق کے ساتھ ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان صفات کے ساتھ متجلّی ہو کر توفیقِ ارزانی سے نوازیں۔

(آمین)

چالیسویں مجلس

مہتدی بن کر ہادی بھی بننے کی ہدایت

مورخہ یکم محرم الحرام ۱۴۱۲ھ بمطابق ۱۴ جولائی بروز یکشنبہ بوقتِ صبح

مؤمن مسلمان مکلف صاحب اختیار کو خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے تو خیال کرے کہ اس کو کس درجہ پر مہتدی ہو کر رہنا چاہیے یعنی ہدایت کے راستے پر کس قدر اہتمام و التزام کے ساتھ چلتے رہنا چاہیے۔ یعنی راہ بین ہو کر اس کو کس درجہ پر رہنا چاہیے۔ بالفاظ دیگر صراطِ مستقیم پر کس درجہ پر کس قدر ہمت اور عزم کے ساتھ لگا رہنا چاہیے۔

اور پھر یہ ہی نہیں بلکہ اس درجۂ اہتمام اور التزام کے ساتھ رہتے ہوئے راہ بین ہو کر راہ نما بزبان عربی ہادی ہو کر رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ تم پہلے مہتدی بنو اور بڑے پختہ، مضبوط بحالِ استقامت بنو اور بن کر بخیل نہ بنو بلکہ سخی بنو اور جب تم راہ بین ہو گئے ہو تو پھر دوسروں کے لئے راہنما بنو۔

اُمتِ محمدیہ کو خیر اُمت کا لقب ملنے کی وجہ :

حق تعالیٰ نے مؤمنین سے بتقاضۂ ایمانیہ مطالبہ کیا ہے اور اسی اعتبار سے

اے مسلمانو! اُمت محمدیہ کو خیر اُمت کا لقب دیا ہے تا کہ تم راہ بین ہو کر صحیح معنی میں رہنمائی کرتے رہو چنانچہ ارشاد ہے: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے نیک کام بتلاتے ہو اور بُری باتوں سے روکتے ہو۔ جبکہ یہ لقب پہلے کسی بھی اُمت کو نہیں ملا اور اُمتِ محمدیہ کو جو یہ لقب ملا کہ جس کی وجہ سے یہ اوصاف بیان کئے اور اوصاف پر ہی خطاب کیا جاتا ہے۔ اگر ان اوصاف کو باقی رکھا جائے گا تو خطاب بھی باقی رہے گا اور اگر ان اوصاف پر نہ رہا جائے بلکہ ان اوصاف کو اپنے اندر سے نکال دیئے جائیں تو خطاب بھی سلب ہو جائے گا۔ وجودِ صفات پر خطاب ہوتا ہے اور بقائے صفات پر خطاب باقی رہتا ہے ورنہ سلب ہو جاتا ہے۔

قول وفعل حال بن جائے :

اور عنوانِ غیرتی سے حق تعالیٰ نے دوسری جگہ بھی فرمایا۔ قرآن شریف میں ہے: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کیوں ایسی باتیں کہتے ہو تم جو خود نہیں کرتے ہو۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تک ایسا نہ ہو تو بھلی بات مت کہو بلکہ یوں فرمایا کہ جو بات تم کہتے ہو، وہ تمہارے اندر تو ہونی چاہیے۔ غیرت دلائی ہے نہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے روکا ہے۔ یعنی وہ قول جو تو دوسروں کو پہنچا رہا ہے جماؤ کے طریق سے تجھ میں ہونا چاہیے، تاکیدی طور پر فرمایا ہے کہ تمہارے اندر وہ قول بطریقِ فعل ہو اور وہ فعل بطریقِ حال ہو اور جب تک کہ اس فعلِ خیر کو نہ کر لیا جائے چین نہ آئے یہ ہیں حال کے معنی کہ اس قدر اس کا تقاضا ہو کہ کہیں قضا نہ ہو جائے۔

اپنے کو نیک بنانے کی فکر ہونی چاہیے :

اور پھر دوسری جگہ کچھ اور فرمایا ہے : اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ کیا غضب ہے کہ کہتے ہو دوسرے لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے، حالانکہ تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

تم پڑھے لکھے ہو ذرا سوچو تو، خیال تو کرو دوسروں کو درس دیتے ہو بر کا اور اپنی ذات کو بر پر لانے کے لئے بالکل التفات نہیں کرتے، توجہ ہی نہیں حالانکہ پڑھتے پڑھاتے ہو۔ لیکن اپنے لئے ابراریت کے کاموں سے تغافل برتتے ہو تساہل اختیار کرتے ہو کیا تمہاری عقل ماری گئی ہے؟

پہلے تو اپنا حق ہے، اپنے کو ناحق بنا دیا اور دوسروں کو التفات الی الحق کراتے ہو، گویا ٹیپ ریکارڈ کی طرح بزبانِ حال غیرت دلا رہا ہے نہ معلوم ہمارا حال ٹیپ ریکارڈ تک کیسے پہنچ گیا۔ یہ آیتیں بتلا رہی ہیں خصوصاً اہلِ علم کو کہ اپنے کو جانچتے رہنا اپنے کو پرکھتے رہنا اپنے کو اس کسوٹی پر دیکھتے رہنا اہلِ علم کو لازم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ارشادات فرما رہے ہیں سوتے ہوئے کو بیداری کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔

وقت کی بڑی قیمت ہے :

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ قسم کھا کر اشارہ کر دیا وقت کی قدر دانی کی طرف کہ وقت کی بڑی قیمت ہے۔ چونکہ میں قسم کھا رہا ہوں اور قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو کہ انتہائی درجہ کی منفعت کی چیز ہو اور ایسی چیز بڑی قابلِ قدر ہوتی ہے اس

کے ضائع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور جو چیز قابلِ قدر ہو اس کی اضاعت کو کوئی عقلمند بھی پسند نہیں کرتا۔ معلوم ہوا کہ وقت کی بڑی قیمت ہے کوئی دوسری چیز لوٹ کر آسکتی ہے۔ جوانی کے اوقات ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے استعمال سے جوانی کی لہر بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ متعدد ایسے واقعات ہیں کہ عمر تو ہے بڑھاپے کی اور لہر دے رہی ہے جوانی کی۔ بہر حال معلوم ہوا کہ وقت کے سوا کوئی دوسری چیز گئی ہوئی لوٹ آسکتی ہے لیکن گیا ہوا وقت پھر لوٹ نہیں سکتا، ماضی حال نہیں بن سکتا تو وقت کس درجہ کی چیز ہوئی۔

ایمان بمغیبات کی تفصیل :

اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے قسم کھا کر بتا کید و تحقیق بحرف ''ان'' اور ''لفی خسر'' میں لام تاکید یعنی یقیناً انسان البتہ خسران اور گھاٹے میں ہے جس نے وقت کی قدر نہ کی۔ اے اللہ یہ تو معلوم ہو جائے کہ وہ قدر کی چیز وقت میں کیا ہے جس کو بجا لاتے رہیں تاکہ خسارہ سے بچیں۔ دنیاوی حیثیت سے بھی نفع والی بنے اور دوسرے عالم کی حیثیت سے بھی نفع والی رہے اس کو بتا دیجیے تو پھر ہم اس وقت کی قدر آپ ہی کی اعانت اور مدد سے آپ ہی کی توفیق سے کریں گے چونکہ آپ ہی اس کے بجالانے کے اسبابِ خیر مہیا فرمائیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلی چیز تو تصحیحِ ایمان اور تصحیحِ عقائد ہے کہ جو چیزیں ایمان سے متعلق ہیں صحیح عقائد سے متعلق ہیں ان کو بن دیکھے ہوئے بلا دیکھے ہوئے کہ جس سے ایمان قلب میں جم جائے۔ جیسا کہ احقر نے عرض کیا تھا کہ ٹیپ ریکارڈ کہتا ہے کہ میرے اندر جو صدا آتی ہے میں اس کو جمع کر کے اندر بٹھا لیتا ہوں وہ چیز نکل

نہیں سکتی تو اس سے بھی کہیں زیادہ۔

تصحیحِ عقائد جس کو تعبیر کیا جاتا ہے چھوٹے سے لفظ ایمان کیساتھ اور وہ مغیبات میں سے ہیں۔ جو اُن کو مان لے میرے ہاں اس کی خوب قدر ہوتی ہے کہ ابھی دیکھی بھی نہیں، بلا دیکھے مغیبات کی چیزوں پر ایمان ہے کہ میرا وجود بظاہر سامنے آیا نہیں مغیبات میں سے ہے، تیری عقلِ مستقیم وفہمِ سلیم کہ جس پر کوئی خارجی غبار نہ آیا ہو میرے وجودِ وجوبی کو بطریقِ وحدانیت تسلیم کرتا ہے مانتا ہے عقل رہبری کر رہی ہے۔

اور ملائکہ دیکھے نہیں اور مانتا ہے جنت دیکھی نہیں اور مانتا ہے دوزخ دیکھی نہیں اور مانتا ہے۔ وہ عالمِ عاقبت یعنی حشر سامنے ابھی آیا نہیں اور مانتا ہے۔ مرنا سامنے ہے لیکن مرنے کے بعد زندہ ہونا سامنے نہیں ہے اور مانتا ہے۔ حیات بعد الممات کو مانتا ہے۔ اور مزید یہ کہ ان چیزوں کی تعلیم کا کوئی ذریعہ نہیں لیکن جب اپنی عقلِ مستقیم اور فہمِ سلیم سے غور کرتا ہے اور سوچنے کے لئے بیٹھ جاتا ہے تو یہ چیزیں رہنمائی کرتی ہیں حالانکہ وہ بڑی استعجاب کی چیز ہے لیکن پھر مانتا ہے۔ اور جو اس طرح سے مانتا ہے اس کو مؤمن کہا جاتا ہے: ان الذین امنوا میں تصحیحِ عقائد اور ایمان بمغیبات مراد ہے اور اس تصحیح عقائد کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہر چیز کے دو درجے ہیں:

ہر شئی کے دو درجے ہیں، ایک درجہ پہلا حصولِ نفسِ شئی کا ہے اس چیز کے حاصل ہونے کا ہے کہ میری قدرت نے انسان کو کیسا پیدا کیا ہے نیز عقل دے کر تمام مخلوق سے ممتاز کر دیا۔ لیکن عقل کہتی ہے کہ نفسِ شئی کا حصول اپنی جگہ پر ہے مگر وہ نفسِ شئی بتلاتی ہے کہ میرا کوئی درجہ تکمیل کا بھی ہے کمال کا بھی ہے۔ اور کوئی انسان عقلمند کسی

شئی کے درجہ نفسِ شئی کے حاصل ہونے پر قناعت اور کفایت ہرگز نہیں کرسکتا۔

بلکہ اس کی عقل کہتی ہے کہ اس شئی کو درجۂ کمال تک پہنچاؤ تکمیل پر لاؤ۔ تو یہ ایمان اس طرح پر جو کہ قلب میں جمایا ہے نکل نہیں سکتا، نکالا نہیں جاسکتا، یہی اس کا تقاضا ہے اور کمال تک اس طرح پہنچائیں کہ جس پر ایمان لائے ہیں یعنی وجود، وجوب اور وحدانیتِ باری تعالیٰ اس کی تکمیل کے لئے کچھ اسباب ہوں گے کچھ سامان ہوں گے ان اسباب کی تلاش کرنی چاہیے۔ اس عقل نے بتلایا کہ اُس چیز کا نام احکام ہے۔

رسول کی صفت :

تو ان کا بھی کچھ نزول ہونا چاہیے، اور وہ نازل کئے ہوئے ہر ایک کے ساتھ تو ہوئے نہیں بلکہ جو بہت ہی مقرب اور دنیا بھر سے زیادہ دانا، دنیا بھر سے زیادہ فہم رکھنے والا ہو وہ ہوا کرتا ہے۔ اور جو ایسا ہوگا وہ اس ذاتِ وجوبی کا اخص الخواص ہوگا کہ وہ اپنی طرف سے کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرسکتا، نہ الفاظ میں اور نہ ان الفاظ کے معانی میں۔ جیسا کہ ٹیپ کہہ رہا ہے یہاں بھی بزبانِ حال کہ میرے اندر جو الفاظ آگئے ہیں جب میں ان کو نکالوں گا میں اس کے اندر کوئی تبدیلیٔ الفاظ نہیں کرسکتا۔

ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ وہ شخصیت ہوگی جو کسی بھی قسم کی تبدیلی نہیں کرسکتی، اس ذات اخص الخواص میں بطریق ٹیپ ریکارڈ وہ کلام اس کے اندر رکھ دیا ہے۔ تو جو رکھ دیا ہے اور جتنا رکھ دیا ہے اتنے ہی وہ الفاظ بولے گا اور جب چپ ہونے کے لئے کہا جائے گا تو چپ ہو جائے گا۔ ایسی ذات کا نام جو کہ اخص الخواص ہے، انسان بشر بھی ہے، ان صفات کے ساتھ موصوف ومتصف بھی ہے، اسے

پیغام پہنچانے والا کہتے ہیں، دوسرے لفظوں میں اسے ہادی کہتے ہیں، اب یہ الگ بات ہے کہ یہ لفظ ہمارے علم میں لانے کے لئے کچھ اور ہوتا ہوگا اسے رسول کہتے ہیں۔ تو ہم اس وجودِ وجوبی کے ماننے کے ساتھ پیغمبر کو جس کو رسول کہتے ہیں اس پر اسی طرح ایمان لاتے ہیں۔

رسول کی نشانی معجزہ ہے :

اور عقل کہتی ہے کہ اس کے پاس نشانیاں ہوں گی کچھ علامتیں ہوں گی، جو کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے اس کے بھیجنے پر اس کو دی ہوں گی وہ ان کو ظاہر کرے گا۔ چونکہ بلا دلیل کے تو کسی بات کا ماننا مشکل ہے، بلکہ اس کے لئے شہادت ہونی چاہیے اور ایسی شہادت ہونی چاہیے کہ اور کسی مخلوق میں نہ پائی جائے بلکہ اس سے تمام مخلوق عاجز آجائے اور ایسی ظاہری نشانی اور کوئی دکھلا نہیں سکتا اور عاجز کرنے والی چیز کا نام معجزہ ہے بشرطیکہ خارجی غبار نہ آیا ہو۔ تو تسلیم کرنا پڑے گا انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور جب یہ ہے تو اس رسول نے کہا کہ جس کو دلائل سے تم نے مان لیا اور پھر اس پر ایمان لائے، تو پھر اس ایمان میں کمال پیدا کرنا چاہیے۔

اعمالِ صالحہ سے کمال پیدا ہوتا ہے :

اور جب تم ایمان میں تکمیل پیدا کرنا چاہتے ہو کمال کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو وہ رسول کہہ رہا ہے کہ اس کے اسباب اس کے ذرائع یہ ہیں۔ جب ہم تک یہ بات اس نفسِ ایمان کی تکمیل کی پہنچ گئی اور ہر ایک کی عقل یوں کہتی ہے کہ بھلا میں اس پر بس کیوں کروں میں اس کو درجۂ کمال پر کیوں نہ پہنچاؤں اور جبکہ مجھے اس کے اسباب و ذرائع بھی معلوم ہو گئے۔ جب میری عقلِ مستقیم یوں کہتی ہے تو پھر میں انکو

کیوں نہ اختیار کروں۔ تاکہ اس شئی کا درجۂ کمال حاصل ہو جائے ان کا نام ہے احکام۔ ان احکام پر چلتے رہو تو نفسِ ایمان میں کمال آتا چلا جائے گا اور وہ احکام جو کہ درجۂ عمل اور درجۂ فعل میں لائے جاتے ہیں ان کا نام ہے اعمالِ صالحہ۔

اجتماعِ ضدّین محال ہے:

اور جب اس لفظ اعمالِ صالحہ سے معلوم ہو گیا کہ جو اس کی ضد ہو گی اس کو استعمال نہ کرنا ہو گا چونکہ عملوا کے ساتھ صالحات کی قید ہے چونکہ وہ اعمالِ صالحہ کی ضد ہیں اور اجتماعِ ضدّین محال ہے لہٰذا اس دوسری ضد کا اس کے ساتھ استعمال کرنا کفر ہو گا۔ جیسے میٹھا شیریں کڑوے کے خلاف ہے، چونکہ اجتماعِ ضدّین ہے دن میں رات کیسی؟

اسی طرح تصحیحِ عقائد اور کمالِ ایمان کے حصول کے جو وسائل اور دلائل ہیں ان کے خلاف دوسرا سبب دوسرا ذریعہ جمع نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ہونا چاہیے اور اگر استعمال کیا تو جو چیز کہ اعمالِ صالحہ ہیں وہ صالحہ نہیں رہیں گی یا تو ان میں ضعف اور کمزوری آجائے گی جس کی وجہ سے ایمان میں بے رونقی اور بے نوری ہو گی اور جو ایسا ایمان ہو گا تو اس کو درجۂ کمال تک کون کہے گا۔ اور اگر کوئی چیز عملِ صالح کے ساتھ بالکل ہی خلافِ استعمال کی ہو تو اسمیں صلاحیت کا کوئی درجہ بھی نہ رہے گا درجۂ کمال تو کیا نفسِ شئی بھی باقی نہ رہے گی۔

نتیجہ تابع ارذل ہوا کرتا ہے:

چونکہ عقلِ مستقیم اور فہمِ سلیم کہتی ہے کہ نتیجہ تابع ارذل ہوا کرتا ہے اور ارذل کہتے ہیں نکمی چیز کو۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ جب میں کسی کو

پیدا کرتا ہوں تو درجہ بدرجہ ہوتا ہوتا اس کو ارذلِ عمر تک پہنچا دیتا ہوں کہ وہ عمر بیچارے کی نکمی ہو جاتی ہے اور اس بات کی وجہ سے کہ آخر میں کیا حال ہے نتیجہ تابع ارذل ہوگا اور اسی طرح جب اِن صالحات کے ساتھ طالحات کو ملا دیا تو نتیجہ تابع ارذل تو پھر وہ صالحات کہاں رہے اور صالحات کو اعمال کے ساتھ موصوف قرار دیا ہے تو وہ اعمالِ صالحہ صالحہ کہاں رہے۔ چونکہ نتیجہ تابع ارذل ہوا کرتا ہے معلوم ہوا کہ درجۂ کمالِ شئی اسی وقت ہوگا جبکہ اس میں کوئی اور دوسری چیز شامل نہ ہو جیسے موجبہ کلیہ ایک مقدمہ ہے اور دوسرا مقدمہ سالبہ کلیہ ہے نتیجہ جو آئے گا وہ سالبہ کلیہ آئے گا موجبہ کلیہ نہیں ہوگا چونکہ ایجاب اعلیٰ ہے اور سلب ارذل ہے اس وجہ سے موجبہ کلیہ، سالبہ کلیہ کا نتیجہ سالبہ کلیہ آئے گا۔

ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ ملانے کی حکمت :

چونکہ اس عالم سے اُس عالم میں جاتے ہی اس کو خیر کی جگہ حیاتِ دائمی، نعمتِ دائمی عطاء فرمادے کہ نفسِ ایمان کے ساتھ ہے اور یہ کافی ہے۔ بلکہ وعملوا الصالحات سے معلوم ہوا کہ نفسِ ایمان کافی نہیں کہ آتے ہی حکم دے دیا کہ جاؤ راحت کی جگہ فرحت کی جگہ عجیب عجیب نعمتوں کی جگہ یہ کافی نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ دوسری چیز ہونی چاہیے جو کہ ایمان کو نکھارنے کے لئے ہو اور جب مومن اعمالِ صالحہ کے ساتھ جمع ہو گیا تو بے کھٹکے اور بے فکر فرما دیا جائے گا کہ جاؤ راحت کی جگہ میری ملاقات کی جگہ وغیرہ وغیرہ۔

مؤمن جہنم میں نکھار کے لئے بھیجا جائے گا :

ورنہ نفسِ ایمان میں جو کمی آئی ہے اس کو نکالا جائے گا جیسے ٹیپ اگر اس میں

کچھ نقص آ گیا تو اس کو نکالا جائے گا تا کہ کمالِ الفاظ، کمالِ صوت اس میں جمع ہوں۔ تو اس کمی کو جو کہ نکالنے کے قابل ہے اس کمی کو جو ایمان میں آ گئی ہے اور وہ کمی نکالے جانے کے قابل ہے تو اس کو سُنار کی طرح سے کہ سونے میں جب کھوٹ آ جائے تو اس کو آگ میں تپایا جائے گا اور اس کھوٹ ہی کو نکالنے کے بعد اس سونے سے جس قسم کی ہیئت شکل بنانی ہے بنائے گا۔

ٹھیک اسی طرح جو کمی اس نفسِ ایمان میں جو کہ وہ مدارِ دخولِ جنت اور خلودِ جنت ہے اور اس میں جو کمی، کھوٹ نکالے جانے کے قابل ہے اور اس میل کو نکالنے کے لئے ایک آگ ہے جس کا نام نار اور دوزخ ہے، ہمارے الفاظ میں اس کا نام جہنم ہے۔ جو آگ کی جگہ ہے اس میں اس میل کو نکالنے کے لئے ڈالا جائے گا۔ لیکن چونکہ وہ میل اور کھوٹ نکالے جانے کے قابل ہے ایسا نہیں کہ جو نکالے جانے کے قابل نہ ہو تو اس کے لئے تپش اور حرارت کمی کے اعتبار سے پہنچائی جائے گی اور جو کھوٹ ایسا ہو کہ نکالے جانے کے قابل نہ ہو اس کی ناریت کا طبقہ اور ہے چونکہ وہاں نفسِ ایمان جو ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہے بلکہ اس میں تو پورا کا پورا کھوٹ ہے، تپانے کے بعد بھی وہ اصل چیز نہیں آ سکتی تو اس کے لئے دخول کے ساتھ خلود ہے۔ اور جس میں کہ نفسِ ایمان میں کمی آئی ہے اس کے لئے ناریت کا طبقہ اور ہے کہ اس کے لئے ناریت دخول کے اعتبار سے ہے خلود کے اعتبار سے نہیں۔ لہٰذا دخول کے بعد جب کمی نکل گئی تو اس نفسِ ایمان میں کمال کا درجہ آ گیا اب وہی ایمان دخولِ جنت مع خلود کا سبب ہو گیا۔ اور جنھوں نے اس کھوٹ کو نکال لیا بشمولِ اعمالِ صالحہ ایمان کے ساتھ وہ تو ہر حال میں خسارے سے بچے ہوئے ہیں۔

بدعمل بظاہر باسکون درحقیقت بے سکون :

اور اگر دوسرا بالمقابل اس کے وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے رُکا ہوا ہے، بچا ہوا ہے اگرچہ دنیوی نقطۂ نظر کے اعتبار سے کیسی بھی ظاہری دولت اور سلطنت اور حکومت ہو لیکن درحقیقت وہ خسارے سے خالی نہیں ہے۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ آپ کے پاس سلطنت وحکومت ہے تو یہ دولت ہے، وہ کہے گا یہ سامان واسباب تو واقعی ایسے ہی ہیں جو اطمینان اور سکون کے معلوم ہوتے ہیں لیکن صبح سے شام تک نہ معلوم کتنی فکر مندی ہوتی ہے کتنا رنج پہنچتا ہے۔

مؤمنِ صالح حقیقی سکون میں ہے :

اور مؤمنِ کامل بکمال بشمولِ اعمالِ صالحہ نتیجۂ ارذل میں زندگی گذارنے والا جس کے پاس دنیوی نقطۂ نظر سے کوئی اچھی چیز نہیں اس سے پوچھے گا کہ آپ تو بڑی دُکھن میں ہوں گے بڑے بڑے صدمے آپ کو پہنچے ہوں گے وہ کہے گا : الحمد للہ ثم الحمد للہ میرے دل پر جو آپ فرما رہے ہیں ان کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ میرے پاس ایسی چیز ہے جو مانع ہے ان باتوں کے لانے سے اور اگر کبھی وہ چیز آ بھی گئی تو میرے اندر ایسی قوی چیز موجود ہے جو اس کو دفع کر دیتی ہے۔ میرے اندر قوتِ مانعہ بھی ہے اور قوتِ دافعہ بھی ہے، مجھے آپ پر ناز نہیں بلکہ اس پر نازاں ہو کر کہہ رہا ہوں۔

ہادی بننے کے طریقے اور شرائط :

دو لفظ ہیں ایک وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ اور دوسرے وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ اور یہ بالمقابل ہے وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے۔ اور جب قبولِ ایمان ہو گیا تو آگے وتواصوا

بالحق ہے اور جب تواصیٔ حق کو قبول کرلیا۔ پھر تو اس میں تحمل ہر ہر موقع پر کرنے کی ضرورت نہیں بس ایک دفعہ ہے معلوم ہوا کہ وتواصوا بالحق مقابل ہے اٰمنُوا کے کہ اگر کوئی شخص مؤمن نہیں ہے۔ اس کو ایمان لانے کی دعوت دو جبکہ دیکھ لو کہ مدعو میں غلبۂ قبولیت کا خیال ہو یہ احقر نے شرطیں بیان کر دیں بدرجۂ اطلاق نہیں۔

اور ایسے شخص کے درپے ہونا جس میں حق کو قبول کرنے کی استعداد معلوم نہ ہو مثلاً دیکھ لیا یا کہہ کر دیکھ لیا، یا اندازہ سے اس کی حالتِ باطن کا علم ہو گیا، ایسے کو خطاب کی ضرورت نہیں اور درپے ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ارشاد فرمایا: اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى جو شخص بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں؟ منع فرمایا اس لئے اس قید کے ساتھ تواصی بالحق ہوگا، دعوت وہاں دو جہاں محل ہو چونکہ خلافِ محل دعوت دینے سے وہ عملِ صالح نہ ہوگا بلکہ عملِ طالح ہوگا۔

صبر بڑے درجہ کی چیز ہے:

دوسری چیز وَتَواصَوا بالصَّبر ہے جو کہ بالمقابل ہے اعمالِ صالحہ کے یعنی جو مؤمن ہیں ان کو جزئیاتِ ایمان کی دعوت دیتے ہیں۔ چونکہ ہر ہر جزئی کو عمل میں لانے میں تحمل کرنا ہوگا طبیعتِ اولیٰ کو طبیعتِ ثانیہ کی طرف لانے کے لئے چونکہ اعمالِ صالحہ کی دعوت ہے اور ہر عمل کو صالح کے ساتھ استعمال کرنا بڑے صبر کی بات ہے بڑے حوصلہ کی بات ہے، بڑے دل گردہ اور عالی ظرف کی بات ہے معمولی بات نہیں ہے باہر سے قالب کو اندر سے قلب کو ادھر جھکانے کی ضرورت ہے اس لئے اس کو تعبیر کیا صبر کے ساتھ۔ اس میں بھی اجبار نہیں ہے، اپنے آپ کو جبر میں ڈالنے کی ضرورت

نہیں ہے وہ تو مؤمن ہے اس مؤمن کے ایمان کا تقاضا خود یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کرتا اور اس کی ضد نہ کرتا۔

لیکن اس کے باوجود اس کو فہمائش کی جارہی ہے اس کو اس کے ساتھ خیر خواہی برتی جارہی ہے اور پھر بھی کان نہیں لگتا اس کو کیا نفع ہوگا اور جب نفع ہی نہیں تو اس کی ضد غیرِ نفع، تو غیرِ نفع کی جگہ پر تم کیوں گئے۔

دین میں اِکراہ نہیں :

اس کی دلیل اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ اور لَاۤ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ جب ایمان کے تقاضے واضح ہوگئے انکی اشاعت ہوگئی تو اب اکراہ کی بات کیسی؟ ابتدائے اسلام میں حضور ﷺ راتوں کو اندھیروں میں اُٹھ کر جو دوسرے باہر کے لوگ آتے خاص کر حج کے موقعہ پر مدینہ طیبہ والے آتے ان کو دعوتِ توحید فرماتے۔ لیکن جب قد تبیّن الرّشد ہوگیا، کیا تب بھی آپ ﷺ محلوں اور گلیوں میں جا جا کر دعوت دیتے تھے؟ بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو مؤمن ہوگئے تھے اور باہمی آپس میں شرکتِ دینوی کاروبار فرماتے تو وہ بھی یوں کرتے کہ ایک ہفتہ کو تم چلے جاؤ حضور ﷺ کی مجلس میں باتیں سنو اور آکر ہمیں سنا دینا اور پھر میں جاؤں گا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی اپنے ساتھی کو بھیجتے وہ رہ کر بعد میں آتے۔

امرِ منکر سے روکنے کا پہلا درجہ :

حضور ﷺ نے فرمایا: مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ معلوم ہوا کہ تم میں کوئی شخص کوئی منکر بات دیکھے تو ہاتھ سے روک دے جبکہ ہاتھ سے روکنے کا

محل ہو۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ تمہاری پٹائی ہو جائے بجائے خیر کے شر ہو جائے کہیں اُلٹے سیدھے الفاظ نہ کہنے لگے۔

دوسرا درجہ :

اور دوسرا درجہ اگلے لفظ میں بیان فرمادیا: فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ یعنی جس کے ہاتھ میں طاقت نہ ہو تو وہ زبان سے کہہ کر دیکھ لے اور جب زبان سے بھی کہہ کر دیکھ لیا ہو اور بات مانی جائے تو سمجھ لو کہ وہ تو بڑا ہی سر پھرا ہے یہ خیر خواہی کا محل نہیں ہے بلکہ ایسی جگہ سے اپنی جان چھڑاؤ، زبان سے بھی مت کہو۔ ورنہ یہ درجے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

تیسرا درجہ :

اور اگر نہ ہاتھ سے روک سکتے ہو اور نہ زبان سے روکنے کا محل ہو تو دل پر کسی کا قابو نہیں اور دل کی بات کسی کو معلوم نہیں۔ تو اس امرِ منکر کی دل میں کراہیت ہونی چاہیے بلکہ امرِ منکر کو دیکھتے ہوئے دل میں آنی چاہیے۔ پسینہ کیوں نہیں آتا، پیشانی پر بل کیوں نہیں آتا اور اگر نہیں آتا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم اس منکر کے منکر ہونے کو خیال نہیں کر رہے ہو بلکہ معروف خیال کر رہے ہو کہ دل میں بھی گرانی نہیں تو اس حالت میں تم بھی اس میں شریک ہو اگرچہ محل میں شریک نہیں ہو، معلوم ہوا کہ منکر کو دیکھتے ہوئے اس منکر سے گرانی نفرت کراہیت آنی چاہیے۔

فعلِ منکر کی تحقیر ہو فاعلِ منکر کی تحقیر نہ ہو :

اور یہ کراہیت فعلِ منکر سے آنی چاہیے یعنی فعل پر تکرار اظہارِ رنجیدگی اور

برائی ہو فاعلِ منکر کی تذلیل وتحقیر دل میں نہ ہو۔

موتو قبل ان تموتوا کی تشریح :

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے مُوتوا قبل ان تَموتُوا یعنی موتِ طبعی سے پہلے اپنے آپ کو موت کا درجہ دے دو۔ جیسے میت کو کسی دوسرے شخص کی طرف سے کیسی بھی طبیعت کے خلاف کیسی بھی بات ہو مگر مُردہ کو غصہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تیزی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، انتقام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ تو خاموشی سے چت لیٹا ہے۔

اسی کو فرماتے ہیں کہ تمہارے نفس کی حالت میں بھی مُردہ کی سی حالت ہونی چاہیے جیسا کہ مردہ ہوتا ہے اور یہ مردہ کی سی کیفیت اپنی ذات کے لئے ہے نہ کہ کسی امرِ منکر کو دیکھ کر بھی قلب میں گرانی نہ پیدا ہو۔

مبلغ میں غایت درجہ حلم وشفقت ہونی چاہیے :

اسی لئے مبلغ کے لئے جہاں اور شرطیں ہیں جنکو محققین نے بیان کیا ہے یہ بھی ہے کہ اس میں انتہائی درجہ کا حلم ہونا چاہیے۔ اس میں ترحّم وملائمت ہونی چاہیے یعنی نرمی اور شفقت ہونی چاہیے۔ دوسروں کی طرف سے خلافِ طبیعت بات پیش آجائے تو اس کو برداشت کرنا چاہیے اور یہ کب ہوگا جبکہ اس کا نفس مردہ ہو گیا ہو حیوانی صفات اور اخلاقِ رذیلہ وذمیمہ اس کے مر گئے ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو وصیت نہ کرو۔

حاصل یہ کہ وقت کی بڑی قدر رہے اور یہ ٹیپ ریکارڈ کہہ رہا ہے اے مسلمانو،

اے مومنو! مجھ سے سبق لے لو، اس لئے کہ میرے اندر جو چیز آجاتی ہے وہ جم جاتی ہے اور جمی ہوئی رہتی ہے اور جب میں اس کو نکالتا ہوں اور عمل میں لاتا ہوں تو اسی طریقہ سے عمل میں آتا ہے۔ لہٰذا ایمان جو کہ اندر بیٹھ گیا ہے اس کے تقاضے پر عمل ہونا چاہیے اور اس ایمان ہی کے تقاضے کے ساتھ افعال صادر ہونے چاہییں، وہ چاہے قولی ہوں، چاہے عملی اعضائی ہوں اعصابی ہوں اور چاہے متعلق بالقلب ہوں اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی برابر توفیق ارزانی سے نوازیں۔

﴿آمین﴾

☆

اکتالیسویں مجلس

وساوسِ غیر اختیاریہ ورؤیا کی تفصیل

مورخہ ۵ جمادالاخریٰ ۱۴۰۹ھ بمطابق ۱۴ جنوری ۱۹۸۹ء بروز دوشنبہ

وساوسِ غیر اختیاریہ کی تشریح اور اِن کا علاج:

اگر ایک شخص مرید ہے اور دماغ قصداً طور پر کسی چیز کی طرف چلتا ہے جس کا نتیجہ پریشانی ہے اور ملا کچھ نہیں رہا ہے، اب اس وقت بڑی مضبوطی کی ضرورت ہے، اعصاب کے ضعف والے کو ایک اگر بڑا نہیں تو معمولی سی طبیعت میں ایک چنگاری و شعلہ پیدا ہوجاتا ہے (یعنی ایک سوزش، جلن اور پریشانی ہوجاتی ہے) اس وقت اس کو دبانا بڑا مشکل ہوجاتا ہے اور اس میں بڑی مضبوطی کے ساتھ خلاف کرنے کی ضرورت ہے، اس کے مطابق عمل بالکل نہ کرے، پھر انشاء اللہ طبیعت پچھلے ضعف کی طرف بدل جائے گی اس کی یہ اِصلاح ہے۔ اب اس زمانہ میں یہ باتیں جلدی متاثر ہونے کی پیش آتی ہیں اسلئے شروع میں زور پڑے گی۔ ہاں جس کے قُویٰ مضبوط ہیں، اعضاء مضبوط ہیں، معدہ اور آنتیں مضبوط ہیں وہ اس تأثر کا کچھ اثر لے گا نہیں کیونکہ اندر

ایک قوت ہے وہ آنے کو منع کررہی ہے اور اگر آ گئے ہیں تو اس کو دفع کررہی ہے، اور اگر ضعیف اعصاب وضعیف معدہ، ضعیف امعاء ہیں تو جلد متاثر ہوجاتی ہیں اور یہ اثر زود تر ہے اور دفع کرنے میں زور دینی پڑتی ہے۔ لیکن اس زور کو برداشت کیا جائے جہاں دو چار دفعہ اس طرح ہوگا پھر طبیعت سنبھل جائے گی اور زور بند ہوجائے گی۔ ایک اچھا خاصا ہیجان ہوجاتا ہے اس وقت طبیعت میں، اب اس ہیجان کو دبانے میں ضعیف دماغ والے ضعیف اعضاء والے پُر زور بن جاتا ہے، لیکن زور اس کے خلاف کرو موافقت نہیں مخالفت کرو اسی سے انشاء اللہ اعتدال اور سمجھ پیدا ہوجائے گی خلجان کی بات سے بچنا چاہیے اور خلجان کی بات جب پیش آجائے تو جلدی سے اس کو ہٹا دینا چاہیے۔

دُنیا میں عورتوں کی کثرت کی حکمت :

مجموعی مردم شماری کی جائے ہفت اقلیم یعنی پوری دُنیا کی تو تعداد عورتوں کی زیادہ نکلے گی۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے، اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف کے ساتھ مرد رکھ دیئے ہیں تو چار بیویوں کے رکھنے کی اجازت دی ہے، جب چار بیویوں کے رکھنے کی اجازت دی ہے تو وہ کہاں سے آئیں گی، اس سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔

یہ اِستنباط ہے بالفرض سو مرد ہیں چار سو عورتیں، تب ہر ایک کو چار چار ملیں گیں، لیکن اس میں ایک قید لگا دی۔

وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ ـــــ الآیۃ۔

اگر تم انصاف نہ کرسکے تو پھر ایک ہی ہے وہ بھی نہیں، چار تو بڑی دور کی بات ہے۔ اب عدل وانصاف سے رہنا بہت مشکل ہے۔

حضور ﷺ عدل پر مکلّف نہیں تھے :

رسول پاک ﷺ پر عدلِ ازواجِ مطہرات ضروری نہیں تھا لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ عدل فرماتے تھے، معلوم ہوا کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے فرائض کے ساتھ واجباتِ شرعیہ کے ساتھ کچھ مستحبات و مستحسنات رکھے ہیں ان میں اختیار دے دیا، اس لئے کہ دخولِ جنت کا وہ موقوف علیہ نہیں ہیں، بلکہ درجات کے لئے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے : ولکل درجاتٌ مما عملوا جیسے دُنیاوی ترقی کے درجہ کے خواہاں ہوتے ہیں ایسے ہی آخرت کی ترقی کے درجہ کے خواہاں ہونا چاہیے۔ کوئی شخص فرضِ منصبی میں بہت ہی با اوقات ہے، بڑے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے رہا ہے بڑے عدل وانصاف کے ساتھ، افسر کا جی خوش ہوگیا تو ترقی ہورہی ہے کہ ابھی تحصیلدار تھا، اب ڈپٹی ہوگیا درجہ بڑھ گیا منصبی حیثیت سے عہدے و منصب بڑھتے رہتے ہیں، اسی طرح آخرت میں رہنا چاہیے اگر نہیں ہوسکتے تو ولکل درجات مما عملوا کیوں کہا؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کے موافق درجے ہیں، تو جنت کا دخول وہ تو ایمان پر ہے جو کہ ضروری ہے اور درجہ تقویٰ پر ہے جو آیتِ قرآن پاک میں ہے۔

مؤمنینِ کاملین کی صفات :

کانو قلیلاً من اللّیل ما یھجعون۔ (پ۲۶ سورۃ الزاریات)

فرمارہے ہیں : میرے بندے مؤمن ایسے بھی ہیں جو رات کو بہت کم سوتے ہیں، وبالاسحار یستغفرون اور جب صبح ہونے کو ہوتی ہے تو پھر بہت استغفار کرتے ہیں، زیادہ حصہ تو جاگ کر عبادت میں لگایا اپنے پہلو کو آرام گاہ سے الگ کردیا

یہ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں ہے، ارشاد ربانی ہے :

تتجافی جنوبهم عن المضاجع یدعون ربهم خوفا و طمعا۔

(سورۃ سجدہ، پ ۲۱، ۱۶)

اور پھر جب صبح ہونے کو ہوتی ہے تو پھر استغفار کرتے ہیں۔

شیخ امراضِ باطنہ کا حکیم ہوتا ہے :

انطباق ہر ایک کا کام نہیں، جو شخص جس کام میں لگا ہوتا ہے اس کو تجربہ ہوتا ہے جو فقہ کی حیثیت سے مشائخ ہیں ان کو فقہی جزئیات کا تجربہ ہوتا ہے۔ جن صاحب کا کو پتہ چلتا ہو کہ مختلف قسم کے مریض ان کے یہاں آتے ہیں اور اکثر شفایاب ہوتے ہیں، اس کو امراضِ جسمانی اور ان کے معالجات میں تجربہ اور مہارت ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی شیخ امراضِ باطنہ کا ہے کہ اس کے پاس ہر قسم کے امراض کو لئے ہوئے آتے ہیں اور اکثر شفایاب ہوتے رہتے ہیں، مثلاً شیخ کی طرف رجوع کرنے سے پہلے دُنیا میں کیسا شغف تھا، حرص و طمع کی کیسی حالت تھی، ترقیٔ دُنیا کی طرف اس کی طبیعت کس قدر چل رہی تھی، غضب نا کی طبیعت میں کس درجہ کی تھی لایعنی جاہ، معاصی کی طرف کس طرح من حیث الافعال چلتا رہتا تھا، خانگی زندگی، تشدد کی قساوت کیسی تھی، باہر لوگوں کے ساتھ تنازع کی شکل کیسی تھی، حسد کے مارے کیسا حال ہو کہ یہ دُنیوی ترقی اس کو کیسی ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اب جب طلب صحیح صدق کو لے کر کھڑا ہوا، اب اُن چیزوں میں جو اس کے اندر تھیں دور ہو رہی ہیں، اور بے رغبتی دُنیا کی طرف سے دل میں آتی جا رہی ہے، اور یہی مقصود ہے۔

زہد کی حقیقت :

کہ دُنیا کی طرف سے زہد و بے رغبتی شوق کے ساتھ آتی ہے، اگر چہ بادشاہ ہے مگر دل میں دُنیا کی طرف سے زُہد یعنی بے رغبتی بدشوقی آتی رہے، یہ ہے مقصد، یہ نہیں کہ دُنیا کی کوئی چیز نہ رکھے یا کوئی چیز نہ رہے، یہ کوئی کمال نہیں، کمال یہ ہے کہ رکھتا ہے مگر دل میں رکھے ہوئے نہیں یہ معنی ہیں زہد کے اصل طریق سُنت و زہد کا یہی ہے، تو ایک ہے تارک الدّ نیا اور ایک ہے متروک الدّ نیا۔

اصل تارک الدّ نیا ہے متروک الدّ نیا نہیں :

اصل تارک الدّنیا ہونا ہے متروک الدّنیا ہونا نہیں ہے، یعنی دُنیا کے سامان جو دُنیا کہلائے جاتے ہیں، حالانکہ حقیقۃً یہ دُنیا نہیں ہے بلکہ دُنیا کے سامان ہیں لیکن دل ان کی طرف سے تارک ہے اور متروک الدّنیا وہ ہے کہ اس کے پاس ہے ہی نہیں، جب اس کے پاس ہے ہی نہیں تو اس کا ترک کرنا کس چیز کا وہ تو ہے ہی نہیں بخلاف تارک الدّنیا کے کہ اسبابِ دُنیا بسہولت مہیا ہیں لیکن دل میں اس کی کوئی وقعت نہیں اسباب عادیہ ہیں اس شئ کے استعمال کرنے کے استعمال کرتا ہے، کیونکہ استعمال کرنے کا حکم ہے مگر نظر اور اعتمادِ قلب مسبب پر ہے، اور یہی طریق سُنت ہے کہ اگر مالی نقصان خدانخواستہ ہوگیا ہو غم لے کر نہیں بیٹھ گیا، اس کی سوچ میں نہیں پڑ گیا، دماغ کو اِدھر اُدھر نہیں چلا رہا، سوچ سوچ کر طبیعت غم کی طرف نہیں لا رہا بلکہ لا پرواہ ہے ایسا نہیں ہوا کہ اپنی طرف سے اُمید رہنے کی تھی اور صورت نا اُمیدی کی آگئی، اسی سے دلالۃً نکلا کہ اس پر ناز نہیں کرتے، اسی طرح شب بیداری پر ناز نہیں کرتے بلکہ اپنی کوتاہی پر تصور و خیال آتا ہے، لہٰذا اِستغفار کرتے ہیں۔

عبادت کے بعد استغفار ہے تو معصیت کے بعد بدرجۂ اولیٰ استغفار ضروری ہے :

یہاں سے بھی یہ معلوم ہوا کہ عبادت کے بعد بھی استغفار م ہونا چاہیے، جب یہ ہے تو پھر اللّٰھم احفظنا، معصیت کے بعد استغفار نہ ہونے کے کیا معنی گناہ ہو جانے کے بعد توبۂ ندامت نہ ہونے کے کیا معنی۔ عبادت کے بعد کس درجہ کی عبدیت ہے کہ اس طرح عبدیتِ کاملہ اپنے عمل پر نظر نہیں، توفیق پر شکر ہے، کوتاہی پر نظر پھر استغفار، اپنی عبادت اور اچھائی پر نظر کر کے، تکبر کی بات نہیں بلکہ اظہارِ انکسار ہے۔ حضرت والا کو کسی صاحب نے لکھا اپنی عبادت کے سلسلے میں کہ مجھ سے عبادتِ کامل نہیں ہوتی، حضرت والا نے لکھا کہ جس دن اپنی عبادت پر کامل ہونے کا تخیل ہو وہ دن ماتم کا ہے۔

ماتم کا دن :

جس دن اپنی عبادت پر کامل ہونے کا تخیل ہو وہ دن ماتم کا ہے، یعنی وہ دن رونے کا ہے۔ کہاں اللہ تعالیٰ کی شانِ عظمت اور کہاں اپنی عبادت کہ اس کی شان کے مطابق ہونے کا خیال کر لیا اس سے معلوم ہوا کہ بس کام کرتا رہے کمال سے نظر انداز رہے۔ سالک کو نشاط چاہیے۔

سالک کو نشاط و چستی کی ضرورت ہے :

سالک دین کے احکام کی عظمت دل میں لئے ہوئے حتی الامکان پورے اہتمام کے ساتھ بجالاتا رہتا ہے، تو اس کو نشاط کی ضرورت ہے، سُستی نہ آئے یعنی ہر

وقت طبیعت کھلی ہوئی رہے اس کی ضرورت ہے، دلچسپی، میں فرق آئے ان چیزوں سے رُکا ہوا رہے اور جلد از جلد دفع کردے۔

عوام کو وساوس نہیں آتے بلکہ سالک کو آتے ہیں :

اسی لئے وساوس ایسوں کو زیادہ آتے ہیں، مشکل یہ ہوگئی، عوام کو نہیں آتے، عوام کو تو دو چار روپیہ کہاں، کہاں سستا ملتا ہے، سستے کی جگہ سے لاؤں اور مہنگے کی جگہ بیچوں تو اس کے ذہن کے بارے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ تو ادھر لگ گیا، یہ دین پر اہمیت لئے ہوئے اہتمام کے ساتھ لگے ہوئے آتا ہے، ایمان کا ڈاکو اسی کے پاس آتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج بتلا دیا کہ بالکل لاپرواہ، بالکل بے خیال، بالکل بے التفات جیسے خیال نہ تھا، حتی الامکان اس طرح رہو کہ انما النجویٰ من الشیطان لیحزن الذین آمنوا۔ شیطان کی جانب سے مؤمن کو رنج پہنچاتے رہنے کے لئے ایسے ایسے خیالات آتے رہتے ہیں۔

تو اے مسلمانو! ایسے خیالات کا خیال مت کرنا، اب شیخ وہیں سے لکھتا ہے، کیونکہ شیخ کی اِن پر نظر ہے، مدرّس کی نہیں ہے۔ اُمید کے موافق ہونا یہ تمہاری طبیعت کے موافق ہے، اور اُمید کے موافق نہ ہونا یہ ذاتِ باری تعالیٰ کی طبیعت کے موافق ہے، تو تم اللہ تعالیٰ کی چاہت کو ترجیح دیتے ہو وہ تمہاری موافقت کی بات تھی اور یہ ذاتِ حق کی موافقت کی بات ہے اور ہونا چاہیے تمہاری طرف سے ذاتِ حق کی موافقت، جب یہ چیز جم گئی، تو مال وغیرہ جو انسان کی ضروریات میں سے ہوا کرتا ہے، ضائع ہونے پر غمزدگی کہاں ہوگی، ہاں ایسا خیال آئے گا لیکن رکھے گا نہیں، اب سوچ کو لائے گا نہیں، بڑھائے گا نہیں بلکہ یہ سوچ کر اس کو بڑھائے گا نہیں بلکہ مٹائے گا۔

صبر بھی نماز کی طرح عبادت ہے :

کیونکہ صبر کا ہونا بھی عبادتِ باطنی ہے، اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے اس غم کی صورت پیش آنے پر بتقاضائے بشری اس نے صبر سے کام لیا اور صبر حق تعالیٰ کی موافقت ہے اور بے صبری ناموافقت ہے تو صبر عبادت ہے اس لئے سوچ سوچ کر رنج کو لانا بڑھانا یہ خلافِ صبر ہے، حق تعالیٰ کی مراد کے موافق کہاں ہے؟ تو اپنی ہی مراد کے موافق ہوتا رہنا چاہنا یہ خلافِ عبدیت ہے تو اعمالِ صالحہ ہوتے رہے اور اُمید وار بنا رہے یہ ہے خیر العمل والباقیات والصالحات خیر عند ربك ثوابا و خیر مردا، یہ باقیات صالحات آپ کے رب کے نزدیک خیر ہے اور اُمیدواری بہ خیر ہے، خیر عمل خیر اُمید تو اس پر اُمیدواری ہونی چاہیے، اس کے خلاف نہیں ہوسکتا، موعود ہے لیکن دُنیاوی نقطۂ نظر خیر ہی خیر ہو اور شر نہ ہو یہ موعود نہیں کیونکہ اس کے خلاف پیش آنے پر دوسری چیز جو عبادت کی ہے صبر وغیرہ وہ کس طرح ہوگا وہ بھی رکھا۔

غیر اختیاری خیالات و وساوس رنج دینے والے ہیں :

غیر اختیاری خیالات اور غیر اختیاری وساوس رنج دہ ہیں، لیکن اپنا دماغ اس کی سوچ کی طرف لگانا یہ خلافِ عبدیت اور خلافِ عبادت ہے اپنے ارادہ سے دماغ کا چلانا تو ذاتِ باری کی طرف رضا کے لئے ہونا چاہیے، اور تم نے غیر رضا کی طرف دماغ چلایا، سوچ میں ڈال دیا، یہ تو ہو نہیں سکتا کہ غیر اختیاری خیالات نہ آئیں، قرین لگا ہوا ہے ساتھی لگا ہوا ہے، یہ تو نہیں ہوسکتا کم و بیش سب ہی کو آئیں گے، لیکن عبدیت کی شان یہ ہے کہ ان کی طرف التفات نہ کی جائے توجہ قصدی، فکری نہ لگائی جائے۔

بُرے خیالات اور بُرے خوابوں سے دُنیوی واُخروی نقصان نہیں ہوتا :

تو ہمارے ان غیر اختیاری وساوس وخیالات کا آنا اسی میں سے خوابوں کا آتا رہنا وہ بھی داخل ہے، غیر اختیاری تمہارے لئے کوئی مضر نہیں، کوئی پریشان کن نہیں، حق تعالیٰ تسلّی دے رہے ہیں، تعلیم فرمارہے ہیں کہ مضر نہیں، نہ مضر دُنیاوی نہ مضر اُخروی، یعنی ضرر دینے والی چیز دُنیاوی' جانی' مالی آبروی ان تین میں سے کوئی ہوتی ہے، اور خوابوں سے نہ جانی نقصان ہوا نہ آبروئی نقصان ہوا، تو آنکھ کھلنے پر رنج کیوں ہے، لہٰذا بے فکر رہنا چاہیے بلکہ جس کروٹ سے تمہاری آنکھ کھلی ہے اس طرف تین دفعہ تھوک کر لاحول پڑھ دو اور دوسری کروٹ لے کر تین دفعہ تھوک کر تین دفعہ لاحول پڑھ دو، یہ شیطانی خیالی خواب کی تردید ہوگئی۔

شیطانی خیالات سے بے خیال رہنے والا پکّا مؤمن ہے :

لہٰذا حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ شیطان مؤمنوں کو رنج پہنچانے کے لئے طرح طرح کے خیالات ڈالتا رہتا ہے، مسلمانو! اس کی طرف تم کچھ خیال مت کرنا میری طرف سے تو کچھ پوچھ گچھ نہیں ہے بلکہ میں تو اور زیادہ خوش ہوں کہ کیسا اچھا مؤمن ہے کہ ایسے ایسے خیالات، وسوسے شیطان کی جانب سے آتے رہتے ہیں لیکن وہ کوئی پرواہ نہیں کرتا نہ عقیدہ کے اعتبار سے کچھ کمزوری اور نہ اعمال میں سستی آنے دی کمزوری، کیسا پکا مؤمن ہے کہ برابر اپنے معمولات میں لگا ہوا ہے، اور انہیں عقائد ایمانیہ میں مضبوطی سے لگا ہوا ہے کیسا اچھا مؤمن ہے کہ یہ تو اس کے بڑے درجۂ کمال

ایمان کی بات ہے، یہ تمہید تھی حدیث شریف کی، حضور ﷺ سے جب بعض صحابہ ﷺ نے وساوس کا حال بیان کیا کہ اب تو ایسے ایسے وسوسے آتے ہیں کہ اس سے اچھا یہ ہے کہ ہم جل کر کوئلہ ہو جائیں تو کتنے سخت وساوس تھے کہ اس قدر گھبرا گئے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ذلك صريح الايمان یہ تو بڑے کھرے ایمان کی بات ہے، تمہیں رنج ہوا مجھے خوشی ہوئی، تو میری خوشی میں تم خوش رہو کہ شیطان کو تو اس میں خوشی ہے کہ رنجیدہ دیکھے اور مجھے اس میں خوشی ہے کہ میں تمہیں بشاش دیکھوں خوش دیکھوں تو میری خوشی میں خوش ہو یا شیطان کی خوشی میں خوش ہو، مؤمن کیا کہے گا کہ میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں، اب گویا حضور ﷺ فرما رہے ہیں جب میری خوشی میں خوش ہو تو میں یوں کہہ رہا ہوں چنانچہ پھر کسی قسم کی شکایت نہیں کی حالانکہ خیالات تو آتے ہوں گے چھوٹے بڑے کچھ نہ کچھ، لیکن اس کے بعد کسی نے بھی شکایت نہ کی۔

صحابہ ﷺ کے اعتماد اور اعتقاد کا حال :

یہ ہے اعتماد اور یہ ہے اعتقاد مربی مجازی کے ساتھ یہ اعتماد پر اعتقاد کہ ساری عمر کے لئے علاج ہو گیا، خوش خوش ہو گیا اور رنج بھاگ گیا نہ کہ روز روز تخیل اور وساوس کا خوابوں کا ذکر کر رہا ہے اور پھر اس طرف رنجیدگی کا تخیل کر رہا ہے تو اس نے کیا اعتقاد اور کیا اعتماد کیا اس کو لے کر بیٹھے گا۔

واقعہ : اسی لئے حضرت شبلیؒ نے ایک درویش سے پوچھا کہ آج کل کون سے مقام کی تصحیح ہو رہی ہے انھوں نے کہا توکل کی، تو حضرت شبلیؒ نے فرمایا او ہو ابھی تک آپ کھانے پینے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ توکل بڑا اُونچا مقام ہے مگر دوسرا اس سے بھی آگے ہے۔

شیخ کے علاج پر اعتماد اور عمل ہونا چاہیے :

تو معلوم ہوا کہ شیخ پر اعتماد نہیں رکھا، اپنی رائے وخیال چلا رہا ہے تو گویا وہ اپنا معتقد ہے تو حضور اکرم ﷺ نے کیا صرف تسلی کی بات فرمادی تھی یا آخری بات اور مستقل علاج بتلا دیا تھا۔ ٹھیک اسی طریقے سے کیا شیخ محض دل کی تسلی کے واسطے ایسا کرتا ہے، اگر یہ عقیدہ ہے تو یہ پریشانی اسی کا نتیجہ ہے، سالک تو احکام کی جو ظاہری و باطنی اہمیت لئے ہوئے اہتمام صالحات کی طرف اور طالحات سے بچنے کی طرف رکھتا ہے اس سے اپنے قلب کو ہمیشہ اُمورِ غیر اختیاریہ سے بچا کر رکھتا ہے خود بھی ایسے کاموں سے بچا ہوا رہے جس سے تشویش پیدا ہو اور خارجی باتیں اگر تشویش کی پیدا ہوں تو ان سے طبیعت کو خالی رکھے، ان کی طرف التفات نہ کرے، اگر وقتی طور پر زور پڑ رہا ہے ان خیالات کو دفع کرے، تو زور پڑنے کا خیال نہیں بلکہ اور زور کے ساتھ اس زور کو ختم کر رہا ہے زور کے ساتھ اس شور کو جو ہیجان وخلجان ہو گیا ہے، طبیعت میں قویٰ کے کمزور ہونے سے اعصاب اعضاو امعاء دماغ کے کمزور ہونے سے، تو بزور اُس ہیجانی وخلجانی چیز کو دفع کرنا بھی نہیں بس بے التفات ہو جائے کیونکہ دفع کرنا بھی التفات ہے اور وہاں یہ فرمایا ہے بے التفات رہو، لہٰذا اپنا التفات ہی نہیں جب اپنا التفات ہوگا تو افسوس ہوگا، افسوس سے ہی اس کو ہٹایا جا رہا ہے، گویا یہ فرما دیا کہ کام میں لگو، ذلك صريح الايمان ایسے خیالات سالکوں کو بہت آتے ہیں شیطان کی طرف سے اور بعض دفعہ بہت زور پڑ جاتا ہے، متعدد ایسے واقعات ہیں۔

ایک عالم صاحب کا واقعہ :

چنانچہ اچھے عالم صاحب اور اچھے واعظ حضرت والا سے متعلق بیعت تھے،

حضرت والا کی وفات کے بعد یہاں آئے پہلے سے کچھ خط و کتابت تھی تو منّی والی مسجد میں ادھر اُدھر کشمیری رہتے ہیں اس میں رہتے طلبہ تو تھے نہیں یہاں رہنے والے مدرسہ میں رہتے تھے، ذاکر و شاغل آدمی مولوی صاحب واعظ اور اچھے واعظ صبح کی نماز پڑھ کر آئے میں اُوپر رہتا تھا، دستک دی کواڑ جو اُوپر کے ہیں اس کو کھولا، دیکھا تو مولوی صاحب ہیں، کیا بات ہے؟ کہا کہ میں نے رات کو ایک خواب دیکھا تھا، طبیعت گھبرا رہی ہے اور اجازت لینے کے لئے آیا ہوں گھر جاؤں، میں نے کہا مولوی صاحب آپ کیسی بات کر رہے ہیں، اتنی بات، ایسا اثر خواب کی وجہ سے، کہا کہ وہ خواب ہی ایسا ہے۔ خواب یہ دیکھا ہے کہ میری بیوی کو میرا پڑوسی جو بڑا شریر ہے وہ بھگا کر لے گیا، مولوی صاحب آپ کیسی بات فرما رہے ہیں، جی نہیں میری بیوی بڑی خوبصورت ہے اور پڑوسی بڑا شریر ہے۔

حضرت کا معمول اِصرار کا نہیں ہے:

میں نے کہا بہت اچھا خدا حافظ۔ یہ بھی عادت ہے ہمیشہ سے کہ کسی ایسی باتوں کے کرنے پر ایک دو دفعہ کہتا ہوں جب نہیں مانتا تو خدا حافظ، بہت اچھا مولوی صاحب چلے گئے، بڑے سچے منصف عالم آخر ذکر و شغل کرنے والے تھے۔ وہاں سے اُنھوں نے نہایت افسوس کا خط لکھا کہ جب میں گھر پہنچا تو میری بیوی خوش و خرم اور باشاد ہے ذرا سی بھی کوئی بات نہیں ہے مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کی فہمائش اور سمجھانے پر کچھ خیال نہ کیا، میں معافی چاہتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی، تو دیکھیے شیطان آگیا اور اپنے بڑے پر اعتماد و اعتقاد نہ رکھا، شیطان کا جی خوش کر دیا، رحمٰن کو ناراض کر دیا تو سالکوں کو ایسی باتیں بہت پیش آتی ہیں۔

طالبِ علم کو گھر یاد آ گیا کوئی خواب دیکھا کچھ خیالات گھر کی طرف چلنے لگے ماں بہن یاد آ گئیں، اب طبیعت بے چین اب اس کا مقابلہ بہت مشکل ہے بس چھٹی لے کر جانا چاہتا ہے اور طرح طرح کی باتیں کرتا ہے سمجھانے پر سمجھتا نہیں تو جو بھی دین کے کام میں لگا ہوا ہے جس درجہ پر بھی جس میں طبیعتی علم ہے اور طبیعتی تربیت بھی ہے (یعنی تعلیم و تربیت میں بطورِ خود مشغول ہے) اُس کے پاس شیطان جائے گا۔

شیطان دین کے بڑے کام سے چھوٹے کام کی طرف لاتا ہے :

کسی بڑے دین کے کام سے روک کر دین ہی کے چھوٹے کام کی طرف اس کو لگاتا ہے کیونکہ دنیوی کام کی طرف تو توجہ کرے گا نہیں، یہ تو ایسا کچھ پختہ ہو گیا ہے لہٰذا اس کو دین کے کام کی طرف توجہ دلاؤ، تو وہ یہ سمجھ کر کہ یہ دین ہی کا تو کام ہے دین کا بڑا کام چھوڑ کر اس دین کے کام کی طرف لگ گیا، اب ایسے وقت اس کا امتیاز کرنا کہ یہ چھوٹا دین کا کام ہے یا بڑا دین کا کام ہے، اگر کسی محقق کے پاس کافی دنوں تک بیٹھا اُٹھا ہو گا غور کے ساتھ اعتماد و اعتقادِ قلب کے ساتھ سُنا ہو گا تو کچھ امتیاز کر لے گا ورنہ تو امتیاز مشکل ہے۔

فکرِ صحیح طالبِ صادق کی رہبری کرتی ہے :

کہیں جہاد ہو رہا تھا طبیعت میں بار بار آ رہی ہے یہ بات کہ جہاد میں جا کر شریک ہونا چاہیے بڑی فکر ہو گئی فکرِ صحیح، صحیح رہبری کرتی ہے طالبِ صادق کی من جانب اللہ، چنانچہ جب ان سالک صاحب نے صحیح فکر سے کام لیا اور غور کیا تو سمجھ گئے، طبیعت اور نفس سے کہا کہ میں سمجھ گیا، میں تیرے ساتھ ہر وقت جہاد کرتا رہتا ہوں چوبیس گھنٹے تو اس سے گھبرا کر جہاد کی طرف رغبت دلا رہا ہے اور وہ کوئی نفیرِ عام نہیں ہے یہ بھی تو میں

جہاد ہی میں لگا ہوا ہوں۔ تیری خواہشات، تیری شہوات، تیری لذّات تیرے تعلقات کو دفع کرتا رہتا ہوں چھوڑتا رہتا ہوں تو تیرے ساتھ جہاد ہی تو ہوتا رہتا ہے یہ جو تجھ پر چوبیس گھنٹے دو دھاری تلوار چلتی رہتی ہے لا الہ الا اللّٰہ کی۔ اس سے چھڑا کر تو ادھر یہ رائے دے رہا ہے میں نہیں جاؤں گا تو بڑی عبادت سے روک کر چھوٹی عبادت کی طرف لے جانا چاہتا ہے، تو طالبِ تربیت اور طالبِ علم کی طرف شیطان بہت آتا ہے، بڑی طاعتوں سے ہٹا کر چھوٹی عبادت کی طرف متوجہ کرتا ہے تو اس اختلاط میں اس خلط ملط میں امتیاز دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ جس پر اعتقاد و اعتماد ہے ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اس کی رائے بھی غلط ہو۔ بعض صاحبوں کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ ہوتا ہے، ظاہر تو نہایت شر ہوتا ہے اور باطن نہایت ہی خیر ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ خواب کا ظاہر نہایت خیر ہوتا ہے مگر باطن بڑا شر ہوتا ہے۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر :

ایک شخص حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں حاضر ہوا خواب بیان کر رہا ہے کہ میں نے رات رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ میرے غریب خانہ پر تشریف فرما ہیں، تشریف لائے اور شاہی لباس میں تشریف لائے تو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا جاؤ جلدی جاؤ اور جا کر اپنا گھر جلدی خالی کر دو وہ گرنے والا ہے۔ تو دیکھئے حضور ﷺ تشریف فرما ہیں اور تعبیر ہے بربادی و ہلاکت، مکان گرنے والا ہے اس کو اعتقاد تھا، اعتماد تھا چلا گیا جلدی اپنے بیوی بچے سامان وغیرہ کو جلدی جلدی اس نے وہاں سے منتقل کرنا شروع کر دیا، سامان منتقل ہو گیا چھت بیٹھ گئی مکان گر گیا۔ کسی نے پوچھا شاہ صاحب سے (جب شاہ صاحب بولتے ہیں تو اس سے مراد شاہ عبدالعزیز صاحبؒ

ہوتے ہیں) کہ حضرت یہ تعبیر کیسی کہ تشریف لائیں حضور اکرم ﷺ اور تعبیر دیں ایسی۔ فرمایا کہ میرا ذہن فوراً منتقل ہوگیا تھا قرآن پاک کی ایک آیت کی طرف ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها یہی ہے، جب بادشاہ لوگ کسی کو فتح کرتے ہیں اور جب بعدِ فتح داخل ہوتے ہیں اس ملک میں، شہر میں تو اس کو برباد کرنا ہلاک کرنا شروع کر دیتے ہیں افسدوها اپنی زور اپنی طاقت وقوت اقتداریت بٹھانے کے لئے تہ وبالا کرنا شروع کر دیتے ہیں تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ شاہی لباس میں تشریف لائے تھے اس لئے میں نے یہ تعبیر دی جو قرآن شریف میں ہے کہ یہ طریق بادشاہوں کو فتحیابی کے بعد عادتی ہے، دیکھئے خواب کیسا اچھا تھا لیکن تعبیر کیسی ہوئی۔

ظاہر خراب باطن اچھا ہونے کی تعبیر :

اور وہ خواب کیسا خراب تھا کہ ماں کے ساتھ وطی کر رہا ہے اور تعبیر یہ کہ اس کے اندر عبدیت وفنائیت پیدا ہوگئی کہ ماں سے مُراد ہے زمین اور لوگوں کی کچھ پرواہ نہیں کر رہا اور وطی سے مراد ہے اپنے آپ کو زمین پر روندنا۔ دیکھیئے خواب کیسا ہے وہ ڈر گیا ہوگا کہ میرا ایمان بھی باقی ہے کہ نہیں کہ میں ماں کے ساتھ اس طرح۔ تو یہ وضاحت کے لئے بیان کیا گیا (خوابات بزرگوں کے اقوال وارشادات افعال واعمال کہ ایسے وقت وہ کیا کرتے ہیں) قرآن پاک کیا کہہ رہا ہے۔ حق تعالیٰ کا کلام کس طرف متوجہ کر رہا ہے دین میں اہتمام واہمیت کو لئے ہوئے کام کرنے والوں کو خالی الذہن کر رہا ہے ان کی پراگندگی ذہن کو دور کر رہا ہے، انتشارِ ذہنی ختم کر رہا ہے، دماغ اور دل کو وہ سکون کی طرف دعوت دے رہا ہے، بشاشت کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ بجبت تعلیم دے رہے ہیں اپنوں کو۔ جو شخص حق تعالیٰ کے ارشادات واحکام پر لگاتار

خلوص کے ساتھ اہتمام کے ساتھ لگا رہتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا آدمی ہوا یا نہیں، اپنا ہوا تو اپنے کو باشاد رکھنا چاہتا ہے بے فکر رکھنا چاہتا ہے۔ ایسوں کا نام ہے سالکین، تو ان کو چاہیے کہ اپنے دل کو اپنے دماغ کو تازگی کیساتھ بشاشت کے ساتھ سکون کے ساتھ رکھیں، ہر ایسے کام سے جس سے بشاشت میں فرق آتا ہو، فکرمندی پیدا ہوتی ہو ان اسباب سے گُریز اور ان اسباب سے اعراض کرنا چاہیے اور اگر غیر اختیاری طور پر پیش آجائیں تو ان سے بے التفاتی یہ ہے اس کا طریق۔ اگرچہ طبیعت پر ان غیر اختیاری بات کے پیش آجانے سے ایک ہیجان و خلجان سا پیدا ہو گیا ہو تو اس کی طرف سے بے التفات ہو جاؤ اس کی طرف توجہ نہ کرو، گو زور پڑے، اس زور کے مقابلہ میں اپنی زور دکھاؤ تو وہ زور گھٹ جائے گی، ورنہ تنکا پہاڑ ہو گیا اور اگر اس زور کے مقابلہ میں اپنا زور ڈال دیا تو پہاڑ تنکا ہو گیا ذلك صریح الایمان کیسا پہاڑ تھا وہ کہ جل کر کوئلہ ہو جائے۔

تو اب چاہے اس تنکے کو پہاڑ بنا لو چاہے پہاڑ کو تنکا بنا لو ، مربی حقیقی یوں فرما رہے ہیں، تمہاری خوشی تم جانو کہ میں تو یوں کہہ رہا ہوں کہ انما النجویٰ من الشیطان لیحزن الذین آمنوا۔ (سورۃ المجادلہ پ ۲۸، ۲) تم جانو غم میں پڑے رہو یا غم میں نہ رہو، مربی حقیقی کہہ رہے ہیں میں تو یوں کہہ رہا ہوں ساری عمر کا علاج ہو گیا یہیں رہتے ہوئے یا گھر پہنچ کر ہی تنہائی میں بھی خلوت میں بھی جلوت میں بھی شیخ کے پاس رہتے ہوئے شیخ سے دور رہتے ہوئے بھی خانگی اُمور غیر اختیاریہ میں بھی، دینی اُمور غیر اختیاریہ میں بھی، ہر موقع پر۔

بیوی مل گئی زبان دراز تو اماں نے تو شکل دیکھی تھی گوری گوری ہے اب اسے

کیا خبر کہ زبان دراز بھی ہے یا نہیں؟

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا تفسیر میں مقام :

اب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جو قرآن پاک کی تفسیر میں ان کو اہمیت اور اوّلین درجہ حاصل ہے وہ فرمارہے ہیں کہ للرجال علیھن درجۃ اس کی تفسیر میں فرمارہے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے ایک بڑی فوقیت حاصل ہے بڑی اونچائی حاصل ہے، فرماتے ہیں کہ جب یہ بات ہے اب پھر مرد کو چاہیے، میاں کو چاہیے کہ اس کے طبیعت کے خلاف ہونے پر متحمل ہو برداشت کرے اور خلاف پیش آنے پر صبر کرے اور جو شیخِ واقعی ہے تجربہ کار اس کے ذہن میں یہ سب چیزیں ہوتی ہیں حضرت والا کو ایک شخص طالبِ طریقت نے لکھا کہ میری بیوی اس درجہ زبان دراز ہے، ایسا ویسا کہتی سُنتی رہتی ہے میں کیا کروں؟ حضرت والا نے لکھا کہ تمہاری طرف سے اس کے ساتھ عدل اور اس کی بے عدلی پر صبر ہو اگر تم نے بھی اس جیسا ہی معاملہ کیا پھر زبان دراز کا کیا سوال؟ تم بھی عورت وہ بھی عورت، جب تمہارا اونچا درجہ ہے تو اس کے ساتھ تمہاری طرف سے تو عدل ہی ہو اور اس کی بے عدلی پر صبر، ہو غیر اختیاری پر تو بات آج چل رہی ہے۔ اب کوئی پوچھے کب تک میں اس کا کہا مانوں؟ تو زندگی بھر تک تا حیات۔

گفتگو طالبِ صادق سے ہے :

یہ گفتگو طالبِ صادقِ تزکیہ طالبِ اصلاح سے ہو رہی ہے تو اُمورِ غیر اختیاریہ کی مثال کہ گھر میں خانگی اُمور میں ظاہر کے اعتبار سے بہت زیادہ باتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ ان میں صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا، خلافِ شرع قولاً و فعلاً کوئی اقدام نہ ہوگا۔

چنانچہ مجھے ایک جوان لڑکے نے لکھا کہ میری بیوی بڑی زبان دراز ہے اور سخت الفاظ کہنے والی ہے میں بھی کچھ کہہ بھی دیا کرتا۔ ایک دن وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی میں چپ چاپ سنتا رہا پھر باہر چلا گیا، پھر آیا وہ اپنے کام میں لگی ہوئی تھی، میں اس کے پاس گیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کمر کو تھپکا یعنی پیار و محبت کے ساتھ کہا مسکراتا ہوا، بیوی سبحان اللہ اس وقت جو آپ فرما رہی تھیں، پھول جھڑ رہے تھے اور بہت اچھی معلوم ہو رہی تھیں تو میں ان باتوں کو سننے کے لئے پھر آیا ہوں، بڑا مزا آرہا تھا ہاں آپ کیا فرما رہی تھیں، ذرا پھر فرمائیگا! اسے ہنسی آگئی، تو حضرت اتنا عرصہ ہو گیا وہ دن آج ہے، ہم دونوں کی زندگی بڑے مزے کی گزر رہی ہے، اپنے کو بدلنا پڑتا ہے۔

مؤمنِ کامل کی شان :

اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ رات کو کم حصے میں سوتے ہیں: کانو قلیلا من اللیل ما یھجعون (سورۃ زاریات، پ۲۶، ۱۹) اور جب صبح ہونے کو ہوتی ہے، و بالاسحار ھم یستغفرون تو مجھ سے استغفار کرتے ہیں کہ اس طرح سے جاگتے بھی رہے اور جب صبح ہونے کو ہوئی تو عبدیت کا اظہار کر رہے ہیں، اتراتے نہیں کہ ہم رات ایسے ایسے جاگے، ایسی ایسی عبادت کی، ہم مستحقِ عبادت ہو گئے، مستحق قبولیت ہو گئے، یہ نہیں کرتے بلکہ میری شانِ معبودیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے شان عبدیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کتنی بھی عبادت کرتے رہیں اخلاص کے ساتھ اور صدق کے ساتھ مگر اِترانا نہ ہو، ظہور عبدیت و انکساری ہی ہو۔ اب یہ جو باری تعالیٰ نے بیان فرمایا اور اُوپر مؤمن متقیوں کے جنت میں داخل ہونے کا ذکر فرمایا کہ

راتوں میں اس طرح جاگتے رہنا اور صبح ہونے پر استغفار کرنا یہ جنت کے دخولِ خلود کے لئے موقوف علیہ نہیں ہے۔

جنت کے دخول کا موقوف علیہ :

جنت کے دخولِ خلود کے لئے تو ایمان و واجباتِ شرعیہ کا بجالاتے رہنا، اوّل وہلہ میں دخول، اوّل وہلہ میں ہی مرتے ہی دخول بخلود ضروریاتِ شرعیہ کا مأمورات اور منہیات سے بچتے رہنے کا بجالاتا رہنا، لیکن اوّل وہلہ یہ وعدہ نہیں اور گفتگو مرتے ہی دخول بخلود سے متعلق ہے۔ آگے پھر جو حق تعالیٰ نے بیان کیا کہ ان میں ایسے بھی ہیں کہ جورات کے زیادہ حصے میں جاگتے ہیں، کم حصے میں سوتے ہیں اور پھر استغفار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ درجہ کی بڑھائی درجوں کے حصول کا ذکر ہے یہ عرض کیا جا رہا تھا اور درجوں کی زیادتی کا طالب دُنیا میں کون نہیں تو پھر اس کا کیوں نہیں بطریقِ اولیٰ ان کی شاباشی فرمارہے ہیں کہ ایسے بھی بندے ہیں متوجہ کیا ہے اس طرف کہ وہ ضروری دینی کی طرف متوجہ ہونے والے ادھر بھی متوجہ ہو جائیں یہ ترغیب ہے ترقیٔ درجاتِ اُخروی کی اور سالکوں کو طالبوں کو جب سلوک میں داخل ہوئے ان کا منشاء کیا ہے؟ ولکل درجات مما عملوا کا استحضار اور ضروریات شرعیات پر مستحسنات اور مستحبات پر بقدرِ صحت و بسہولت بترکِ تساہل لگا رہنا۔

ایک صاحب کا خط اور حضرت والا کا جواب :

ایک صاحب نے خط لکھا کہ میں اشراق، چاشت، اوّابین، تہجد پڑھتا ہوں لیکن بعض دفعہ قصداً چھوڑ دیتا ہوں کہ فرض کا درجہ نہ ہو جائے میں نے ان کو لکھا کہ عقیدہ تو یہی ہے کہ یہ نفل ہے لیکن دوامِ عمل اس طرح پر ہے کہ جیسے فرض کے ساتھ ہوا

کرتا ہے تو پھر قصداً ترک کیسا؟ تو علاج ہو گیا، عقیدہ میں تو فرض نہیں، عقیدہ میں تو نفل ہے اس لئے اہل اللہ تہجد کی نماز کے نفل ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں لیکن اس کو اسطرح ادا کرتے ہیں جیسے کہ کوئی فرض ہو تو سالک کی تو عملی زندگی، حصولِ درجات، ترقی عمل میں شغل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سالکوں کے ساتھ نیک سلوک کی توفیقات سے بخلوصِ صدق سے نوازیں۔ (آمین)

☆

بیالیسویں مجلس

مقصود اور غیر مقصود کا فرق

مورخہ ۱۳ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بمطابق ۲۲ جنوری ۱۹۸۹ء بروز یکشنبہ بوقتِ صبح

دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں، مقصود اور غیرِ مقصود، جو مقصود ہے وہ مطلوب ہے اور جو مقصود نہیں وہ مطلوب نہیں ہے، جس کو مطلوب کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو اس میں اہتمام کے ساتھ لگا دینا، کھپا دینا اور جو مطلوب و مقصود نہیں ہے اس میں اپنے آپ کو لگا دینا کھپا دینا یہ خلافِ عقل ہے، عقل کا تقاضا اہم او غیر اہم میں تمیز کرنا اور اہم کو مقدم کرنا ہے۔

غیرِ مقصود میں صرف ہمت کا فرق :

مقصود کا جو مادہ ہے ق ص د یعنی قصد، ارادہ اختیاری کو عمل میں لائے رکھنا کہتے ہیں میرا یہ قصد ہے یعنی میرا یہ ارادہ ہے، ارادہ اور مراد کے حصول کے بیچ میں کسی چیز کا تخلل نہیں ہوا کرتا کہ وہ مخل ہوگا، جب قصد ہو تو یہ دوسری بیچ میں مخل کیوں آئی۔ تو جو چیز مقصود ہوتی ہے اس میں اپنے اختیار کا دخل ہوتا ہے تو غیرِ مقصود کی طرف

اس مقصد کے حصول کے لئے متوجہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں البتہ مقصود کے حاصل کرنے میں وہ غیر مقصود معاون ہے تو وہ اگرچہ اپنی ذات میں مقصود نہیں مگر مقصود کے حاصل کرنے میں اس سے امداد ملتی ہے معاون ہوتا ہے، تو اس مقصود کے ساتھ وہ غیرِ مقصود بھی مقصود ہو گیا، اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

مقصود اور غیرِ مقصود کی مثالیں :

زندگی کے لئے اصل مقصود جسم ڈھانکنا' پیٹ بھرنا اور رہائش کی جگہ کا ہونا ہے لیکن ان کے لئے مال کی ضرورت ہے اور مال کے حاصل ہونے کے لئے تجارت زراعت اور صنعت و حرفت، ملازمت وغیرہ کی ضرورت ہے۔

لیکن یہ مقاصد میں سے نہیں ہیں، مقصود کے لئے جو مطلوب ہے اس کے تابع ہیں یہ ذریعہ ہیں، اب اگر کسی شخص کو بدون زراعت، بدون تجارت بدون صنعت و حرفت اور بدون ملازمت تن ڈھکنے کے لئے' پیٹ بھرنے کے لئے مل جائے اور رہائش کے لئے اگر جگہ مل جائے تو مقصود حاصل ہوا۔ اگر کسی شخص کو اسطرح حاصل ہو جائے تو ملازمت کی کیا ضرورت، تجارت کی کیا ضرورت یہ تو مقاصد میں سے نہیں ہیں اگر یہ مقاصدِ ذاتیہ میں ہوتے تو کوئی بھی آپ کو اس سے خالی نہ ملتا۔

لیکن بعض مخلوق نہ زراعت کرتی ہے، نہ تجارت کرتی ہے نہ ملازمت کرتی ہے، کھانے کو بھی مل رہا ہے پہننے کو بھی مل رہا ہے رہنے کو بھی مل رہا ہے اسی لئے تو مل رہا ہے کہ یہ چیزیں زراعت وغیرہ مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ بہت سی مخلوق ایسی ہے کہ کسی سے مانگتی بھی نہیں، کسی کے گھر لینے بھی نہیں جاتی لیکن مقاصد حاصل ہیں۔

مقصود اور غیرِ مقصود کی فقہی مثال :

شریعت میں مؤمن کے لئے اصل مقصود نماز ہے وضو نہیں ہے لیکن وضو جو غیرِ مقصود ہے وہ ایسا ہے کہ بلا اس کے جو مقصود نماز ہے وہ حاصل نہیں ہوتی، تو نماز جو مقصود ہے اس کے لئے وضو مقصود ہے اور وضو ہوتا ہے پانی سے، تو پانی اپنی ذات میں مقصود نہیں ہے اس لئے کہ اگر پانی نہ ہو تو اس کا قائم مقام تیمّم ہے تو اصل مقصود تو طہارت ہے، طہارت کا ذریعہ وضو ہے اور وضو کا ذریعہ پانی ہے اگر وہ نہیں ہے تو تیمّم ہے اور تیمّم کا ذریعہ مٹی کی چیز ہے چاہے آگ میں پکالیا ہے جیسے پکّا گھڑا پکّا مٹی کا لوٹا، چاہے پاک کپڑا ہو کہ مٹی کا غبار ہے اس کے اوپر لگا ہوا ہو۔ تو مقصود طہارت ہے وضو اور تیمّم اپنی ذات میں مقصود نہیں ہے ۔وضو کرنے کے لئے ایسا بیٹھا کہ وضو ہی ختم نہیں ہوتا جماعت ہی ختم ہوگئی۔ تو کیا مقصود وضو تھا یا نماز۔

مقصود اور غیرِ مقصود کی طبعی مثال :

ایسے ہی طبعی مثال کہ ایک شخص کو پیاس لگی ہے تو پانی پیاس کے لئے ہے، پانی اصل مقصود نہیں ہے وہ تو پیاس کے دفع کے لئے ہے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص ایسا ہے کہ جس کو پیاس لگتی ہی نہیں اس کو خشکی آتی ہی نہیں۔ اب پانی کی کیا ضرورت جب ضرورت نہیں تو وہ کنویں کے پاس کیوں جائے کنویں کے پاس جانا تو اپنی پیاس کے دفع کرنے اور بجھانے کے لئے تھا اور وہ ہے نہیں، چنانچہ بعض اولیاء اللہ ایسے گذرے ہیں کہ اُن کو پانی کے پاس جانے کی چھ چھ مہینے تک ضرورت نہیں آئی، چکھ لیا تو چکھ لیا، کھانے کی ضرورت نہیں چکھ لیا اور بس۔ حُکم کی تعمیل کی کہ دن میں روزہ رکھ لیا کرو، ا

ور وہاں حکم ہے افطار کا بعد الغروب۔ جب افطار کا وقت آیا تو بادام کی گری و مغز اس کے پاس ہے اس نے اس بادام کو الٹا کر ذرا سا کاٹ لیا جیسے سرسوں کا دانہ اور تھوڑا سا پانی پی لیا۔ اب یہ افطار بھی ہو گیا یہ کھانا بھی ہو گیا اور یہ سحری بھی ہو گئی کل پھر روزہ ہے اب جب افطار کا وقت آیا تو پھر اسی طرح سے تو چھ مہینے وہ بادام کی گری اور وہ ذرا سا پانی اب بتلاؤ اس شخص کو ملازمت کی کیا ضرورت ہے، تجارت کی کیا ضرورت ہے صنعت و حرفت کی کیا ضرورت ہے۔

ہر شخص کے لئے ترکِ وسائل صحیح نہیں :

لیکن جو شخص ایسا نہیں ہے اس کے لئے ان چیزوں کا حاصل کرنا ضروری ہو گا تو عامتاً ان چیزوں کا مقاصدِ اصلی کے لئے حاصل کرنا ضروری ہو گا۔ یہاں ایسے حضرات کی نقل نہیں چلے گی ان حضرات کی یہ نقل حرام ہے کہ پیاس لگی ہوئی ہے، بھوک لگی ہوئی ہے پانی موجود ہے کھانے کی چیز موجود ہے لیکن نہ پانی پیتا ہے اور نہ کھانا کھاتا ہے موت ہونٹوں پر آ گئی اگر اس نے پانی نہ پیا اور کھانے کا لقمہ نہ کھایا اور مر گیا تو حرام کی موت ہو گئی۔

حیات مطلوب ہے اپنی طرف سے ایسا طریق جس میں موت آ جائے اس کو اختیار کرنا حرام ہے مرنے کے لئے سنکھیا کھالے، بندوق مارلے حرام کی موت ہو گی۔ حاصل یہ ہوا کہ جو چیز کہ اصل اور اپنی ذات میں مقصود ہے اس کی اہمیت ہے اس کو تو مقدم رکھنا ہے اس کو تو اوّل حاصل کرنا ہے اختیار کرنا ہے اور اس مقصود کے لئے جو فی نفسہٖ غیرِ مقصود ہے اگر اس مقصود کے لئے معین ہے مددگار ہے کہ اس سے مدد ملتی ہے اس مقصود میں تو وہ بھی مقصود ہے اور اگر مدد نہیں ملتی تو وہ چیز مقصود نہیں اور نہ مقصود کے لئے

مقصود ہے تو ایسی چیز کی طرف توجہ کرنا التفات کرنا لگنا اور اسمیں خود کو کھپانا حرام ہے۔

زندگی جو مقصود ہے اس کے لئے مال کی ضرورت ہے تو مال تو حاصل ہو لیکن کس طرح حاصل ہوا کہ وہ مقاصد میں نہیں بلکہ وہ رُکاوٹ میں سے ہے ایسی رُکاوٹ میں سے ہے کہ اگر کھانے کی وہ چیز چوری سے یا حرام ذریعہ کمائی سے حاصل کی اور اسکو غذا سمجھا اور کھانے کو بیٹھ گیا تو یہ ظاہر میں تو کھانے کی چیز کھا رہا ہے مگر حق تعالیٰ فرمار ہے ہیں یأکلون فی بطونھم نارا یہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں آگ کھا رہے ہیں۔ دیکھنے میں وہ کھانے کی چیز ہے لیکن حقیقت میں وہ آگ بھر رہا ہے۔ تو حرام کھانے پر بسم اللہ پڑھنا، سنکھیا کھانے پر بسم اللہ پڑھنا ہے۔

غیرِ مقصود کی دو قسمیں ہیں :

تو غیر مقصود چیز دو طرح کی ہوئیں ایک وہ جو مقصود کے لئے معاون ومددگار ہے، وہ بھی مقصود میں داخل ہے۔ حلال طیب کا کمانا حاصل کرنا وہ اصل مقصد کے لئے معاون ہے۔ دوسری چیز کی نفی ہوگئی کہ جو اپنی ذات میں نہ مقصود ہو اور نہ اس مقصود کو اس سے مدد پہنچ رہی ہو تو یہ چیز اپنی ذات میں مطلوب اور مقصود نہیں ہے اور جو چیز مقصود ومطلوب ہے اس کو اس سے مدد نہیں پہنچ رہی ہے تو وہ لایعنی ہے۔

اعراض عن اللغو مؤمن کی شان :

قرآن شریف میں حق تعالیٰ نے فرمایا: والذین ھم عن اللغو معرضون یہ کیسا مؤمن ہے کہ ایسے کام میں لگتا ہے کہ جس کے حاصل کرنے میں نفع کوئی نہیں بلکہ اور اندیشہ ہے کہ کہیں ضرر نہ پہنچ جائے تو لغو کام سے اعراض کرنے والے مؤمن ہوتے ہیں۔ تو لایعنی حرکتوں، لغو کاموں، لغو کلاموں میں مشغول ہونا مؤمن کی شان

سے بعید ہے۔

جب بطن کے لئے تیار نہیں تو باطن کے لئے ایسے ایمان پر تیار ہونا' قناعت کرنا یہ کون سا ایمان اور عقل کی بات ہے۔ اصل پیٹ نہیں ہے اصل تو روح اور دل ہے یہ کیسا عقلمند ہے کہ غذاءِ جسمانی بطنی میں تو پکا پکا، اچھا اچھا، لذیذ لذیذ فرحت بخش خوشبودار خوش رنگ و خوش ذائقہ چاہتا ہے اور ایمان کا خوش رنگ ہونا خوش ذائقہ ہونا اس کی طلب نہیں حالانکہ اسکی طلب ہونی چاہیے۔

حلاوتِ ایمان :

اسی لئے رسول پاک ﷺ نے ایمان کا ذکر فرماتے ہوئے ایمان کی حلاوت کا بھی ذکر کیا ہے، حلاوت کہتے ہیں مٹھاس کو بخاری شریف میں ایک باب مستقل ہے۔ باب حلاوۃ الایمان۔ یہ باب جو بیان کیا جا رہا ہے اس کے نیچے جو احادیث شریف آ رہی ہیں وہ ایمان کی حلاوت کی یعنی میٹھے ہونے کی چیزیں ہیں ایمان بڑھتے رہنے کی چیزیں ہیں ان چیزوں کو بیان فرمانے کے بعد فرمایا: لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم تاکہ زیادہ کرلیں وہ ایمان کو اپنے اس پہلے ایمان کے ساتھ۔ معلوم ہوا کہ ایمان میں بھی زیادتی ہوتی ہے، جیسے جسم بڑھتا ہے ایمان میں بھی بڑھوتری ہوتی ہے، جب ان چیزوں کو اختیار کرے گا جسمانی غذاؤں میں تو جسم بڑھے گا کہ نہیں بڑھے گا؟ ایسے ہی ان چیزوں کو جو ایمان کے بڑھنے کی چیزیں ہیں ان کو استعمال کرے گا تو ایمان بڑھے گا اور ہوسکتا ہے کہ جسمانی غذاؤں کے استعمال کرنے سے جسم نہ بڑھے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ ایمان کی زیادتی کے سامان اختیار کرے گا تو ایمان میں زیادتی نہ ہو، یہ نہیں ہوسکتا، جسمانی سلسلہ میں بعض دفعہ تو وہی دوا جو نفع دے رہی تھی نقصان

دینے لگی وہی غذا جو نفع دے رہی تھی نقصان دینے لگی۔ لیکن ایمان کی زیادتی کی جو غذائیں بیان کی ہیں ان کو استعمال کرنے سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ایمان گھٹ جائے، ایمان میں ضعف وکمزوری آجائے تو عقل کہتی ہے کہ جیسے غذائے جسمانی میں تم اس کے درپے ہوئے اس سے زیادہ ایمان کی بڑھوتری زیادتی کے درپے ہونا ہے کہ وہ ساتھ جائے گا، یہ غذا نہیں جائے گی۔

عقلمند یا احمق :

ہے انتہائی درجے کا احمق، انتہائی درجہ کی بے عقلی اور سمجھ رہا ہے اپنے آپ کو عقل مند کام کر رہا ہے احمقانہ اور سمجھ رہا ہے عاقلانہ، ڈاکہ ڈال کر ڈاکو چوری کر کے چور اپنے خیال میں کامیاب ہوکر آگیا نہیں پکڑا گیا خوش ہورہے ہیں۔ جھوٹ بولنے کو کامیابی سمجھ رہا ہے اور سچ بولنے کو ناکامی۔

سچائی نجات دلاتی ہے :

اس لئے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کا ارشاد ہے : **الصدق ینجی والکذب یھلك** ۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سچ میں نجات ہے اور جھوٹ میں بربادی اور آج مسلمان اکثر وبیشتر کہتا ہے کہ مولوی صاحب بس چپ رہو وہ زمانہ بھول جاؤ۔ آج تو زیادہ سے زیادہ جتنا جھوٹ بولا جاسکتا ہو جتنی فریب کاری اور مکاری اور چالاکی کی جاسکتی ہو اس میں نجات ہے اس میں کامیابی ہے دیکھ لو کیسے کامیاب ہورہے ہیں اور سچے بیچارے بھوکے مر رہے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے، سچائی والے سچ بولنے سے بھی نہیں مر رہے، کہتے ہیں اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے جھوٹ بولنے پر شکر نہیں کہے گا۔

اور سچ بولنے پر کہے گا اللہ تیرا شکر، غصب کی چیز میں مکان دبا بیٹھ کر تو اس پر کہے گا خدا کا شکر؟

الصدق ینجی و الکذب یھلك انتہائی درجہ صدق کا نجات ہی ہے اور انتہائی درجہ کذب کا بربادی ہی ہے، آج نہیں تو کل بالفعل کسی حکمت سے اگر یہاں بربادی نہ بھی آئی آخرت میں تو بربادی ہے ہی۔ کہ دوسری زندگی کوئی ہے نہیں کیا ایسا بھی ہوتا ہے ذرا کچھ عرصے تک صبر کیا اور تحمل کی ضرورت ہے، نجات صدق ہی میں ہو گی اور کذب میں بربادی ہوگی۔

حضرت والا نے کانپور کا واقعہ سنایا کہ ایک نیک بخت حلال وحرام کا خیال کرنے والا اُس نے بانسوں کی دُکان کھولی اب بانس ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ کھوکھلا بھی ہوتا ہے ٹھوس بھی ہوتا ہے، کیڑا لگا بھی ہوتا ہے اب جب لوگ بانس خریدنے کے لئے آتے تھے تو وہ بانس والا کہتا تھا دیکھ لو پسند کر لو اب وہ دیکھ رہے ہیں پسند کر رہے ہیں خریدار لینا چاہ رہا ہے، اب وہ مالکِ دوکان کہہ رہے ہیں کہ یہ بانس تو اس درجہ کا ہے اور یہ بانس اس درجہ کا ہے، یہ کچھ کھوکھلا ہے ذرا اندر سے ایسا ہے اور باہر سے ایسا معلوم ہو رہا ہے اس کی یہ قیمت ہے اور جو ٹھوس عمدہ ہے اس کی قیمت یہ ہے۔ اب چاہے وہ لے لو، چاہے یہ لے لو کیونکہ مسئلہ ہے شریعت کا کہ دوکاندار کو اپنی چیز میں عیب معلوم ہو تو اس کو بتلا دینا چاہیے، اگر نہ بتایا وہ خرید کر لے گیا وہ پوری قیمت دے رہا ہے اور وہ لے رہا ہے اور گھر جا کر نقص وعیب معلوم ہو گیا تو بدل دینا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں تو بیچنے والا گناہ گار ہو گیا۔ چنانچہ یہ مالک بے چارہ بتا دیتا تھا تو اس کی دوکان میں بانس کی لکڑی کم ہوتی تھی دوسرے دوکاندار جو پرانے قریبی قسم کے تھے وہ بیچتے

تھے اور کہتے تھے کہ ارے کہیں تجارت اس طرح بھی ہوتی ہے، کیا دوکانداری کہیں اس طرح چلتی ہے۔ لے بیچ لے وہ تو شام کو اچھے اچھے پیسے لے کر جاتے اور اس کی کم لکڑی بکی ہوتی تھی وہ ظاہری آنکھوں سے دیکھتے کہ اپنے صدق کو آباد کر رہا ہے اور ہم جھوٹوں کو جھوٹ آباد کر رہا ہے۔

لیکن اس نے پرواہ نہیں کی اپنی سچائی کو نہیں چھوڑا وہ تو پکا شریعت والا ہے ایسا جما ہوا ہے جس کو ذاتِ باری تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے: ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا یقیناً بلا شک وشبہ وہ جو کہ کہا انہوں نے ہمارا رب اللہ ہے ہماری پرورش کرنے والا، پالنے والا اللہ تعالیٰ ہے پھر جمے ہوئے مستقیم اور مضبوط رہے تو ان کے لئے بشارت سنائی تتنزل علیھم الملائکۃ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے ملائکہ کی طرف سے ایسی باتیں دلوں میں ڈالی جاتی ہیں۔

تو وہ بانسوں کی دُوکان والا مضبوط رہا پوری طرح، اس مضبوطی کا یہ اثر و نتیجہ ہوا کہ بالآخر دوکان خوب چلی، گاہک خوب آنے لگے اس کی دیانت پر اعتماد ہو گیا تو گاہک آنے لگے، پرانی جو دوکانیں تھیں وہ ٹھپ ہونے لگیں ان کی لکڑی بکنی کم ہونے لگی۔ ایسے بہت واقعات ہیں کہ اللہ کے بندوں نے سچائی پر ثابت قدمی اور استقامت اختیار کی ہے اس لئے وہ کامیاب ہوئے ذرا صبر و تحمل کی ضرورت پڑتی ہے بے چینی سے رکنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کم ہمتی کے بعد بلند ہمتی تو اچھی چیز ہے بلند ہمتی کے بعد کم ہمتی کا ظہور نہ ہو، بلند ہمتی بڑی ضرورت کی چیز ہے۔

روح جب نکلے طہارت پر نکلے:

روح جو کہ طیب و طاہر چیز ہے نزہت کی چیز ہے جب وہ بدن سے نکلے تو

طہارت ہونے کی حالت میں نکلے، تو روح طہارت پر نکلے جس کے ذہن میں یہ بات آ گئی وہ اپنے آپ کو ہر وقت باوضو رکھتے جب کہ اس نے یہ بھی سن لیا ہو کہ پہلے تو مجھے معلوم تھا نہیں اب معلوم ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی عادتِ شریفہ :

کہ رسول اللہ ﷺ پیشاب سے فارغ ہو کر ڈھیلے سے استنجاء فرما کر پانی سے استنجاء فرما کر تشریف لے جا رہے ہیں تو تیمم فرما رہے ہیں، ایک صحابی ؓ کہہ رہے ہیں کہ پانی یہیں قریب ہی ہے آپ ﷺ وضو فرمائیے۔ تو آپ ﷺ نے اندیشہ کیا اور فرمایا کہ عجب نہیں ہے کہ میں پانی تک نہ پہنچوں اور میری روح نکل جائے تو بلا طہارت میری روح نکلے گی تو میں چاہتا ہوں کہ تیمم کرلوں اور بعد میں جا کر وضو کرلوں حالانکہ نبی کی روح بلا اجازت فرشتہ آ کر نہیں نکال سکتا، اجازت لے گا اتنا تقرب حاصل ہے نبی کو حق تعالیٰ کے ساتھ۔

لیکن حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں جبکہ آپ ﷺ مجسّم نور ہیں کیا عجب ہے کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ میری موت آ جائے اور میں طہارت پر نہ ہوں اس لئے پانی تک پہنچنے سے پہلے آپ ﷺ تیمم فرما رہے ہیں تو جس مؤمن نے یہ سن لیا ہو اور پھر اس کے دل میں یہ بات بطلب آ گئی ہو خاص کر جو اصلاح کے طالب ہیں سالکین کو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ باوضو نہ رہے۔ ہاں جب پانی ہی نہیں ہے یا سردی ہے گرم پانی نہیں ہے تو معذوری ہے مجبوری ہے لیکن نیت کا ثواب ملے گا، اس نیت پر اس کو معنوی طہارت کہ نیت اندرونی چیز ہے تو طہارت بھی اندرونی حاصل ہو گئی اور یہ وضو اپنی ذات میں مقصود نہیں گفتگو یہ ہو رہی تھی تو دیکھنا پڑے گا کہ ہماری زندگی کا مطمعِ نظر

ہماری زندگی کا مقصود کیا ہے؟۔

ہماری زندگی کا مقصود کیا ہے :

جو مقصود ہے بالذات اس میں تڑپ کر جی لگا کر کھل کر محنت کے ساتھ لگنا یہ فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے اور جو مقاصد میں سے نہیں ہے اگر وہ مقصد کے لئے معین ہے تو اس میں بھی اپنے آپ کو لگانا ہوگا وہ بھی مقاصد میں سے ہے طبعاً تو ذاتِ باری تعالیٰ نے اس انسان کو عالمِ میثاق میں ایمان عطاء فرما کر مؤمن بنا کر احسانِ عظیم فرمایا، اس نے کب کہا تھا کہ مجھے ایمان عطاء کر۔ مؤمن بنا کر اس عالمِ دُنیا میں آدم علیہ السلام کو بھیجا تھا اور ساری مخلوق انسان آدم علیہ السلام کی پشت میں ہے تو ساری کی ساری اس مؤمن کی پشت میں ایمان والا بنا کر بھیجا گیا اور بتلا دیا کہ تمہارے بھیجنے کا مقصد تمہاری ترقی ہے ورنہ جنت میں ہی رکھ لیتا۔

فرما دیا کہ تمہارے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ جنت میں رہ کر ترقی کی کوئی صورت نہیں آرام ہے، فرحت ہے، خوش خوش رہنا تو ہے لیکن ترقی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ جیسے فرشتوں کو ترقی کی کوئی صورت نہیں ہے کہ میکائیل علیہ السلام جبرئیل علیہ السلام ہو گئے ہوں اور جبرئیل علیہ السلام میکائیل علیہ السلام ہو گئے ہوں، جبرئیل علیہ السلام نے میکائیل علیہ السلام کا مقام لیا اور جبرئیل علیہ السلام کا مقام میکائیل علیہ السلام کو دیدیا ہو۔ تو وہاں نہ تنزلی ہے اور نہ وہاں ترقی ہے بخلاف انسان کے ان کو یہ فرما دیا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم جن جن چیزوں کو، جن جن باتوں کو، جن جن حکموں کو بھیجتے رہیں اُن پر چلتے رہنا ایمان جو تم کو دیدیا اس ایمان کے ساتھ جن جن کاموں، جن جن اعمال کو ہم بھیجتے رہیں ان کو تم کرتے رہنا تو یہ ایمان تمہارا ترقی یافتہ ہوتا رہے گا اور درجہ کی بڑھوتری ہوتی رہے گی۔

ترقیٔ منصب وعہدہ چاہنا طبعی بات ہے دُنیا میں ہر شخص چاہتا ہے کہ مجھے اُونچا منصب اور عہدہ مل جائے حالانکہ ترقی بی اے ایم اے کر کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں۔ بی اے ایم اے کرلیا پھر مجھے نوکری نہیں مل رہی ہے، درخواست دے دے کر جی گھبرا گیا مگر نوکری نہیں ملتی (کسی کو ملی کسی کو نہیں ملی) لیکن یہاں حق تعالیٰ نے خود فرمایا کہ یہ یہ اعمال ہیں جن کے کرتے رہنے سے جو تمہارا پہلا ایمان ہے اس پہلے ایمان میں زیادتی ہوتی رہے گی کہ ان اعمال کو بیان فرما کر فرمادیا کہ لیزدادوا ایماناً مع ایمانھم کہ ان کے ساتھ جو پہلا ایمان ہے اس کے ساتھ ان اعمال کو اختیار کرنے سے ایمان میں زیادتی وترقی ہوتی رہے گی یہ ہے مقصد اب ان اعمال کو اختیار کرنا چاہیے جو ایمان زیادتی وبڑھوتری کا سبب ہوں۔

تو مقصود اس عالم میں بھیجنے کا زیادتِ ایمان ہوا جس کے لئے کچھ کام، کچھ اسباب اور ذرائع وسائل اختیار کرنے پڑ گئے کہ یہ عالمِ اسباب ہے مقصد یہ ہوا تو اس مقصد میں اصل جو مقصود ہے اس مقصد کی چیز کو دیکھنا ہوگا کہ ہمارے مقصود میں اس سے مدد ملتی ہے یا نہیں ملتی، انہیں میں سے ایک علم ہے جو اپنی ذات میں مقصود نہیں بلکہ جو اصل مقصود ہے اس کے لئے مقصود ہے کہ زیادتِ مقصود اس سے ہوگی معاونِ مقصود ہوگا وہ علم ہے۔

معاون ومقصود علمِ نافع ہوتا ہے:

وہ علم جو وحی کے ذریعہ سے نازل فرمایا ہے جو ایمان کی زیادتی کا سبب بنے نہ کہ انگریزی علم وہ ایمان کی زیادتی کا سبب کیا ہوگا بلکہ اندیشہ ہے کہیں مانع نہ ہو جائے کہیں رُکاوٹ نہ بن جائے مقصود میں اور اگر نہ بن جائے اور وہ معین ہو جائے تو

فی نفسہ انگریزی علم پڑھنا حرام نہیں ہے، اب معین تو ہوتا نہیں نفع دِہ ایمان میں ہوتا نہیں اور ضرر دِہ ہو جائے تو حرام ہے۔ اور اگر کوئی علم عربی پڑھے علمِ عربی بھی جو اصل مقصود ہے ایمان کی زیادتی کا وہ حاصل نہ ہو تو اس نے علمِ عربی وحی شرعی دینی کا کیا حاصل کیا ہے؟

اصل مقصود قربِ الٰہی کے لئے عمل ہے اور عمل کا جو اصل مقصود ہے اس کے لئے معین علمِ وحی ہے جیسے احقر نے وضو کی مثال دی تھی، کھانے کی مثال دی تھی اور اسبابِ نکاح کی مثال دی تھی ایسے ہی علم ہے کہ مقصود عمل ہے اس علم سے، چنانچہ جب یہ آیت آپ کے سامنے پیش کی لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم درجے کے لئے ذات باری تعالیٰ نے دوسری جگہ قرآن پاک میں فرمایا ہے: ولکل درجات مما عملوا۔ ایک ایک کے لئے درجے ہیں اس نے اعمال اس کے عمل کے مطابق یہ نہیں فرمایا اس کے علم کے مطابق دلیل ہوگئی علم تو ہے لیکن وہ علم عمل کی طرف نہیں لے جا رہا۔ وہ عمل جو عند الشرع اور عند اللہ مطلوب ہے مقصود ہے اس کی طرف لے جانے کا سبب ذریعہ نہیں بن رہا پھر کیا ہوا؟ تو مما عملوا فرمایا: مما علموا نہیں فرمایا۔

احقر نے مثال دی تھی باطن کی، ایک شخص یوں کہتا ہے کہ بھوک لگ رہی ہے بھوک اگر لگ رہی ہے تو کھانا کھالو، کھانے سے ہی پیٹ بھرتا ہے یہ بازار گیا اور لکڑی خرید رہا ہے، دیا سلائی کا بکس خرید رہا ہے آٹا خرید رہا ہے، ارے بھائی تم تو یوں کہہ رہے تھے کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے اور بھوک تو کھانے کے بغیر نہیں جایا کرتی یہ تم کہاں لگ گئے۔ لکڑی خرید رہے ہو آٹا خرید رہے ہو تو کیا کہے گا وہ؟ یہی پیٹ بھرنے کے لئے مقصود ہے اگر میں آٹا نہ خریدوں لکڑی نہ خریدوں، دیا سلائی نہ

خریدوں تو پھر یہ پیٹ بھرنے کی جو چیز ہے روٹی کیسے حاصل ہوگی؟ تو پیٹ بھرنا مقصود ہے اس کے لئے یہ چیزیں حاصل کرنا مقصود ہو گیا تو جو مقصود کے لئے معاون ہو وہ بھی مقصود میں داخل ہے۔ اور جو ایسا ہو کہ نہ اپنی ذات میں مقصود اور نہ مقصود حاصل ہونے کے لئے معین و مددگار و معاون ہو وہ لغو ہے وہ لایعنی حرکت ہے، وہ لایعنی کلام ہے۔

سیر فی الارض کا حکم کیوں ؟

واضربوا فی الارض، سیروا فی الارض، زمین میں چلو پھرو، تو یہ سیر کرنا اپنی ذات میں مقصود نہیں ہے پھر حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیسے فرمادیا: سیروفی الارض اس لئے فرمادیا کہ اس طرح سیر کرنے سے اور چلنے پھرنے سے ذاتِ باری تعالیٰ کے قدرتی مظاہر سامنے آ کر ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت کے بڑھنے کا ذریعہ ہوگا یہ سیر ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت کے زیادہ ہونے کا کہ قدرتِ الٰہی کے مظاہر منازل میں نظر آرہے ہیں ذریعہ ہیں تو اصل مقصود تو معرفتِ الٰہی ہے لیکن یہ مظاہر قدرتِ الٰہی کا دیکھنا ذریعہ اور وسیلہ ہے اور جب کسی کو یہ چیز حاصل ہے تو سیر اسے حاصل ہے اب اس کے لئے سیروا نہیں ہے وہ تو معرفتِ الٰہی کے حصول کے لئے تھی محض تفریح کے لئے نہیں ہے۔

صحتِ جسمانی بھی مطلوب ہے :

عنداللہ جیسے صحتِ روحانی مطلوب ہے ایسے ہی صحتِ جسمانی بھی مطلوب ہے، اپنی ذات میں مقصود نہیں ہے بلکہ صحتِ روحانی کے لئے مطلوب ہے۔ کہ اگر صحتِ جسمانی نہیں ہے تو جن اعمال کا حکم دیا ہے ان اعمال کو بلا صحتِ جسمانی بھلا کیسے کرے گا؟ تو اپنی ذات میں صحتِ جسمانی' مطلوب نہیں ہے، بلکہ صحتِ جسمانی'

صحتِ ایمانی صحتِ روحانی صحتِ قلبی، تصحیحِ اعمال کے لئے مطلوب ہے۔

دوا کھانا اپنی ذات میں مقصود نہیں ہے لیکن دوا کھانا اس لئے مقصود ہے کہ صحت مقصود ہے اب اس کا خیال اور لحاظ فرض ہے عندالشرع، اس لئے کیا علاج کرانے سے صحت ہو جاتی ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے علاج کرا کر بتلا دیا کہ میں علاج کرا رہا ہوں تو آپ ﷺ کا خیال تو عام احکام کے لئے، عام مخلوق کے لئے، اپنی اُمت کے لئے ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بالکل ہی علاج نہ کراؤں تو میری اُمتِ مسلمہ بھی کچھ کمزور ہو گی اس کی تسلی اس کی تقویت اس کے گھر والوں کا سکون وہ تو علاج سے ہو گا۔

نبی ﷺ نے بعض کام اُمت کی خاطر کیے :

لہٰذا حضور ﷺ نے وہ کام جو آپ کے لئے ضروری نہ تھے وہ بھی آپ ﷺ نے کئے جو کہ موافقِ نبوت تھے خلافِ نبوت نہ تھے، اپنی اُمتِ مسلمہ کی خاطر کہ اگر میں نے یہ نہ کیا تو وہ بھی نہ کرے گی ایسی مخلوق بھی میری اُمت میں ہو گی اُمتِ مسلمہ لہٰذا ان کاموں کو بھی کیا جو نبوت کے موافق ہیں خلاف نہیں اُمت کی خاطر۔ اور اس لئے بھی بعض کام کئے کہ مجھے لوگ بشر سمجھیں، میری اُمت مجھ کو بشر سمجھیں فرشتہ نہ سمجھیں جیسے اور اُمتوں نے اپنے نبیوں کو خدا کا درجہ دیدیا، میری اُمت مجھ کو خدائی کا درجہ نہ دے سکتے۔

اور اُمتوں نے کہا لیکن آپ ﷺ کی اُمت میں سے کسی نے بھی نہیں کہا کہ محمد ﷺ اللہ تھے، آپ ﷺ کو بخار آیا دوا کھائی، سر میں پٹی باندھی، سر میں درد ہوا آپ ﷺ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا آپ ﷺ پر رنج آیا آپ کی آنکھوں سے آنسو نکلے، یہ بشری تقاضا تھا، حالانکہ اُمتِ مسلمہ میں ایسے اولیاء اللہ گذرے ہیں کہ آنکھوں سے انسو بھی

نہیں دل میں رنج کا خیال بھی نہیں تو پھر حضور ﷺ کو رنج کا کیا خیال؟ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور ہے ان کی حکمت و مصلحت پر نظر ہے یا رنج کا کام؟ آنسوؤں کا نام؟

ایک بزرگ کے نکاح کی حکایت:

ایک بزرگ کی رات کو آنکھ کھل گئی آنکھ کھلتے ہی شور مچا دیا کوئی ہے؟ کوئی ہے؟ وہ خادمِ خاص جو تھا اس کی آنکھ کھل گئی، حضور! میں حاضر ہوں حکم؟ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں، بہت اچھا حضور دن ہونے دیجیے انشاء اللہ نکاح ہو جائے گا فرمایا میں ابھی کروں گا، کہ حضور ابھی کہاں جاؤں کس کو کہوں کیا کروں، وہ بیچارہ عذر کر رہا ہے جب دیکھا کہ یہ تو بہت مصر ہو گئے، ابھی کروں گا...... تو خادم نے کہا کہ میری بیٹی ہے جو کہ شادی کے قابل ہے، حضور قبول فرمائیں تو حاضر ہوں فرمایا بہت اچھا۔ اب خانقاہ میں دو چار یا پانچ آدمی تھے ہی وہاں اُٹھا دیا گواہ ہو گئے نکاح ہو گیا رخصتی ہو گئی اور بیوی خاوند کے پاس آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اولاد میں لڑکا دیا لیکن وہ کچھ دن ہونے پر مر گیا، جب وہ مر گیا کفن دفن سب ہو گیا تو پھر ایک دن اپنی بیوی سے کہا تمہیں میرا حال معلوم ہے کہ میں تو ایک فقیر آدمی ہوں، کھانے پینے کو بھی زیادہ نہیں ملتا سب کچھ معلوم ہی ہو گیا، اگر تمہارا جی چاہے رہو، ایسے حال میں اگر رہنا چاہو تو ٹھیک ورنہ میں تم کو طلاق دیدوں؟

بیوی نے کہا یہ تو عجیب سی بات ہے کہ تم نے تو راتوں رات نکاح کر لیا اور اب فرما رہے ہیں کہ طلاق دیدوں؟ یہ کیا قصہ ہے یہ کیا بات ہے؟ ان بزرگ نے کہا کہ بات یہ ہے کہ میں رات کو سو رہا تھا میں نے قیامت کا میدان دیکھا کہ وہاں نفسی نفسی ہو رہی ہے، ایک مؤمن بندہ کے لئے حکم ہو گیا کہ دوزخ میں لے جاؤ، اب

فرشتے اس کو پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جارہے ہیں کہ اچانک اتنے میں ایک بچہ آیا اور اس نے کہا کہ یہ تو میرے باپ ہیں میں نہیں جانے دوں گا، فرشتے اس کو دوزخ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور بچہ جنت کی طرف لے جانا چاہتا ہے کہ یہ تو میرے باپ ہیں کشمکش ہوگئی ذاتِ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بچہ بلا اپنے ساتھ جنت میں لے جائے جنت نہیں مانے گا، جاؤ ہم نے اس کے باپ کو بھی بخش دیا، وہ بخشا گیا، میری آنکھ کھل گئی، مجھے خیال ہوا کہ میرے اعمال تو کچھ ایسے ہیں نہیں لیکن کیا اچھی بات ہے کہ میں شادی کروں اور شادی کر کے بچہ پیدا ہو اور پیدا ہو کر مرجائے تو میرے لئے بخشش کا ذریعہ ہوجائے اس لئے میں نے شادی کی تھی۔

ہم تو اس لئے کرتے ہیں کہ ایک اور بیٹا پیدا ہوا، دو اور ہوں ایک ہی بیٹا ہے دو اور ہوں۔ اور وہاں کیا ہو رہا ہے کہ لڑکا ہوا اور مرگیا، اور کیا کہہ رہے ہیں کہ میری بخشش کا ذریعہ تو دیکھو اُمت میں ایسے بھی ہیں کہ بیٹا مرگیا تو کوئی غم اور آنکھوں میں کوئی آنسو بھی نہیں آتے۔

رسول پاک ﷺ کی آنکھوں میں آنسو بھی اور رنج کا اظہار بھی ہے اور زبان پر الفاظ بھی، خیال فرمایا؟ تو اگر آپ کے آنکھوں میں آنسو کا ہونا نہ ہوتا اور دل میں رنج کا ہونا نہ ہوتا تو اُمتِ مسلمہ ساری بزرگ تو ہے نہیں۔ تو رنج ہوتا آنکھوں میں آنسو بھی آتے جیسا کہ ہوتا ہے ایسا خیال پیدا ہوتا کہ یہ میری حالت یہ میرے ایمان کی کمزوری کی بات ہے۔ اب تسلی ہوگئی کہ حضور ﷺ کو بھی رنج ہوا تھا، حضور ﷺ کے بھی آنکھوں سے، چشمِ مبارک سے آنسو بہے تھے، لہٰذا میرے اس ایمان میں کوئی کمی نہیں ہے کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں میرے دل میں رنج ہو رہا ہے بچہ کے

مرنے کا، یا کسی بھی رنج کی بات کے آنے پر رنج کا ہونا، آنکھوں سے آنسوؤں کا نکلنا یہ کوئی میرے ایمان کے خلاف بات نہیں کہ حضور ﷺ بھی روئے تھے، حضور بھی غمزدہ ہوئے تھے۔

وہ کام جو حضور ﷺ کی نبوت کے خلاف تو تھے نہیں لیکن کیے اپنی اُمت مسلمہ کی خاطر اسی میں سے اس کو بھی سمجھ لو کہ آپ ﷺ کو اِستغفار کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ استغفار گناہوں پر ہوتا ہے، علاج جسم کا مرض پر ہوتا ہے تو معصیت بھی مرض ہے اس کا علاج توبہ ہے استغفار ہے اور حضور ﷺ کو ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ حضور ﷺ تو معصوم ہیں جب معصوم کی عصمت ہے تو معصیت کیسی؟ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ استغفار فرما رہے ہیں، بڑا سبق ہو گیا کہ جہاں استغفار کی ضرورت نہیں ہے وہاں استغفار ہے تو ہمیں تو استغفار کی کتنی ضرورت ہے۔

عام عادت قابلِ ترک ہے:

اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ کسی بھی مؤمن کا کسی وقت یہ کہنا کہ میں آج کل اس طرح تکلیف میں ہوں، غریبی میں ہوں، بیماری میں ہوں، پریشانی میں ہوں، نہ معلوم کون سا مجھ سے ایسا گناہ ہوا کہ پکڑا گیا، یہ کہنا فریب ہے اس کو کہ مجھ سے ایسا کون سا گناہ ہوا ہے ارے صبح سے شام تک بہت ہوتے رہتے ہیں، وہ تو ایسے کریم ہیں کہ بلا توبہ و اِستغفار کے بھی معاف کرتے رہتے ہیں، اگر سب گناہوں پر پکڑ ہو تو ہمارا تو کہیں ٹھکانا نہیں بلا توبہ کے بھی معاف ہوتے رہتے ہیں تو حضور اکرم ﷺ استغفار فرما رہے ہیں تو سبق کس کیلئے ہو گیا؟ آپ کی اُمتِ مسلمہ کے لئے اِستغفار سے کوئی وقت خالی کیسا؟

اصل مقصد رضائے الٰہی ہے اور رضائے الٰہی کا محل اس عالم کے بعد عالمِ آخرت میں جنت اور جنت کے حصول کی علت ایمان ہے اور اس ایمان کی زیادتی اور تقرب کی بڑھوتری کا ذریعہ اعمال یعنی اعمالِ صالحہ ہیں اور ان اعمالِ صالحہ کو اعمالِ ممنوعہ سے بچا کر جس کا نام تقویٰ ہے تو یہ وسائل واسباب ہیں۔

الغرض اصل مقصود جو رضائے الٰہی ہے اس کی علت تو ایمان ہے اگر ایمان نہیں ہے تو رضا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جنت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ علت ہے اس علتِ ایمان کے ساتھ اب ایمان کی بڑھوتری کے اسباب، ذرائع اور وسائل وہ اعمالِ صالحہ ہیں اور ان اعمال صالحہ کے ساتھ ان اعمالِ صالحہ میں کمی نہ کر دینے والی چیز وہ تقویٰ ہے اسی آمنو کے بعد اتقوا اللّٰہ ہے اے ایمان والو! کہ ایمان تو ہے پھر یہ اتقوا اللّٰہ کیا ہے اس تقویٰ ایمانی کے ساتھ جو دوسرا تقویٰ ہے وہ زیادتِ تقویٰ ایمانی کے لئے لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم فرمایا۔

☆

تینتالیسویں مجلس

احکامِ شریعت نہایت عظیم امانت ہیں

موخہ ۲۰ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ بمطابق ۱۰ نومبر ۱۹۹۰ء بروز شنبہ

اللہ تعالیٰ نے خود ہی بندوں کو کام سپرد فرمادیا:

اللہ تعالیٰ نے خود ہی کام بندوں کے سپرد کردیا ہے، اور وہ ایسے کہ الستُ بربکم کہہ کر اور بلٰی کہلوا کر فرمادیا کہ بس یہ میرے احکام ہیں ان کو بجالاتے رہنا، سپرد کردیا تو اس عالم میں موجود فرما کر پھر اس کی یاددہانی فرمادی انا عرضنا الامانة تو امانتِ احکام سپرد فرمادی، اب اس امانت میں خیانت کیسی؟ اس کی تو ضمانت ہوگی۔ اب اس کی حفاظت بڑی لازمی ہوگئی، اور قاعدہ ہے کہ جیسی امانت کوئی کسی کے سپرد کرتا ہے ویسی ہی امانت کی حفاظت ہوتی ہے۔ یہ دیکھنا ہوتا ہے یہ امانت کی چیز کہاں اور کس جگہ چھپا کر رکھوں۔ ایسی مستور اور پوشیدہ رہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور ایسی عمارت میں کہ نہ ٹوٹے نہ گرے اور ایسا تالا ہو کہ نہ کٹے اور ایسی کنجی ہو کہ دوسری نہ پڑے یعنی دوسری کنجی نہ لگ سکے۔ اس لئے یہ امانت احکام خداوندی سوچ لیں کہ کیسی

امانت ہے۔ایسی ہے کہ لا الٰہ کی کنجی سے بند ہوکر الا اللہ کی کنجی سے کھولتا ہے اور آگے بڑھتا رہے۔

ایمان عظیم ترین نعمت اور عظیم ترین امانت ہے :

اورلا الٰہ الا اللہ بشمولِ محمد رسول اللہ ﷺ یہ اعظم نعمت ہے، اعظمِ امانت ہے اللہ تعالیٰ کو اس نعمتِ اعظم ایمان پر بڑی محبت آئی ہے، اب اس کی حفاظت کی ذمہ داری جو لی ہے یعنی احکامِ الٰہیہ کی بجا آوری جو قبول کی ہے اس کا برابر خیال اور لحاظ رکھیں۔اس کو انجام دیتے رہیں اللہ تعالیٰ کے کرم کے شکریہ کے ساتھ کہ ہم سے وہ ذات خدمت لے رہی ہے، یہ اس کا فضل واحسان ہے۔دیکھو اگر کوئی شیخ اپنی خدمت بتلادے تو جی خوش ہوگا کہ نہیں ہوگا۔

طاعات کو خوشی خوشی انجام دے :

اسی طرح یہاں بھی یہ سوچنا چاہیے کہ ہم نے عرض بھی نہیں کیا خود ذاتِ باری تعالیٰ مربیِ حقیقی نے ہم کو خدمت سپرد فرمادی، یہ ان کی ذرّہ نوازی اور کرم فرمائی ہے جیسے مربیِ مجازی، شیخ کوئی خدمت سپرد کردے اور ہر ایک سے کہا بھی نہیں جاتا بلکہ اُسی سے کہا جاتا ہے جس سے بے تکلفی ہوجائے جس سے محبت زیادہ ظاہر ہوجائے گویا شیخ بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ ارے جب تو بے تکلف ہوگیا تو میں بھی بے تکلف ہوگیا لہٰذا تجھے میں خدمت کے لئے کہہ رہا ہوں تو خود سمجھ لے کہ تیری بے تکلفی ہے، اب میں تجھ سے نہ کہوں اور کس سے کہوں تو محبت اور تعلق والا یہ سوچے گا کہ یہ تو میری خوش قسمتی ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے لہٰذا خوشی خوشی انجام دے گا۔اسی طرح حق

تعالیٰ مربیِ حقیقی کی جو خدمات ہیں یعنی جو شرعی طاعات ہیں ان کو انجام دیتا رہے۔ عقل خود اس کو تجویز کرتی ہے اور جی چاہتا ہے جیسے شیخ کبھی کسی خدمت کے لئے کہے اور کہہ دیا اور بلا کہے کہہ دیا تو بس مزید پھول گیا لوگوں سے بھی کہہ رہا ہے آج مجھ سے حضرت نے فلاں خدمت کے لئے فرمایا تھا بس کچھ مت پوچھو باغ باغ ہے میرا دل تو مربیِ حقیقی ذات باری تعالیٰ کے فرمان کا کیا عالم ہوگا؟

جان و مال اللہ تعالیٰ کی رضا میں استعمال ہو :

اور جب یوں بھی فرمادیں سب کو "ان اللّٰہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ" اور با کے معنی شرح مأۃ عامل میں عوض بھی ہے اختصاص بھی ہے مقابلہ کے لئے بھی آتا ہے اور نہ معلوم کیا کیا ہیں" بان لھم الجنۃ" انّ کا اسم ہے الجنۃ۔ کیا اس میں تمہیں کچھ شبہ ہے حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ اس میں تمہیں کچھ شبہ ہے؟ بالتحقیق بلا شک وشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری جانوں کو تمہارے مالوں کو خرید لیا ہے، تم نے بیچ دیا ہے میں نے خرید لیا ہے، اب تمہارا اس میں کیا دخل ہے، تمہارے ان مالوں میں اور ان جانوں میں بتاؤ کیا دخل ہے۔

دیکھیے! جب کسی نے اپنی زمین بیچ دی کسی کو تو اس میں کیا دخل ہے اپنے پاس مال تھا جب کسی کو دیدیا تو کیا دخل ہے اور جب جان بھی سپرد کردی اپنی جان کا کیا دخل ہے جس سے محبت ہوگئی دُنیاوی اس سے کہتے ہیں کہ یار کیا بات کررہے ہو جان و مال سب تمہارے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمارے روزانہ کے محاورہ میں ہم سے خطاب فرمارہے ہیں کہ تم تو خود جانتے ہو جب تم میں سے کوئی اپنی کسی چیز کو جان و مال کو سپرد کردے، تمہارا کیا دخل رہتا ہے تو ایسے ہی یہاں سمجھو کہ تمہاری جان

اور مال ہمارا ہو چکا ہے تو اب تمہاری جان و مال میں تمہارا کیا دخل ہے؟

پس جہاں تمہاری جان کے خرچ کرنے کو کہوں وہاں جان خرچ کرو تو ہر موقعہ پر یہ دیکھ لیا کرو یہاں خرچ کرنے کو کہا بھی یا نہیں کہا؟ یا خواہ مخواہ خرچ کر رہے ہو اور جہاں مال خرچ کرنے کو کہا وہاں مال خرچ کرو۔ چونکہ وہ مال میرا ہے، مگر تمہارے پاس میں نے رکھ دیا ہے مُستعار یا امانت......اور میں نے تم کو اجازت دیدی ہے تو پھر تم کو جان و مال کا کیا دخل ہے تو جہاں میں کہوں وہاں جان اور جہاں میں کہوں وہاں مال لگاؤ خرچ کرو۔ تو اب بندہ کہہ رہا ہے، بہت اچھا آج سے حُکم سر اور آنکھوں پر ہے تو آگے کچھ کہنا تو نہ چاہیے تھا کہ یہ تو اُن کی کرم فرمائی ہے جو یوں فرما رہے ہیں ورنہ تو فی الحقیقت جان بھی اُن کی مال بھی اُن کا یہ خریدنے کا کیا سوال؟ یہ تو اُن کی کرم فرمائی ہے کہ یوں فرما رہے ہیں ورنہ تو بلا واسطہ اور بغیر عوض جان بھی انہیں کی مال بھی ان کا، یہ تو اُن کا کرم ہے کہ یوں فرما رہے ہیں کہ ہاں چلو مان لیا جان بھی تمہاری مال بھی تمہارا مگر وہ تو بِکا ہوا ہے۔ تو اولاً بالذات تو میرا ہی ہے لیکن خیر تمہارا ہی سہی، لیکن تم نے تو بیچ دیا۔ ہم نے کب بیچا ہے؟ گویا حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تم نے ہی تو کہا تھا کہ باغ و بہار کی جگہ دیدیجیے ہمیں تو کیا مفت ہی دے دوں، ایسا باغ و بہار کہ تم نے کبھی سُنا نہ ہو، کبھی دیکھا بھی نہ ہو، تمہارے دل میں کبھی خیال بھی نہ گذرا ہو۔ تم اس کو مانگ رہے ہو تو اس چیز کے لینے میں کچھ عوض ہوا کرتا ہے۔ تو ایسی چیز مانگ رہے ہو اور دائمی طور پر مانگ رہے ہو اچھا تو اللہ تعالیٰ جب ایسی چیز دے رہے ہیں تو ہم کیا دیدیں ہم تو فانی ہیں اور وہ باقی ہے تو اس کا عوض کیا ہو سکتا ہے؟ ہاں ہو تو نہیں سکتا ہے لیکن میرا کرم ہے اس باقی کو فانی کے عوض دے رہا

ہوں ، واہ اللہ میاں کیا چیز ہے وہ ؟ وہ تمہاری جان اور تمہارا مال ہے بس وہ دیدو ہمیں ۔ اے اللہ تعالیٰ طبیعت شرما گئی .... شرما کیوں گئی؟ جان بھی آپ کی مال بھی آپ کا وہ تو آپ ہی کا ہے، ہاں یہ تیری سعادت ہے ۔ اب تو ہم تیری طرف منسوب کر رہے ہیں، اب اسی مال کو جو تو کہہ رہا ہے کہ میرا ہے اور جان بھی تیری سعادت ہے ۔ اسی جان اور اسی مال کو تو رکھ تو اپنے پاس ہی مگر جہاں کہا کروں وہاں خرچ کر دیا کرنا جان کو بھی اور جہاں کہا کروں وہاں خرچ کر دینا مال کو بھی بس اور جہاں خرچ کرنے جان کو کہا کروں ، وہ بھی تیرے نفع کے لئے یہ احقر کیا کہہ رہا ہے ، وہ بھی تیرے نفع کے لئے ،تو جہاں میں کہوں وہاں استعمال کر ...... اب نہیں پانچ وقت میں وہاں خرچ کر دینا تو میرے لئے خرچ کر رہا ہے ...... تو جہاں میں کہوں پنجوقتہ وہاں جان خرچ کرنا تیرا ہی نفع ہے اور نقصان سے بچنا ہے ۔ اور جہاں مال کو خرچ کرنے کے لئے کہوں وہاں مال کو خرچ کرنا تیرے ہی نفع کے لئے خرچ کرنا ہے نقصان سے بچنے کے لئے اپنے پاس ہی رکھ، بس یہ عوض ہے تو اب وہ جان وہ مال فانی چیز باقی کے عوض ہے ۔

اے اللہ! یہ آپ کا کرم ہے اس باقی کے عوض یہ فانی چیز اور پھر میں آپ کے خلاف خرچ کروں اور مال خرچ کروں تو پھر میری سعادت کہاں رہی ، اور جب سعادت نہ رہی تو سعید کہاں رہا اور جب نہ رہا تو اما الذین سعد وا ففی الجنۃ کا مصداق کہاں رہا ایسے آدمی کا دل رو رہا ہے، اور یوں گویا کہ کہہ رہا ہے کہ مصداق میں کہاں رہا ۔ اے اللہ تعالیٰ میری سعادت کو آپ باقی رکھیے، شقاوت سے بچائیے کہ شقی بمقابل سعید ہے ۔ اور سعید کے متعلق وعدہ ہے ففی الجنۃ ۔

شیخ کی خدمت دلچسپی سے ہو :

جب شیخ مربیِ مجازی بہ تربیتِ روحانی کے واسطے دل چاہتا ہے کہ کسی خدمت کے لئے فرمادیں اب جب فرمادیا تو طبیعت میں لہر آ گئی۔اس سے اندازہ کیجیے گا کہ جب شیخ مجازی ایسی محبت میں کوئی کام سپُرد کریں، خدمت کے لئے فرمائیں تو سرو آنکھوں سے قبول ہے وہ تو علی الرأس والعین کہتا ہے،تو مربیِ حقیقی کسی خدمت کے لئے فرمادیں تو سب سے بڑھ کر اوّلاً اپنا ہاتھ بڑھا جائے کہ میں آگے نکل جاؤں اور والسابقون السابقون کی ندا کان میں اوردل میں آجائے تو اس کے نتیجہ میں اولئك هم المقرّبون ہےاورسبقت کرنے میں اپنی جیسی کوشش کرتا رہے،امتحان میں فرسٹ کلاس اوراوّل نمبر آنا چاہیں،فانی چیز کے لئے تواوّل نمبر کی کیا ضرورت ہے۔تو قرآن شریف میں تین جماعتیں بیان کیں اوّل مقربین دوسرے ابرار ہیں،اورآگے چھوڑ دو غیرِ اسلام کو،تو ابرار اور ابرار سے آگے مقربین تو مقربین وہ السابقون ہیں جیسے مہاجرین سابقین،وہ مقرب ہیں اور بعد کے جو مہاجرین ہیں وہ ابرار ہیں تو درجۂ مہاجرینِ اوّل کا اوّلی ہوا تو پہلے ہاتھ مارے اپنی جیسی کوشش کرے، کیونکہ عزت،مال و دولت کوئی چیز نہیں،ایمان کی حفاظت کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں اسی کو عرض کیا جارہا تھا جان کیا چیز ہے؟ مال کیا چیز ہے؟اور جب تم ہمیں دے بھی چکے اور ہم خرید بھی چکے اور اس کی تم نے خود پسند کر کے امانت رکھ لی تو ایمان کی امانت کے مقابلہ میں جان و مال کوئی چیز نہیں،جہاں ہم جان کو کہیں گے خرچ کرو،جہاں ہم مال کو کہیں گے خرچ کرو کوئی بات نہیں،’’ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسهم واموالهم بان لهم الجنة‘‘ بھلا قدیم کے مقابلہ میں حادث کیا چیز ہے؟اور بقاء کے مقابلہ میں فناء کیا چیز ہے؟

شیخ سے محبت اور پیار ہو :

اس لئے میں نے ایک نظیر پیش کی تھی آپ کی خدمت میں کہ جس کو واقعی شیخ کہتے ہیں اور اپنا مربی اور اعتمادِ کامل، اعتقادِ جازم کے ساتھ اختیار کیا ہے اپنے کو اس کے سپرد کیا ہے تو اس سے زیادہ دُنیا بھر میں اور کسی سے محبت نہیں، وہ اگر پیار سے بولے تب تو پیار ہے ہی اور اگر سختی سے بولے تب بھی پیار ہے، نرمی سے بولے تب پیار ہے دھتکار دے تب پیار اسے کہتے ہیں محبت۔

مخلص اور منافق کی پہچان :

کُتے کو پالنا تو جائز ہے زراعت کھیتی کی حفاظت کے لئے' مکان کی حفاظت کے لئے اور شکار کے لئے لیکن گھر میں رکھنا جائز نہیں، بعض دفعہ مالک کتے کو مار رہا ہے اور اس کو یوں کہہ کر دور کر رہا ہے ہش ہٹ لیکن وہ کہتا ہے کہ مجھے آپکی چوکٹ چھوڑنا نہیں کتا بزبانِ حال کہہ رہا ہے، ماریئے گا مگر آپ کی چوکٹ مجھے چھوڑنا نہیں ......

آیا ہوں ترے در پہ ، کچھ کر کے ہٹوں گا
تو کر دے میرا فیصلہ ورنہ مر کے ہٹوں گا

کتا کہہ رہا ہے سبق دے رہا ہے کہ بہت اچھا، پیار آیا پیار کے معنی محبت کے ہیں، محبت و پیار تو وہ ہے جو پیار پر مار ہو اور پھر بھی پیار ہو وہ ہے محبت، جب کھانے اچھے اچھے دیتے رہیں، صحت وتندرستی اچھی اچھی دیتے رہیں، دُنیا کی عزتیں دیتے رہیں تو اللہ تعالیٰ کو پیار آرہا ہے اور ذرا کچھ اس میں جھبکی آگئی خلاف میں، تو آزمائش ہوگئی معلوم ہو گیا حق تعالیٰ کا مخلص کون ہے اور منافق کون ہے۔ ان کو پہچاننا قرآن

پاک میں بہت ضروری ہے حق تعالیٰ کو معلوم ہے مگر حالِ ظاہر میں دیکھنا ہے اور اس کو دکھانا چاہتے ہیں کہ تیرے اندر کیسا اخلاص تھا تیرے کلام میں کتنی سچائی تھی، تیرے قدم میں کتنا اخلاص تھا بس ذرا سی ہوا لگ گئی، تو ایمان کا رہا یا نفاق کا ہو گیا۔ ارشاد ہے: احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون بس کہہ دیا: امنا تو کافی ہو گیا، قرآن پاک میں ہے کیا گمان کر رکھا ہے لوگوں نے اس طرح سے کہ وہ چھوڑ دیے جائیں امنا کہنے سے اور ان کی آزمائش نہ ہو۔

مرید کی مار سے مزہ آتا ہے:

پیار پر تو پیار ہے دیکھنا یہ ہے کہ آر پر بھی پیار ہے کہ نہیں یا عار آتی ہے، اسے کہتے ہیں پیار، شیخ نکال رہا ہے مگر نکلتا نہیں، اور بیعت جب ٹوٹے گی جب مرید نکلے، لہٰذا شیخ ہزار دفعہ کہے تو میرا مرید نہیں مرید رہے گا، کہنے سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک وہ بالقصد اپنے ارادہ سے مرید ہونے سے نہ نکلے، اسے تو پیار آ رہا ہے آپ کے اس کہنے پر نکلو، مجھے تو پیار آ رہا ہے، ذرا بھی فرق دل میں تو کیا آتا چہرہ پر بل بھی نہیں آتا۔

مؤمن کو تکلیف میں بھی مزہ آتا ہے:

باری تعالیٰ کے احسانات میں سے وجود ہی ایک ایسا احسان ہے کہ جس کا کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا، اور اس کے لئے سارے سامان مُیسّر کہ جس کی زندگی کے لئے جتنے وہ سب کے سب مُیسّر کتنا بڑا احسان کتنی بڑی نعمت ہے ساری عمر کے لئے تو اگر ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات کڑواہٹ کی آجائے تو کیا اس کو زبان پر لائے کہ واہ اللہ میاں واہ آج یہ کیسا ہو گیا؟ اور یاد رکھو کہ میٹھے کا مزا تب ہی آ سکتا ہے صحیح طریقے سے جب کہ کڑوی چیز بھی چکھی ہو یہ بشارت ہو گئی، میٹھی چیز کھاتے رہیں لیکن

قدر نہیں کہ میٹھی ہے اور جس دن کڑوی چیز مل جائے اب پھر دیکھیں او ہو یہ کیا ہو گیا کہ کڑوی چیز کھائی نہیں اور جو کھائی تھی وہ تو میٹھی چیز تھی اس کی قدر کھل گئی، قدر کا علم ہو گیا ویسے ہی پیار کی قدر پر جب آر لگی اور عار نہیں آئی جبھی تو پیار کی قدر ہے۔

بچوں میں خلوص زیادہ ہوتا ہے :

ان بچوں کو تو یہ خبر نہیں کہ ثواب ملے گا یہ کیا جانیں بچوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ بدلہ ملے گا پیسہ دو پیسہ، بچوں کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ دُعا ہی ملے گی اس سے زیادہ محبت کون سی ہو گی نہ پیسوں کا عوض، نہ دُعاء کا عوض نہ طمع کچھ نہیں ان کے ذہن میں۔

بچے کے خلوص میں اور بڑے کے خلوص میں زمین و آسمان کا فرق ہے بڑے کے تو کچھ نہ کچھ ذہن میں ہو گا، کم از کم ثواب تو ہو گا، اور یہ تو ہو گا کہ بزرگوں کی خدمت کرنے سے دوسروں کی نگاہوں میں کچھ نہ کچھ عزّت ہو جاتی ہے، بزرگوں کی خدمت کرتا ہے اور کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے اور بچے کے ذہن میں تو کچھ بھی نہیں۔

دادا کو پوتے سے فطری محبت ہوتی ہے :

دادا کو جتنی محبت پوتے کی ہوتی ہے، اُتنی محبت باپ کو ہے تو مگر اس کا اظہار نہیں ہونے پاتا۔ بیمار ہے دادا لئے پھرے کندھے پر، اس پوتے سے کیا اُمید ہو گی، باپ کو تو کچھ ہو گی ابھی تو جوان ہے باپ، دادا میاں کے پاؤں لٹکے ہوئے ہیں قبر میں، اس سے کیا اُمید ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں دبائے گا کما کے کچھ کھلائے گا ہماری راحت پہنچنے کا کچھ سبب بنے گا۔ ہم نے بڑے بوڑھوں سے سُنا ہے کہ بڈھا اور بچہ دونوں برابر، نہ تو بچہ کے ذہن میں کچھ ایسی چیزیں ہیں طمع وغیرہ کی، اور نہ دادا وغیرہ

کے ذہن میں ایسی کچھ چیزیں ہیں حرص وطمع کی، تو بڈھا بھی مخلص بچہ بھی مخلص۔

اللہ کی محبت مؤمن سے ازلی ہے :

تو بندۂ مؤمن کو جو بچہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی محبت ہے لیکن ذاتِ باری تعالیٰ کو بندۂ مؤمن سے جو محبت ہے وہ محبت کہاں ہے بندہ کو، ارے کم از کم دل تو رو جائے بندۂ مؤمن کو محبت نہیں تھی تو ایمان کیسے لایا تو بندۂ مؤمن کو ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ محبت ہے تسلیم ہے لیکن ذاتِ باری تعالیٰ کو بندۂ مؤمن کے ساتھ جو محبت ہے وہ بندہ میں ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ کہاں ہے۔ وہ تو ازلی ہے ابدی ہے، جب دادا صاحب کو پوتے کی اتنی محبت ہے تو اللہ میاں کو بندۂ مؤمن کے ساتھ کتنی محبت ہوگی اے اللہ ہمیں اپنی محبت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیے۔

مؤمن کو ذاتِ باری تعالیٰ کا پروانہ ہونا چاہیے :

تو شیخ کچھ خدمت کے لئے کہتا ہے تو تربیت پرواز کر جاتی ہے پروانہ بن جاتا ہے۔ تو ذاتِ باری تعالیٰ نے جو خدمت سپرد کی ہے اس کے لئے اس بندۂ مؤمن کو کیسا پروانہ بننا چاہیے تو پروانہ لُو پر عاشق ہے اور لپک لپک کر لُو کی طرف جارہا ہے اور جانتا ہے کہ جل جاؤں گا ہاں جلنے ہی کے لئے تو پروانہ ہے پھر جلنے دو کیا پرواہ ہے۔ عشق بھی یوں ہی کہتا ہے کہ میں جلنے ہی کے لئے ہوں پھر مجھے جلنے کی کیا پرواہ ہے کہ کوئی کیا کہے گا ....

عاشق بدنام کو پروائے نیک و نام کیا
جو خود ہی ناکام ہو اسکو کسی سے کام کیا

محبتِ کاملہ کا اثر طاعتِ کاملہ ہے:

کیونکہ بدنام ہوتا ہے عاشق لوگوں کی نگاہوں میں اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا ہے جو کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے: لایؤمن احدکم حتی یقال انه مجنون۔ تم میں کوئی شخص مؤمنوں میں سے مؤمنِ کامل نہیں ہوسکتا جب تک دیکھنے والا تم کو یوں نہ کہہ دے کہ یہ پاگل ہے۔ اے مؤمنو! تم اس وقت تک مؤمنِ کامل نہیں ہوسکتے جب تک کہ دوسرا دیکھنے والا تم کو یہ نہ کہہ دے کہ یہ پاگل ہے، اب گویا مہر لگ گئی لوگوں کی اس کے پاگل کہنے پر کہ اس کو محبتِ کاملہ ہے کہ پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ کیا کہیں گے، برادری کے لوگ کیا کہیں گے کہ کس طرح نکاح کیا، اس طرح کہیں نکاح ہوتا ہے۔ کچھ پرواہ نہیں کرتا وہ تو شریعت کے مطابق نکاح کرنا چاہتا ہے لیکن برادری طعنہ دے رہی ہے لیکن اس کی پرواہ نہیں کیونکہ عاشقِ الٰہی ہے، بدنام کر رہے ہیں یہ تو پاگل ہے یہ کیا جانے دُنیا کو سنبھالنا کسے کہتے ہیں، یہ تو دقیانوس ہے اسے زمانہ کی کچھ خبر نہیں یہ پرانا آدمی ہے اس کو کچھ خبر نہیں، اسے کہہ رہے ہیں پاگل دیندار' کامل کو لوگ پاگل کہتے ہیں اور حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو رہے ہیں کہ میرے ایسے بندے کو لوگ پاگل کہہ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو خوشی ہوگی اس شخص پر، اس شخص پر جس کو پاگل کہا، اور جس نے پاگل کہا ہے اس پر حق تعالیٰ کی ناراضگی اور غصہ ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ذلک لمن خشی ربہ کیونکہ وہ تو پروانہ ہے، اڑنے والا چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن لو پر عاشق ہے یہ کہتا ہے کہ میں بھی پروانہ اُڑ اُڑ کر چکر کاٹ رہا ہوں گا۔

پریدن کے معنی ہیں اُڑنا مؤنث سماعی پروانہ ہے اُڑ اُڑ کر جا رہا ہے، اور لوگ اس کو جھڑک دیتے ہیں، پھر جا رہا ہے ارے تو یہاں جلنے کے لئے کیوں آ رہا ہے تجھے

اپنی جان پیاری نہیں ہے، میں تو جان آپ کو دے چکا ہوں، پھر جان کی پرواہ کیسی؟ وہ تو آپ ہی کیلئے تو ہے یا نہیں؟ اور دشمنوں کو جلانے کے لئے ہے آپ کی راہ میں جلنے کے لئے ہے، اس لئے جل جل کر ہمارے ایمان پر ایسی ایسی بات کہتے ہیں، اور جل جل کر ہمارے ایمان کے ساتھ اس طرح سے پیش آتے ہیں، جی اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے جل رہا ہے اور دشمنوں کو جلا رہا ہے۔

خدا کی نوازش پر ناز نہ آنا چاہیے :

کیا ایک پیسہ والوں کو بھی مالدار کہتے ہیں؟ کیا پیسہ مال نہیں ہے لیکن کوئی کہہ دے گا مالدار؟ یوں تو ایمان ہے لیکن اس کو کہتے ہیں ایمان، اللہ تعالیٰ اپنے کرم و فضل سے اس ایمان کی توفیقات سے نوازیں، وہ نوازیں اور ناز نہ آئے نیاز رہے کیونکہ ان کی بخشش ہے تو پھر ناز کی کیا بات ہے بلکہ جتنا بھی نیاز ہو تھوڑا ہے اطاعت پر چلتے رہیں اور دعاؤں سے غافل نہ ہوتے رہیں۔

حضرت سیّد الانبیاء ﷺ کو عبد کا لقب ملا :

اس لئے اس کا نام عبد ہے عبدِ کامل، اس سے اونچا کوئی عہدہ، اس سے اونچا کوئی تخلص نہیں کہ رسولِ پاک ﷺ کو بھی جب خطاب دے رہے ہیں تو عبد کے عنوان سے' عبد کے تخلص سے' عبد کے لقب کے ساتھ، جب خط لکھتے ہیں کسی کو دعوت پر تو بڑے بڑے القاب لکھتے ہیں۔ لیکن ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑا عنوان، خطابِ عبد کا ہے انتہائی درجہ کی عاجزی وانکساری لفظ عبد میں رکھی ہوئی ہے۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ اور مراد حبیب سردارِ دو جہاںؐ سیّد الانبیاء والملائکہ ﷺ ہیں اور عبد خطاب سے بُلائے جا رہے ہیں۔

سبحان کہنے میں حکمت اور شبہ کا جواب :

اور شروع کیا سبحان اللہ سے یوں نہیں کہا: اللّٰہ الذی یعنی اپنی صفتِ مُنزہ مُبرّا سے کہ اس ذات میں کسی قسم کی کسی اعتبار سے' کسی وقت میں' کسی زمانہ میں' کسی مکان میں بھی نقص ہے ہی نہیں اس میں تو پورا کمال ہے، پھر اگر وہ دعوت دے کسی کو تو تمام راستہ اس کے مجھ تک پہنچنے کیلئے سب صاف شفاف کھلے ہوئے ہیں کوئی چیز بیچ میں مانع، دافع کیسے ہوسکتی ہے کہیں طبقۂ زمہریر میں ٹھنڈک تو کچھ نہیں طبقہ ناریہ آئے تو کچھ نہیں طبقہ ہوائیہ آئے تو کچھ نہیں، کیونکہ پہلے کہتے تھے کہ طبقۂ زمہریری ہے، بھلا کیسے گذرے ہوں گے، ارے دیکھو تو سہی براق اُڑ رہا ہے، جب کوئی ملک کا وزیر اعظم صدر بادشاہ دعوت دیتا ہے تو سواری کیسی ہوتی ہے اس کی اور راستے اس کے کتنے صاف کہ اس وقت تک کوئی سواری گذر بھی نہیں سکتی، سڑک کیسی صاف اور راستہ کے موانع سارے ختم بڑی آسانی' بڑی راحت کے ساتھ' بڑی فرحت' بڑے سکون کے ساتھ' بڑے چین کے ساتھ سواری چلی جاتی ہے تو وہ ذاتِ قادر .... ہے

قدرت تو داری ہرچہ خواہی میکنی
زندہ را مردہ کنی مردہ را زندہ کنی

جو زندہ تھے وہ سب مردہ ہوگئے مردہ بھی زندہ ہوگئے، طبقۂ زمہریر بھی مردہ ہوگیا طبقہ ناریہ وہ بھی مردہ بن گئی سب مردہ ہوگئے، سب میدان صاف تو کہا: سبحان الـذی اس لفظ سبحان میں معترضوں کے شبہ کا جواب ہے کہیں مت جاؤ سبحان کے لفظ میں معترضوں کے اعتراض کا جواب ہے۔

سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم میں عبدیتِ کاملہ تھی :

اور لفظِ عبد میں روضیّت کا اظہار ہے، تو ایسا ہے جس کو بُلا یا جارہا ہے زمین سے لیکر اور جہاں تک اس کو بُلایا جارہا ہے سب صاف عبدیتِ کاملہ، یہ عہدہ بہت اونچا ہے اور آپ کی عبدیتِ کاملہ لامتناہی تو پھر سید الانبیاؑ و المرسلین سید الملائک صلی اللہ علیہ وسلم وہ نہیں تو کون ہوگا جس کو لفظِ عبد کے ساتھ یاد کیا جارہا ہے۔

حضرت بشر حافیؒ کی عظمت و محبت کا ظہور :

جب بندوں میں کوئی ایسا بندہ ہوجاتا اللہ تعالیٰ کبھی اظہار کے لئے فرمادیتے ہیں، بندے تو اور بھی ہوتے ہوں گے لیکن جب ایک بندہ میں توبہ نصوح کے ساتھ اور ذاتِ باری تعالیٰ کی محبت و عظمت کو لیکر کھڑا ہوا ہے تو ذاتِ باری تعالیٰ فرمادیتے ہیں کہ جہاں جہاں اس کے قدم پڑجائیں تو اے پرندو چرندو! تمہاری وہاں گوبر اور مینگنی نہ پڑنے پائیں، وہ تو ننگے پیر پھرتے تھے توبہ نصوح کے بعد اور جب کسی نے کہا تو کیا کہا زمین اللہ تعالیٰ کا فرش اور بادشاہوں کے فرشوں پر ننگے پیر چلا کرتے ہیں تو پھر میں جوتے لیکر کیسے چلوں اس کا ظہور اب ہوا، طالبِ علموں میں کچھ شوخی ہوتی ہے کہ مؤمن، مسلمان اُمتی ہوکر زمین کو اللہ تعالیٰ کا فرش کہہ رہے ہیں اور بادشاہ کا فرش ہے اور بادشاہ کے فرش پر کہیں جوتے پہن کر چلا کرتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کے دو جواب :

اب طالبِ علمانہ شبہ ہوگیا۔ پیغمبرانہ اُسوۂ حسنہ ذہن میں ہے نہیں، تو کیا حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی اتنی عظمت نہیں تھی العیاذ باللہ! کیا اتنی محبت نہیں تھی جیسی

کہ بشر حافیؒ ظاہر کررہے ہیں۔ حضور ﷺ حال پر قادر ہیں، حال تابع ہے حضور ﷺ کے نمبر ایک، نمبر دو کہ حضور اکرم ﷺ اپنے اقتدائیت کے واسطے تشریف لائے تھے، سارے مقتدی، آپ ﷺ متبوع سارے تابع، آپ ﷺ کا ہر فعل وعمل اتباعیت کو لئے ہوئے ہیں، اگر آپ ﷺ ننگے پیر چلتے رہتے تو اس مخلوق اُمتی کا ننگے پیر چلنے کا حال کیا ہوتا؟ آپ ﷺ تو چل لیتے گوارہ فرمالیتے، بشر حافیؒ بیچارے حضور ﷺ کے سامنے کیا چیز ہیں، لیکن اُمت کے لئے دشواری تھی۔

سالک اور خشک صوفی کو ہدایت :

ولی کے احوال سے اپنے احوال کو نہ ملاؤ کہ نہیں ملتے، صحابی کے ساتھ ملاؤ نبی کے ساتھ ملاؤ ملتے ہیں اگرچہ اس ولی کے ساتھ حال سے حال نہیں ملتا پرواہ نہیں ہے کچھ گنجلک نہیں ہے تشویش نہیں ہے اپنے اوپر جھنجھلاہٹ نہیں ہے طبیعت میں ٹھنڈاپن نہیں ہے گرما گرمی وہی ہے طبیعت بجھی ہوئی نہیں ہے۔ جب ایسے شخص کو جب کچھ حقیقت شناس ہوگیا ہے کہیں کوئی جگہ مل گئی ہے اس طرح بیٹھنے کی اب ایسے صوفی صاحب کو ایسے طالبِ تزکیہ کو تذکرۃ الاولیاء کے مطالعہ میں کچھ حرج نہیں ہے ورنہ بڑا حرج ہے وہ تنگ حال نہیں ہوگا، اس کی طبیعت بجھے گی نہیں اور جب تک ایسا نہیں ہوا صوفی! ابھی بیچ میں بیچارہ پڑا ہوا ہے اس کو تذکرۃ الاولیاء کا مطالعہ جائز نہیں ہے، بُستان العارفین دیکھنا جائز نہیں ہے ایسا صوفی تو اپنی ساری ریاضتوں مجاہدوں کو بے کار سمجھے گا اور رُوٹ کر بیٹھ جائے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ نماز ہی چھوڑ دے۔

محبت کے آثار اور اس کا مقتضیٰ :

تو شیخ کے ساتھ محبت تمام دُنیا بھر سے زیادہ ہو اس لئے تجویز تشخیص کے بعد

ہو۔اب جب پھر بھی وہی خدمت کے لئے وہ کہتا ہے تو مرید کا جی پھول جاتا ہے حتیٰ کہ دوسروں کے آگے تذکرہ بھی کرتا ہے مجھ سے حضرت نے آج خدمت لی جو کہ مربیِ مجازی ہے تو مربیِ حقیقی کی محبت کا تقاضا نہیں؟ یہ کہتا ہے کہ بعض صحابیہ نے آکر عرض کیا حضور ﷺ کی خدمت میں یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی محبت تو ہمیں بھی ہے جیسے مرد صحابہ کو ہے۔اللہ تعالیٰ جب خطاب فرماتے ہیں اور علمِ وحی نازل فرماتے ہیں تو مردوں کے خطاب کے ساتھ فرماتے ہیں۔ہمارا بھی یوں جی چاہتا ہے کہ عورتوں کے خطاب کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ نازل فرمادیا کریں۔دیکھئے محبت کہہ رہی ہے ہم کو خطاب خاص عنوان کے ساتھ نازل فرمائیں حالانکہ دونوں کے لئے تھا تو مومن کی محبت کا تقاضا ہوا کہ اپنا خود جی چاہے اللہ تعالیٰ کے مذاق ومزاج اور طبیعت کے موافق کام کرنے کو لیکن کریں تو کیسے کریں کیا میں منتخب کروں اپنی محبت ہی میں ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ اور ذاتِ باری تعالیٰ ہی کی عظمت ہی میں ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے۔

باپ کو بلا رضا بیٹے کی چیز میں تصرف جائز نہیں :

جیسے باپ نے اپنی چیز بیٹے کو دیدی اب باپ کو بیٹے کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، اس کی رضاء پر موقوف ہے بشرطیکہ عاقل بالغ ہو اگر بچے کو دیدی ہے تو اس بچہ کو مالک بنا کر دینے کے بعد باپ کو بھی اس پیسے میں تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔اگرچہ وہ رضاء سے بھی دے چنانچہ مالک بنا دیا ہے دس پیسے کا اور بازار سے شکر قندی مول کر لے آیا ہے تو باپ کو اس میں کھانا جائز نہیں ہے اگر کھائے گا تو اتنے پیسے جتنی کھائی ہے دینے پڑیں گے کہ اس کی ہے، خیال کرنے کی بات ہے۔

بندہ کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے :

اللہ تعالیٰ بندہ سے ایسا برتاؤ فرمارہے ہیں جیسے کہ باپ بیٹے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔آج کل جانتے نہیں کہ بڑے چھوٹے کی حوصلہ افزائی کیسے کریں؟ ہاں اچھا پڑھا لکھا ہے بیچارے نے الفاظ پڑھ لئے کچھ معنی جان لیے، ظاہر داری ہوگئی اندر کیا جانے بیچارہ باپ بننے والے جانتے ہی نہیں کہ بچہ کی حوصلہ افزائی کس طرح کرنی چاہیے۔ بیٹے کی حوصلہ افزائی میں محنت کرنا پڑے بیچارہ پر، اچھا اس زمانہ کا باپ ہے باپ تو بن گیا مگر باپ بننا نہیں آتا۔حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ تیری سعادتمندی ہے کہ میں تیری طرف منسوب کررہاہوں میں خریدنا چاہتا ہوں ورنہ پھر خریدنے کا کیا سوال؟ اور تو بار بار یہ کہتا ہے یعنی مؤمن جنت جنت تو گویا مفت ہی جنت لے گا؟۔

جنت کی قیمت ادا نہیں ہوسکتی :

تو جانتا بھی ہے کہ جنت کسے کہتے ہیں کہ ہاں میں نے لغت کی کتاب میں دیکھا تھا، جنت کے معنی تو باغ کے ہیں، تو پھر جنت جنت کہہ رہا ہے تو پھر کسی کے باغ پر قبضہ کرلے اس کی قیمت بھی ادا کرے گا یا مفت ہی تو جنت کا سوال کررہا ہے۔ پھر اس کا کچھ عوض بھی تو ہونا چاہیے۔اے بندۂ مؤمن! جنت تو میں آپ سے مانگ رہا ہوں، اور آپ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں وہ تو باغ ایسا عجیب قسم کا کہ میرے خواب میں بھی نہیں آسکتا تو پھر ہمارے پاس اس کی قیمت مشکل ہے، اس کا عوض ہمیں بہت مشکل ہے کہ جس کی جنت کا میں سوال کررہاہوں اور وہ آپ کا لگایا ہوا باغیچہ ہے اور رہے گا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جو میں کہہ رہا ہوں جو درخواست پیش کررہا ہوں وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔اے اللہ اس کی قیمت پاس تو نہیں آسکتی جو ہوگی بھی تو وہ فانی ہے

اور میں خود فانی ہوں اور جس چیز کا سوال کیا ہے وہ باقی ہے بھلا فانی چیز سے باقی چیز کی کیا قیمت ادا ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہاں یہ تیری سعادت ہے، تجھ کو یہی خیال کرنا چاہیے لیکن میرے کرم اور میرے فضل کا کچھ اور تقاضا ہے۔ کہ تیری فانی چیز کو ایسی باقی چیز کا عوض بنا دیا۔ اے اللہ مؤمن کہہ رہا ہے کہ طبیعت بے چین ہو گئی، تو جلدی بتائیے گا وہ کیا چیز ہے جو میں سپرد کر دوں آپ کو۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: وہ تیری جان اور تیرا مال ہے۔ ہم اس کے عوض میں جنت دیں گے۔ تیری جان اور تیرا مال وہ جنت کے عوض میں بک چکا خریدا جا چکا، اب تجھ کو اپنی جان میں تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ تجھ کو مال میں تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ جہاں جہاں ہم تجھ کو جان کے تصرف کی اجازت دیں وہاں تجھ کو تصرف کرنا ہوگا بس یہ ہمارا ہے جو تیرے پاس استعمال کے لئے مستعار دیا ہے۔

سعادت کو شریعت میں استقامت کہتے ہیں :

اب اس سعادت کا ثبوت دیتا رہ کہ دیکھیں تو جان کو کہاں خرچ کرتا ہے مال کو کہاں خرچ کرتا ہے۔ اے اللہ مجھ کو توفیق عطا فرمائیے گا اس سعادتمندی کے نباہنے کی جس کا نام شریعت میں استقامت ہے۔ اسی لئے اهدنا الصراط المستقیم ہے۔ استقامت کی اللہ سے درخواست ہے کہ سعید بنا رہوں۔ اور سعید کے متعلق آپ نے فرمایا ہے: واما الذین سعدوا ففی الجنۃ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں استقامت پر ناز سے بچتے ہوئے نیاز کیساتھ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆

چوالیسویں مجلس

ایمان کا تقاضا ایفائے عہد ہے

مورخہ ۵ جمادی الاوّل ۱۴۱۲ھ بمطابق ۱۳ نومبر ۱۹۹۱ء

بروز چہارشنبہ بوقتِ صبح جلال آباد

محبت وشفقت کا خطاب:

جوان اولاد بوڑھے باپ پر رحم نہیں کرتی بلکہ اولاد اُلٹی اپنے پر رحم کرانا چاہ رہی ہے بزبانِ حال کہہ رہی ہے کہ میں اُلٹی جو چاہوں کروں جو چاہو کہوں جہاں چاہے جاؤں مگر مجھ پر رحم کھاؤ یعنی مجھ سے کچھ نہ کہو آزاد اور مخلی بالطبع رہنے دو، تو آپ حضرات بھی اپنے شوق میں نہ آیئے کہ اُلٹے شوق میں تشریف لے آتے ہیں اور بیچارے بوڑھے باپ مجازی پر اپنے شوق میں شفقت کا نام ہی نہیں رکھتے، چلو بڑے میاں کے پاس خیر ٹھیک ہے بہت اچھا ہے۔ بھائی! میرا بھی کچھ وقت آپ حضرات کے ساتھ گذر جاتا ہے۔ آپ حضرات کی تشریف آوری کے شوق کو دیکھ کر۔

ایک خط:

ایک صاحب کا خط آیا ہے فیروز آباد ضلع آگرہ سے اس کا جواب لکھا ہے میں

نے، پہلے وہ سُنا دوں کہ یہاں تشریف آوری پر بندہ کی طرف سے کیا کرتے ہیں۔ خط لکھنے والے تحریر فرماتے ہیں :

احقر کا حضرت والا سے بذریعہ مکاتبت اصلاحی تعلق ہے، اب حضرت والا ملاقات کے لئے دل ازحد بے چین ہے، آمد و رفت کا اور زمانۂ قیام کا بفراخی انتظام ہے، گھر میں بھی کسی قسم کی کوئی دشواری احقر کے یہاں سے جانے میں نہیں۔ اس لئے احقر حضرت والا کی زیارت کا متمنی ہے بغرض اصلاح فقط ملنے ہی کو طبیعت چاہ رہی ہے اور ایک ہفتہ کے لئے حاضری کی اجازت کا خواہاں ہے۔ یہ مضمون ہے اب اس کا جواب سنیے!

جواب بزمانہ شناسی :

مکرم! زیدمجدہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کی مخلصانہ محبت اور عظمتِ شریعت بشرفِ صالحات' تزکیہ کا شوق' مبارک سفر کا سکون، اور متعلقین کے حقوق کہ ان کو پیچھے انتظام قیام وطعام اور بچوں کی طرف سے اطمینان اور رات کو گھر سونے کے لئے مردِ محرم دیانت دار، دیانتدار کی بھی قید لگا دی ہے میں نے! محرم ہے پردہ تو ہے ہی نہیں مگر چونکہ واقعات بہت اُلجھے ہوئے میرے سامنے آچکے ہیں، اگر بتا دیئے جائیں تو آپ حضرات کو اس چودھویں لئے پندرھویں صدی میں سُن کر بڑا تعجب ہوگا۔

محرم سے پردہ نہ ہو تب بھی احتیاطاً پردہ سا رکھا جائے :

اس سے اندازہ فرمایئے گا کہ اب محرم کا بھی محرم سے گو وہ پردہ نہ ہو مگر پھر بھی ڈھکا چھپا رہنا چاہیے۔ کوئی زبانی آکر گھر والا کہتا ہے تو کوئی لکھ کر بھیجتا ہے کہ

ہندوستان میں بھی اور غیرِ ہندوستان بھی کہ حقیقی بھائی حقیقی بہن سے مل گیا حقیقی باپ حقیقی بیٹی سے مل گیا، حقیقی داماد اپنی حقیقی ساس سے مل گیا، یہ سب محرم ہیں تو جب سے اس احقر کو اس قسم کی اطلاعات پہنچی ہیں تو یہ قید لگا دیتا ہوں "محرم دیانت دار۔

غیر محرم رشتوں میں تو احتیاط اور زیادہ ضروری ہے :

تو اس سے اندازہ کیجیے گا پھوپھی زاد بہن بھائی، ماموں زاد بہن بھائی، خالہ زاد بہن بھائی وغیرہ جن سے نکاح درست ہے تو ان سبھی سے احتیاط کیساتھ زندگی میں لازم ہے : اللھم احفظنا۔ اور رات کو گھر سونے کے لئے مردِ محرم دیانت دار ہو اور سارے متعلقات کا ہی سب انتظام ہو، دوکان کر رہا ہے، تجارت کر رہا ہے، کھیتی کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ، اپنی غیر موجودگی کا پورا پورا انتظام ہو تب سفر ہو۔

قیامِ خانقاہ کے شرائط و اُصول :

اور یہاں آکر کلام میں سکوت ہے کسی سے بات نہیں ملنا نہیں، اور دل میں سکون کہ دل میں کچھ سوچ نہیں، اللہ تعالیٰ احقر کو صحیح خدمت کی بخلوص کرنے کی توفیق سے نوازیں۔ (آمین)

یہ ہیں مکرمانِ بندہ! تشریف آوری کی شرطیں، اور تشریف رکھنے پر شرطیں اس طرح کوئی آسکتا ہے تو آئے اور رہ سکتا ہے تو رہے ورنہ نہ آئے اور نہ رہے۔

کام سے پہلے اس کے موضوع اور غرض و غایت پر نظر :

ہر کام کا ہر عمل کا ایک موضوع ہوتا ہے، اور اس موضوع کے تحت غرض ہوتی ہے جیسا کہ آپ صاحبان نے پڑھا ہوگا کہ علمِ صرف کا موضوع کچھ اور نحو کا موضوع

کچھ، منطق کا کچھ اور فلسفہ کا کچھ اور، تو ہر چیز کا ایک موضوع ہوتا ہے اسی اعتبار سے اس کی تعریف بھی ہوتی ہے اسی اعتبار سے اسکی کچھ غرض ہوتی ہے، تو کسی شے کی حد، کسی شے کا موضوع اسی شے کی غرض و غایت معلوم کرنا ضروری ہے۔ ان باتوں کو سمجھ کر، سوچ کر اہلِ عقل، اہلِ فکر، اہلِ دانش اُس کام کا اقدام کرتے ہیں اُس کام کے لئے اُٹھاتے ہیں۔

صدق واخلاص کیساتھ کام پر اقدام ہو :

اور دینی لحاظ سے ہر شے پر کامل اِخلاص کے ساتھ نیت رضائے الٰہی کے سوا اور دوسری ہے ہی نہیں، اور پوری صدق کی نیت کے ساتھ کہ اس شے کو ہمیں درجۂ کامل پر حاصل کرنا ہے یہ اس کا صدق ہے جب شروع کرنے سے پہلے یہ استحضار ہو گیا، حدی طور، موضوعی طور، غایتی طور اخلاص کے طور، تو یہ سب موضوع کے مقدمات ہیں۔

عدمِ استحضار سے خلافِ موضوع اور نفاق کا صدور :

پھر اقدام کے بعد اقدام کے ساتھ اس کے خلاف کیسا؟ اس لئے کہ اس کے خلاف اقدام تو منافقت ہے مقید خلافِ مقید ہو گیا پھر خلافِ اقدام کیا، اور آ کر مخلّی بالطبع ہو گیا۔ چلا تھا مقید بالطبع ہو کر اور آ کر ہو گیا مخلّی بالطبع۔ موضوع سے نکل گیا حد سے تجاوز ہو گیا تو یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور وہاں رضائے الٰہی کی نیت، پھر یہاں پر یہ کیا کہا کہ پیر صاحب کو کیا خبر، شیخ کو کیا خبر۔

قصد اور نیت ہو جانا اللہ تعالیٰ سے عہد ہو جانا ہے :

لیکن جو چلا تھا بنیت رضائے الٰہی، اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے، ان کے تو علم

میں ہے یہ تیرا استحضار جاتا رہا وہ جو اقدام شروع ہو رہا تھا کس لئے تھا کیا نیت تھی، بایں لحاظ تو اللہ تعالیٰ سے عہد تھا اس وقت تو پیر جی سامنے نہیں تھے وہ اللہ تعالیٰ سے عہد تھا قلبی عہد اللہ تعالیٰ سے ہو کر اللہ تعالیٰ سے بیعت تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان الذین یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم ۔وہ جو بیعت ہوئی تھی عالمِ میثاق میں اور اس کا پھر خلاصہ ظاہر کر دیا تھا اس کلام الٰہی میں چنانچہ ارشاد فرمادیا: ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ تو دراصل بیعت اللہ تعالیٰ سے ہوئی بس اب نمونہ ہے عالمِ شہود میں اس عالم غیب کا کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے اصلی بیعت کو بواسطہ مذکر یاد بھی دلا دیا۔تو جب چلا تھا پیر جی کہاں سامنے تھے؟ مگر اللہ تعالیٰ تو تھے۔

سالک کے لئے لمحہ فکریہ اور ایفائے عہد:

تو بیعت اور معاہدہ اللہ تعالیٰ سے ہو گیا تھا اس کا استحضار اس صاحب السلوک کو زندگی بھر موت تک لازم ہو گیا اس کے خلاف میں منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟ ایمان میں اس اعتقادِ عہد میں منافقتِ عملی آ گئی، شرک فی العہد ہو گیا اور جس راہ میں قدم اُٹھایا تھا اس میں یہ شرک فی السلوک، شرک فی الطریقت ہو گیا، ایمان کا اجمالی جو عہد ہوا تھا اس میں احکام پر عمل کرنے کے لئے بھی عہد آ گیا تھا، اور سب سے پہلے اقیموا الصلوٰۃ سے ندا آئی اذّوا الصلوٰۃ نہیں کہا۔

اقیموا الصلوٰۃ کے معنی:

اقیموا الصلوٰۃ کہا، اس اقامت الصلوٰۃ کے لفظِ اقامت میں ساری چیزیں نماز کی متعلق بالظاہر اور متعلق بالباطن آگئیں من حیث الاوقات، من حیث الرّکعات،

من حیث الارکان، من حیث الشرائط، من حیث الخشوع والخضوع اقیموا الصلوٰۃ میں سب آ گیا۔

یہ ترکِ صلوٰۃ مشرکوں کا کام ہے تمہارا کام نہیں ہے، تم تو مؤمن ہو کیا لفظ شرک ومشرکین کا اپنے لئے عنوان گوارا کرتے ہو؟ کیا یہ خلافِ غیرت نہیں ہے؟ یہ تو مشابہت مشرکین کے ساتھ ہوگئی، اس کی شرح حضور اکرم ﷺ نے فرمائی ہے: ''من تشبہ بقوم فھو منھم'' تو یہ ترکِ صلوٰۃ مؤمن کی طرف سے مشابہت مشرکوں سے ہوگئی۔ لہٰذا مؤمن ترکِ صلوٰۃ کر کے ایفائے عہد نہ کرنے والا فھو منھم ہوا، اُنہیں میں سے ہو گیا اور اس ایفائے عہد کا حکم اور اعلان آ چکا ہے۔

ایفائے عہد ایمان کا تقاضا ہے:

یٰاَیھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود، اے ایمان والو! اس ایمان کا منشاء ایفائے عہد ہونا چاہیے تم نے عقد کیا ہے ایمان لا کر تو تمہاری زندگی کے سارے جزئیات وافر ہوں گے اور جزئیات کا میں تم کو علم دے رہا ہوں کہ ایمان کے یہ اجزاء ہیں جس کو اسلام کہتے ہیں گویا کہ ایمان، اسلام دونوں میں تساوی کی نسبت ہے۔

گویا کہ اسلام، ایمان جو تصدیقِ قلبی کا نام ہے اس کے لئے شاہد ہے کہ بلا شہادت کے کوئی دعویٰ قبول نہیں ہوتا جس درجہ کی شہادت میں تفریق ہوگی، کبھی فعلِ شرک ہوگا، یہ عمل شاہد شہادت ہے اس باطنِ ایمان کا۔

ترکِ عمل ظلم ہے اور ظلم پر سزا ہے:

ورنہ پھر مؤمن کو سزا کیوں دی جاتی؟ ان اعمال کے ترک پر ظلم قرار دے کر

سزا کیوں مقرر کی گئی گو عینِ شرک کی سزا نہ سہی۔ ظلمِ مجرم کا جیسا ویسی حد یعنی سزا کبھی تعزیر کے طور پر ہوتی ہے کبھی حد کے طور پر ہوتی ہے، کبھی جسمانی ہوتی ہے کبھی مالی ہوتی ہے۔ بحالتِ حیض زوجہ سے مقاربت حرام ہے لیکن ابتدائے حالتِ حیض قریب ہونے کی سزا اور ہے اور بحالتِ انتہائے حیض قریب ہونے کی سزا اور ہے۔ تو جیسا جرم اسی اعتبار سے وہ مجرم، اسی لحاظ سے وہ سزا، تو مانا کہ عینِ شرک نہیں ہے لیکن درجہ بدرجہ ہونے کی حیثیت سے شرک تو آ گیا نفاق تو آ گیا اسی اعتبار سے سزا۔ تو یہ سزا کیوں بیان کی؟ تصدیقِ قلبی تو ہے؟ ایمان تو ہے؟ جو اجزائے ایمانیہ ہیں وہ موجود ہیں۔ اجزائے ایمانیہ تو ہیں لیکن اس کے جو جزئیات ہیں وہ تو پورے نہیں اور جب پورے نہیں تو نقص ہے اور جیسا نقص ہوگا جو کہ جرم ہے اسی اعتبار سے سزا ہے۔

عقدِ نکاح عقدِ ایمان کی نظیر ہے:

یٰاَیھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود، آمنوا کے بعد ایفائے عقود کا مطالبہ فرمایا ہے تو یہ عقد ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان کے ضمن میں بہت سے عقود قبول کئے ہیں ان کے پورا کرنے کا مطالبہ ہو رہا ہے نظیر کے طور پر حضرت والا نے بیان فرمایا ہے وعظوں میں کہ شادی ہوگئی اور بیوی آ گئی عقد ہو گیا۔ اب میاں بیوی کی ضروریات کا خیال نہیں رکھتے، وہ بیچاری کبھی کچھ کہتی ہے یہ چیز نہیں ہے وہ چیز نہیں ہے اس کی ضرورت ہے اس کو لانا چاہیے، میرے پاس کپڑے، میرے پاس رہنے کا ٹھیک مکان ٹھیک قسم کے کھانے پینے کی چیزیں درکار ہیں۔ آپ نے تو معلوم کر لیا تھا کہ کس گھر کی ہوں کس کنبہ کی ہوں غریب گھر کی ہوں امیر گھر کی ہوں کس شریف خاندان کی ہوں وغیرہ وغیرہ، یہ سب آپ نے معلوم کر لیا تھا مجھے کپڑا، مجھے کھانا، مجھے اپنا رہنے کو مکان

چاہیے، اور میاں کہہ رہے ہیں اللہ کی بندی کیسی باتیں کرتی ہے وہ تو قاضی جی آئے تھے، انھوں نے یوں کہا تھا کہ تمہارا نکاح فلاں لڑکی جو فلاں کی ہے بعوض مہر اتنا تمہارے نکاح میں دی، تم نے قبول کی؟ میں نے کہا قبول کی۔ اس نے تو نہ مکان کا نام لیا نہ کھانے کا نام لیا نہ پینے کا نام لیا، نہ رہنے سہنے کا نہ کپڑے کا پھر کیسی باتیں کر رہی ہو جاہلانہ پاگلانہ۔ اوہو آپ مجھے پاگل کہہ رہے ہیں میں ادب سے کہہ رہی ہوں کہیں خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ آپ باہر جا کر فرمادیں کہ بیوی یوں یوں کہہ رہی تھی تو کہیں آپ کے دوست یوں نہ کہیں کہ وہ پاگل یا آپ پاگل؟

جب آپ نے قاضی جی کے کہنے پر اس کے ایجاب پر قبول فرمالیا تھا تو اس کہنے ہی سے کھانا' پینا' رہنا' سہنا' کپڑے یہ سب چیزیں ذمہ ہوگئیں آپ کے۔ چونکہ جب قاضی صاحب نے کہا تھا کہ آپ کے نکاح میں فلاں لڑکی فلاں کی بعوضِ مہر نکاح میں دی تم نے قبول کیا؟ تو تم نے کہا تھا کہ ہاں میں نے قبول کیا اس میں سب ذمہ داریاں داخل تھیں۔ تو اس قبولِ امراۃ میں اس کے جو جزئیاتِ زندگی ہیں وہ تمام تمہارے ذمہ آگئے۔

جوانوں کے لئے انتباہ:

ابھی جوان بچے ہو، شباب ہے اس میں قوتِ غضبیہ بھڑک رہی ہے، قوتِ شہوانیہ چل رہی ہے، قوتِ عقلیہ بلا حکمت ہے، جوان تو ہو لیکن جب گھر چلے تھے جو عرض کیا جاچکا ہے! بازار بایمان ہو کر چلے تھے تو جوان بے زار ہو کر نہیں چلے قوتِ شہویہ لیکر نہیں ہم جب چلے تھے اس کو تو مٹانے کے لئے چلے تھے قوتِ غضبیہ تھی مگر چلے تھے تو قوتِ غضبیہ کو مغلوب کرنے کے لئے، جب چلے تھے تو قوتِ عقلیہ کے جذبات کو چھوڑ

کر چلے تھے افراطِ عقل کو چھوڑ کر چلے تھے۔ جب اس نیت کیساتھ چلے تھے تو اس محل پر جا کر اس کا جو موضوع ہے اس طرح پر قیام، اس طرح پر رہائش کہ جو اس کے اجزاء ہیں اعمالِ صالحہ ظاہرہ و اعمالِ صالحہ باطنہ ان کا استحضار و اہتمام پورا پورا ہو، قلب میں دوسرے کی محبت کی اس طرح کہاں گنجائش جو عہد کیا تھا رضائے الٰہی کے ساتھ نکلنے میں پھر اس کے خلاف غیر کی محبت کا اثر و آثار کیسے؟

یہ ہے عدمِ اختلاط یہ کون کہتا ہے کہ تم بیوی سے نکاح مت کرو، یہ کون کہتا ہے کہ بچے نہ ہوں، نکاح تو احکام میں سے ہے۔ جب مانعِ ازدواجی نہ ہوں کہ نہ قوتِ جسمیہ ہے، نہ قوتِ مالیہ ہے نہ طبیعت میں قوتِ غضبیہ کا اعتدال ہے تو مانع موجود ہے نکاح کرنا درست نہیں۔

نکاح کے لئے ایک مانعِ شرعی :

قوتِ مالیہ بھی ہے، قوتِ جسمانیہ بھی ہے مگر قوتِ غضبیہ افراطی ہے تب بھی اس جوان کو نکاح کرنے کی اجازت نہیں، کٹنے پٹنے کیلئے نہیں آرہی مار کھانے کے لئے نہیں آرہی، گالی سننے کے لئے نہیں آرہی ہاں کوئی غایت درجہ کی کچھ بے حیائی کی چیز سامنے آجائے اور باوجود فہمائش کے باز نہ آئے تو اور بات ہے تنبیہ کرنا درست ہوگا۔

شوہر کو باحوصلہ باظرف ہونا چاہیے :

لیکن اگر تجھ میں حوصلہ ہے تو سب کچھ سُن لے اس کے باوجود بھی رہنے دے کیا تجھ سے کبھی ایسی غلطی نہیں ہوئی؟

اے بیوی والو! سمجھ لو اچھی طرح سے۔ وبا پھیل رہی ہے طلاق کی مارنے کی،

آج ہی شادی ہوئی پہلی رات اور طلاق ۔کیا ان باتوں کے سننے کی ضرورت نہیں ہے مؤمنوں کو اور خاص کر مولویوں کو اور خاص کر مولویوں کو اور بھی زیادہ ضرورت ہے ان باتوں کے سننے کی ،دل میں رکھنے کی جمانے کی ،اور اس طرح سے طبیعت کے ہوجانے کی وقت پر اس کے مطابق عمل ۔تو اگر ایسا بھی ہے خدانخوستہ تو حوصلہ سے کام لے ابھی ڈھکی چھپی ہے اور جب طلاق دیدی آپ سے پوچھے گا کہ کیوں دیدی ، اسکی ماں کہے گی کہ کیوں دیدی ۔اس کی سہیلیاں کہیں گی کہ فلاں عورت کو کیوں طلاق ہوگئی ۔تو مخلوق کے سامنے اس کی توہین ہوئی ، تذلیل ہوئی ، رشتہ داریوں میں تفریق پیدا ہوگئی ، عداوتیں آگئیں ذرا عالی حوصلہ بن ، عالی ظرف بن ۔

بیوی سے برتاؤ میں خوفِ خدا :

کم ظرفی کا ثبوت مت دے ،سوچ لے ! مجھ سے بھی کبھی کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی نہیں ؟ شاید کہ کوئی ایسا ہو کہ نہ ہوئی ہو اور خاص کر اس زمانہ میں ۔اگر اب تک نہیں بھی ہوئی تو کیا اندیشہ واحتمال نہیں ہے کہ کہیں زندگی میں کبھی ایسا ہو جائے مجھ سے مگر کون سُنے ! کیا ایسا نہیں ہوگا کیا ایسا احتمال نہیں ہے ، یا ایسا اندیشہ نہیں ہے ؟ اور وہ ممکن ہے پکی سچی توبہ کر کے اخیر وقت تک ولی بنی رہے اور تیرے اندر شرک آجائے عفت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ شرک آجائے اور وہ پکی توبہ کر کے کہیں ایسا نہ ہو کہ ولایت آجائے ۔اس کو ولایت حاصل ہوجائے ۔

عبرت ناک واقعہ :

ایک رئیس صاحب مال و دولت صاحبِ جاگیر و جائداد کھانا کھا رہا ہے بیوی کیساتھ ۔ایک سائل آگیا ، سائل نے سوال کیا آیت ہے واما السائل فلا تنھر وہ

رئیس صاحب بگڑ گئے جتنا تیز بیچارے کو اپنی رعایا پر ہونا چاہیے تھا اس پر بھی تیز ہو گئے اس سائل کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگا۔ بے حیا بے غیرت ہو گئے، ہاتھ پاؤں اچھے خاصے کمایا نہیں جاتا کھایا نہیں جاتا وغیرہ وغیرہ۔ بیوی نے کہا کہ آپ رحم نہیں کرتے، بیوی نے کہا میں دے آؤں کچھ تو رحم کرو؟ نہیں نہیں پکڑ لی وہ چلا گیا۔ ادھر قہر نازل ہونا شروع ہو گیا، یہاں لا تنهر کے خلاف ہوا یعنی لا تنهر ہوا وہاں سے قہر ہوا، نقدی ختم، جاگیر ختم، جائیداد ختم، فقر و فاقہ کی نوبت، چونکہ فقیر کو ڈانٹا فقر کی نوبت آ گئی، میاں نے کہا بیوی اب ایسی حالت میں میں تجھے کیا رکھوں، میں طلاق دیدوں، بیوی نے کہا یہ تو آپ کی خوشی کی بات ہے میں تو نہیں چاہ رہی طلاق دے دی، عدت گذار کر اس نے شادی دوسری جگہ کر لی۔ وہ بھی رئیس تھا بلا مرغے کے بلا مرغ پلاؤ کے بات نہیں کرتا۔ ایسا رئیس تو ایک دن دوسرا میاں اس بیوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرغ پلاؤ کھا رہے ہیں اتنے میں سائل آ گیا۔ سائل نے دروازے پر آ کر سوال کیا عاجزی انکساری کے ساتھ، بیوی نے کہا بیچارہ سائل سوال کر رہا ہے، میاں نے کہا کہ میں بھی یہی خیال کرتا ہوں یہ تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ سائل بیچارہ ہمارے دروازے پر آئے اور ہم مرغ پلاؤ کھائیں اور اس کو ہم یوں ہی خالی لوٹا دیں۔ دینا چاہیے۔ رقابی میں پلاؤ لیکر اس کو دیدو، تو اُٹھی اور رکابی میں مرغ پلاؤ نکال کر دروازہ پر گئی تو ذرا کیواڑ کی آڑ میں ہو کر کہا لو! تو سائل نے جو ہاتھ بڑھایا اور چہرہ پر جو نگاہ پڑی اس عورت کی تو حیران ہو کر رہ گئی۔ پسینہ آ گیا رونے لگی اور اس کو حوالہ کر کے کہ وہ چلا گیا اب کھڑی رو رہی ہے آنکھوں سے آنسو کہ میاں پوچھے گا تو کیا ہو گا پونچھ رہی ہے اب اس کو فکر ہوئی کہ دیر ہوئی تو میاں کو کہیں وہم نہ ہو جائے کہ اتنی دیر کیوں لگی، کہیں فقیر سے باتیں کرنے لگی

یہ دیر کیوں لگی۔ پونچھ پانچھ کر آئی چپ بیٹھ گئی، میاں نے دیکھ لیا، یہ چپکی چپکی ہوئی آئی ہے طبیعت ذرا الجھی ہوئی ہے، پانی سا بھی کچھ آنکھوں میں ہے، پوچھا کیا بات ہے، کیا فقیر نے کچھ تجھ کو چھیڑا تھا کچھ کہا تھا جلدی بتا؟ تا کہ اس کی خبر لوں کیونکہ وہ تو رئیس ہے بیوی نے کہا کچھ نہیں، شوہر نے کہا اب بھی رونے کی شکل ہے بتانا کیا بات ہے؟ بیوی نے روتے ہوئے کہا کہ میاں! یہ جو سائل آپ کے دروازہ پر آیا یہ پہلا میرا میاں تھا۔

کبھی جلدی ہی ایسا ہو جاتا ہے حق تعالیٰ کی طرف سے کہ جیسا جرم جیسا ظلم ویسی ہی سزا اللّٰھم احفظنا۔ ڈرنے کی بات ہے۔ وہ جو سائل تھا میاں! وہ پہلا میرا میاں تھا تو جس طرح سے اب آپ کے ساتھ مرغ پلاؤ ہوتا ہے کھانا ایسے ہی اسکے ساتھ بھی ہوتا تھا لیکن ایک سائل آیا تھا اسکو ڈانٹ دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا جو میں نے دیکھا۔ یہ وہ پہلا میاں تھا کہ مرغ پلاؤ سے بات کرتا تھا اور آج سائل ہے۔

میاں نے کہا سُن! وہ سائل جو تھا وہ میں ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آخری زندگی ایسی دیدی کہ میں اس کی جاگیر و جائداد کو خریدتا رہا اور اس کی بیوی بھی میرے پاس پہنچادی اللہ تعالیٰ نے۔

اِصلاح کا حاصل ومنتہا :

چاہے وہ دولتِ ایمانی ہو بڑے تقویٰ کے ساتھ ظاہراً و باطناً، چاہے دولتِ اموالی دنیوی ہو افراط کے ساتھ مگر دونوں کو کبھی کسی وقت بھی اپنے اندر تعلّی اور دوسرے کو بنظرِ تحقیر دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اپنی اُخروی حیثیت سے کتنا ہی دولت مند ہے اور دُنیاوی حیثیت سے کتنا ہی سرمایہ دار دولتمند ہے اور دوسرا اُخروی حیثیت سے کتنا بھی غریب ہو یا دُنیاوی حیثیت سے کتنے ہی مفلِس ہو وہ اچھا ہے اور تو بُرا ہے

اس لئے کہ یہ انتہائی درجہ کا گناہ ہے۔ یہ انتہائی درجہ کا اپنے پرنظرِ تعلّی کا انتہائی درجہ کا گناہ ہےاس کے گناہ سے بدتر گناہ ہے۔ یہ منتہاء ہے اصلاح کا اگر یہ نہیں تو پھر اصلاح کا نام ونشان بھی نہیں۔ اصلاح کا کام نہیں تو پھر نام ونشان کہاں؟ صورتاً ہے حقیقتاً نہیں، دوسرا کہہ دے گا کہ تو صالح ہے لیکن اللہ تعالیٰ نہیں کہیں گے کہ تم صالح ہو اور عنداللہ تعالیٰ کا اعتبار ہے نہ کہ عندالناس کا، پیشی وہاں ہوگی نہ کہ پیشی یہاں ہوگی یہ منتہا ہے۔

نبوّت وطلبِ مسکینیت :

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے فرمایا : ''اللّٰھم احینی مسکینا و امتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاکساری کی درخواست کررہے ہیں۔ مسکین کے معنی خاکساری والا، انسان خاک سے پیدا ہوا۔ یہ رنگ آنا چاہیے چونکہ ہر چیز کے لئے ایک موضوع ہوتا ہے تو انسان کا موضوع اصل عبدیت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:'' وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون '' اصل موضوع اس تخلیقِ انسان کا ہوا؟ مخلّی بالطبع ہونا یا مقید بالطبع ہونا؟ تو تیرا ہر کام من حیث العبادت ہونا چاہیے ظاہری اعمال میں بھی اور باطنی اعمال واخلاقِ حمیدہ کے رسوخ وملکہ کیساتھ یہی موضوع ہے یا کچھ اور موضوع ہے اس کا؟ جسم سے بھی ٹپکے مسکینیت رفتار میں بھی تو وہ شہادت ہے باطن کی، حضور ﷺ نے یہ سب کر کے بھی کھادیا کہ کس طرح چلا کرتے تھے اور کس طرح بیٹھا کرتے تھے اور کس طرح کھایا کرتے تھے مثلِ غلام حدیث میں ہے: آکل کما یاکل العبد، رفتار میں، گفتار میں بھی تکبر کی کیفیت نہ تھی دعاء کررہے ہیں : '' اللّٰھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا و

احشرنی فی زمرۃ المساکین ''اے اللہ مجھے خاکسار بنا کر زندہ رکھیے اور خاکساری ہی کی حالت میں موت دیجیے اور خاکساروں ہی میں میرا حشر کیجیے۔ چلتے ہیں تو کبھی آگے ہو جاتے ہیں کبھی پیچھے ہو جاتے ہیں کبھی بیچ ہو جاتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اس باطنی طلب وچاہت کے ساتھ ذرخواست کے ساتھ یوں بھی درخواست کر رہے ہیں، اے اللہ مجھ کو مسلمان تابعدار بنا کر زندہ رکھئے گا اور تابعداری کی حالت میں مجھ کو موت دیجیے گا۔

میری مسکینیت اور وہ میری خاکساریت میرے اعمال سے ظاہر ہو کہ کمالِ اطاعت میں اخیر دم تک لگا رہنا ہو۔ حضور اکرم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے حق تعالیٰ فرما رہے ہیں: '' واعبد ربك حتی یاتیك الیقین ''یوں نہیں فرمایا: '' صلّ ربك حتی یاتیك الیقین ''نماز پڑھتے رہو، اے رسول ﷺ! حضور اکرم ﷺ کو خطاب ہو رہا ہے اپنے رب کی نماز پڑھتے رہو موت کے آنے تک، یہ کہا؟ نہیں بلکہ ''واعبد ''فرمایا یہاں '' واتبع '' کا لفظ بھی نہیں ہے اطاعت واتباع کرتے رہئے ''واطع '' کا لفظ بھی نہیں ہے ایک جامع لفظ بول دیا جو پوری طاعتوں کو شامل ہے۔

واعبد میں عبدیّت، مسکینیّت اسلامیّت تامہ موجود ہے:

''واعبد'' جس میں عبدیت رکھی ہوئی ہے جس میں مسکینیت رکھی ہوئی ہے جس میں اسلامیتِ تامہ رکھی ہوئی ہے، اے اللہ میں آپ کے احکامِ ظاہرہ و باطنہ پر پوری گردن جھکائے رکھوں، اسلام کے معنی کیا ہیں؟ روٹی کھانا سو جانا بس؟ بلکہ گردن نہادن بطاعت۔ اسی سے مسلم ہے۔ اسی کی درخواست حق تعالیٰ سے کر رہے ہیں، رسول اکرم ﷺ کہ جو میں نے کہا اس کو اب یہاں کہہ رہا ہوں۔ تم نے مسکینیت لے

لی، کمالِ صدق جس کو شروع میں احقر نے عرض کیا تھا کمالِ صدق و اخلاص۔ وہاں پر تو اخلاص آ گیا اندر مسکینیت اور یہاں شہادت آ گئی۔ اسلامیت اور اس کا ظہور، صرف مسکینیت کے الفاظ کہنے سے کام نہیں چلتا بلکہ اس کی شہادت مسلم ہو کر دو یعنی پوری پوری آخرِ حیات تک جو جو جس جس موقع پر احکام کے نزول کے احسن طرق ہوں ان کو بجالاتا رہنا اور کون کہہ رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے محبوب محمد رسول اللہ ﷺ کہ جن کی خاطر سے بالائی و تحتانی پورا عالم پیدا فرمایا جن کی خاطر لولاک لما خلقت الافلاک کہ اگر مجھ کو تمہارا پیدا کرنا منظور نہ ہوتا تو ہر گز عالم پیدا نہ کرتا، یہ سب آپ کی خاطر سے پیدا کیا، سارا جہاں آپکا، نور تقسیم کیا آپ کا اوّل ما خلق اللّٰہ نوری اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا پھر تقسیم ہوا۔

کیا ہمارے حضرات رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ کے نور ہونے کا انکار کیا ہے۔ یہ دوسری جماعت نے انتہائی درجہ کی تہمت لگائی ہے۔ ایک حیثیت سے آپ ﷺ نور ہیں تو دوسری حیثیت سے آپ ﷺ بشر ہیں "انما انا بشر مثلکم" ہاں! امتیاز و فرق دوسرے انسانوں سے یہ ہے کہ آپ صاحبِ وحی اور صاحبِ نبوّت ہیں۔

حضور ﷺ نے خود فرما دیا اور انما کیساتھ جو کہ حصر کے لئے آتا ہے میں تو تم جیسا ہی بشر ہوں، کتنی عاجزی ہے اپنے کو دوسروں میں شامل کر دیا!

اصل چیز دل میں عاجزی و مسکینیّت ہے:

اصل چیز ہے اندر مسکینیتِ خاکساریتِ حقیقی پیدا کرنی ہے، اس کی درخواست حضور اکرم ﷺ کر رہے ہیں اور اسکی شہادت دیتے رہے ہیں آپ ﷺ موت کے وقت تک اسلامیت۔ ایمان ایک دعویٰ ہے جو کہ اندر ہے اور شہادت وہ اس کی

اسلامیت ہے اور جتنی تفریق وفرق ہے اسی اعتبار سے ایمان میں بھی فرق ہے۔ فرما رہے ہیں: اللّٰھم انی اسئلك تمام الوضوء وتمام الصلوٰۃ و تمام رضوانك و تمام مغفرتك۔ اے اللہ! میں آپ سے وضؤ کامل کا سوال کرتا ہوں کہ جب میں وضو کروں تو بدرجۂ کامل کرو۔ کمالِ وضوطہارت ہے، جو کہ شرط ہے صلوٰۃ کی نہ کہ اصل رکن تو اس شرط کی بھی جو کہ اسبابِ شرطیہ میں سے ہے اس کے لئے بھی حضور ﷺ درخواست کر رہے ہیں کہ اے اللہ وضو بھی کامل درجہ کا ہو ناقص درجہ کا نہ ہو۔

ایمان میں درجۂ کمال مطلوب ہے :

معلوم ہوا کہ ہر چیز میں درجۂ کمال مطلوب ہے تو ایمان میں بھی درجۂ کمال اور وہ بدونِ طاعتِ کاملہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ تو پھر ناقص پر صبر وقناعت کیسی؟ رہی معزوری، کمزوری، وہ تو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، وہ تو پہلے ہی سے استثناء کر دیا۔ یار دوست سے تو گھنٹے گھنٹے باتیں کر لے اور بیٹھا باتیں کرتا رہے اور نماز کے لئے کمزوری یہ ہے نماز کی اہمیت، گو اس کہنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے، معلوم ہوا کہ ہر چیز میں درجۂ کمال مطلوب ہے، اور وہ درجہ اخلاص کے ساتھ صدق کا درجہ جو احقر نے شروع میں عرض کیا تھا۔ حضور ﷺ صدق کی درخواست کر رہے ہیں کہ وضوءِ کامل جو اس کا مقام ہے اور درجہ ہے اس کی رُکنیت وفرض کا اس کے درجۂ سُنیت کا اس کے درجۂ استحباب کا خیال کیا جائے گا تو وضوءِ کامل ہوگا۔ اور حضور ﷺ نے کیا درخواست کی ہے؟ تو اُمت کو کیا درخواست کرکے اور کس طرح ہونا چاہیے، اُمتِ مسلمہ چوں کہ اُمت مؤنث ہے اس لئے مسلمۃ اس کی صفت مؤنث ہے تو مسلم نماز کے لئے جو وضو کر رہا ہے اسلام کی اس عملی حیثیت سے جو ایمان اندر رکھا ہوا ہے، اس کا تقاضا اس

عملِ اسلامی، ظہورِ شہادتِ ایمانی کامل یا ناقص؟ سوچ لو!

اسباب وآلات کا اثر مقصود پڑتا ہے :

اب جیسا آلہ ہوگا ویسا ہی جو مقصود اور اعلیٰ ہے وہ ہوگا ورنہ تو جیسا مقدمہ کمزور ادنیٰ ایسے ہی کامیابی بھی کمزور، مقدمہ یعنی جس چیز کے پہلے جو چیزیں ضروری ہوتی ہیں کرنے کی جیسے وضو ہوگا ویسے ہی نماز بھی ہوگی۔ اس لئے بھی یا اس لئے امام کے پیچھے کھڑا کون ہو؟ کہیں اس کا اثر امام پر نہ پڑ جائے یہ تعلیم ہو رہی ہے۔ یہ نہیں کہ جو چاہے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہونے والے رعایت بھی نہیں کرتے سب سے پہلے ہی آ کر بیٹھ گیا امام کے پیچھے، پہلے کوئی بیچارا پیچھے بیٹھ جایا کرتا تھا اور بچوں کے بھی پیچھے بیٹھ جایا کرتا تھا اب کسی کو شوق ہو گیا اس کی جگہ وہ بیٹھ گئے، اب جب میں پہنچا دیکھا کہ وہ تو کوئی صاحب بیٹھے ہیں اس دن سے وہ جگہ چھوڑ دی خاموشی کے ساتھ، جہاں جگہ مل گئی وہاں جا کر بیٹھ گئے اور اسی پر عمل کرتا رہا۔

درخواستِ مسکینیت تو بہت آسان ہے لیکن اس کی شہادت مسلّم ہو کر بہت مشکل ہے، اس لئے حضور اکرم ﷺ درخواست کر رہے ہیں کہ مسکین کہا ہے میں نے، میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں مسلّم ہونے کی، تو حق تعالیٰ نے بھی فرما دیا ہے اس موقع پر کہ آپ ﷺ کسی کے کہنے سُننے کا کچھ جو رنجیدگی کی بات ہوا کرتی ہے بشری تقاضے سے اس کی پرواہ نہ کیجیے، آپ ﷺ تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید میں لگ جایئے اللہ تعالیٰ جانیں وہ جانیں...... آپ تو میرے حکموں کی بجا آوری میں لگ جایئے اور سیدھی بات تو میں یوں کہتا ہوں: واعبد ربك حتى ياتيك اليقين اپنے رب کی عبادت میں لگ جایئے، کلام اللہ شریف کے کیا عجیب انوار ولطائف واعبد ربك

ہے یا واعبد اللّٰہ ھے ؟ واعبد ربک جس موقع کا لفظ جو حق تعالیٰ کی صفات میں سے آنا چاہیے وہی استعمال فرماتے ہیں حق تعالیٰ اپنے کلام شریف میں اختیار کرتے ہیں۔

حتّٰی یاتیك الیقین کی تفسیر :

یقین کے معنی یہاں موت کے ہیں کہ جس میں کسی کو بھی کلام نہیں افلاطون کو ہوا؟ ارسطو کو ہوا؟ لقمان کو ہوا؟ کسی اور چیز میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن موت میں کسی کا کلام نہیں، اس موت کو یقین کے لفظ سے تعبیر کیا ہے موت کو کہ جس میں کسی کا بھی کلام نہیں۔

افلاطون بیمار ہوگیا دستوں کی بیماری لگی۔ اور اِسہال کے مرض میں اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ بیماری لگا دی اور وہ دست بند نہیں ہوتے، شاگرد نے کہا کیا آپ کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو دست بند ہوں؟ افلاطون نے کہا مٹکا لاؤ اور پانی سے بھر دو۔ رکھ دیا بھر کر ایک چھوٹی سی پڑیا نکالی اور اس مٹکے کے اندر پانی میں ڈال دی اس نے کہا ڈھک دو اس کو، ڈھک دیا۔ کچھ دیر کے بعد کہا اسے کھولو! کھولا تو پانی جما ہوا تھا، شاگرد سے کہا دیکھا اتنی سی چٹکی تھی وہ جو مٹکے بھرے پانی میں ڈالی جس سے پانی جم گیا ایسی پڑیاں میں کئی کھا چکا ہوں لیکن جب اللہ تعالیٰ کے ہاں سے حکم یقینی اسی میں موت لکھی ہوئی آگئی ہے تو کون بند کرے گا۔

موت میں کسی کو شبہ نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے یقین کا لفظ فرمایا : ''واعبد ربك حتی یأتیك الیقین'' اے میرے حبیب! موت تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے۔ جو میرے احکام ہیں موت تک کرنے کے انھیں کرتے رہو اور ان کے خلاف سے پرہیز جس کو تقویٰ کہتے ہیں وہ رکھو۔ موت تک اس کی عبادت میں لگے

رہو، کوئی کچھ کہے کہنے دو، اس کی طرف التفات نہ فرمایئے گا۔

رنج وغم کا علاج :

تسبیح وتحمید میں لگو اور عبادت کرتے رہو، علاج بتلا دیا، ساری اُمتِ مسلمہ کو اگر کسی شخص کی طرف سے اپنے ہوں یا پرائے تمہارے خلاف ہوتا ہے وہ کچھ کہتا سُنتا رہتا ہے، تم دوسرے کام میں لگ جاؤ، دوسرے کام میں لگ جانے کی وجہ سے اس کی طرف سے بے التفاتی ہو جائے گی، اگر رنج وغم بالکل نہیں جائے گا تو کم تو ہو ہی جائے گا۔ ورنہ غم جان لے لے گا۔ تعلیم فرمادی عموماً ایک ایک جزئی کو کہاں سوچو گے تم ایسا نہ ہو کہیں صرف تسبیح ہی لیکر بیٹھ جاؤ۔

ہر شے کا ایک موضوع ہے :

تو احقر نے عرض کیا تھا کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور ایک غایت ہوتی ہے اور ایک اصل موضوع ہوتا ہے اس موضوع کی وضع سے ہٹنا یہ اپنے پر ظلم کرنا ہے اسی پر ایمان اور اسی کے ساتھ اسلام جو متفرق مختلف اعمالِ زندگی اندرونی بیرونی ہیں سارے کے سارے اعضاء جو ہمارے ہیں ان میں لگنے کے لئے ان کی ہر چیز کی وضع بتادی ہے کہ اس کا موضوع یہ ہے آنکھ کا موضوع یہ ہے زبان کا موضوع یہ ہے پیٹ کا موضوع یہ ہے اور دل کا موضوع ذکر۔ اب جب کبھی اس موضوع سے ہٹے گا اسی درجہ کا نقص آجائے گا۔۔ درخواست کی تھی کامل کی۔ حضور اکرم ﷺ نے جس کی تعلیم ہمیں یعنی اُمتِ مسلمہ کو فرمائی کہ دیکھو! میں کیا درخواست کر رہا ہوں تو بطریق اولیٰ تم کو تو اور بھی زیادہ ہمہ وقت درخواست کرتے رہنا چاہیے اس میں غفلت مت کرنا تاکہ تمہارا وہ ایمان بمعیتِ اسلام بدرجۂ کامل بکمالِ ایمان کے ساتھ ہو ذاتِ حق کے سامنے تم جاؤ

اور مجھے خوشی ہوگی تمہارا کام بنے گا اور میرا نام بنے گا۔ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ایسے گھرانے میں نکاح کرو جس میں اولاد زیادہ ہوتی ہو، تاکہ میں اپنی اُمتِ کثیرہ پر فخر کروں۔ گھمنڈ نہیں بلکہ ناز وشکر اللہ کا ادا کروں، جب قطار کھڑی ہوگی اُمتِ مسلمہ کی حدیث شریف میں آیا ہے۔ تو حضور ﷺ کو خوشی ہوگی اور اب بھی خوشی کیا آپ کی خدمت میں اعمال پیش نہیں ہوتے؟ تو جب بھی اعمال پیش ہوں گے تو اپنی اُمتِ مسلمہ کے ایمان کے تقاضے پر اسلامِ کامل جس جس کا جاتا رہے گا کتنی خوشی ہوگی، اور حضورِ اکرم ﷺ نے ہمارے لئے کتنی تکلیف اُٹھائی ہے، کتنے رنج وغم سہے ہیں، کتنی راتوں کو دن رات دُعائیں کی ہیں تو کیا ہمارے اعمال حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کے وقت رنجیدگی کی حالت ہو کیا یہ گناہ کم ہے؟ یہ کھوٹ کچھ کم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پورے اخلاص وصدق کے ساتھ رہتے رہنے کی توفیق ارزانی عنایت فرمائیں۔

☆

پیتالیسویں مجلس

کمالِ آداب مشاہدہ و معائنہ کے ہمہ وقت ملحوظ و مطلوب ہیں

مورخہ ۱۵ جمادی الآخر ۱۴۱۲ھ بمطابق ۱۹۹۱ء بروز شنبہ صبح جلال آباد مظفر نگر

فصاحت، بلاغت اور لطافت میں اوّل درجہ عربی ہے پھر فارسی پھر اُردو :

پہلی زبان فصیح و بلیغ اور نہایت لطیف عربی ہے دوسری فارسی، تیسری اُردو، باقی تو بقیہ ہیں گو ترجمے ہو رہے ہیں دینی کتابوں کے، بہشتی زیور کے انگریزی میں بھی ہندی میں بھی اور گجراتی میں بھی ترجمہ ہوا ہے لیکن جو بات اُردو میں ہے وہ سوائے عربی اور فارسی کے دوسری زُبانوں میں نہیں۔

قرآن پاک کا رسم الخط غیر عربی میں کرنیکی خرابیاں :

عجیب عجیب رسم الخط پیدا ہو رہے ہیں اور قرآنِ پاک عربی زُبان میں ہے، اس کا رسم الخط عربی ہے اور عربی رسم الخط ہونا اس کے لئے لازمی اور ضروری ہے مگر آج

کل اس کا رسم الخط ہندی چل رہا ہے انگریزی چل رہا ہے۔ تعجب اور افسوس ہے، یہ نہیں سوچتے کہ عربی تلفظ کی ادائیگی کے لئے وہ حروف کہاں سے لائیں گے انگریزی اور ہندی میں (یعنی انگریزی میں لکھنے سے صحیح حروف کی ادائیگی نہیں ہوسکتی) عجیب اِشاعت کا شوق ہے۔

بلا اُستاد کے قرآن شریف پڑھیں گے، اس کا ترجمہ پڑھیں گے، اس کی تفسیر ذہن میں لائیں گے، پڑھنے اور سمجھنے میں بکثرت غلطیاں واقع ہوں گی، کچھ بھی کرلیں اور کیسا بھی کرلیں اور کتنی بھی اشاعت کرلیں اور کیسی بھی تحریف کرلیں مگر صحیح قرآنِ پاک اور تفسیرِ اسلاف ختم نہیں ہوسکتی وہ تو قیامت تک قائم رہے گی۔

قرآنِ پاک کو معدوم کرنے کی ناکام کوشش :

ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ قرآن پاک دشمنوں نے ملحدین نے خرید کر دریا میں بہائے، کوئی عقلمند اس کو مل گیا کہ یہ کیا حرکت ہے تمہاری؟ اس نے جواب دیا کہ مسلمانوں سے ایمان و اسلام جو اس کے تحت ہے اس کو ختم کر رہا ہوں تاکہ ان کا ایمان و اسلام چلا جائے، اس نے کہا بے وقوف! یہ اُمت پہلی اُمتوں کی طرح سے نہیں ہے ان کے لاکھوں سینوں میں رکھا ہوا ہے، اگر ایک سے کسی لفظ' کسی حرف میں غلطی ہوگئی تو دوسرے بہت سے بتلانے والے اس کی تصحیح کے لئے کھڑے ہوجائیں گے یہ اُمَمِ سابقہ کی طرح سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ایسے محافظ پیدا فرماتے رہیں گے۔ اسی کلام میں بتلا دیا گیا ہے: ''انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون'' تو ایسے طریقے ایسے اسباب اللہ تعالیٰ قائم فرمائیں گے کہ کسی حرف اور نقطہ میں بھی فرق نہیں آسکتا۔

مقبولِ خدا کی کتاب جلانے سے اسکی اشاعت زیادہ ہوتی ہے :

جب مخلوق کی مقبولیت اس درجہ ہے کہ اسکی کتاب کو جلائی جائے اتنا ہی اس میں جلا پیدا ہوتا ہے تو ذاتِ باری تعالیٰ کا کلام کتاب اللہ جلائی اور ڈبوئی جائے اور اس کا جلاء بڑھتا نہ جائے۔ حضرت والا کی بہشتی زیور جلائی گئی، امام غزالی صاحبؒ کا احیاء العلوم جلایا گیا تو جتنا جلایا اتنا ہی جلا پیدا ہوا، گھر گھر موجود ہے جب مخلوق کا ایسا حال ہے تو ذاتِ قدسی کا کلام! ظاہر ہے کہ اس کے مٹانے اور جلانے اور دریا میں غرق کرنے سے اور زیادہ، زیادہ سے زیادہ اس کا شیوع ہوگا، اشاعت بڑھے گی، حاسدین کے دل میں ملحدین کے دل میں زخم آگیا ان کے دل پر مرہم رکھ رہا ہے ڈبو کر ،جلا کر تو مرہم کارآمد نہیں۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ مؤمن ہو کر مسلمان ہو کر اللہ تعالیٰ کے کلام کو نہ پڑھے اور پڑھ لیا ہو اور پڑھنے کے بعد اس کو کھول کر نہ دیکھے، اس کو سینہ سے نہ لگائے، سر پر نہ رکھے، تقبیل نہ کرے، دستِ پاک سے نہ چھوئے، یہ کلام اللہ قرآن پاک گویا محبوبِ حقیقی کا خط ہے، اور محبوب کے خط کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے۔ دیکھیے! جب دوست کا خط آئے تو اس کو بار بار دیکھ رہا ہے، چومتا بھی ہے جب ڈاکیہ نے ہاتھ میں لا کر دیا معلوم ہو گیا تو طبیعت میں فرحت آگئی باغیچہ کھل گیا چوم بھی رہا ہے دیکھ بھی رہا ہے پڑھ بھی رہا ہے اور بار بار پڑھ رہا ہے۔

شیخ کے چہرہ پر بلا وضو نگاہ نہ پڑے :

آدابِ شیخ میں جہاں اور آداب لکھے ہیں وہاں یہ بھی ادب لکھا ہے کہ شیخ کے چہرہ پر بلا وضو نگاہ نہ پڑے، ہو شیخ، جب ایسے خلق کیساتھ ایسا ادب ہے تو خالقِ برتر کا ادب

کس درجہ ہونا چاہیے ۔ مراقبہ، مشاہدہ، معائنہ باحسان ہوتے ہوئے مؤمن صاحبِ سلوک بمشاہدۂ حق بلاوضور ہے؟ جب خلق کی طرف نظر ایسی (یعنی طہارت ہو) تو خالق کی طرف نظر کیسی ہونی چاہیے۔

تصوّف وسلوک شریعت کا جزءِ اعظم ہے :

شریعت کا جزءِ اعظم سلوک بہت لطیف ہے پاکیزہ اور نکھرا ہوا ہے، اس کا ایک حق مستقل ہے کہ اگر کوئی عذر نہیں ہے تو سالک کو باوضو رہنا چاہیے ۔ تو قرآن پاک کیسی نعمت اللہ تعالیٰ کا کیسا کرم، کیسا فضل، کسی نے کہا تھا کسی سے ......

ع چیست قرآن اے کلامِ حق شناس

یعنی اے حق پہچاننے والے ذرا بتلا تو سہی قرآن کیا چیز ہے؟ اس نے کہا......

ع رونمائے ربّ ناس آمد بناس

لوگوں کے رب کی طرف سے ہے، رب نے اپنی رونمائی کے لئے بھیجا ہے رُو کے معنی چہرہ اور نمائی حاصل، مصدر ہے نمودن سے جس کے معنی ہیں دکھلانا یعنی اپنے آپ کو دکھلانے کے لئے بھیجا ہے، لوگوں کے قلب میں لوگوں کی اگر فطرت خراب نہیں ہوگی، اپنی جگہ پر سلامتی کے ساتھ ہے ان کا جی میری رویت کو چاہے گا تو اس کلام کے ذریعہ مجھ کو دیکھ لیں گے ۔ اور اس عالم میں لوگوں کا عقلاً کمالِ امکان میری رونمائی جس کو رونمائی کہتے ہیں آمنے سامنے ہو کر جسمی طور پر وہ کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

تمام انبیاء علیہم السلام نہایت درجہ عقلمند تھے :

اسی لئے انبیاء علیہم السلام حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر میرے محبوبِ حقیقی

نبی آخرالزماں احمدِ مجتبیٰ ﷺ تک جتنے نبی آئے ہیں سب عقلِ اتم کے ساتھ تھے تو موسیٰ علیہ السلام نے میری عینِ ذات کے لئے " ارنی " کہا اور ان کی عقل اکمل ہے اتم ہے، ان کی عقلِ اکمل واتم نے امکان کو قائم کیا کہ ممکن ہے لیکن میں نے موسیٰ کو تعلیم دی کہ اس عالم میں بحقِ شرع محال ہے ایسا نہیں ہوسکتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درخواست کرنے میں امکان تو ثابت ہوا۔ ذاتِ باری تعالیٰ نے اس امکان کو اس عالم میں محال فرما کر اُس عالمِ آخرت میں بحال فرمادیا اور آپ کو اس عالم میں محال ہونے کا مشاہدہ ہوجائے گا۔ اس پہاڑ کو دیکھو! جس پر میری تجلی کا ظہور ہوگا تم اس سے سمجھ جاؤ گے "فلما تجلّٰی ربه للجبل جعله دکا" اللہ تعالیٰ رب العالمین نے تجلی فرمائی تو پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، ایک ہیبت ذاتِ باری تعالیٰ کی طاری ہوئی نہ کہ پہاڑ کو دیکھ کر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا بلکہ ہیبتِ ذاتِ باری تعالیٰ کا ظہور ہوگیا : " وخر موسٰی صعقًا، فلما افاق قال سبحٰنك تبت الیك "۔

نبی اپنے مرتبۂ عالیہ کے سبب خلافِ اولیٰ پر بھی توبہ کرتا ہے :

انابت ہوگئی توبہ کی بات نہ تھی مگر مقام نبی کا بہت اُونچا ہے اس لئے وہ خلافِ اولیٰ پر بھی توبہ اسی طرح کرتا ہے جیسا کہ متبعِ مؤمن گناہ پر توبہ کرتا ہے۔ لوگ دھوکہ میں آتے ہیں ذاتِ باری تعالیٰ کا یہ فرمان: " واستغفر لذنبك " دیکھ کر خیال کرلیتے ہیں کہ نبی سے بھی گناہ ہوجاتا ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ نبی کی شان بہت اونچی ہوتی ہے اس لئے خلافِ اولیٰ اگر ہوجاتا ہے کہ پہلے یہ سمجھا نبی، کہ یہ اولیٰ ہے میں اسکو اولیٰ سمجھتا ہوں تو کروں۔ اور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ خلافِ اولیٰ ہے یہ بہت احساس ہوتا ہے متاثر ہوجاتے ہیں، شدید تأثر ہوتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: " الذی انقض ظهرك " کمر ٹوٹ گئی اس کی تلافی ہورہی ہے: " و استغفر لذنبك " کو سمجھے ہی نہیں اپنے مقام کی حیثیت سے مرتبہ کے اعتبار سے درجہ کے اعتبار سے ظہورِ غایتِ غلامیت کا اظہار فرما جارہا ہے، تو عینِ ذاتِ حق کی رویت کا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا گویا یوں عرض کیا: " ارنی ربی نفسك " اسی وقت جواب دیدیا، تسلی ہوگئی ذرا ابھی انتظار رکھو، بعض چیز ذرا اُدھار اچھی ہوتی ہے۔ بس سکون ہوگیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوالِ رویت میں فرق ہے :

ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذاتِ عین کے مشاہدہ کے لئے نہیں فرمایا۔ کیفیت احیائے موتی کے متعلق سوال کیا اور عینِ ذات کے مشاہدہ کے متعلق نہیں کیا احیائے موتی کی کیفیت کا سوال تھا: " رب ارنی کیف تحی الموتیٰ " الہام ہوا کہ تم ایسا سوال کررہے ہو: " قال اولم تؤمن۔ قال بلیٰ " زندہ کرنے کا تو یقین ہے کامل، اکمل، اتم و ایمان و یقین ہے: " و لکن لیطمئن قلبی " اپنے قلب کے اطمینان کے لئے سوال کیا تھا میں نے، ہاں جو چیز مشاہدہ کی ہوتی ہے وہ عقلی طور سے سمجھ میں نہیں آسکتی اس لئے عقلاً سمجھایا نہیں جاسکتا اس کا سوال کہیں زائد از ضرورت نہ ہو۔

جو چیز مقدار کے اعتبار سے من حیث الکم ہو کر من حیث الکیف ہو تو جب تک وہ چیز اپنے اوپر واقع نہیں ہوجاتی اس وقت تک اس کی کیفیت کا پتہ نہیں چل سکتا۔

احوال وکیفیات کے درپے نہ ہونا چاہیے :

اس لیے جتنے بھی احوال ہیں وہ من حیث الکیف ہیں ان کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔اس کی تلاش میں نہیں پڑنا چاہیے، تجسّس نہیں ہونا چاہیے، اعمال کا مکلّف ہو احوال کا مکلّف نہیں۔ مقاصد کے عدمِ معصیت کی حیثیت سے ہوجائے ہوجائے، نہ ہوجائے فکر نہیں۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے احیائے موتی کی کیفیت کا سوال کیا تھا ذاتِ عین کے مشاہدہ ومعائنہ کے لئے نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ چیز مشاہدہ کی تھی اور وہ مشاہدہ معائنہ تھا اور یہ عین ذات محال تھی اس کو قبول نہیں کیا اور سوال کیف کا تھا مشاہدہ سے کیفیت معلوم ہوسکتی تھی اس کو قبول کیا۔

" قال فخذ اربعة من الطير فصرهن اليك ثم اجعل على كل جبل منهن جزءً ثم ادعهن ياتينك سعياً۔ واعلم ان الله عزيز حكيم ٥ " ارشاد ہوا کہ چار پرندے لو اور کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف جگہوں پر اس طرح رکھو، کسی کا دھڑ یہاں ہے گردن وہاں پیٹ یہاں سینہ وہاں۔ پھر آواز دے دو مشاہدہ ہوجائے گا کیفیت کا، ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے چوٹی پر رکھ دیئے ادھر صدا گونجی " کن فیکون " معاملہ سامنے مشاہدہ کا احیائے موتی کی کیفیت کا آگیا۔

مشاہدۂ قلبی شدہ شدہ عینی جیسا ہوجاتا ہے :

تو مکرمانِ بندہ! طالبانِ سلوک بمشاہدہ بمراقبۂ احسان! یہ درجہ مشاہدۂ قلبی کا بعض دفعہ مثلِ عینی ہوجاتا ہے جب مثلِ عینی ہوجاتا ہے تو پھر شیخ کی طرف دیکھنا اس کے چہرہ پر نظر کرنا بلا وضو خلافِ ادب ہوگا اور سالک کا سلوک بمشاہدہ بمراقبۂ احسان

مثلِ عین اور بلا وضو؟ یہ بحقِ شرع بالزامِ سلوک طے کرنا گویا کہ بحق شرع ہی ہے جیسا کہ ادھر اس معائنہ کو گویا کہا ہے جب جبرائیل نے سوال کیا تھا ''ما الایمان اور ما الاسلام'' کے بعد ما الاحسان کسی چیز کی ماہیت حقیقی کے لئے ما سے سوال ہوتا ہے کہ اسکی ماہیتِ حقیقی جو ہے اس کا جواب دو، ایمان کا سوال تھا جواب دیدیا، اسلام کا سوال تھا جواب دیدیا تھا کہ ایمان کی حقیقت یہ ہے تو پھر دوسرا ما کیوں لائے؟ پھر حقیقت کے سوال کی کیا ضرورت ہے؟

حدیثِ جبرئیل میں ایمان واسلام کے بعد احسان کے ذکر سے دونوں کو کامل کرنے کا بیان ہے :

اس کی ضرورت ہے تعمیر تو ہوگئی ایمان کی، تعمیر تو ہوگئی اسلام کی تو یہ بلا تزئین روکھا پن کیسا؟ نفسِ ایمان پر نفسِ اسلام پر قناعت کرلی؟ نہیں، ان دونوں میں عجیب حُسن کی ضرورت ہے اور تم جانتے ہی ہو کہ حُسن کسے کہتے ہیں اس لئے قلبی اور جوارحی دونوں میں حُسن ہونا مطلوب ہے درجۂ وجوب ہے کس طرح؟ ایمان کی جو تعلیم کیفیت کے ساتھ کی گئی ہے ایمان جس ماہیت کے ساتھ ہے اسلام جس ماہیت کے ساتھ ہے اس طرح ہوں دونوں جو کہ عبادات مقصودِ حیات کہ جس پر تو ایمان لاتا ہے جن احکام پر تو اعمال کے لئے کمربستہ اور ہر وقت آمادہ رہتا ہے وہ اس طرح ہو گویا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے: '' ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ '' معلوم ہوا کہ اس کی رؤیت اس خلقِ مؤمن کے لئے بطورِ عینِ طریق گویا ہوسکتا ہے، اس کا طریقِ استعمال کیا جائے تو وقوع ہوگیا، اسی لئے اہل اللہ، عارف باللہ کوئی مجبوری ومعذوری نہ ہو تو ہمہ وقت گویا

کہ سامنے ہے اس کے آداب بجالاتا ہے بیٹھنے میں بھی، چلنے میں بھی بولنے میں بھی کھانے میں بھی کیونکہ مؤمن کا بولنا، چلنا، کھانا، پینا، یہ سارا کا سارا عبادت ہے۔

حُسنِ کلام کا بھی مکلف بنایا گیا ہے :

کلام میں بھی مکلف بنایا گیا ہے "قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن الآیۃ" کلام میں بھی مکلف بنایا گیا ہے اس کلام کے طریقِ احسن کو مت چھوڑنا ورنہ تنازع ہو جائے گا نا اتفاقی ہو جائے گی خانہ جنگی ہو جائیگی، دوستانہ بگڑ جائے گا، متانت میں فرق آجائے گا اس لئے کہ "ان الشیطان ینزغ بینھم" سخت کلامی کے ذریعہ سے مسلمانوں کے درمیان شیطان فساد پھیلاتا ہے، ذرا تکلم اے مسلمان! سوچ سوچ کر کر جو چاہا جب چاہا جس طرح چاہا جس کے ساتھ چاہا کلام خرد بُرد کرلیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ شیطان تو کھلا واضح دشمن ہے مسلمانوں کا۔

"ان الشیطان للانسان کان عدوا مبینًا" لعبادی سے مراد مسلمان ہیں یہاں بھی انسان سے مراد مسلمان ہیں کہ کافر کو کیا چھیڑے گا وہ تو گمراہی کی آخری حد تک پہنچ چکا۔ وہ تو چاہتا ہی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان نا اتفاقی تنازع جھگڑا بڑھتا چلا جائے۔ تو ذاتِ باری تعالیٰ نے جیسے تصحیح اور اصلاح اعمال کی فرمائی ہے ایسے ہی کلام کی بھی فرمائی ہے۔

پڑھے لکھے بھی اہتمام نہیں کرتے حالانکہ چھوٹوں کے ساتھ بھی حُسنِ کلام کا ہونا ضروری ہے :

لیکن اس کا اہتمام اچھے خاصے پڑھے لکھوں میں بھی نہیں ہے۔ مولویت کا

نصاب پورا کر دیا، میزان سے لیکر دورۂ حدیث شریف تک لیکن احسن کلام کا اپنے کو مکلف خیال نہیں کرتا اولاد کے ساتھ، تلامذہ کے ساتھ، شاگردوں کے ساتھ، چھوٹوں کے ساتھ بھی مکلف ہے چہ جائیکہ بڑوں کے ساتھ، کلام بھی آداب وتہذیب کے ساتھ کرنا، شیخ کا کام ہے کہ سکھلائے۔ صرف اعمال ہی پر نظر نہ رکھے کلام پر بھی نظر رکھے، اسکی نشست و برخاست اور اُٹھنے بیٹھنے پر بھی نظر کرے کہ کس طرح بیٹھا ہے، بلا ضرورت کس طرف دیکھ رہا ہے، کس طرح بیٹھا ہے وہ اشارے وکنائے سے ٹوکتا رہتا ہے صراحتاً مجبور ہو کر کہتا ہے۔

صِدق واخلاص کا فرق اور دونوں کا مطلوب ہونا:

صدق کے معنی یہی ہیں کہ بدرجۂ کمال ہو۔ ایک عمل کا اخلاص ہوتا ہے اور ایک عمل کا کمال ہوتا ہے اس کمالِ عمل ہی کو صِدق کہتے ہیں۔ سوائے رضائے الٰہی کے اور کوئی دوسری نیت عمل میں ہے ہی نہیں یہ اخلاص ہے اور جب اس عمل کو کر رہا ہے تو کامل طریقہ سے بجالا رہا ہے ناقص طریقہ سے نہیں بجالا رہا ہے یہ اس عمل کا صدق کہلایا جاتا ہے۔ تو عمل میں اخلاص بھی مطلوب ہے اور صدق بھی مطلوب ہے اور محبت وہ ایک عمل ہے جس کا تعلق قلب سے ہے۔ اس میں بھی اخلاص وتوحیدِ خالص اس میں بھی صدق، ادھر توحیدِ خالص ادھر اخلاصِ کامل بصدق ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ پھر اطاعت نہ ہو یا اطاعت میں کمی ہو۔ "لو کان حبك صادقا لا طعته" لام تاکید کا ہے لا طعتہ ضرور اس کی اطاعت کرتا ہے۔ اطاعت ہے تو سچی محبت ہے کیونکہ

ع ان المحب لمن یحب مطیع

اس لئے کہ محب محبوب کی پوری اطاعت طوعاً لاکرہاً کیا کرتا ہے۔

محبتِ الٰہی کے لئے اتباع لازم ہے :

" قل ان کنتم تحبّون الله " اس کا ثبوت دو عملی اِتباعیت سے قدم بقدم چلے آؤ پیچھے، جیسا کچھ جس موقع کے متعلق کہا گیا ہے قدم بقدم اس کے پیچھے چل کے اس کے ساتھ چلے جاؤ، یہ ہے ثبوت محبتِ حقیقی کا فاتبعونی میرا محبوب ہونا ثابت ہو گیا۔ جب تمہاری طرف سے محبّ ہو کر میرا محبوب ہونا ثابت ہو گیا اتباعیت سے تو کہہ دیجیے : "یحببکم الله " تم بھی میرے محبوب ہو گئے، جیسے تم محبّ میں تمہارا محبوب اسی طرح میں تمہارا محبّ تم میرے محبوب۔ محاورہ ہے ہتھیلی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اگر ایک ہاتھ سے بجے گی تو ہلکی ہو گی ایسے ہی ایک جانب سے محبت ہلکی ہو گی، حق تعالیٰ نے فرما دیا اپنی محبت کا ثبوت دو اتباعیت اور طاعتِ کاملہ کے ساتھ اور پھر دیکھو! اس نفسِ ایمان پر جو کہ وہ بھی تمہارے عاشق اور محبّ ہونے کا ثبوت ہے میں راضی ہوں مگر یوں چاہتا ہوں کہ رضائے کامل ہو جائے یہ سُن کر مؤمن کا دل پھڑک جائے گا تڑپ جائے گا کہ میرے اس ایمان میں کمی کیوں ہوئی کمالِ ایمان کیوں نہ ہوا اطاعتِ کاملہ کے ساتھ، ایک نفسِ ایمان کا موقوف علیہ ہے اور ایک کمالِ ایمان کا موقوف علیہ، یوں فرما رہے ہیں: " قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله " تمہارا یہ حال ہو جائے اس کمالِ محبت کے ثبوت کیساتھ کہ تمہارا دل اندر سے یوں کہنے لگے ....

آرزو ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے
تم ہمارے سامنے ہم تمہارے سامنے

گویا جب محبت میں آدابِ خلق خلق کے ساتھ اس طرح ئے چاہیے تو

آدابِ خلق خالقِ برتر کے ساتھ کس طرح ہونے چاہیے؟ ملاحظہ فرمائیے گا!

اور یہ سب ممکن الوجود ہے اس کے صحیح طرق کے استعمال کرنے سے ممکن الوجود وقوع الوجود، کہ اس ممکن الوجود شے میں اس ممکن الوجود مؤمن نے صحیح طریق کو اختیار کیا ہوگا یا وجود عینی مشاہد، اور ہر اُمتی ہر وقت عبادت میں ہے اور عبادت کے متعلق حکم ہے: "ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ" اگر ابھی ایسا نہیں ہوا تو ایسا یقینی ہے "فان لم تکن تراہ فانه یراك" یہاں کَاَنَّ نہیں ہے فانه یراك ہے۔

احسان کا طریقِ تحصیل :

اس طریق سے سوچ کے ساتھ فکر کے ساتھ لگے رہو تو کانك تراہ ہو جائے گا جب کانك تراہ ہو جائے گا تیرا وجودِ خارجہ کچھ اور ہی طرح کا ہو جائے گا۔ جب تیرا مکان ایسا ہو جائے گا تو تُو ایسا ہو جائے گا کہ اگر تجھ کو کوئی ایذاء پہنچائے گا۔ چونکہ یہ عالَم ایسا ہی ہے صلاح وفساد لئے ہوئے، جب تو ایسا ہو جائے گا تجھ کو ایذاء دی جائیگی، مگر تو ایسا ہو گیا ہے کہ اس ایذاء پہنچانے پر نہایت درجہ کا تجھ میں میرا وصفِ صبر و حلیم ہونے کا آ گیا ہے کہ میں تیرے سامنے ہوں اور اُس ایذاء کا بدل تیری طرف سے ایذاء کا نہیں ہوگا۔ اس کو حُسنِ ظن کے ساتھ اعذار میں لاکر معاف کر دینا ہوگا اور بجائے ایذاء رسانی کے تیری طرف سے راحت رسانی ہوگی کیونکہ تو احسانِ ایمان میں اور اس مکانِ اسلام میں دیکھ تو کیسا ہو گیا ہے۔ جب ایسا ہو گیا ہے تو ایسا رہے گا۔

احسان کا اثر تہ خانہ کے مانند ہے کہ انسان فتنوں کے اثر سے محفوظ ہو جاتا ہے :

چونکہ ایمان تہ خانہ اور اسلام مکان جیسا ہے تو تُو ایمان کے تہ خانہ میں ہے۔

تہ خانہ گرمی کے لئے، ٹھنڈا پانے کے لئے امن کے لئے گرمی سے امن کے لئے بنایا جاتا ہے، ہم تہ خانہ میں چلے جایا کرتے تھے، ہر سال ریت بدل دیتے تھے، تو وہاں ایسی ٹھنڈک رہتی تھی کہ روزہ کی حالت ہے اور جی چاہتا ہے کہ چادر اوڑھ لو، ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ تو جس طرح تہ خانہ مکان میں ہوتا ہے اسی طرح یہ ایمان تہ خانہ ہے دل میں اور اسلام تعمیرِ مکان کی حیثیت سے ہے کہ اعمال ظاہر اور نظر میں ہوتے ہیں، اور ایمان ایسا تہ خانہ میں رکھا ہوا ہے تو تیری طرف سے تو امن ہی ہونا چاہیے ورنہ سارے عالم میں بدامنی پھیل جائے گی چونکہ تعمیرِ مکان اسلام میں داخل ہے، جب ایسا مکان ہے تو مکین کیسا ہو؟ یا سلامتی ہو جب تو نے اس مکان کو اپنایا ہے تو اپنی طرف سے سلامتی کو بھی اپنا! اگر تو نے بھی سلامتی کو چھوڑ دیا تو عالم سے سلامتی گئی............اور جب سلامتی گئی تو خانہ جنگی ہو گئی جیسا کہ ظہور ہو رہا ہے۔

شریعت کا جزِ اعظم جس کو سلوک کہتے ہیں وہ کس درجہ کا ہے جس سے شریعت میں ظاہراً و باطناً حُسنِ سلامتی اور حُسنِ امن آتا ہے۔ نظر غائر بغیر طالبِ سلوک مکلف ظاہر و باطن کا کیا بغیر تہذیب اخلاق نہیں بلکہ تعمیرِ اعمال۔ تہذیبِ اخلاق۔

تہذیبِ اخلاق کی حقیقت :

تہذیب کے معنی ہیں "ھذب الشجر" یہ عربی کا محاورہ ہے تھذیب ھذّب باب تفعیل سے ہے اس نے درخت کو چھانٹ دیا جو شاخیں ٹیڑھی اور معیوب تھیں ان کو درست کر دیا اور سیدھی عمدہ نہایت پُرحسن شاخوں کو بنا دیا بنانے والے نے جس کو مالی کہتے ہیں۔

ھذّب الشجر اعوجاجہ ٹیڑھاپن، یہ ہے اخلاق کے ٹیڑھے پن کو چھانٹ

کاٹ کر مہذب بالکل ایک صف سیدھی ہموار سطح کر دیا مثلاً انسان میں بخل کا ٹیڑھا پن تھا اس کو چھانٹ دیا ایک شاخ تھی ٹیڑھی اس کو چھانٹ دیا جو دو کرم آ گیا وغیرہ وغیرہ ، جو شاخیں ٹیڑھی تھیں اخلاق میں اس کو تہذیب کے ساتھ اس کو چھانٹنے کے ساتھ صحیح بالکل ٹھیک کر دیا جن اخلاق کے ساتھ ابتدائی پیدائش اصل ہوئی تھی وہ آ گئی جو مکلف کی چیزیں تھیں ان میں اعواج آ گیا تھا اس کو نکال کر صحیح تہذیب آ گئی کہ تزکیہ ہو گیا، اس کا تخلیہ ہو گیا اس کا نام تہذیب رکھ دیجیے۔ اور اس تہذیب میں بطریقِ مستقیم دائمی اس کا نام پھر تمکین رکھ دیجیے۔ ایسی شاخ سیدھی کر دی اس میں کچھ ایسا مصالحہ لگا دیا کہ ٹیڑھا پن آتا ہی نہیں ٹیڑھا پن آ بھی گیا تو فوراً وہیں کا وہیں سکوکر رہ گیا اسی طرح خُلق بھی ہو گیا۔ اس لئے سالک نے جب قدم سلوک میں رکھا تھا بنیتِ استقامت رکھا تھا اور بنیتِ استقامتِ مطلقاً نہیں بلکہ استقامت بقیدِ مثل منعم علیہم کے کہ خیالِ استقامت زُبان سے ادا کرتے کرتے، اور دل میں زبان پر اس کو لاتے لاتے، زُبان پر اس کو رکھتے رکھتے، دل میں اس کی طلب لیتے لیتے، اس طرح ہو بھی گیا : "اهدنا الصراط المستقيم"۔ اس کا بدل عمومی نہیں بلکہ "صراط الذين انعمت عليهم" وہ جو میری نظر میں جو آپ کی نظر میں وہ صراطِ مستقیم منعم علیہم والی چاہت ہے کہ جس میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط ہو، نہ یہودیت ہو اور نہ نصرانیت ہو۔ میں اس کی نفی کر رہا ہوں " غير المغضوب عليهم ولا الضالين " نہ افراطیت ہو نہ تفریطیت ہو اور دونوں اہلِ کتاب اور دونوں میں یہ ہیں اسی سے یہ لازم آ گیا پھر تو بطریقِ اولیٰ شرک کا نام نہیں، جب یہودی اور نصرانی سے میں پرہیز کرتا ہوں بالکلیہ جو اہل کتاب رہ چکے ہیں تو جو بالکل شرک میں ہیں انکی تو بطریقِ اولیٰ مجھ سے نفی ہے تو اے رب

العالمین' ارحم الراحمین! آپ سے فریاد ہے، سالک کہہ رہا ہے کہ میں توحید خالص واخلاصِ کامل بصدق کا طالب ہوں تو اس کے آداب بھی مطلوب ہیں، عرض یہ کیا گیا تھا کہ سالک اور بے وضو؟ مشاہدۂ حق یہاں تک کہ معائنۂ حق جب ایک ایسے خُلق کا ادب ملحوظ تو خالقِ برتر کا ادب کتنا؟ جب کوئی عذر اس کے خلاف کا داعی نہیں ہے تو پھر خلاف کیسا؟ اور اس حالت میں جب کہ عذر موجود ہے اس خالقِ برتر نے رخصت دیدی ہے۔

خداتعالیٰ بندۂ مؤمن کے لئے ہر طرح کی واقعی راحت چاہتے ہیں:

اس لئے کہ مؤمن راحتِ جسمانی کی پرواہ نہیں کرتا اور دل کی فرحت کی پرواہ نہیں کرتا، ایسی حرکات کرتا ہے کہ اپنی جسمانی راحت میں بھی فرق آئے اور اپنی قلبی فرحت میں بھی فرق آئے۔ مگر وہ ذات چاہتی ہے کہ تیری جسمانی راحت میں بھی فرق نہ آئے اور نہ قلبی فرحت میں کوئی فرق آئے لہٰذا جب تجھے عذر ہے تو جس طرح چاہے بیٹھ جس طرح چاہے لیٹ، جس طرح چاہے چل؛ جس طرح چاہے بول اور جب عذرِ شرعی نہیں ہے معذوری نہیں ہے تو کمالِ آداب مشاہدہ ومعائنہ کے ہمہ وقت ملحوظ ہوں۔

سلوک کے آداب عینِ شریعت ہی ہیں چونکہ جو مرکب چیز ہوتی ہے اُس کا ہر جز عین ہی میں داخل ہوتا ہے۔ یہ چاردیواری اس تعمیرِ مکانی، جسمانی اور چھت، کھڑکیاں تعمیرِ مکانی یہ دروازے چوکھٹ تعمیر کے اجزاء ہی ہیں۔ یہ سب تعمیر میں داخل

ہیں تو ایسے ہی تعمیرِ ایمانی واسلامی کے اجزاء ہیں، بتمامہا وشرائطہا جب ادا کئے جائیں گے تو اس کو کمالِ ایمان اور کمالِ اسلام کہا جائے گا تو سلوک یہ شریعت کا ایک عینِ جزء ہے اُس کے آداب جو پیش کئے گئے ہیں اللہ تعالیٰ ان آداب ان عادات کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ (آمین)

☆

چھیالیسویں مجلس

مسلم کی امتیازی شان

مورخہ ۱۶ جمادالآخر ۱۴۱۲ھ بمطابق ۲۴ نومبر ۱۹۹۱ء بروز یکشنبہ صبح بمقام جلال آباد

متعلقین سے حُسنِ ظن رکھنا چاہیے :

حدیث میں وارد ہے ظنوا المؤمنین خیراً یعنی مؤمنوں سے حُسنِ ظن ہی رکھنا چاہیے۔ جب کہ دوسرے کے خلاف کا علم نہ ہو، تو جو کہہ رہا ہے زبان سے یا طرزِ عمل سے تو اس پر یقین رکھو کہ جو کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے، اب حقیقی معاملہ وہ اس بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، وہ صدر اور سینہ کی بات کو بھی جانتا ہے، اُن کے قول کو بھی سُن رہا ہے، ان کے اعمال پر بھی اُس کی نظر ہے وہ سمیع بھی ہے بصیر بھی ہے، علیم بھی ہے۔ اسی لئے ہر انسان کو متعلقین کے بارے میں حُسنِ ظن رکھنے کا حکم ہے جب تک کہ اس کے خلاف کا ظنِ غالب یا بقاعدہ شرعیہ خلاف کی اطلاع، خلاف کا علم، خلاف کی خبر نہ ہو۔ تو معاشرت کو آپس میں باہمی گندہ مت کرو، اپنی معاشرت کو بحث میں پڑ کر، کاؤ کاوش میں پڑ کر، کھود کرید میں پڑ کر گندہ مت کرو یہ حکم ہے۔

بدگمانی کا سوال ہوگا حُسنِ ظن کا سوال نہیں ہوگا :

چنانچہ قرآن پاک میں ہے: اجتنبوا کثیرا من الظن یعنی گمانوں سے بچو، بلا کسی خاص تحقیق کے کسی کے بارے میں غلط گمان ویقین نہ کرو۔ اور اس کے بعد تنبیہ بھی فرمادی، تخویف بھی فرمادی: ان بعض الظن اثم یہ ثاء سے ہے، جس کے معنی گناہ کے ہیں اور س سے اِسم کے معنی نام کے ہوتے ہیں۔ بعض گمان گناہ ہیں اور اِنّ کے ساتھ ہیں جس کے معنی یقیناً کے ہیں جس پر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ بعض دفعہ قرائن کچھ ایسے ہوتے ہیں جس سے آدمی کچھ حکم لگائے اس واقعہ کے اپنے فیصلہ کے لئے نہیں، اسی لئے اس ارشاد کے ساتھ کہ انّ بعض الظن اثم بعض ظن یقیناً گناہ ہیں۔ اس پر ایک اور تنبیہ کردی! میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کو فلاں شخص کے ساتھ نیک گمان کیوں تھا؟ کیونکہ اس نیک گمان میں فتنہ نہیں ہے، فساد نہیں ہے اپنی احتیاط رکھنی تھی۔ یہ ضرور پوچھوں گا کہ تم کو فلاں شخص کے ساتھ بدگمانی کیوں تھی؟ اس کا جواب دو! ہمارا ایمان بتلا رہا ہے قیامت کا دن حساب وکتاب کے لئے ہے، کھڑا ہو کر عدالتِ احکم الحاکمین میں پوچھا جائے گا۔ اس کا جواب سوچو!

مؤمن کی زندگی معاشرت کی ہو :

یہ معاشرتی زندگی ہے عزت کے ساتھ، آرام کے ساتھ، راحت کے ساتھ، فرحت کے ساتھ مؤمن کی زندگی گذرے انفرادی حیثیت سے بھی اجتماعی حیثیت سے بھی، خانگی زندگی میں بھی، بیرونی زندگی میں بھی، حضری زندگی میں بھی، سفری زندگی میں بھی، گویا حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جہاں میں نے حقوق بیان کئے ہیں تمہاری اپنی ذات سے متعلق اور خانگی متعلقین کے متعلق، وہیں بیرونی زندگی میں بھی میں نے

معاشرتی زندگی سکون کی، راحت و طمانیت کی بیان کردی ہے۔ تم مؤمن ہو، مسلم ہو، تمہاری زندگی من حیث المؤمن، من حیث الایمان امن کی من حیث المسلم من حیث الاسلام سلامتی کی ہونی چاہیے کہ ہر ایک یہ خیال واہتمام رکھے کہ دوسرے کے امن و سلامتی میں فرق نہ آئے۔ اس کا اہتمام لازم اور ضروری ہے۔

یاداشت کا ملکہ قائم ہو جانا مطلوب ہے :

یوں کہنا کسی کا جائز نہیں ہے کہ میں نے آپ کو قصداً اذیت نہیں پہنچائی کسی کی نیت پر حملہ کرنا کہاں جائز ہے؟ کہ یوں کہا جائے کہ اس کی نیت تکلیف پہنچانے کی ہے کیا معلوم؟ لیکن یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس کا اہتمام کیوں نہیں کیا کہ میرے اس طرزِ کلام اور طرزِ عمل سے کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ سبق ہے یہ منجانب اللہ حکم ہے، آ کر بیٹھنا تو بہت آسان ہے، پرکھنا اپنے آپ کو اصل چیز ہے کہ یاداشت کا ایسا ملکہ قائم ہو جائے کہ وقت پر وہ یاداشت یاد ہو کر اس کے مطابق طرزِ زندگی عملاً گذرے۔ چونکہ بوجھ پڑتا ہے عمل کرنے میں جی کو مارنا پڑتا ہے جو کہ بگڑا ہوا جی ہے، نفس کو مارنا پڑتا ہے جس میں تکبر رکھا ہوا ہے۔ اس سے ہٹ کر تواضع حقیقی کو لا کر تعامل ہونا چاہیے۔

مجلس میں آنے اور بیٹھنے کا مقصد :

اور یہی قصد ہونا چاہیے سفر کے وقت اس جگہ کے لئے' قیام کے لئے' مجلس میں آنے کے لئے' بیٹھنے کے لئے جانے کے لئے' کہ یہ قصد عمل کے لئے ہے، یہ سفر برائے رفعِ ستر اور رفعِ ستر اور برائے دخولِ جنت ہوتا ہے۔ غرض ہر ہر کام میں قصد و نیت کا اہتمام و استحضار ہو اس سے عمل جاندار اور پُر آثار ہوتا ہے اور عدمِ استحضار اور

غفلت و بے توجہی سے عمل کمزور اور کم اثر ہو جاتا ہے۔

اسی طرح غلط عمل میں بھی قصد و عدمِ قصد، استحضار و عدمِ استحضار، بے توجہی / بے پرواہی سے فرق آجاتا ہے چنانچہ جیسے قصداً تکلیف پہنچانا حرام ہے بلکہ سخت حرام ہے۔ بے توجہی و بے پرواہی کے برتاؤ سے بھی دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے اسلئے بے پرواہی کرنا بھی ناجائز ہے۔ پس یہ سمجھ لینا کہ میں نے قصداً تکلیف نہیں پہنچائی ہے لہٰذا میری کوئی غلطی نہیں ہرگز صحیح نہیں۔ دوسرے کے اظہار تاذّی پر اس کہہ دینے سے بری نہیں ہو سکتا کہ میں نے قصداً تکلیف نہیں پہنچائی۔ یہ تو نیت پر حملہ ہے۔ یہ کیسے کہا جائے گا کہ آپ کی نیت قصداً تکلیف پہنچانے کی تھی۔ ہاں یوں کہا جائے گا کہ آپ نے اس کا اہتمام کیوں نہیں کیا کہ میرے طرزِ عمل سے، طرزِ کلام سے تکلیف نہ پہنچے اس اہتمام کے مکلف ہیں اس اہتمام کرنے کا حکم ہے۔

اہتمام ھــم سے مشتق ہے۔ اور ھــم کے معنی ہیں فکر، جب ھــم کو بابِ افتعــال میں لے گئے اہتمام مصدر بن گیا، اس کے معنی ہیں فکر۔ تو کلام کرنے سے پہلے اور کلام کو عمل میں لانے سے پہلے صحیح فکر سے کام کیوں نہ کیا۔ سوچ لیتے کہ میں اس بات کو کہنا چاہ رہا ہوں کہیں اس بات کے کہنے میں تکلیف نہ پہنچے، میں جو طریق عمل دوسرے شخص کے ساتھ اختیار کر رہا ہوں کہیں اس عمل سے تکلیف نہ پہنچ جائے۔ تم نے کلام سے پہلے اور عمل سے پہلے اس فکر سے کام کیوں نہ لیا۔ یہ ہیں ہم کے معنی! یہ ہے اسلام یہ تو ہوگئی شریعت۔

معاشرت کو پڑھے لکھوں نے بھی دین سے نکال رکھا ہے :

چونکہ صحابہ ﷺ نے پوچھا تھا: من المسلم؟ مسلم کون ہے؟ آپ ﷺ نے

فرمایا: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویدیه۔ (مشکوۃ شریف، ص۱۲) اچھاتم یہ پوچھ رہے ہو کہ مسلم کون ہے؟ کہ جس کا تعلق اسلامی عمل سے ہے۔ ایک تو مؤمن کا سوال جس کا تعلق تصدیقِ قلبی یعنی ایمان سے ہے۔ تم مسلم کو پوچھ رہے ہو جس کا تعلق اسلام سے ہے جس کے معنی ہیں گردن نہادن بطاعت، اس کا تعلق عمل سے ہے۔ معاشرتی زندگی میں مسلم و مسلمان وہ ہے جو کہ اپنے آپ کو پرکھے جس کو مسلمان عوام تو کیا پڑھے لکھوں نے بھی معاشرتی زندگی کو دین سے نکال رکھا ہے۔ یاد رکھیے! جو نیک بخت کہلایا جارہا ہے تہجد گزار صاحب اشراق و چاشت اس نے بھی دین کے جز و راحتی، فرحتی و سلامتی کو جو کہ معاشرت کہلائی جاتی ہے دین سے نکال رکھا ہے۔ جس طرح چاہے جس کے ساتھ چاہے عمل درآمد کر بیٹھے اور بول بیٹھے اس کی بلا سے کسی کا دل دُکھے نہ دُکھے، تکلیف ہو کہ نہ ہو جان و مال و عزت کو نقصان ہو یا نہ ہو۔ اس معاشرت کو اچھے خاصے لوگوں نے بھی دین سے نکال رکھا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا مسلم وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو سلامتی رہے۔ تُرش بات کہہ دی اس کا دل دُکھ گیا، زبان سے جو اس طرح کلام کیا سخت تُرش، تلخ تو دل اس کا دُکھ گیا۔ اے مسلمان! تجھے کیا حق تھا اس طرح کلام کرکے مسلمان کا دل دُکھانے کا رنج پہنچانے کا تجھے کیا حق تھا تو مسلمان کہلائے جانے کے قابل ہے؟

یہ مسلمان کے اسلام کی معاشرت بیان فرمارہے ہیں حضور اکرم ﷺ جو حق تعالیٰ ہی کا فرمان ہے تجھے کیا حق تھا کہ تو نے اس طرح کلام کیا جس سے اس کے دل کو دُکھ، رنج پہنچ گیا فکرِ صحیح سے تو نے کام کیوں نہ لیا پہلے کیوں نہیں سوچا۔ زبان کا کام یہ ہے کہ رُک جائے سوچ کر چلے یہ زبان جرمِ صغیر ہے حدیث شریف میں آیا ہے

یہ زُبان چھوٹا سا ٹکڑا ہے جَرمہ صغیر و جُرمہ کبیر لیکن اس کے گناہ بڑے زبردست ہیں۔

نظرِ حقارت سے اِبتلاء در معاصی ہوسکتا ہے :

ایک غیبت ہی کو لے لو جو زُبان کا کام ہے کہ کسی کے اندر عیب دیکھا جو واقعی عیب ہے اس کو دوسروں سے کہہ رہا ہے اس مسلمان کی ذلت ہے کہ نہیں بدنامی ہے کہ نہیں؟ اگر تجھ کو معلوم ہے تو چھپا کر رکھتا اور اپنے لئے بھی کچھ سوچ لیتا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عیب مجھ میں اس وقت تو ہے نہیں لیکن خدا نہ کرے آئندہ کو ایسا عیب مجھ میں پیدا ہو جائے یہ علاج ہے' علاج شروع ہو گیا کہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس میں عیب دیکھا اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن میری نظر اس پر حقارت کی نہ پڑے کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ چل کر کہیں میں مبتلا نہ ہو جاؤں اس عیب میں کیا تجھے یہ احتمال نہیں ہے یہ اندیشہ نہیں ہے دیکھ لیا' مگر تیری نظر حقارت کی کیوں پڑی اور پھر اپنے تک بس نہیں کی بلکہ دوسروں سے بھی کہہ دیا اس نے تو وقتی کوئی حرکتِ شرعی قبیح بے حیائی کی کی تھی، اور تو اس کے اس عیب کو جگہ جگہ بیان کر رہا ہے تو تُو ہر وقت اس سے زیادہ بدتر گناہ برابر کر رہا ہے چنانچہ ارشادِ رسول ﷺ ہے:۔ الغیبة اشد من الزنا ۔

غیبت کرنے والا توبہ نہیں کرتا گنہگار توبہ کر لیتا ہے :

وہ وقتی ہو گیا تھا ہو گیا تھا تو تُو ہمہ وقتی اور اشد میں لگا ہوا ہے۔ کسی مؤمنہ یا کسی مؤمن سے کوئی ارتکاب بیحیائی کا قباحت کا شناعت کا ہو جاتا ہے تو اس کا ایمان اندر سے کھٹکھٹاتا ہے اور بے چارے کو اندر ہی اندر ندامت آتی ہے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اور ندامت کا نام ہے توبہ، تو اس نے تو توبہ بھی کر لی اور تو اے غیبت کرنے

والے! جس میں حبِّ جاہ بھی رکھا ہوا ہے اور جس سے ایسا ہوتا ہے وہ نادم نہیں ہوتا جس کا نام توبہ کرنا ہے تو ایسا آدمی توبہ بھی نہیں کرتا تو اس نے گناہ کیا ہے تائب بھی ہوا اور تو نے گناہ کیا ہے تو اس کو گناہ نہیں سمجھتا تائب بھی نہیں ہوتا اب بتلائیں کہ بدتر کون ہے، کیا ہماری مجلسوں میں غیبتیں نہیں ہوتیں جب چار چھ بیٹھتے ہیں تو کیا دوسروں کی برائیاں نہیں کرتے تو یہ غیبت کرنا حبّ جاہ کا فرد ہے حبِّ جاہ جو کہ حرام ہے یہ اس کا فرد ہے اس کی ایک شاخ ہے وہ تو تائب ہے اور یہ تائب نہیں، حدیث شریف کیا کہتی ہے، اسلام کیا کہتا ہے؟ اس کی تعلیم کیا کہتی ہے کہ اس بے جاہ کے کام کرنے والے گناہگار سے زیادہ تو گنہگار ہے اور یاد رکھ! تو نے جلدی توبہ نہ کی حقارت کی نگاہ ڈال کر رہ گیا تو جب تک تیرا ارتکاب اس فعل کا نہیں ہو جائیگا موت نہیں آئے گی۔ ہمیں اپنے نفسوں کو زُبان پر قابو رکھ کر پاک رکھنا چاہیے۔

مجلس میں دھیان لگا کر بیٹھنا چاہیے :

جب تشریف لائے ہیں تو سماعت مقصد کے تحت ہونا چاہیے، سماعت بغور ہونا چاہیے، اِدھر اُدھر آنکھیں نہیں چلانی چاہیے، اِدھر اُدھر اپنے سر کا رُخ نہیں کرنا چاہیے، ایسے سُننے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ قرآن شریف میں ہے جب بیٹھو تو اس طرح بیٹھو ان فی ذٰلک لذکریٰ لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔

کانوں کو لگا کر گردنوں کو جھکا کر دل کو حرص وطمع سے ہٹا کر سنو جب تم کو فائدہ ہوگا بلا اس کے فائدہ نہیں ہوسکتا۔ یہ قرآن پاک کی تعلیم ہے اس طرح بیٹھو اخلاص وصدق کے ساتھ تب فائدہ ہوگا۔ یہ اِمتناع ضروری ہے کیوں کہ بعض ایسے بھی بیٹھتے ہیں۔

زُبان پر قابو پالینا اہم مسئلہ ہے :

کفُّ اللسان بڑا بھاری مسئلہ ہے، معاشرتی زندگی میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں : قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن۔(پ۱۵،ع۵) میرے مسلمان بندوں سے کہہ دیجیے کہ کلام جب کسی کے ساتھ ہو تو احسن ہو بہترین عمدہ الفاظ اور عمدہ آواز کے ساتھ ہو۔ خشونت نہ ہو، سخت لہجہ نہ ہو، آواز میں کڑک نہ ہو، اگر دور پہنچانا ہے تو زور سے بولے گا، زور سے بولنا اور بات ہے۔ احسن اسمِ تفضیل بہت ہی کلام کرنے میں آواز میں حسن رکھا ہوا ہونا چاہیے چونکہ ان انکر الاصوات لصوت الحمیر یعنی آوازوں میں بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے جب گدھا بولتا ہے تو لوگ لاحول پڑھتے ہیں بڑی کراہت ہوتی ہے انسان ہو کر گدھے کی سی آواز نکال رہا ہے کہ بلا ضرورت کے زور سے بول رہا ہے کہ اس طرح بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہے جو مخاطبین ہیں بس ان تک آواز صاف پہنچ جائے کہ سن بھی لیں اور سمجھ لیں۔

حضرت عمرؓ کی ایک واعظ کو تنبیہ :

چنانچہ ایک صاحب مسجد نبوی ﷺ میں وعظ کہہ رہے تھے اور زور زور سے کہہ رہے تھے اتفاق سے عمر فاروقؓ ادھر سے گذرے تو آواز زور سے باہر آ رہی تھی، مسجد میں تشریف لے گئے اور واعظ سے کہا کہ تم اتنی زور سے کیوں بول رہے ہو سامعین مخاطبین تمہارے سامنے موجود ہیں ان تک آواز صاف پہنچ رہی ہے اگر تم نے آئندہ اس طرح وعظ ایسے رفعِ صوت کے ساتھ کیا تو میں تم کو ٹھیک کر دوں گا۔ (ماروں گا)

آدابِ مجلس کا تذکرہ :

قرآن شریف میں حضور اکرم ﷺ کو تعینِ مجلس کا حکم ہے :

"واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغدٰوة و العشىّ يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم تريد زينة الحيوٰة الدنيا۔ (پ۱۵ع۱۶)

جو ذاتِ باری تعالیٰ کے طالبِ رضاء ہیں اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے رہتے ہیں ان میں آپ جم کر بیٹھیے۔ ان کے ساتھ ہے جم کر بیٹھنا طالبین کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگے ہوئے ہیں اور طالب ہیں نہ کہ ہر ایک کو لے کر بیٹھ گئے کیا فائدہ ہوگیا۔ طالب ہونا چاہیے تو شیخ کا ایک وقت متعین ہوتا کہ معلوم ہو جائے طالبین اس وقت میں پہنچ جائیں نہ کہ ہر وقت گھیر رہے۔

مؤمن کا مسلم ہونا ضروری نہیں :

تو گفتگو زبان کی ہے یہ قینچی کی طرح چلتی ہے چاہے کسی کا دِل ٹوٹے پھوٹے فکر ہی نہیں ہے تو اس میں ایک بڑی چیز غیبت ہے اور اگر اس میں وہ چیز ہے بھی نہیں تو پھر وہ تہمت ہے یہ تو اس سے بھی زیادہ بدتر ہے، اشدّ عذاب ہے اس کی بے حیائی سے زیادہ اس کے عیب کا بیان کرنا یہ اشد ہے اور جیسا اشد ویسا ہی اشدّ عذاب ہے کہ غیبت یہ حبِ جاہ کی فرد ہے اپنا اعزاز اور دوسرے کا اذلال، تو حضور ﷺ نے فرمایا مسلمان وہ ہے جو اپنی زُبان کو روکے رکھے کہ مسلمان کا دِل نہ دُکھے رنجیدہ نہ ہو اس کی ذلّت نہ ہو یعنی زُبان کو محفوظ رکھے، زُبان سے دوسرے کی سلامتی میں فرق نہ آجائے، پریشانی نہ پیدا ہو جائے۔ اور اگر دوسری چیز بھی شریک ہوگئی اس برائی میں پھر مسلمان کہلایا جانا بہت مشکل ہو جائے گا وہ ہے : یہ، " المسلم من سلم المسلمون من لسانه

ویدہٖ" زُبان سے تو دِل کو تکلیف پہنچتی ہے رنج ہوتا ہے۔

حدیث میں قید واقعی ہے احترازی نہیں :

اور یہاں مسلمان کی جو قید ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ جانوروں کو تکلیف پہنچاؤ، یہ مطلب نہیں ہے کہ کافروں کو تکلیف پہنچاؤ حربی کی بات الگ ہے چونکہ اس وقت میں کفار سے سابقہ وہ معاملہ نہیں ہے جیسے کہ ٹخنے ڈھکنا حرام ہے مرد کے لئے اگر بچہ بیٹا نابالغ ہے اس کے لئے پاجامہ جب بنوائے ٹخنے ڈھکے ہوئے نہ ہوں بچہ گنہگار نہیں ہوگا باپ گنہگار ہو جائے گا اور یہ قید قیدِ واقعی ہے اور یہ قید قیدِ احترازی نہیں ہے کہ تکبر کے طور پر ڈھکے گا تو گنہگار ہوگا اگر نہیں ڈھکے گا تو گنہگار نہیں ہوگا یہ قید واقعی ہے اس لئے ممنوع ہے۔ مگر آج اگر ٹخنے سے اونچا پاجامہ پہنے گا کوئی تو کہیں گے کہ یہ کیا تم نے سقوں کا سا پاجامہ پہن رکھا ہے یوں کہا جاتا ہے کہ سقے اونچا پاجامہ پہنتے ہیں کہ پانی کا اس کا کام ہے تو کہتا ہے کیا تو سقہ ہے کہ اتنا اونچا پاجامہ پہن رکھا ہے، بات بہت دور پہنچ رہی ہے۔ گو حضور ﷺ نے تہبند باندھا ہے پاجامہ نہیں پہنا ہے لیکن سلوایا تھا، ثابت ہے تو ارادۂ فعلِ نبی ﷺ فعل میں شمار ہوتا ہے تو پاجامہ پہننا خلاف سُنت نہیں ہے صحابہ ؓ پہنتے تھے اور یہ معاشرت کی زندگی تھی وہاں کی۔

تو یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں کہ کافروں کو تکلیف پہنچاؤ، جانوروں کو تکلیف پہنچاؤ۔ ذبح کرتے وقت تیز چھری کا حکم ہے اگر کند چھری ہو اور ذبح کرے گا تو گناہ ہوگا کیونکہ تکلیف پہنچ رہی ہے اس کو بلکہ مضبوط ہاتھ والا تیز دھار والا ہو تاکہ جلدی سے اس کو ذبح کر دے تو یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں ہے۔

اسلام نے فتنہ، فساد سے محفوظ رہنے کی تعلیم دی ہے، یہ نہیں کہ خاص کافر کو

ایسے الفاظ زُبان سے بولے کہ جس سے اس کا دل دُکھ جائے، اس کو رنج پہنچ جائے جھگڑا پیدا ہو جائے، فساد آ جائے، تو بنیاد یہ ہے زُبان کی اور اسلام میں فساد و فتنہ سے محفوظ رہنے کی اہم ترین طریق سے تعلیم دی ہے، اور جب ہندو کو، کافر کو تکلیف پہنچ گئی تو کیا وہ در پے نہیں ہوگا ستانے کے پیچھے نہیں پڑے گا وہ سوچے گا نہیں پھر بدلہ لینے کی طرف نہیں چلے گا اس کا دل؟ تو بیٹھے بٹھائے اپنی زندگی کی سلامتی میں ایسی حرکت کیوں کی تھی کہ پریشانی میں پڑ گئے تو اپنے ہاتھوں پریشانی مول لی ہے۔ اور میں نے تجھ سے اے مسلمان! کیا کہا تھا جب تم نے اس کے خلاف استعمال کیا اس کے خلاف عمل میں لایا تو تو نے خود اپنے کو فتنہ میں ڈال دیا۔ ہم بطورِ خود خانگی زندگی بیرونی زندگی میں پریشانی میں پڑتے ہیں اور حکم بطورِ احتیاط بطورِ اہتمام کے ہے اور پھر بھی کوئی اس کے پیچھے پڑ جائے اس کی ذمہ داری نہیں۔

بدگمانی کا موقعہ بھی نہ دینا چاہیے:

چنانچہ حدیث میں بھی اتقوا مواضع التھم کہا اتقوا التھم نہیں کہا کہ تہمتوں سے بچو، یہ نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ تمہاری طرف سے ایسا طریق نہ ہو کہ لوگوں کو تہمت لگانے کا موقع مل جائے، یوں تو تہمت حضرت عائشہ ؓ پر بھی لگائی تھی، یوں تو تہمت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی لگائی تھی، اس کی زبان پکڑ لی آپ نے؟ خود اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ایسا طرزِ کلام ایسا طرزِ عمل نہ ہو کہ جس سے تہمت کا موقع ملے، جس پر پورا اعتقاد پورا اعتماد نہ ہو جائے مخلوق کو بزرگی کا اور تقویٰ کا۔ اس کو بھی اہتمام ہی چاہیے جب کہ وہ ہدایت وارشاد کا بھی کام کر رہا ہو، دروازہ بند ہے امرد لڑکا خاص کر جو ذرا حُسن و خوبصورتی لئے ہوئے ہے اندر بیٹھا ہے۔ کچھ دیر کے بعد اندر سے نکلا،

دروازہ بند ہی تھا گذرنے والے نے کہا کہ یہ لڑکا حسین وخوبصورت اندر سے نکلا ہے اور کوئی نہیں صرف ایک ہے اور وہاں سے نکلا ہے اس کے جی میں خواہ مخواہ بدگمانی' اور خاص کر آج کل یہ زمانہ بدگمانی کا زیادہ ہے۔ بیبیوں کو بھی بدگمانی ہو جاتی ہے اسی لئے آج کل بہت زیادہ طلاق کی نوبتیں آ رہی ہیں۔

بدگمانی کا سانحہ بشکلِ المیہ :

ایک فوجی شخص کی بیوی تھی، فوجی فوج میں تھا چھٹی لے کر گھر آیا جب دروازہ کے قریب پہنچا تو بیوی کو دیکھا کہ ایک کواڑ کھلی ہوئی ہے اور جھانک رہی ہے وہ تو فوجی ہے تلوار ساتھ لٹکی ہوئی ہے اس کو پکڑ لیا اور اس کو یہ ظن ہو گیا کہ کوئی اس کے ساتھ لگا ہوا ہے اس کو تاک جھانک رہی ہے گرا دیا دروازہ میں ہی۔ وہ پناہ مانگ رہی ہے کہہ رہی ہے کہ میاں! اندر جا کر تو ذرا دیکھو جب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں یہاں کیوں کھڑی ہوں۔ مگر وہ غضبناک ہے اسے قتل کر دیا جب کھینچ کر اندر لے گیا تو دیکھا کہ صحن میں بہت بڑا سانپ پھوں پھوں کر رہا ہے، اس کے ڈر کے مارے آئی تھی کہ کوئی مل جائے تو میں کہہ دوں کہ میرے گھر میں سانپ ہے۔ اب پچھتا رہا ہے۔ غصہ' ظن' بدگمانی' یہاں تک پہنچ جاتی ہے۔

آنکھ بھی غلطی کر جاتی ہے :

اس لئے آنکھ کی دیکھی ہوئی بعض دفعہ چیزوں میں بڑا مغالطہ ہو جاتا ہے۔ چلے جا رہے ہیں کوئی شخص سامنے سے نظر آیا یہ شخص سمجھا یہ تو میرے دوستوں میں سے ہے لپک کر سلام کیا، جب قریب ہوا وہ تو اجنبی ہے تو شرمندہ ہو رہا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص کے ساتھ ہو گیا اس نے لاحول پڑھ دیا بیچارہ نے، اس کو غصہ آ گیا آپ نے مجھ کو

شیطان سمجھا ہے، مجھ کو دیکھ کر لاحول پڑھا آپ نے، کہا کہ نہیں میں نے جو سلام کیا آپ کو اپنا دوست سمجھ کر، اور اب معلوم ہوا کہ آپ تو میرے دوستوں میں سے نہیں ہیں تو میں نے اپنے افسوس کیساتھ لاحول پڑھا ہے، نہیں نہیں آپ نے مجھ پر لاحول پڑھا، جھگڑا بن گیا اور آدمی جمع ہو گئے، وہ بے چارہ جان بچا کر بھاگ گیا۔ تو آنکھوں دیکھی بھی غلطی ہو سکتی ہے مشاہدہ بھی غلط ہو سکتا ہے، تو زبان بطریق اولیٰ غلط استعمال ہو سکتی ہے، اب رہ گیا ہاتھ۔

ہاتھ سے دو طرح کی تکلیف:

ہاتھ سے بھی کئی قسم کی تکلیفیں پہنچتی ہیں، خصوصاً دو ایک جانی اور ایک مالی، جب کسی کو مارے گا اگرچہ ہاتھ میں ڈنڈا ہی ہو تو ہاتھ ہی میں تو ہے وہ، تلوار مارے بندوق مارے بم و گولہ مارے تو ہاتھ ہی میں تو ہے۔ قلم خود لکھ سکتا ہے جب تک ہاتھ میں ہو تو ہاتھ سے تکلیف جسم کو پہنچتی ہے اُستاد نے کسی شاگرد کو مارا۔ کیوں مارا تم نے اگر مارا تھا تو تم نے ایسا کیوں مارا، قابلِ تعزیر تھا تم نے حد کیوں جاری کی۔

یہ ملاجی حافظ جی لڑکوں کو بہت مارتے ہیں، جب ان کی کھال قیامت میں کھینچی جائے گی تب ان کو پتہ چل جائے گا۔

مسلم خود کو کسوٹی پر کیسے پرکھے؟

دُکھ پہنچ گیا اور جسمانی تکلیف پہنچ گئی اور یہی تین چیزیں ہیں جانی، مالی، آبروئی یعنی قلبی۔ تو زبان سے تو قلبی اور ہاتھ سے جانی اور مالی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمان وہ ہے کہ جس کی ذات سے کسی مسلمان کو جانی اور مالی اور قلبی تکلیف دُکھ، رنج نہ پہنچے۔" مسئلہ صاف ہو گیا، اب ہر مسلمان کو اس طرح اپنے آپ کو کسوٹی پر

پرکھنا ہے۔

صحابہ ﷺ نے پوچھا کہ مسلمان کس کو کہتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان اسے کہتے ہیں، تو اپنے کو مسلمان ہونے کی کسوٹی معلوم کر کے اس پر پرکھنا چاہیے۔ ہر وقت اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ صرف نماز پڑھ لی، تہجد پڑھ لی، تلاوت کر لی، چار پارے روز پڑھ لئے نہ ہاتھ حفاظت میں ہے نہ زُبان حفاظت میں ہے اور سمجھتا ہے کہ میں تو پکا مسلمان ہوں۔ کیا وہ صحیح معنی میں مسلمان کہلائے جانے کے قابل ہے اور بالخصوص سلوک میں داخل ہو کر ابھی تو تیری زُبان تیرے ہاتھ بھی قابو میں نہیں ہیں جس طرح چاہا جو چاہا اپنی بیوی سے کہہ دیا اس پر بڑا زور ہے، اندر بھی جھجھک نہ رہی باہر تو ذرا کچھ مصلحت ہو گئی، اُس نے اس طرح کہا ہے اگر میں اس طرح کہوں گا تو چار آدمی سُنیں گے تو کیا کہیں گے۔ اگر اس نے کچھ کہہ دیا تھا تو کہہ دیا تھا تو کیا بات تھی لوگ تمہیں کہیں گے اس کو نہیں کہیں گے۔ وہ تو جاہل تھا آپ تو عالم صاحب ہیں۔

سالک کی زُبان قابو میں رہنی چاہیے:

جس کو لوگ خانقاہ کہہ دیتے ہیں تو تزکیہ کے لئے تو آپ آئے تھے اپنے تو تصفیہ کے لئے ہی تو آئے ہیں، ہم نے تو یہ سُنا ہے اور پھر آپ دیکھیے لڑکے سے کس طرح بگڑ رہے ہیں اپنے ساتھیوں سے کس طرح باتیں کر رہے ہیں تیزی کے ساتھ۔ تو سلوک میں داخل ہونے والے کی زندگی کیسی تصفیہ کی اور پاکیزگی کی' زبان کے اعتبار سے بھی اور ہاتھ کے اعتبار سے بھی ہونی چاہیے۔

اور یہ جب تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ عدمِ اِختلاط نہ ہو تو یہاں خانقاہ میں رہنے کے لئے اِختلاط کے لئے آئے تھے؟ یہاں تو پہلی ہی شرط عدمِ اِختلاط ہے نہ

اختلاط ہوتا نہ دست درازی ہوتی، نہ زبان درازی ہوتی، اب تک آپ کی زبان بھی قابو میں نہ ہوئی، آپ کیا خواہ مخواہ کے لئے آئے ہیں۔

اِیذاء رسانی سے رُکنا ادنیٰ درجہ، راحت رسانی اعلیٰ درجہ ہے:

تین چیزیں ہیں۔ جان، مال اور دِل۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان وہ ہے کہ جس سے مسلمان کی جان اور مال اور دل سلامت رہے'' یہ کسوٹی ہے موٹی سی پہچان کی۔ اور آگے فرمایا حضور ﷺ نے کہ یہ تو ادنیٰ درجہ ہے ایسا بھی نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا، تو ادنیٰ درجہ ہے یہ کہ کسی کو کسی قسم کی اپنے سے تکلیف نہ پہنچے، رنج نہ پہنچے، اس کا اہتمام ہونا چاہیے یہ شریعت ہے۔ اب آگے یوں فرماتے ہیں اچھا! بس تم نے اس ادنیٰ درجہ پر قناعت کر لی؟ آگے کیوں نہیں بڑھتے، اپنے آپ کو ایسا کیوں نہیں بناتے کہ تم سے دوسرے کو راحت پہنچے ایذاء رسانی سے تو تم بچ گئے مگر اس پر کفایت وقناعت کیسی؟ آگے بڑھو' راحت رسانی بھی ہونی چاہیے دوسرے مسلمان کے واسطے راحت رساں بننا چاہیے۔ اس طرح کہ راحت رسانی کے لئے اپنے پر کوئی تکلیف گذرتی ہو تو اُٹھا لو جہاں تک تحمل ہو چونکہ معاملہ اس معبودِ حقیقی کے ساتھ ہے نہ کہ بہانہ خوری کہ میرے تحمل سے باہر تھا یہ دل کا معاملہ جو زُبان سے کہہ رہا ہے ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے، تو دھوکہ دے سکتا ہے یہ کہہ کر کسی دوسرے شخص کو مگر اس ذات کو دھوکے کا کیا سوال؟ ....

کارہا باخلق آری جملہ راست باخدا تزویر وحیلہ کئے داست

تو مخلوق کو دھوکہ تو دے سکتا ہے چونکہ تعلیم حسنِ ظن کی کر دی ہے سوءِظن سے بچنے کی کر دی ہے، لیکن خالق برتر کو دھوکہ اور اس کے سامنے حیلے بہانے چل نہیں سکتے۔

اپنی عزت دوسرے کی ذلّت نہ ہو :

کہ میں نے تو اِصلاح کے لئے کہا تھا کہ میں نے تو لوگوں کو اس کے ضرر سے بچنے کے لئے کہا تھا حالانکہ اس طرح سے دوسروں کو ضرر پہنچ رہا ہے بھلا غیر سے کہنے کی کیا غرض اور ضرورت تھی اس کے عیب کی، اگر کہنا تھا اور شفقت تھی اور رحمدلی تھی۔ تو اس سے خود کہتا کہ بھائی دیکھو! تم ایسے آدمی ہو میں تمہارے اندر ایسی بات پاتا ہوں، اُن سے اگر غلطی ہوگئی تو ان سے کہہ دیتا، ان سے تو کہتا نہیں اور دوسروں سے کہتا پھرتا ہے، یہ اپنا اعزاز ہے اور دوسرے کا اِذلال ہے، یہ باریک چور ہے، اور یہ اس کے لئے ہے جو کہ اپنے کو مریض سمجھے اور طالبِ صادق ہو رضائے الٰہی کا اور کچھ خوف رکھتا ہو۔ اعلیٰ درجہ راحت رسانی کا جہاں تک کہ تحمل ہو چونکہ اپنی ذات کا پہلے اپنا حق ہے اپنے کو تکلیف پہنچی اور دوسرے کو راحت پہنچائی تو کیا راحت پہنچ گئی؟ دیکھنے میں تو پہنچ گئی تو پہلے اپنے کو تکلیف سے بچانا ہے ان لنفسك عليك حقاً تفسیر ہے حدیث شریف میں الفاظ تو چھوٹے ہوتے ہیں مگر صاحب کلام کا متکلم کی حیثیت سے کلام چھوٹا اور اس میں بہت سی تفسیر ہوتی ہے۔ فرمایا بخاری شریف کی حدیث: "المسلم من سلم ...... الخ" کے بعد دوسری حدیث ہے فرماتے ہیں کہ اس سے آگے بڑھو وہ ہے: "اطعام الطعام افشاء السلام" یعنی کھانا کھلانا اور سلام پھیلانا۔ وہاں تو صراحتاً نصاً لسان کا لفظ تھا اور ید کا لفظ تھا اور یہاں نہ لسان کا لفظ ہے اور نہ ید کا لفظ ہے۔

حدیث کی طرح منطق پڑھنے میں بھی ثواب ہے :

منطق کا پڑھنا خواہ مخواہ نہیں ہے ضروری ہے اکابرین تو فرماتے ہیں کہ جیسے حدیث شریف کے پڑھنے میں ثواب ملے گا منطق کے پڑھنے میں بھی ثواب ملے گا

اور یوں تو حدیث شریف کو غلط استعمال کرے تو گناہ ہوگا ایسے ہی منطق کو غلط استعمال کرے گا تب گناہ ہوگا۔ بڑی تسہیل ہو جاتی ہے منطق کے پڑھنے سے بشرطیکہ سمجھ کر پڑھے۔ علمِ کلام اس میں منطق و فلسفہ رکھا ہوا ہے اپنے ایمان کی مضبوطی کے لئے نہیں بلکہ اثباتِ حق کے لئے خصم و دشمن کے سامنے ثابت کرنے کے لئے۔ شرحِ عقائد اپنے عقائد کے صحیح کرنے کے لئے نہیں پڑھی پڑھائی جاتی ہے وہ تو مؤمن ہے، بلکہ دشمن کے مقابلہ کے لئے۔

راحت رسانی کے دو طریقے:

فرمایا: "اطعام الطعام افشاء السلام" یہ ہے راحت رسانی کہ اوپر کی حدیث میں تو تھا کہ ایذاء رساں مت بنو، ایذاء رسانی سے بچو اور پھر ترقی کرو کہ تم دوسرے مسلمان کے لئے (گفتگو اس وقت مسلمان سے ہو رہی ہے) راحت رساں بنو، اس کو راحت پہنچانے کے لئے اپنے پر کچھ تکلیف برداشت کرلو زبان کے اعتبار سے بھی اور ہاتھ کے اعتبار سے بھی، تو یہاں تو زبان کا لفظ نہیں ہے ہاتھ کا لفظ نہیں ہے۔

تو اے مسلمان! تیری عقل تو بحر ذخار ہونی چاہیے، جب میں نے کہا: اطعام الطعام کھانا کھلانا، جب تم کھانا لاؤ گے اور سامنے رکھو گے تو پیروں سے یا ہاتھوں سے تو اطعام الطعام میں ید آ گیا۔ اور جب سلام کرو گے تو زبان سے، تو افشاء السلام میں زُبان آ گئی اوپر ہاتھ اور زبان تھی یہاں بھی ہاتھ اور زبان آ گئی، وہاں اور طرح استعمال ہے اور یہاں اور طرح استعمال ہے۔ وہاں ایذاء سے بچنے کے لئے استعمال ہے اور یہاں راحت رسانی کے لئے استعمال ہے جب کسی کو کھانا کھلائیں گے تو راحت و آرام ہی پہنچے گا۔

یہ تو ایک مثالی اور جزوی چیز ہے۔ چونکہ اس کا معاملہ پڑتا رہتا ہے آنے جانے کا کھانا کھلانے کا۔ اگر بیمار ہو اور دُکھن و درد ہو رہا ہو اُس کا جسم دبانا ہے تو زُبان سے دباؤ گے یا ہاتھ سے دباؤ گے یا پیر سے دباؤ گے؟ ہاں اگر وہ یوں کہہ دے کہ بھائی! کمر میں بہت درد ہے۔ تم میرے کندھے سے لیکر پاؤں تک اپنے پیر رکھ کر خوب دباؤ، وہ تو ایک اتفاقی اور عارضی بات ہے' اس کا اعتبار نہیں۔

زیادہ ذہانت برباد کر دیتی ہے :

کیونکہ بعض لوگ بڑے ذہین ہوتے ہیں ۔ میں بڑے ذہینوں سے گھبراتا ہوں، خدا محفوظ رکھے ان ذہینوں سے کہ عقل تو کم اور ذہن زیادہ، اور جس کا ذہن عقل سے زیادہ ہوتا ہے تو وہ گمراہی کے راستہ پر چلنا شروع کر دیتا ہے، ایسے ہی گمراہ ہوئے ہیں کوئی قادیانی ہو گیا، کوئی مودودی ہو گیا، کوئی ایسا ہو گیا کوئی ویسا ہو گیا، ذہن چلا رہا ہے عقل مغلوب ہو گئی۔ تو ایسوں ذہینوں سے اللہ محفوظ رکھے۔ (آمین)

دکھ درد والے جسم کو ہم نے تو پیروں سے بھی دباتے دیکھا ہے، تم ہاتھ ہی سے دباتے رہے ہو تو عادت ہاتھ سے دبانے کی تو عادت کی بات کا اعتبار ہوا کرتا ہے۔ اتفاقی بات کو لا کر اعتراض کر رہا ہے بعض طالب علم ایسے بھی ہوتے ہیں مطالعہ دیکھ کر آیا ہے ایک مقام پر سات اعتراض کر دیئے۔ اب اُستاد حیران ہے کہ کہاں سے بول رہا ہے؟ تو دیکھیے یہاں متن پر سات کا نشان لگا ہوا ہے تو میں نے حاشیہ پر دیکھا تو وہاں بھی سات لگا ہوا ہے رات میں مطالعہ کر رہا تھا تو میرے ذہن نے سات اعتراض نکالے، او بے وقوف! اس کا تو کوئی تعلق ہے نہیں یہاں سے، ایسی ذہن رسائی سے گمراہی آجاتی ہے۔

آدمی بننے کے اوصاف :

یہ نہیں کہ صرف اطعام الطعام ہو بلکہ ہاتھ سے جو راحت پہنچائی جا سکے وہ بھی ضروری ہے یہ تو ایک مثال ہے کیونکہ واقعہ یہ اکثر و بیشتر ہر آدمی کے ساتھ پیش آتا رہتا ہے ورنہ تو ہاتھوں کا دبانا، پیروں کا دبانا اور ہاتھوں سے بچارے حاجتمند کو پیسہ روپیہ دینا زبان سے دے گا یا پیروں سے، تو اطعام الطعام کو لے کر بیٹھ گیا حدیث شریف کو نہیں سمجھا، حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے، پیر دبانے کی کیا ضرورت ہے پیر دبانا، تو کہیں نہیں، حدیث شریف میں تو کسی کو پیسہ روپیہ دینے کے لئے آیا نہیں، حدیث شریف میں صرف اطعام الطعام آیا ہے، یعنی جزوی مثال کو ایک کلیہ سمجھ لیا۔

اس پر تعدیہ کردو، ہاتھوں سے جسم کو بھی راحت پہنچائی جایا کرتی ہے، بیچارے پر قرضہ ہے فقر و فاقہ ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے تو ہاتھوں سے اس کو روپیہ پیسہ دیدو، یہ راحت رسانی ہوگئی اور جو ایذاء پہنچ رہی تھی پیسے کے نہ ہونے سے وہ دفع ہوگئی، تو دفعِ ایذاء بھی ہے اور راحت رسانی؟ آگے ترقی کرو، لیکن زبان سے بھی راحت رسانی ہونا چاہیے جس کا تعلق دل سے ہے۔

سلام زبان سے ہے تو جس کو سلام کیا ہے اس سے دِل خوش ہوگا اور دل خوش کرنا مؤمن کا بہت بڑی عبادت ہے، حُسنِ خلق کا یہ ایک فرد ہے۔

حُسنِ خُلق کا پلڑا قیامت میں سب سے زیادہ بھاری ہوگا :

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت میں میزان رکھا جائے گا تو حُسنِ خُلق کا پلڑا سب عبادتوں سے بھاری ہوگا۔ حُسنِ خلق کا پلڑا تمام عبادتوں سے اس عبادت کا پلڑا زیادہ بھاری ہوگا۔ آج کل حُسنِ خلق مفقود ہو رہا ہے ہم مسلمانوں سے،

یہ معاشرتی زندگی عرض کی جارہی ہے جس کو مسلمان اور ایک اچھے خاصے دیندار نے بھی نکال رکھا ہے۔

مسلمان کو کس طرح رہنا چاہیے :

اتنا تو معلوم ہے کہ یہ مسلمان ہے اب چاہے رشتہ دار ہے چاہے نہیں ہے برادری ہے چاہے نہیں ہے، پہچاننے کا مطلب یہ نہیں ہے چاہے وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو مسلمان کی گفتگو ہو رہی ہے۔ ہاں یہ معلوم ہو کہ یہ مسلمان ہے جانتا نہیں ہے مگر ہاں یہ جانتا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ اس میں شانِ ظاہری مسلم ہونے کی بھی ہے، وضع قطع، لباس، چہرہ، صورت شکل، اور جب نہیں پہچانا تو کیا پہچان ہے کہ مسلمان ہے اور جب نہیں پہچانا تو پھر سلام کیسا، اس سے نکلی یہ بات کہ ہر مسلمان کو کس طرح رہنا چاہیے؟ اسلامی شان، وضع قطع، صورت وشکل، لباس مونچھ بھی ہے داڑھی بھی ہے کُرتا بھی مسلمانوں جیسا ہے پاجامہ بھی مسلمانوں جیسا ہے، یہ معاشرت ہے۔

مسلم کی اِمتیازی شان :

مسلم کے اسلام کا ایک یونیفارم ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ مسلمان ہے چہرہ پر داڑھی ہے باقاعدہ، نہ یہودیوں کی سی ہے نہ پادریوں کی سی ہے نہ سکھوں کی سی ہے۔ یہ جواب ہے دفعِ دخلِ مقدر کا کہ کوئی کہہ دے کہ داڑھی تو سکھوں کے بھی ہوتی ہے داڑھی تو پادریوں کے بھی ہوتی ہے یہودیوں کے بھی ہوتی ہے مشرکین کے پنڈتوں کے بھی ہوتی ہے یعنی غیر مسلموں میں بھی یہ بعض داڑھی ہوتی ہے بعضوں کے تو پھر یہ کیا؟

ان کی داڑھی اور طرح سے اور مسلمان کی داڑھی اور طرح سے چھٹی چھٹائی تینوں طرف سے باقاعدہ نہ کہ لٹکی چلی جارہی ہے اور نہ فرنچ کٹ۔ تمہاری داڑھی اور طرح کی ہے اور اُن کی داڑھی اور طرح کی ہے۔ اسی لئے داڑھی رکھنے کا جو حکم دیا ہے اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے ایک کلیہ بیان کردیا، کہ "خالفوا المشرکین" مخالفت کرو مشرکین کی اور اس کے بعد فرمایا: "وفروا اللحیٰ واحفوا الشوارب" داڑھی بڑھاؤ اور مونچھوں کو کٹاؤ۔

غیر مسلم کی مونچھ لبوں تک آئی ہوتی ہے اور جو داڑھی رکھتے ہیں وہ اور طرح کی رکھتے ہیں اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسی نہ ہو جیسے اوروں کی جو کہ غیر مسلموں کی ہے بلکہ مسطح ہو، اسی سے نکل آیا کہ سلام کرو مسلم کو۔

تشبہ حرام ہے :

غیر مسلموں کی نقل و مشابہت کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے، اور ایسے فروعی احکام بدلتے رہتے ہیں تشبہ بالکفار، جبکہ تشبہ بالمسلمہ ناجائز ہے تو تشبہ بالکفار تو بطریقِ اولیٰ ناجائز ہوگا۔

حضور ﷺ تشریف لے جارہے ہیں، یہ کون جارہی ہے؟ جب تک پردہ کا حکم نہیں ہوا تھا، یہ ابوجہل کی بہن ہے، اوہو! لعنت ہو ان عورتوں پر جو......

جب ایک مسلم کی مسلمہ کے ساتھ معاشرتی زندگی منع ہے تو کفار مشرکین کے ساتھ کیسی؟ جب ان کا طریق' مذہبی نہیں معاشرتی ایک عموم طریق سے آجائے اور مسلمان اسی کو اختیار کرے تو تشبہ ہوگیا۔ وہ ننگے سر سے پھرتے ہیں تو تم بھی ننگے سر سے پھرنے لگے وہ یہاں تک کا پہنتے ہیں تم بھی یہاں تک کا پہننے لگے، کیا اس کو کرتہ

کہتے ہیں؟

ایذاءرسانی سے بچنا شریعت' راحت رسانی کا اہتمام تصوّف ہے :

سلام میں راحت رسانی ہے، دل خوش کرنا ہے حُسنِ خُلق ہے اور بڑا اونچا حسنِ خُلق بڑی اونچی عبادت ہے اور پلڑا اس حُسنِ خلق کا میزان میں سب سے بھاری عبادتوں میں ہوگا تو کیسی بڑی حسنِ خُلق عبادت ہے تو وہیں ہاتھ کا بھی استعمال ہوگیا، اطعام الطعام، اور افشاء السلام زُبان کا استعمال ہوگیا، تو وہاں اِیذاء رسانی سے بچا اور یہاں راحت رسانی ہوگئی۔ وہ شریعت تھی اور یہ تصوّف وسلوک ہے۔ بدون سلوک کے طے کئے ہوئے شریعت تامہ حاصل نہیں ہوسکتی ایسا تب ہی ہوگا جب کہ تکبّر نام کو بھی نہ ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ کا ایثارِ حقیقی اور تصوّفی شان :

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ چلے جا رہے ہیں۔ حضرت علیؓ ادھر سے چلے آرہے ہیں۔ ابوبکر صدیقؓ نے سلام نہیں کیا حضرت علیؓ نے سلام کیا اور دیکھنے والے کو معلوم تھا کہ جب اس طرح سے تقابل ہوتا تھا تو ابوبکر صدیقؓ پہلے سلام کیا کرتے تھے حضرت علیؓ کو اور وہ جواب دیا کرتے تھے، آج اس کے خلاف ہوا اور جب خلافِ عادت کوئی بات ہوتی ہے تو کچھ شبہ ہو ہی جاتا ہے تو ان کو یہ خیال ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کے دل میں حضرت علیؓ کی طرف سے کوئی بات رنجش کی آگئی ہو اور آج انہوں نے

خلافِ عادت سلام نہیں کیا۔ کھٹک ہوگئی، جلدی سے پہنچ گئے کہ جلدی کھٹک دور ہو جائے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے اور حضور ﷺ سے جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عادت یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جب تقابل ہوتا تھا تو سلام پہلے کیا کرتے تھے آج انہوں نے سلام پہلے نہیں کیا، ہاں جواب دیا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سلام کا تو یا رسول اللہ ﷺ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان دونوں میں کچھ چل گئی ہو تحقیق فرمالیں۔ حضور ﷺ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلا لیا، آ گئے، فرمایا مجھے معلوم ہوا کہ آج آپ کا آمنا سامنا علی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا تو آپ نے سلام نہیں کیا انہوں نے کیا تھا پہلے، جی ہاں! ایسا ہوا ہے، اور آپ کی عادت کیا تھی (پہلے تحقیق ہو رہی ہے، صرف روایت پر نہیں چل رہے حالانکہ الصحابۃ کلھم عدول) فرمایا پہلے عادت یہی تھی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سامنے آتے تو میں پہلے سلام کیا کرتا تھا، اچھا تو پھر آپ نے اس کے خلاف کیوں کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں جب سلام کیا کرتا تھا تو مجھ پر ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار کا نزول اور قرب زیادہ ہوا کرتا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کم ہوتا تھا تو میں نے آج ایثار کیا کہ پہلے اپنے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو موقع دیدوں کہ وہ سلام پہلے کریں تا کہ اُن پر انوار کا نزول زیادہ سے زیادہ ہو جائے، آج مجھ پر کم ہی سہی۔ حضور ﷺ خاموش ہو گئے...... اور نزولِ وحی کے بعد جواب دیا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ تم نے ٹھیک کہا اور ٹھیک کیا۔

یہ اِیثار کا مسئلہ ہو گیا ترجیح ہو گئی، تصوّف آ گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا قصہ ہے سلام کرنا تو سنت ہے اور جواب دینا واجب ہے۔ واجب ادا کر رہا ہے اور ثواب کم مل رہا ہے اور سُنت پر ثواب و قرب زیادہ تو یہ وہی قصہ ہے جو عرض کیا جا رہا

تھا اطعام الطعام اور افشاء السلام میں۔

سلام کرنیوالے کا عجز و اِنکساری کے باعث درجہ افضل ہے :

تو دیکھیے! وُجوب ادا کیا جا رہا ہے اور ثواب کم' اور سُنت میں وہاں عجز ہے اور جواب ایک قسم کا تشفّی ہے ہم کو سلام کیا ہے، میں جار ہا تھا اگر فخراً ایسی بات ہے تو پھر وہ تو گناہ ہو گیا گو جواب دیا۔ یعنی ایک گونہ اس کی شان بڑھی ہوئی معلوم ہو رہی ہے اور جس نے سلام کیا ہے اس کی جانب سے ایک گونہ عجز و اِنکساری کا ظہور ہو رہا ہے اور جس شے میں عجز و اِنکساری جس درجہ کی ہو گی اسی درجہ کے اعتبار سے اس کا درجہ ثواب وقرب کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہو گا اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں ٹھیک کہا تم نے۔

اللہ ہمیں ایسی معاشرتی زندگی پر دائماً قائماً اختیار کر کے رکھنے کی اخلاص و صدق کے ساتھ توفیق سے نوازے، آمین۔

☆

مجالس مسیح الامت

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب

جلد دوم

پیش لفظ

مولانا عبد القیوم حقانی

بہ تعاون و نگرانی

الحاج ابراہیم تسبیح والا

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ پاکستان